إني لأمزح ولا أقول إلا حقا

میں مزاح کرتا ہوں مگر سچ کے سوا کچھ نہیں بولتا (الحدیث)

مختلف طبقات کے لوگوں کیلئے کتابوں
کے سمندر علم سے چنا ہوا ایک انمول خزانہ

فقہی لطائف

مؤلف
مفتی محمد سلیم آلف
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی و متخصص جامعہ خیر المدارس ملتان



پسند فرمودہ
حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب دامت برکاتہم

مکتبہ عمر فاروق

إني لأمزح ولا أقول إلا حقا

میں مزاح کرتا ہوں مگر سچ کے سوا کچھ نہیں بولتا (الحدیث)

مختلف طبقات کے لوگوں کیلئے کتابوں
کے سمندرِ علم سے چنا ہوا ایک انمول خزانہ

فقہی لطائف

مؤلف
مفتی محمد سلیم الفؔ
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی و متخصص جامعہ خیر المدارس ملتان

پسند فرمودہ
حضرت ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب مدظلہم

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

نام کتاب .... مفتی لطائف

مؤلف .... مفتی محمد سلیم آلف

اشاعت اوّل .... اکتوبر 2009ء

تعداد 1100

طابع .... القادر پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر .... فیاض احمد 0320-4075225

مکتبہ عمر فاروق 4/501 شاہ فیصل کالونی کراچی

ملنے کے پتے

دار الاشاعت ، اردو بازار کراچی
مکتبہ العلوم ، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ قاسمیہ ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
اسلامی کتب خانہ ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
قدیمی کتب خانہ ، آرام باغ کراچی
طاہر نیوز پیپر اینڈ بک اسٹال ، صدر کراچی
ادارۃ الانور ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ رشیدیہ ، سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ ، راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ العارفی ، جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد
مکتبہ رحمانیہ ، اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہید ، اردو بازار لاہور
مکتبہ علمیہ ، جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ
وحیدی کتب خانہ ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور
مکتبہ المعارف ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور

فهرست

فقہی لطائف

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
سب کا تیمم ٹوٹ جائے گا	۲۲۱
مجوسی کی شکار کی ہوئی مچھلی	۲۲۲
مچھلی کو ذبح کرنا مکروہ ہے	۲۲۲
قسم کھا کر حانث نہ ہو جانا	۲۲۲
انڈے چھین کر اپنی مرغی کے نیچے رکھنا	۲۲۲
مینڈک کے متعلق فقہی مسائل	۲۲۲
مینڈکوں کے شور سے حفاظت کی ترکیب	۲۲۳
انزال منی سے وجوب غسل اور پیشاب وغیرہ سے عدم وجوب غسل	۲۲۳
وہ خون جو اپنے لیے پاک، دوسرے کیلئے ناپاک	۲۲۴
دس خون پاک ہوتے ہیں	۲۲۴
طلباء کو کتابیں دینا	۲۲۴
مدرس کی شرعی وفقہی حیثیت	۲۲۴
مہتمم ومدرس کی تنخواہ کی فقہی حیثیت	۲۲۴
ایک احتیاط	۲۲۵
اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتے	۲۲۵
ایک مسئلہ میں دو غلطیاں	۲۲۵
عدالت جھک گئی	۲۲۶
ایسی سنت جو فرض سے افضل ہے	۲۲۶
سنت ولیمہ	۲۲۶
تکفیر کا اصول	۲۲۷
فقہ سب سے زیادہ مشکل فن ہے	۲۲۷
شہادت باللہ یا بالطلاق؟	۲۲۷
فوٹو اور تصویر میں فرق	۲۲۷
واجب کا درجہ	۲۲۸
داڑھی کی مقدار	۲۲۸
غیبت سے بچنے کا ایک واقعہ	۲۲۸
ایسی سنت جو واجب سے افضل ہے	۲۲۸
ماہ صفر	۲۲۸
نماز کا اس قدر اہتمام	۲۲۹

ختم شد

کتاب کے دائرے میں

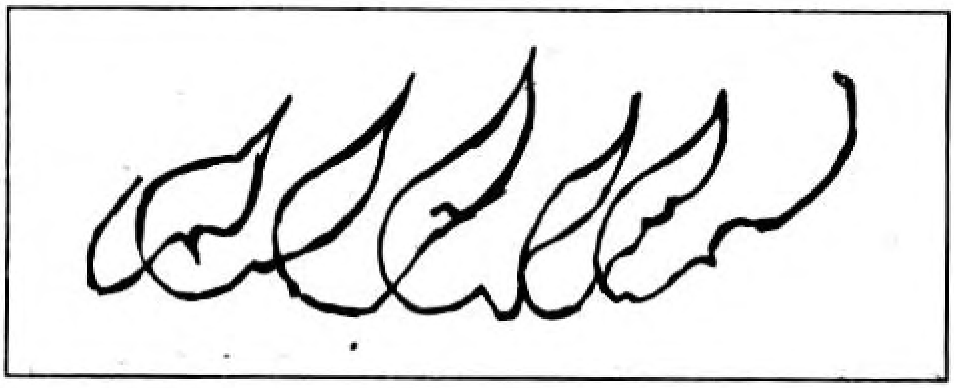
مسکرانا زندہ دلی کا ترجمان ہے، آنحضرت ﷺ اکثر تبسم فرماتے تھے اور مزاح بھی فرمایا کرتے تھے لیکن طریقہ نہایت شائستہ تھا، شگفتہ مزاجی اور ظرافت ایک فطری شے ہے، اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ خوش طبعی اور دل لگی سے آپس میں محبت بڑھتی ہے اور سخت مزاج آدمی سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔

تیز و تند مزاج، درشت رویہ اور کرخت لہجہ اسلام میں کوئی پسندیدہ چیز نہیں البتہ ایسا ہنسی مذاق جو انسان کو اپنی آخرت اور ضروریات دنیا سے غافل کردے اس سے بہر حال بچنا چاہئے۔ کشادہ روئی اور خندہ لبی سے انسان ایک طرف اچھے اخلاق کا ثواب پاتا ہے تو دوسری طرف اسے لوگوں کے درمیان اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

انسان کی سرِشت میں تنوّع و تفنن، ظرافت و لطیفہ گوئی اور ذکاوت و فطانت ودیعت کی گئی ہے، کوئی بھی طبقہ اس سے خالی نہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبروں، دنیا کے سنجیدہ انسانوں، مایہ ناز دانشوروں، سیاستدانوں اور سائنسدانوں کے ہاں بھی یہ فطری خوبیاں بدرجۂ اتم دکھائی دیتی ہیں۔

ہنسنا اور مسکرانا ہماری زندگی کیلئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح سانس لینا...... ہاں! جو مزاح و ظرافت حدود و قیود کے اندر اور کبھی کبھار ہو تو وہ نہ صرف مباح ہے بلکہ صحت، مزاج اور نشاط و سلامتی کی علامت بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی اداؤں میں سے ایک ادا کا احیاء ہے۔

(م۔س۔آلف غفرلہٗ)



''بسم اللہ'' ببری دار خط میں، ٹیپو سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک سے

ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی وصیّت

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

(از علامہ اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

تمام مسلمان مرد اور تمام مسلمان خواتین کے نام

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب
تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس مختصر و جامع ترین دعا کے ساتھ
جس میں اپنے اور سب مسلمانوں کے لئے دین و
دنیا کے سارے مقاصد کی دعا آجاتی ہے

"اَللّٰهُمَّ کُلَّ خَیْرٍ لِّکُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و الصلوۃ و السلام علی عبادہ الذین اصطفی

عرض مؤلف

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اور پھر اسے کامیابی کا صحیح راستہ دکھلایا۔ درود وسلام ہو حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کی کامرانی کا راز بتلایا۔

علم فقہ کی اہمیت محتاج بیان نہیں کیونکہ یہی کتاب وسنت کا صحیح ترجمان ہے جو کہ انسانی دستور حیات ہیں، انسان کو زندگی میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے علم فقہ میں اس کی بہترین رہنمائی موجود ہے۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الف تحیۃ میں احکام ومسائل کے اصول ذکر کئے گئے ہیں اور علم فقہ میں اس کی شرح وتفصیل ہے۔ اس لیے فقہ، کتاب وسنت کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ ﷺ کی عمدہ تفسیر وتشریح ہے، اسی وجہ سے اکثر اہل علم نے اس فن میں مفید کتابیں تصنیف کر کے امت کے لیے صراط مستقیم پر چلنا آسان کر دیا۔ آپ کو نماز سے متعلق مسائل کی ضرورت ہو یا زکوۃ، روزہ، حج وجہاد کے مسائل یا نکاح اور طلاق کے مسائل درکار ہوں، غرض یہ کہ عبادات سے متعلق مسئلہ تلاش کرنا ہو یا معاملات سے متعلق، کتب فقہ میں آپکو یہ تمام مسائل یکجا اور نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اور آپ اپنی ضرورت کے مسئلے کو حاصل کر سکتے ہیں۔

علم فقہ کی اسی اہمیت کی بناء پر حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد"

کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے، جس کو دین کی سمجھ ہوگی، وہ شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھے گا، اور اسکی ایک چال بھی نہ چلنے دے گا۔ اور کورے عابد کو تو شیطان جس طرح چاہے پٹی پڑھا سکتا ہے۔

اس فن کو عام لوگوں خصوصاً طالب علموں میں مسائل شرعیہ سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے بعض حضرات نے پہیلیوں کے انداز میں کتابیں لکھیں تاکہ پڑھنے والا ہر مسئلہ شوق اور رغبت سے پڑھے، اور اس طرح علم فقہ سے بہرہ ور ہو سکے۔

احقر کو بھی دوران مطالعہ، اکابر وسلف صالحین کی کتابوں میں فقہ سے متعلق جو دلچسپ سبق آموز واقعات، اثر انگیز عبارات اور بصیرت افروز معلومات، دلآویز احوال واقوال، حقائق ودقائق اور لطائف وظرائف، عجائب وغرائب جو دل کو بھاتے، ہمت بڑھاتے اور نور ایمان کا باعث بنتے، اس پر قلم سے نشان لگاتا رہا اور فہرست بناتا رہا۔

ہم نے اپنے آشیاں کے لیے ☆ جو چبھے دل کو وہی تنکے لیے

بعد میں محترم دوست حضرت مفتی فضل مولیٰ صاحب مدظلہ (سابق رفیق شعبۂ تدریس ودارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی) نے ان خط کشیدہ یادداشتوں پر مشتمل تحریروں کو یکجا کرنے کے لیے فرمایا، بندہ نے حکم کی تعمیل کی، اوران یادداشتوں پر مشتمل تحریروں کے مجموعہ کا نام ''فقہی لطائف'' رکھا۔

قارئین کرام پڑھیں گے! مجھے یقین ہے جیسا نام ہے ویسا ہی پائیں گے، بلکہ مجھے اللہ رب العزت سے امید ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر پائیں گے۔ (انشاء اللہ العزیز)

ظرافت ایک فطری چیز ہے، اسلام ظرافت سے منع نہیں کرتا۔ لطائف وغرائب اور ظرافت ومزاح کا مطالعہ کرنے سے طبیعت پر بہار آجاتا ہے اور نشاط لوٹ آتا ہے، انسان طبعی طور پر اس طرف مائل ہوتا ہے کیونکہ دائمی سنجیدگی طبیعت پر گراں گزرتی ہے، تاہم اس کا یہ مطلب لینا بھی درست نہیں کہ ہمہ وقت بے مقصد ظرافت کو ہی طبعی مشغلہ بنالیا جائے۔

اسی طرح طبیعت کو زندگی کے گراں بار مسائل سے سبکدوش کرنا بھی انسانی وقار کے منافی نہیں کیونکہ ایسے مواقع سے کوئی طبقہ بھی خالی نہیں بچا، جو اسلامی معاشرے میں سب سے زیادہ سنجیدہ وباوقار گردانا جاتا ہے، اس میدان میں کئی محدثین، ادباء، نحویین اور کئی قضاۃ اور اسی طرح فقہاء کرام حضرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بعض کا حصہ کم ہے اور بعض کا زیادہ ہے۔

ایسے ہی حضور نبی کریم ﷺ بھی صحابہ کرام ؓ سے خوش طبعی کے طور پر کبھی کبھار مزاح وظرافت کو اختیار فرماتے تھے جس سے آپ ﷺ کا مقصد مخاطب کی دل بستگی وخوش وقتی اور محبت وموانست کے جذبات کو مستحکم کرنا ہوتا تھا۔ حضرت سفیان ثوری ؒ سے پوچھا گیا: ''کیا مزاح عیب ہے؟'' فرمایا: ''نہیں بلکہ سنت ہے۔'' کیونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''انی لامزح ولا اقول الاحقا'' یعنی میں مزاح کرتا ہوں مگر سچ کے سوا کچھ نہیں بولتا۔

خوش طبعی اور دل لگی سے آپس میں محبت بڑھتی ہے، سخت مزاج آدمی سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔ عربی کہاوت ہے ''المزح فی الکلام کا لملح فی الطعام'' گفتگو میں ظرافت کھانے میں نمک کا درجہ رکھتی ہے۔

جب یہ معلوم ہوگیا، کہ گفتگو میں مزاح کا درجہ کھانے میں نمک کا ہے تو ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ زیادہ نمک کھانے کو بگاڑ دیتا ہے، یہی حال کثرت مزاح کا ہے، خصوصاً جبکہ وہ ایک قسم کے پھکڑپن اور بے ہودگی میں تبدیل ہوجائے۔

مزاح کو اگر عادت کے طور پر اختیار کیا جائے، تو وہ ایک معیوب بات ہے لیکن مزاح کو اگر تدبیر کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ ایک پسندیدہ چیز بن جائے گی، کیونکہ بعض اوقات مزاحیہ کلام وہ کچھ کر کے دیتا ہے جو سنجیدہ کلام نہیں کرسکتا۔ جو مزاح وظرافت حد کے اندر اور کبھی کبھار ہو تو وہ نہ صرف مباح ہے بلکہ صحت، مزاج اور نشاط وسلامتی کی علامت بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی اداؤں میں سے ایک ادا کا احیاء ہے۔

اسی بناء پر اکابر نے مزاح میں میانہ روی پر زور دیا ہے، تاکہ یہ لایعنی لہو ولعب کا ایک باب نہ بن جائے، جو

نوجوانوں اور طالبعلموں کو بگاڑ کر رکھدے ،بعض لوگ سنجیدہ اور متین بنتے ہیں تو اتنے کہ خوش طبعی اور ظرافت ان سے کوسوں دور رہتی ہے اور بعض خوش طبع بنتے ہیں تو اس قدر کے تہذیب اور اخلاق ان سے کوسوں دور رہتی ہے اس لئے ہمیں حضور ﷺ کے ہدایات وعمل کو اپنے سامنے رکھ کر مزاح وخوش طبعی کرنی چاہیے۔

زیر نظر کتاب جو آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے، اس میں فقہی لطائف کے ساتھ ساتھ اصول فقہ، قواعد ضروریہ، نکات مہمہ، اصطلاحات مفیدہ، ذہانت کے قصے اور نادر ونایاب عقل ودانائی کی باتیں بھی سہل انداز میں بیان کی گئی ہے تاکہ ذہنی نشاط کیساتھ علم فقہ سے ربط ومناسبت اور دلچسپی بھی قائم ہو۔

اگر قارئین کرام حوصلہ افزائی فرمائیں گے تو اس سلسلۂ لطائف وحقائق کے دیگر مختلف موضوعات سے بھی انتخاب کر کے شائع کئے جاتے رہیں گے، انشاء اللہ تعالی۔

دنیا میں کھینچ لاؤں ،فضائے بہشت کو ☆ تم میرے فکر وفن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ

میں مفتی فضل مولی صاحب، جامعہ کے استاد مولانا جہانزیب صاحب، مولانا عمر فاروق صاحب (شانگلہ سوات) اور خصوصاً محترم دوست مولانا محمد اطہر شیخوپوری صاحب کا نہایت شکر گزار اور ممنون ہوں کہ یہ حضرات اکثر معاملہ میں مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے، اللہ تعالی اس کی بہترین جزاء انہیں دنیا وآخرت میں عطا فرمائیں، نیز اسکی تیاری کے مختلف مراحل میں کسی بھی طرح شریک ہونے والے جملہ معاونین و احباب کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو ایمان، صحت اور مزاج کی مستحکم حالت میں رکھیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ناگزیر ہے کہ احقر کو اپنی مفلسئ علم اور تہی دامنئ عمل کا از خود احساس واعتراف ہے، اور ''الانسان مرکب من الخطاء والنسیان ''اس لیے اہل علم حضرات قارئین کرام سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر اس کتاب میں کہیں کوئی فروگذاشت یا کوئی اصلاحی پہلو نظر آئے تو اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے اللہ تعالی کی رضا ومحبت کی خاطر اس ناکارہ کو بذریعہ تحریر ضرور مطلع فرمائیں یا اپنے پاس بلا کر رہنمائی فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی تصحیح کی جاسکے۔

؎ صدائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

اللہ رب ذوالجلال والاکرام! اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں، طلباء کے لیے نافع بنائے، اور ہم سب کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

محمد سلیم آلف غفرلہٗ
سابق مدرس جامعہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ
اتحاد ٹاؤن کراچی نمبر ۳۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت اقدس مولانا ظہور احمد صاحب مدظلہم

استاذ الحدیث والتفسیر دار العلوم تعلیم القرآن راجہ بازار، راولپنڈی

نوٹ: حضرت اقدس مولانا ظہور احمد صاحب عمت فیوضھم ہمارے استاذ مکرم ہیں۔ آنمخدوم مدظلہم عرصہ تقریباً پندرہ سال تک جامعہ امدادیہ فیصل آباد میں استاذ حدیث رہے۔ اب عرصہ پانچ سال سے دار العلوم تعلیم القرآن راجہ بازار، راولپنڈی میں استاذ حدیث وتفسیر کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ آنمحترم معقولات ومنقولات دونوں میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ آپ کی ذات گرامی ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کی مصداق ہے، کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرت استاذ محترم دامت برکاتہم سے اپنی کتاب کے لئے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تھی جسے حضرت نے ازراہ شفقت قبول فرمالیا۔ اپنی مصروفیات میں سے قیمتی وقت نکال کر مجھ عاجز کی کتاب کے لئے ایک مبسوط مقدمہ ''مزاح کی شرعی حیثیت'' کے موضوع پر تحریر فرمایا جسے اس کتاب میں بطور دیباچہ قارئین کرام کے استفادے کے لئے شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت استاذ مدظلہم کو درازیٔ عمر کے ساتھ بعافیت دین متین کی خدمت کے لئے موفق فرمائیں۔ آمین (م۔س۔آلف غفرلہ)

اسلام دین فطرت ہے جو کسی بھی انسانی جذبے کو مٹانے یا پامال کرنے نہیں آیا بلکہ ان کا رخ موڑنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے ان جذبات تک کو بھی مکمل طور پر فنا نہیں کیا جو عرف عام میں معصیت سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت شریعت کی نظر میں بھی وہ معصیت میں داخل ہیں۔ مثال کے طور پر جھوٹ، دھوکہ، لوٹ مار اور قتل وغارت گری وغیرہ۔

دین اسلام نے ان تمام درج بالا چیزوں کو مکمل طور پر علی الاطلاق حرام اور معصیت قرار نہیں دیا بلکہ جھوٹ کی اصلاح ذات البین (لڑائی جھگڑا ختم کرنے کے لئے اصلاح احوال کی کوشش) اور متعدد دیگر مواقع پر اجازت دی ہے، حالت جنگ میں دھوکہ جائز قرار دیا، جنگ کے موقعہ پر قتل وغارت گری کو ہمارے لئے جائز قرار دیا تاہم ان کا جواز بتلائی ہوئی حدود کے اندر ہے، ان حدود وقیود سے ماورئی ان کو استعمال کرنا جائز نہیں۔

خوش طبعی اور مزاح ❶ بھی ایک فطری جذبہ ہے جو زندہ دلی اور خوش مزاجی کی علامت ہے،

---

❶ مزاح کے معنی ہیں''الانبساط مع الغیر من غیر ایذاء لہ'' یعنی کسی کے ساتھ اس طرح ہنسی کی بات کرلینا جس کا انجام اس کیلئے ایذاء نہ ہو۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مزاح میں بھی جس کا نتیجہ کینہ اور وقار کی بربادی اور کثرت ضحک اور قساوت قلب اور اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کی صورت میں برآمد ہو وہ ممنوع ہے۔

شریعت مطہرہ نے اپنے مزاج کے مطابق اس انسانی جذبے کو مکمل طور پر پامال نہیں کیا بلکہ مزاح اور خوش طبعی اگر شرعی حدود و قیود کے اندر ہو، اس میں فحش گوئی، عریانی، عبث گوئی اور جھوٹ کا عنصر شامل نہ ہو تو ایسا مزاح نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات محمود اور طاعت ہے۔

مزاح اور خوش طبعی افادہ واستفادہ کا موثر ترین وسیلہ ہے اس سے دو اجنبی طبیعتیں ایک دوسرے سے قریب ہو کر مکمل طور پر فائدہ حاصل کرتی ہیں، چنانچہ جو لوگ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور اپنے آپ میں مگن ہیں ان کے ہاں اگر مزاح اور بے تکلفی کو حقیر سمجھا جاتا ہے تو وہ خود بھی اسی قدر عامۃ الناس کے ساتھ ربط و تعلق اور باہم افادہ واستفادہ کی نعمت سے محروم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے مزاح اور خوش طبعی سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار نہیں فرمائی، کیونکہ ان نفوس قدسیہ کے پیش نظر اپنے پیروکاروں سے محبت اور استفادہ کے لئے انہیں اپنے ساتھ بے تکلف بنانے کا عظیم مقصد تھا ورنہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا رعب و دبدبہ سائلین کو اتنی جرأت ہی نہیں دلا سکتا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر کوئی سوال یا استفادہ کر سکتے، مزاح و بے تکلفی کا یہ کتنا عظیم فائدہ اور حکمت اس کی تہہ میں پوشیدہ تھی کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے دینی سوالات، استفادہ اور استرشاد کے دروازے کھل گئے جو ان کے حق میں علوم کی فراوانی اور دینی تقویت کا سبب بنے۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مزاح و خوش طبعی تفریح نفسانی کا نام نہیں بلکہ عقل کی تروتازگی اور روحانی خوشی کا نام ہے ورنہ تو حضور اکرم ﷺ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ "**کان دائم الفکرۃ حزینا**" آپ ﷺ ہمیشہ فکر آخرت کی وجہ سے غمگین اور فکر مند رہا کرتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ کے رعب و دبدبے کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جری اور بہادر صحابی مرعوب ہو کر گھٹنوں کے بل گر جاتے تھے۔ اگر مزاح نفسانی تفریح کا نام ہوتا تو حضور اکرم ﷺ اسے کبھی اختیار نہ فرماتے جبکہ روایات و واقعات سے حضور اکرم ﷺ کا مزاح کرنا ثابت ہے، بطور مشتے نمونہ از خروارے چند واقعات آپ ﷺ کے سطور ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

ان واقعات میں حضور ﷺ نے مزاح کے عملی نمونے قائم کر کے دکھلا دیئے جن میں ظرافت و خوش طبعی انتہاء درجہ کی موجود ہے مگر کوئی بات خلاف واقعہ یا شریعت مطہرہ کے معتدل و متوازن اصولوں اور حدود سے باہر نہیں۔ ان سے متوازن مزاج آدمی تفریح بھی حاصل کرتا ہے، علم و حکمت کے گہر بار موتی بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکتا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

۱) ...... ایک انصاری عورت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھی، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: جاؤ جلدی سے اپنے خاوند کے پاس جاؤ، اس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ وہ ایک دم گھبرائی ہوئی خاوند

کے پاس پہنچی، خاوند نے گھبراہٹ کی وجہ دریافت کی، اس نے جواب دیا کہ مجھے ابھی نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے کہ تمہاری آنکھوں میں سفیدی ہے، خاوند نے کہا: شریف ذات! سیاہی بھی تو موجود ہے، یہ سن کر وہ عورت متعجب بھی ہوئی اور اس بات پر اس نے فخر بھی محسوس کیا کہ مخدوم کائنات ﷺ نے اس کے ساتھ بے تکلفی کا معاملہ کیا۔ تاہم غور کیجئے کہ اس واقعہ میں کوئی بات خلاف واقعہ نہیں تھی، یہ ارشاد حقیقت سے لبریز تھا اور اس میں نشاط طبع کا سامان بھی بھرپور طور پر موجود تھا۔

۲) حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ سحری کھانے کی آخری حد یہ ہے کہ ﴿کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر.... الآیة﴾ ''کھاؤ پیو، یہاں تک کہ سفید دھاگہ کالے دھاگے سے ممتاز ہو جائے''

حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد دو دھاگے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیئے دونوں کو نکال کر دیکھتے رہتے اور کھاتے پیتے رہتے جب تک دونوں میں امتیاز ہوتا تب تک کافی روشنی پھیل چکی ہوتی، تاہم وہ اپنے زعم میں قرآن کریم پر عمل پیرا تھے۔ حضور اکرم ﷺ کو ان کے اس طرز عمل کا علم ہوا تو ان سے فرمایا:

''ان وسادتك لعریض''

''اے عدی! تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے، اس کی وسعت میں دن اور رات دونوں آ گئے''۔

اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ کالے دھاگے سے رات اور سفید دھاگے سے دن (صبح صادق) مراد ہے، دھاگے ہی مراد نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔

قارئین کرام! غور فرمائیے یہ جملہ بھرپور مزاحیہ جملہ ہے، تاہم اس میں علم وحکمت کے موتی بھی مستور ہیں اور ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو شرعی مسئلہ کی تعلیم بھی موجود ہے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ سے کسی نے پوچھا کہ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی دل لگی کر لیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں اس حال میں کہ ایمان ان کے دلوں میں مضبوط پہاڑ کی طرح جڑ پکڑے ہوئے ہوتا تھا، مطلب یہ تھا کہ اس دل لگی میں بھی کوئی بات خلاف واقعہ یا کسی حکم شرعی کے خلاف نہیں ہوتی تھی چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں باتیں کرتے، اشعار بھی سنتے سناتے، خوش طبعی بھی ہوتی لیکن جونہی درمیان میں ذکر اللہ آ جاتا تو ان کی نگاہیں فوراً بدل جاتیں اور ایسا محسوس ہوتا کہ گویا ان کے درمیان کوئی جان پہچان ہی نہیں۔

بہرحال جہاں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فکر آخرت کی وجہ سے گریہ وبکا، خوف وخشیت کے جذبات غالب رہتے، وہیں اس حدیث پر عمل کرنے کے لئے کہ ''ان لنفسك علیك حقا'' ''یعنی تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے وہ جائز خوش طبعی اور ہنسی مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔۔۔۔ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور علی المرتضی رضی اللہ عنہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح چل رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ درمیان میں تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ و فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دونوں اطراف میں تھے۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مزاحاً فرمایا:

''علیّ بیننا کالنون فی لنا''

علی رضی اللہ عنہ ہمارے درمیان اس طرح ہیں جیسے ''لنا'' کے درمیان نون (جس کی ایک طرف لام اور دوسری طرف الف ہے درمیان میں نون ہے) اس جملے سے موصوف کا مقصد باہمی اتحاد کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ جس طرح ''لنا'' میں تینوں حرف جڑے ہوئے ہیں ایسے ہی ہمارے قلوب میں بھی اتحاد و جڑاؤ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد سن کر برجستہ جو جواب دیا وہ خوش طبعی کی جان ہے۔ فرمایا:

''لو لا کنت بینکما لکنتما لا'' ''اگر میں تمہارے درمیان نہ ہوتا تو تم ''لا'' ہو جاتے۔

کیونکہ ''لنا'' کا نون نکل جانے کے بعد ''لا'' رہ جاتا ہے جس کے معنی ہے ''نہیں'' یعنی تم دونوں میرے بغیر کچھ نہیں۔

قارئین کرام! غور فرمایئے ان حضرات کا مزاح بھی کس قدر پاکیزہ، علمی وقار کا حامل اور عربیت کے محاسن سے بھرپور تھا۔

درج بالا واقعات سے اس بات کی کافی ضمانت اور شہادت فراہم ہو جاتی ہے کہ مزاح شریعت کی نظر میں ایک مقام رکھتا ہے بشرطیکہ اس میں حدود شریعت کی رعایت کی گئی ہو اس میں کسی کی دل آزاری، حوصلہ شکنی اور جذبات کی پامالی نہ کی گئی ہو ورنہ ایسا مزاح شریعت کی نظر میں مذموم اور قابل ترک ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد حضرات تابعینؒ، تبع تابعینؒ، علماء ربانیین اور حکماء نے نہ صرف مزاح و دل لگی کا لطیف استعمال جاری رکھا بلکہ اس کے واقعات و آثار کو بھی محفوظ رکھ کر آنیوالی نسلوں تک پہنچانے کی کوشش بھی کی، اس سلسلے میں ذہانت، حاضر جوابی اور لطائف کے موضوعات پر مختلف کتابیں بھی لکھی گئیں جیسے ''المستطرف فی کل فن مستظرف'' اور ''العقد الفرید'' وغیرہ۔

اسی سلسلے کی ایک قابل قدر کوشش ہمارے شاگرد رشید مفتی محمد سلیم آلف سلمہ اللہ کی تالیف کردہ کتاب ''فقہی لطائف'' بھی ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں اپنی مطالعاتی زندگی کے دوران

حاصل ہونے والی نادر، شستہ اور فقہ سے متعلق انمول معلومات کو قصداً غیر مرتب شکل میں قارئین کی دلچسپی کے لئے جمع فرمادیا ہے تاکہ ایک ہی موضوع پر کئی کئی صفحات کا مسلسل مطالعہ طبیعت پر گراں بار نہ ہو۔ کیونکہ بقول شاعر۔

دریں کتاب پریشاں نہ بینی از ترتیب ☆ عجب مداو کہ چوں حال من پریشاں است

لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب میں کسی ترتیب کو تلاش نہ کریں، ابتداء سے انتہائے کتاب منتشر مختلف ابواب وفصول سے متعلق گہر بار موتیوں سے اپنے دامن بھرتے جائیں، علم وعرفان کی نگر نگر سیر کرتے ہوئے فاضل مؤلف کے لئے دعائے خیر نہ کرنا انتہائی ناسپاسی اور احسان فراموشی ہوگی، کیونکہ انہیں کی شبانہ روز سعی مشکور کی بدولت ہم اس استفادے کے قابل ہوسکے ہیں۔

جو واقعہ جس کتاب سے لیا گیا ہے بقید صفحہ وجلد کتاب اس کا حوالہ درج کیا گیا ہے اور ''ف'' کے عنوان سے کسی جزوی واقعہ سے متعلق فائدہ ذکر کیا گیا ہے جس کے آخر میں مؤلف نے اپنے نام کی تصریح کردی ہے، اگر کہیں نام کی تصریح موجود نہیں تو وہ اکثر اوقات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہیں۔

یہ چند معروضات بندہ نے فاضل مؤلف حفظہ اللہ تعالیٰ کی درخواست پر مزاح کے موضوع سے متعلق اس تحریر میں جمع کردی ہیں، اگر کسی کو ان سے کوئی فائدہ پہنچے تو وہ حیاً اور میتاً بندہ، اس کے والدین اور جملہ اساتذہ ومشائخ کرام کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

فضل وہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

دعا گو خیر وبرکت

بندہ ظہور احمد عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

شیخ الحدیث والتفسیر

حضرت اقدس استاد محترم ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب المدنی مدظلہم

جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

محترم حضرت مولانا مفتی محمد سلیم صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ کی گرانقدر تالیف ''فقہی لطائف'' کا اجمالی مطالعہ سے بے پایاں انبساط و مسرت نصیب ہوئی۔

ماشاء اللہ حضرت مفتی صاحب نے بعض اہم فقہی مسائل کا معتمد و مستند مصادر و مراجع سے انتخاب فرما کر شستہ شگفتہ سلیس اردو زبان میں محققانہ انداز میں پورے بسط و تفصیل سے جمع فرما کر فرزندان اسلام کے لئے ایک بیش بہا علمی گلدستہ پیش فرمایا ہے جو درحقیقت اہم فقہی مسائل کا گنجینہ اور کشکول ہے۔ کتاب کے مضامین و محتویات متنوع فقہی جواہر پاروں سے معمور فرما ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کے اس وقیع علمی دینی خدمت کو شرف پذیرائی فرما کر اس مبارک تالیف سے عوام و خواص کو استفادہ کی توفیق نصیب فرمادے۔

واللّٰہ من ورآء القصد و ھو یجزی عبادہ المحسنین۔

کتبہ شیر علی شاہ کان اللہ لہٗ

خادم اہل العلم بجامعہ دار العلوم الحقانیہ اکوڑہ خٹک

۱۲/۴/۱۴۳۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت اقدس سید جاوید حسین شاہ صاحب مدظلہم
مہتمم جامعہ عبیدیہ فیصل آباد

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم أما بعد !

عزیز القدر مولانا مفتی محمد سلیم آلِف صاحب کی تالیف لطیف ''فقہی لطائف'' کا مسودہ بندہ نے مختلف جگہوں سے دیکھا۔

ماشاءاللہ خوب علمی و فقہی مواد کو موصوف نے جمع فرمایا ہے۔ کتاب بے حد دلچسپ معلومات علمیہ، فقہیہ سے بھرپور اور افادہ و استفادہ کے اعتبار سے نہایت ہی سہل و آسان ہے بعض جگہوں پر کمپوزنگ کی خامیاں سامنے آگئیں، جنکی بندہ نے نشاندہی کر دی ہے۔

دل سے دعا گو ہوں، اللہ پاک! حضرت مفتی صاحب کی اس علمی و تصنیفی کاوش کو قبول فرمائیں اور اسکو دونوں جہانوں میں ہم سب کے لئے سرخروئی اور سعادتوں کا ذریعہ بنائیں۔

آمین

جاوید حسین عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ
سابق رفیق مؤتمر المصنفین واستاد دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک / پرنسپل حضرت
ابو ہریرہ جی ٹرسٹ خالق آباد، نوشہرہ، صوبہ سرحد

الحمد لحضرة الجلالة والصلوة والسلام على خاتم الرسالة:

ثمرات الفقہ یعنی "فقہی لطائف" کا اصل مسودہ میرے سامنے ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد سلیم آلف صاحب کی محنت مطالعہ اور ذوق علم کا مبارک ثمرہ ہے جگہ جگہ سے پڑھا، ہر جگہ دلچسپ، ہر عنوان حیرت انگیز اور ہر واقعہ دلآویز ہے جہاں نظر پڑی، دل نے چاہا، پڑھتے ہی چلے جائے۔

یہ دور، میڈیا کا دور ہے، عریانی وفحاشی اور لادینی مشن پر کام ہورہا ہے، پرنٹ میڈیا بھی عریاں اور مغرب زدہ ہوگیا ہے، ایسے حالات میں مفتی محمد سلیم صاحب کی یہ علمی، تحقیقی، تاریخی اور فقہی کاوش، اور وہ بھی لطائف اور فقہی لطائف پر مشتمل ایک عظیم فکری، علمی اور قلمی جہاد ہے۔

مرداں چنیں مے کنند

موصوف، قلمی میدان میں نو وارد ہیں، اور فقہی لطائف انکی پہلی قلمی کاوش ہے جب آغاز کار اتنا عمدہ ہے تو رفتار کار اور انجام کار یقیناً تابناک ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ موصوف کی دوسری قلمی کاوش، اس کے بعد تیسری اور چوتھی اور مزید کاوشیں، تاریخی، ادبی اور تابندہ نقوش ہوں گے۔ نقش اول ہی روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ کریم، موصوف کی مساعی کو قبول فرمادے، علمی ترقی اور مزید عظمتوں سے سرفراز فرمادے۔

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله وصحبه اجمعين

عبدالقیوم حقانی

بسم الله الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا مفتی فضل مولی صاحب مد ظلہم

(سابق رفیق شعبۂ تدریس والافتاء والتصنیف جامعہ فاروقیہ کراچی)

الحمد للّٰہ و کفی و الصلوۃ و السلام علی نبیہ الأ علی امابعد!

سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں؟ لکھے تو وہی جس کو لکھنے کا کچھ ڈھنگ آتا ہو، لیکن کیا کیا جائے، برادرم محترم حضرت مفتی محمد سلیم آلف صاحب کا اصرار اور حکم ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے، اس لیے کردم و نہ کردم کے ملے جلے امتزاج کے ساتھ قلم اٹھا کر قلبی اضطراب کے باوجود موصوف محترم کی کتاب ''فقہی لطائف'' سے متعلق چند سطریں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بھی کام کرتا ہے، اس کام کے اندر اگر تنوع اور تجدد ہو تو اس کام کے انجام دینے میں ایک طبعی سرور سا محسوس ہوتا ہے، ہو بہو اسی طرح علمی اور دینی مطالعہ کا معاملہ بھی ہے۔ اگر موضوع بالکل خشک ہو تو اس سے فطری طور پر انسان کو طبعی ضیق سا محسوس ہوتا ہے، اور اگر موضوع بالکل ہی آزادانہ اور ہر پہلو سے مزاحیہ ہو تو بھی اسکا وقار جاتا رہتا ہے، لہذا ہونا اسطرح چاہیے کہ موضوع نہ تو اتنا خشک ہو کہ پڑھنے والے کو اس سے وحشت محسوس ہو کر ذوقِ مطالعہ ہی ختم ہو اور نہ اس طرح مزاحیہ ہو (حدود سے متجاوز ہو) کہ دینی مطالعہ کا ذوق ختم ہو کر فحش ڈائجسٹوں کی طرف رخ بدل جائے۔ محترم موصوف نے آخر الذکر نوعیت کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو، انشاء اللہ تعالیٰ مقبول عام و خاص ہوگا۔

ذوقِ مطالعہ جس تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ رہا ہو، کہا جا سکتا ہے کہ چند ہی سالوں میں یہ ذوق اگر سو فیصد تک نہ پہنچے تو نوے، پچانوے فی صد تک تو ضرور پہنچے گا، لیکن بدقسمتی سے معاشرے میں فحش ڈائجسٹوں اور بے فائدہ ناولوں کے مطالعہ کی ایک بہت بڑی وباء عام ہوتی جارہی ہے، ان حالات میں اہلِ تصنیف وتالیف کی ذمہ داریاں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے ان حضرات کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان ڈائجسٹوں اور ناولوں کی روک تھام کی طرف توجہ دیں اور تصنیف کے میدان میں تصنع اور تنوع سے کام لے کر ان ڈائجسٹوں اور ناولوں کو بے فائدہ، مضر اور بے وقعت ثابت کردیں۔ برادرم محترم مفتی محمد سلیم آلف صاحب کی پیش خدمت کاوش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

راقم الحروف کا تعلق چونکہ جامعہ فاروقیہ کے شعبۂ تدریس اور شعبۂ تصنیف وتالیف سے رہا ہے۔ جامعہ فاروقیہ میں درسِ نظامی اور تخصص فی الفقہ سے فراغت کے بعد منتظمین جامعہ نے ''فتاویٰ محمودیہ'' کی ترتیب وتبویب اور تحقیق وتعلیق کی غرض سے بندہ کے تقرر کا فیصلہ کیا۔ تین سال کے عرصہ میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل واحسان سے

وہ کام بھی مکمل ہوا اور اس کے علاوہ دوسرے حضرات علماء کرام کی کتابوں پر بھی ساتھ ساتھ کام کرتا رہا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ بندہ کا تعلق تصنیف وتالیف کے شعبہ سے رہا ہے اس وجہ سے محترم موصوف نے ایک دن تصنیف وتالیف کے جذبہ کا اظہار کیا، اس پر راقم الحروف نے اس کی تائید کی، اور کچھ حسب حیثیت حوصلہ افزائی کی، اور ساتھ ہی کچھ کام کئے جانے اور مقبولیت کے حامل موضوعات کی طرف نشاندہی کی، جن میں سے ایک موضوع یہ بھی ہے جو ناظرین کے پیش خدمت ہے۔

دراصل موصوف نے یہ کتاب، علم فقہ کے طلباء کی تنشیط اذہان کے لیے تحریر فرمائی ہے تا کہ ان کے اندر فقہی ذوق اور علمی شوق کا جذبہ پیدا ہو، لیکن اپنی افادیت کے لحاظ سے یہ کتاب عوام وخواص سب کے لیے یکساں اہمیت رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ فقہی لطائف پر یہ کتاب اپنے قاری کو بھرپور معلومات فراہم کرتی ہے، کتاب کے انداز بیاں کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ فقہی مسائل یادداشت کی گرفت میں آسانی کے ساتھ آجاتے ہیں۔

آپ کو اس کتاب میں لطافت کی چاشنی بھی ملے گی اور سنجیدہ ظرافت بھی، عقل ودانائی کی باتیں بھی ملیں گی اور ذہانت کے قصے اور وعظ ونصیحت بھی، حاضر جوابی اور برجستگی بھی، خوش گوئیاں اور نکتہ رسی بھی، مضامین مسائل بھی ملیں گی اور مضامین فضائل بھی۔

بالفاظ دیگر قارئین کی تمام تر علمی اور شرعی دلچسپی کا سامان اس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس لیے مستفیدین اگر بنظر غائر مطالعہ کریں گے تو ان پر واضح ہوگا کہ یہ کوئی مروجہ قسم کے لطیفوں اور ہنسنے ہنسانے کے عامیانہ قصوں ،کہانیوں کا کوئی گول گپا نہیں بلکہ "فقہی مسائل" کا ایک خزانہ ہے۔

محترم مفتی آلف صاحب نے اس موضوع کو بہت ہی اچھے انداز اور صحیح معنوں میں لیکر بہت اچھی طرح سے اسکی خدمت کی، اس موضوع سے متعلق، اگرچہ دوسرے حضرات علماء کرام کی تالیفات بھی ہیں، لیکن زیر نظر کتاب "فقہی لطائف" بھی اس قابل ہے کہ اس کو ہر طرح سے سراہا جائے۔

اللہ جل شانہٗ سے دعا ہے کہ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں مقبول فرمائیں اور اس کو مقبول عام وخاص بنائے۔ آمین

وللہ تعالیٰ الحمد اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً

والصلوۃ والسلام علی نبیہ خیر الانام وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

کتبہٗ

فضل مولیٰ غفرلہٗ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

تأثرات

محترم جناب افتخار علی صحرائی صاحب مدظلہم

(شاعر وادیب)

محترم مفتی محمد سلیم آلفؔ کی تالیف ''فقہی لطائف'' میرے سامنے ہے پڑھتا گیا اور پھر چند لمحے بعد، میں اس کی گرفت میں تھا۔ چھوٹے چھوٹے لطیف ''فقہی مسائل'' کا یہ پیکج اعلیٰ بصیرت وپختگیٔ ایمان کے لئے حرارت افروز نسخہ ہے، جس نے پہلی ہی خواندگی میں خود کو منوالیا۔

جیسے جیسے پڑھتا گیا، اپنی علمی کم مائیگی اور صاحب تالیف کی علمی گرفت و گہرائی کا احساس بڑھتا گیا۔ یہ کتاب پڑھ کر شوقِ ادب اور ذوقِ بصیرت کو جلا ملتی ہے۔

اگر چہ یہ کتاب فقہی مسائل پر مشتمل ہے جو کہ لطیف انداز میں پیش کی گئیں ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ علماء وفقہاء حضرات کے علاوہ ایک عام آدمی کے مطالعے کے لئے بھی نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوگا بلکہ آخرت کے سنوارنے کا بھی ذریعہ بنے گا۔ (انشاءاللہ العزیز)

طالب دعا

افتخار علی صحرائی

امام المسلمین ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

لقد زان البلاد و من عليهاامام المسلمين أبو حنيفة بآثارو فقه في حديث، كآ ثار الزبور على الصحيفة فما في المشرقين له نظير و لا بالمغربين ولا بكوفة.

ترجمہ......امام المسلمین امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے شہروں کوزینت بخشی اور شہروں میں زندگی گزارنے والے لوگوں پر احسان کیا۔یعنی آثار کی ترویج،فقہ کی دلنشین تشریح فرمائی جیسا کہ صحیفہ میں زبور کی آیات جڑی ہوئی ہوں۔ چنانچہ ان کمالات کی وجہ سے نہ تو مشرق میں اسکی مثال ملتی ہے اور نہ مغرب و کوفہ میں ان کی نظیر پائی جاتی ہے۔

(امیر المؤمنین فی الحدیث امام عبداللہ بن مبارکؒ)

بسم اللہ کے احکام

۱)......جانور ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا فرض ہے اگرچہ پوری پڑھنا فرض نہیں۔

۲)......بیرون نماز کسی سورت کے شروع سے،تلاوت کی ابتداء کے وقت،وضو کے شروع میں،نماز کی ہر رکعت کے اول میں اور ہر اہم کام جیسے کھانے پینے اور لکھنے پڑھنے کے وقت اور ہمبستری وغیرہ کے شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنا سنت ہے۔

۳)......خارج نماز درمیان سورت سے تلاوت کی ابتداء کے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا مستحب ہے اور سورۃ توبہ کے درمیان سے پڑھتے وقت کا بھی یہی حکم ہے۔

۴)......اٹھنے،بیٹھنے کے وقت،اور نماز میں سورۃ فاتحہ اور سورت کے درمیان ''بسم اللہ'' پڑھنا جائز اور مستحب ہے۔

۵) شراب پینے،زنا کرنے،چوری کرنے،جوا کھیلنے کے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا کفر ہے جبکہ حرام قطعی کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کو حلال سمجھے۔

۶)......حرام قطعی کرنے اور چوری وغیرہ کا ناجائز مال استعمال کرنے کے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا حرام ہے جبکہ پڑھنے کو حلال نہ سمجھے۔اسی طرح حائضہ عورت سے ہمبستری کرتے وقت بھی پڑھنا حرام ہے اور وہ شخص کہ جس پر غسل فرض ہے اسے تلاوت کی نیت سے ''بسم اللہ'' پڑھنا حرام ہے البتہ اسے ذکر و دعا کی

نیت سے پڑھنا جائز ہے۔

۷) سورۂ براءت کے شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنا مکروہ ہے جبکہ سورۂ انفال سے ملا کر پڑھے، اسی طرح حقہ، بیڑی، سگریٹ پینے، پان، نسوار اور لہسن، پیاز جیسی چیز کھانے کے وقت اور نجاست کی جگہوں میں ''بسم اللہ'' پڑھنا مکروہ ہے۔ اور شرمگاہ کھولنے کے بعد بھی پڑھنا مکروہ ہے۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح صفحہ عالمگیری، حاشیہ ابن عابدین)

مزاح اور مسخریہ میں فرق

عربی میں لفظ مزاح کا اطلاق اس خوش طبعی اور مذاق پر ہوتا ہے جس میں کسی کی دل شکنی اور ایذاء کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اس کے برعکس جس خوش طبعی اور مذاق کا تعلق دل شکنی اور ایذاء رسانی سے ہو اس کو مسخریہ کہتے ہیں اور یہ مسخراپن ناجائز ہے۔

علماء کرام لکھتے ہیں کہ وہ مزاح اور ظرافت ممنوع ہے جس میں حد سے تجاوز کیا جائے اور اسی کو عادت بنالیا جائے۔ کیونکہ ہر وقت مزاح اور ظرافت میں مبتلا رہنا بہت زیادہ ہنسنے اور قہقہہ لگانے کا باعث ہوتا ہے اور یہ قلب وذہن کو قساوت اور بے حسی میں مبتلا کر دیتا ہے اور ذکر الٰہی سے غافل کر دیتا ہے۔ (شاہراہ سنت ۱۸۹)

ائمہ احناف ؒ کی فقہی خدمات، ایک دلچسپ تمثیل وتشریح

وقد قالوا: "الفقه زرعه عبدالله بن مسعود رضي الله عنه وسقاه علقمه وحصده ابراهيم النخعي وداسه حماد وطحنه ابو حنيفه رحمه الله وعجنه ابو يوسف وخبزه محمد وسائر الناس ياكلون" (درمختار ۴/۱)

ترجمہ: فقہاء کہتے ہیں کہ فقہ کا کھیت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بویا، حضرت علقمہ نے اس کو سینچا، ابراہیم نخعی نے اس کو کاٹا، حماد نے اس کو مانڈا (یعنی بھوسہ سے اناج جدا کیا) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پیسا، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو گوندھا، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی روٹیاں پکائیں، اور باقی سب اس کے کھانے والے ہیں۔

تشریح: ...... اس کی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اجتہاد واستنباط احکام کے طریقے کو فروغ بخشا اور حضرت علقمہ نے اس کی تائید وترویج کی ابراہیم نخعی نے اس کے فوائد متفرقہ جمع کیے اور علم فقہ کی تدریجی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ امام الائمہ سراج الامۃ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کمال تک پہنچا کر باقاعدہ اس کی تدوین کی، ابواب میں مرتب کیا اور دیگر ائمہ نے اپنی اپنی کتابوں میں آپ کی پیروی کی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی روایات اجتہادات اور مسائل کو جمع کر کے فروع کی

تنقیح کی اور آپ کے مرجوعات و بیان کیا اور فقہ کو اصول فروعات اور جزئیات کے ساتھ مدون کیا، عظیم تصنیفات لکھ کرامت محمدیہ کے حضور پیش کیں۔

ائمہ احناف کی فقہی ڈگریاں

امام مزنیؒ سے کسی نے اہل عراق کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا: **سیدُھم** (ان کے سردار)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا: **اتبعھم للحدیث** (ان میں سب سے زیادہ حدیث کے پیرو)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا: **اکثرھم تفریعاً** (سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والا)

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا: **احدّھم قیاساً** (سب سے زیادہ قیاس میں تیز)

(تاریخ بغداد و حسن التقاضی: صفحہ ۲۹)

کہاں جارہے ہو؟

وہ ایک روز کسی کام سے بازار جارہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات شعبیؒ سے ہوگئی۔ ان کی شکل وصورت دیکھ کر وہ سمجھے کہ یہ کوئی طالب علم ہے.... چنانچہ حضرت شعبیؒ نے انہیں اپنے پاس بلایا اور پوچھنے لگے:

''اے نوجوان! کہاں جارہے ہو؟''

''میں ایک تاجر کے پاس جارہا ہوں۔''

ان کی بات سن کر حضرت شعبیؒ نے کہا:

''میرا مطلب ہے.... تم کس سے پڑھتے ہو؟''

یہ سن کر آپ شرمندہ ہوئے اور بولے:

''میں کسی سے بھی نہیں پڑھتا۔''

اس پر حضرت شعبیؒ فرمانے لگے:

''تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو، مجھے تمہارے اندر قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں۔''

یہ نوجوان امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تھے... وہ کہتے ہیں:

''امام شعبیؒ کی یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی اور میں بازار چھوڑ کر صرف علم کا ہو کر رہ گیا۔''

(عقود الجمان، باب سادس)

بڑے فقیہ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو 56 کروڑ روپیہ خزانے میں موجود تھا۔ کوفے میں جتنے غریب، بیوائیں اور یتیم تھے، امام صاحب کے ہاں ان کی فہرستیں بنی ہوئی تھیں، غریبوں کے ہر گھر کے لئے رمضان میں کپڑے تیار ہوتے تھے۔ بڑے آدمی کے بڑے کپڑے، چھوٹے کے چھوٹے، عورتوں کے لئے ان کے مناسب اور ہر عید کی صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے پہنچ جاتے تھے۔ غریب کہتے تھے:

''امام صاحب سلامت رہیں، جیسی عید امیروں کی، ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے''۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ بڑے بڑے علماء اور آئمہ کی ایک کمیٹی بیٹھتی، ایک ایک مسئلے پر کئی کئی ہفتہ بحث ہوتی تھی۔ جب خوب بحث کرنے کے بعد ایک مسئلہ صحیح طور پر واضح ہو جاتا تھا، تب وہ لکھا جاتا۔ اس طرح کئی جلدوں میں فقہ حنفی مرتب ہوا، یہ جو پچاس علماء کی کمیٹی تھی، ان سب کو تنخواہیں امام صاحب اپنے خزانے سے دیتے تھے۔

اس کے علاوہ ہزاروں آدمی امام صاحب سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے۔ ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں، امام صاحب سے ایک شخص نے 20 ہزار روپیہ قرض لیا اور مدت متعین کر دی کہ ایک سال میں ادا کروں گا۔ مدت گزر گئی، اس کے پاس دینے کو نہ ہوا یا بخل کیا، نہیں دیا۔ جب وقت گزر گیا اور نہ ادا کیا تو وہ امام صاحب سے کترانے لگا کہ سامنے آؤں گا تو شرمندگی ہوگی۔ ایک بار اس نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آ رہے ہیں تو ایک گلی میں گھس گیا تاکہ سامنا نہ ہو ورنہ مجھے شرمندہ کریں گے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی گلی میں جا گھسے اور جا کر پیچھے سے دامن پکڑ لیا اور کہا:

''بھائی! تو نے تعلقات کیوں خراب کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے، وہ دینے کے لئے نہیں ہیں۔ اس لئے شرمندہ نہ ہو، میں نے تمہیں معاف کیا''۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بے شمار لوگوں کو اسی طرح قرضے معاف کیے۔ (مختصر پُر اثر ۶۳)

مسجد میں قوالی

ایک شخص نے حیدر آباد کے مشہور بزرگ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب قدس اللہ

سرہ کو لکھا:

''میں قوالی کا ایک پروگرام کرانا چاہتا ہوں، قوالوں اور انتظامات پر جو خرچ ہوگا، وہ میں ادا کروں گا، آپ بس حیدرآباد کے کسی اچھے سے ہال میں فلاں تاریخ کی بکنگ کرادیں۔''

جواب میں ڈاکٹر صاحب نے جو لکھا، اس کی تحریر کچھ یوں تھی:

''جگہ کے لئے ہال وغیرہ کی کیا ضرورت ہے، ماشاء اللہ گھر کے سامنے مسجد ہے، یہیں قوالی کا پروگرام رکھ لیتے ہیں اور یوں ہال کی بکنگ پر خرچ ہونے والی رقم بھی بچ جائے گی۔''

جب اس شخص کو یہ جواب موصول ہوا تو وہ فوراً ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا:

''یہ آپ نے کس قسم کا جواب لکھا تھا، ایسے جواب کی توقع مجھے آپ سے نہ تھی، مسجد میں بھلا کیسے قوالی ہوسکتی ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

''مجھے معلوم تھا، آپ فوراً دوڑے چلے آئیں گے، آپ کے پریشان ہوکر میرے پاس آنے میں ہی وہ بات موجود ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں، بھائی! جو کام مسجد میں کرنا مناسب نہیں، وہ بھلا مسجد کے باہر کس طرح مناسب ہوسکتا ہے۔ (مختصر پُراثر:۶۹)

روزہ نہ ٹوٹنے کا نسخہ

ایک وکیل نے رمضان کے دنوں میں شاہ جی سے بزعم خویش مذاق کرتے ہوئے کہا، حضرت! علماء تعبیر و تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمایئے کہ آدمی کھاتا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔ فرمایا: سہل ہے قلم و کاغذ لیکر لکھو، ایسا مرد چاہئے جو اس وکیل کو صبح صادق سے مغرب تک جوتے مارتا رہے یہ جوتے کھاتے جائیں اور غصے کو پیتے جائیں۔ اس طرح کھاتے جائیں اور پیتے جائیں۔ فرمایا: جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو، روزہ بھی نہ ٹوٹے گا۔ (خزینہ:۲۷۱)

تیمّم کیا، وہ بھی وضو جیسا

ایک بڑے لیڈر کی حکایت ہے وہ سفر میں تھے پانی ملا نہیں، تیمّم کا ارادہ کیا۔ مگر کبھی کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں تھا۔ اجتہاد شروع کیا۔ تقدم تو اس جماعت کے لوازم سے ہے ہر بات میں سب سے پہلے ٹانگ اڑاتے ہیں۔ آپ نے کیا کیا کہ مٹی لیکر پہلے ہاتھ کو ملی پھر چلّو میں مٹی لیکر منہ میں دی غرض وضو کی طرح تیمّم کیا۔

ف: افسوس ہے کہ ان لوگوں کو دین کی تو خبر نہیں اور پھر لیڈران قوم بنے ہیں۔

طلاق کی عجیب قسم

قاضی ابوبکر ابن عربیؒ نقل فرماتے ہیں کہ: جس زمانہ میں منصور بغداد کا خلیفہ تھا، موسیٰ ابن عیسیٰ ہاشمی نام کے ایک شخص نے اپنی بیوی کو فرطِ محبت میں یہ کہہ دیا کہ: اگر تم چاند سے زیادہ حسین نہ ہو تو تمہیں تین طلاق۔ بیوی سخت پریشان ہوئی، اور سمجھی کہ طلاق واقع ہوگئی ہے اس لیے شوہر کے سامنے آنا بھی بند کردیا۔ شوہر نے یہ الفاظ فرطِ محبت سے کہہ دیے تھے مگر جب ہوش آیا تو اسے بھی فکر ہوئی اور اس کی ساری رات بڑے اضطراب میں گذری، بڑی مشکل سے صبح ہوئی تو، وہ خلیفہ منصور کے پاس پہنچا اور واقعہ بتلایا۔ منصور نے فوراً شہر کے بڑے بڑے علماء وفقہاء کو جمع کر کے مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ اکثر فقہاء کی رائے یہ ہو رہی تھی کہ طلاق واقع ہوگئی ہے اس لیے اس کی بیوی فی الواقعہ چاند سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔

لیکن ایک فقیہ تھے جنہوں نے یہ رائے پیش کی کہ طلاق واقع نہیں ہوئی، ان سے وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ وجہ یہ ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (ترجمہ: بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین قوام کیساتھ پیدا کیا ہے۔)

منصور نے اس جواب کو بے حد پسند کیا، اور موسیٰ بن عیسیٰ کو یہی کہلا کر بھیج دیا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ (حیاۃ الحیوان للدمیری: ۳۲/۱ لفظ انسان)

سیب کے دو ٹکڑے کر دیئے تو استفتاء کا جواب ہو گیا

ایک مرتبہ کوئی عورت مسجد میں آئی امام ابوحنیفہ اپنے حلقۂ تلامذہ میں تشریف فرما تھے۔ عورت نے ایک سیب جسکا رنگ سرخ تھا اور نصف زرد۔ امام ابوحنیفہ کے سامنے چپکے سے رکھ دیا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے سیب کو درمیان سے کاٹ کر دو ٹکڑے کردیا اور عورت کے حوالے کردیا، عورت اسے لیکر چلی گئی۔ یہ ایک معمہ تھا جس پر حاضرین متعجب تھے حاضرین کی دریافت واصرار پر امام ابوحنیفہ نے یہ معمہ حل کرتے ہوئے فرمایا کہ اس عورت کو حیض کا خون کبھی سرخ اور کبھی زرد آتا تھا، تو اس نے سیب کے ذریعے اپنی حقیقت حال بیان کردی اور طہر کا حکم دریافت کیا تو میں نے سیب کاٹ کر یہ مسئلہ واضح کردیا کہ جب تک سیب کی اندرونی سفیدی کی طرح پانی سفید نہ آئے طہر نہیں ہوتا۔ (روض الفائق، حدائق الحنفیہ: ۲۹)

اپنی نماز پوری کرلو، میں مسافر ہوں

مسائل سے ناواقفیت سے کیسے کیسے مفسدات ہوتے ہیں۔ مراد آباد میں ایک مسافر امام نے دو رکعت پر سلام پھیر کر مقتدیوں سے کہا، اپنی نماز پوری کرلو، میں مسافر ہوں۔ تو مقیمین میں سے ایک صاحب، نماز کے اندر ہی سے کہتے ہیں، ہاں جناب! کیا فرمایا؟ انہوں نے کہا میں نے تو جو کچھ فرمایا تھا، بعد میں بتلاؤں گا۔ آپ پہلے اپنی نماز کا اعادہ کرلیں۔ (حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے پسندیدہ واقعات)

عربی میں بات کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے

اسی طرح ایک مولوی صاحب ساڈھورہ میں تھے۔ جب وہ طالبعلمی کرتے تھے تو وہ ایک نماز میں کسی امام کے پیچھے شریک ہوئے۔ امام غلطی سے تیسری رکعت میں بیٹھ گیا، تو آپ پیچھے فرماتے ہیں کہ "قم" یعنی کھڑے ہو جاؤ امام کو یاد آ گیا، تیسری رکعت ہے وہ کھڑے ہو گئے سلام کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ قم کہنے والے کون صاحب تھے؟ وہ اپنی نماز کا اعادہ کر لیں۔ تو آپ فرماتے ہے کیوں میں نے عربی میں کہا تھا امام نے کہا سبحان اللہ! پھر تو اہل عرب کی نماز باطل نہیں ہونی چاہیے خواہ کچھ ہی باتیں کرتے رہیں کہ وہ اردو میں تھوڑی باتیں کرتے ہیں۔ تو یہ طالبعلم سمجھے ہوئے تھے کہ اردو فارسی میں باتیں کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، عربی میں باتیں کرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ (ایضا)

ممبئ حج کا محل نہیں

بعضے لوگ جمعہ کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ دیہات میں گو نہ ہو لیکن اگر پڑھ ہی لیا جائے تو نہ پڑھنے سے تو بہر صورت پڑھنا اچھا ہے، میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ ممبئ میں گو حج نہیں ہوتا لیکن اگر پھر بھی کر لیا جائے تو کیا حرج ہے نہ کرنے سے تو اچھا ہی ہے اس کا کیا جواب ہے؟ آخر یہی کہو گے کہ ممبئ حج کا محل نہیں۔ میں کہوں گا کہ دیہات جمعہ کا محل نہیں۔ غرض! فہم دینی کیلئے عقل کامل کی ضرورت ہے۔ (ایضا)

میرے پاس کنسیشن ہے

حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ سفر میں جانیوالے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ یہیں جماعت کر لیں۔ ایک حکیم صاحب بھی تھے، وہ مسافر تھے، ان سے کہا گیا کہ آپ بھی جماعت میں شریک ہو جائیں انہیں نے کہا کہ میں نہیں شریک ہوتا، میرے پاس کنسیشن ہے (یعنی مجھ پر قصر ہے) تو اسے کیوں ضائع کروں، جب زیادہ کہا، تو وہ شریک ہو گئے۔ قاری صاحب نے نماز کے بعد فرمایا کہ شائد مجھ سے موزوں پر مسح رہ گیا۔ جماعت دوبارہ ہوئی تو حکیم صاحب نے کہا کہ دو کی جگہ چار ہوئیں اور چار کی جگہ آٹھ ہوئیں۔ اب پڑھوالوں سنتیں کس سے پڑھواؤ۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف:۸۸)

طلاق کا ایک دلچسپ مقدمہ

ایک عورت نے اپنے شوہر کے خلاف قاضی کی کچہری میں یہ مقدمہ پیش کیا کہ میرا شوہر رات بستر پر پیشاب کر دیتا ہے۔ اس لئے مجھے اس سے طلاق دلا دی جائے۔ قاضی صاحب نے شوہر سے بیان دینے کی فرمائش کی۔ تو اس نے کہا کہ عزت مآب کیا کروں؟ میں ہر رات یہی خواب دیکھتا

ہوں کہ میں سمندر کے ایک جزیرہ میں ہوں اور اس میں ایک بہت ہی اونچا محل بنا ہوا ہے۔ اور محل کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے اور اس گنبد پر ایک اونٹ ہے اور میں
اس اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہوں اور ایک دم وہ اونٹ سمندر کا پانی پینے کے لئے اپنا سر جھکانے لگتا ہے، یہ دیکھ کر مجھ پر ایسا خوف طاری ہو جاتا ہے کہ مارے ڈر کے میرا پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ شوہر کا بیان سن کر قاضی صاحب نے عورت سے فرمایا کہ اے اللہ کی بندی! تو اپنے شوہر کو معذور سمجھ کر معاف کر دے اور صبر کر۔ جب اس کی بات سن کر میرا پیشاب خطا ہو گیا تو یہ منظر دیکھ کر اس کا پیشاب کیوں کر رک سکتا ہے؟

جھوٹ کا پہاڑا

حضرت مفتی محمود گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دارالافتاء میں حضرت مہتمم صاحبؒ (قاری محمد طیب صاحب) تشریف لائے، ان کو جھوٹ کا پہاڑا سنایا، بہت پسند کیا اور لکھ کر گھر لے گئے کہ وہاں سناؤں گا۔ وہ یہ ہے۔

جھوٹ اکم جھوٹ	☆	جھوٹ دونی مبالغہ
جھوٹ تیا بہانہ	☆	جھوٹ چوک دھوکا
جھوٹ پنجے سفید جھوٹ	☆	جھوٹ چھکے تہمت
جھوٹ ستے بہتان	☆	جھوٹ اٹھے غدر
جھوٹ نمے نفاق	☆	جھوٹ دھامے کفر

(اکابرین کے پاکیزہ لطائف)

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی

ایک شخص دودھ میں اسی کے بقدر پانی ملا کر بیچتا تھا، ایک روز دودھ بیچ کر آ رہا تھا، روپوں کو اپنی لنگی میں باندھ کر رکھا تھا۔ درخت کے نیچے ان کو رکھ کر قضاء حاجت کے لئے چلا گیا۔ بندر جو پہلے سے درخت پر تھا، نیچے اترا، اور لنگی روپوں کی اٹھا کر درخت پر چڑھ گیا۔ یہ آیا اور ماجرا دیکھا، تو کوشش کی کہ بندر سے روپے حاصل کر لے، مگر وہ اس کے ہاتھ نہ آیا، مجبوراً بیٹھا رہا، اتفاق سے درخت کے نیچے کنواں تھا، اب بندر نے روپوں کی گرہ کو دانت سے پھاڑا، اور اس میں سے ایک روپیہ کنویں میں اور ایک اس کی طرف پھینکنا شروع کیا، یہاں تک کہ آدھے روپے کنویں میں گئے اور آدھے اس کے پاس پہنچے، تب اس نے کہا ''دودھ کا دودھ، پانی کا پانی'' یعنی جو دودھ کے پیسے تھے وہ مجھے مل گئے اور جو پانی کے پیسے تھے وہ پانی میں چلے گئے۔

ف: دودھ میں اسی طرح پانی ملا کر بیچنا کہ خریدار یہ سمجھے کہ خالص دودھ ہے، دھوکہ ہے

جو ممنوع ہے۔ ہاں خریدار کو بتلا دیا جائے کہ اس دودھ میں پانی ملایا گیا ہے، تو گنجائش ہے۔

غیر مسلم کے لئے ایصال ثواب کی صورت

عرض: غیر مسلم صدر جمہوریہ کے مرنے پر لوگ تعزیت کے لئے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایصال ثواب کے لئے کچھ پڑھنا بھی ہے اور مجھے پڑھنے کے لئے تجویز کیا ہے، اب میں کیا کروں؟ ان سے تعلق تھا، مجبوراً جانا ہے۔

مفتی محمود گنگوہیؒ کا ارشاد: ''آپ جائیے اور پڑھتے رہیے''

﴿وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرا ...... الخ﴾

ان کو کیا معلوم، اس کا ترجمہ کیا ہے؟ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف ۸۰)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون رشید کے خلاف فیصلہ دیا

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فیصلہ ہارون رشید کے خلاف بھی دیا تھا مگر اس میں ان سے ذرا سی غلطی ہو گئی تھی جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بوڑھے نے ہارون رشید کے خلاف یہ دعویٰ دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون رشید فیصلے کے لیے بیٹھا تھا۔ قاضی ابو یوسفؒ فریقین کے بیانات اور ان کے دعوے ہارون رشید کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ جب مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ آپ کے و پر دعویٰ ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے، بڈھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسفؒ نے پوچھا بڑے میاں آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المومنین نے ناحق قبضہ کر لیا ہے جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا، اس وقت وہ باغ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے؟ بولا امیر المومنین کے ذاتی قبضہ میں ہے، اب قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون رشید سے مخاطب ہو کر کہا دعویٰ کے جواب میں آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں! ہارون رشید نے کہا میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے۔ قاضی صاحب نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعوے کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے؟ کہا ہاں! خود امیر المومنین سے قسم لے لی جائے، ہارون رشید نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں، بوڑھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے، اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھا لی ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہارون رشید کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ یحییٰ برمکیؒ نے ہارون کو خوش کرنے کے لئے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر کہا آپ نے

دیکھا اس عدل واحسان کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے؟ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تحسین کی اور کہا مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

مذکورہ بالا معاملہ میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے انصاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آجاتا تو فرماتے تھے میں اپنے اندر سخت کوفت، اذیت، رنج محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا، لوگوں نے پوچھا آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی اور آپ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا؟ فرمایا تم لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون رشید سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائیے یا پھر اجازت دیجئے کہ اس کے لئے بھی کرسی لائی جائے۔ (مناقب ۲/ ۲۴۴ تذکرہ امام ابو یوسفؒ وسیر الصحابہ ۸/ ۸۰)

شوافع پر واجب ہے

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ان شفقتوں، عنایات، توجہات اور خصوصی تعاون وتعلقات اور احسانات کی بناء پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"ليس لأحد علی منة في العلم وأسباب الدنيا لمحمد"

ترجمہ: "علم اور دنیاوی اسباب کے سلسلہ میں مجھ پر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا جتنا احسان ہے اتنا کسی دوسرے کا نہیں"

انہی احسانات اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی تربیت کے پیش نظر ابن عبدالبرؒ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت تک کے لئے ہر شافعی المسلک پر واجب ہے کہ وہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ممنون رہے اور انکی مغفرت کی دعا کرتا رہے۔ (شذرات الذهب جلد۲)

عمامہ نمازوں کیلئے

حضرت کشمیریؒ نے ایک وعظ میں فرمایا کہ عمامہ تین ذراع (۱۱/۲ گز عرفی) عام استعمال کے لئے، سات ذراع نمازوں کے لئے اور 12 ذراع کا جمعہ عیدین اور وفود کے لئے ماثور ہے، اس کو علامہ جزری نے امام نووی سے نقل کیا اور فرمایا کہ میں نے اسی طرح انکے دستخط سے یہ عبارت دیکھی ہے اور لکھا کہ میں عرصہ تک اس تلاش میں رہا کہ عمامہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معلوم ہو۔ (ملفوظات محدث کشمیریؒ ص ۸۱)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عقل کامل تھی

علی بن عاصم کا قول ہے کہ آدھی دنیا کی عقل ترازو کے ایک پلہ میں اور امام ابوحنیفہ کی عقل دوسرے

پلہ میں رکھی جاتی تو امام صاحب کا پلہ بھاری ہوتا۔

خارجہ بن مصعب کا قول ہے کہ میں کم وبیش ایک ہزار عالموں سے ملا ہوں ان میں صاحب عقل صرف تین چار دیکھے ایک ان میں امام ابوحنیفہ تھے۔

محمد انصاریؒ کا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت، یہاں تک کہ بات چیت اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں بھی دانشمندی کا اثر پایا جاتا ہے۔

درحقیقت امام عالی مقام کی انتہائی دانش مندی یہی تھی کہ اپنے سینکڑوں فضلاء نامدار شاگردوں سے چالیس اجلہ فقہاء ومحدثین کی ایک مجلس بنا کر تیس سال مسلسل لگے رہ کر ایک ایسی فقہ مرتب کر گئے جو دوسری تمام فقہوں پر ہزار بار فائق ہے، جس کا ہر ہر مسئلہ قرآن مجید، احادیث، آثار اور اجماع وقیاس صحیح پر مبنی ہے اور اسکی مقبولیت عنداللہ وعندالناس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا کہ ہر دور میں نصف یا دوثلث امت محمدیہ اس کا متبع رہا۔

امام صاحب نے اپنے زمانہ میں سیاسی وعلمی فتنوں کی روک تھام بھی صرف اپنی عقل خداداد سے کی جو اس زمانہ میں انتہائی دشوار مرحلہ تھا۔ (حوالہ بالا:۱۵۳)

فقہاء کے مراتب

حضرت کشمیریؒ نے فرمایا کہ فقہاء میں سے شمس الائمہ حلوانی کو شمس الائمہ سرخسی پر ترجیح دیتا ہوں، کیونکہ حلوانی مسئلہ مختلف بین الائمہ میں نہایت صحیح قول اختیار کرتے ہیں پس میں بھی ان ہی کے مختار کو لیتا ہوں اس کے بعد شامی، صاحب ہدایہ، صاحب بدائع وفتاوی قاضی خان اور صدر الائمہ وفخر الائمہ وغیرہ سب برابر ہیں۔ (حوالہ بالا ص۲۲۲)

کون سی نماز سب سے پہلے کس نے پڑھی؟

۱)..... فجر کی نماز سب سے پہلے دنیا کے سب سے پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام نے پڑھی ہے۔

۲)..... زوال کے بعد (ظہر کی نماز) سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار رکعت نماز پڑھی ہے جبکہ ان کو اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم کیا گیا تھا۔ چنانچہ پہلی رکعت اسماعیل علیہ السلام کا غم چلے جانے کے شکریہ میں تھی اور دوسری رکعت کے ذریعہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا گیا کہ اللہ نے اسماعیل علیہ السلام کے بدلے میں فدیہ (مینڈھا) اتارا، اور تیسری رکعت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی وجہ سے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "قد صدقت الرؤیا" کی خبر دی اور چوتھی رکعت مضرتِ ذبح پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صبر کرنے کی وجہ سے تھی۔ یہ نماز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بطور نفل تھی لیکن امت مرحومہ پر فرض کی گئی۔

۳)..... عصر کی نماز سب سے پہلے حضرت یونس علیہ السلام نے پڑھی جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عصر کے وقت چار ظلمتوں سے نجات عطا فرمائی (1) لغزش کی ظلمت (2) رات کی ظلمت (3) پانی کی

ظلمت (4) مچھلی کے پیٹ کی ظلمت۔ حضرت یونس علیہ السلام نے چار رکعتیں تطوعاً بطور شکرانہ ادا کیں، لیکن امت مرحومہ پر فرض کردی گئی۔

۴)...... مغرب کی نماز سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پڑھی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ ﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اور آپ نے یہ نماز غروب کے بعد پڑھی تھی۔ پہلی رکعت اپنی ذات سے الوہیت کی نفی کرنے کیلئے تھی۔ اور دوسری رکعت اپنی والدہ سے الوہیت کی نفی کرنے کے لئے تھی۔ اور تیسری رکعت اللہ تعالیٰ کے واسطے الوہیت ثابت کرنے کے لئے تھی۔

۵)...... عشاء کی نماز سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پڑھی ہے۔ (اشرف الہدایہ: ۳۱۵ بحوالہ حاشیہ ملا عبدالغفور عنایہ)

کم مہر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اعرابی کو ہلکی پھلکی نماز پڑھتے دیکھا، جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے یہ دعا کی۔

"اللّٰهم زوجني الحور العين"

ترجمہ: اے اللہ! حور عین (جنت کی موٹی موٹی آنکھوں والی اور اپنے حسن و جمال سے حیران کردینے والی حور) سے میری شادی فرما دیجئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

"لقد اسات النقد واعظمت الخطبة"

یعنی تو نے مہر تو بہت کم دیا اور منگنی اتنی بڑی عورت سے کرنا چاہتا ہے۔

(لطائف ونوادر بحوالہ ابن ابی الحدید)

کہیں چھت سجدہ نہ کرے

ایک عالم جو فقیہ تھے۔ ایک کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔ مکان کی چھت بہت بوسیدہ اور کمزور ہوگئی تھی۔ اور ہر وقت کڑیوں سے چڑ چڑانے کی آواز آتی رہتی تھی۔ جب مالک مکان کرایہ لینے کے لئے آیا تو فقیہ صاحب نے فرمایا کہ تم پہلے اس مکان کی چھت درست کراؤ۔ اس میں سے ہر وقت چڑ چڑ کی آواز آتی رہتی ہے۔ مالک مکان نے کہا کہ حضرت! آپ بالکل نہ ڈریں۔ اس مکان کی چھت باری تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی رہتی ہے۔

فقیہ صاحب جو بہت ہی زندہ دل اور تفریح پسند تھے۔ فوراً بول اٹھے کہ تسبیح میں تو خیر کوئی مضائقہ نہیں مگر کہیں تسبیح پڑھتے پڑھتے اس پر رقت طاری ہو جائے اور وہ سجدے میں چلی جائے تو پھر کیا ہوگا؟

ایک دلچسپ فتویٰ

ایک مسخرے نے کسی حاضر جواب اور خوش طبع مفتی سے یہ سوال کیا کہ نماز جنازہ عموماً میدانوں میں ہوا کرتی ہے۔تو اگر نماز جنازہ میں سجدہ سہو کرتے وقت کانٹا پیشانی میں چبھ جائے ،تو نماز کی حالت میں کس طرح اس کو نکالنا چاہیے؟

مفتی صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ اس مسئلہ میں میرا فتویٰ ہے کہ اس کانٹے کو ہاتھ سے ہرگز ہرگز نہ نکالے۔ بلکہ بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے اس طرح آہستگی کے ساتھ نکال لے کہ پیشانی زمین سے اٹھنے نہ پائے ،ورنہ سجدہ سہو مکروہ ہو جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح کانٹا نکالنے میں شاید دوبارہ وضو کی حاجت پڑ جائے۔

قرأت خلف الامام سے متعلق شوافع اور احناف کی مجلس

فیض الباری شرح بخاری میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ شوافع نے ایک مجلس منعقد کی۔ جس میں ایک شخص کو فرضی مفتی بنایا۔ پھر ان سے قراۃ فاتحہ کے متعلق سوال کیا کہ ''قراۃ فاتحہ'' فرض ہے یا کیا؟ مفتی نے فرض بتلایا۔ سائل نے دریافت کیا کہ اس میں کسی کا اختلاف تو نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کسی کا اختلاف نہیں۔ البتہ ایک شخص نعمان بن ثابت (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) کوفہ میں گذرا ہے، اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختلاف ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ارشاد فرمایا ہے۔

''لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب''

اس کی نماز نہیں جس نے قرأت فاتحہ نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرأۃ فاتحہ فرض ہے۔ مگر اس نے اس کے خلاف کہا ہے کہ قراۃ فاتحہ فرض نہیں۔ حنفیہ کو اس مجلس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی ایک مجلس منعقد کی۔ کہ بے تمیزوں کی کسی جماعت میں کمی نہیں اور اس میں ایک شخص کو مفتی تجویز کر کے اس کو تخت پر بٹھلایا اور پھر اس سے قرأۃ فاتحہ کے متعلق سوال کیا۔ مفتی نے جواب دیا کہ قرأۃ فاتحہ فرض نہیں ہے۔ اس پر سائل نے کہا۔ اس میں کسی کا اختلاف تو نہیں۔ مفتی نے جواب دیا اس میں کسی کا اختلاف نہیں البتہ ایک شخص محمد بن ادریس (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) گذرا ہے۔ اس کا حق تعالیٰ شانہ، سے اختلاف ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ، نے تو فرمایا ہے۔ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو، پڑھ لیا کرو۔ اور اس میں فاتحہ کی کوئی تخصیص نہیں اور وہ فاتحہ کی تخصیص کرتا ہے۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف :۷۵)

داڑھی پر مسح

امام شعبیؒ سے ایک آدمی نے داڑھی پر مسح سے متعلق سوال کیا، انہوں نے جواب دیا کہ اس کا خلال کرلیا کرو، آدمی نے کہا ''مجھے اندیشہ ہے کہ اس طرح یہ تر نہ ہوگی'' امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' تو پھر اسے رات

سے ہی پانی میں بھگو کر رکھ دیا کرو (تاکہ اچھی طرح تر ہو جائے)'' (لطائف ونوادر بحوالہ المراح)

''لطیفہ'' اس زمانے کے مجتہدین

اس زمانے کے مجتہدین کا حال یہ ہے کہ ایک پیر صاحب نے اپنے شاگردوں کے سامنے مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اسکے ساتھ دو شاگرد بھی متفق ہو گئے۔ ایک مرتبہ پیر صاحب اجتہاد کرنے بیٹھے اور اسکے ساتھ دونوں شاگرد بھی بیٹھے، پیر صاحب نے شاگردوں کو اجتہاد کرنے کے لئے کہا: ایک شاگرد نے اجتہاد کیا: چنا کھانا حرام ہے، پیر صاحب: اسکی دلیل کیا ہے؟ شاگرد: چنا دیکھنے میں پھوڑا پھنسی کے مشابہہ ہے جو کہ ناپاک ہے اور اسکا کھانا بھی حرام ہے لہذا چنا بھی کھانا حرام ہونا چاہیے۔ پیر صاحب: دلیل سے ثابت ہو گیا کہ چنا کھانا حرام ہے۔

اب دوسرے شاگرد کی باری آئی تو اس نے اجتہاد کیا: چاول کھانا حرام ہے: پیر صاحب: حرام ہونے کی علت کیا ہے؟ شاگرد: چاول دیکھنے میں گندگی کے کیڑے کی مشابہہ ہے جو کہ حرام ہے۔ لہذا چاول کا کھانا بھی حرام ہونا چاہیے۔ پیر صاحب: دلیل سے ثابت ہو گیا کہ چاول کھانا حرام ہے۔ سامعین میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: حضرت! برائے مہربانی مزید اجتہاد نہ فرمایئے اس لیے کہ آپ کے ایک شاگرد نے اجتہاد کر کے پنجاب اور ہندوستان کے رہنے والوں کے کھانے کو حرام کر دیا اور دوسرے شاگرد نے برما، بنگال اور سیلون والوں کا کھانا حرام کر دیا۔ اب آپ اگر اجتہاد کریں گے تو صرف ایک ہی چیز باقی ہے اور وہ ہے گندم یعنی گیہوں، اس میں بھی آپ یہ علت نکالیں گے کہ گیہوں کا کھانا حرام ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ دیکھنے میں مقام مستور مرأۃ کے مشابہہ ہے تو یہ بھی حرام ہے لہذا آپ حضرات اجتہاد کے بازار کو بند کر دیں۔ (نایاب تحفہ)

لنگڑی خاتون

امام شعبیؒ کے پاس ایک آدمی آ کر کہنے لگا: ''میں نے ایک عورت سے شادی کی ہے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لنگڑی ہے، کیا میں اسکو لوٹا سکتا ہوں (یعنی طلاق دے سکتا ہوں)''

انہوں نے جواب دیا:

''ان کنت ترید ان تسابق بها فردها''

ترجمہ۔ اگر تم نے اس سے دوڑ لگانے کے ارادے سے شادی کی ہے تو اس کو لوٹا دو۔ (لطائف ونوادر بحوالہ الکشکول)

مولوی کا نفس بھی مولوی ہوتا ہے

میں زمانہ طالب علمی میں (مراد حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ ہیں) ایک بار میرٹھ گیا۔ وہ زمانہ نوچندی کے میلہ کا تھا۔ میرا بچپن تھا۔ اس لئے میں بھی میلہ دیکھنے چلا گیا۔ جب میلہ سے

واپس آیا تو حافظ عبدالکریم صاحب رئیس کے صاحب زادہ غلام محی الدین مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ مولوی صاحب نوچندی کے میلہ میں جانا کیسا ہے؟ میں نے کہا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی اس غرض سے جائے کہ اس کو فتوی دینے کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ عوام کے سامنے اس کے مفاسد بیان کر سکے، تو ایسے شخص کو جانا جائز ہے۔ صاحبزادہ صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ مولوی گناہ بھی کرتے ہیں تو اس کو جائز کر لیتے ہیں۔ مجھے اس تاویل کے بعد تاویل سے ایسی نفرت ہوگئی ہے۔ کہ اس سے زیادہ نفرت کسی چیز سے بھی نہیں۔

ف: اور اس تاویل سے مراد وہ تاویل ہے جس سے اپنے نفس کی نصرت مقصود ہو۔ عارف شیرازی اسی کو فرماتے ہیں۔

ترسم کہ صرفہ بزوروز باز خواست
نان حلال شیخ بہ نان حرام ما

یعنی اندیشہ ہے کہیں قیامت میں ہمارا نانِ حرام، شیخ کے نانِ حلال پر غالب نہ آ جائے کیوں کہ ہم تو حرام کو حرام جانتے ہیں۔ اور وہ حرام کو تاویل سے حلال بنا کر کھاتے ہیں۔ (امثال عبرت:۴۰۴)

کونسی انگلی؟

امام شعبیؒ نے ایک دن یہ روایت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سحری کھایا کرو، اگر چہ اسکی مقدار اتنی ہو کہ کوئی آدمی اپنی انگلی مٹی پر رکھ دے اور پھر اس کو اپنے منہ میں ڈال دے''۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا: ''کونسی انگلی؟'' شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر کہا: ''یہ''۔ (ابن الجوزی: اُخبار الظراف)

کتنی مقدار؟

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے آدمی نے مسئلہ پوچھا کہ محرم (حج یا عمرہ کا احرام باندھنے والے) کے لیے اپنے بدن کو کھرچنا جائز ہے؟ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ''ہاں'' اس آدمی نے کہا ''کتنی مقدار؟'' شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ''جب تک ہڈی نظر نہیں آتی'' (کھرچتا ہی رہے)

ف: مطلب یہ ہے کہ یہ سوال ہی فضول اور لغو ہے کہ کتنی مقدار؟

کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنا ہی کھرچا جاتا ہے۔ (لطائف ونوادر، اردو لطائف ونوادر:۶۲)

وہ بھی اسی طرح ہے

ایک آدمی نے ایاس بن معاویہ (قاضی بصرہ) سے کہا:

آدمی: ''اگر میں کھجور کھاؤں تو کیا آپ مجھے ماریں گے؟''

ایاس بن معاویہ: نہیں۔

آدمی: کھجور کی شراب بھی تو اسی طرح کھجور اور پانی کو ہانڈی میں ملانے سے بنتی ہے تو یہ کیوں حرام ہے؟

ایاس بن معاویہ: اگر میں تجھے مٹی سے ماروں تو تجھے تکلیف ہوگی؟

آدمی: نہیں۔

ایاس بن معاویہ: اگر میں تجھ پر پانی سے بھری دیگچی انڈیل دوں تو کیا تیرا کوئی عضو ٹوٹے گا؟

آدمی: نہیں۔

ایاس بن معاویہ: اگر میں پانی اور مٹی سے پختہ اینٹ بنا کر دھوپ میں خشک کروں اور پھر تیرے سر پر دے ماروں تو کیا ہوگا؟

آدمی: سر پھوٹ جائے گا۔

ایاس بن معاویہ: وہ بھی اسی طرح ہے (یعنی تیرے سوال کا جواب یہی ہے) (ایضاً:٦٢)

مہدی اور خیزران کے درمیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

کہا جاتا ہے کہ مہدی نے خیزران سے کہا: ''میں شادی کرنا چاہتا ہوں'' جبکہ وہ اس سے پہلے خیزران سے شادی کر چکا تھا، خیزران نے کہا: ''آپ کے لیے میرے بعد کسی خاتون سے شادی کرنا جائز نہیں ہے''

مہدی: آخر کیوں نہیں؟

خیزران: آپ جسے چاہیں میرے اور اپنے درمیان فیصل بنالیں۔

مہدی: کیا آپ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو فیصل بنانے پر تیار ہیں؟

خیزران: ہاں۔

مہدی نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو بلوایا اور کہا کہ رشید کی ماں کا خیال یہ ہے کہ اس کے بعد کسی عورت سے میرے لیے نکاح حلال نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ عز وجل کا صاف اور واضح ارشاد ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (النساء:٣)

ترجمہ: پس نکاح کرلو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں، دو دو، تین تین، چار چار۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا، حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آیت پوری پڑھو یعنی

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾

ترجمہ: اگر ڈرو کہ ان میں تم انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔

آپ عدل وانصاف نہیں کریں گے۔ (لہٰذا آپ دوسری شادی نہ کریں)۔

مہدی نے بطور انعام حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دس ہزار درہم کا حکم جاری کیا، لیکن سفیان

ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (وفیات: ۲/۳۸۹)

پانچ بیویوں کو طلاق

اصمعی نے ایک لطیفہ سناتے ہوئے کہا کہ میں نے ہارون الرشید سے ایک دن کہا امیر المومنین! مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک عربی النسل آدمی نے پانچ عورتوں کو طلاق دی ہے۔ ہارون نے کہا: ''آدمی کو تو صرف چار بیویوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے، پھر اس نے پانچ کو کیسے طلاق دی؟'' میں نے کہا ''قصہ یوں ہے کہ آدمی کی چار ہی بیویاں تھیں، ایک دن وہ ان کے پاس آیا تو انہیں لڑتے جھگڑتے دیکھا، آدمی ذرا تند مزاج تھا، اس نے کہا: ''یہ جھگڑا کب تک ہوتا رہے گا؟''

پھر ایک بیوی سے کہنے لگا: ''میرا خیال ہے کہ تیری طرف سے ہی یہ جھگڑا شروع ہوا ہے، جا تجھے طلاق ہے۔''

دوسری بیوی نے کہا: ''آپ نے طلاق دینے میں بہت جلدی کی ہے، اگر طلاق کے علاوہ کسی طریقہ سے مناسب تنبیہ کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا'' اس نے کہا: ''تجھے بھی طلاق ہے۔''

تیسری بیوی بولی: ''اللہ تیرا برا کرے، اللہ کی قسم! یہ دونوں تیری محسن ہیں، اس نے کہا: ''ان کے احسانات شمار کرانے والی (تو کون ہوتی ہے جا) تجھے بھی طلاق ہے۔''

چوتھی بیوی بولی جو چاند کی طرح خوبصورت اور انتہائی بردبار تھی: ''تیرا سینہ تنگ پڑ جائے، کیا تیرے پاس بیویوں کو طلاق دینے کے سوا تنبیہ کا اور کوئی راستہ نہیں؟'' اس نے کہا: ''تجھے بھی طلاق ہے۔''

اس کی لونڈی اوپر کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے (بالا خانہ) سے جھانکتے ہوئے کہا: ''اللہ کی قسم! تمہاری انہی حرکتوں کی وجہ سے عرب تمہاری اور تمہاری قوم کی نسبت نازیبا کلمات کہتے ہیں۔ پل بھر میں تو نے اپنی چار بیویوں کو طلاق دے دی.....؟''

اس نے کہا: ''اے ملامت کرنے والی! تجھے بھی طلاق ہے اگر تیرا شوہر اس کے نفاذ پر راضی ہو''، شوہر (شاید وہ بھی بیوی سے تنگ آچکا تھا) نے گھر کے اندر سے جواب دیا:

''میں راضی ہوں، میں راضی ہوں'' (یوں ایک مرد نے پانچ عورتوں کو طلاق دے دی)۔ (لطائف ونوادر: ۹۹ بحوالہ دولۃ النساء: ٦٤٦)

انوکھا سوال

ایک مالکی عالم نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا، جس میں تحریر تھا: ''اے امام! بتایئے، فرض، فرض کا فرض، تتمہ فرض اور بدون فرض نماز کیا ہیں؟ نیز ایسی نماز بتایئے جس کا چھوڑنا فرض ہے اور آسمان وزمین کے درمیان ہونے والی نماز کی بھی کچھ وضاحت کیجئے''۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب لکھا: ''فرض سے مراد تو پانچ نمازیں ہیں۔ فرض کا فرض وضو ہے۔ تتمہ

فرض درود شریف کا پڑھنا ہے۔ بدوں فرض نماز سے مراد قبل از بلوغ بچے کی نماز ہے، جس نماز کا چھوڑنا فرض ہے اس سے مراد نشے کی حالت کی نماز ہے، زمین وآسمان کے درمیان نماز سے مراد حضرت سلیمان علیہ السلام کی نماز ہے اور زمین وآسمان کے بیچ پڑھی گئی نماز سے مراد شب معراج میں نبی کریم ﷺ کی نماز ہے۔ (ایضا: ۳۵۵ بحوالہ المختار)

''امرءة لها زوجان'' کا مطلب

فقہ شافعی میں ایک لطیفہ ہے۔ ''امرءة لها زوجان'' جس کا ظاہری مطلب یہ ہے۔ ایک عورت کے دوشوہر، حالانکہ یہ غلط ہے۔ (ایک عورت کے دوشوہر کیسے ہو سکتے ہیں) اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ایک عورت غلام اور ایک باندی کی مالک ہے اور وہ دونوں آپس میں زوجان یعنی میاں بیوی ہیں۔ دونوں اس عورت کی ملک ہیں۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف: ۷۶)

علامہ صدیق صاحب کشمیریؒ کا فتویٰ

سہارنپور کی مسجد بہادران میں ایک مرتبہ امام نے نماز فجر میں آیت کریمہ ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ﴾ سے ''یتوبوا'' کو چھوڑ کر اس طرح پڑھ دیا ''ثم لم فلهم عذاب جهنم''

علامہ صدیق صاحب کشمیری بھی نماز میں تھے، لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ نماز ہوگئی یا نہیں؟ آپ نے اپنے نحوی مذاق کے اعتبار سے فرمایا کہ ''لم'' اور ''لما'' میں یہ فرق ہے کہ ''لما'' کے بعد فعل کا حذف درست ہے اور ''لم'' کے بعد درست نہیں۔ پھر فرمایا کہ او ہو سہورے کافروں کا ذکر ہے وہ تو توبہ کریں یا نہ کریں ان کے لئے تو عذاب حریق ہے ہی۔ چلو نماز ہوگئی۔ (ایضا: ۷۹)

مجھے معلوم نہیں

امام شعبی رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا، انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس کا علم نہیں، مسئلہ دریافت کرنے والے نے کہا: ''کیا آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی، آپ تو عراق کے فقیہ ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا کہ جب فرشتوں کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آئی:

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ (البقرہ: ۳۲)

ترجمہ: ''آپ ہر عیب سے پاک ہیں ہمیں کوئی علم نہیں مگر (اتنا ہی علم ہے) جو آپ نے ہمیں سکھلایا ہے'' تو میں ''لا ادری'' (مجھے معلوم نہیں) کہتے ہوئے کیوں شرماؤں؟'' (الاصبهانی محاضرات: ۵۰)

ایک عقلی سوال

ایک مالکی عالم نے امام شافعی رحمہ اللہ کو سوالنامہ بھیجا جس میں لکھا تھا: ''اے امام! میری ایک خالہ ہے،

میں اس کا ماموں ہوں، اور میری ایک پھوپھی ہے، میں اس کا چچا ہوں، جس عورت کا میں چچا ہوں اس کی ماں میرے باپ کی ماں ہے، اور اس کا باپ میرا بھائی ہے اور اس کا بھائی عام رواج کے مطابق میرا باپ ہے، اور جس خاتون کا میں ماموں ہوں، اس کا دادا میری ماں کا باپ ہے۔ ہم مجوسی (آتش پرست) ہیں، نہ مشرک، ہم سنت حق کے پیروکار ہیں۔ پس ہے کوئی ایسا امام جو نکاح کی مختلف شکلوں سے واقف ہو اور اس کے پاس گہرا علم ہو، وہ ہمارا نسب بتائے اور اس کے حکم سے بھی آگاہ کرے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا: سائل کی دادی (یعنی اس کے باپ کی ماں) نے سائل کے ماں شریک بھائی سے شادی کی، اور اس (سائل) کی باپ شریک بہن نے سائل کے نانے سے شادی کی، دونوں سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، لہذا اس کی دادی کی بیٹی سائل کی پھوپھی ہے اور وہ خود اس کا چچا ہے، اور اس کی بہن کی بیٹی اس کی خالہ ہے اور وہ اس کا ماموں ہے''۔ (لطائف ونوادر: ۲۵۵)

گردن پر ہاتھوں کی مشقیں کسنا

ایک آدمی مسئلہ معلوم کرنے کے لئے ایک فقیہ کے پاس آیا اور کہا: ''میں نے رمضان کا ایک روزہ (بعذر) توڑا ہے، اسکا کیا حکم ہے؟'' فقیہ: ''ایک روزے کی قضا کرو'' سائل: ''میں نے روزے کی قضا کی تھی مگر جب میں گھر پہنچا تو گھر والوں نے ''مامونیہ'' (کھانے کی ایک قسم ہے) پکایا ہوا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ہاتھ اس طرف بڑھ گیا اور میں نے تھوڑا سا کھالیا، اب کیا ہوگا؟'' فقیہ: ''دوبارہ روزے کی قضا کرو'' سائل: ''میں نے قضا کی تھی لیکن جب میں اس روز گھر پہنچا تو اہلخانہ نے ہریسہ (کھانے کی ایک قسم جیسے آجکل حلیم) پکایا تھا، غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ اس طرف اٹھ گیا اور میں نے تھوڑا سا کھالیا''

فقیہ: ''میرے خیال میں تم روزے کی قضا نہ کرو تو بہتر ہے ورنہ اندیشہ ہے کہیں گردن میں آپ کے ہاتھ کی مشقیں نہ کس دی جائیں''۔ (المستطرف فی کل فن مستظرف: ۳۱۵)

نحوی اور فقہی مسئلہ

ایک رات ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو لکھا کہ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے ان اشعار کے متعلق فتوی دیجئے۔

فان ترفقی یاھند فالرفق ایمن ... وان تخرقی یاھند فالخرق اشأم

فانت طلاق والطلاق عزیمة ... ثلاثا ومن یخرق اعق واظلم

فبینی بها ان کنت غیر رفیقة ... ومالا مریء بعد الثلاث مقدم

ترجمہ: اے ہندہ! اگر تو نرم برتاؤ کرے تو یہ مبارک عمل ہے اور اگر تو بیوقوفانہ حرکتیں کرے تو یہ منحوس حرکت ہے۔

ترجمہ: تجھے طلاق ہے اور طلاقیں تین ہوتی ہیں جو بیوقوفانہ حرکت کرتا ہے، وہ بڑی ہی نافرمانی اور بڑا ہی ظلم کرتا ہے۔

ترجمہ: اگر تو رہنا نہیں چاہتی تو طلاق لیکر جدا ہو جا اور تین طلاقوں کے بعد آدمی کے لئے آگے بڑھنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

ہارون نے کہا کہ اشعار میں ''عزیمۃ ثلاث'' کا لفظ۔ عزیمۃٌ ثلاثٌ۔ بھی پڑھا گیا ہے اور۔ عزیمۃً ثلاثاً بھی، رفع کی صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہونگی اور نصب کی صورت میں کتنی واقع ہوں گی؟

امام ابویوسف رحمہ اللہ نے اشعار دیکھ کر فرمایا: یہ مسئلہ فقہی بھی ہے اور نحوی بھی، اگر میں محض اپنی رائے سے جواب دوں تو یقیناً غلطی سے محفوظ نہ رہوں گا، اور اگر یہ کہوں کہ مجھے اس کا جواب معلوم نہیں ہے تو لوگ کہیں گے کہ اگر انہیں ان پیش آمدہ مسائل کا علم نہیں تو یہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کیسے بن گئے؟ پھر فرماتے ہیں کہ سوچ و بچار کے بعد مجھے ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی جو لغت اور نحو کے امام ہیں یاد آئے، میں اور وہ ایک گلی میں رہتے تھے، میں نے اپنی لونڈی سے کہا: چراغ لے کر میرے آگے آگے چل، میں امام کسائی کے پاس پہنچا تو وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے، میں نے ہارون کا خط انہیں تھما دیا، انہوں نے ایک نظر پڑھنے کے بعد کہا: کاغذ اور قلم لو، اور لکھو، جس نے شعر رفع کے ساتھ پڑھتے ہوئے یوں کہا ہے ''عزیمۃٌ ثلاثٌ'' تو اس نے اپنی بیوی کو صرف ایک طلاق دی ہے اور وہ ''والطلاق عزیمۃ ثلاث'' سے اپنی بیوی کو یہ بتلانا چاہتا ہے کہ طلاق کی کل تعداد تین ہے، اس سے زیادہ طلاق نہیں ہوتی اور جس نے شعر نصب کے ساتھ ''عزیمۃً ثلاثاً'' پڑھا ہے اس نے اپنی بیوی کو پوری تین طلاقیں دی ہیں اور دوسرے لفظوں میں اس نے صاف صاف یوں کہا ہے کہ ''انت طالق ثلاثاً'' یعنی تجھے تین طلاقیں ہیں۔

امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہی جواب آگے ہارون کے پاس بھیج دیا، رات کے آخری پہر ہارون کے خدام میرے پاس بہت سے انعامات اور عطیات لے کر آئے، میں نے وہ سب امام کسائی کے گھر بھجوا دیئے۔ (الزجاجی: مجالس: ۲۳۸)

اپریل فول

اس رسم کے تحت یکم اپریل کی تاریخ میں جھوٹ بول کر کسی کو دھوکہ دینا اور دھوکہ دیکر اسے بے وقوف بنانا نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ اسے ایک کمال قرار دیا جاتا ہے، جو شخص جتنی صفائی اور چابکدستی سے دوسرے کو جتنا بڑا دھوکہ دے، اتنا ہی اسے قابل تعریف اور یکم اپریل کی تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھانے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ مذاق جسے درحقیقت ''بدمذاقی'' کہنا چاہیئے، نہ جانے کتنے افراد کو بلا وجہ جانی اور مالی نقصان پہنچا چکا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں کی جانیں چلی گئی ہیں کہ انہیں کسی ایسے صدمے کی جھوٹی خبر سنا دی گئی جسے سننے کی وہ تاب نہ لا سکے اور زندگی ہی سے ہاتھ دھو

بیٹھے۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ رسم مندرجہ ذیل بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے:
1۔ جھوٹ بولنا 2۔ دھوکہ دینا 3۔ دوسرے کو اذیت پہنچانا 4۔ ایک ایسے واقعے کی یاد منانا جس کی اصل یا تو بت پرستی ہے یا توہم پرستی یا پھر ایک پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ گستاخانہ مذاق۔
اب مسلمانوں کو خود فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں اپنا کر فروغ دیا جائے.........؟ (از افادات: مولانا تقی عثمانی مدظلہ)

لفظ ''پالیٹکس'' اور پاکستان کی سیاسی زندگی

سارے قرآن میں ''پالیٹکس'' کا لفظ نہیں۔ ہاں! میں جانتا ہوں، اس کے معنی ''مکر'' کے ہیں اور فرنگی مقامروں کی ایجاد ہے۔ جس کا مطلب ہی فریب دہی ہے۔ سیاسئین کے وعدے پورے ہونے کے لئے نہیں بلکہ ٹالنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ان بدبختوں کے دل پر خدا کے سوا ہر شئے کا خوف غالب ہے۔ میں نے ''پالیٹکس'' سے زیادہ شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع وفریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں۔ اس دور میں سیاست کا مطلب فتنہ خیزی، فتنہ پروری اور فتنہ انگیزی ہے۔ (دفتر احرار، لاہور)

پاکستان میں اسلام کا سیاسی نظام تو ہم رائج نہ کر سکے اور غیروں کا جو نظام ہم نے اپنایا ہے، اس کے ساتھ بھی انصاف نہ کیا۔ اس کی خوبیاں چھوڑ دیں اور برائیوں کو شعار کر لیا، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔
(امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ، ملتان ۱۹۵۸ء)

شراب حلال ہے یا حرام؟

ایک آدمی نے کسی فقیہ سے پوچھا کہ شراب حلال ہے یا حرام؟

فقیہ: حرام

سائل: انگور، کشمش اور کھجور حلال ہیں یا حرام؟

فقیہ: حلال

سائل: چینی، شکر اور شہد حلال ہے یا حرام؟

فقیہ: حلال

سائل: تو ان حلال اشیاء میں کون سی چیز ایسی ہے جس نے شراب کو حرام کر دیا ہے؟

فقیہ: اگر میں ایک مٹھی مٹی لے کر آپ کے چہرے یا سینے پر پھینک دوں تو آپ کو تکلیف ہوگی؟

سائل: نہیں

فقیہ: اگر میں چلّو بھر پانی کا چھینٹا آپ کے چہرے یا سینے پر ماروں تو کیا اس سے آپ کو تکلیف ہوگی؟

سائل: نہیں

فقیہ: اگر میں مٹھی بھر تنکے لے کر آپ کے چہرے، سینے یا پیٹھ پر پھینک ماروں تو کیا آپ کو تکلیف ہوگی؟

سائل: نہیں

فقیہ: اگر میں مٹی، پانی اور تنکے لے کر ان کا گارا بناؤں اور کچھ روز انہیں سورج کی دھوپ میں رکھوں، پھر ان کا بنا ہوا بٹا آپ کے منہ پر دے ماروں تو تکلیف ہوگی؟

سائل: ہاں

فقیہ: ایسے ہی جب انگور اور اس کا شیرہ وغیرہ ملا دیئے جائیں اور پرانے ہو جائیں تو وہ حرام ہو جاتے ہیں، جیسا کہ جب پانی، مٹی اور تنکے مل کر پرانے ہو جائیں تو ان کے لگنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ (لطائف ونوادر: ۳۷۶)

نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے کا مسئلہ

ایک شخص نے ایک مولوی صاحب سے سوال کیا تھا۔ کہ اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جائے، تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے لکھ بھیجا:

''مخدومی! نماز میں قرآن مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اسکے اور کچھ قباحت نہیں کہ ''نماز نہیں ہوتی''۔

بلا وضو و تیمّم کی نماز

جس شخص کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کہنیوں اور ٹخنوں کے اوپر سے کٹے ہوں اور چہرہ زخمی ہو، تو ایسے شخص پر نماز فرض ہوتی ہے، مگر اس کو نماز پڑھنے کے لیے نہ وضو کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ تیمم کی۔ (نور الایضاح باب التیمم)

زندہ اور مردہ کے غسل میں پانچ فرق

☆ زندہ کے پہلے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھونا سنت ہے، اور مردہ کا پہلے چہرے کا دھونا مستحب ہے۔

☆ زندہ کو کلی کرنا فرض ہے اور مردہ کے غسل میں کلی نہیں۔

☆ زندہ کو ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے اور مردہ کے غسل میں منع ہے۔

☆ زندہ کو حکم ہے کہ اگر پاؤں کے پاس دھوون کے جمع ہونے کا امکان ہو تو غسل کے وضو میں پاؤں نہ دھوئے بلکہ غسل سے فارغ ہو کر دوسری جگہ دھوئے مگر مردہ کے غسل میں پاؤں کا دھونا مؤخر نہ کرے۔

☆ زندہ اپنے غسل کے وضو میں سر کا مسح کرے اور مردہ کے وضو میں ایک روایت کے مطابق سر کا مسح نہیں اور صحیح یہ ہے کہ اس کے بھی سر کا مسح کرے۔ (تفسیر روح البیان: ۳۵۶/۲ و عالمگیری: ۱۴۸/۱)

تین طلاقیں

ایک آدمی کی خوبصورت بیوی تھی جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا، جب کہ وہ اس سے اتنی ہی نفرت کرتی تھی۔ نفرت کا یہ سلسلہ اس قدر طویل ہو گیا کہ اس نے شوہر کو زچ کر دیا بیوی کی زبان درازی جب حد سے بڑھی تو ایک دن شوہر نے اس سے کہا:

"انت طالق ثلاثا بتاتاً ان خاطبتني بشيء ولم اخاطبك بشيء مثله"

ترجمہ: اگر آئندہ تو نے مجھے کچھ کہا اور میں نے اسی طرح تجھے جواب نہ دیا تو تجھے پکی تین طلاقیں ہیں، بیوی نے فوراً کہا:

"انت طالق ثلاثا بتاتا"

ترجمہ: تجھے تین یقینی طلاقیں ہیں۔

شوہر ہکا بکا رہ گیا اسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور بیوی کی بات جو ابا دہرانے کی صورت میں اسے طلاق کا اندیشہ ہوا، اسی تذبذب کی حالت میں اس نے ابو جعفر طبری کو اپنی صورت حال لکھ کر بھیجی اور پوچھا کہ اب وہ کیا جواب دے؟ انہوں نے جواب میں لکھا کہ جب وہ تجھ سے جواب مانگے۔ تو تو یہ جواب دینا:

"انت طالق ثلاثا بتاتا ان انا طلقتك"

ترجمہ: اگر میں تجھے طلاق دوں تو تجھے تین یقینی طلاقیں ہیں۔ اس صورت میں جواب بھی ہو جائے اور طلاق بھی نہیں ہوگی۔ (لطائف ونوادر: ۳۸۲)

بدو نماز توڑ کر مسجد سے باہر نکل گیا

ایک بدو نے امام کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھی امام نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ﴾ (یوسف: ۸۰)

ترجمہ: میں اپنی جگہ سے اس وقت تک ہرگز نہیں ہلوں گا جب تک مجھے میرا باپ اجازت نہ دے دیں۔

یہ آیت پڑھ کر وہ بھول گئے اور کھڑے بار بار یہ آیت دہرانے لگے اس پر بدو نے زچ ہو کر کہا:

"يا فقيه! اذالم ياذن لك ابوك في هذا الليل نظل نحن وقوفا الى الصباح"

ترجمہ: اے فقیہ اگر پوری رات آپ کے والد نے آپ کو اجازت نہ دی تو ہم تو صبح تک یہیں کھڑے رہیں گے۔

یہ کہہ کر اس نے نماز توڑی اور مسجد سے باہر نکل گیا۔ (لطائف ونوادر بحوالہ المستطرف: ۵۱۸)

آپ کی کمر میں ریڑھ کی کتنی ہڈیاں ہیں؟

ایک گورنر نے کسی بدو سے کہا میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ تم دن بھر میں کتنی رکعتیں

پڑھتے ہو؟ بدو نے کہا اگر میں تمہیں بتلادوں تو کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دو گے! اس نے کہا ہاں، ضرور دوں گا، اس پر بدو نے دن بھر کے فرائض کی تعداد اشعار میں یوں بیان کی!

ان الصلاۃ اربع اربع ثم ثلاث بعدھن اربع

ثم صلاۃ الفجر لا تضیع

ترجمہ: بلاشبہ فرض نمازوں کی تعداد چار (ظہر) اور چار (عصر) ہے پھر تین (مغرب) ہے ان کے بعد چار رکعتیں (عشاء کی) ہیں پھر نماز فجر بھی ضائع نہیں ہوتی۔

گورنر: آپ نے درست جواب دیا، اب آپ اپنا سوال پوچھئے،

بدو: "کم فقار ظھرك" یعنی آپ کی کمر میں ریڑھ کی کتنی ہڈیاں ہیں؟

گورنر: مجھے معلوم نہیں۔

اس پر بدو نے کہا:

"افتحکم بین الناس وانت تجھل ھذا من نفسك"

ترجمہ: کیا آپ اپنے آپ سے غافل ہو کر لوگوں کے فیصلے کرتے ہو۔ (لطائف ونوادر:۵۱۹)

بدو کی امید

ایک بدو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی غزوے میں شریک ہوا غزوے سے واپسی پر اس سے پوچھا گیا اس غزوے (جنگ) میں تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا اس نے کہا:

"وضع عنا نصف الصلوۃ وارجوا فی غزوۃ اخری ان یضع عنا النصف الاخر"

ترجمہ: آپ نے اس میں آدھی نماز معاف فرمادی امید ہے کہ باقی آدھی کسی اور غزوے میں معاف فرمادیں گے۔ (لطائف ونوادر:۵۲۳)

ٹھہریے ٹھہریے ابھی نماز کھڑی نہ کیجیے

ابوالاسود الدؤلی رحمۃ اللہ علیہ جسے علم نحو کا موجد کہا جاتا ہے، نے اپنے بیٹے سے کہا بیٹا تیرے تایازاد بھائی کی شادی قریب ہے اس کا نکاح تجھے پڑھانا ہے۔ لہٰذا ابھی سے اچھی طرح خطبۂ نکاح یاد کرلے۔ بیٹے نے خطبہ رٹنا شروع کیا اور مسلسل دو دن اور دو راتیں خطبہ رٹتا رہا تیسرے دن باپ نے اس سے کہا ہاں تم نے خطبہ یاد کرلیا اس نے کہا جی ہاں، وہ میں نے ازبر یاد کرلیا ہے، باپ نے کہا سناؤ، اس نے جب سنانا شروع کیا تو وہ سناتے سناتے خطبۂ نکاح سے اذان میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا:

"الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونتوکل علیه ونشھد ان لاالہ الااللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح"

بیٹا اپنی مصنوعی پر کشش آواز میں بڑی روانی کے ساتھ خطبہ سنانے میں مشغول تھا باپ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا برخوردار ٹھہریئے، ابھی نماز کھڑی نہ کیجئے کیونکہ میں نے ابھی وضو نہیں کیا۔ (اخبار الحمقیٰ)

طلاق شوہر نے دی یا بیوی نے؟

ایک عورت عدالت میں آئی اور قاضی سے کہا کہ مجھے میرے شوہر نے طلاق دی ہے قاضی نے کہا کوئی گواہ؟ اسنے کہا ''ہاں میرا پڑوسی اس کا گواہ ہے'' اسے اس نے قاضی کے سامنے پیش کر دیا قاضی نے اس سے کہا کیا تم نے اس عورت کی طلاق سنی ہے؟

''پڑوسی: میں بازار گیا میں نے گوشت روٹی شیرہ اور زعفران خریدا''

قاضی: میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا میں نے یہ پوچھا ہے کہ کیا تم اس عورت کی طلاق سنی ہے یا نہیں؟

پڑوسی: (اپنی پہلی بات جاری رکھتے ہوئے) ''میں نے وہ سب چیزیں لا کر گھر میں رکھ دیں اور دوبارہ بازار گیا اور لکڑیوں کا ایندھن اور سرکہ خریدا''

''قاضی: یہ فضول بات چھوڑو''

پڑوسی: ''وہ پہلی بات ہی کیا خوب تھی پھر اس نے مزید کہا کہ میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے کچھ چیخیں سنی اور ان میں ''تین طلاقوں'' کا لفظ بھی سنا، اب مجھے یہ نہیں معلوم کہ طلاق شوہر نے دی یا اس نے شوہر کو؟'' (اخبار الحمقیٰ)

اس نے مجھ سے مستعار لیا ہے

حباب بن علاء کہتے ہیں کہ میں مدینے میں قیام کے دوران ایک دن وہاں کے قاضی صاحب کے پاس گیا وہاں ایک آدمی گدھا مانگتا ہوا عدالت میں داخل ہوا، اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی تھا اس دوسرے آدمی نے کہا میرا گدھا چوری ہو گیا تھا اب وہ اس کے پاس ملا ہے، قاضی نے آدمی سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا گدھا اس کا نہیں میرا ہے اسکا ثبوت یہ ہے کہ یہ اس وقت میرے قبضے میں ہے قاضی نے پہلے مدعی سے کہا تمہارے دعوے پر کوئی گواہ ہیں؟ اس نے کہا: ہاں'' قاضی نے کہا ''انہیں پیش کرو'' وہ آدمی اٹھا گدھے پر سوار ہوا اور عدالت سے باہر نکل گیا میں اس آدمی کی طرف متوجہ ہوا جس کے قبضہ میں گدھا تھا، اس سے کہا ''تم نے اس کا دعویٰ تو سن لیا، پھر کیوں گدھا اس کے حوالہ کیا؟ اس نے کہا اس نے مجھ سے گدھا مستعار لیا ہے''۔ (اخبار الحمقیٰ)

میرا وضو ٹوٹ گیا

مرغ نے درخت پر اذان دی لومڑی نے سنی تو اس نے کہا۔

لومڑی: اے ابوالمنذر! (یہ عربی زبان میں مرغ کا لقب ہے) تو نے اذان دیدی؟ مرغ: ہاں دے دی ہے۔

لومڑی: ''تو نیچے آیئے جماعت سے نماز پڑھیں''

مرغ: ''ہاں ہاں ضرور تم ذرا امام کو اٹھا دو، میں نیچے آتا ہوں لومڑی سمجھی کہ شاید یہاں کوئی دوسرا مرغ ہے اس نے گردن موڑ کر پیچھے نظر ڈالی تو وہاں ایک کتا سویا ہوا تھا جس کی دم اسکے چوڑے چکلے پورے منہ سے بھی بڑی تھی، وہ دم دبا کر سرپٹ بھاگی، گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تک نہیں''

ٹھہریئے ٹھہریئے! نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے لومڑی کو بھاگتا دیکھ کر مرغ نے درخت کے اوپر سے کہا۔ میرا وضو ٹوٹ گیا، انشاء اللہ وضو کر کے ابھی آتی ہوں لومڑی نے بھاگتے بھاگتے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ (لطائف ونوادر)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ موت کے دروازے پر

یحیٰی بن یحیٰی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مرض الموت طویل ہوا اور وقت آخر آ پہنچا تو مدینہ اور دیگر شہروں کے تمام فقہاء وعلماء امام صاحب کے مکانِ فیض نشان میں اس غرض سے جمع ہوئے کہ امام صاحب کی آخری ملاقات سے فیضیاب اور اس پیشوائے مخلوق کی وصیتوں سے بہرہ یاب ہوں میں نے انکو شمار کیا تو ایک سو تیس علماء وفقہاء موجود تھے میں بھی ان میں تھا میں امام کے پاس جاتا تھا سلام کرتا تھا اور سامنے کھڑا ہوتا تھا کہ شاید اس آخری وقت میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی نظر مجھ پر پڑ جائے اور آخرت ودنیا کی بہبودی حاصل ہو جائے اسی حالت میں تھا کہ امام نے آنکھیں کھولیں اور ہماری طرف متوجہ ہو کر یہ فرمایا:

''جس اللہ نے ہمیں خوشی وغمی دکھلا کر کبھی ہنسایا، کبھی رُلایا اسکا شکر ہے، اسی کے حکم سے زندہ رہے اور اسی کے حکم پر جان دیتے ہیں۔''

اسکے بعد فرمایا کہ: ''موت آ گئی ہے خدا تعالیٰ سے ملاقات کا وقت قریب ہے سب نے آپ سے قریب ہو کر یہ عرض کیا کہ اے ابوعبداللہ! اس وقت آپ کے باطن کا کیا حال ہے؟ فرمایا: نہایت خوش ہوں صحبت اولیاء اللہ کی وجہ سے اور میں اہل علم کو اولیاء سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ کو حضرات انبیاء کے بعد علماء سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہے، نیز میں مسرور ہوں اور خوش دل ہوں کیونکہ میری تمام عمر علم کی طلب اور اسکی تعلیم میں بسر ہوئی اور اپنی سعی کو مشکور خیال کرتا ہوں، اس لیے کہ جو عمل حق تعالیٰ نے ہم پر فرض کئے یا اسکے پیغمبر نے مسنون فرمائے وہ سب ہم کو پیغمبر کی زبان سے پہنچے اور آپ کے ارشاد سے انکا ثواب معلوم ہوا مثلاً حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نماز کی محافظت کرے اس کو ایسا ایسا ثواب ملے گا اور جو کوئی خانہ کعبہ کا حج کرے گا اسکا یہ ثواب ہے اور جو کوئی شخص کفار کیساتھ جہاد کرے اسکا خدا کے نزدیک یہ رتبہ ہے اور ان معلومات کو علم حدیث کے طالب علم کے سوا اور کوئی شخص تفصیل اور صحت کے ساتھ معلوم نہیں کر سکتا پس یہ علم گویا نبوت کی میراث ہے کیونکہ ادبیات وعقلیات وریاضیات اور ایسے ہی دوسرے علم

کو بغیر طریقہ نبوت کے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے بخلاف علم ثواب وعقاب اور علم شرائع وادیان کے کیونکہ بغیر چراغ دانِ نبوت کے ان کے انوار کو حاصل کرنا محال ہے پس جو شخص اس علم کی طلب میں پڑ گیا اور اسی شوق میں گرفتار رہا عجب کرامت اور ثواب دیکھتا ہے جو انبیاء کی کرامت اور ثواب کے مشابہ ہے اور جسکی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے'' (بستان المحدثین:۳۶)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا آخری کلام

اس کے بعد فرمایا کہ:

۱)...... میں تم کو ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ حدیث سناتا ہوں جو اس وقت تک روایت نہیں کی میں نے سنا ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتے ہیں، اگر کوئی شخص اپنی نماز میں خطا کرے اور وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ کس طرح نماز ادا کرنی چاہیئے اور یہ شخص اس مسئلہ کو مجھ سے دریافت کرے اور میں اسکو نماز کے فرائض اور سنتوں اور آداب بتلادوں اور اس کے طریقہ ثواب کو بیان کروں تو میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ کوئی شخص مجھ کو تمام دنیا کی دولت دے اور میں اسے خدا کے راستے میں صرف کردوں۔

۲)...... خدائے بزرگ و برتر کی قسم! اگر مجھ کو کسی علمی مسئلہ یا روایات حدیث میں سے کسی روایت میں کوئی شبہ پیش آئے اور میں اسکی دھن و تلاش میں اپنے قلب کو ایسا مصروف کروں کہ بیداری و خواب کی حالت میں اس طرح گزاردوں کہ نہ دن کو چین ملے نہ رات کو بستر پر آرام معلوم ہو، اور تمام شب اس شبہ کے باعث میرا دل مکدر رہے اور پھر صبح کے وقت کسی عالم کے پاس جا کر اسے حل کر کے اطمینان حاصل کروں تو میرے نزدیک ایک سو حج مقبول سے بہتر ہے۔

۳)...... ابن شہاب یعنی زھری سے میں نے بارہا سنا ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ خدائے بزرگ و برتر کی قسم! اگر کوئی شخص اپنے دینی معاملات میں سے کسی معاملہ میں مجھ سے مشورہ کرے اور میں اس میں تامل و تفکر کے بعد جیسا کہ مشیر کے ذمہ ہے بہتر رائے قائم کر کے اسکو رائے حق بتلادوں کہ اسکے دین کی اصلاح ہو جائے اور اس شخص کو اس رابطہ و تعلق میں جو اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے کوئی خلل پیش نہ آئے تو میرے نزدیک یہ ایک سو غزوہ سے بہتر ہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ یہ سب سے آخری کلام ہے جو میں نے حضرت امام سے سنا ہے۔ (بستان المحدثین:۳۹)

تار کی خبر معتبر نہیں

ایک مرتبہ والی چترال نے حضرت مفتی اعظمؒ (مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں ایک تار بھیجا جس میں دریافت کیا گیا کہ دہلی میں عید کا چاند ہو گیا یا نہیں؟ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود نہ تھے، مدرسہ امینیہ میں چند چترالی طلباء تھے انہوں نے تار کا جواب دے دیا کہ چاند ہو گیا اسکے مطابق چترال میں صبح کو عید کر لی گئی والی چترال نے حضرت کو خط لکھا کہ میں آپکا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ایک بڑا اختلافی مسئلہ حل فرمادیا یعنی یہ کہ اگر چاند کی اطلاع بذریعہ تار کے معتبر نہیں ہوتی تو آپ تار کا جواب نہ

دیتے حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے تار اور اسکے جواب کی مجھے قطعاً کوئی خبر نہیں، کب آپ نے تار دیا اور کب میں نے اسکا جواب دیا؟ اور یہی تار کی خبر کے غیر معتبر ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ (سراغ زندگی: ۱۲۹)

جنہیں سلام کرنا ممنوع ہے

مندرجہ ذیل صورتوں میں کسی شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے اور کوئی شخص ایسی حالت میں سلام کرے تو ان حالتوں والے شخص پر اس کا جواب دینا واجب نہیں:

(۱) حالت نماز میں (۲) حالت ذکر میں (۳) حالت خطبہ میں (۴) حالت درس وتدریس میں (۵) حالت تلاوت میں (۶) حالت اذان میں (۷) حالت اقامت میں (۸) حالت دعا میں (۹) حالت تسبیح میں (۱۰) شرعی مسائل پر بات کرنے والے کو (۱۱) فیصلے کے دوران (قاضی کو) (۱۲) کسی کے کھانے پینے کے دوران (۱۳) اجنبی عورت کو (۱۴) برہنہ شخص کو (۱۵) تلبیہ (لبیک) کہنے کی حالت میں (۱۶) حالت امامت میں (۱۷) قضاء حاجت کے دوران (۱۸) حمام میں (۱۹) حالت وعظ میں (۲۰) مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والوں کو۔

اور درج ذیل صورتوں میں بھی سلام کرنا مکروہ ہے اور اگر یہ لوگ کسی کو سلام کریں تو انکے سلام کا جواب دینا واجب نہیں۔

☆ اعلانیہ فسق وفجور میں مبتلا شخص ☆ بھیک مانگنے والا ☆ غیبت کا عادی ☆ سونے والا ☆ شطرنج اور جوا کھیلنے والا ☆ گانے بجانے والا ☆ کبوتر باز ☆ پاگل ☆ اونگھنے والا ☆ گالی بکنے والا ☆ بات بات پر جھوٹ بولنے والا ☆ شرابی ☆ زندیق ☆ کافر۔ (ردالمحتار [شامی]: ۱/۴۱۴)

مسلح ہو کر نکلو

حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ (مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ وضو مومن کا ہتھیار ہے، اس لیے مسلح ہو کر نکلو، اس سے بدنگاہی اور دوسری چیزوں سے حفاظت ہوگی۔ شیطان جب تم کو مسلح دیکھے گا تو اسے تمہارے پاس آنے کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ وہ تو دور ہی سے بھاگ کھڑا ہوگا۔ فرمایا اس لیے ہم لوگوں کو مسلح نکلنا چاہیے، اس کے فائدے ان شاء اللہ آپ خود محسوس کریں گے۔

(باتیں ان کی یاد رہیں گی: ۹۰)

مسائل فقہیہ کا معاملہ بہت نازک ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آج کل مسائل فقہیہ میں لوگ بہت دلیر ہیں، سب سے زیادہ مجھ کو فقہ ہی میں بولتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ مسائل کا بہت نازک معاملہ ہے اس میں ہر گز ہر شخص کو دخل نہ

دینا چاہیے۔ فقہ کا فن بڑا ہی نازک ہے میں اتنا کسی چیز سے نہیں ڈرتا جتنا اس سے ڈرتا ہوں، جب کوئی مسئلہ یا فتویٰ سامنے آتا ہے، دور دور کے احتمالات ذہن میں آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں اب فتاویٰ میں دوسروں کا حوالہ دیتا ہوں اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بعضے اسی کے اندر زیادہ بے باک ہیں حالانکہ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ (حسن العزیز)

گدھے کے سینگ

حضرت مولانا امین اوکاڑوی رحمہ اللہ نے کھلا خط بنام چوہدری ابوطاہر محمد زبیر علی زئی کے آخر میں لکھا کہ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ کے رسالے سے یہ بات درجہ یقین کو پہنچ گئی کہ آپ رفع الیدین کے مسئلہ میں دلائل شرعیہ سے ایسے عاری ہیں جیسے گدھا سینگوں سے۔ (تجلیات صفدر: ۵۵۳/۱)

ہار یا پٹہ

ایک مجلس میں حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ غیر مقلد تقلید کا معنی پٹہ کرتے ہیں جبکہ حدیث میں ہار کے معنی پر بھی لفظ قلادہ آیا ہے۔ فرمایا چونکہ ہم انسان ہیں اس لیے انسانوں والا معنی مراد لیتے ہیں اور غیر مقلد چونکہ جانور ہیں اس لیے وہ جانوروں والا معنی مراد لیتے ہیں۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۲۷)

ہزار درجہ کا ضعیف غیر مقلد

ایک غیر مقلد نے امام صاحب پر جرح کی اور کہا کہ وہ ضعیف تھے حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا! تو ہزار درجے کا ضعیف ہے۔ وہ بہت بگڑا کہ میرے ضعیف ہونے پر کیا دلیل ہے۔ مبہم جرح عدالت میں قبول نہیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا! جب تم جیسے عام آدمی پر مبہم جرح قبول نہیں تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جن کی امامت فی الفقہ محدثین کے ہاں بھی مسلم ہے ان پر مبہم جرح کیسے قبول ہوگی؟ کہنے لگا: محدث ابن عدی کا فیصلہ ہے اور تم مقلد ہو اس لیے اس کی بات مانو۔ حضرت نے فرمایا: ابن عدی کا امام امام شافعی رحمہ اللہ ہے میں تو ان کا بھی مقلد نہیں ابن عدی کا مقلد کیسے بن جاؤں۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۲۹)

زندہ غیر مقلد کی غائبانہ نماز جنازہ

ایک غیر مقلد نے غائبانہ نماز جنازہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی مسلم غائبانہ نماز جناہ کا منکر نہیں ہوسکتا حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کیوں؟ کہنے لگا! سب مسلمان نماز جنازہ میں یہ الفاظ پڑھتے ہیں" وشاھدنا وغائبنا" اس سے ثابت ہوا کہ جنازہ حاضر کا بھی ہوتا ہے اور غائب کا بھی۔ حضرت اقدس رحمہ اللہ نے فرمایا: اس سے پہلے وہ یہ بھی پڑھتے ہیں:" حینا ومیتنا" تو ان الفاظ کا بھی یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح مردوں کا جنازہ ہے اسی طرح زندوں کا بھی ہے پھر تو ہم تیرا بھی جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔ کہو تو اعلان کر

دیں؟ وہ گھبرا کر بھاگ گیا۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۳۰)

ترکہ اور اس کی تقسیم اور ایک الائچی

مرنے والا انتقال کے وقت اپنی ملکیت میں جو کچھ منقولہ اور غیر منقولہ مال و جائیداد، نقد روپیہ، زیورات، کپڑے اور کسی بھی طرح کا چھوٹا بڑا سامان چھوڑتا ہے خواہ سوئی دھاگہ ہی ہو، از روئے شریعت وہ سب اس کا ترکہ ہے انتقال کے وقت اس کے بدن پر جو کپڑے ہوں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ نیز میت کے جو قرضے کسی کے ذمہ رہ گئے ہوں اور میت کی وفات کے بعد وصول ہوں وہ بھی اس کے ترکہ میں داخل ہیں۔

میت کے کل ترکہ میں ترتیب وار چار حقوق واجب ہیں۔ ان کو شرعی قاعدے کے مطابق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا وارثوں کی اہم ذمہ داری ہے، یہاں تک کہ اگر میت کی جیب میں ایک الائچی بھی پڑی ہو تو کسی شخص کو یہ جائز نہیں کہ سب حقداروں کی اجازت کے بغیر اس کو منہ میں ڈال لے۔ کیونکہ وہ ایک آدمی کا حصہ نہیں۔

وہ چار حقوق یہ ہیں

۱)...... تجہیز و تکفین۔ ۲)...... دین اور قرض، اگر میت کے ذمہ کسی کا رہ گیا ہو۔ ۳)...... جائز وصیت اگر میت نے کی ہو۔ ۴)...... وارثوں پر میراث کی تقسیم۔

بقیہ تفصیل حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احکام میت'' میں ملاحظہ کیجیے۔ (احکام میت: ۱۵۱)

یتیم کا مال

حضرت حمدون قصار اپنے ایک بیمار دوست کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور کافی دیر رات گئے تک اس کے پاس بیٹھے رہے اسی اثناء میں اس کا انتقال ہو گیا، آپ نے حاضرین کو کہا اس کے سرہانے جو چراغ جل رہا ہے اسے بجھا دو۔ لوگوں نے کہا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ فرمایا جب تک ہمارا دوست زندہ تھا یہ اس کا مال تھا لیکن اب یہ اس کے یتیم بچوں کا مال ہے۔ ہمیں اس کی استعمال کی اجازت نہیں۔ (خزینہ: ۱۹۳)

ترکہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے وفات کے وقت گیارہ لڑکے چھوڑے تھے۔ ان کا کل ترکہ سترہ دینار تھا، پانچ دینار ان کے کفن پر صرف ہوئے، دو دینار سے قبر کے لیے زمین خریدی گئی۔ باقی رقم گیارہ لڑکوں میں تقسیم ہوئی، ہر لڑکے کے حصے میں انیس، انیس درہم آئے۔

ہشام بن عبدالملک نے بھی گیارہ لڑکے چھوڑے تھے ان میں سے ہر ایک کو دس دس لاکھ درہم ملے لیکن بعد میں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ایک لڑکے نے ایک دن میں سو گھوڑے

جہاد کے لیے دیے اور ہشام کے ایک لڑکے کو لوگ صدقہ دے رہے تھے۔ (ایضاً ۱۹۷)

دندان شکن

سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے دوران بحث یہ کہا کہ داڑھی رکھنا خلاف فطرت ہے۔ سید صاحب نے پوچھا وہ کیوں؟ کہنے لگا، اس لیے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر داڑھی نہیں ہوتی لہذا داڑھی منڈوانی چاہیے، آپ نے فرمایا پھر تو تم اپنے دانت بھی توڑ ڈالو، کیونکہ یہ بھی خلاف فطرت ہیں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے منہ میں دانت کہاں ہوتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سید صاحب نے خوب دندان شکن جواب دیا (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) دانت توڑ جواب (۲) خاموش کرنے والا جواب) (خزینہ: ۲۶۲)

جرم کا اندراج

ایک عامل نے اپنے دفتر میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی ایک خفیہ بات پر کان لگائے ہوئے تھا، اس نے اس کو مارنے اور قید کرنے کا حکم دیا، محرر قید خانہ نے سوال کیا کہ رجسٹر جیل میں اس کا جرم کیا درج کیا جائے۔ عامل نے کہا لکھو:

"استرق السمع فاتبعه شهاب ثاقب" (ایضاً: ۲۷۳)

مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

ایک مرتبہ کسی شخص نے امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضرت! حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی لڑائیوں اور جنگ صفین کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

امام صاحب نے فرمایا: قیامت کے روز جن باتوں کی پرسش ہوگی ان کا ڈر لگا رہتا ہے ایسے واقعات خدا تعالیٰ مجھ سے نہیں پوچھے گا اس لیے ان واقعات پر چنداں توجہ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (عقود الجمان)

علقمہ اور اسود میں افضل کون؟

امام اعظم سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت علقمہ اور اسود میں افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا بخدا! [illegible]ت یہی ہے کہ میں ان دونوں کے عزت و احترام کے لیے ان بزرگوں کو دعائے استغفار سے یاد [illegible]ر میرے لیے اس کی حاجت کیا ہے اور مجھے کیا پڑی ہے اور میری حیثیت کیا ہے کہ میں ایک کو دوسر[illegible]یلت دوں۔ (خیرات الحسان)

طاقتور کون حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ؟

[illegible]ضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ مسجد کوفہ میں تشریف فرما تھے کہ مشہور رافضی مناظر شیطان طاق آپ کے

پاس حاضر ہوا، اور کہا یہ بتائیے کہ لوگوں میں سب سے بڑا طاقتور اور اشد الناس کون ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک اشد الناس حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور تمہارے نزدیک اشد الناس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ شیطان طاق ٹپٹایا اور کہا تم نے بات الٹی کردی اصل میں ہمارے نزدیک اشد الناس کا مصداق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمہارے نزدیک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

ابوحنیفہ نے فرمایا: ہرگز ایسا نہیں، ہم جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اشد الناس قرار دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے جب انہیں معلوم ہوگیا کہ خلافت کا استحقاق ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو ہے تو انہوں نے اسے تسلیم کرلیا اور تمام عمر، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی اور تم لوگ کہتے ہو کہ خلافت حضرت کا حق تھا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جبراً ان سے یہ حق چھین لیا تھا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اتنی قوت اور طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنا حق ابوبکر رضی اللہ عنہ سے واپس لیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے نزدیک ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ طاقتور اور قوت والے تھے۔

شیطان طاق رافضی، ابوحنیفہ کا یہ جواب سن کر لال پیلا ہو کر بھاگ گیا۔ (عقود الجمان)

دیہاتی کی جہالت

ایک دیہاتی اذان کے وقت سحری کھا رہا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ سحری کا وقت ختم ہوئے تو پانچ منٹ ہوگئے۔ تو کہا، ہوجانے دے پانچ منٹ بعد روزہ افطار کرلوں گا۔ اس طرح میرا روزہ پورا ہوجائے گا۔ یہ اس کی جہالت ہے۔ ورنہ صبح صادق کے بعد کھانے سے روزہ کہاں ہوگا۔ (ایضا: ۸۸)

سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کی تبدیل مذہب کا مفصل قصہ

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث سننے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے ایک عالم کو مقرر کر رکھا تھا۔ جو ان کو حدیث سنایا کرتے۔ اب یا سنانے والے عالم شافعی المسلک تھے یا کتاب شوافع کی تھی۔ اس لئے زیادہ احادیث شوافع کے موافق آتے۔ سلطان محمود حنفی تھے۔ یہ دیکھ کر کہ احادیث میرے سامنے زیادہ تر شوافع کی مؤید آرہی ہیں۔ حنفیہ کے خلاف ہے۔ طبیعت پریشان ہوئی۔ دونوں طرف کے علماء سے مناظرہ کرایا۔ طے یہ ہوا کہ سلطان کے سامنے ہر دو مسلک کی دو رکعت پڑھ کر دکھائی جائے۔ اس کے بعد سلطان کو اختیار ہوگا۔ جس مسلک کو چاہے پسند کرے۔ اس کام کے لئے قفال مروزی طے ہوئے۔ انہوں نے پہلے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے موافق دو رکعت اس طرح پڑھیں کہ پہلے ایک کتا منگوایا۔ اس کو ذبح کرکے اس کی کھال اتاری اور اس کو ستر عورت کے لئے استعمال کیا۔ پھر نبیذ تمر سے وضو کیا۔ جس میں نہ استقبال قبلہ کی رعایت کی اور نہ بسم اللہ پڑھی اور نہ نیت کی، نہ ترتیب کی رعایت کی۔ اس کے بعد کھڑے ہوئے۔ اور تکبیر تحریمہ اس طرح فارسی میں کہی کہ "خدا بزرگ تر است" اس کے بعد قرأت بھی فارسی میں کی۔ وہ بھی بقدر ایک آیت "دو باغ سبز" ﴿مُدْهَامَّتَانِ﴾ اس کے بعد فوراً رکوع کیا، نہ اس میں تسبیح پڑھی اور نہ اس کے بعد قومہ کیا۔ اسی طرح دوسری رکعت پوری کرکے بقدر تشہد قعدہ کیا۔ اور "خروج بصنعه" یعنی زور سے ریح

خارج کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور کہا۔ "هذه صلوة أبي حنيفة رحمہ اللہ" اور یہ سب اس لئے کیا کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک ذبح سے غیر ماکول کی کھال بھی پاک ہو جاتی ہے۔ نبیذ تمر سے وضو جائز ہے۔ وضو میں تسمیہ، ترتیب، نیت وغیرہ شرط نہیں۔ تکبیر تحریمہ ہر ایسے لفظ سے صحیح ہے جو حق تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کرتا ہو۔ اور شائبہ احتیاج عبد سے پاک ہو، گو غیر عربی ہو۔ اسی طرح فارسی میں قرأت کرنا جائز ہے۔ اور بقدر ایک آیت فرض ہے۔ نہ فاتحہ فرض ہے، نہ سورۃ ملانا، نہ تعدیل ارکان، نہ قومہ نہ جلسہ۔

اس کے بعد مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کے مطابق دو رکعت اس طرح پڑھیں کہ نہایت عمدہ پوشاک زیب تن کی، صاف شفاف پانی سے اونچی جگہ مستقبل قبلہ ہو کر وضو کیا، جس میں تسمیہ، نیت، ترتیب وغیرہ جملہ امور کی پوری رعایت کی۔ پھر نہایت متانت کیساتھ نماز شروع کی، تکبیر تحریمہ عربی میں کہی۔ قرأت بھی عربی میں کی۔ غرض جملہ امور کی رعایت کرتے ہوئے دو رکعت پوری کی اور کہا: "**هذه صلوة الشافعي رحمہ اللہ فانتقل من مذهب ابي حنيفه رحمہ اللہ الى مذهب الشافعي رحمہ اللہ**" یعنی یہ حال دیکھ کر سلطان محمود مذہب امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منتقل ہو گئے۔

مفتی محمود گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ "وفیات الاعیان" میں یہیں تک لکھا ہے۔ تکمیل دوسری کتاب سے میں نے کر دی۔ کہ اس واقعہ کا علم کسی دل جلے حنفی کو ہوا۔ تو اس نے سلطان محمود کو کہا کہ مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کی نماز صحیح پڑھ کر نہیں دکھائی گئی۔ میں دکھاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے دو مٹکے پانی منگوایا اور ان میں سے ایک میں پیشاب کر کے دونوں کو ایک جگہ ملا لیا پھر اس نے وضو کرنا شروع کیا۔ اس لئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ "**اذا بلغ الماء قلتين لم يحمل الخبث**" کہ پانی جب دو مٹکے کے برابر ہو جاتا ہے۔ تو نجس نہیں ہوتا۔ اس پر سلطان محمود نے کہا۔ کہ بس بس معلوم ہو گیا۔ "**فانتقل من مذهب الشافعي الى مذهب ابى حنيفه**" یعنی اس کے بعد سلطان محمود پھر مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منتقل ہو گئے۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف: ۵۸)

مردہ گائے کو حلال کرنے کا وظیفہ

مولوی حکیم غلام ربانی خاں صاحب بن افسر الاطباء حکیم عبد القادر صاحب شاہجہانپوری بہت بڑے رئیس اور حاذق طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی بذلہ سنج اور خوش طبع انسان تھے۔ ایک دفعہ قصہ سنایا کہ صاحب! ایک پیر صاحب تھے جن کے کشف و کرامات کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ دور دور سے ان کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ مگر وہ پیر صاحب تھے بالکل جاہل مطلق۔ ایک دن شہرت سن کر ایک مولانا صاحب بھی ان کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ جیسے ہی مولانا موصوف آ کر بیٹھے۔ پیر صاحب کا ایک نوکر بھاگتا ہوا آیا۔ اور کہا کہ میاں! گائے تو مر گئی۔ میاں صاحب نے فرمایا اب تو مر گئی خیر، اچھا جاؤ۔ تم لوگ اس کی کھال اتارو۔ میں ابھی اس کو حلال کر دوں گا۔ اور گوشت قصائی کو دے دوں گا۔ یہ سن کر مولانا صاحب ایک دم چونکے اور بول اٹھے۔ حضرت! مری ہوئی گائے کو آپ کیسے حلال کر دیں گے؟ پیر

صاحب نے چمک کر فرمایا کہ اجی جناب! یہی سب تو وہ خاص خاص دعائیں اور وظائف ہماری خانقاہ میں ایسے ایسے ہیں۔ جس سے ہماری خانقاہ دور دور تک مشہور ہے۔ مری ہوئی گائے تو کیا؟ ہم تو مرا ہوا ہاتھی بھی حلال کر سکتے ہیں۔ مولانا صاحب نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور کرامت مآب! خدا کے لئے ذرا یہ دعائیں ہمیں بھی تو سنا دیجئے۔ پیر صاحب نے فرمایا! خیر تم بہت بڑے مولانا ہو تو سن لو، ﴿اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ پڑھ کر تو ہم مری ہوئی گائے کو حلال کر دیتے ہیں، اور ﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ﴾ پڑھ کر ہاتھی حلال کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر مولانا صاحب ایک دم مجلس سے کود کر بے تحاشا بھاگے۔ لوگوں نے کہا، کہ ہاں ہاں یہ کیا؟ ارے مولانا بھاگتے کیوں؟ مولانا نے فرمایا کہ بھائی! مجھے یہ خطرہ درپیش ہو گیا کہ کہیں پیر صاحب ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ﴾ پڑھ کر مجھے بھی حلال نہ کر ڈالیں۔

دلجمعی اور فراغ خاطر افادہ واستفادہ

ایک شخص نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ فقہ حاصل کرنے میں کیا چیز معین ثابت اور مددگار ثابت ہو سکتی ہے؟

فرمایا: فراغ خاطر (دل کی فراغت)

انہوں نے عرض کیا: دلجمعی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔

ارشاد فرمایا: تعلقات کم کیے جائیں۔

عرض کیا گیا: تعلقات کیونکر کم ہو سکتے ہیں؟

فرمایا! انسان ضروری چیزیں لے لیں اور غیر ضروری چھوڑ دے۔

ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ علم فقہ سے آپ کیونکہ مستفیض ہوئے ارشاد فرمایا:

"ما بخلت بالا فادة ولا استنكفت عن الاستفادة"

میں نے علم کی اشاعت وتدریس میں کبھی بخل نہیں کیا اور علم حاصل کرنے میں کبھی سستی اور غفلت پہلو تہی اور اعراض وانکار سے کام نہیں لیا۔ (درمختار: ج ۱/۵)

موت کب واقع ہو گی؟

ایک مرتبہ خلیفۂ وقت نے ملک الموت کو خواب میں دیکھا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ میں نے خواب میں حضرت عزرائیل علیہ السلام کو دیکھا تو اس سے دریافت کیا کہ اب میری باقی زندگی کتنی رہ گئی ہے تو اس نے میرے سوال کے جواب میں پانچوں انگلیاں اٹھا دیں، میں نے اس کی تعبیر بہت جگہ سے دریافت کی مگر کہیں سے جواب نہیں ملا، اب آپ ہی اس مسئلہ کو حل فرما دیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا: پانچ انگلیوں سے ان پانچ چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں اول قیامت کب آئے گی، دوم بارش کب ہو گی، سوم حاملہ کے پیٹ میں کیا

ہے، چہارم کل انسان کیا کرے گا، پنجم یہ کہ موت کب اور کہاں آئے گی؟ (تذکرۃ الاولیاء)

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی محتاط گفتگو طوسی کے لیے وبال جان بن گئی

منصور کے درباریوں میں ایک صاحب جن کا نام ابوالعاس طوسی تھا حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روز افزوں مقبولیت ان کو بھی دوسرے حاسدوں کی طرح ایک لمحہ نہ بھاتی تھی ایک روز جب خلیفہ منصور کا دربار لگا ہوا تھا تو اس نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے برسر دربار امام صاحب سے مسئلہ دریافت کرتے ہوئے کہا:

اے ابوحنیفہ! یہ بتایئے کہ اگر امیر المومنین ہم میں سے کسی کو حکم دیں کہ فلاں آدمی کی گردن ماردو اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس شخص کا قصور کیا ہے تو کیا ہمارے لیے اس کی گردن مارنی جائز ہوگی؟

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالعاس سے برجستہ جواب فرمایا کہ: ابوالعاس! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ امیر المومنین صحیح حکم دیتے ہیں یا غلط؟

ابوالعاس طوسی نے کہا کہ: امیر المومنین غلط حکم کیوں دینے لگے ان کا تو ہر حکم صحیح ہوتا ہے۔

تب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تو صحیح حکم کے نافذ کرنے میں تردد کی گنجائش کیا ہے۔

طوسی امام صاحب سے یہ جواب پا کر کھسیانا ہو کر بے حد شرمندہ ہوا جس حال میں وہ امام صاحب کو پھانسنا چاہتا تھا وہ خود پھنس گیا۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا (عقود الجمان)

تکفیر میں حزم واحتیاط اور فتویٰ میں تقویٰ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حتی الامکان مومن کی تکفیر سے احتراز اور فتوی کفر میں حد درجہ حزم واحتیاط برتتے تھے، ظاہر پر باطن اور فتوی پر تقوی غالب رہتا تھا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ ایک مسلمان کے قول میں کفر کی ننانوے وجوہات ثابت ہو جائیں اور صرف ایک وجہ ایمان موجود ہو تو اسکو ترجیح دی جائیگی، چنانچہ امام ابوحنیفہ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے اور یہ واقعہ مختلف کتابوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

کہ ایک شخص امام ابوحنیفہ کی مجلس میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ حضرت ایک شخص جو ایمان واسلام کا دعویٰ کرتا ہے خود کو مسلمان کہلواتا ہے مگر اسکے باوجود:

۱)...... وہ جنت کی خواہش نہیں رکھتا۔ ۲)...... اور نہ اسے نار جہنم کا خوف ہے۔ ۳)...... میتہ (غیر مذبوح چیز) بلا جھجک کھا جاتا ہے۔ ۴)...... نماز پڑھتا ہے مگر رکوع سجدہ نہیں کرتا۔ ۵)...... گواہی دیتا ہے مگر دیکھے بغیر۔ ۶)...... اسکے ہاں فتنہ محبوب اور حق مبغوض ہے۔ ۷)...... رحمت سے دور بھاگتا ہے۔ ۸)...... یہود

اور نصاریٰ کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔

بظاہر ہر یہ سب وجوہات کفر ہیں جو ا ٓمیں موجود ہیں ایسے شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

اگر آج کا زمانہ ہوتا تو سوال ختم ہونے سے پہلے ہی کتنے کفر کے فتوے لگ چکے ہوتے مگر یہ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں جن کو قدرت نے سواداعظم اہل سنت کی امامت کا شرف بخشا ہے بغیر کسی تردد کے فرمایا: ''میرے نزدیک وہ شخص مومن ہے۔''

سائل کو حیرت ہوئی تو امام صاحب نے فرمایا اسلیے کہ:

۱)...... اس پر اللہ کی خواہش غالب ہے جب اللہ ہی اسکا مطلوب ہے تو جنت کی خواہش کی اسے کب پروا۔

۲)...... اسے نار جہنم کا نہیں بلکہ رب النار کا خوف ہے۔

۳)...... میتہ (غیر مذبوح چیز) کھاتا ہے مچھلیوں کی صورت میں۔

۴)...... نماز جنازہ پڑھتا ہے اور ا ٓمیں رکوع اور سجدہ نہیں۔

۵)...... توحید و رسالت کی گواہی دیتا ہے (یعنی کلمہ شہادت پڑھتا ہے) حالانکہ اس نے خدا کو دیکھا ہے نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

۶)...... ﴿اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ﴾ قرآن نے اموال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے۔ اسے محبوب رکھنا انسان کی فطرت ہے۔

موت امر حق ہے مگر ذوق عبادت اور جمع حسنات کی وجہ سے اس سے بغض رکھتا ہے یہ (ناپسند کرنا) محمود ہے۔

۷)...... بارش اللہ کی رحمت ہے اس سے دور بھاگتا ہے کہ بھیگ جانے سے بچ جائے۔

۸)...... یہود کے اس قول کے ﴿لَیْسَتِ النَّصَارٰی عَلٰی شَیْءٍ﴾ اور نصاریٰ کے قول کے ﴿لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ﴾ کی تصدیق کرنا ہے جو عین ایمان ہے۔

سائل وحاضرین، ابوحنیفہ کے اس جواب سے حیرت واستعجاب کے ساتھ انکا منہ تکتے رہ گئے۔ (عقود الجمان:۲۵۱)

مغرور مفتی

ایک مرتبہ مولانا احمد سعید صاحب رحمہ اللہ ناظم جمعیۃ علماء ہند اور مولانا محمد عرفان صاحب جو اس زمانے میں اخبار الجمعیۃ کے مدیر تھے اور مولوی حافظ عبدالغنی دہلوی رحمہ اللہ حضرت کے پاس دولت خانے پر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ ضروری اور اہم معاملے پر گفتگو تھی اسی دوران ایک شخص استفتاء لے کر آیا آپ نے فرمایا کل لے جانا اس نے اصرار کیا کہ ابھی جواب کی ضرورت ہے۔ آپ نے کام چھوڑ کر استفتاء کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ دوسرے حضرات کو کچھ گرانی اور انقباض ہوا، مولوی عبدالغنی صاحب نے فرمایا کہ مولوی عبدالحق

ؒ (مصنف تفسیر حقانی) نے استفتاء کے جواب کے لئے خاص وقت مقرر کر رکھا تھا اسکے علاوہ اگر کوئی شخص استفتاء لے کر آیا تو جھڑک دیا کرتے تھے اس پر مولانا محمد عرفان نے کہا کہ حافظ صاحب وہ زمانہ اور تھا اگر موجودہ دور میں ایسا کیا جائے تو دوسرے ہی دن دیواروں پر بہت بڑا پوسٹر دکھائی دے گا جس کا عنوان جلی حروف میں ہوگا "مغرور مفتی" اس پر چاروں حضرات کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ (سراغ زندگی:۱۳۰)

فتوائے کفر سے احتراز

۱) حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب ؒ کے ایک شاگرد مولوی سید محمد فاروق (ناظم" بچوں کا گھر") کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک استفتاء صوبہ سرحد سے آیا سوال یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنے خسر کو جو مشہور عالم دین تھے، زدوکوب کیا اور سخت توہین کی اس پر جواب تھا اور بہت سے علماء کی تصدیقی دستخط تھے تمام جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ عالم دین کی توہین دین کی توہین اور اس کا مرتکب کافر ہے، لہٰذا وہ شخص کافر ہوگا، مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ میں نے بھی ان تمام جوابات کی تصدیق کی اور حضرت کے سامنے پیش کیا بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: کہ تمام جوابات غلط ہیں آپ نے فرمایا کہ مارنے والا کافر نہیں ہوا کیونکہ اس نے عالم دین کی توہین نہیں کی بلکہ اس شخص کی توہین کی ہے جو کسی خانگی اور نجی جھگڑے میں اس کا مخالف تھا یہ الگ بات ہے کہ اتفاقاً وہ عالم دین بھی تھا لہٰذا اس مارنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائیگا۔

۲)...... ایک مرتبہ ایک استفتاء آیا سوال یہ تھا کہ ایک مسجد کی تعمیر کی جارہی تھی ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا وہ اسکے توسیع میں حائل ہوتا تھا مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا سا حصہ مسجد کو دیدے اس نے مسجد کی شان میں نامناسب الفاظ کہے، آیا وہ شخص کافر ہوا یا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اسکا جواب لکھا کہ مسجد چونکہ شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی توہین کفر ہے لہٰذا وہ شخص کافر ہوگیا، جواب دیکھکر حضرت ؒ نے فرمایا کہ ابھی سے تم نے کافر سازی شروع کردی مفتی بن جاؤ گے تو کیا کروگے؟ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں ننانوے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو جس سے اس کے اندر ایمان ثابت کیا جا سکتا ہو، تو اس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا اس سوال میں تو مسجد کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہوگا؟ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کرو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے، فرض کرو، وہ مسجد مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہو اور اس شخص کو یہ بات معلوم ہوگئی ہو۔ اس لیے اس نے نامناسب یا توہین آمیز الفاظ کہے ہوں۔ اس لیے اتنی جلدی ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ (سراغ زندگی:۱۳۲)

مچھر کا خون

امام یزید بن حبیب ؒ تابعی ایک دفعہ علیل تھے ابن سہیل والئی مصران کی عیادت کو آیا، اثنائے کلام میں اس نے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو۔ اس سے نماز جائز ہے یا نہیں؟ امام نے یہ سن کر غصہ

سے منہ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔ تب امیر نے چلنے کا قصد کیا تو اس کو نظر بھر کر دیکھا اور فرمایا کہ تو روزانہ خدا کے بندوں کا تو خون بہاتا ہے اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہے۔ (علمائے سلف بحوالہ خزینہ ۱۱۷)

کسی کا حق

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی بیوی فاطمہ نے شکایت کی کہ عید الفطر سر پر آ رہی ہے سب لوگ نئے کپڑے پہنیں گے مگر ہمارے لڑکے خلیفہ کے فرزند ہونے کے باوجود پرانے کپڑوں میں پھریں گے، خلیفہ نے بیت المال کے مہتمم کو لکھا ہمارا حق خلافت ایک ماہ پیشگی بھیج دیجیے۔

مہتمم نے جواب ارسال کیا، خلیفہ کا حکم ہے مجھے کوئی عذر نہیں لیکن کیا امیر المومنین کو یہ یقین ہے کہ وہ ایک مہینے تک زندہ رہ سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہو تو پھر بھلا غریبوں کے مال کا حق پیشگی اپنی گردن پر کیوں رکھتے ہو۔ (خزینہ: ۱۷۲)

سنت کی اہمیت

اہوال القیامۃ میں علامہ زین الدین بن رجب نے لکھا ہے ایک مرتبہ ان کے پاس ایک ایسا شخص آیا جو کفن چور تھا مگر وہ اب اس قبیح حرکت سے باز آ چکا تھا۔ اور توبہ کر کے نیکی کی زندگی گزار رہا تھا۔ علامہ زین الدین نے اس سے پوچھا۔ تم مسلمانوں کے کفن چراتے رہے ہو اور تم نے مرنے کے بعد ان کی حالت دیکھی ہے یہ بتاؤ کہ جب تم نے ان کے چہرے کھولے تو ان کا رخ کس طرف تھا؟ اس نے جواب دیا اکثر چہرے قبلے کے رخ سے پھرے ہوئے تھے۔ حضرت زین الدین کو بڑا تعجب ہوا کیونکہ دفن کرتے ہوئے تو مسلمان کا چہرہ قبلہ رخ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں پوچھا تو امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو تین بار "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا پھر فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی میں سنتوں سے منہ پھیرنے والے تھے۔ (خزینہ: ۱۹۲)

الہزل، خوش طبعی

اشعب سے حکایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ مدینہ کے کسی حاکم کے ولیمہ میں شریک ہوا جو بڑا ہی کنجوس تھا۔ چنانچہ وہ لوگوں کو تین روز تک بلاتا رہا اور ایک دسترخوان پر جس میں بکری کا یکسالہ بھونا ہوا بچہ تھا جمع کرتا رہا (بٹھلاتا رہا) لوگ اس کے آس پاس چکر لگاتے رہتے لیکن کوئی چھوتا نہیں تھا کیونکہ حاکم کی کنجوسی سے سب واقف تھے۔ اشعب بھی لوگوں کے ساتھ آتا اور بکری کے بچہ کو دیکھتا تھا، جب تیسرا دن ہو گیا تو اشعب نے کہا: حاکم کی بیوی پر طلاق اگر اس کی عمر ذبح کے بعد اس سے زیادہ نہ ہو جو ذبح سے پیشتر تھی۔ (نفحۃ العرب: ۲۳)

ایاس کی ذہانت

حضرت ایاس کی زیرکی کا ایک قصہ یہ ہے کہ آپ کے پاس دو شخص سرخ اور سبز دو چادروں کے سلسلہ

میں ایک جھگڑا لے کر آئے ان میں سے ایک نے کہا میں غسل کرنے کے لیے حوض میں داخل ہوا، اور میں نے اپنی چادر حوض کے کنارے رکھ دی، اس کے بعد یہ شخص آیا اور اپنی چادر میری چادر کے پاس رکھ کر حوض میں داخل ہوا، اور غسل کر کے مجھ سے پہلے باہر نکل آیا اور میری چادر اٹھا کر چلنے لگا میں نے اس کا پیچھا کیا تو یہ کہتا ہے کہ چادر میری ہے، حضرت ایاس نے کہا: تیرے پاس بینہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں آپ نے کہا پاک کنگھی لاؤ، کنگھی لائی گئی تو آپ نے دونوں کے سر میں کنگھی کی۔ پس ایک کے سر میں سے سرخ اور دوسرے کے سر میں سے سبز اون برآمد ہوئی۔ آپ نے سرخ چادر کا فیصلہ سرخ اون والے کے حق میں اور سبز چادر کا فیصلہ سبز اون والے کے حق میں کر دیا۔ (ایضا:۳۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عجیب وغریب فیصلے

۱)...... حضرت زر بن حبیش سے مروی ہے آپ نے فرمایا: دو آدمی ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھے ان میں سے ایک کے پاس پانچ اور دوسرے کے پاس تین روٹیاں تھیں جب انہوں نے ناشتہ سامنے رکھا تو ایک شخص نے ان کے پاس آکر سلام کیا انہوں نے کہا: تشریف لائیے ناشتہ کیجیے۔ وہ بیٹھ گیا اور ان سب نے مل کر آٹھوں روٹیاں کھالیں (ناشتہ سے فراغت کے بعد) وہ شخص (جو بعد میں آیا تھا) اٹھا اور ان کو آٹھ درہم دیکر بولا: میں نے جو تمہارے ناشتہ سے فائدہ اٹھایا اس کے عوض میں (اپنے اپنے حق کے مطابق) یہ آٹھ درہم لے لو۔

ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ پانچ روٹیوں والے نے کہا: پانچ درہم میرے ہیں اور تین تمہارے، تین روٹیوں والا بولا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوسکتا جب تک آٹھوں درہم ہمارے درمیان برابر نہ ہوں (جب آپس میں فیصلہ نہ ہوا تو) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پورا قصہ کہہ سنایا۔ آپ نے تین روٹیوں والے سے کہا: تیرے ساتھی نے تجھ پر (جو کچھ) پیش کیا وہ (تیرے علم میں ہے) جو اس نے پیش کیا حالانکہ اس کی روٹیاں زائد تھیں۔ پس تو تین درہم پر راضی ہو جا۔ اس نے کہا بخدا میں از روئے حق زیادہ لیے بغیر راضی نہ ہونگا۔ آپ نے فرمایا حق کی رو سے تو تیرا صرف ایک درہم ہے اور اس کے سات۔ اس نے کہا: بہت خوب وہ تو مجھے تین درہم دے رہا تھا اور آپ نے بھی لینے کی طرف اشارہ تب بھی میں راضی نہ ہوا اور آپ فرماتے ہیں کہ حق کی رو سے تیرا صرف ایک درہم ہے آپ نے فرمایا: وہ تجھ کو تین دے رہا تھا وہ تو از روئے صلح دے رہا تھا تو نے کہا میں از روئے حق زیادہ لوں گا، سو از روئے حق تو تیرا ایک ہی درہم ہے: اس نے کہا ذرا مجھے سمجھا دیجیے تا کہ میں قبول کرسکوں۔ آپ نے فرمایا: آٹھ روٹیاں تین تہائی کرنے سے چوبیس ہوتی ہیں جن کو تم تین آدمیوں نے کھایا تھا اور تم میں کم وبیش کھانے والے کا علم نہیں لہذا تم کو کھانے میں برابر ہی شمار کیا جائے گا۔ اس نے کہا جی ہاں بالکل صحیح ہے۔

آپ نے فرمایا: تیرے کل نو ثلث تھے جس میں سے آٹھ تو خود کھا گیا اور پندرہ ثلث تیرے ساتھی

کے تھے جس میں سے اس نے آٹھ ثلث کھائے ہیں اور سات باقی ہیں تیسرے ساتھی نے تمہارے نوثلث میں سے صرف ایک ثلث کھایا لہذا تیرے ایک ثلث کے عوض میں ایک درہم ہے اور تیسرے ساتھی کے لیے سات کے عوض میں سات درہم ہیں اس نے کہا۔ اب راضی ہوں۔ (تحفۃ العرب ۳۲)

۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تھا وہاں کے لوگ شیر کا شکار کرنے کے لئے گڑھا کھودا کرتے تھے اور مختلف تدبیروں سے شیر کو اس گڑھے میں گرا کر اس کا شکار کرتے تھے ایک دن انھوں نے ایسا ہی ایک گڑھا کھودا اور شیر کو اس میں گرادیا آس پاس کے لوگ تماشا دیکھنے کے لئے گڑھے کے اردگرد جمع ہو گئے اور اتنی دھکا پیل ہوئی کہ ایک آدمی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گڑھے میں گرنے لگا، گرتے گرتے اس نے سنبھلنے کے لئے ایک پاس کھڑے ہوئے آدمی کا ہاتھ پکڑا اس سے دوسرے آدمی کے بھی پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھی گرنے لگا اس نے سنبھلنے کے لئے ایک تیسرے آدمی کا ہاتھ پکڑا اور تیسرے نے چوتھے کا یہاں تک کہ چاروں گڑھے میں آرہے، شیر ابھی زندہ تھا اس نے چاروں کو اتنا زخمی کیا کہ وہیں انکی موت واقع ہوگئی اب مرنے والوں کے رشتہ داروں میں جھگڑا شروع ہوا کہ انکا خون بہا کون دے؟ گفتگو میں تیزی آگئی یہاں تک کہ تلواریں تک نکل آئیں اور خونریزی ہوتے ہوتے بچی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ ان چاروں کی دیت (خون بہا) گڑھا کھودنے والے پر ہے لیکن اس ترتیب سے کہ پہلے کو چوتھائی دیت، دوسرے کو تہائی دیت، تیسرے کو آدھی دیت اور چوتھے کو پوری دیت ملے گی بعد میں یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی تصویب فرمائی۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس فیصلے کی وجہ یہ ہے کہ چاروں خطأ قتل ہوئے تھے اور گڑھا کھودنے والا انکی دیت کا ذمہ دار تھا لیکن پہلا شخص مقتول ہونے کیساتھ ساتھ تین آدمیوں کو کھینچنے کیوجہ سے انکا قاتل بھی تھا لہذا جو دیت اسکو ملتی اسکے تین حصے ہر مقتول پر تقسیم ہو کر اسکے لیے صرف چوتھائی حصہ بچا اسی طرح دوسرا شخص دو آدمیوں کا قاتل ہے اسلئے اسکی دیت کے دو تہائی حصے اسکے دو مقتولوں کو اور ایک حصہ خود اس کو ملے گا تیسرا شخص ایک آدمی کا قاتل تھا اس لئے آدھی دیت اسکے مقتول اور آدھی دیت خود اسکی ہوگئی اور چوتھے نے کسی کو نہیں کھینچا، اس لئے اسے پوری دیت ملے گی۔ (تفسیر قرطبی: ۱۵/ ۱۶۳)

۳) حنبش بن المعتمر سے روایت ہے کہ دو شخص قریش کی ایک عورت کے پاس آئے اور دونوں نے اسکے پاس ایک سو دینار امانت رکھے اور دونوں نے یہ کہا کہ یہ ہم میں سے کسی ایک کو مت دینا، جب تک ہم میں کا دوسرا بھی ساتھ نہ ہو، ایک سال گزر جانے کے بعد ان میں کا ایک شخص آیا، اور اس عورت سے کہا کہ میرے ساتھی کا انتقال ہو گیا، وہ دینار واپس دے دیجئے، اس نے انکار کیا اور کہا کہ تم دونوں نے یہ کہا تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کو نہ دینا جب تک دوسرا ساتھی نہ ہو۔ اس لیے تجھے تنہا تو نہ دوں گی۔ اب اس شخص نے اس عورت کے متعلقین اور پڑوسیوں کو تنگ کر دیا اور وہ اس عورت سے کہا سنی کرتے

رہے، یہاں تک کہ اس نے دینار اس کو دیدیے۔ اب ایک سال گذرا تھا کہ دوسرا شخص آیا اور اس نے دیناروں کا مطالبہ کیا۔ عورت نے کہا کہ تیرے ساتھی نے میرے پاس آکر یہ بیان کیا کہ تو مر چکا ہے، وہ سب دینار مجھ سے لے گیا۔ اب یہ دونوں یہ مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لائے۔ آپ نے اس کا فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ عورت نے کہا میں آپ کو خدا کی قسم دیتی ہوں کہ آپ خود فیصلہ نہ کریں اور ہم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس دونوں کو بھیج دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً پہچان لیا کہ دونوں نے مل کر اس عورت کے ساتھ فریب کیا ہے۔ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ کیا تم دونوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کو مت دینا، جب تک دوسرا ساتھی موجود نہ ہو اس نے کہا، بے شک کہا تھا، فرمایا کہ تمہارا مال ہمارے پاس ہے، جاؤ دوسرے ساتھی کو لے آؤ تا کہ دے دیا جائے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۶۹)

علماء کا اختلاف بھی رحمت ہے

ایک روز خلیفہ متوکل نے اپنے ہم نشینوں سے کہا: جانتے ہو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مسلمانوں کو سب سے پہلے کس چیز نے غضبناک کیا؟ ان میں سے ایک شخص نے کہا: ہاں اے امیر المومنین (میں جانتا ہوں وہ واقعہ یہ ہے کہ) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ سے ایک سیڑھی نیچے کھڑے ہوئے اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جگہ سے ایک سیڑھی نیچے کھڑے ہوئے اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ سب سے پہلے اوپر (والی سیڑھی پر) چڑھ گئے۔

مسلمانوں نے اس پر نکیر کی اور چاہا کہ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جگہ سے ایک سیڑھی نیچے کھڑے ہوں حضرت عبادہ نے متوکل سے کہا: اے امیر المومنین آپ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ احسان کرنے والا کوئی نہیں خلیفہ، نے کہا: یہ کیسے؟ اس نے کہا اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منبر کے اوپر چڑھ گئے۔ اگر ہر خلیفہ سابق خلیفہ کی جگہ سے ایک سیڑھی نیچے ہی کھڑا ہوا کرتا تو (آج) آپ ہم کو کنویں میں (کھڑے ہوئے) خطبہ دیتے ہوتے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے (تحفۃ العرب: ۳۵)

ف: اختلاف کی دو قسمیں ہیں مذموم اور مستحسن: مذموم وہ ہے جو عقائد اور اصول دین کی بابت ہو جیسے یہود و نصاریٰ کا اختلاف۔ اور مستحسن وہ ہے جو اعمال اور فروع دین میں ہو "کما قال علیه السلام: اختلاف الامة رحمة" ایک مرتبہ ایک یہودی نے از راہ طعن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم لوگ اپنے نبی کو ابھی دفن بھی نہ کر پائے تھے کہ اختلاف میں پڑ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے اپنے نبی کے کسی اصول میں اختلاف نہیں کیا بلکہ آپ کی ہدایت کے بقا کے لیے اختلاف کیا ہے، تم اپنی کہو کہ دریا کے پانی سے

تمہارے پاؤں سوکھنے بھی نہ پائے تھے کہ اپنے نبی سے کہنے لگے ○ اجعل لنا الھا کما لھم الھۃ○
وھذا من الا جوبۃ المسکۃ

ذہانت

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عدی بن ارطاۃ کے پاس لکھا کہ ایاس بن معاویہ اور قاسم بن ربیعہ جرشی کو جمع کر کے امور قضاء میں جو نافذ تر ہو، اس کو عہدہ قضاء پر مامور کر دو۔ عدی بن ارطاۃ نے دونوں کو جمع کیا۔ ایاس نے کہا کہ آپ میرے اور قاسم دونوں کے متعلق فقیہ بصری حضرات حسن بصری اور محمد بن سیرین سے دریافت کر لیجیے (کہ ہم میں عہدہ قضاء کے لائق کون ہے؟) ان دونوں حضرات کے ہاں قاسم بن ربیعہ کی آمدورفت تھی اور ایاس ان کے پاس آتے جاتے نہ تھے اس لیے قاسم بن ربیعہ نے کہا کہ آپ میرے متعلق دریافت کریں نہ ایاس کے متعلق۔ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک ایاس مجھ سے زیادہ فقیہہ اور امور قضاء کے واقف کار ہیں۔

اگر میں اس قسم میں جھوٹا ہوں تب تو مجھے قاضی بنانا کسی طرح زیبا ہی نہیں اور اگر سچا ہوں تو تسلیم کر لینا چاہیے ایاس نے عدی سے کہا۔ آپ نے ایک شخص کو جہنم کے کنارہ پر کھڑا کیا اس نے جھوٹی قسم کھا کر خود کو بچا لیا جھوٹی قسم سے استغفار کر لے گا اور جس چیز کا خوف تھا اس سے نجات ہو جائے گی۔ عدی نے ایاس سے کہا۔ جب آپ اس مضمر ارادے کو بھی سمجھ گئے تو آپ قاسم سے کہیں زیادہ عہدہ قضاء کے لائق ہیں چنانچہ عدی نے ایاس ہی کو قاضی بنا دیا۔ (فجۃ العرب: ۴۸)

محقق کون ہے؟

ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”علم، استدلال پیدا کرتا ہے اور فراست کو جلا دیتا ہے، مگر فقر و استغناء سے وجدان کو بال و پر ملتے اور زندگی پر رونق ہوتی ہے لیکن محض فقر و استغناء بغیر علم و نظر ایک ایسا درخت ہے جس میں پھول اور پھل نہیں لگتے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: جو شخص صوفی ہوا اور فقیہ نہ ہوا، وہ گمراہ ہوا، اور جو فقیہ ہوا، اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا۔ (مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری: ۵۲)

ایک دلچسپ لطیفہ

ایک مرتبہ ایک افغانی طالب علم نے حضرت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ اگر کسی کو پیشاب کا قطرہ آ جائے تو کیا کرے؟ فرمایا: ڈھیلے سے خشک کر لے، اس نے کہا اگر پھر آ جائے تو کیا کرے؟ فرمایا: کپڑے سے پونچھ لے، کہا اگر پھر آ جائے، فرمایا: پانی سے دھو لے، اس نے کہا اگر پھر آ جائے، فرمایا: انگیٹھی میں رکھ کر سکھا لے۔ (سراغ زندگی: ۱۲۹)

رافضی نے توبہ کی اور شنیع حرکات سے باز آیا

کوفہ کا ایک رافضی حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خلاف بکواس کیا کرتا تھا، کبھی انہیں کافر کہتا اور کبھی یہودی، امام اعظم ابوحنیفہ کو خبر ہوئی تو صحابہ کے دفاع کے لیے تڑپ اٹھے جب تک اس رافضی سے ملاقات نہ کر لی بے چین رہے آخر اس رافضی کے پاس تشریف لے گئے، بڑے ادب محبت اور نرمی سے کہا:

اے بھائی مصر میں میری لخت جگر (بچی) کے لیے فلاں صاحب کی طرف سے منگنی کا پیغام لایا ہوں اللہ نے اس صاحب کو حفظ قرآن کی دولت سے نوازا ہے اس کی تمام رات نوافل اور قرآن کی تلاوت میں گزرتی ہے خدا کا خوف ہمیشہ ہمہ وقت غالب رہتا ہے تقویٰ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

رافضی نے کہا بہت اچھا یہ تو صرف میری لڑکی کے لیے نہیں بلکہ پورے خاندان کے لیے سعادت ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ہاں اگر اس میں ایک عیب ہے مذہب یہودی ہے رافضی کا رنگ بدلا اور جھلا کر بولا کیا میں اپنی لڑکی کی شادی یہودی سے کر دوں؟

تب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بھائی آپ تو اپنے لخت جگر ایک یہودی کے نکاح میں دینے کو تیار نہیں تو کب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک نہیں اپنے نور دل کے دو ٹکڑے (دو بیٹیاں) حضرت عثمان (جو بزعم آپ کے یہودی تھے) کے نکاح میں کیوں دے دیں۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد رافضی کے لیے تنبیہ اور ہدایت کا باعث ہوا، اپنے کیے پر نادم اور خلوص سے تائب ہوا، اور ہمیشہ کے لیے ایسی حرکتوں سے باز آیا۔ (عقود الجمان)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعمش کی مشکل حل کر دی

امام اعمش مشہور تابعی ہیں اور اکابر محدثین میں ان کا شمار ہوتا ہے سلیمان نام تھا۔ ۶۱ھ میں پیدا ہوا، اور ۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ چار ہزار احادیث زبانی بیان کیا کرتے تھے ان کے پاس کتاب نہیں ہوتی تھی ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے اچھے نہیں تھے۔ اعمش کہلانے کی وجہ یہی ہے۔ کہ ان کی آنکھوں میں عموشت (چندھیا پن) آ گئی تھی دوسری جانب ان کی رفیقہ حیات نہایت حسین اور جمیل تھی۔ اپنے حسن وجمال پر اسے غرور تھا بات بات پر اعمش سے جھگڑتی تھی اور ہر کام میں جھگڑنے کی بات پیدا کر لیتی تھی۔ مختلف حیلوں اور بہانوں سے امام اعمش کو تنگ کر کے آپ سے ہمیشہ کے لیے نجات کی خواہش مند رہتی۔

ایک روز عشاء کے بعد کسی مسئلہ پر تنازعہ ہوا دونوں طرف سے بات بڑھ گئی بالآخر بیوی نے امام اعمش سے بولنا بند کر دیا، امام اعمش نے ہزار جتن کیے۔ مختلف ترکیبیں سوجھیں مگر بیوی ان سے بولنے پر کسی طرح رضامند نہ ہوئی۔ آخر غصہ میں آ کر امام اعمش نے قسم کھائی کہ اگر آج کی رات، تو میرے ساتھ نہ بولی تو تجھ پر طلاق بائنہ۔

غصہ اور جذبات میں امام اعمش کے منہ سے یہ الفاظ نکل تو گئے مگر گھریلو حالات چھوٹے بچوں کی

نگہداشت، امور خانہ داری اور زوجہ کی رفاقت میں فطری تسکین خاطر اور دیگر مہم مسائل جب سامنے آئے تو حد درجہ نادم اور پشیمان ہوئے مگر اب کیا ہو سکتا تھا ایک کے پاس گئے، دوسرے سے ملے مگر کوئی تدبیر نہ سوجھی بالآخر امام اعظم ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا، امام ابوحنیفہ نے تسلی دی اور فرمایا کہ کوئی فکر کی بات نہیں اطمینان خاطر رکھیے آج صبح کی اذان آپ کے محلے میں صبح صادق سے پہلے پڑھوادونگا۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خود بہ نفس نفیس مسجد کے مؤذن سے ملے اور انہیں صبح صادق سے قبل اذان کہنے پر رضامند کیا۔ ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی کہ مؤذن نے اذان دے دی۔

ادھر امام اعمش کی بیوی نے جو پہلے ہی بوریا بستر سمیٹے صبح کی اذان کی منتظر بیٹھی تھی اذان سنی تو خوش ہوئی اور جوش مسرت میں بول اٹھی ''خدا کا شکر ہے آج بوڑھے بداخلاق سے میرا دامن پاک ہوا''۔ امام اعمش نے کہا: ''خدا کا شکر ہے کہ مؤذن نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مہربانی سے صبح صادق سے قبل اذان دے کر آپ کے ٹوٹنے والے رشتہ کو میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا''۔ (عقود الجمان)

جاہل بے علم کی حکایت

ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا اور ایک ٹانگ ایک طرف کو اٹھا رکھی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ یہ ٹانگ الگ کیسے کر رکھی تھی۔ کہا کہ اس پاؤں پر کچھ چھینٹ وغیرہ پڑگئی تھیں۔ اس لئے ناپاک تھی اور دھونے کی فرصت نہ تھی اس لئے میں نے اس کو نماز سے خارج کردیا۔ اسی طرح ایک جاہل امام کی حکایت ہے کہ امام نے سجدہ سہو کیا اور ظاہراً کوئی سہو نہ تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی تھی۔ کہتا ہے کہ پھسکی نکل گئی تھی یعنی خفیف سی ہوا خارج ہوگئی تھی اس لئے سجدہ سہو کیا۔ (امثال عبرت ۳۳۴)

عورتوں سے پردہ نہ کرانیوالے پیر کی خباثت

ممبئی میں سنا ہے ایک پیر صاحب ایسے تھے جو عورتوں کو زبردستی اپنے سامنے بلاتے اور کہتے تھے کہ دیکھو جی تم ہم سے اس لئے مرید ہوئی ہو۔ تاکہ قیامت میں تم کو بخشوائیں۔ سو جب ہم تمکو دیکھیں گے نہیں تو ہم قیامت میں کیسے پہچانیں گے اور کیسے بخشوائیں گے۔ ایک شخص نے اس کے جواب میں خوب کہا کہ قیامت میں تو ننگے اٹھیں گے اور تم نے یہاں اپنی مریدنیوں کو کپڑے پہنے دیکھا ہے تو وہاں ننگیوں کو کیسے پہچانو گے۔ لہٰذا ان کو بالکل ننگا کر کے دیکھنا چاہیئے۔ بس پیر صاحب کو اس کا جواب کچھ نہ آیا اور اپنا منہ لیکر رہ گئے۔

ف: آج کل پیروں کے یہاں یہ آفت ہے کہ خود عورتوں کو پردہ نہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ صاحبو! یہ پیری مریدی ہے یا راہزنی اور ڈاکہ ہے۔ پیر تو خدا کا مقرب بنانے کے لئے ہے، مقرب بنائیں گے۔ آج کل کے پیروں کو خداوند کے حقوق کی پرواہ ہے نہ بال بچوں کی، بس اسی کا نام فقیری رکھ لیا ہے۔ کہ تمام اہل حقوق کے حقوق ضائع کر کے پیر صاحب کے حقوق ادا کئے جائیں۔ یہ

سب باتیں اللہ کے، رسول کے خلاف ہیں۔ یاد رکھو! جو شریعت کے خلاف کریگا وہ پیر نہیں ہو سکتا۔ پیر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوتا ہے کہ جو تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اس کو بصیرت اور تجربہ کیساتھ مریدوں تک پہنچاتا ہے۔ تو جو شخص منیب کے خلاف عمل و تعلیم کرتا ہے۔ تو اس کو منیب کا نائب کہنا کہاں درست و جائز ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عمل۔ (کساء النساء، ۲۲۔۲۳)

ساس کو حلال کرنیوالے مولوی کی جہالت

حکایت ہے کہ کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی تھی پھر ساس پر دل آ گیا تو ایک غیر مقلد عالم کے پاس گیا۔ اور کہا مولوی صاحب کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ ساس سے نکاح ہو جائے۔ کہا ہاں۔ بتلا کیا دے گا۔ اس نے کچھ سو، دوسو روپے دینا چاہے۔ کہا اتنے میں یہ فتویٰ نہیں لکھ سکتا۔ کچھ تو ہو۔ واقعی ایمان فروشی بھی کرے تو دنیا کچھ تو ہو۔ غرض ہزار پر معاملہ طے ہوا، اور فتویٰ لکھا گیا۔ وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا ہے، اس میں لکھا تھا کہ ساس بیشک حرام ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ساس کسے کہتے ہیں۔ ساس کہتے ہیں منکوحہ کی ماں کو، اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح منعقد ہوا ہو، اور اس شخص کی عورت چونکہ جاہل ہے۔ اور جاہل عورتوں کی زبان سے اکثر کلمات کفریہ نکل جاتے ہیں اس لئے ضرور ہے۔ کہ اسکے منہ سے بھی کلمہ کفریہ نکلا ہوگا اور نکاح کے وقت اسکو کلمے پڑھائے نہیں گئے اس لئے یہ مرتدہ ہے اور مرتد کیساتھ نکاح صحیح نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ عورت منکوحہ نہیں ہے تو اسکی ماں ساس بھی نہیں پس اسکی ماں کیساتھ نکاح درست ہے۔ رہا یہ کہ وہ منکوحہ کی ماں نہیں تو مزنیہ کی ماں تو ہے جس سے حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ حرمت مصاہرت کا مسئلہ، ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اجتہادی مسئلہ ہے جو ہم پر حجت نہیں۔

ف: حرمت مصاہرت کو اس نے غیر مقلدوں کی مد میں اڑادیا اور ساس کو منکوحہ کی تکفیر سے اڑادیا اور یہ سب ترکیبیں ہزار روپے نے سکھائیں۔

جب علماء میں بھی ایسے ایسے موجود ہیں تو بیچارے دنیا دار، وکلاء کا، تو کام ہی چٹے بٹے لڑانا، ان سے تو کوئی بات بھی بعید نہیں۔ (اصلاح ذات البین: ۶)

آجکل کے محققین کے اجتہاد کرنے کی مزاحیہ حکایت

آج کل کے محققین اور مدققین کا حال ایسا ہے جیسے ایک شخص گلستان دیکھ کر اس کا محقق ہو گیا۔ اتفاق سے دو شخصوں میں لڑائی ہوگئی۔ ایک ان میں سے ان حضرت کے دوست تھے۔ وہ پٹ بھی رہے تھے اور پیٹ بھی رہے تھے آپ نے یہ دیکھ کر دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ انجام یہ ہوا کہ ان کے دوست صاحب خوب پٹے اور آپ اپنی اس حرکت پر بڑے خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے گلستان میں جو پڑھا تھا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست ☆ در پریشاں حالی و درماندگی

آج اسپر عمل کرنے کا اچھا موقع ملا اور اپنے نزدیک دوست کا پورا حق ادا کر دیا۔

ف : تو جیسے وہ گلستان کے محقق تھے ایسے ہی یہ لوگ آج کل قرآن وحدیث کے محقق ہیں۔

ان ہی میں سے ایک شخص کی حکایت ہے کہ انہوں نے امام مقیم کیساتھ نماز پڑھی جب امام دو رکعت پڑھ چکا، آپ دونوں طرف سلام پھیر کر بیٹھ گئے۔ امام نماز میں ہے اور مقتدی پہلے ہی فارغ ہو گیا۔ میں دیکھ کر سمجھا قیام سے کوئی عذر ہوگا۔ جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں مگر میں نے دیکھا کہ ہر رکن میں بیٹھے ہی نظر آتے ہیں۔ اب میں سمجھا کہ آپ نے امام مقیم کیساتھ بھی قصر کیا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے ان سے کہا کہ آپ نے پوری نماز کیوں نہیں پڑھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر ہوں۔

ف : آجکل کے ایسے محقق ہیں جنہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ اگر امام مقیم ہو، تو مقتدی مسافر کو بھی چار رکعت پڑھنی چاہئے۔ (امثال عبرت: ۳۵۳)

چاند کے مہینے

علامہ محمد مغربی نے لکھا ہے کہ قمری کیلنڈر میں چار مہینوں تک مسلسل تیس کا چاند ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد نہیں، اور انتیس کا چاند مسلسل تین ماہ تک ہو سکتا ہے اس کے بعد نہیں۔

اور حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ کسی رمضان کی پانچ تاریخ جس دن ہو، اگلے رمضان کا پہلا روزہ لازماً اسی دن ہوتا ہے، علامہ مغربی کہتے ہیں کہ اس قاعدے کو پچاس سال آزمایا گیا ہمیشہ صحیح نکلا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام حسابات کی حیثیت لطائف سے زیادہ نہیں، احکام شریعت میں اعتبار رؤیت ہلال ہی کا ہے۔ (الیواقیت العصریہ بحوالہ تراشے)

باپ بیٹے کو کس طرح حکم دے؟

علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر باپ کو یہ چاہیے کہ جب وہ اپنے بیٹے کو کوئی حکم دے تو صریح حکم کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے یوں کہے: بیٹے! اگر تم فلاں کام کر لو تو اچھا ہے۔ کیونکہ اگر صراحۃً حکم دیا اور مثلاً یہ کہا کہ: ایسا کرو۔ اور پھر بیٹا کسی وجہ سے نہ کر سکا تو وہ نافرمانی کے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوگا۔ پہلی صورت میں یہ اندیشہ نہیں۔ (خلاصۃ الفتاوی: ۳۴۰/۴)

چور پکڑا گیا اور طلاق واقع نہیں ہوئی

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے "کہ ایک شخص کے گھر میں رات کو چور گھس آئے، مالک مکان کو گرفتار کر لیا اور اس کا سارا سامان سمیٹ کر لیجانے لگے جانے سے پہلے انہوں نے مالک مکان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن انکے سردار نے کہا کہ اسکا سامان تو سارا لیجاؤ مگر اسے زندہ چھوڑ دو، اور قرآن اسکے ہاتھ پر رکھ کر اسے قسم دو کہ میں کسی شخص کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ چور کون تھے؟ اور اگر میں نے کسی کو بتایا تو میری بیوی کو تین طلاق۔"

مالک مکان نے جان بچانے کی خاطر یہ قسم کھائی لیکن بعد میں بڑا پریشان ہوا صبح کو بازار میں گیا تو دیکھا کہ وہی چور چوری کا مال بڑے دھڑلے سے فروخت کر رہے ہیں اور یہ بیوی پر طلاق کے خوف سے زبان بھی نہیں کھول سکتا، عاجز آ کر یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا اور ان سے بتایا کہ رات اس طرح کچھ چور میرے گھر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے مجھے ایسی قسم دی اب میں انکا نام ظاہر نہیں کر سکتا کیا کروں؟

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم اپنے محلہ کے معزز افراد کو جمع کرو میں ان سے ایک بات کہوں گا اس شخص نے لوگوں کو جمع کرلیا امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں پہنچ کر ان سے کہا کہ: ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس شخص کو اس کا مال واپس مل جائے؟''

''ہاں چاہتے ہیں'' ان سب نے کہا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر ایسا کیجئے کہ اپنے ہاں کے سارے غنڈوں کو جامع مسجد میں جمع کیجئے اور پھر ایک ایک کر کے انہیں باہر نکالئے جب کوئی باہر نکلے تو آپ اس شخص سے پوچھئے کہ: ''کیا یہی وہ چور ہے؟ اگر وہ چور نہ ہو تو یہ انکار کر دے اور اگر وہی چور ہو تو خاموش رہے نہ ہاں کہے نہ ناں، اس موقع پر آپ سمجھ جائیے کہ یہی وہ چور ہے اسطرح چور کا پتہ بھی لگ جائے گا اور اسکی بیوی پر طلاق بھی نہ ہو گی''

سب نے اس تجویز پر عمل کیا چور پکڑا گیا اور اس بیچارے کو اپنا مال بھی واپس مل گیا۔

(تقی الدین حموی رحمۃ اللہ علیہ: ثمرات الاوراق علی المستطرف)

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت کا ایک واقعہ

ایک شخص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا او کہنے لگا کہ بہت عرصہ ہوا میں نے اپنا کچھ مال کسی جگہ دفن کیا تھا اب وہ جگہ یاد نہیں آ رہی کوئی تدبیر بتائیے؟

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ کوئی فقہ کی بات تو ہے نہیں البتہ ایک تدبیر بتاتا ہوں گھر جاؤ اور آج ساری رات (نفل) نماز پڑھو، امید ہے کہ انشاء اللہ تمہیں وہ جگہ یاد آ جائے گی۔

وہ شخص چلا گیا ابھی چوتھائی رات ہی گزری تھی کہ اسے وہ جگہ یاد آ گئی، اس نے جا کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا تو انہوں نے کہا مجھے خیال یہی تھا کہ شیطان تمہیں ساری رات نماز نہیں پڑھنے دے گا لیکن تمہیں چاہئے تھا کہ جگہ یاد آنے کے بعد بھی پوری رات نماز پڑھتے رہتے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا تے۔ (ثمرات الاوراق علی المستطرف)

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب

چار رکعت کی نماز میں جب دوسری رکعت پر بیٹھتے ہیں تو صرف التحیات پڑھی جاتی ہے، درود نہیں پڑھا جاتا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے دوسری رکعت کے قعدہ میں التحیات کے بعد ''**اللھم صل علی محمد**'' تک پڑھ لے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے اس کے متعلق امام

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک لطیفہ منقول ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ امام صاحب نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ:

''جو شخص مجھ پر درود پڑھے تم اس پر سجدہ سہو کو کیسے واجب کرتے ہو؟''

امام صاحب نے جواب دیا ''اسلئے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف غفلت میں پڑھا ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب کو پسند فرمایا۔ (البحر الرائق ۱۰۵/۲)

عورتیں بھی مفتی تھیں

شیخ علاؤ الدین سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب تحفۃ الفقہاء لکھی ہے اس کتاب کی شرح ان کے شاگرد رشید امام ابوبکر ابن مسعود کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے جس کا نام ''بدائع الصنائع'' ہے بقول علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ کتاب فقہ میں بے نظیر ہے، جب شرح مکمل کر چکے تو اپنے استاد محترم کی خدمت میں پیش کی وہ شرح کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور اپنی لخت جگر مسماۃ فاطمہ کا نکاح ان سے کر دیا یہ وہی خاتون ہیں کہ بادشاہوں نے انکے نکاح کے لئے پیغام دیا تھا لیکن شیخ نے انکی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا ان خاتون کو فقہ اور افتاء میں اس قدر مہارت تھی کہ فتویٰ نویسی بھی کیا کرتی تھیں چنانچہ لوگ جب دینی مسائل کے جوابات انکے گھر سے لکھا کر لے جاتے تو بسا اوقات یہ ہوتا کہ جواب کا کچھ حصہ اس خاتون کا لکھا ہوا ہوتا تھا اور کچھ حصہ انکے والد کا اور کچھ حصہ انکے خاوند کا۔ (شامی: ۱/۱۰۰، بحوالہ تراشے)

پانی کی قیمت

یحییٰ بن جعفر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اپنا ایک واقعہ سنایا، فرمایا کہ ایک مرتبہ بیابان میں مجھے پانی کی شدید ضرورت لاحق ہوئی میرے پاس ایک اعرابی آیا اس کے پاس پانی کا ایک مشکیزہ تھا میں نے اس سے پانی مانگا اس نے انکار کیا اور کہا کہ پانچ درہم میں دوں گا میں نے پانچ درہم دیکر وہ مشکیزہ لے لیا پھر میں نے اس سے کہا کہ ''ستو کی طرف کچھ رغبت ہے؟'' اس نے کہا کہ ''لاؤ'' میں نے اسکو ستو دیدیا جو روغن زیتون سے چرب کیا گیا تھا وہ خوب پیٹ بھر کر کھا گیا اب اسکو پیاس لگی تو اس نے کہا کہ ایک پیالہ پانی دیدیجئے، میں نے کہا کہ پانچ درہم میں ملے گا، اس سے کم میں نہیں اور اس طرح اسکو وہ پانچ درہم دینے پڑھے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء)

قاضی ایاس رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت

قاضی ایاس رحمۃ اللہ علیہ اپنی ذہانت وزیرکی میں ضرب المثل ہیں، انکی ذہانت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر ان سے کہا، میں نے کچھ مال فلاں کے پاس امانت رکھوایا تھا اب مانگتا ہوں تو وہ مکر جاتا ہے۔ قاضی ایاس رحمۃ اللہ علیہ نے مدعا علیہ کو بلوا کر پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مدعی نے میرے پاس کوئی امانت نہیں رکھوائی اب قاضی صاحب نے مدعی سے کہا تم نے یہ مال اسے

کس جگہ سپرد کیا تھا۔

جنگل میں ایک جگہ! مدعی نے کہا۔

''اس جگہ کی کوئی علامت ہے قاضی صاحب نے پوچھا۔''

''جی ہاں! ایک درخت ہے اسکے نیچے میں نے یہ امانت سپرد کی تھی۔'' مدعی نے کہا۔

''اچھا تو تم اس درخت کے نیچے جا کر دیکھو'' قاضی صاحب نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ تم نے وہاں امانت رکھوانے کے بجائے مال دفن کیا ہو۔ اور بھول گئے ہو۔''

مدعی چلا گیا اور قاضی صاحب نے مدعا علیہ سے کہا!''اس کے آنے تک تم بیٹھے رہو۔''

اسکے بعد قاضی صاحب دوسرے مقدمات کے فیصلوں میں مصروف ہو گئے پھر تھوڑی دیر کے بعد اچانک اسی مدعا علیہ سے پوچھا'' کیا خیال ہے؟ وہ شخص اس درخت کے پاس پہنچ گیا ہوگا؟ نہیں ابھی نہیں'' مدعا علیہ نے بیساختہ کہا۔

بس! قاضی صاحب نے وہی چور پکڑ لیا ظاہر ہے کہ اس شخص کا درخت کو پہچاننا اور اسکے فاصلے کا اندازہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ اس نے واقعۃً اس درخت کے نیچے مدعی سے کوئی معاملہ کیا تھا اسکی خیانت کا راز فاش ہو گیا اور پھر اسے خود جرم کا اعتراف کرتے ہی بن پڑی، اسی طرح ایک اور شخص نے آپ سے آکر یہی شکایت کی کہ فلاں شخص میری امانت دبا کر بیٹھ گیا ہے قاضی صاحب نے اس سے کہا کہ اب تم چلے جاؤ اور مدعا علیہ پر یہ ظاہر نہ ہونے دو کہ تم نے میرے پاس اسکی شکایت کی ہے پھر دو روز میرے پاس آنا وہ شخص چلا گیا تو قاضی ایاس رحمہ اللہ نے اس شخص کو بلا کر اس سے کہا میرے پاس بہت سا مال آگیا ہے اگر تمہارا گھر محفوظ ہو تو تمہارے یہاں رکھوا دیا جائے اس نے کہا جی ہاں میرا گھر بالکل محفوظ ہے اچھا تو تم اس کے لئے جگہ وغیرہ بنا کر رکھو، قاضی صاحب نے کہا، وہ شخص خوشی خوشی چلا گیا اس کے بعد مدعی حاضر ہوا تو قاضی صاحب نے اس سے کہا اب جا کر اپنے دوست سے اپنا مال طلب کرو، اگر دیدے تو ٹھیک ہے اگر انکار کرے تو اس سے کہدو میرا مال واپس کردو ورنہ میں قاضی کو خبر کرتا ہوں مدعی یہ سن کر مدعا علیہ کے پاس پہنچا اور اس سے انہیں الفاظ میں تقاضا کیا تو اس نے مال حوالے کر دیا اسکے بعد مدعا علیہ قاضی صاحب کے پاس آیا تو قاضی صاحب نے اسے سخت سست کہہ کر رخصت کر دیا۔ (ابن القیم رحمہ اللہ: الطرق الحکمیۃ السیاسیۃ الشرعیۃ)

متعۃ النساء کی تردید پر وجدانی دلیل

ہر شریف الطبع بھلا مانس شریف قوم کا امیر آدمی اپنی جگہ سوچے کہ اگر شرعاً متعۃ النساء جائز بلکہ کار ثواب ہے تو پھر نکاح میں اور اس میں یہ فرق کیوں ہے؟ کہ نکاح کی نسبت کرنے میں اپنی بیٹی بہن کی طرف تو عار نہیں آتی مگر کیا بڑے شریف مجالس میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ماں اور بیٹیوں اور بہنوں نے اتنے متعے کئے ہیں وجدانی رنگ میں یہ لاجواب دلیل ہے اور یقین تو یہ ہے کہ جیسے ازدواج وتزویج میں

صریح مبارک باد قبول کرتے ہیں اس طرح اپنی اقارب عورتوں کے متعہ کے متعلق اس مبارکباد کو برداشت نہ کرسکیں۔ یہ تو عقلی دلیل تھی اور نقلی دلیل بھی لکھی جاتی ہیں:

"عن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن متعة النساء"

ترجمہ: یعنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا عورتوں سے متعہ کرنا۔ ترمذی وغیرہ نے اس حدیث کی تصحیح کی اور حرمت متعہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تھا البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ قدیم ملکی روایات اور عادت کے باعث چندروز مجوز رہے مگر جب انکو شرعی حکم کی اطلاع پہنچی تو تجویز متعہ سے رجوع کیا اور متعہ کی حرمت تمام حنفیہ اور شافعیہ اور مالکیہ اور حنابلہ اور اہلحدیث اور صوفیاء کرام میں متفق علیہ ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں)

بہشتی عمامہ

کسی نے بہشتی زیور کے تعریف میں عرض کی کہ اسکی عبارت بھی آسان ہے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "اگر عبارت مشکل ہوتی تو بہشتی عمامہ ہوتا پیچ در پیچ۔" (اشرف اللطائف)

لواطت کی اقسام

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: فقہاء نے لکھا ہے کہ لوطی کی تین قسمیں ہیں:

۱) قسم ینظرون ۲) وقسم یفعلون ۳) وقسم یلمسون

یعنی ایک قسم تو وہ ہے جو صرف دیکھتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ جو بوس وکنار کرتے ہیں۔ تیسری قسم جو یہ فعل کرتے ہیں اور میں عرض کرتا ہوں کہ چوتھی قسم ایک اور ہے اور وہ یہ ہے "**یتصورون ویتخیلون**"، یعنی تصور اور تخیل میں مبتلاء ہیں۔ یہ قلب کی لواطت ہے اور "**والقلب یزنی وزناہ ان یشھی**" یعنی قلب بھی زنا کرتا ہے اور اس کی زنا خواہش کرنا ہے اور یہ فعل زیادہ سخت اس لیے ہے کہ عورت کسی وقت حلال ہونے کا تو محل ہے اور اس فعل خبیث (لواطت) میں تو حلت کا وسوسہ بھی نہیں۔ اور یہ فعل فطرت سلیمہ کے بالکل مبائن اور مخالف ہے اور اس فعل سے عقوبۃً بھی سخت بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ (رفع الموانع: ۵۱)

ف: لواطت ایک خبیث فعل ہے جو زنا سے بھی بدتر ہے۔ شریعت کے علاوہ عقلاً اور طبعاً بھی یہ فعل بہت ہی خبیث ہے۔ خبیث فعل کی ابتداء حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے کی تھی اس لئے لوگ اس خباثت کو لواطت اور اس سے فاعل خبیث کو لوطی کہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہنا چاہئے ایسے خبیث فعل اور خبیث فاعل کو اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت لوط علیہ السلام کے نام کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہے۔ (بلکہ سدومیت "ھم جنس پرستی"، اغلام بازی، بدفعلی وغیرہ کے نام دیئے جائیں) (احسن الفتاویٰ ۵/۵۰۹، خلاصۃ الانوار)

بے نمازی کس کے مثل ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب علمائے حدیث "**من ترک الصلوة متعمدا فقد کفر**"

یعنی جس نے عمداً نماز کو چھوڑا تو وہ کافر ہو گیا'' کا مضمون بیان کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو تو کافر بنانا آتا ہے، حالانکہ یہ مولویوں کے گھر کی بات نہیں، خود رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ ہے، نعوذ باللہ اگر کسی کے نزدیک حجت نہیں تو قرآن پاک نے تارک نماز کو مشرک کہا ہے، چنانچہ ارشاد ہے،

٭ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٭ نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ (العاقلات والغافلات۔۱۸)

جمعیت قلب کا مفہوم

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: فقہاء فرماتے ہیں کہ کسی کو تیز بھوک لگ رہی ہو اور کھانا سامنے رکھا ہو، ادھر جماعت شروع ہو گئی ہو تو پہلے کھانا کھالے پھر نماز پڑھے، یہ مسئلہ تو حدیث میں صراحۃً مذکور ہے۔

''اذا حضر العشآء و العشآء فابدؤ ابالعشآء''

یعنی جب عشاء کا کھانا اور عشاء کی نماز آجائیں تو کھانے سے شروع کرو، نماز عشاء کھانے کے بعد پڑھو۔

جس سے معلوم ہوا کہ کم کھانا مطلوب نہیں بلکہ جمعیت قلب مطلوب ہے اس لیے تو حضور ﷺ نے اس حالت میں کھانے کو نماز سے مقدم فرمایا۔ پھر فقہاء نے اس پر ایک دوسرے مسئلہ کی تصریح کی کہ اگر کسی کو بھوک زیادہ نہ ہو مگر کھانا ٹھنڈا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ٹھنڈا ہو جانے سے ان کی لذت جاتی رہے گی۔ جب بھی اجازت ہے کہ کھانا پہلے کھالے اور نماز کو مؤخر کر دے کیونکہ بعض کھانے ایسے ہیں جن کی لذت گرم ہی رہنے تک ہے، مثلاً چائے گرم ہی اچھی لگتی ہے اور اہل ذوق کہتے ہیں کہ پلاؤ گرم ہی اچھا ہوتا ہے اور زردہ ٹھنڈا اچھا ہوتا ہے۔ (جمال الجلیل)

حقیقتِ علم، فقہ ہی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حقیقتِ علم جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اور یہی ہے وہ فقہ جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''فقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد'' یعنی ایک فقیہ، شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ گراں ہے۔

اس سے درسی فقہ مراد نہیں کیونکہ محض کتابیں پڑھنے سے شیطان کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ وہ معرفت ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے جس سے عارف کو دین کی سمجھ بوجھ ایسی کامل ہو جاتی ہے کہ شیطان کے تمام تار و پود کو توڑ دیتا ہے۔ (کوثر العلوم)

احیاء سنت کا مفہوم

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جب دہلی میں آمین بالجہر اور رفع یدین پر عمل شروع کیا تو لوگوں کی شکایت کی وجہ سے ان کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بلا کر

کہا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ میں سنت مردہ کو زندہ کرتا ہوں اور ایک سنت کے احیاء سے سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔

فرمایا: اسماعیل! تم سمجھتے نہیں یہ ثواب اس سنت میں ہے جس کے مقابل بدعت ہو، اور جس کے مقابل دوسری سنت ہو وہاں احیاء سنت بہر صورت بدستور قائم رہتا ہے۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ بالکل خاموش ہو گئے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: عجیب غامض تحقیق ہے۔ (خیر الافادات)

گرانقدر ہدیہ کے واپس کرنے میں مضائقہ نہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہدیہ اگر اس قدر ہو کہ طبیعت پر اس سے زیادہ بار معلوم ہونے لگے تو اس کا واپس کر دینا کچھ برا نہیں۔ حدیث شریف سے اس کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ "**لا تردوا الطيب فانه خفيف المحمل**" (خوشبو کو رد نہ کرو کیونکہ وہ معمولی چیز ہے) خفیف المحمل کی قید لگانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہدیہ اگر ثقیل المحمل (گرانقدر) ہو تو رد کر دینے میں مضائقہ نہیں۔ (مقالات حکمت)

فتویٰ دینے میں ایک احتیاط کا بیان اور اس سے متعلق ایک واقعہ

فرمایا: کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تشقیق کے ساتھ جواب نہ دینا چاہیے کہ سائل سے اول واقعہ کی تعیین کرانا چاہیے، پھر اس شق کا جواب دے دے۔ اس کی خرابی کا ایک قصہ سناتا ہوں کہ ہمارے قریب ایک قصبہ میں غلطی سے رضاعی بہن بھائی کا نکاح ہو گیا اور یہ بے خبری میں ہوا، کسی کو پتہ نہیں تھا (اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے والی یہ مشہور کر دے کہ میں نے فلاں فلاں جگہ دودھ پلایا ہے) غرضیکہ بعد نکاح کے پتہ چلا علماء سے استفتاء کیا سب نے حرام بتلایا، مجھ سے کہا گیا کہ اجی اس میں تو بدنامی ہو گی۔ میں نے کہا اور اس میں بدنامی نہ ہو گی کہ بہن بھائی ایک جگہ جمع ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ دودھ تو رہا بھی نہیں تھا ویسے ہی نکل گیا تھا۔ میں نے کہا کہ دودھ ہی نکل گیا تھا حرمت نہیں نکلی وہ تو اس کے پیٹ میں بیٹھ گئی، بس وہ غیر مقلد کے ہاں دہلی پہنچا، کسی نے کہہ دیا کہ پانچ گھونٹ سے کم پیے ہوں تو حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ بس سائل نے سن کر فوراً ایک سوال قائم کر لیا کہ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید، جس نے ایک عورت کا دودھ پیا ہے تو یہ ہندہ اس زید کے نکاح میں حلال ہے یا نہیں۔ بینوا و توجروا۔ بس کیا تھا، انہوں نے لکھ دیا کہ حلال ہے ال ے ہاں تو یہ مسئلہ ہے ہی۔ ایک حنفی عالم صاحب نے بھی فتویٰ دیکھ کر کہہ دیا کہ کیا حرج ہے یہ بھی تو ایک مذہب ہے مگر پوچھنا تو یہ ہے کہ آیا سوال کا واقعہ جواب سن کر تراشا گیا۔ یا وہاں بیٹھ کر کسی نے گھونٹ شمار کیے تھے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۲۰۷)

حقوق طبع کی رجسٹری کرانا جائز ہے کہ نہیں؟

فرمایا: کہ مولوی احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث سہارنپوری نے ایک مرتبہ کسی کتاب کی رجسٹری کرائی تھی جب مولانا کانپور تشریف لے گئے تو ایک شخص نے ان سے سوال کیا کہ مولانا کتاب کی رجسٹری کرانا

جائز ہے؟ اس سوال پر مولانا شرمندہ ہو گئے اور عبدالرحمان صاحب بولے ہاں جائز ہے، جیسے ایک شخص کا نہایت عمدہ باغ ہے اور مخالفین کے ہاتھوں اس کے اجڑنے کا اندیشہ ہے تو اس کی حفاظت کے لیے کتا پال لے لہٰذا یہ بھی ایک دینی باغ ہے اگر اس کو بھی دنیاداروں سے بچالیا جائے تو کیا حرج ہے، ممکن ہے کہ کوئی خراب چھاپ کر کم داموں کو فروخت کرنے لگے لیکن اس کے جواب پر مولانا کچھ خوش نہ ہوئے ویسے ہی ہنس دیے۔ جواب کچھ نہ دیا۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۱۷۱)

حقوق طبع کی رجسٹری کے بابت فتوؤں کا واقعہ

فرمایا کہ ایک بار عبدالرحمان خان صاحب کو کتاب کی رجسٹری کے جواز کی فکر ہوئی، اس کی ضرورتیں اور مصلحتیں دکھلاتے، میں جواب دیتا۔ انہوں نے متعدد جگہ فتوے بھیجے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی، آگرہ بھی، سب جگہ سے ناجواز کا فتویٰ آیا۔ ہاں صرف آگرہ سے ایک صاحب نے جواز لکھا تو وہ مجھ کو دکھلایا میں نے کہا، خان صاحب! جواز تو ہر بات کا ہو سکتا ہے مگر تم ہی کہو کہ یہ فتویٰ تمہارے جی کو لگتا ہے بس ہنسنے لگے، میں نے کہا کہ جب تمہارے جی کو بھی نہیں لگتا تو میرے جی کو کیا لگے گا۔ پھر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے دکھلائے میں نے کہا کہ ان کو چھپا ہی رکھا تھا ہاں طبع اول میں کچھ صورت ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں صرف و محنت زیادہ پڑتی ہے اور اس رجسٹری میں دفع مضرت نہیں بلکہ جلب منفعت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۱۷۱)

پڑوسیوں کی رعایت

فرمایا: کہ پڑوسی کے حدیثوں میں بڑے حقوق آئے ہیں۔ اگر پڑوسی تمہاری دیوار میں میخ گاڑنے لگے تو منع نہ کرو، کیونکہ اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں گو بوجہ ملکیت تمہیں منع کرنے کا حق ہے مگر پڑوسی کا بھی تو کچھ حق ہے میں نے ایک مکان بنایا ہے میرے ہمسایہ کی کچھ دیوار ٹوٹی پڑی تھی اور مجھے مکان میں روشندان نکالنے تھے (گو میں ان سے یہ کہہ سکتا تھا کہ تم اپنی دیوار اونچی کرلو، تاکہ بے پردگی نہ ہو) مگر میں نے اس سے کچھ نہ کہا اور اپنے روشندان خوب اونچے رکھوا دیے۔ جس سے ان کی بے پردگی نہ ہوا گرچہ اونچے رکھے جانے سے روشنی اور ہوا بہت کم ہو گئی آج کل لوگ ہمسایہ کی کچھ رعایت نہیں کرتے اس زمانہ میں تو، جو زبردست ہو گا وہی اپنا حق لے سکتا ہے، ورنہ نہیں (مثل مشہور ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس) فقہاء متاخرین نے لکھا ہے کہ اپنی دیوار میں پڑوسی کے مکان کی طرف روشندان جائز نہیں ہے۔ لیکن متقدین کہتے ہیں کہ جائز ہے اپنی زمین میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے متاخرین نے جواب دیا ہے کہ اپنی زمین کا وہ تصرف کر سکتا ہے جس سے دوسرے کو نقصان نہ پہنچے پھر متقدمین نے اس کا جواب دیا ہے کہ جب اسے بالکل ہی دیوار اٹھا دینے کا اختیار ہے تو روشندان رکھنے کا اختیار کیسے نہ ہو گا پھر متاخرین نے اس کا جواب دیا ہے کہ دیوار اٹھانے کا تو اس کو اختیار ہے کہ اس سے اتنا ضرر نہیں کیونکہ وہ اپنے پردہ کا بندوبست خود کر لے گا اور وہ روشندان میں، روشندان سے چھپ کر بھی دیکھ سکتے ہیں جو کسی کو پتہ بھی نہ چلے اور سامنے بالکل دیوار نہ ہو تو

دیکھنے والے کی بھی جرأت نہ ہوگی اور گھر والے بھی احتیاط سے رہیں گے۔ فافہم (ملفوظات حکیم الامت ۱/۷۱)

خطبۂ جمعہ کے احکام

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: کہ خطبہ شروع ہونے کے بعد بولنا، نماز پڑھنا وغیرہ سب منع ہے۔ جب خطیب اس آیت پر پہنچے ﴿انّ اللّٰہ و ملائکتہ یصلّون علی النّبیّ﴾ تو اس وقت دل میں درود شریف پڑھے زبان سے نہیں اور یہ حکم خود حضور ﷺ نے فرمایا ہے "اذا خرج الامام فلا صلوۃ و لا کلام" (جب امام خطبہ کے لیے نکلے تو نہ کوئی نماز پڑھے نہ کلام کرے)۔ (ملفوظات ابرار، بحوالہ مرقات ۳/۲۶۹)

مطالبۂ جہیز کا شرعی حکم

ارشاد فرمایا: کہ جس کے پاس ایک دن کا سامان خورد و نوش ہو، اور کسی جانی مصیبت و پریشانی میں مبتلا نہ ہو تو سوال کرنا حرام ہے، حدیث پاک میں ایسے شخص کے لیے سخت وعید آتی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "فانما یستکثر من النار" (مشکوۃ ۱/۱۶۳) یعنی وہ شخص دوزخ کی آگ جمع کرتا ہے۔

لیکن آج کل ایک عام رواج ہے کہ لڑکے کی شادی میں رشتہ طے کرنے سے قبل لڑکی والوں سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا دیں گے؟ کیا کیا دیں گے؟ یہ سوال ہے یا نہیں تو پھر یہ کس طرح جائز ہوگا؟ لوگ رشوت دینے اور لینے کو ناجائز سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن شادی کے وقت یہ معاملہ کیا جارہا ہے۔ "و لا یسأل من لہ قوت یومہ" (کنز الدقائق: ۶۵)

شادی کی حیثیت اور اس کا طریقہ

ارشاد فرمایا: کہ لوگوں نے شادی کو صرف ایک تقریب سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ ایک عبادت بھی ہے کیونکہ یہ سنت ہے۔

واقعہ: ایک صاحب نے سوال کیا کہ شادی میں پھول کا ہار ڈالنا کیسا ہے؟ اس پر مزاحاً فرمایا کہ یہاں تو جیت ہو رہی ہے ہار کا کیا سوال۔ پھر فرمایا کہ عید بقر عید کی نماز میں بھی پھول کا ہار ڈالتے ہو، جب اس میں نہیں ڈالتے ہو تو پھر شادی میں اس کا اہتمام کیوں؟ جس طرح وہ عبادت ہے اسی طرح یہ بھی عبادت ہے۔ (ملفوظات ابرار: ۱۸)

شریعت میں بڑی آسانیاں ہیں

نماز عید سے قبل ارشاد فرمایا: کہ شریعت نے بڑی آسانیاں رکھی ہیں۔ موقع و حالات کے مناسب سہولتیں دی ہیں، چنانچہ عید کی نماز میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے، اگر اس میں غلطی پر سجدہ سہو واجب ہوتا تو بڑی دشواری ہوتی، اس لیے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے آسانی دیدی کہ اگر نماز میں کوئی ایسی صورت پیش آجائے

جس سے سجدہ واجب ہوتا ہوتو وہ معاف ہے، سجدہ سہو نہ کرے، بغیر اس کے نماز پوری ہو جائے گی۔ اور قبول کر لی جائے گی۔ (ملفوظات ابرار:۲۹)

کسی کو ایذا نہ پہنچائے

ارشاد فرمایا: کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا، مجلس کا وقت تھا سب لوگ بیٹھے تھے یہ شخص سب کو پھاندتے ہوئے حضرت کے پاس آیا، حضرت نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ آپ سے مصافحہ کے لئے آیا ہوں، اس پر حضرت نے فرمایا: کیا مصافحہ کرنا فرض ہے یا واجب ہے، یہ تو سنت ہے اور تم نے اتنے لوگوں کو ایذا دی جو کہ حرام ہے تو ایک سنت پر عمل کرنے کے لئے حرام کام کیا، خبردار! آئندہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ (ملفوظات ابرار:۴۴)

عجیب واقعہ اور عجیب ترین استدلال

خنثیٰ مشکل کے بارے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک ایسا واقعہ پیش ہوا جس نے اس زمانہ کے تمام علماء کرام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ ایک شخص نے ایک خنثیٰ سے شادی کی اور مہر میں اس شخص نے اپنی بیوی (خنثیٰ) کو ایک لونڈی دی، وہ خنثیٰ اس قسم کا تھا کہ اس کا فرج مردوں اور عورتوں دونوں قسم کا تھا اس شخص نے اپنی بیوی (خنثیٰ) کے ساتھ جماع کیا تو اس سے ایک لڑکا تولد ہوا، اور جب اس خنثیٰ نے اپنی لونڈی کے ساتھ جماع کیا تو اس سے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا۔

یہ بات مشہور ہوگئی اور معاملہ امیر المومنین سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے خنثیٰ مشکل سے سوال کیا تو اس نے بتایا کہ اس کا فرج عورتوں والا بھی ہے ماہواری بھی آتی ہے اور مردوں والا بھی ہے خروج منی بھی ہوتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں غلاموں برق اور قنبر کو بلایا اور انکو حکم دیا کہ وہ خنثیٰ مشکل کی دونوں طرف والی پسلیاں شمار کریں اگر بائیں جانب کی ایک پسلی دائیں جانب سے کم ہو تو پھر اس خنثیٰ مشکل کو مرد سمجھا جائے گا ورنہ عورت وہ اسی طرح ثابت ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسکے مرد ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا اور اس کے خاوند اور اس کے درمیان تفریق کردی۔

اور اسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اکیلا پیدا فرمایا اور جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر احسان کا ارادہ فرمایا کہ اس کا جوڑ پیدا فرمائے تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنے جوڑے سے سکون حاصل کرے جب حضرت آدم علیہ السلام سو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انکی بائیں جانب سے اماں حوا کو پیدا فرمایا جب بیدار ہوئے تو انکی بائیں جانب ایک حسین وجمیل عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

تو اس لیے مرد کی بائیں جانب کی ایک پسلی عورت سے کم ہوتی ہے اور عورت کی دونوں جانب کی پسلیاں برابر ہوتی ہیں کل پسلیوں کی تعداد چوبیس (۲۴) ہے، بارہ دائیں جانب اور بارہ بائیں جانب ہوتی ہیں جبکہ مرد کی دائیں جانب بارہ اور بائیں جانب گیارہ ہوتی ہیں، تو مرد کی کل پسلیاں چوبیس کی بجائے تیئس

ہوتی ہیں اس حالت کے اعتبار سے عورت کو ''ضلع اعوج'' کہا جاتا ہے اور حدیث شریف میں تصریح ہے کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اگر تو اسکو سیدھا کرنا چاہے تو یہ ٹوٹ جائیگی سیدھی نہیں ہوگی اس لیے اس کو اپنی حالت پر چھوڑ کر اس سے نفع اٹھا۔'' واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم '' (الاشباہ والنظائر:۲/۰۷۵)

ف: پسلی کا ٹیڑھا ہونا عیب کی بات نہیں بلکہ پسلی کی خوبی ہے۔ (مؤلف)

اپنے کپڑوں کی طرف

بعض فقہاء کے بارے میں مذکور ہے، کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے مسئلہ دریافت کیا کہ جب میں نہر میں نہانے کے لئے کپڑے اتار کر نہر میں گھسوں تو اپنا منہ قبلے کی طرف رکھوں یا کسی اور طرف؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ افضل یہ ہے کہ تم اپنا منہ اس طرف رکھو جس طرف تمہارے کپڑے ہیں، تا کہ کوئی چور یہ کپڑے نہ لے جائے۔ (جواہر پارے و لطائف علمیہ:۱۴۹)

آدھی رات کا سورج

طاہر الزھری کہتے ہیں کہ ایک شخص امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی مجلس میں بہت دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا، امام صاحب نے اسے کہا کہ تم کیوں نہیں بولتے تو وہ بول پڑا، اور اس نے سوال کیا کہ روزے دار کب افطار کرے گا؟ امام صاحب نے کہا غروب آفتاب کے وقت اس نے کہا اگر سورج آدھی رات تک غروب نہ ہو تو کیا کریگا؟ امام صاحب ہنس پڑے اور فرمایا کہ تیرا خاموش رہنا اچھا تھا اور میرا یہ مطالبہ کرنا کہ تم کچھ کہو غلط تھا۔ (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور انکے ناقدین)

ایک نصرانی کا قصہ

ضحاک بن مزاحم نے ایک نصرانی سے کہا تو کیوں مسلمان نہیں ہوتا اس نے کہا شراب کی محبت کی وجہ سے، ضحاک نے کہا کہ تو مسلمان ہو جا پھر شراب کے بارے میں سوچنا، جب وہ مسلمان ہو گیا تو ضحاک نے اس سے کہا اگر تم نے شراب پی تو ہم تم پر حد جاری کریں گے اور اگر تو مرتد ہو گیا تو تجھے قتل کر دیں گے تو وہ آدمی اسلام پر ثابت قدم رہا۔ (جواہر پارے)

حالت نزع میں تعلیم مسائل

ابراہیم بن الجراح کی روایت ہے کہ ''امام ابو یوسف رحمہ اللہ بیمار ہوئے، مرض بڑھ گیا تو میں عیادت کے لئے حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ بیہوشی طاری ہے جب ذرا افاقہ ہوا آنکھ کھولی تو مجھ سے فرمانے لگے: اے ابراہیم! رمی جمار میں افضل صورت کیا ہے؟ آیا رمی جمار پیدل کرنا چاہیے یا سوار ہو کر؟ میں نے جواب دیا'' پیدل'' امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرمانے لگے'' غلط'' میں نے عرض کیا'' سوار ہو کر'' ارشاد ہوا'' یہ بھی

غلط ہے'' اسکے بعد از خود ارشاد فرمایا جو شخص دعا کے بعد وہاں رکنا چاہتا ہو اس کے لئے افضل یہ ہے کہ پا پیادہ رمی جمار کرے اور جو نہ رکنا چاہے اس کے لئے افضل یہ ہے کہ سواری پر بیٹھے بیٹھے رمی جمار کر لے اور آگے بڑھ جائے۔''

ذرا دیر ٹھہر کر میں قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے رخصت ہوا مشکل سے دروازے تک پہنچا ہوں گا کہ کان میں رونے دھونے کی آواز آئی میں فوراً پلٹا معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے ہیں خدا اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ (دفاع امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ: ۱۶۳)

یہودی کا طنز اور اللہ تعالیٰ کا جلال

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے زمانہ فقر و عسرت اور تنگدستی کا قصہ ہے کہ آپ کے مکان کی گلی میں ایک یہودی نے اپنی دیوار کچھ اس طرح سے بڑھا کر بنائی کہ اس سے عام گلی تنگ ہو گئی، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے یہودی کے اس ناجائز فعل پر اعتراض کیا تو یہودی نے بطور طعنہ اور طنزاً کہا کہ'' جناب! جب آپ کی سواری نکلے گی اور راستہ تنگ ہوگا تو میں دیوار گرا دوں گا'' خدا تعالیٰ کو اس یہود کا یہ طعنہ اور طنز پسند نہ آیا اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو منصب قضا اور عدل و انصاف کی با اختیار وزارت کا جاہ و جلال عطا فرما دیا اور جب آپ کی سواری شان و شوکت تزک و احتشام اور جلال کے ساتھ اس گلی سے گذری تو قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے یہودی کو اسکا وعدہ یاد دلایا جس پر اسے دیوار گرانا پڑی۔ (علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات: ۸۵/۲)

عدل وانصاف کی عدالت میں شاہ وگدا سب برابر ہیں

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید اور ایک یہودی کا مقدمہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی عدالت میں پیش ہوا، اور اس سلسلہ میں دونوں آپ کے پاس عدالت میں حاضر ہوئے تاہم یہودی کو ایک عام رعیت کی حیثیت ہونے کے پیش نظر احساس کمتری بھی تھا۔ اس لیے وہ خلیفہ سے ذرا پیچھے ہٹ کر قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے سامنے بیٹھ گیا مگر قاضی صاحب سے یہ تفاوت بھی نہ برداشت کیا گیا اور کھلی عدالت میں یہودی کو مخاطب کر کے فرمایا:'' ذرا آگے اور قریب آ کر خلیفہ کے برابر بیٹھ جاؤ، یہ اسلامی عدالت ہے اس میں ایک کو دوسرے پر کوئی تقدم اور تفوق نہیں، عدل و انصاف کی عدالت میں شاہ و گدا سب برابر ہیں۔'' (حدائق الحنفیہ، تذکرہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ)

ہارون رشید کے دربار میں زندیق کے قتل کا فیصلہ

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے سوانح نگاروں نے عثمان ابن حکیم کی ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک زندیق خلیفہ ہارون رشید کی خدمت میں پیش کیا گیا ہارون رشید نے امام صاحب رحمہ اللہ کو طلب کیا جب وہ تشریف لے آئے تو کہا آپ اس زندیق سے بحث و مناظرہ کیجیے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا: '' اے امیر المومنین! جلاد کو طلب کیجیے چمڑے کا نطع بچھوائیے پھر اس شخص پر اسلام پیش کیجیے، اگر قبول کر

لے تو بہت اچھا ورنہ گردن ازاد یجیے۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس سے مناظرہ کیا جائے یہ تو اسلام قبول کر کے اس سے منحرف ہو چکا ہے۔ (مناقب موفق ۲۹۷، تاریخ بغداد)

امام کسائی کا نحوی اعتراض اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا فقہی جواب

ایک دفعہ ہارون رشید کے زیر نگرانی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام کسائی کے درمیان خوب مناظرہ ہوا جو نحوی انداز کا تھا سب سے پہلے خود خلیفہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ پر چند سوالات کیے پھر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے جواب پر امام کسائی نے نحوی اصول کے تحت جرح کی۔

سوال نمبر ۱: ہارون رشید! انت طالق. تین بار کہنے سے کتنی طلاقیں واقع ہوئیں؟ شریعت کے مطابق اس کا واضح جواب دیجیے۔

جواب: امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس کلام سے ایک طلاق واقع ہوئی؟

سوال نمبر ۲: ''انت طالق، او طالق، او طالق'' سے کتنی طلاقیں ہوں گی؟ اس کا جواب رحمت فرمائیں۔

جواب: اس صورت میں بھی ایک طلاق ہوگی۔

سوال نمبر ۳: '' انت طالق ثم طالق ثم طالق'' سے کتنی طلاقیں ہوں گی؟

جواب: اس صورت میں بھی ایک طلاق واقع ہوگی۔

سوال نمبر ۴: ''انت طالق و طالق و طالق'' سے کتنی طلاقیں ہوں گی؟

جواب: ان الفاظ سے بھی ایک طلاق واقع ہوگی۔

تنقید کسائی رحمۃ اللہ علیہ: جب امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان چاروں سوالوں کا جواب دے دیا تو امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امیر المومنین! امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے دو جواب ٹھیک ہیں اور دو غلط ہیں یعنی (صورت اول) ٹھیک ہے اس لیے کہ ''انت طالق'' سے ایک طلاق ہوئی۔ طالق طالق بطور تاکید کہا اس کی صحت میں شک نہیں۔

(صورت دوم) کا جواب بھی درست ہے اس لیے کہ ''انت طالق '' سے بصیغہ تیقن ایک طلاق ہوگی اس کے بعد او طالق او طالق میں شک کی وجہ سے کوئی طلاق نہیں پڑے گی۔

(صورت سوم) کا جواب غلط ہے کہ '' انت طالق ثم طالق ثم طالق'' میں بجائے ایک کے تین طلاقیں واقع ہوں گی اس عبارت میں لفظ ثم سے بالترتیب طلاق دی گئی ہے۔

(صورت چہارم) کا جواب بھی ٹھیک نہیں، اس لیے کہ'' انت طالق و طالق و طالق'' میں بھی بجائے ایک کے تین طلاقیں ہوں گی اس صورت میں واو عاطفہ ترتیب پر دلالت کرتی ہے یہ اصول نحو سے غلط ہے۔

جواب اور اس کا حل: امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی غلطی کا صادر ہونا نہایت تعجب خیز امر ہے۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ عباسی نے طلاق غیر مدخولہ کے متعلق سوال کیا تھا اس قسم کے سوال کے مطابق چار صورتوں میں صرف ایک طلاق بائن پڑے گی، کیوں کہ فقہاء نے مدخولہ اور غیر مدخولہ کی خوب وضاحت کی ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ صورت اول وثانی میں تو بحث نہیں، صورت ثالث وصورت رابع میں جب غیر مدخولہ کوایک طلاق پڑ گئی تو محل طلاق نہ رہالہذا تمام صورتوں میں ایک طلاق واقع ہوگی۔ یہ تاویل بے جا نہیں، ظاہر ہے کہ علامہ کسائی رحمۃ اللہ علیہ اصول نحو کے عالم تو تھے مگر فقہ سے نا آشنا، پھر غلطیوں کا علاقہ ہے، ہر فریق کرسکتا ہے جیسا کہ علامہ کسائی رحمۃ اللہ علیہ اپنی غلطی کا اعتراف خود کرتے ہیں کیونکہ اپنی غلطی ماننا عیب نہیں۔ (تاریخ علم النحو: ۳۲)

باجماعت نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے کیا سے کیا ہو گیا؟

قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ کے ایک چہیتے وزیر کو مردود الشہادۃ قرار پایا یعنی کسی مقدمہ میں وزیر نے قاضی ابویوسف کی عدالت میں گواہی دی تھی خلیفہ کے بعد جو سب سے بڑا وزیر تھا قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں اسے سنایا جارہا ہے کہ تمہاری شہادت قابل قبول نہیں قرار دی جاسکتی وزیر نے اسے اپنی سبکی اور توہین خیال کرتے ہوئے قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت سے سیدھا خلیفہ کے دربار میں پہنچا اور قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے اس برتاؤ کی خلیفہ سے شکایت کردی وزیر کی اس شکایت پر ہارون رشید نے قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کو بلاکر دریافت کیا کہ اس بے چارے کو آپ نے کیوں مردود الشہادت قرار دیا؟

روایتیں مختلف ہیں مثلاً:

(الف) بعض کہتے ہیں کہ قاضی صاحب نے کہا کہ میں نے اپنے کانوں سے اس شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں تو خلیفہ کا عبد، بندہ یا غلام ہوں۔ اس زمانہ کے خوشامدی امیروں میں کچھ یہ دستور چل پڑا تھا کہ اپنے آپ کو خلیفہ کا عبد اور غلام کہتے تھے۔ درحقیقت یہ لوگ خلیفہ کے نہیں درہم اور دینار کے بندے تھے۔ ایسا کہنے والے تمام امراء کو قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے مردود الشہادۃ قرار دے دیا تھا۔

(ب) اور بعض روایتوں میں ہے کہ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وزیر مذکور پر جرح کی کہ یہ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا اور میں ایسے آدمی کی شہادت قبول نہیں کرسکتا۔

خلیفہ ہارون رشید خاموش رہا اور حنفی قاضی کی عظمت اور عوامی دباؤ کے پیش نظر اسے حکومت کے وقار کا مسئلہ نہ بنا سکا۔ بعض دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بالآخر اس وزیر نے اپنی ڈیوڑھی میں مسجد بنائی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا پابند ہو گیا۔ (دفاع امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: ۱۶۵)

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جواب نصف سلطنت کے برابر ہے

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نہایت ذکی ذہین اور حاضر جواب تھے۔ جب بھی کوئی مسئلہ یا اہم بات سامنے

آتی تو اس کو فوراً حل فرماتے اور سلجھا ہوا جواب دیتے، ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے ظہر یا عصر کے وقت انہوں نے نماز کی امامت کی، چونکہ یہ مسافر تھے اس لیے نماز کا قصر کیا یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر نمازیوں سے کہا کہ اپنی نماز پوری کرلو میں مسافر ہوں۔ تو اہل مکہ میں سے ایک شخص نے نماز ہی میں کہا: "ہم لوگ یہ مسئلہ تم سے اور جس نے تم کو سکھلایا ہے اس سے بہتر جانتے ہیں" امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا" یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم کو یہ مسئلہ معلوم ہوتا تو نماز میں بات چیت نہ شروع کر دیتے اس جواب پر ہارون رشید بہت خوش ہوا، اور اس نے کہا کہ اگر نصف سلطنت کے بدلے مجھے یہ جواب مل جاتا تو بھی میں پسند کرتا۔ (حسن التقاضی ۷۱، ومناقب کردری تذکرہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دانائی کام آئی

خلیفہ ہارون رشید اور ملکہ زبیدہ کے درمیان کسی بات پر نزاع ہو گیا۔ بات بڑھ گئی اور ملکہ نے شاہی مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دی جس پر خلیفہ بگڑ گیا اور جذباتی طور پر بیوی سے یہ کہہ دیا "اگر آج ہی تو میری مملکت سے نہ نکل جائے تو تجھ پر طلاق ہے" جب غصہ کافور ہوا، حواس ٹھکانے لگے تو دونوں نادم ہوئے مگر اس کا اب کیا تدارک ہو، بڑے شپٹائے بالآخر قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دانائی کام آئی۔ انہوں نے فرمایا کہ: خلیفہ کی حکومت شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے اس سے باہر جانا تو ممکن نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ملکہ زبیدہ خانۂ خدا (مسجد) میں چلی جائے کہ وہ (خلیفہ کی) سلطنت میں نہیں آتا۔"

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تدبیر پر عمل کیا گیا، الجھا ہوا مسئلہ سلجھا گیا۔ اس جواب سے خلیفہ اور ملکہ دونوں نہال ہو گئے اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو بیش بہا تحائف سے مالا مال کیا گیا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور حالت زندگی اور طرز سیاست وانقلاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکھر کر سامنے آتا ہے کہ ان کا رویہ اور اصول عام علماء سے مختلف مگر معتدل تھا۔ عام طور پر سلاطین وخلفاء کے دربار میں علماء کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ بس ان کی ہاں میں ہاں ملائے چلے جاتے ہیں یا "اعلاء کلمۃ الحق" اس زور وشور سے کرتے ہیں کہ اصلاح کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بین بین کا راستہ اختیار کیا انہوں نے خلفاء کی مجالست کی اور انہیں راہ ثواب پر بڑی حد تک گامزن رکھا۔ (علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات ۹۴/۲)

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور ربیعۃ الرائے کے درمیان ایک دلچسپ مباحثہ

ایک مرتبہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ربیعۃ الرائے کے درمیان مشترک غلام کا مسئلہ زیر بحث آیا، قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا "آپ اس غلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو بیک وقت دو آدمیوں کا غلام اور ان دو میں سے ایک نے اسے آزاد کر دیا ہو" ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ایسے غلام کا عتق (یعنی آزادی) جائز نہیں ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کیوں جائز نہیں آخر اس کی کیا وجہ

ہے؟ ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس لیے کہ اس میں ضرر کا پہلو ہے اور حدیث میں آیا ہے۔ "لاضرر و لاضرار" ایک آقا کے آزاد کر دینے سے دوسرے کو ضرر کا اندیشہ ہے بلکہ یقین ہے۔

ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے پھر دریافت کیا کہ جی! اگر دوسرا مالک بھی اسے آزاد کر دے تو پھر آپ کیا فرماتے ہیں؟ ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حق جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائے گا، تب ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے احترام سے عرض کیا، حضرت! آپ ہی کے اصول کے پیش نظر میں آپ کی بات نہیں مان سکتا وجہ یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق جب غلام دو آقاؤں کے درمیان مشترک ہے اور پہلے آقا کی آزادی بے اثر ہے اور غلامی بدستور قائم ہے تو دوسرے مالک کے آزاد کرنے کے بعد وہ کس طرح آزاد ہو جائے گا جبکہ ابھی تک وہ بدستور غلام ہے۔ ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ یہ سنکر خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ (حسن التقاضی ۱۶)

عیسائی باپ اور مسلمان بیٹا

بشیر بن ولید کندی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز انہوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا حضرت! میرا والد عیسائی ہے اور بہت لاغر بوڑھا اور کمزور، اکثر ایسا ہوتا ہے اسے کہیں آتے جاتے دیکھتا ہوں اور راستے میں آمنا سامنا ہو جائے تو کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا کروں؟ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہاں! جب کلیسا سے واپس آ رہا ہو لیکن جب جا رہا ہو تب نہیں۔ (حسن التقاضی ۵۴)

اعتراف سرقہ کے باوجود چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس علم میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے حتیٰ کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک ہوتے تھے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں آپکی ذہانت وفقاہت کا یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ ایک مجلس میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بہت سے علماء بیٹھے تھے کہ ایک چور کو لایا گیا اس چور نے اخذ مال کا اعتراف کیا تو سارے علماء نے کہا کہ اب چوری کی وجہ سے اسکا ہاتھ کاٹنا لازمی ہو گیا، ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نہیں ہاتھ کاٹنا لازم نہیں، تمام علماء حیران ہو گئے کہ چور کے اعتراف سرقہ کے باوجود ہاتھ کاٹنا کیوں لازم نہیں ہے لہذا چور سے دوبارہ استفسار کرنا چاہیئے چنانچہ علماء نے اس شخص سے دوسری مرتبہ دریافت فرمایا کہ "ھل سرقت؟" کیا تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب میں کہا "نعم!" ہاں میں نے چوری کی ہے، علماء نے کہا اب تو ہاتھ کاٹنا واجب ہے قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اب بھی مصر تھے کہ ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

علماء نے حیرت کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ: "اقرار اول اخذ مال غیر" کا تھا اور وہ موجب ضمان مالی ہے لہذا اس شخص کے ذمہ مال واجب ہو گیا، اس کے بعد اعتراف بالسرقہ انکار ہے اس ضمان مالی سے اور رجوع ہے سابقہ اعتراف سے کیونکہ قطع ید اور ضمان مالی دونوں جمع نہیں ہوتے اور ایسے موقع پر رجوع عن الاقرار السابق جائز نہیں لہذا اس شخص پر ضمان مالی واجب

ہے نہ کہ قطع ید۔ علماء کا مجمع آپ کی فقاہت وذہانت پر دنگ رہ گیا اور سب نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ (اتمام التکمیل: ۱/ ۳۲)

کشتی خریدلو طلاق واقع نہیں ہوگی

علامہ زاہد الکوثری رحمہ اللہ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص ابو یوسف رحمہ اللہ کے پاس آیا اور اس نے کہا" میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں ایک جاریہ (باندی) نہ خریدوں تو میری بیوی پر طلاق مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ایسا کرنا میرے لیے آسان نہیں ہے کیونکہ میں اپنی بیوی سے بہت محبت اور الفت کرتا ہوں اور میری نظر میں اس کی بڑی وقعت اور عظمت ہے۔" یہ سنکر قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا:"تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک کشتی خریدلو وہ بھی تو" جاریہ" ہی ہے۔ (حسن التقاضی: ۴۵ بحوالہ علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات: ۲/ ۱۰۲)

اہلِ بدعت اور دروغ گوئی کا جواب

ایک دفعہ دشمنوں، حاسدوں اور مخالفین نے مشہور کردیا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ خود" القرآن مخلوق "(یعنی قرآن مخلوق ہے) کے قائل ہیں چنانچہ امام صاحب رحمہ اللہ کے خاص تعلق والے تلامذہ یا معتقدین ومخلصین حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا حضرت! آپ ہمیں تو ایسے عقیدہ اور اقوال سے روکتے ہیں مگر خود دوسروں کو اسی کی تعلیم دیتے ہیں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو حیرت ہوئی تو انہوں نے سارا قصہ ذکر کیا اور بتایا کہ باہر اس کی اسی طرح کی شہرت ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ لوگ بھی بڑے سادہ لوح ہیں کہ حاسد لوگوں اور مخالفین کی باتوں میں آگئے وہ پاگل دیوانے تو خدا پر بھی جھوٹ بولتے ہیں (کہ قرآن کو خدا کی مخلوق بتاتے ہیں) تو مجھ پر جھوٹ لگانا ان کے لئے کیا مشکل ہے؟ پھر ارشاد فرمایا کہ اہل بدعت کا طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں دوسروں پر رکھ کر چلاتے ہیں حالانکہ وہ لوگ انکے جھوٹ سے بری ہوتے ہیں۔ (مقدمہ انوار الباری: ۱/ ۷۸)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے علم فقہ سے تعلق کی ایک مثال

حسن بن ابی مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا" میں بیمار پڑا، اور اس بیماری نے میرے حافظہ پہ چھاپا مارا، بیماری کی شدت کی وجہ سے جو کچھ بھی یاد تھا سب بھول گیا سوائے علم فقہ کے۔" سوال کیا گیا، حضرت! یہ کیونکر؟ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا علم فقہ کے سوا جو دوسرے علوم میرے پاس تھے انکی بنیاد صرف قوت حافظہ پر تھی اور وہ شدت مرض کی وجہ سے جواب دے گئی تو وہ علوم بھی جاتے رہے اور علم فقہ تو میرا جانا پہچانا علم تھا۔ ابتدائے شعور سے آج تک اس کے ساتھ تلبس رہا، علم فقہ میں میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کئی سال تک اپنے وطن سے غیر حاضر رہے، پھر اس کے بعد آئے تو کیا وہ اپنے گھر کا راستہ بھول جائے؟ بلکہ قدم خود بخود اس طرف بڑھیں گے۔ (حسن التقاضی: ۵۴)

محدث اعمش رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مشہور محدث حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ (جو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے استاد بھی ہیں) نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا جواب سن کر محدث اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تم نے اس مسئلے کا یہ حل کہاں سے ڈھونڈا ہے اور تمہارے اس جواب کی بنیاد کیا ہے؟ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا، حضرت! فلاں حدیث جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی اس سے مسئلے کا یہ جواب میں نے اخذ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا، محدث اعمش رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے اور فرمانے لگے اے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث تو مجھے اس وقت سے یاد ہے جب تمہارے باپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کی جو تاویل تم نے اس وقت بیان کی وہ آج معلوم ہوئی جو بالکل صحیح ہے۔ اس طرف تو کبھی ہمارا ذہن منتقل ہی نہیں ہوا تھا۔ (تاریخ بغداد و حسن التقاضی: ۲۴)

نکاح نہ کرنے پر وعید و تہدید

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ "عاشق رسول" کے سامنے، آپ ﷺ، عکاف صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں: "کیا تمہارے پاس بیوی بھی ہے؟" عکاف نے کہا: جی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر بیوی نہیں تو کوئی کنیز اور لونڈی (یعنی شرعی حرم) بھی ہے؟، عکاف نے کہا کہ وہ بھی نہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم فارغ البال صاحب فراخی نہیں ہو؟ عکاف نے کہا کہ جی میں دنیا کی جانب سے مطمئن اور خوش ہوں۔ (یعنی مالدار ہوں)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو، اگر تم نصرانی ہوتے تو ان کے راہبوں میں شمار کیے جاتے، نکاح میرے طریقہ میں داخل ہے۔ تم میں سب سے زیادہ بد وہ لوگ ہیں جو مجرد اور کنوارے ہیں، سب سے ذلیل ترین کمینے وہ مرد ہیں جو بحالت تجرد زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔ کیا تم لوگ شیطان کا تختۂ مشق بننا چاہتے ہو؟ شیطان کا وہ ہتھیار جو اچھے لوگوں میں بہ آسانی اثر جاتا ہے، صرف عورت ہے۔ ہاں! جنہوں نے شادیاں کیں، وہ لوگ پاک دل والے ہیں۔ سیاہ اعمال سے دور اور کنارہ پر ہیں۔

عکاف! تجھ پر افسوس ہے۔ یہی عورتیں تھیں جنہوں نے ایوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، کرسف ... کیا" بشر بن عطیہ بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے پوچھا کہ حضور ﷺ یہ کرسف کون شخص ... ﷺ نے فرمایا کہ "کسی گزشتہ زمانہ میں اس نام کا ایک عابد تھا جو کسی دریا کے کنارے بیٹھ کر تین سو ... عبادت میں مصروف رہا، وہ دن بھر روزے رکھتا تھا اور رات بھر نمازیں پڑھتا۔

... ایک دن کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوا، اور ساری ریاضتوں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے دیوانہ ہو گیا۔ بہ حال اخیر میں اس کی حالت درست ہوئی"۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف پھر متوجہ ہوا، خدا تعالیٰ نے اس کے قصور سے درگزر کیا۔

اس کے بعد سرور کائنات ﷺ عکاف کی طرف پھر متوجہ ہوئے اور سمجھانا شروع کیا عکاف تجھ پر افسوس! نکاح کر! ورنہ تو ہمیشہ مذبذب رہے گا، یعنی طمانیت وسکینت تجھے حاصل نہیں ہو سکتی'' عکاف نے اس کے بعد درخواست کی کہ حضور ﷺ! تو آپ ہی میرا عقد جس سے چاہیں کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ '' کریمہ بنت کلثوم حمیری سے میں نے تیرا نکاح کر دیا''۔

اس حدیث سے نکاح کا مسئلہ جس قدر اہم ہو جاتا ہے اسے کون نہیں سمجھتا اور شادی کے بعد دنیاوی الجھنوں کا جو طوفان امنڈتا ہے آج اس سے کون واقف نہیں مگر حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان نبوی علوم نے اسی طرح عاجز ولاچار بنا دیا تھا کہ انہوں نے یہ بھی کیا اور وہ بھی کیا، غایت احتیاط کے ساتھ نباہ کر کے ایک عجیب وغریب قوت عملیہ کا ثبوت انہوں نے پیش فرمایا۔'' (سوانح ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ: ۱۳۵)

عالم کا سونا عبادت کیوں؟

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب نے فرمایا: وہ عالم دین جس کا اوڑھنا بچھونا دین ہے اور ہمہ وقت دینی خدمت میں مصروف رہتا ہے، اللہ کے نزدیک اس کا بڑا اونچا مقام ہے ایسے عالم کا دیکھنا بھی عبادت ہے اور اس کا سونا بھی عبادت، عالم کے سونے پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جسے میں نے حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا واقعہ یہ ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا حضرت! حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا سونا بھی عبادت ہے مگر اس کا عبادت ہونا سمجھ میں نہیں آتا؟

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''ایک بڑھئی ایک شخص کا دروازہ بناتا ہے اسے اپنے کام کے دوران میں بعض اوزاروں کو پتھر پر گھسنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے تاکہ اوزار کے تیز ہو جانے کے بعد اس سے صحت اور تیزی کیساتھ کام لے اب یہ بتائیے کہ بڑھئی جب اوزار کو تیز کر رہا ہوتا ہے اس وقت دروازہ تو وہ نہیں بناتا ہے لیکن اس کو اس وقت کی مزدوری ملے گی یا نہیں؟ پوچھنے والے نے جواب دیا، ہاں ضرور ملے گی پھر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب ایک بڑھئی کو اوزار تیز کرنے کے وقت کی مزدوری ملے گی اور یہ وقت مزدوری ہی میں شمار ہوگا، منہا نہ کیا جائے گا اس بنیاد پر کہ اوزار کو تیز اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آئندہ اس سے کام لے گا، تو سوچئے کہ ایک عالم بھی تو اسی لیے سوتا ہے کہ سونے کے بعد اس کی تھکن اور اضمحلال دور ہو، اور نشاط، مستعدی اور چابکدستی و چوبندی کیساتھ دین کی خدمت کر سکے اس صورت میں اس کا سونا کیوں نہ عبادت قرار پائے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اسکی مزدوری کیوں کاٹی جائے جبکہ اللہ کے بندے کے یہاں ایک بڑھئی کی مذکورہ بالا صورت میں مزدوری نہیں کٹتی ہے یہ تقریر بھی احقر نے اپنے مرشد پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ سے سنی تھی۔'' (باتیں انکی یاد رہیں گی ۱۱۳)

برجستہ جواب

جو لوگ علماء اور دینداروں کو انکی وضع قطع پر طعنہ دیتے ہیں، اس سلسلے میں ایک لطیفہ بیان فرمایا: کہ

پاکستان میں ناظم آباد روڈ پر ایک موٹے آدمی، دو ڈھائی من کے دوڑ رہے تھے اور انکی داڑھی بھی خوب تھی ماشاءاللہ ایک مشت شرعی داڑھی، ایک مسٹر جا رہے تھے اس نے دیکھ کر کہا مولانا اتنی بڑی داڑھی رکھ کر دوڑ رہے ہیں، کہنے لگے بھائی! ہمارا جسم ڈھائی من کا ہے ڈھائی من کا جسم لے کر جب میں دوڑ سکتا ہوں تو اگر ایک چھٹانک کی داڑھی میرے ساتھ دوڑ رہی ہے تو آپ کو کیوں تعجب ہے؟ عجیب بات ہے یعنی داڑھی والا، اپنی صحت نہ بنائے، صبح نہ دوڑے، ورزش نہ کرے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دو میل روزانہ ٹہلتے تھے اسی دوران پانچ پارے قرآن پاک پڑھتے تھے۔ (حوالہ مذکورہ: ۱۱۷)

شاہی جنگل

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب نے فرمایا: جہاں قبر میں ہماری نعش اتری، پھر اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اور سیرت پر حساب و فیصلہ ہوگا، نبی والی صورت لیکر آئے ہو یا اہل مغرب اور یورپ والوں کی شکل، اگر نبی والی شکل نہ ہوگی تو پوچھا جائے گا تم نے نبی والی کیوں نہ بنائی؟ کیا ہمیں کافروں، یہودیوں اور عیسائیوں والی شکل اچھی معلوم ہوتی تھی؟ کیا تم کو اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی رکھتے تھے اور سارے انبیاء رکھتے تھے؟ اس کو تم جنگل کہتے تھے کہ یہ جنگل کون لگائے چہرے پر؟ بھائی یہ شاہی باغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باغ ہے تم اس کو جنگل کہتے تھے اس پر استرا پھیرنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ کو تراشنا اور مٹانا ہے۔ اور ایک مشت، یہ سرکاری حد ہے اس سے ذرا بھی کم کرنا جرم ہے کہ یہ پلاٹ ہے جیسے مکان کا پلاٹ متعین ہوتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پلاٹ کی حد بندی کر دی ہے، جمعرات کے دن ہفتہ میں ایک دن جو حصہ بڑھ جاتا تھا اس کو کاٹتے تھے اور اسی طرح پکڑ لیتے تھے کہ آگے نہ کٹ جائے، سید الانبیاءؑ نے حد بندی کر دی ہے، حد بندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ہوئی ہے اب اگر آگے کاٹتے ہو، تو سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک کاٹ رہے ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ گستاخی کر رہے ہو، میرے بھائی! مرنے سے پہلے پہلے اپنی حالت کو درست کرلو۔ (باتیں انکی یاد رہیں گی: ۱۲۱)

مکھی کا ڈبونا

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بخاری شریف وغیرہ میں حدیث ہے کہ مکھی کسی چیز میں گرے تو اس کو ڈبو دو، تاکہ اسکی سمیت (زہریلے اثرات) جاتی رہے کیونکہ اسکے ایک پر میں زہر اور دوسرے میں تریاق ہے اور وہ پہلے زہر والا پر ڈالتی ہے۔

علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ نے حیوۃ الحیوان میں لکھا کہ مکھی بائیں پر کو ڈبوتی ہے (اپنا تجربہ نقل کیا ہے) میرے نزدیک گرم میں نہ ڈبوئے، مسئلہ یہی ہے اگرچہ عمل نہیں ہے اور یہ بھی کہ اگر نجاست پر سے اٹھ کر آئی ہو تو اس وقت بھی یہ حکم نہ ہوگا۔ (ملفوظات محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ: ۲۲۶)

تارک صلوۃ کا حکم

ایک وکیل قادیانی نے حضرت کشمیری رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ نماز چھوڑنے والے کے لئے فقہاء کے ہاں کیا حکم ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ تین فقہاء اسکو فاسق قرار دیتے ہیں اور ایک امام کافر گویا اسکا اشارہ اس طرف تھا کہ حدیث میں تو "فقد کفر" آیا ہے حضرت نے کہا کہ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ خدا چاہے تو بخشدے جس سے معلوم ہوا کہ کفر نہیں ہے۔ (حوالہ بالا: ۷۰)

مسائل میں غلطیوں کے ذمہ دار؟

فرمایا: جن مسائل کی غلطی دقیق ہے اس میں عوام الناس تو معذور ہوں گے انکو کچھ گناہ نہ ہوگا، اہل فتوی کی گردن نپے گی یہی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ "من افتی بغیر علم فانما اثمہ علی من افتاہ" اس حصر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو کچھ گناہ نہ ہوگا۔ (تحفۃ العلماء: ۲/۴/۱۷)

چند مفید نمونے

۱) فرمایا: ایک شخص کا خط آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، اب اس نے بیس دن کے بعد اپنی سالی سے نکاح کرلیا ہے، یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟ اور شامی میں مردوں کے واسطے بیس عدتیں لکھی ہیں اسکا کیا مطلب ہے؟

میں نے لکھا ہے کہ نکاح تو ہوگیا اور شامی میں جو لکھا ہے خود دیکھ لو مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو۔

۲) فرمایا: لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں ایک صاحب نے کچھ مسائل دریافت کیے ہیں، لکھا ہے کہ انکا جواب حدیث سے تحریر فرمایا جائے، میں نے کہہ دیا ہے کہ فقہ میں تو اس کا جواب یاد ہے اور حدیث سے اس کا جواب یاد نہیں اسلیے معذور ہوں۔

۳) ایک شخص نے خط میں سوال کیا کہ بیس رکعت تراویح کا کیا ثبوت ہے؟ اس کا جواب تحریر فرمایا کہ کیا مجتہدین پر اعتبار نہیں؟ یہ جواب لکھنے کے بعد فرمایا: کہ اگر اس شخص نے یہ جواب لکھا کہ "مجتہدین پر اعتبار نہیں" تو یہ جواب لکھوں گا کہ پھر مجھ پر کیسے اعتبار کرلیا جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسے حضرات پر اعتماد نہیں کیا۔

۴) فرمایا: ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ میں نے عورت کو لفظ طلاق نہیں کہا بلکہ "تلاک" کہا فرمایا کہ نکاح کے وقت بھی تو نکاح نہ کہا تھا "نکاہ" کہا تھا اگر اس سے نکاح نہ ہوا تھا تو عورت کو نکاح نہ ہونے کے سبب جدا ہونا چاہیے۔

۵) ایک شخص کا خط آیا ہے انہوں نے قنوتِ نازلہ کے بارہ میں دریافت کیا ہے کہ آج کل یہ نماز میں پڑھنی چاہیے یا نہیں اور اگر پڑھیں تو ہاتھ چھوڑ کر یا ہاتھ باندھ کر، اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائیں یا نہیں؟

میں نے اس کے جواب میں لکھا ہے بھلا ایسا جواب کیوں کسی کو پسند آئے گا مگر اسکی حقیقت تو میں جانتا ہوں یہ شخص ایک کم قوم کا ہے باہر جا کر اپنے کو سید ظاہر کیا، نام بھی بدل دیا۔

میں نے جواب دیا کہ آپ نے قنوت نازلہ میں تو استفتاء کیا جو چنداں ضروری نہیں اور رذائل نفس کے متعلق کچھ نہ پوچھا جو نہایت ضروری ہے، اب یہ بات کہ جواب کا سوال سے کیا تعلق ہے تو اس کا ثبوت کلام اللہ میں موجود ہے:

﴿ویسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس﴾

سوال تو کرے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت سے اور جواب ملا ہے اسکی حکمت وفائدہ کا، مطلب یہ ہے کہ علت سے سوال مت کرو فائدہ دیکھو جو جوڑ یہاں ہے وہی میرے جواب میں، حاصل یہ کہ ضرورت سے سوال کرو۔

۶) فرمایا ایک خط آیا ہے پوچھتے ہیں کہ تصویر کا رکھنا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ میں نے جواب لکھا کہ کپڑوں کے بکس میں کبھی آگ رکھتے ہوئے بھی یہ تحقیق کی ہے کہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑا انگارہ۔

۷) ایک شخص نے بذریعہ خط دریافت کیا کہ سحری کا وقت کب تک رہتا ہے فرمایا: جواب لکھا ہے کہ سحری کا اور افطار کا وقت ہر روز کا جدا جدا ہے، جس دن کا دریافت کرنا ہو، اس دن کا غروب لکھو پھر میں جواب لکھوں گا۔

۸) میں عید کا مصافحہ ابتداء تو نہیں کرتا لیکن دوسرے کی درخواست پر کر بھی لیتا ہوں، (یعنی اگر دوسرا کرتا ہے تو کر لیتا ہوں) مگر مولانا گنگوہی نہیں کرتے تھے کیونکہ بدعت ہے اور میں مغلوب ہو جاتا ہوں۔

۹) فرمایا: ایک موضع میں ایک میاں جی نے مجھ سے ترک جمعہ کے فتوے کے بارے میں یہ کہا کہ تم یوں کہہ دو کہ اگر جمعہ ترک کرنے پر عذاب ہو تو ہمارے ذمہ ہے پھر ہم جمعہ چھوڑ دیں گے میں نے کہا کہ تم یوں کہہ دو اگر پڑھنے پر عذاب ہوا تو میرے ذمہ پھر ہم اجازت دیدیں گے، پھر میں نے کہا بھلا مانس! جب کسی مولوی نے فتویٰ دیدیا تو وہ خود ذمہ دار ہو گیا، زبان سے ذمہ دار بنے یا نہ بنے۔

۱۰) ایک شخص نے کارڈ میں ایک طویل مسئلہ پوچھا ہے اور دفع دخل کے لئے لکھتے ہیں کہ یہ تکلیف کی بات تو ہے مگر رنجیدہ نہ ہونا۔

میں نے لکھدیا ہے کہ ایسے جواب کے واسطے لفافہ آنا چاہیے اور یہ نصیحت کی بات سے رنجیدہ نہ ہونا۔

۱۱) (رضاعت کے رشتہ کا) نکاح کے بعد پتہ چلا علماء سے استفتاء کیا سب نے حرام بتلایا مجھ سے کہا گیا کہ اجی اس میں تو بدنامی ہوگی، میں نے کہا اور اس میں بدنامی نہ ہوگی کہ بہن بھائی ایک جگہ جمع ہیں اس نے کہا وہ دودھ تو رہا بھی نہ تھا ویسے ہی نکل گیا تھا۔

میں نے کہا دودھ ہی نکل گیا تھا، حرمت نہیں نکلی وہ تو اس کے پیٹ میں بیٹھ گئی۔ (تحفۃ العلماء)

عیسیٰ بن مریم کی دیت (خون بہا)

عیسیٰ بن عمر نے بیان کیا کہ اک اعرابی کو بحرین کا والی (گورنر) بنا دیا گیا اس نے وہاں کے سب یہودیوں کو جمع کیا اور کہا کہ تم عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے انکو قتل

کر کے سولی پر لٹکا دیا یہ سن کر اس نے کہا پھر یہ تو ضروری بات ہے کہ تم نے اسکی دیت (خون بہا) ادا کی ہوگی؟ ان لوگوں نے جواب دیا "نہیں" اعرابی نے کہا تو واللہ! تم یہاں سے جا نہیں سکتے جب تک اسکی دیت نہ دے دو تو جب تک ان سے دیت نہ وصول کر لی جانے نہ دیا۔ (لطائف علمیہ ۱۵۹)

شفیق بن ثور کا فیصلہ

عاصم احول سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کا پیام دیا لڑکی والوں نے کہا ہم نکاح نہیں کریں گے جب تک تم طلاق نہ دے دو گے اس نے ان سے کہا کہ گواہ رہو، میں تین طلاق دے چکا ہوں اس نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ پہلے فلاں عورت جو فلاں کی بیٹی ہے میرے نکاح میں تھی اور میں نے اسکو طلاق دی تھی انہوں نے کہا معلوم ہے پھر اس نے کہا کہ یہ بھی معلوم ہے کہ فلاں عورت جو فلاں کی بیٹی ہے وہ بھی میرے نکاح میں تھی پھر میں نے اسکو طلاق دی تھی انہوں نے کہا کہ ہاں، پھر اس نے کہا کہ فلاں عورت جو فلاں کی بیٹی ہے وہ بھی میرے نکاح میں تھی اور میں نے اسکو بھی طلاق دی تھی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا اس نے کہا پھر میں تین طلاقیں دے چکا ہوں اور یہی میں نے کہا تھا انہوں نے کہا کہ ہماری گفتگو اس بیوی کو طلاق دینے کے بارے میں ہو رہی تھی یہ تنازعہ شفیق بن ثور کے سامنے لایا گیا جو عثمان کے پاس جا رہے تھے جب شفیق واپس آئے تو انہوں نے بیان کیا کہ میں نے اس صورت کے بارے میں عثمان سے سوال کیا تھا انہوں نے اس کی نیت کو قابلِ اعتبار مانا ہے۔ (لطائف علمیہ ۱۶۹)

دو بیویوں میں انصاف کا عجیب قصہ

حضرت یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں ان میں سے جس کی باری کا دن ہوتا اس دن دوسری کے گھر سے وضو نہ کرتے پھر دونوں بیویاں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملک شام گئیں اور وہاں دونوں اکٹھی بیمار ہوئیں اور اللہ کی شان دونوں کا ایک ہی دن میں انتقال ہوا ،لوگ اس دن بہت مشغول تھے اسلئے دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے دونوں میں قرعہ ڈالا کہ کس کو قبر میں پہلے رکھا جائے۔

حضرت یحییٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں جب ایک پاس ہوتے تو دوسری کے ہاں سے پانی بھی نہ پیتے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۶۹/۲ ۷)

خطوط میں "بسم اللہ" لکھنا جائز ہے یا ناجائز؟

خط نویسی کی اصل سنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے لیکن قرآن وسنت کے نصوص واشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ "بسم اللہ" یا "اللہ تعالیٰ" کا کوئی نام لکھا جائے اگر اس جگہ اس کاغذ کی بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں "بسم اللہ" یا "اللہ تعالیٰ" کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے

ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔

آج کل عموماً ایک دوسرے کو جو خط لکھے جاتے ان کا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں اسلئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لئے زبان سے ''بسم اللہ'' کہے تحریر میں نہ لکھے۔ (معارف القرآن:۶/۵٦٧)

ف: ہمارے ہاں جو ۷۸٦ لکھنے کا رواج ہے، اس سے سنت ادا نہیں ہوتی، البتہ جب کوئی شخص زبان سے ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھ کر خط لکھنا شروع کرے تو اس وقت سنت ادا ہو جائے گی چاہے ۷۸٦ لکھے یا کچھ بھی نہ لکھے۔ (مؤلف)

ایک عالمی آفت کا شرعی حکم

ٹی وی پر میچ دیکھنا جائز نہیں، اس میں کئی گناہ اور خرابیاں ہیں پہلا گناہ کھیلنے والوں کی تصاویر قصداً دیکھنے کا ہے، جس کو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جواہر الفقہ :۲/۳۳۹) پر لکھا ہے اور ٹی وی میں بے شمار لوگوں کی تصاویر ہوتی ہیں اسلیے ہر تصویر کو دیکھنے کا الگ الگ گناہ ہوگا۔

دوسرا گناہ کھیل دیکھنے کے دوران وقتاً فوقتاً ان عورتوں کی تصاویر دیکھنے کا ہے جو کھیل دیکھنے کے لئے اسٹیڈیم میں ہوتی ہیں۔

تیسرا گناہ ٹی وی خریدنے اور گھر میں رکھنے کا ہے اگرچہ اسکو استعمال نہ کیا جائے جیسا کہ (فتاویٰ رحیمیہ ۶/۲۹۸) میں لکھا ہوا ہے اگر کوئی شخص گانے بجانے کے آلات اور غفلت میں ڈالنے والے سامان اپنے گھر میں رکھے تو یہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے اور گناہ ہے اگرچہ وہ انکو استعمال نہ کرے اس لئے کہ ایسے آلات کو رکھنا عام طور پر دل لگی کے لئے ہوتا ہے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ:۳۳۸)

چوتھا گناہ جماعت کی نماز چھوڑنے کا ہے جیسا کہ عام طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

پانچویں خرابی اپنے قیمتی وقت کو برباد کرنا ہوتا ہے۔

چھٹی خرابی لایعنی (بے فائدہ کام) میں اپنے کو مشغول رکھنا ہے جب کہ حدیث میں اسلام کی خوبی یہ بتلائی گئی ہے کہ بے کار کاموں کو چھوڑ دے۔

ساتویں خرابی یہ ہیکہ اس سے دین و دنیا کے ضروری کاموں سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔

آٹھویں خرابی یہ ہے کہ اس سے ٹی وی سے انسیت پیدا ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد بہت سے گناہ اور خرابیاں وجود میں آتی ہیں۔

نویں خرابی یہ ہے کہ اس سے روزی کی برکت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ ہر گناہ کا یہی اثر ہے۔

دسویں خرابی یہ ہے کہ ٹی وی کے پروگراموں سے دلچسپی رکھنے والا بھلائی کے کاموں سے محروم رہتا ہے۔

کومینٹری سے دلچسپی رکھنے کی خرابیاں اور گناہ

پہلا گناہ جماعت کی نماز چھوڑنے کا ہے۔
دوسری خرابی لغو (بے کار کام) میں مشغول ہونا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کامیابی کے لیے ایک شرط بیان فرمائی ہے کہ لغو کاموں سے دور رہے۔ (پارہ ۱۸، رکوع ۱)
تیسری خرابی یہ ہے کہ اس میں وقت کی ناقدری ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ''والعصر'' میں وقت کی قسم کھا کر اس کی اہمیت اور قدردانی کی تعلیم دی ہے۔
چوتھی خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی فکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔
پانچویں خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کے ضروری کاموں کا نقصان ہوتا ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ (بکھرے موتی: ۵۵/۱)

ناخن کاٹنے کا کوئی خاص طریقہ منقول نہیں

ناخن کاٹنے کا کوئی خاص طریقہ یا کوئی خاص دن آنحضرت ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ صاحب درمختار، جمعہ کے دن خاص طریقہ پر ناخن کاٹنے کی دو روایتیں نقل کر کے لکھتے ہیں:

"قال الحافظ ابن حجر انه يستحب كيفما احتاج اليه، ولم يثبت في كيفيته شيء ولا في تعيين يوم له عن النبي صلى الله عليه وسلم" (شامی جلد: ۲۶۰/۵)

اور بذل المجہود میں ہے: حافظ ابن حجر عسقلانی اور ابن دقیق العید نے فرمایا کہ ناخن تراشنے میں کوئی خاص کیفیت اور کوئی خاص دن بالیقین حضور ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ (بذل المجہود: ۳۳/۱)

چار ماہ کے بعد اسقاط حمل قتل کے حکم میں ہے

بچوں کو زندہ دفن کر دینا قتل کر دینا سخت گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے اور چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی کے حکم میں ہے کیونکہ چوتھے مہینے میں حمل میں روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے اسی طرح جو شخص کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہو جائے تو باجماع امت مارنے والے پر اسکی دیت میں غرہ یعنی ایک غلام یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے۔
اور بطن سے باہر آنے کے وقت وہ زندہ تھا پھر مر گیا تو پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے اور چار ماہ سے پہلے اسقاط حمل بھی بدون اضطراری حالت کے حرام ہے، مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیونکہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتل صریح نہیں ہے۔ (مظہری، معارف القرآن: ۶۸۳/۸)

ننگے سر کی شہادت قبول نہیں

اسلام بلند اخلاق و کردار کی تعلیم دیتا ہے اور گھٹیا اخلاق اور معاشرت سے منع کرتا ہے ننگے سر بازاروں اور گلیوں میں نکلنا اسلام کی نظر میں ایک ایسا عیب ہے جو انسانی مروت و شرافت کے خلاف ہے

اسلئے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اسلامی عدالت ایسے شخص کی شہادت قبول نہیں کرے گی، مسلمانوں میں ننگے سر پھرنے کا رواج انگریزی تہذیب ومعاشرت کی نقالی سے پیدا ہوا ہے ورنہ اسلامی معاشرت میں ننگے سر پھرنے کو عیب تصور کیا جاتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۳/۲۲۴، آپکے مسائل ۸/۷۴)

شہادت کی شرطیں

دو ہوں، بالغ، عاقل وحروذکور۔۔۔ مسلم وغیر متہم بہ فجور

(خلاصۃ التفاسیر:۱/۲۲۴)

مقروض کی نماز جنازہ حضور پاک ﷺ نہیں پڑھتے تھے

حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ ایسے لوگوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے جن پر دوسروں کا حق ہوتا اس لیے نماز سے پہلے حضور ﷺ معلوم کرلیا کرتے تھے کہ اس پر کسی کا حق تو نہیں اسی وجہ سے ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا مگر حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے انکے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لی، اس کے بعد آپ ﷺ نے نماز جنازہ ادا فرمائی۔

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی کا جنازہ لایا گیا تاکہ آپ ﷺ اسکی نماز جنازہ پڑھ دیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو کیونکہ انکے ذمہ قرض ہے جب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اسکی ادائیگی میرے ذمہ ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا پورا کروگے؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں میں ادا کردوں گا۔

نوٹ: جب آپ ﷺ پر فتوحات ہوئیں تو مقروض کے قرض کا ذمہ خود لے لیتے تھے۔ اور جنازہ کی نماز پڑھاتے تھے۔ (آپکے مسائل اور انکا حل:۳/۱۳۱ اور رحمۃ للعالمین:۱/۲۶۶)

پھر آپ ﷺ نے ان صحابی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (نسائی شریف:۳۱۵)

باغی، ڈاکو اور ماں باپ کے قاتل کی نماز جنازہ نہیں

سوال: قاتل کو سزا کے طور پر قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے اسکی نماز جنازہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر والدین کا قاتل ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ فاسق، فاجر اور زانی کی موت پر اسکی نماز جنازہ کے بارہ میں کیا حکم ہے؟

جواب: نماز جنازہ ہر گنہگار مسلمان کی ہے البتہ، باغی اور ڈاکو اگر مقابلہ میں مارے جائیں تو انکی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے، نہ انکو غسل دیا جائے، اس طرح جس شخص نے اپنے ماں باپ میں سے کسی کو قتل کردیا ہو، اور اسے قصاصاً قتل کیا جائے تو اسکی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی اور اگر وہ اپنی موت مرے تو اسکی نماز جنازہ پڑھی جائے گی تاہم سربرآوردہ مقتدا (یعنی دین میں باحیثیت) لوگ اس میں شرکت نہ کریں۔ (آپکے مسائل اور انکا حل:۳/۱۳۲)

دو جھگڑنے والوں کو دیوار کی نصیحت

بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کا انتقال ہوگیا، اسکے دو بیٹے تھے، ان دونوں کے مابین ایک دیوار کی تقسیم کے سلسلے میں جھگڑا ہو گیا، جب دونوں آپس میں جھگڑ رہے تھے تو انہوں نے دیوار سے ایک غیبی آواز سنی کہ تم دونوں جھگڑا مت کرو کیونکہ میری حقیقت یہ ہے کہ میں ایک مدت تک اس دنیا میں بادشاہ اور صاحب مملکت رہا۔ پھر میرا انتقال ہوگیا اور میرے بدن کے اجزاء مٹی کے ساتھ مل گئے۔ پھر اس مٹی سے کمہار نے مجھے گھڑے کی ٹھیکری بنا دیا، ایک طویل مدت تک ٹھیکری کی صورت میں رہنے کے بعد مجھے توڑ دیا گیا۔ پھر ایک لمبی مدت تک ٹکڑوں کی صورت میں رہنے کے بعد میں مٹی اور ریت کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ پھر کچھ مدت کے بعد لوگوں نے میرے اجزائے بدن کی اسی مٹی سے اینٹیں بنا ڈالیں۔ اور آج تم مجھے اینٹوں کی شکل میں دیکھ رہے ہو، لہٰذا تم ایسی مذموم وقبیح دنیا پر کیوں جھگڑتے ہو۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

غرور تھا نمود تھی، ہٹو بچو، کی تھی صدا
اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

آہ! آہ! یہ دنیا بڑی فریب دہندہ ہے فانی ہونے کے باوجود یہ لوگوں کی محبوب بنی ہوئی ہے، یہ اپنی ظاہری رنگینی اور رعنائی سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہوئے آخرت سے غافل کرتی ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں کو حقیقی مسرات کے شوق سے ہم آغوش فرمائیں۔ (گلستان قناعت تالیف علامہ محمد موسیٰ روحانی بازی: ۴۹۲)

میاں بیوی ایک دوسرے کا ستر نہ دیکھیں

یہ مضمون ضرور پڑھیں اور نسیان کے مرض سے بچیں۔

اسلامی تعلیم یہ ہے کہ زوجین بھی آپس میں بالکل بے شرم نہ ہو جایا کریں بلکہ حتی الامکان ستر کا خیال رکھیں، چنانچہ ایک مرسل روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد نقل فرماتے ہیں:

"اذااتی احد کم اھلہ فلیستتر ولا یتجردان تجرد العیرین"

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو حتی الامکان ستر پوشی کرے اور جانوروں کی طرح بالکل ننگے نہ ہو جایا کریں۔

معلوم ہوا کہ حیا کا تقاضا یہ ہے کہ میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے ستر کو نہ دیکھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پوری زندگی نہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر دیکھا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا دیکھا۔ اس بات کا لحاظ رکھ کر شرم وحیا کا ثبوت دینا چاہیے۔ والدین کے اعمال واخلاق کا اولاد پر بہت اثر پڑتا ہے اگر ہم شرم وحیا کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوں گے تو ہماری اولاد بھی ان ہی صفات وخصائل کی

حامل ہوگی، اور اگر ہم شرم وحیا کا خیال نہ رکھیں گے تو اولاد میں بھی اسی طرح کے خراب جراثیم سرایت کر جائیں گے۔ آج ٹیلی ویژن کے پردے پر ننگے اور انسانیت سے گرے ہوئے مناظر دیکھ کر ہمارے معاشرے میں انکی نقل اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اس کا بالکل لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ ہمارا رب اور ہمارا خالق ومالک تنہائیوں میں بھی ہمارے اعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ اس بدترین حالت میں ہمیں دیکھے گا تو اسے کس قدر ناگوار گذرے گا۔ اس لیے اللہ سے شرم کرنی ضروری ہے، یہ شرم وحیا ہی ہمیں ایسی بری باتوں سے بچا سکے گی۔

علاوہ ازیں ستر پوشی میں لا پرواہی کا ایک اور نقصان حضرات فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی پر بھول اور نسیان کا غلبہ ہوجاتا ہے اور ضروری باتیں بھی اسے یاد نہیں رہتی۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بھول کا مرض پیدا کرنے والی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی شرم گاہ سے کھیل کرے اور اس کی طرف دیکھے۔ (شامی: ۱/۲۲۵، کتاب الطھارۃ مطلب ست تورث النسیان)

بہر حال نظر سے صادر ہونے والی نامناسب باتوں میں سے اپنے ستر پر بلاضرورت نظر کرنا بھی ہے جس سے نظر کو محفوظ رکھنا چاہیے۔

فقہ کی طرح علم تصوف کا بھی ایک حصہ فرض عین

جس طرح ہر مرد وعورت پر اپنے اپنے حالات ومشاغل کی حد تک ان کے فقہی مسائل جاننا فرض ہے، اور پورے فقہ کے مسائل میں بصیرت ومہارت حاصل کرنا اور مفتی بننا سب پر فرض نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے اسی طرح جو اخلاق حمیدہ کسی میں موجود نہیں انہیں حاصل کرنا اور جو رذائل اس کے نفس میں چھپے ہوئے ہیں ان سے بچنا، تصوف کے علم پر موقوف ہے، اس کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے اور پورے علم تصوف میں بصیرت ومہارت پیدا کرنا کہ دوسروں کی تربیت بھی کر سکے، یہ فرض کفایہ ہے۔ (رد المحتار مع الدر المختار: ۱/۳۹، تفسیر معارف القرآن: ۴/۴۹۰)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ فقیہ النفس تھے، اس لیے انہوں نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کماحقہ تعریف کی ہے، کبھی فرماتے ہیں کہ: امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دل اور نگاہ دونوں کو بھر دیتے ہیں (کیونکہ خوبصورت اور خوب سیرت تھے اور علم بھی اچھا تھا) کبھی فرماتے ہیں کہ جب امام محمد رحمۃ اللہ علیہ گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی نازل ہو رہی ہے، ایک بار فرمایا کہ میں نے ان سے دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا۔

جہاں تک محدثین کی بات ہے تو ان میں جو لوگ فقیہ نہیں ہیں ان کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی قدر ومنزلت معلوم نہیں اس لیے ان لوگوں سے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تعریفی کلمات منقول نہیں ہیں۔ محدثین کی ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ پہلے شخص ہیں جس نے فقہ کو حدیث سے الگ کیا۔ اس لیے ان

لوگوں نے اس بارے میں ان کو مطعون کیا، حالانکہ آخر کار تمام مذاہب والوں کو ان کی اتباع کرنی پڑی اور سب نے انہیں کا طریقہ کار اختیار کیا۔ (جمال انور سوانح کشمیری ﷫:۱۴۹، بحوالہ فیض الباری ۵۲/۱)

دو مسئلے

ایک شخص نے اپنا بیٹا معلم کے حوالہ کر کے کہا کہ اس کو نحو اور فقہ کے علاوہ اور کچھ نہ سکھائیں۔ معلم نے اس کو صرف دو مسئلے سکھائے، ایک نحو کا، اور ایک فقہ کا۔ ''ضرب زید عمروا'' زید فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ''عمرو'' مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور دوسرا مسئلہ فقہ کا سکھایا: ''ایک شخص مر جائے اور اس کے ماں باپ رہ جائیں تو اس کے مال میں ماں کو ثلث (تہائی) ملے گا اور باقی پورا مال باپ کے لیے ہے پھر بچے سے پوچھا یہ مسئلہ آپ کی سمجھ میں آ گیا؟ بچے نے جواب دیا، ہاں جب گھر گیا تو باپ نے پوچھا بیٹا! '' ضرب عبد الله زيدا'' میں کیا کہتے ہو؟ یعنی اس کی کیا ترکیب ہے؟ بیٹے نے کہا، میں کہتا ہوں کہ عبداللہ اپنے فعل کی وجہ سے جیت گیا اور باپ کے لیے کچھ نہیں بچا۔ (اخبار الحمقی والمغفلین اردو:۲۷۹)

نہ کنواری نہ بیاہی ہوئی

ایک شخص ابو حکیم فقیہ کے پاس آیا، میں بھی وہاں حاضر تھا، آدمی کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی، جس کا ایک شخص کے ساتھ نکاح کرا رہا تھا، شیخ نے اس سے پوچھا: آپ کی بیٹی شادی شدہ ہے یا کنواری؟ اس آدمی نے کہا: اے شیخ! خدا کی قسم یہ نہ کنواری ہے اور نہ بیاہی ہوئی بلکہ درمیانی ہے، شیخ نے کہا: پھر کیا ہے؟ ''عوان بين ذالك'' یہ سن کر حاضرین ہنس پڑے اور یہ احمق سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ (حوالہ بالا)

سردی کے موسم میں ایک دیہاتی کی نماز

اصمعی کہتے ہیں میں نے ایک دیہاتی کو سردی کے موسم میں بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا وہ کہہ رہا تھا۔

اليك اعتذر من صلاتي قاعدًا ☆ على غير طهر موميانحو قبلتي

فمالي برد الماء يارب طاقة ☆ ورجلاى لا تقوى طى ركبتي

ولكنني اقضيه يارب جاهدًا ☆ وا قضيكه ان عشت في وجه صيفتي

وان انا لم افعل فانت محكم ☆ الهي في صفعي وفي نتف لحيتي

یعنی ''میں تیرے سامنے بغیر وضو کے رو بہ قبلہ ہو کر اشارہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا عذر پیش کرتا ہوں''

''اے میرے پروردگار! کہ میں ٹھنڈے پانی کو استعمال کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور میرے پیروں میں گھٹنے سمیٹنے کی طاقت نہیں''

اے میرے پروردگار! لیکن میں بڑے پیار اور انہماک سے نماز ادا کرتا ہوں اور اگر زندہ رہا تو موسم گرما کی ابتداء میں اس کی قضا کروں گا (یعنی پھر صحیح طریقہ سے نماز کی قضاء کروں گا)

اور اگر میں نے قضاء نہیں کی، تو اے میرے رب میرے گدی اور داڑھی نوچنے کا فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ (احمقوں کی دنیا: ۱۸۷)

بکری کو حد جاری کرنا

رقہ میں ہارون الرشید کے گورنر نصر بن مقبل نے بکری کو حد میں کوڑے مارنے کا حکم دیا، لوگوں نے کہا یہ تو جانور ہے (اس پر کیسے حد جاری ہوگی؟) کہنے لگا حدود کسی سے ٹلتی نہیں ہیں اور اگر میں نے حد معطل کی تو میں بہت بڑا ظالم کہلاؤں گا، یہ خبر ہارون الرشید کو پہنچی تو اس نے اسکو طلب کیا جب یہ انکے سامنے ظاہر ہوا، تو ہارون الرشید نے پوچھا تم کون ہو؟ کہا میں بنی کلب کا سردار ہوں، ہارون الرشید ہنسے پھر پوچھا آپ نے کیسے بکری پر حد جاری کرنے کا حکم دیا؟ کہا میرے یہاں حد میں انسان اور چوپائے برابر ہیں اگر کسی چوپائے پر حد واجب ہو جائے تو میں اس پر ضرور حد جاری کروں گا اگر چہ وہ میری ماں، بہن ہی کیوں نہ ہو اللہ کے حق کے معاملہ میں، میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا۔

چنانچہ ہارون الرشید نے حکم دیا "ایسے معاملات میں اسکے ساتھ کوئی تعاون نہ کیا جائے" (ایضاً)

جب نماز میں کسی کو حدث ہو جائے تو.....؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب نماز میں کسی کو حدث ہو جائے یعنی گوز (ریح) نکل کر وضو ٹوٹ جائے تو اپنی ناک پکڑ کر جماعت سے نکل جائے تاکہ مسلمان کا عیب چھپ جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شراب حرام ہونے سے پہلے مراد خداوندی کو بھانپ لینا

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (شراب حرام ہونے سے پہلے) سنا کہ یہ فرماتے تھے کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے شراب سے بچانے کا ارادہ کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جلدی ہی اسکے بارے میں حکم نازل ہونے والا ہے، تو جس کے پاس کچھ شراب موجود ہو وہ اسکو بیچ کر نفع اٹھالے، کہتے ہیں کہ اس ارشاد پر تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام کر دیا ہے جس کو اس آیت کی اطلاع ہو جائے اور اسکے پاس شراب موجود ہو تو وہ نہ اسکو پئے اور نہ اسکو بیچے، تو لوگوں کے پاس جس قدر بھی شراب موجود تھی اسکو لے کر سڑکوں پر آ گئے اور بہا دی۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۶۳)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ذہانت سے بھرپور ایک مشورہ

مجاہد سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان تشریف رکھتے تھے کہ آپ کو بدبو ہوا محسوس ہوئی تو فرمایا جس شخص کی ریح خارج ہوگئی، اسکو چاہیے کہ اٹھ کر وضو کر آئے، شرم کی وجہ سے وہ شخص نہ اٹھا، آپ نے پھر فرمایا، صاحب ریح کو اٹھ کر وضو کر لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ بھی اظہار حق

سے نہیں شرماتے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! ہم سب ہی اٹھ کر وضو کیوں نہ کرلیں۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۷۱)

جریر بن عبداللہ کا مشورہ

ایک روایت میں ایسا ہی قصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں پیش آیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مکان میں بیٹھے تھے اور ان کیساتھ جریر بن عبداللہ بھی تھے (اور دیگر حاضرین مجلس تھے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بدبودار ہوا محسوس ہوئی تو آپ نے فرمایا: صاحب ریح کو چاہیے کہ اٹھ کر وضو کرلے جریر بن عبداللہ نے عرض کیا اے امیر المومنین! تمام حاضرین ہی کو وضو کرلینا چاہیئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز پسند کرتے ہوئے فرمایا: تم پر خدا کی رحمت ہو تم جاہلیت کے زمانہ میں بہت اچھے سردار تھے اور اسلام میں بھی بہت اچھے سردار ہو۔

سحری کا وقت

حضرت عدی بن حاتم کو جب یہ معلوم ہوا کہ رمضان میں سحری کھانے کی آخری حد یہ ہے کہ:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (سورۃ البقرۃ:۱۸۷)

''کھاؤ پیو، جب تک کہ سفید ڈورا، سیاہ ڈورے سے صبح ہونے تک ممتاز نہ ہو جائے''

تو انہوں نے ایک سفید اور ایک سیاہ ڈورا تکیہ کے نیچے رکھ لیا اور اس وقت تک کھاتے پیتے رہتے تھے، جب تک یہ دونوں ڈورے کھلے طور پر ایک دوسری سے الگ نہ نظر آنے لگتے۔ اس میں کافی چاندنا ہو جاتا مگر انکا خورد ونوش (کھانا پینا) بند نہ ہوتا اور وہ بزعم خود قرآن پر عمل کررہے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاح کے لہجہ میں فرمایا: "ان وسادتك لعريض"

تیرا تکیہ بڑا ہی لمبا چوڑا ہے (کہ اسکے نیچے سیاہ ڈورا اور سفید ڈورا یعنی افق سارا آگیا۔)

اشارہ تھا کہ سیاہ وسفید ڈورے سے سوت کا ڈورا مراد نہیں، بلکہ رات کا سیاہ خط اور صبح صادق کا سفید خط مراد ہے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۳۷)

عقلمند آدمی جب اسکا چہرہ اور قد سامنے ہو تو چھپ نہیں سکتا

عجلان کہتے ہیں کہ مجھ سے زیاد نے کہا کہ میرے پاس کسی عقلمند آدمی کو لاؤ، میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا کہ آپکی مراد کس شخص کو بلانا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ عقلمند آدمی جب اسکا چہرہ اور قد سامنے ہو تو چھپ نہیں سکتا تو میں نکلا ہی تھا کہ ایک شخص میرے سامنے آیا جو وجیہ اور دراز قد و فصیح اللسان تھا میں نے اس کو چلنے کے لئے کہا وہ آکر زیاد سے ملا زیاد نے کہا کہ اے شخص میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں ایک معاملہ میں، کیا آپ تیار ہیں اس نے جواب دیا کہ میں پیشاب کو روکے ہوئے ہوں اور ایسے شخص کی رائے ناقابل اعتماد ہے زیاد نے مجھ سے کہا کہ اے عجلان اس کو بیت الخلاء لے جاؤ (میں نے پہنچا دیا) جب وہ

نکلا تو اس نے کہا کہ میں بھوکا ہوں اور بھوکے کی رائے نا قابل اعتبار ہے۔ زیاد نے کہا اے عجلان! اسکو کھانا دو، تو کھانا لایا گیا پھر جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو کہا اب پوچھیے، آپکو جس امر کی ضرورت ہو، تو ان سے جو سوال بھی کیا گیا ان کے پاس اس کا مناسب جواب موجود تھا۔

عورتوں میں ختنہ کا رواج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جاری کیا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت منقول ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے، کہ جب حضرت سارہ نے دیکھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ (ہاجرہ) سے حضرت ابراہیم علیہ السلام محبت کرنے لگے، تو اسکے دل میں شدید غیرت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ وہ قسم کھا بیٹھیں کہ وہ ہاجرہ کے اعضاء میں کوئی عضو ضرور کاٹ دیں گی، جب یہ اطلاع حضرت ہاجرہ کو پہنچی تو انہوں نے ذرہ پہننا شروع کردی جس کے دامن طویل رکھے اور یہ دنیا کی پہلی عورت ہیں جس نے دامن لمبا بنایا اور ایسا اس لیے کیا تھا کہ چلتے ہوئے دامن کی رگڑ سے قدموں کے نشانات زمین پر باقی نہ رہیں کہ سارہ انکے آنے جانے کو نہ پہچان سکیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارہ سے فرمایا کہ کیا تم یہ خبر حاصل کرسکتی ہو کہ اللہ کے فیصلے پر اپنے کو راضی کرلو، اور ہاجرہ کا خیال چھوڑ دو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے جو قسم کھائی ہے اب اس سے عہدہ برآ ہونا کیسے ممکن ہوگا؟ آپ علیہ السلام نے اس کی یہ ترکیب بتائی کہ تم ہاجرہ کے پوشیدہ جسم کے اوپر کا حصہ گوشت (جو ایک مستقل عضو ہے) کاٹ دو (اس کا کاٹ دینا عورتوں کے لئے اچھا بھی ہے) اور عورتوں میں سے ایک سنت جاری ہو جائے گی اور تمہاری قسم بھی پوری ہو جائیگی، تو وہ اس پر رضامند ہوگئیں اور اسکو کاٹ دیا، اور یہ طریقہ عورتوں میں جاری ہوگیا (اس طرح عورتوں کے ختنہ کا رواج عرب میں تھا) اسلام نے اسکو ضروری نہیں قرار دیا جس طرح مردوں کا ختنہ ضروری ہے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۵۶)

ف: ختنہ کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلا آرہا ہے، خود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ختنہ کیا تھا، ان کی اولاد میں بھی ختنہ رہا، یہاں تک کہ تورات میں ختنہ کا حکم موجود ہے اور مسلمانوں کے لئے بھی ختنہ کرنا سنت ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ تاریخی ضرب المثل بن گیا کہ "جو مذہب پکا اس کی نشانی پکی اور جو مذہب کچا اس کی نشانی کچی" (مسلمانوں کی نشانی ختنہ اور ہندوؤں کی نشانی چوٹی ہے) تفصیل کے لئے "انعام الباری لشیخ تقی عثمانی مدظلہ جلد ۱ص ۲۷۲" ملاحظہ کیجئے۔ (مؤلف)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ایک عجیب واقعہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوگئے تو اپنی قوم جرہم کی ایک عورت سے نکاح کرلیا، جب ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے کیلئے (شام سے) آئے تو اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا تو آپ نے انکی بیوی سے پوچھا، اس نے جواب دیا کہ وہ معاش کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں، پھر اس سے معاشی حالات دریافت کئے تو اس نے کہا کہ ہم بڑی تنگی اور سختی سے گزارا کرتے ہیں

اور شکایتیں کرنا شروع کردیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تمہارا شوہر آجائے تو اس سے ہمارا سلام کہہ دینا اور یہ کہ اپنے گھر کے دروازہ کی دہلیز بدل دے، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو انکو پیغام پہنچا دیا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے والد (حضرت ابراہیم علیہ السلام) تھے اور مجھے یہ حکم دے گئے ہیں کہ تجھے اپنے سے جدا کردوں، اب تو اپنے متعلقین کے پاس چلی جا۔ (بخاری شریف جلد اول)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا عجیب وغریب فیصلہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ دو عورتیں سفر میں تھیں اور ہر ایک کی گود میں بچہ تھا، ان میں سے ایک کے بچے کو بھیڑیا لے گیا اب دوسرے بچہ پر دونوں عورتوں نے جھگڑنا شروع کر دیا۔ (ہر ایک اسکو اپنا کہتی تھی) اب دونوں نے یہ مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے پیش کیا، آپ نے دونوں میں سے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا، کہ بچہ پر اسی کا قبضہ تھا اور ثبوت کوئی بھی پیش نہ کر سکی تھی واپسی میں ان عورتوں کا گذر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے سے ہوا، آپ نے ان سے حال دریافت کیا تو انہوں نے پورا قصہ کہہ سنایا۔ آپ نے یہ سن کر حکم دیا کہ چاقو لاؤ، میں اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے دونوں میں تقسیم کر دوں گا، چھوٹی نے (آمادگی دیکھ کر) پوچھا کہ کیا واقعی آپ اسے کاٹ ڈالیں گے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: کہ ہاں! اس نے کہا کہ آپ نہ کاٹیے؟ میں اپنا حصہ اسکو دیئے دیتی ہوں، یہ سن کر آپ علیہ السلام نے فیصلہ کر دیا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے، اور اسکو دیدیا۔ اسکا ذکر بخاری و مسلم میں ہے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۵۷)

عقلمند مر کر بھی جیتا ہے

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے جلوس میں چلے آرہے تھے، انہوں نے ایک عورت کو دیکھا جو اپنے بیٹے کو "یالادین" کے لفظ سے پکار رہی تھی، یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام ٹھہر گئے، اور کہا کہ اللہ کا دین تو ظاہر ہے (اس لادین کا کیا مطلب؟) اس عورت کو بلوایا اور پوچھا اس نے کہا کہ میرا شوہر ایک (تجارتی) سفر میں گیا تھا اور اسکے ہمراہ اسکا ایک ساجھی تھا اس نے ظاہر کیا کہ وہ مر گیا اور اس نے یہ وصیت کی تھی کہ اگر میری بیوی کے لڑکا پیدا ہو، تو میں اس کا نام لادین رکھوں، یہ سنکر آپ نے اس شخص کو پکڑوا کر بلایا اور تحقیق کی، اس نے اعتراف کرلیا کہ میں نے اسے قتل کر دیا تھا تو اسکے قصاص میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے قتل کرا دیا۔ (ایضاً: ۵۸)

نماز میں عجلت کی مذمت

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غالباً حضرت مولانا فتح محمد رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جلال آباد میں دو شخص مسجد میں نماز کو آتے تھے، اور یہ شرط کر کے آتے تھے، کہ پہلے کون نماز ختم کریگا؟ ایک شخص نے انکے نماز پڑھنے کی حالت دیکھ کر کہا، معلوم ہوتا ہے، قرات وتشہد ودرود شریف وتسبیحات تو گھر پڑھ آتے

ہوں گے، باقی رکوع اور سجدے یہاں آ کر کر لیتے ہوں گے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۲۴)

حضور ﷺ کا تعریض سے بھرپور ایک کلام

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک مدعی حاضر ہوا، جو ایک شخص کو پکڑے ہوئے تھا، جس نے اسکے کسی عزیز کو قتل کر دیا تھا اس سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم دیت یعنی خون بہا لینا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا معاف کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا نہیں، آپ ﷺ فرمایا کہ اچھا لے جاؤ، اسکو قتل کر دو جب وہ آپ ﷺ کے پاس سے چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس نے قتل کر دیا تو وہ اسی قاتل کی مثل ہو جائے گا، اب ایک شخص نے اس مدعی سے مل کر رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نقل کر دیئے تو اس نے فوراً اسے چھوڑ دیا حالانکہ وہ اسکی گردن میں رسی باندھے کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔

ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مثل کے لفظ سے یہ مراد نہیں لیا تھا کہ اگر اس نے اسکو قتل کر دیا تو وہ گناہگار اور مستحق نار ہونے میں اس قاتل کے برابر ہو جائے گا، اور آپ ﷺ یہ مراد کیسے لے سکتے تھے؟ جبکہ قاتل سے قصاص لینے کو اللہ تعالیٰ نے مباح کیا ہے لیکن رسول ﷺ کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ اس سے قصاص لے اور آپ ﷺ نے یہ اچھا سمجھا کہ وہ اسکو معاف کر دے، تو آپ ﷺ نے ایسا لفظ استعمال کیا جس میں اس مطلب کیطرف اسکی قوت واہمہ دوڑ جائے، کہ اگر میں نے قتل کر دیا تو میں بھی گناہ گار ہونے میں اسکے برابر ہو جاؤں گا، تا کہ وہ اسکو معاف کر دے اور مراد آپ ﷺ کی یہ تھی کہ قتل نفس میں دونوں برابر ہو جائیں گے تو یہ بھی قاتل ہوگا اور وہ بھی قاتل یہ الگ بات ہے کہ پہلا قاتل ظالم تھا اور دوسرا قصاص لینے والا ہوتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک شخص کو طلاق سے بچانے کے لیے ایک عجیب حیلہ

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حاضر کیا گیا، جس نے یہ حلف کر لیا تھا کہ میری بیوی پر تین طلاق اگر میں رمضان میں اس سے دن میں جماع نہ کروں۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر سفر میں چلا جا اور دوران سفر روزہ فرض نہیں (اس لیے روزہ نہ رکھنا) اور دن میں جماع کر لینا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء ۶۹)

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی معرفت خداوندی

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں ابراہیم بن رباح موصلی سے منقول ہے کہ ایک شخص نے ان پر کچھ مال کا دعویٰ کیا۔ آپ کو قاضی کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اپنے دعوے کی سچائی پر حلف کر لے اور لے لے۔ اس شخص نے ان الفاظ سے شروع کیا "واللہ الذی لا الہ الا ھو" یعنی قسم کھاتا ہوں اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان الفاظ سے حلف کرو، واللہ، واللہ، جس مال کا دعویٰ کرتا

ہوں تو حسین کے ذمہ وا جب ہے اس شخص نے حلف کر لیا، ذرا کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس کے پاؤں ڈگمگائے اور مر کر جا پڑا۔ آپ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا (کہ آپ نے حلف کے الفاظ کیوں بدلوائے) آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ اللہ کی تمجید بیان کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ حلم کا معاملہ ہو جائے گا۔ (ایضا ۷۰)

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا مزاح سے بھرپور ایک واقعہ

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں عکرمہ مولی ابن عباس کہتے ہیں کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹے ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے حجرے کی طرف پہنچے (جہاں انکی باندی موجود تھی) اس سے مشغول ہو گئے۔ جب ان کی بیوی نے بیدار ہو کر ان کو نہ دیکھا تو تجسس کے لیے نکلی اور دیکھا کہ وہ جاریہ یعنی باندی کے پیٹ پر ہیں، تو اس نے واپس ہو کر چھری سنبھالی اور جاریہ کے پاس پہنچی۔ عبداللہ نے اس سے کہا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کیا بات، کیسی سمجھ لو؟ میں اگر اس وقت تم کو اسی حالت میں پھر دیکھتی جس میں تم تھے تو اس چھری سے اس کی خبر لیتی۔ عبداللہ نے کہا: اور میں کہاں تھا؟ اس نے کہا، اس جاریہ کے پیٹ پر، عبداللہ نے کہا میں کہاں تھا۔ (انہوں نے ایک ایسا لفظ بولا جس سے اس عورت کو انکار مفہوم ہوا) اس نے کہا کیوں نہیں، کہنے لگی۔ اچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حالت جنابت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا اگر تم سچے ہو تو قرآن پڑھ کر سناؤ، انہوں نے کہا اچھا سنو۔ (اور قرآن کے لہجہ میں یہ اشعار پڑھ ڈالے)

"اتانا رسول اللّٰہ یتلو کتابہ، کما لاح منشور من الصبح ساطع ارانا
الھدی بعد العمی فقلو بنابہ موقنات ان ما قال واقع یبیت یجافی جنبہٗ
عن فراشہ اذا استقلت بالکافرین المضاجع"

(ترجمہ) ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے، وہ ہم کو اللہ کا کلام سناتے ہیں جس طرح پھیلی ہوئی درخشاں صبح ظاہر ہوتی ہے، ہم کو جبکہ ہم بے بصیرت تھے سچا راستہ دکھایا تو ہمارے دل جس چیز کے واقع ہونے کی انہوں نے خبر دی اس کا پورا یقین کرتے ہیں اللہ کے رسول کا یہ حال ہے کہ ان کا پہلو بستر سے جدا ہوتا ہے جس وقت کافروں کے بوجھ سے ان کے بستر دبے ہوئے ہوتے ہیں یعنی آپ اللہ کے حضور میں تمام رات عبادت کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔

اس نے (قرآن سمجھ کر) کہا میں اللہ پر ایمان لائی اور میری آنکھیں جھوٹ کہتی ہیں۔ اور میں صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا عرض کیا، آپ سن کر اتنا ہنسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیا ۱۷۰)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ظرافت سے بھرپور ایک جواب

مؤلف کتاب کہتے ہیں کہ ہم کو معلوم ہوا، کہ ایک شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حاجب (چوکیدار) کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع کر دو، آپ کا باپ شریک اور ماں شریک بھائی دروازہ

پر ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے حاجب سے حال معلوم کر کے فرمایا کہ میں نے تو اس کو پہچانا نہیں۔ پھر کہا، اچھا بلالو۔ جب یہ شخص سامنے پہنچا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ تو میرا بھائی کس طرح ہے، تو اس نے کہا کہ میں آدم علیہ السلام اور حواؑ کا بیٹا ہوں۔ یہ سن کر انہوں نے غلام کو حکم دیا کہ اس کو ایک درہم دے دے۔ اس نے کہا کہ اپنے بھائی کو جو کہ ماں اور باپ دونوں میں شریک ہے، آپ ایک درہم دے رہے ہیں؟ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر میں اپنے ان سب بھائیوں کو جو آدم وحواؑ کی اولاد ہیں، دینے بیٹھوں گا تو تیرے حصہ میں یہ بھی نہیں آئے گا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۷۵)

لقطہ کا مسئلہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی ہوشیاری

مغیرہ بن شعبہ کے متعلق منقول ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہ مغیرہ کے پاس ایک نیزہ تھا جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی غزوہ میں جاتے تھے، تو یہ اس نیزہ کو لے کر نکلتے تھے (راستہ میں کسی جگہ) گاڑ دیا کرتے تھے (یاد رہے کہ لقطہ یعنی گری پڑی چیز کے بارے میں یہ حکم شرعی ہے کہ جس مسلمان کی اس پر نظر پڑ جائے وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور اس پر واجب ہے کہ اس کے مالک کو تلاش کر کے اس تک پہنچائے) پھر جب لوگ وہاں سے گذرتے تھے تو اس کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اور منزل مقصود پر پہنچ کر ان تک اس نیزہ کو پہنچا دیتے تھے، اس ہوشیاری سے یہ نیزہ کا بار دوسرے کے کاندھوں پر ڈال دیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو ان کو تمہاری اس حرکت کی ضرور خبر دوں گا۔ کہنے لگے ایسا نہ کرنا اگر تم نے ایسا کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا، کہ کوئی نہ اٹھایا کرے تو پھر کوئی گمشدہ چیز نہیں اٹھائی جائے گی (لوگ ایسا ہی سمجھ لیں گے کہ یہ کسی نے مغیرہ کی طرح قصداً ڈالی ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا، جس کی ذمہ داری آپ کے اوپر رہے گی) (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۷۶)

ایک بڑھیا کا واقعہ

مشہور ہے کہ ایک بڑھیا کی پوٹلی گم ہوگئی تھی اور وہ بیٹھی ہوئی یہ دعا کر رہی تھی کہ یا اللہ! کسی مولوی کو نہ ملے۔ لوگوں نے کہا کہ مولوی کو ملنے یا نہ ملنے سے تیرا کیا فائدہ، کیا نقصان؟ کہنے لگی: کسی اور کو مل گئی تو دنیا میں نہیں تو کم از کم آخرت میں ثواب وصول کر لونگی لیکن اگر کسی مولوی کو ملی تو وہ اس کو کسی نہ کسی طرح حلال کر کے کھائے گا تو اس لئے آخرت میں ملنے کی بھی توقع نہیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حاضر دماغی کا ایک عجیب واقعہ

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ کو بحرین کا عامل (گورنر) بنا دیا تھا۔ وہاں کے لوگ ان سے ناراض ہو گئے اور دشمن بن گئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر دیا لیکن بحرین والوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، مغیرہ رضی اللہ عنہ کو بحال کر کے واپس نہ بھیج دیں، تو

بحرین کے چودھری نے لوگوں سے کہا کہ اگر تم کو جو کچھ میں کہتا ہوں اس پر عمل کر لو تو مغیرہ کبھی واپس نہیں آسکیں گے انہوں نے کہا اپنی تجویز بتاؤ۔ چودھری نے کہا تم مجھے ایک لاکھ درہم جمع کر دو اور میں یہ رقم لے کر عمرؓ کے پاس جاؤں گا، اور کہوں گا یہ وہ رقم ہے جو مغیرہ نے خیانت کر کے میرے پاس جمع کی تھی، چنانچہ لوگوں نے اس کے پاس ایک لاکھ درہم جمع کر دیے اور اس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو پیش کر دیا اور عرض کیا کہ یہ مغیرہ نے خیانت کر کے میرے پاس رکھوائی تھی یہ سن کر عمرؓ نے مغیرہؓ کو بلایا اور فرمایا کہ سنو! یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے سن کر عرض کیا، اللہ آپ کا بھلا کرے، یہ جھوٹ بول رہا ہے، وہ تو دو لاکھ تھے۔ فرمایا یہ حرکت کیوں کی، انہوں نے عرض کیا کہ کنبہ کے خرچ اور ضرورت نے مجبور کیا، اب حضرت عمرؓ نے اس نمائندہ قوم سے خطاب کیا کہ بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو (دو لاکھ سن کر اس کے ہوش وحواس ٹھکانے آچکے تھے) کہنے لگا خدا کی قسم ایسا نہیں اب میں آپ سے ضرور سچ کہوں گا۔ اللہ آپ کا بھلا کرے، خدا کی قسم! مغیرہ نے میرے پاس نہ قلیل رقم رکھوائی نہ کثیر۔ حضرت عمرؓ نے مغیرہ سے فرمایا تم نے اس دہقان کی نسبت کیا ارادہ کیا تھا؟ مغیرہؓ نے کہا اس خبیث نے مجھ جھوٹ باندھا تھا، میں نے بھی پسند کیا کہ (اسی سے حقیقت ظاہر کراؤں اور اس کو رسوا کر دوں) ایسے واقعات میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ایک صحابی جھوٹ بول رہے ہیں، احکام مقصد کے تابع ہوتے ہیں ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس دہقان سے ان کو دو لاکھ درہم وصول کرنا تھا بلکہ سچائی کی سطح پر لانے کے لیے محض ایک حیلہ کیا تھا جو نہ عقلاً مذموم ہے اور نہ شرعاً۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء، ۷۶)

امام شعبی ؒ کا داؤد ازدی کو تر کی بہ تر کی جواب

شعبیؒ کے بارے میں منقول ہے مجاہد ؒ سے، کہ شعبی حمام میں داخل ہوئے تو داؤد ازدی کو بغیر پاجامہ کے دیکھا تو اپنی دونوں آنکھیں میچ لیں، داؤد نے کہا: اے ابو عمر! کب سے اندھے ہو گئے ہو؟ شعبی نے جواب دیا کہ جب سے خدا نے تیرا پردہ چاک کر دیا۔ (ایضا:۱۳۱)

امام شعبی ؒ کا حیلہ

ابراہیم نخعی کے بارے میں مغیرہ سے مروی ہے کہ ابراہیم نخعی کو جب کوئی ایسا شخص تلاش کرتا جس سے وہ ملنا نہ چاہتے تو خادمہ باہر آکر یہ کہہ دیتی تھی کہ مسجد میں دیکھو۔ (یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ گھر میں نہیں ہے)(ایضا:۱۳۱)

ابراہیم نخعی ؒ کا حیلہ

علی بن ہاشم نے ایک شخص سے روایت کیا جس کا نام بھی لیا تھا کہ جب ہم ابراہیم نخعی ؒ کے پاس سے آیا کرتے تو ہم سے کہا کرتے تھے کہ اگر میرے بارے میں تم سے پوچھا جائے تو کہہ دینا کہ ہمیں خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ (اس میں جھوٹ لازم نہیں آئے گا) کیونکہ جب تم میرے پاس سے چلے گئے تو پھر تم

کو کیا خبر ہوسکتی ہے کہ میں کہاں ہوتا ہوں (نماز کی جگہ، کھانے کی جگہ، آرام کی جگہ، بیت الخلاء گھر میں بہت سے جگہیں ہوتی ہیں۔) (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۳۲)

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت دو مردوں کے برابر

خزیمہ بن ثابت کے متعلق زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا، آپ اسکو ساتھ لیکر چلے تاکہ اسکی قیمت اسکو ادا کردیں آپکی رفتار تیز تھی اور اعرابی آہستہ چل رہا تھا (اس لئے آپ اس سے کچھ دور آگے ہوگئے تھے) لوگوں نے (یہ دیکھ کر کہ ایک بکاؤ گھوڑا ہے) اس اعرابی کو روک دیا اور اس سے قیمت طے کرنا شروع کردی، انکو یہ خبر نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اس سے خرید چکے ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس قیمت سے جو حضور ﷺ سے طے ہوچکی تھی زیادہ قیمت لگادی تو اس اعرابی نے حضور ﷺ کو آواز دی اور کہا کہ اگر تمہارا اسکو خریدنے کا ارادہ ہے تو خرید لو نہیں تو میں اسکو بیچ دیتا ہوں، یہ سن کر آپ ﷺ کھڑے ہوگئے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میں تجھ سے خرید نہیں چکا ہوں، اس نے کہا نہیں اب لوگ رسول اللہ ﷺ اور اعرابی کے گرد جمع ہوگئے جبکہ دونوں ایک دوسرے سے سوال و جواب کررہے تھے اب اعرابی نے یہ کہنا شروع کیا کہ کوئی گواہ لاؤ جو یہ شہادت دے کہ میں نے آپ کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور مسلمانوں میں سے جو شخص آتا رہا وہ اعرابی سے کہتا رہا۔ کہ کمبخت! اللہ کے رسول ہمیشہ سچ ہی فرماتے ہیں یہاں تک کہ خزیمہ آگئے، انہوں نے نبی کریم ﷺ اور اعرابی کے ایک دوسرے سے سوال و جواب سنے اس اعرابی نے پھر یہی کہنا شروع کیا کہ گواہ لاؤ جو گواہی دے کہ میں بیچ چکا ہوں، خزیمہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو بیچ چکا ہے رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ سے کہا کہ تم کیسے گواہی دیتے ہو تم تو ہمارے ساتھ نہیں تھے انہوں نے کہا کہ آپ کے صادق ہونے کی بنا، پر اے رسول اللہ (ﷺ)! اس وقت سے نبی کریم ﷺ نے تنہا خزیمہ کی شہادت، دو مردوں کے برابر قرار دی، اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ سے فرمایا تم کیسے گواہی دیتے ہو تم تو ہمارے ساتھ نہیں تھے انہوں نے کہا یا رسول اللہ (ﷺ) جب آپ آسمان کی خبر دیتے ہیں (صرف آپ سے سن کر ہی) تو ہم آپکی تصدیق کرتے ہیں تو اس قول کی تصدیق کیوں نہ کرے (اسی ذہانت کے مشاہدہ پر آپ ﷺ نے خزیمہ کی شہادت کو دو مردوں کے برابر قرار دیا)۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء،۷۸)

خلیفہ مہدی کی ذکاوت

خلیفہ مہدی کے متعلق علی بن صالح کہتے ہیں، کہ میں مہدی کے پاس موجود تھا، جب کہ شریک بن عبداللہ قاضی خلیفہ سے ملنے آگئے تو مہدی نے چاہا کہ خوشبو جلائی جائے، قاضی صاحب کیلئے تو خادم کو پیچھے کھڑا تھا حکم دیا کہ قاضی صاحب کے لئے عود لاؤ (عود اس خوشبودار لکڑی کو کہتے ہیں جس کے جلنے سے خوشبودار دھواں بتدریج اٹھتا رہتا ہے اور عود ایک باجے کا نام بھی ہے جو سارنگی جیسا ہوتا ہے) خادم جا کر عود

باجہ اٹھالایا اور اس نے لاکر قاضی شریک صاحب کے گود میں رکھ دیا شریک نے کہا کہ اے میر المومنین! یہ کیا ہے؟ مہدی نے جواب دیا کہ آج صبح اس باجے کو پولیس آفیسر نے برآمد کیا تھا ہم نے چاہا کہ یہ قاضی کے ہاتھ سے ٹوٹ جائے، قاضی صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ''جزاك الله خيرا، يا امير المومنين!'' کہا اور اسے توڑ دیا پھر دوسرے باتوں میں لگ گئے اور وہ واقعہ فراموش ہوگیا پھر مہدی نے شریک سے سوال کیا کہ اس صورت میں آپ کیا حکم دیتے ہیں، کہ ایک شخص نے اپنے وکیل کو ایک شے معین کے لانے کا حکم دیا مگر وہ دوسری لے آیا اور یہ دوسری چیز تلف ہوگئی تو قاضی صاحب نے کہا اے امیر المومنین اس پر ضمان ہے (یعنی اسکی مثل چیز مہیا کرے یا قیمت ادا کرے) تو (قاضی صاحب کے جانے کے بعد) منصور نے خادم سے کہا کہ اس حرکت سے جو چیز تلف ہوئی ہے اسکا ضمان ادا کرو (یہ دوسری ذکاوت ہے کیسے لطیف طور پر دوسرا باجہ مہیا کرنے کا خادم کو ایماء کیا)۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۹۰)

سلطان کا ایک دانشمندانہ فیصلہ

ابوالحسن بن ہلال نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے جو شخص دوسرے ترکمانی کا ہاتھ پکڑ کر لایا اور کہا کہ اس کو میں نے اپنی بیٹی سے جماع کرتے ہوئے دیکھا، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ سے حکم حاصل کرکے اس کو قتل کردوں۔ سلطان نے کہا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کا نکاح کردے اور مہر ہم اپنے خزانے سے ادا کردیں گے۔ اس نے کہا کہ میں تو قتل کے سوا اور کوئی صورت قبول نہیں کروں گا۔ سلطان نے حکم دیا کہ تلوار لاؤ تو تلوار حاضر کی گئی تو اس کو میان سے نکالا اور باپ سے کہا کہ آگے آؤ تو اس کو تلوار دی اور اپنے ہاتھ میں میان سنبھال لیا اور اس سے کہا اس تلوار کو میان میں دے دو تو جب بھی وہ میان کے منہ میں لاکر تلوار اس میں داخل کرنا چاہتا تھا سلطان اس میان کا منہ ہٹا دیتے تھے جس سے وہ تلوار کو داخل نہ کرسکا اس نے کہا حضور! آپ چھوڑتے ہی نہیں کہ میں اس میں داخل کروں۔ سلطان نے فرمایا کہ یہی معاملہ اپنی بیٹی کا سمجھ۔ اگر وہ نہ چاہتی تو یہ اس کے ساتھ کیسے کرتا۔ اس لیے اگر اس فعل کی سزا میں تو قتل ہی چاہتا ہے، تو دونوں کو قتل کر (اس کی سمجھ میں آگیا) پھر نکاح پڑھنے والے کو بلا کر نکاح کرا دیا اور مہر اپنے خزانے سے ادا کر دیا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۰۸)

امام کی قرأت سے اس کی پریشانی کا اندازہ کرنا

ابن طولون علی الصباح اٹھ کر ائمہ مساجد کی قرأت سنا کرتے تھے ایک دن انہوں نے ایک اپنے مصاحب کو بلا کر فرمایا کہ فلاں مسجد میں جا کر اس کے امام کو یہ دینار دے آؤ۔ یہ مصاحب کہتا ہے کہ میں گیا اور امام کے پاس بیٹھ کر سلسلہ گفتگو میں اس کو بے تکلف کرلیا یہاں تک کہ اس نے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا کہ اس کی بیوی کو پیدائش کے درد کی تکلیف ہے اور اس کے ضروری سامان کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس لیے آج نماز میں بھی کئی مرتبہ قرأت میں غلطی ہوگئی ہے پھر میں (اس کو دینار دے کر) ابن طولون

کے پاس واپس آیا اور حال بیان کیا، انہوں نے کہا اس نے سچ کہا میں نے آج کھڑے ہو کر سنا تو میں نے دیکھا کہ بہت غلط پڑھ رہا ہے، اسی سے میں سمجھا کہ اس کا دل کسی اور چیز میں مشغول ہے۔ (ایضا ۱۱۲)

داروغہ جیل کی ظرافت

ایک اندھا ایک اندھی کے ساتھ پکڑا گیا۔ محرر نے دریافت کیا، کہ ان دونوں کا قصہ کس طرح لکھنا چاہیے؟ داروغہ جیل نے کہا لکھو" ظلمت بعضها فوق بعض " (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء ۱۱۳)

چوری کا اقرار کرانے کے لیے ابن النسوی کا ایک نفسیاتی حربہ

ابن النسوی کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے سامنے دو آدمی لائے گئے جن پر چوری کا اتہام تہمت تھا۔ انہوں نے ان کو اپنے سامنے کھڑا کیا پھر ملازموں سے پینے کے لیے پانی مانگا، جب پانی آ گیا تو اس کو پینا شروع کیا پھر قصداً اپنے ہاتھ سے گلاس چھوڑ دیا جو گر کر ٹوٹ گیا ان میں کا ایک شخص اس کے اچانک گرنے اور ٹوٹنے سے گھبرا گیا اور دوسرا اسی طرح کھڑا رہا، اس گھبرا جانے والے شخص کو کہہ دیا گیا کہ چلا جائے اور دوسرے کو حکم دیا گیا کہ مسروقہ مال واپس کر، ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کیسے معلوم کیا کہ یہ چور ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ چور کا دل مضبوط ہوتا ہے، وہ نہیں گھبراتا اور یہ گھبرانے والا اس لیے بری ہوا کہ اگر گھر میں ایک چوہا بھی حرکت کرتا تو یہ گھبرا کر بھاگ جاتا اور یہ خفیف سی حرکت بھی اس کو چوری سے روک دیتی۔

پیشاب روکنے والے کی رائے قابل اعتبار نہیں

ایک عالم امیر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے کہ ان کو پیشاب نے مجبور کیا تو یہ باہر آ گئے۔ پھر (فارغ) ہو کر واپس آئے تو امیر نے پوچھا، کہاں گئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ" رائے ٹھیک کرنے کیلیے" انہوں نے اس مقولہ مشہور کی طرف اشارہ کیا" لارای لحاقن " (پیشاب روکنے والے شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں)۔ (ایضا: ۱۱۸)

اقرار جرم کے لئے ایک حاکم کا ذہنی حربہ

بعض شیوخ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک شخص کے پانچ سو دینار چوری ہو گئے وہ سب مشتبہ لوگوں کو حاکم کے پاس لے گیا، حاکم نے کہا میں تم میں سے کسی کو مار پیٹ نہ کرونگا بلکہ میرے پاس ایک لمبی ڈور ہے جو اندھیرے کمرے میں پھیلی ہوئی ہے تم سب اس میں جاؤ، اور ایک شخص اسکو ہاتھ میں لیکر ڈور کو شروع سے آخر تک ہاتھ لگائے چلا جائے اور ہاتھ کو آستین میں چھپا کر باہر آتا رہے، یہ ڈور چور کے ہاتھ پر لپٹ جائیگی اور اس نے ڈور کو لپے ہوئے کوئلہ سے کالا کر دیا تو ہر شخص نے ڈور پر اندھیرے میں اپنے ہاتھ کو کھینچا مگر ان میں سے ایک شخص نے (اسکو ہاتھ نہیں لگایا) جب سب لوگ باہر آ گئے تو انکے ہاتھوں کو دیکھا سب کے ہاتھ سیاہ تھے سوائے ایک شخص کے، اسی کو پکڑا گیا جو اقراری ہو گیا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء ۱۱۹)

کعب بن اسود رضی اللہ عنہ کی نکتہ رسی

شعبی سے مروی ہے، کہ ایک عورت نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ایک ایسے شخص کی شکایت پیش کرتی ہوں جو دنیا کا بہترین شخص ہے بجز اس شخص کے جو اعمال خیر میں اس سے سبقت لے گیا ہو، یا اس ہی جیسے اعمال پر کار بند ہوں، وہ شخص تمام رات صبح تک نفلیں پڑھتا ہے اور تمام دن روزے سے رہتا ہے (اتنا عرض کرنے کے بعد) پھر اس پر حیا کا غلبہ ہو گیا اور اس نے عرض کیا، کہ اے امیر المومنین! میں اپنی شکایت واپس لینا چاہتی ہوں، آپ نے فرمایا، اللہ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے تو نے بہت اچھی ثناء اور تعریف کی، اور فرمایا بہت اچھا جب وہ چلی گئی تو کعب بن اسود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! اس عورت نے بلیغ طور پر اپنی شکایت آپ کے سامنے پیش کر دی آپ نے فرمایا، کہ اس نے کیا شکایت کی ہے؟ کعب نے عرض کیا کہ اپنے شوہر کی شکایت کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت اور اس کے شوہر کو حاضر کیے جانے کا حکم دیا تو دونوں حاضر ہوئے تو آپ نے کعب سے فرمایا کہ تم ان کا فیصلہ کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنی فطانت سے وہ بات سمجھ گئے جو میں نہیں سمجھ سکا (اس لئے اب فیصلہ بھی تم ہی کرو) کعب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (انہوں نے شوہر کو حکم دیا کہ) تین دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو اور اس (بیوی) کے ساتھ رہو اور تین رات نوافل کے لئے کھڑے رہا کرو اور ایک رات اسکے ساتھ رہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ یہ فیصلہ میرے لئے پہلی نکتہ رسی سے بھی زیادہ عجیب ہے اس واقعہ کے بعد ہی آپ نے انکو بصرہ کا قاضی بنایا اور ان کے لئے سواری کا انتظام کر کے انکو روانہ کر دیا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۱۱۹)

حرکات وسکنات سے حالات وواقعات معلوم کرنا

مروی ہے کہ ایاس بن معاویہ کے پاس تین عورتیں آئیں انہوں نے (ان کو دیکھ کر) کہا کہ ان میں سے ایک بچے کو دودھ پلانیوالی ہے اور دوسری کنواری اور تیسری بیوہ، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ انہوں نے کہا دودھ پلانے والی جب بیٹھی تو اس نے اپنے ہاتھ سے پستان کو سنبھالا اور جب کنواری بیٹھی تو اس نے کسی کی طرف التفات نہیں کیا اور بیوہ جب آئی تو وہ دائیں بائیں اپنی نگاہ پھراتی رہی۔ (ایضا: ۱۲۲)

قاضی ایاس بن معاویہ کی باریک بینی

۱) ابوالحسن قیسی سے معلوم ہوا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے پاس جو عام لوگوں میں سے تھا کچھ مال امانت رکھا اور یہ شخص ایسا امانت دار مشہور تھا، جس کے بارے میں کسی کو شبہ نہ تھا، پھر امانت رکھنے والا شخص مکہ چلا گیا جب یہ واپس آیا تو اپنا مال طلب کیا تو یہ شخص مکر گیا تو مدعی ایاس کے پاس پہنچا اور پورا واقعہ

سنایا، ایاس نے کہا کیا میرے پاس تمہارے آنے کی خبر اسکو ہوئی۔اس نے کہا نہیں، پھر پوچھا کہ تم کسی شخص کی موجودگی میں اس سے جھگڑے ہو، اس نے کہا کہ نہیں، کسی کو اسکی خبر نہیں ہوئی۔ ایاس نے کہا کہ لوٹ جاؤ اور کسی کے سامنے اسکا ذکر بھی نہ کرو، اور دو دن کے بعد مجھ سے ملو وہ شخص چلا گیا اب ایاس نے اس امانت رکھنے والے کو بلا کر کہا کہ کثیر مقدار میں ہمارا مال آ گیا ہے ہمارا ارادہ ہے کہ وہ تمہارے سپرد کریں کیا آپکا مکان محفوظ ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں ایاس نے کہا تو مال رکھنے کے لئے مناسب جگہ ٹھیک کر لیجئے اور مزدوروں کا انتظام بھی ہونا چاہیئے جو اسے اٹھا کر لے جائیں۔اب (دو دن کے بعد) وہ شخص آیا تو اس سے ایاس نے کہا اب تم جا کر اس سے اپنا مال مانگو اگر وہ دیدے تو "فھو المراذ" (مقصد حاصل ہو گیا) اور اگر انکار کرے تو اس سے کہنا کہ میں قاضی کو خبر کرتا ہوں چنانچہ یہ شخص اسکے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میرا مال دیدے ورنہ میں قاضی صاحب کے پاس جا کر شکایت کر دونگا اور تمام ماجرا، ان کو بیان کر دونگا اس نے اسکا مال اسکو واپس کر دیا پھر اس شخص نے ایاس کے پاس جا کر اطلاع دی کہ اس نے مال واپس دیدیا پھر وہ امین ایاس کے پاس پہنچا تو انہوں نے اسکو پٹوا کر انکلوادیا اور کہا کہ اے خائن! خبردار، کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۲۲)

۲)...... ابو محمد قرشی نے ہم سے بیان کیا کہ ایک شخص نے دوسرے کے پاس کچھ مال امانت رکھا پھر جب اس سے طلب کیا تو اس نے انکار کر دیا اس نے اپنا معاملہ ایاس بن معاویہ کے سامنے پیش کیا مدعی نے بیان کیا کہ میں نے اس کو مال دیا قاضی ایاس نے کہا کہ کس کے سامنے دیا تھا، اس نے کہا کہ میں ایسی جگہ دیا تھا اور وہاں کوئی موجود نہیں تھا، قاضی نے کہا اس جگہ کوئی چیز ہے؟ اس نے کہا کہ ایک درخت ہے قاضی نے کہا اچھا اب تم اسی جگہ جاؤ، اور درخت کو دیکھو، شاید اللہ تعالیٰ وہاں جانے سے ایسی بات واضح کر دیں جس سے تمہارا حق ظاہر ہو جائے ہو سکتا ہے کہ تم نے درخت کے قریب اپنا مال دفن کیا ہو، اور وہاں جا کر یاد آ جائے جب تم درخت کو دیکھو۔ یہ شخص چلا گیا قاضی صاحب نے مدعا علیہ کو مدعی کی واپسی تک بیٹھا رہنے کا حکم دیا، وہ بیٹھ گیا اور ایاس قضا کے متعلق کام کرتے رہے اور ایک ساعت اسکی طرف دیکھنے کے لئے انہوں نے پوچھا کہ اے شخص! کیا وہ تیرا ساتھی اس درخت تک پہنچ گیا ہوگا جس جگہ کا وہ ذکر کر رہا تھا؟ اس نے کہا نہیں (اس نفی سے ثابت ہو گیا کہ یہ اس جگہ سے بخوبی واقف ہے) ایاس نے کہا مردود! تو یقیناً خائن ہے، اس نے کہا خدا آپ کے ساتھ آسانی کرے آپ میرے ساتھ آسانی کر دیجئے انہوں نے اس پر ایک نگہبان مقرر کر دیا جو اسکی حفاظت کرے (اور جانے نہ دے) یہاں تک کہ وہ شخص واپس آ گیا اس سے ایاس نے کہا یہ تمہارے حق کا اقرار کر چکا ہے اسکو پکڑ لو۔ (ایضا ۱۲۴)

عبید اللہ بن حسن اور عمر کے مشترکہ فیصلے

ابو سہل نے ہم سے بیان کیا کہ عہد قضا کبھی دو کے درمیان مشترک نہیں بنایا گیا۔ مگر عبید اللہ بن الحسن العنبری اور عمر بن عامر کے درمیان یہ دونوں مشترکہ طور پر بصرہ کے قاضی تھے، ہر مجلس میں دونوں جمع

رہتے تھے اور لوگوں کو جب دیکھتے تو ایک ساتھ دیکھتے۔ کہتے ہیں کہ دونوں کے پاس ایک قوم ایک باندی کا معاملہ لیکر آئی جو پیڑ انہیں پہنچی تھی (اسلئے جو خریدار تھا وہ اسکو عیب قرار دیکر اپنے لیے خیار عیب کے حق کا مدعی تھا اور اسکو بیچنے والا اسکو عیب نہیں مانتا تھا، اسی کے فیصلہ کے لئے عدالت کی طرف ان لوگوں نے رجوع کیا تھا) انکے بارے میں عمر بن عامر نے کہا، کہ یہ ناقص الخلقت ہے اور عبید اللہ بن الحسن نے کہا کہ جو چیز ایسی ہو جو خلقت اور طبیعت عامہ کے خلاف ہو وہ عیب ہے تو دونوں کے جملوں کو ملا کر یہ فیصلہ بنا کہ باندی معیوب ہے۔ اسمیں تجویز کی تکمیل کسی ایک قاضی کے فیصلے سے نہیں ہوسکی جب تک دونوں کو بطور صغریٰ اور کبریٰ کے ملایا نہیں گیا اور غالباً اس حکایت کے اظہار سے یہی مقصد ہے کہ اشتراک کی حیثیت کو اسطرح یہ دونوں حضرات باقی رکھتے تھے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۱۲۳)

قاضی القضاۃ شامی کی حساسیت

ابن السماک نے ذکر کیا کہ ایک دن قاضی القضاۃ شامی کے سامنے دو آدمیوں نے اپنا جھگڑا پیش کیا جبکہ یہ جامع منصور میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے دس دینار اس کو امانتاً دیئے تھے، دوسرے نے کہا کہ اس نے مجھے کچھ نہیں دیا ہے آپ نے مطالبہ کرنے والے سے کہا کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے اس نے کہا کہ نہیں قاضی صاحب نے کہا اور نہ کسی کی آنکھوں کے سامنے دیئے، اس نے کہا نہیں۔ وہاں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا، قاضی صاحب نے کہا کہ کس جگہ سپرد کئے تھے اس نے کہا کہ کرخ کی ایک مسجد میں (کرخ بغداد کا ایک بڑا محلّہ ہے جس میں بہت سی مساجد ہیں) پھر جس سے مطالبہ کیا جارہا تھا اس سے انہوں نے پوچھا کہ کیا تم حلف کرو گے؟ اس نے کہا ہاں۔ تو آپ نے مدعی سے کہا کہ جس مسجد میں تم نے اس کو دینار سپرد کئے تھے وہاں جاؤ اور وہاں سے میرے پاس قرآن کا ایک ورق لاؤ تاکہ میں اس سے اس کو حلف دوں وہ شخص چلا گیا اور قاضی صاحب نے اس متہم (جس پر تہمت تھا) کو روک لیا جب ایک گھڑی گزر گئی تو اس کی طرف التفات کیا اور پوچھا تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ شخص مسجد میں پہنچ گیا ہوگا، اس نے کہا نہیں، ابھی نہیں پہنچا۔ یہ جواب اقرار کے مانند ہوگیا تو اس پر سونے کی ادائیگی قرار دی اور پھر اس نے اقرار کرلیا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۱۲۴)

وسوسہ کا علاج

ہم کو معلوم ہوا کہ ایک شخص نے ابو حازم کے پاس آکر کہا کہ شیطان میرے پاس آکر مجھ سے کہتا ہے کہ تو نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے وہ مجھ کو اس وسوسہ میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا (اور حقیقت کیا ہے؟) کیا تو نے اسکو طلاق نہیں دی۔ اس نے کہا نہیں، انہوں نے کہا کیا تو نے کل میرے پاس آکر میرے نزدیک اپنے بیوی کو طلاق نہیں دی؟ اس نے کہا خدا کی قسم! میں آج ہی آپ کے پاس آیا ہوں اور میں نے کسی صورت میں بھی اسے طلاق نہیں دی انہوں نے کہا کہ جب شیطان تیرے پاس آئے تو اس

وقت بھی اس طرح قسم کھالینا اور آرام سے رہنا۔ (ایضاً ۱۲۷)

ایک قاضی صاحب کا حیلہ

یحییٰ بن محمد سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھ سے ایک قابل اعتماد شخص نے بیان کیا کہ ایک قاضی پر انکی بیوی نے تقاضا کیا کہ مجھے ایک باندی خرید دیجئے۔ وہ اس سلسلہ میں بردہ فروشوں میں گئے جنہوں نے انکے سامنے چند لڑکیاں پیش کیں، ان میں سے ایک کو انہوں نے پسند کرلیا اور اپنی بیوی کو لاکر دکھایا کہ میں اپنے مال سے اس کو تمہارے لئے خرید کرلایا ہوں اس نے کہا مجھے آپ کے مال کی حاجت نہیں یہ دینار لیجئے اور اسکو میرے واسطے خرید کرلائیے اور انکو ایک سو دینار دے دیئے (بڑی سمجھدار عورت تھی کہ انکے الفاظ "اپنے مال" سے سن کر انکی نیت کو تاڑ گئی) یہ دینار قاضی صاحب نے لے لئے، انکو گھر میں (کسی تھیلی میں سربمہر کرکے) الگ رکھ دیا اور جاکر اپنے لئے خرید لائے اور اپنے مال سے ہی قیمت ادا کی اور بیعنامہ بھی اپنے ہی نام لکھایا اور لڑکی کو آہستہ سے بتادیا اور اس کو پوشیدہ رکھنے کی ہدایت کردی، اب انکی بیوی اس سے خدمت لیتی رہتی تھی۔ جب قاضی صاحب کو تنہائی میسر آجاتی تو یہ اس سے ہمبستر ہوتے۔ ایک دن اتفاق ہوا کہ ایسے وقت میں بیوی سر پر آپہنچی۔ اس نے کہا اے بدکردار شیخ زانی یہ کیا ہورہا ہے؟ کیا تو خدا سے نہیں ڈرتا؟ کیا تو ہی مسلمانوں کا قاضی ہے؟ قاضی نے کہا کہ "شیخ" "بدکردار نہیں ہے رہا "زنا" سو خدا کی پناہ اور اپنے نام کا بیعنامہ نکال کر اسکے سامنے رکھ دیا اور اسکو حیلہ سے آگاہ کردیا اور سربمہر دینار نکال کر اسکے آگے ڈال دیئے اس وقت وہ سمجھی کہ قاضی صاحب نے حرام فعل نہیں کیا اور برابر خوشامدیں کرتی رہیں یہاں تک کہ قاضی صاحب نے اسکو فروخت کردیا۔

ایک قاضی کی عدالت میں فرزدق شاعر کی شہادت

ابن قتیبہ نے کہا کہ ایک قاضی کے یہاں ایک مرتبہ فرزدق شاعر نے شہادت دی تو قاضی نے کہا ابو الفراس کی شہادت کو ہم نے جائز رکھا ہے مگر مزید شہادتیں لاؤ (ابو الفراس فرزدق کی کنیت ہے) جب فرزدق واپس ہوئے تو ان سے کہا گیا، واللہ تمہاری شہادت کو معتبر نہیں مانا گیا (فرزدق مشہور شاعر تھا)۔

جیسا دعویٰ ویسے ہی گواہ

دو آدمی قاضی ضمضم کے پاس آئے، ان میں سے ایک کا دوسرے پر یہ دعویٰ تھا کہ یہ میرا طنبور نہیں دیتا۔ مدعا علیہ انکاری تھا مدعی نے کہا میں شہادتیں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں اس نے دو گواہ پیش کیے جنہوں نے مدعی کے سچا ہونے کی گواہی دی۔ مدعی علیہ نے کہا قاضی صاحب ان گواہوں سے ان کا پیشہ دریافت کیجیے (پوچھا گیا) تو ایک نے بتایا کہ وہ نبیذ بیچنے والا ہے اور دوسرے نے بیان کیا کہ وہ جانور ہنکانے والا ہے تو قاضی نے مدعا علیہ سے کہا کہ طنبورے کے دعوے پر تیرے نزدیک ان سے بڑھیا گواہوں کی ضرورت ہے؟ (جیسا دعویٰ ہے ویسے ہی گواہ ہیں، اٹھ اس کو وہ طنبورا واپس دے۔) (لطائف

علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۱۲۹)

ایک نزاع (جھگڑے) میں حکم کا دلچسپ فیصلہ

دو آدمی ایک بکری کے بارے میں جھگڑ رہے تھے ہر ایک نے اس کا ایک ایک کان پکڑ رکھا تھا، اس دوران میں ایک شخص آ گیا دونوں نے اس سے کہا کہ جو فیصلہ تم کرو گے وہ ہمیں منظور ہے۔ اس نے کہا اگر تم میرے فیصلہ پر راضی ہو تو ہر ایک یہ حلف کرے کہ اگر وہ میرا فیصلہ نہ مانے گا تو اس کی بیوی پر طلاق ہے تو دوسرے نے ایسا حلف کر لیا پھر اس نے کہا اب اس کے کان چھوڑ دو، تو دونوں نے چھوڑ دیئے اب اس نے اس کا کان پکڑا اور چلتا بنا (کہ اس کا فیصلہ یہی ہے) دونوں دیکھتے رہ گئے۔ اس سے بات کرنے پر قادر بھی نہ رہے (کہ اگر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں تو بکری کے ساتھ بیوی بھی جائے گی)۔ (ایضا: ۱۲۹)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ربیع کو ایک مسکت جواب

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا تو آپ تشریف لے گئے۔ ربیع نے جو منصور کا حاجب تھا اور ابوحنیفہ کا دشمن، کہا کہ اے امیر المومنین! یہ ابوحنیفہ آپ کے دادا (حضرت عبداللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ تھا کہ کسی معاملہ پر حلف کرنے والا اگر اس سے ایک یا دو دن کے بعد استثناء کر دے یعنی انشاء اللہ کہدے تو یہ اس کے لیے جائز ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ حلف کے ساتھ متصلا ہی جائز ہے (بعد میں معتبر نہ ہوگا) ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اے امیر المومنین ربیع چاہتا ہے کہ آپ کے لشکر کی گردن کو آپ کی بیعت سے آزادی دلا دے۔ منصور نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیسے کہدیا تو امام صاحب نے فرمایا کہ لوگ آپ کے سامنے تو حلف کر جائیں گے پھر اپنے گھروں پر واپس جا کر استثناء کر دیا کریں گے، تو جو حلفیہ عہد اطاعت لیا جاتا رہے گا وہ باطل بھی ہوتا رہے گا منصور ہنسنے لگے اور اس نے کہا کہ اے ربیع! ابوحنیفہ کو کبھی نہیں چھیڑنا (ورنہ اس طرح منہ کی کھایا کرے گا) جب ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ باہر آ گئے تو ربیع نے کہا کہ آج تو آپ نے مروانے ہی کا کام کر دیا۔ آپ نے فرمایا وہ کام تو نے کیا تھا میں نے اپنے لیے اور تیرے لیے خلاصی کی راہ نکالی۔

(لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء: ۱۳۵)

یہ شخص مجھے باندھنا چاہتا تھا مگر میں نے اسکو جکڑ دیا

عبدالواحد بن غیاث سے مروی ہے کہ ابو العباس طوسی امام ابوحنیفہ کے متعلق برے خیالات رکھتا تھا اور اسکا علم انکو بھی تھا ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ منصور کے پاس آ گئے اور وہاں اس وقت کثیر مجمع تھا طوسی نے کہا، آج مجھے ابوحنیفہ کی خبر لینا ہے چنانچہ سامنے آیا اور کہا کہ اے ابوحنیفہ! امیر المومنین ہم میں سے کسی شخص کو بلا کر یہ حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی گردن کاٹ دی جائے اور جس کو حکم دیا جاتا ہے اسکو یہ خبر نہیں کہ گردن کاٹنے کے حکم کے لئے خلیفہ نے کیسے گنجائش نکالی (ایسی حالت میں گردن کاٹنا جائز ہوگا یا نہیں) ابوحنیفہ

رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اے ابوالعباس (اسکا جواب دو کہ) امیر المومنین کے احکام حق پرمبنی ہوتے ہیں یا باطل پر اس نے کہا حق پر، آپ نے فرمایا بس تو حق کا نفاذ کرتا رہ جس صورت سے بھی (تجھے حکم دیا جارہا ہو) اور تیرے لیے اس کی تحقیق ضروری نہیں۔ ابوحنیفہ نے جو لوگ ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان سے فرمایا کہ یہ شخص مجھے باندھنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے جکڑ دیا۔ (ایضا:۱۳۵)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذکاوت

امام ابوحنیفہ اور انکی ذکاوت کا ذکر تھا، اس پر عبدالحسن بن علی نے بیان کیا کہ کوفہ میں حجاج میں سے ایک حاجی نے ایک شخص کے پاس مال امانت رکھا اور حج کو چلا گیا پھر واپس آ کر اپنی امانت طلب کی تو وہ شخص منکر ہوگیا اور اس نے جھوٹی قسمیں کھانا شروع کردیں یہ صاحبِ مال امام صاحب کی خدمت میں مشورے کے لئے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ اسکے انکار کرنے کا کسی کے سامنے ذکر نہ کرنا اور یہ منکر شخص امام صاحب کے خدمت میں آتا جاتا رہتا تھا، آپ نے اس سے تخلیہ میں کہا کہ ان لوگوں نے (صاحبانِ حکومت نے) مجھ سے کسی ایسے شخص کے بارے میں مشورہ طلب کیا ہے جس میں قاضی ہونے کی صلاحیت ہو، کیا آپ اس کو پسند کریں گے کہ آپ کا نام بھیج دیا جائے تو اس نے کچھ بناوٹی انکار شروع کردی اور امام صاحب نے اسکو رغبت دلانا شروع کی تو وہ اس عہدے کے لالچ کے ساتھ آپ کے پاس سے رخصت ہوا ۔ پھر وہ حاجی صاحب مال آپکے پاس آیا تو اس سے آپ نے فرمایا کہ اب اسکے پاس جاؤ اور یہ کہو کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم بھول گئے ہو اس لئے تمہیں یاددلاتا ہوں کہ میں نے فلاں وقت تمہارے پاس امانت رکھی تھی اور یہ اسکی علامت ہے یہ شخص گیا اور اسی طرح گفتگو کی، اب اس نے فوراً وہ امانت واپس کردی (اور امام صاحب کو بھی مطلع کردیا) پھر جب وہ امین صاحب سے ملے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اس معاملہ پر غور کیا تو سوچا کہ مجھے آپ کا مرتبہ بلند کرنا چاہیے۔ یہ تو یوں ہی ایک کم درجہ کا عہدہ ہے۔ اس پر آپکا نام نہ بھیجوں، یہاں تک کہ کوئی اس سے اونچے درجہ کی جگہ سامنے آئے۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۳۶)

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بصیرت

ہم کو معلوم ہوا کہ ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا اور شکایت کی کہ اس نے کسی جگہ مال دفن کیا تھا۔ اب وہ موقع (جگہ) یاد نہیں آتا، امام صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی فقہی سوال نہیں ہے کہ جس کا میں کوئی حل نکالوں، اچھا ایسا کرو کہ جاؤ اور آج تمام رات نفلیں پڑھتے رہو، صبح تک انشاء اللہ تمہیں یاد آجائے گا، اس شخص نے ایسا ہی کیا ابھی چوتھائی رات سے بھی کم ہی گزرا تھا، کہ اسکو وہ جگہ یاد آگئی (تو اس نے نوافل کو ختم کردیا) پھر اس نے انکی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ شیطان تجھے نوافل نہیں پڑھنے دیگا اور تجھے یاددلائیگا، کیوں نہ تو نے اللہ عزوجل کے شکرانہ کے لئے بقیہ رات نفل پڑھنے میں گزاری۔

(لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۳۸)

ہارون الرشید کے ایک سوال پر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا دلچسپ جواب

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ فالودہ اور لوزینہ کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ دونوں میں سے کونسا اعلیٰ ہے؟ آپ نے کہا کہ امیر المومنین! فریقین جب تک حاضر نہ ہوں، میں فیصلہ نہیں کیا کرتا خلیفہ نے دونوں چیزیں منگا دی اب ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے لقمہ پر لقمہ مارنا شروع کر دیا کبھی فالودہ میں سے کھاتے تھے کبھی لوزینہ میں سے جب دونوں پیالے آدھے کر دیئے گئے، تو بولے کہ اے امیر المومنین! میں نے اب تک کوئی دو حریف ان سے زیادہ لڑنے والے نہیں دیکھے جب میں نے ایک کے حق میں فیصلہ دینے کا ارادہ کیا تو فوراً دوسرے نے اپنی دلیل ثابت کر دی۔ (ایضا: ۱۴۰)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ذہانت سے بھرپور ایک حیلہ

حرملہ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میرے سامنے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میری بیوی کے پاس ایک کھجور تھی میں نے اس کو یہ کہہ دیا کہ اگر تو نے یہ کھجور کھالی تو تجھ پر طلاق ہے اور اس کو پھینک دیا تب بھی طلاق۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے کہا کہ آدھی کھالے اور آدھی پھینک دے۔ (ایضا: ۱۴۲)

فقہ حنفی میں طلاق سے بچنے کے حیلہ کے چند اہم مسائل

مسئلہ نمبر ۱)...... ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بیوی سے کہا جو پانی میں کھڑی تھی، اگر تو اس پانی میں ٹھہرے تو تجھ پر طلاق اور نکلی تب طلاق، تو ہم دیکھیں گے کہ اگر پانی جاری تھا اور اس شخص نے کوئی خاص نیت نہیں کی تھی تو اس پر طلاق واقع نہیں ہوگی، چاہے وہ نکل جائے یا کھڑی رہے اور اگر پانی کھڑا تھا تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ اسے فوراً کوئی دوسرا زبردستی اٹھا کر باہر لے آئے۔

مسئلہ نمبر ۲)...... اگر ایسی صورت واقع ہو کہ عورت سیڑھی پر ہے اور شوہر نے کہا اگر تو سیڑھی پر چڑھی یا اس سے نیچے اتری یا تو نے اپنے آپ کو نیچے گرایا، یا کسی نے نیچے اتارا تو تجھ پر طلاق ہے تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ وہ دوسری سیڑھی پر منتقل ہو جائے (جو اس سیڑھی کے برابر رکھ دی جائے)۔

مسئلہ نمبر ۳)...... اگر گھر والوں نے بہت ساری کھجوریں کھائیں اور پھر شوہر نے کہا کہ اگر تو نے میرے سامنے اس کی تعداد ذکر نہ کی جو میں نے کھائی ہے (تو تجھ پر طلاق) تو اس سے رہائی کی صورت یہ ہے کہ جس قدر کھجوریں کھانے کا زیادہ سے زیادہ احتمال ہو، ایک سے لے کر اس عدد تک گنتی چلی جائے (اس گنتی میں صحیح عدد بھی اس کے سامنے مذکور ہو جائے گا)۔

مسئلہ نمبر ۴)...... اگر (شوہر اور بیوی دونوں نے) کھجوریں کھالیں اور (دونوں کی گٹھلیاں ایک جگہ مخلوط پڑی ہیں) شوہر نے کہا کہ اگر تو میری کھائی ہوئی کھجوروں کی گٹھلیوں کو اپنی کھائی ہوئی کھجور کی گٹھلیوں سے الگ نہ کرے تو تجھ پر طلاق ہے۔ تو عورت کو چاہیے کہ ہر ایک گٹھلی کو الگ الگ کر دے۔

مسئلہ نمبر ۵)...... اگر کسی نے بیوی سے کہا کہ تجھ پر طلاق ہے اگر تو تصدیق نہ کرے گی اس امر کی کہ تو نے

میری چیز چوری کی یا نہیں؟ تو اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ میں نے چرایا جو کچھ چرایا تو طلاق نہ پڑے گی (اگر چہ چوری ثابت نہ ہو گی)۔

مسئلہ نمبر ٦)...... اگر کسی کی تین بیویاں ہیں اور وہ ان کے لیے بازار سے دو، دو پٹے خرید کر لایا۔ ان پر ایک جھگڑنے لگی، اس پر شوہر نے کہا تم سب پر طلاق اگر اس مہینہ میں تم میں سے ہر ایک بیس بیس دن نہ اوڑھے، تو اس کی یہ صورت ہے کہ ایک دوپٹہ بڑی کو اور ایک درمیانی کو اوڑھنے کے لیے دے دیا جائے، اور دس دن کے بعد بڑی بیوی یہ دوپٹہ سب سے چھوٹی کو دے دے اور درمیانی عمر والی سے مسلسل بیس دن پورے کرنے کے بعد بڑی بیوی اسے لے کر اوڑھ لے آخر ماہ تک۔

مسئلہ نمبر ۷)...... (تین بیویوں والے شخص نے) تین کوس کا سفر کیا اور اس کے ساتھ دو خچر ہیں۔ تینوں سوار ہونے کے لیے جھگڑنے لگیں۔ اس شوہر نے طلاق کا حلف کیا کہ تم میں سے ہر ایک کو دو کوس سوار ہو کر چلنا ہوگا تو ایسا کیا جائے کہ سب سے بڑی اور درمیانی کو سوار کر دیا جائے۔ پھر ایک کوس چل کر درمیان والی اتر جائے اور اس کے خچر پر بڑی بیٹھ جائے اور چھوٹی سوار ہو جائے درمیانی والی کے خچر پر اور آخر مسافت تک بیٹھی رہے اور درمیانی عمر والی بڑی کی جگہ دو فرسخ کے ختم تک بیٹھی رہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر ۸)...... ایک شخص اپنے گھر میں تیس بوتلیں لایا (جن میں سے) دس بھری ہوئی اور دس آدھی آدھی اور دس خالی تھیں۔ (اس کی تین بیویاں ہیں) پھر کہا تم سب پر طلاق ہے اگر میں انکو تم پر اسطرح برابر تقسیم نہ کر سکوں، کہ اس تقسیم پر نہ ترازو سے کام لوں اور نہ پیمانے سے۔ اسکو چاہیے کہ وہ پانچ آدھی آدھی بوتلیں لے کر دوسری پانچ آدھی آدھی بوتلوں میں بھر دے (اس طرح پانچ پوری بوتلیں بن جائیں گی اور دس پوری بوتلیں تو موجود ہی تھیں اب کل پندرہ بوتلیں بھری ہوئی ہو جائیں گی اور پانچ خالی بوتلوں کا اضافہ دس خالی بوتلوں میں ہو کر کل پندرہ خالی بوتلیں ہو جائیں گی۔) اب ہر بیوی کو پانچ بوتلیں بھری ہوئی اور پانچ خالی دے دے۔

مسئلہ نمبر ۹)...... ایک شخص نے اپنی بیوی کے پاس ایک برتن دیکھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا اس نے بیوی سے کہا کہ یہ مجھے پلا دے اس نے انکار کر دیا تو اس نے حلف بالطلاق کیا کہ نہ تو اس پانی کو پی سکتی ہے اور نہ گرا سکتی ہے اور نہ برتن میں باقی چھوڑ سکتی ہے اور نہ کوئی ایسی ہی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ (مثلاً یہ کہ کسی دوسرے کو پلا دے) تو اسکا حیلہ یہ ہے کہ برتن میں کوئی ایسا کپڑا ڈالا جائے جو پانی پی جائے پھر اسکو دھوپ میں سکھا لیا جائے۔

مسئلہ نمبر ۱۰)...... ایک شخص نے قسم کھائی (اور بیان کیا کہ) اسکی بیوی نے یہ پیام بھیجا ہے کہ میں تجھ پر حرام ہو چکی ہوں اور میں نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا ہے اور میں تیرے لیے ضروری قرار دیتی ہوں کہ تو میرے لیے میرا خرچ بھیج اور میرے شوہر کا خرچ بھیج (یہ قسم اسطرح صحیح ہو سکتی ہے کہ) یہ ایک ایسی عورت ہے جس کو اسکے باپ نے اپنے غلام کے نکاح میں دے دیا تھا پھر اس غلام کو اموال تجارت دے کر کہیں بھیجا اسکے بعد اس (باپ) کا انتقال ہو گیا۔ اب اس شخص کے تمام ترکہ کی وارث اس کی بیٹی ہوئی اور غلام سے

(چونکہ وہ اب اس کا مملوک ہوگیا) نکاح فسخ ہوگیا۔ اور اس نے عدت پوری کی اور دوسرے شخص سے نکاح کرلیا اب وہ یہ پیام بھیجتی ہے کہ مال میرے لیے یہاں بھیجو کہ اس کی اب میں مالکہ ہوں۔ (اور مالک کو حق ہے کہ اپنے مال کے بارے میں کسی کو بھی حوالہ کرنے کا حکم نافذ کرے۔ اس لئے نئے شوہر کو بھی دلواتی ہے۔)

مسئلہ نمبر۱۱) کسی کی دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے ایک بالا خانہ میں ہے اور دوسری نیچے گھر میں ہے۔ شوہر نے سیڑھی چڑھنا شروع کیا تو دونوں بیویوں نے اپنے اپنے پاس آنے پر اصرار شروع کردیا۔ اس شخص نے قسم کھائی کہ نہ میں اوپر چڑھ کر تیرے پاس آؤں گا اور نہ نیچے اتر کر تیرے پاس آؤں گا۔ اور نہ اس جگہ اس ساعت میں ٹھہروں گا۔ تو چاہیے کہ نیچے کے گھر والی اوپر چڑھ آوے۔ اور اوپر والی اتر کر اس کے پاس آجائے۔ اب اس کو اختیار ہے کہ دونوں میں سے جس کے ساتھ چاہے، چلا جائے۔

مسئلہ نمبر۱۲)...... اگر اپنی زوجہ سے حلف کیا کہ میں تیرے گھر میں بوریہ نہیں لاؤں گا اور تجھ سے جماع بوریہ پر ہی کروں گا۔ پھر اس نے گھر میں جماع بھی کرلیا اور قسم بھی نہ ٹوٹی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بوریہ کا سامان گھر میں لے آئے اور کاریگر کو بلا کر گھر میں ہی بوریہ بنوالے اور اس پر جماع کرے۔

مسئلہ نمبر۱۳)...... اگر کسی نے حلف کیا کہ میں اپنی زوجہ سے روز روشن (دن کی روشنی میں) جماع کروں گا اور باوجود پانی پر استعمال کی قدرت ہونے کے دن میں غسل بھی نہ کروں گا اور امام کے ساتھ جماعت کی نماز بھی فوت نہ ہونے دوں گا تو اس کو چاہیے کہ وہ امام کے ساتھ فجر اور ظہر کی اور عصر کی نماز پڑھ لے، اور بعد عصر جماع کرے۔ جب سورج غروب ہوجائے تو فوراً غسل کرے اور امام کے ساتھ مغرب پڑھ لے۔

مسئلہ نمبر۱۴)...... ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں نے ایک ایسے (روزہ دار) شخص کو دیکھا جو (ایک مسجد میں) دو مقتدیوں کا امام بن کر نماز ادا کررہا تھا (نماز کے دوران میں) اس نے اپنے داہنی طرف توجہ کی تو ایک قوم کو دیکھا جو آپس میں باتیں کررہے تھے (انکی باتیں بھی سنیں) تو اس پر اسکی بیوی حرام ہوگئی اور اسکا روزہ باطل ہوگیا اور دونوں مقتدیوں کو کوڑے مارنے واجب ہوگئے اور مسجد کو ڈھادینا پڑا۔

یہ ایسا شخص تھا جس نے ایک ایسی عورت کے ساتھ نکاح کرلیا جس کا شوہر غائب تھا اور ان دونوں مقتدیوں نے شہادت دی تھی کہ اسکے گھر کو مسجد بنادیا جائے اور یہ شخص مقیم اور روزہ سے تھا۔ جب اس نے داہنی طرف التفات کیا تو دیکھا کہ وہ غائب شخص جو اسکے بیوی کا شوہر تھا۔ آگیا اور یہ لوگ گفتگو کررہے تھے کہ عید کا چاند ثابت ہوچکا۔ اس لئے آج یوم عید ہے اسکو اطلاع نہیں تھی کہ شوال کا ہلال دیکھا جاچکا ہے (اسلیے روزہ سے تھا) اور اس نے اپنی ایک جانب سے پانی اور کپڑے پر ناپاکی کا نشان بھی دیکھ لیا تو عورت حرام ہوگئی خاوند کے آجانے سے اور روزہ باطل ہوا عید کے ثبوت سے اور نماز باطل ہوئی کپڑے پر ناپاکی کے مشاہدہ سے، اور ان دونوں آدمیوں کو اس لیے کوڑے مارے جائیں گے کہ انہوں نے جھوٹی شہادت دی تھی اور مسجد کا توڑنا اس لیے ثابت ہوگیا کہ یہ وصیت غلط ہوگئی اور مالک کو اسکا گھر ملے گا۔

مسئلہ نمبر۱۵)...... ایک شخص کے پاس چھوارے اور انجیر اور کشمش تھی جن کا مجموعی وزن بیس رطل تھا۔ اس نے قسم

کھائی کہ اس نے چھوارے فی رطل نصف درہم اور انجیر فی رطل دو درہم اور کشمش فی رطل تین درہم کے بھاؤ سے فروخت کئے اس شخص کو کل کی قیمت بیس درہم وصول ہوئی تو (اسکی قسم سچی ہونے کی یہ صورت ہے کہ) اسکے پاس چھوارے چودہ رطل اور انجیر پانچ رطل اور کشمش ایک رطل تھا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۴۳۔۱۴۶)

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کی دانش

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کے بارے میں ابن المرزوق بغدادی کے غلام نے بیان کیا میرا آقا میری بہت عزت کرتا تھا اس نے ایک کنیز خریدی اور اس سے میرا نکاح کر دیا مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہوگئی مگر اس کنیز کو مجھ سے اسی درجہ شدید بغض ہوگیا اور وہ مجھ سے ہمیشہ بدکتی تھی اور اس حد تک معاملہ پہنچا کہ ایک دن اس نے مجھے سختی سے جھڑکا میں نے غصہ میں اس سے یہ کہدیا کہ تجھ پر تین طلاق اگر تو نے جیسے الفاظ سے مجھے مخاطب کیا میں بھی اسی قسم کے الفاظ کے ساتھ تجھے مخاطب نہ کروں۔ میرے تحمل نے تیرا مزاج بگاڑ دیا (وہ عورت بڑی چالاک اور ذہین تھی اس نے اپنی خلاصی کی راہ نکال لی) اس پر اس نے فوراً کہا تجھ پر جدا کرنے والی تین طلاق (اب اگر وہ یہی کلمات کہتا ہے تو اس کی وجہ سے طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر نہیں کہتا تو اس حلف کی وجہ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے) یہ کہتا ہے کہ میں دنگ رہ گیا اور نہیں سمجھ سکا کہ اسے کیا جواب دوں اس اندیشہ سے کہ اگر میں نے اس کو وہی کہہ دیا جو اس نے کہا تو اس سے طلاق واقع ہو جائے گی، تو میں ہدایت حاصل کرنے کے لیے ابوجعفر طبری کے پاس پہنچا اور ان کو سب قصہ سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس سے کہدو کہ تجھ پر تین طلاق اگر تجھے دیدوں۔ تو ان ہی کلمات سے اس کو بھی خطاب ہو جائے گا اور تیری قسم پوری ہو جائے گی اور اس پر طلاق نہیں پڑے گی اور ایسی قسموں کو اب مت لوٹانا۔ (لطائف علمیہ اردو کتاب الاذکیاء:۱۴۷)

وہم جنون (پاگل پن) کی ایک قسم ہے

ابوالوفاء ابن عقیل کے بارے میں از بر بن عبدالوہاب سے منقول ہے کہ ایک شخص نے ابن عقیل سے آکر کہا کہ میں جب بھی نہر میں خواہ دو غوطے لگاؤں یا تین مجھے یہ یقین نہیں ہوتا کہ پانی میرے سر سے اوپر ہوگیا ہے اور میں پاک ہوگیا ہوں۔ اب میں کیا کروں انہوں نے جواب دیا کہ نماز پڑھنا چھوڑ دے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے آپ نے فرمایا؟ انہوں نے جواب دیا اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین سے کوئی باز پرس نہیں ہے۔ بچہ سے جب تک بالغ نہ ہو جائے اور سونے والے سے جب تک جاگ نہ جائے۔ اور مجنون سے جب تک ہوش میں نہ آ جائے اور جو شخص نہر میں غوطہ لگائے ایک مرتبہ یا دو مرتبہ یا تین مرتبہ اور پھر بھی وہ یہی خیال کرے کہ اس کا غسل نہیں ہوا ہے تو مجنون ہی ہو سکتا ہے۔ (ایضاً:۱۴۸)

ابن عقیل کا توریہ

اور ہم کو ابن عقیل کا یہ قصہ پہنچا ہے کہ وہ ایک دن نماز جمعہ سے رہ گئے تو لوگ ان کے پاس بہت متفکر

آئے تو کہا کہ میں نے صندوقوں کے پاس نماز پڑھی ہے اس طرح پھر ایک مرتبہ جمعہ کی نماز سے رہ گئے، تو جب لوگوں نے اس پر توحش کا اظہار کیا تو کہا کہ میں نے منارہ کے قریب نماز پڑھی (اور حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے گھر میں ظہر کی نماز پڑھی تھی) صندوقوں سے مراد اپنے گھر کے صندوق تھے اور منارہ سے مراد بھی اپنے گھر کا منارہ تھا۔ (ایضا ۱۴۹)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا فقہ و دانش۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک کنیز ہارون رشید کے کنیزوں میں سے اس کے پاس موجود تھی اور ہارون الرشید کے سامنے ایک جواہرات کی مالا رکھی ہوئی تھی ہارون الرشید اس کو اٹھا کر الٹنے پلٹنے میں مشغول تھے پھر وہ مالا گم ہوگئی ہارون نے اس کنیز کو متہم (تہمت لگایا) کیا کہ یہ اسکی حرکت ہوگی جب اس سے دریافت کیا تو اس نے انکار کیا ہارون الرشید نے قسم کھالی کہ میں نے اگر اس سے چوری کا اقرار نہ کرالیا تو میری بیوی پر طلاق اور میرے سب مملوک آزاد، اور مجھ پر حج لازم۔ وہ کنیز برابر انکار پر قائم رہی اور وہ اسکو متہم کرتے رہے۔ اب ہارون الرشید کو قسم ٹوٹنے کا اندیشہ لاحق ہوگیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر پورا قصہ سنایا انہوں نے کہا کہ اس کنیز سے مجھے بات کرنے کا موقع عنایت فرمادیجئے اور ہمارے ساتھ ایک خادم ہوتا کہ میں آپ کو اس قسم سے باہر کرسکوں ہارون الرشید نے اس کا انتظام کردیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے ملکر کہا کہ جب خلیفہ تجھ سے ہار کے بارے میں سوال کریں تو اس سے انکار کردینا پھر جب دوبارہ سوال کیا کریں تو کہدینا کہ میں نے لیا ہے، پھر جب تیسری مرتبہ سوال کریں تو کہہ دینا کہ میں نے نہیں لیا ہے، یہ سمجھا کے واپس آتے وقت خادم کو یہ ہدایت دی کہ اس گفتگو کی امیر المومنین کو اطلاع نہ دینا اور ہارون الرشید سے آپ نے کہا کہ اے امیر المومنین! کنیز سے آپ ہار کے بارے میں تین مرتبہ پے در پے سوال کریں، وہ آپ کی تصدیق کریگی خلیفہ نے جاکر پہلی مرتبہ سوال کیا تو اس نے انکار کیا جب دوسری مرتبہ سوال کیا تو اس نے کہاہاں میں نے لیا ہے، تو خلیفہ نے کہا کہ تو کیا کہہ رہی ہے تو اس نے کہا واللہ میں نے نہیں لیا ہے لیکن مجھے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا سمجھایا تھا پھر خلیفہ نے امام یوسف سے کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آپ کی قسم پوری ہوگئی کیونکہ اس نے آپکو خبر دی کہ اس نے ہار لیا ہے اور پھر خبر دی کہ نہیں لیا تو دونوں میں سے ایک جواب میں وہ سچی ہے اور اب آپ حلف کے قید سے نکل چکے ہیں۔ خلیفہ بہت خوش ہوئے اور انکو انعام دیا پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ ہار بھی مل گیا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی توقعات

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی عمر جب چودہ (۱۴) سال کی ہوئی تو ایک روز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ ان سے ایک مسئلہ کے بارے میں دریافت کرے، جس نے انکے دل میں کھٹک پیدا کر رکھی تھی۔

علیک سلیک اور آداب و اکرام کے بعد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ دریافت کرتے ہوئے عرض کیا۔

ایسے شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو عشاء کی نماز پڑھ کے سویا تو اسے احتلام ہو گیا تو کیا اسے نماز عشاء از سر نو پڑھنی چاہیے۔

امام صاحب نے فرمایا اسے نماز دوبارہ پڑھ لینی چاہیے۔

یہ سن کر امام محمد اٹھے اور جوتے بغل میں دبائے اور گوشۂ مسجد میں جا کر نماز دہرائی، امام صاحب نے ان کی ذکاوت سوال کا انداز اور قیام صلوٰۃ دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا انشاء اللہ ترقی کریگا۔

یہ واقعہ خود امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو سوال کرنے سے قبل نابالغ تھے، عشاء کی نماز پڑھ کر سوئے تو بالغ ہو گئے چونکہ عشاء باقی تھا اس لئے امام صاحب نے اعادہ کا حکم دیا تو آپ نے نماز دوبارہ پڑھ لی۔ (**الامانی فی سیرت الامام محمد بن حسن الشیبانی** رحمۃ اللہ علیہ)

سفر شرعی میں روزہ کا حکم

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

"لیس البر الصیام فی السفر"

ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک بہت سا مجمع ہے۔ لوگ کسی چیز کو گھیرے کھڑے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص نے سفر کی حالت میں روزہ رکھا تھا، وہ بے ہوش ہو گیا ہے، لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ اس کی حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "سفر کی حالت میں روزہ رکھنا کہ انسان مرنے کے قریب پہنچ جائے اور ہلاکت کی نوبت آجائے کوئی نیکی کا کام نہیں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے"

۴۸ میل انگریزی (۲۳۔۷۷ کلومیٹر) کے سفر کو سفر شرعی کہتے ہیں، اس سفر میں نماز قصر بہر حال واجب ہے۔ لیکن روزہ کا افطار کرنا جائز ہے لیکن فی نفسہ واجب نہیں جب تک کہ سخت ضرر کا اندیشہ نہ ہو، اگر تھوڑی سی مشقت برداشت کر کے (بشرطیکہ ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو) روزہ رکھ لیا جائے تو افضل ہے۔ ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ (شرائط الطاعۃ)

نکاح کو وصول الی اللہ کیلئے مانع سمجھنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

حدیث شریف میں ہے: "**من تبتل فلیس منا**" یعنی جو شخص نکاح نہ کرے (باوجود تقاضائے نفس وقدرت کے) وہ ہمارے طریقے سے خارج ہے۔ (کیونکہ یہ طریقہ نصاریٰ کا ہے کہ وہ نفس نکاح کو وصول الی اللہ سے مانع سمجھ کر اس کے ترک کو عبادت سمجھتے ہیں)۔

پھر فرمایا کہ یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی ثابت ہوتی ہے جو اسی بناء پر بے نکاح رہتے ہیں، باقی کسی کو عذر بدنی یا مالی ہو یا دینی وہ مستثنیٰ ہے۔ بدنی اور مالی تو ظاہر ہے دینی یہ کہ نکاح کے بعد ضعف کے سبب دین کی حفاظت نہ کر سکے گا۔ (کمالات اشرفیہ)

مساجد میں اپنے جوتوں کی حفاظت کے اہتمام کی ضرورت

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے:

"تفقدوا نعالکم عند ابواب المسجد"

''یعنی مساجد کے دروازوں کے پاس پہنچ کر اپنی جوتیوں کی دیکھ بال کر لیا کرو۔'' (کہ کوئی گندگی وغیرہ تو نہیں لگی جس سے مسجد آلودہ ہوجانے کا اندیشہ ہو)۔

اس سے دو امر مستفاد ہوئے ایک یہ کہ مسجد کی حفاظت کی جائے گندگی سے اور یہ مدلول ظاہر ہے۔

دوسرے یہ کہ جوتیوں کی حفاظت کی جائے کہ اپنے ساتھ لے جائے تاکہ دل پریشان نہ رہے، اس سے مفہوم ہوا کہ اپنی چیز کی حفاظت کا اہتمام بقدر ضرورت کرنا شغل مع اللہ کے منافی نہیں بلکہ شغل مع اللہ کا معین ہے، ورنہ قلب اس چیز سے متعلق رہتا اور شغل مع اللہ میں خلل پڑتا ہے۔ پس مدعیانِ طریق جو ایسے اہتمام کو خلاف طریق سمجھتے ہیں جان لیں کہ یہ غلو ممنوع ہے۔ (کمالات اشرفیہ)

آفتاب غروب ہونے کا مفہوم

سائل نے دریافت کیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے جس وقت آفتاب غروب ہوتا ہے اس وقت سجدہ کرنا حرام ہے تو آفتاب، غروب ہی کب ہوتا ہے؟ فرمایا ذرا توقف کرو، انشاء اللہ نفل پڑھنے کے بعد سمجھا دوں گا، چنانچہ بعد نفل بلایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کا ایک جواب میرے ذہن میں پہلے سے تھا وہ چند مقدماتِ علم ریاضی پر موقوف ہے، شاید وہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے اور اگر آبھی گیا تب بھی طوالت بہت ہے۔ اور اول اسی کے بتانے کا ارادہ تھا لیکن ابھی درمیان نماز میں ایک جواب جو اس سے عمدہ اور سہل ہے من جانب اللہ ذہن میں آیا جو عنقریب بیان کروں گا۔

اس حدیث میں دو سوال ہیں ایک تو یہ آفتاب غروب کب ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ جو سوال اول سے بھی ادق اور مشکل ہے یہ کہ فرمایا ہے "تسجد تحت العرش" تحت العرش کے کیا معنی؟ کیونکہ تمام اشیاء ہر وقت ہی تحت العرش ہیں۔ عرش تو محیط ہے سو سوالِ اول کا جواب تو یہ ہے کہ ارض کا مشاہدہ سے کرہ (گول) ہونا ثابت ہے اور زمین کا آباد اکثری حصہ ہے جو عرفاً فوق کہلاتا ہے۔ اور اس کو معظم معمورہ کہتے ہیں۔

اب حدیث سمجھنا چاہیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تغرب جو فرمایا اس غروب سے مراد غروب باعتبار معظم معمورہ کے ہے جس کے اوپر قرائن دال ہیں۔ اول متکلم یعنی جناب، جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا خود معظم معمورہ پر تشریف رکھنا، دوسرے اسی حدیث میں قیامت کی خبریں فرمانا "تطلع من ویھا" جس میں یقیناً معظم معمورہ کی مغرب مراد ہے۔ یہ بھی قرینہ اس پر دال ہے کہ اس سے مراد معظم معمورہ ہے۔ اور سوال ثانی کا جواب یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شئ کی ایک روح ہوتی ہے تو بس آفتاب کی بھی ایک روح ہے اور وہی سجدہ کرتی ہے اور تحت عرش سے مراد مطلق تحت عرش نہیں بلکہ مع القرب مراد ہے۔ یعنی آفتاب کی روح

عرش کی قریب سجدہ کرتی ہے اور تحت سے مراد تحت مع القرب ہونے کی مثال یہ ہے جیسے ایک ہفت منزلہ مکان ہے کوئی کہے کہ منزل ہفتم کے نیچے فلاں چیز رکھی ہے تو ذہن کبھی بھی منزل اول میں نہ جائے گا کہ اس سے مراد منزل اول ہے بلکہ فوراً ذہن منزل ششم کی جانب منتقل ہو جائے گا۔ چونکہ وہی قریب اور متصل ہے۔ (مجادلات معدلت)

حضور ﷺ کے نماز میں سہو کا سبب

نبی کو بھی نماز میں سہو ہو جاتا ہے، تو اس پر یہ سخت اشکال واقع ہوتا ہے کہ پیغمبر نماز میں کیوں بھولتے تھے اس کا جواب سنیے۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی استحضار کی کمی سے سہو ہوتا تھا مگر فرق یہ ہے کہ ہمیں جو عدم توجہ الی الصلوۃ سے ہوتا ہے اس وقت توجہ نماز سے اسفل چیزوں کی طرف ہوتی ہے۔ اور ان حضرات کے عدم توجہ الی الصلوۃ کا سبب یہ ہوتا ہے کہ نماز سے بھی جو چیز فوق ہے اس وقت ان کی توجہ اس پر ہوتی ہے۔ غرض ہماری توجہ نماز سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ (اشکال از جامع) حدیث شریف میں حضور ﷺ کے التباس کا سبب مقتدیوں کا اچھی طرح وضو کر کے نہ آنا۔ ارشاد فرمایا گیا ہے اس کو حل فرما دیا جائے۔

جواب: حکم مذکور اکثری ہے اور ایسے التباس کا سبب ہونا یہ کبھی کبھی لطافت کی وجہ سے ہوتا ہے کہ بالاضطرار مختلف اشیاء کا حضور طبعاً موجب التباس ہو جاتا ہے پس کوئی تعارض نہیں رہا۔ پھر فرمایا اس قسم کی تدقیقات درسیات میں کہاں لکھی ہوتی ہیں اسی واسطے تو میں کہتا ہوں کہ محض اصطلاحات سے کیا ہوتا ہے؟ کسی محقق کی جوتیاں سیدھی کرنے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ (الافاضات الیومیہ)

نفسانی خواہش کے غلبہ کا علاج

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ایک ایسی تدقیق یاد آئی۔ یہاں ایک صاحب آئے تھے، وہ غیر مقلد تھے، اور ایسے بے باک تھے کہ آنے سے قبل مجھے لکھا تھا کہ میں جانچ کرنے کے لیے آ رہا ہوں۔ میں نے دل میں کہا کہ جانچ کرنے کے لیے کیوں آ رہے ہیں؟ میں نے دعویٰ کیا ہے کسی کمال کا؟ غرض وہ آئے او مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ میرے پاس ایک شخص آیا اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ پر نفسانی خواہش کا غلبہ ہے جوان آدمی تھے نکاح کی وسعت نہیں تھی، مجھ سے پوچھا کہ ایسی حالت میں میں کیا کروں؟ میں نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ آپ بولے روزے رکھا کرو۔ حدیث میں اس کا یہی علاج بتایا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے روزے بھی رکھے مگر ان سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا، بس وہ تو ختم ہو گئے میں نے دل میں کہا کہ آپکو کہا کس نے تھا؟ دخل دینے کو۔ جب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تب میں نے اس شخص سے سوال کیا کہ تم نے کتنے روزے رکھے تھے؟ اس نے کہا کہ جی کبھی دو، تین رکھ لیے کبھی چار، پانچ رکھ لیے میں نے کہا کہ حدیث یہ ہے:

"فمن لم يستطع فعليه بالصوم فانه له وجاء"

یہ میں نے ان کو سنانے کو کہا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے روزے رکھنا اور مسلسل روزے رکھنا ایسے حال میں مفید ہوتا ہے نہ کہ صرف گاہ گاہ دو چار روزے رکھنا۔ اب ان کو حیرت تھی کہ حدیث میں تو کثرت کا کہیں ذکر نہیں اس لیے میں نے کہا کہ "علیہ" لزوم پر دال ہے اور لزوم کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک اعتقادی، ایک عملی۔

یہاں اعتقادی درجہ تو مراد ہے نہیں کیونکہ یہ روزہ فرض نہیں بلکہ عملی درجہ مراد ہے اور وہ ہوتا ہے تکرار سے جبکہ بار بار عمل کیا جائے اور عادۃً لازم کرلیا جائے۔ اور میں نے کہا کہ دیکھو اس کی ظاہر تائید ہے۔ رمضان شریف میں مسلسل ایک مہینہ تک روزے رکھے جاتے ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ شروع رمضان میں تو قوت بہیمیہ شکستہ نہیں ہوتی بلکہ رطوبات فضلیہ کے سوخت ہو جانے کی وجہ سے اس قوت میں اور انتعاش ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ ضعف بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اخیر میں پورا ضعف ہوتا ہے جس کی وجہ سے قوت بہیمیہ شکستہ ہوتی ہے کیونکہ اس وقت روزوں کی کثرت متحقق ہو جاتی ہے۔

پھر میں نے اس شخص سے کہا کہ جب اتنے روزے رکھو گے تب اثر ظاہر ہوگا۔ جب اتنے روزے رکھ کر بھی فائدہ نہ ہو، تب آ کر اشکال کرنا، میری اس تقریر کو سن کر مولانا کی آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھیے حدیث تو انہوں نے پڑھ دی اور اس کا مطلب کچھ نہ سمجھے۔ (الافاضات الیومیہ)

ارکان اسلام کی وجہ حصر

عبادت دو حال سے خالی نہیں ہوگی، قولی ہوگی یا فعلی۔ اگر قولی ہوگی تو وہ شہادت ایمانی ہے یعنی

" شهادة ان لا اله الا الله وان محمداً عبده ورسوله"

اگر فعلی ہے تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔

یا کسی چیز کا ترک ہے یا اخذ ہے اگر ترک ہے، صوم ہے۔ اور اگر اخذ ہے تو بھی دو حال سے خالی نہیں یا بدنی ہوگی یا مالی ہوگی اگر بدنی ہے تو صلوٰۃ ہے اور اگر مالی ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو اس کا تعلق صرف مال سے ہوگا یا مال و بدن دونوں میں مشترک ہوگا اگر صرف مال سے تعلق ہے تو وہ زکوٰۃ ہے اور اگر دونوں میں مشترک ہے تو وہ حج ہے۔ (نایاب تحفہ صفحہ ۳۳)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

ایک مرتبہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگا، میں قمریوں (فاختہ) کی تجارت کرتا ہوں۔

چنانچہ میں نے ایک دن ایک آدمی کو ایک قمری فروخت کی لیکن اس نے اسکو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ آواز نہیں کرتی۔

اسکے بعد میں نے قسم کھائی کہ اگر میری قمری برابر آواز نہ دے، تو میری بیوی پر طلاق ہے چنانچہ امام

مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فتوی دے دیا کہ تمہاری بیوی پر طلاق پڑ گئی تمہارے لیے اب کوئی چارہ نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تمام گفتگو سن رہے تھے آپ نے فرمایا اس سے کہہ کیا تمہاری قمری اکثر وقت آواز کرتی ہے یا اکثر وقت چپ رہتی ہے؟ اس نے کہا: وہ دن کے اکثر وقت آواز کرتی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر تمہاری قمری اکثر وقت آواز کرتی ہے تو تمہاری بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوگی (اس وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چودہ سال کی تھی) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو جب اس فتوے کی خبر ہوئی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر پوچھا: اے لڑکے! ایسا فتوی تم نے کس طرح دیا اور یہ بات تم کو کہاں سے معلوم ہوئی؟ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آپ ہی نے تو یہ حدیث مجھ سے بیان کی تھی کہ زہری نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے ام سلمہ سے روایت کی!

فاطمہ بنت قیس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا! یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے ابوجہم اور معاویہ نے پیغام نکاح بھیجا ہے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاویہ تو فقیر محتاج شخص ہے اور اس کے پاس مال نہیں اور ابوجہم وہ تو اپنی گردن سے لاٹھی نہیں رکھتا یعنی ہر وقت مار پیٹ کرتا رہتا ہے۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول: **"لایضع عصاهٗ"** باوجود یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ ابوجہم کھاتا پیتا ہے، سوتا ہے اور دیگر ضروریات زندگی پوری کرتا ہے مگر چونکہ اہل عرب دو فعل میں سے ایک اغلب فعل کو مداومت کی مانند قرار دیتے ہیں، اس لیے میں نے بھی ایسا ہی کہا، اور اسی حدیث سے استدلال کیا اس شخص کی فاختہ اکثر وقت چپ رہنے کے مقابلے آواز کرتی ہے، اس لیے میں نے اس کے دو فعل میں سے اغلب فعل کو دائمی قرار دیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس استدلال پر حیران رہ گے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو فتوی دینے کی اجازت فرمائی، چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے چودہ سال کی عمر سے فتوی دینا شروع کر دیا ہے۔ (حیوۃ الحیوان: ۱۹۹/۲)

حین کی تحقیق

حکایت: ایک شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں نے قسم کھائی ہے کہ ایک حین تک اپنی بیوی سے بات نہیں کروں گا، لہذا کتنے دنوں تک اس کی مدت ہے؟

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قیامت تک۔ اس آدمی نے عرض کیا: آپ کی دلیل کیا ہے؟

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: قرآن پاک کی ایک آیت:

﴿وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (سورۃ البقرہ: ۳۶)

وہ آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور یہی سوال کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اس کی مدت چالیس ہے اس آدمی نے کہا: آپکی دلیل کیا ہے؟

تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یہ آیت:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (سورۃ الدھر:۱)
حضرت آدم علیہ السلام نے چالیس سال تک مکہ اور طائف کے درمیان قیام فرمایا تھا۔
پھر اس شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر پوچھا آپ اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں؟
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی مدت ایک سال ہے۔
اس شخص نے کہا آپ کی دلیل کیا ہے؟
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن پاک کی یہ آیت ﴿تُؤْتِیْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾
وہ شخص پھر حضرت رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے یہی سوال کیا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر صبح کے وقت قسم کھائی ہے، تو رات کو بات کر سکتا ہے اور اگر رات کے وقت قسم کھائی ہے، تو صبح بات کر سکتا ہے۔
تو اس شخص نے کہا آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کلام اللہ کی یہ آیت ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ (الروم:۱۷)
تو وہ آدمی خوش ہو کر چلا گیا۔ (لطائف اللغات: ۷۷)

وقت مغرب میں تعجیل

سوال: تمام نمازوں کے اوقات میں اذان اور جماعت میں فاصلہ ہوتا ہے کسی میں آدھا گھنٹہ، کسی میں پندرہ منٹ، لیکن مغرب کی نماز میں بلا فاصلہ جماعت میں کھڑے ہوتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟
جواب: دوسری نمازوں کے اوقات شروع ہونے میں اختلاف ہے۔ اس لئے فاصلے کرتے ہیں۔ لیکن مغرب کا وقت شروع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لیے بلا فاصلہ جماعت شروع کر دیتے ہیں۔ (نایاب تحفہ: ۷۶)

امام محمد اور امام کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ

ایک روز خلیفہ ہارون الرشید کی مجلس میں امام محمد بن حسن اور امام کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ حاضر تھے، امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "من تبحر فی علم اهتدی لجمیع العلوم"
جو ایک فن میں ماہر ہو گیا تو اس نے تمام علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ اس بات پر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا: جو شخص سجدہ سہو میں سہو کرے تو پھر اس کو سجدہ سہو کرنا پڑے گا یا نہیں؟
امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: نہیں۔
امام محمد رحمۃ اللہ علیہ: اس کی وجہ کیا ہے؟
امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ: علم نحو کا قاعدہ ہے اسم مصغر کی دوبارہ تصغیر نہیں آ سکتی۔

امام محمد رحمہ اللہ: اگر کوئی شخص عتق (غلام کی آزادی) کو ملک پر معلق کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟
امام کسائی رحمہ اللہ: صحیح نہیں۔
امام محمد رحمہ اللہ: کیوں؟
امام کسائی رحمہ اللہ: سیلاب بارش سے پہلے نہیں آسکتا۔
مسعود ملتانی صاحب نے نغزک میں لکھتے ہیں: یہ واقعہ امام محمد اور امام فراء رحمۃ اللہ علیہما کے درمیان ہوا تھا۔ (حیوۃ الحیوان باب الخاء۔ الخرب: ۶۹۶/۱ نغزک: ۹۳)

اسم ''مکہ''

مکہ معروف شہر ہے جس میں کعبۃ اللہ ہے، یہ ایک عورت کا نام ہے اس سے کسی آدمی نے پوچھا:
مااسمك تیرا نام کیا ہے؟
تو عورت نے کہا: میرا نام مکہ ہے۔ آدمی نے کہا "**فاقبل حجر الاسود**"
ترجمہ: میں حجر اسود کو بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ عورت نے یہ آیت تلاوت کی ﴿**لَمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ**﴾ (النحل: ۷)
ترجمہ: ہرگز بوسہ نہیں دے سکتے ہو مگر مشقت کے ساتھ۔
یاد رہے کہ یہ آیت قرآن کریم میں حج کے بارے میں ہے اس کے بعد اس آدمی نے کہا، اگر میں تجھ سے شادی کرلوں تو؟ عورت نے کہا "**ان شئت ادخل المسجد الحرام وان شئت فقبل حجر الاسود**"
ترجمہ: اس وقت تجھ کو اختیار ہے چاہے مسجد حرام میں داخل ہو چاہے حجر اسود کو بوسہ دے۔ (مونذ الفضلاء: ۳۰۷/۲)

چور کا ہاتھ کاٹنا

ابوالعلاء المعری جب بغداد آیا، تو اس نے اعتراض کیا اگر کسی کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے تو دیت پانچ سو دلواتے ہیں پھر اس ہاتھ کو پاؤ دینار کی چوری کے بدلے میں کیوں کٹوا دیتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی؟
قاضی عبدالوہاب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جواب دیا: جب ہاتھ امانت دار تھا تو ثمین یعنی قیمتی تھا، اور جب یہ خائن ہوگیا، یعنی اس نے چوری کی تو اس کی قیمت گھٹ گئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

منطقی اور ایک مسئلہ

ایک شخص نے کسی منطقی سے مسئلہ پوچھا: میرے کنویں میں ایک چوہا گر کر مر گیا، شریعت کی رو سے اس پانی کا کیا حکم ہے؟
منطقی صاحب نے سوچا: اگر کہوں میں مسئلہ نہیں جانتا تو میرے لیے بے عزتی کی بات ہے۔ اس

لیے مسئلہ میں سائل کو ایسا چکر دوں گا کہ یہ نہ سمجھ سکے، کہ میں مسئلہ نہیں جانتا، چنانچہ اس نے اس سائل سے پوچھا: منطقی: تمہارے کنویں میں جو چوہا گرا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے، یا چوہا خود بخود گرا ہے یا کسی نے پھینکا ہے۔ کسی نے گرایا ہے، تو یہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے، یا تو کسی جانور نے گرایا ہوگا یا انسان نے گرایا ہوگا۔ اگر انسان نے گرایا ہے تو بھی دو حال سے خالی نہیں ہے، یا وہ عورت ہوگی یا مرد ہوگا۔ اگر مرد ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ لڑکا ہوگا یا جوان ہوگا۔ اگر جوان ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے عالم ہوگا یا جاہل ہوگا۔ اگر عالم ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہوگا۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہوگا یا علم شریعت کا عالم ہوگا۔ اگر عالم شریعت ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ وہ محدث ہوگا یا مفتی ہوگا۔

اس سائل نے حیران ہوکر کہا: حضرت آپ اپنی بات ختم کریں، میں چلتا ہوں۔ مجھے مسئلہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ والسلام۔

منطقی اپنے دل میں بہت خوش ہوا کہ میں ایک آدمی کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوا۔ (نایاب تحفہ: ۹۰)

عجیب انداز نصیحت

ایک سوداگر کی بیوی اس زمانے میں حسن و جمال میں یکتا تھی اور سوداگر اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ عین جوانی میں جب کہ وہ مرنے لگا تو اس نے اپنی بیوی کو بلا کر کہا: تم جوان ہو، میرے بعد اگر تم کو شادی کی ضرورت پڑ جائے، تو پڑوس میں ایک مولانا صاحب ہیں ان سے مسئلہ دریافت کر لینا وہ جیسا فرمادیں ویسا ہی عمل کرنا۔

سوداگر کا انتقال ہوگیا، دو سال تک وہ عورت صبر کے ساتھ رہی بعد میں اپنی شادی کے متعلق مسئلہ پوچھنے کے لیے پڑوس کے مولانا صاحب کے پاس گئیں تو اس وقت مولانا استنجاء کرنے کے لیے بیت الخلاء جا رہے تھے اور پرانے لوٹے میں پانی لیا ہوا تھا جس سے پانی گر رہا تھا، مولانا صاحب نے ہاتھ کی انگلی سے لوٹے کے سوراخ کو بند کر رکھا تھا، وہ عورت یہ ماجرا دیکھ کر چلی آئی، چند دن کے بعد پھر مسئلہ دریافت کرنے کے لیے گئی تو دیکھا کہ وہ لوٹا لیے ہوئے استنجاء کے لیے جا رہے ہیں، جب استنجاء سے فارغ ہوکر آئے تو عورت نے ان سے پوچھا: حضرت کیا وجہ ہے؟ کہ آپ اس سوراخ والے لوٹے کو بدلتے نہیں؟ اگر حکم فرمائیں تو میں آپ کے لئے نیا لوٹا خریدوں، مولانا صاحب نے جواب میں فرمایا: بات یہ ہے کہ یہ لوٹا بچپن سے میرا ساتھی ہے، اور میرے مقام مستور سے واقف ہے، اس لیے اس کو بدلنا نہیں چاہتا کہ دوسرا لوٹا اسے نہ جان سکے۔

مولانا صاحب کے جواب سے عورت کے دل کو تسلی مل گئی، اور وہ واپس آئی اور شادی کے خیال کو ترک کر دیا۔ (نایاب تحفہ: ۹۲)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مطالعہ میں خلل ڈالنے والے مرغ کو ذبح کرادیا

صاحب حدائق الحنفیہ نے یہاں پر ایک لطیفہ بھی نقل کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایسی باتیں ان لوگوں

کے لیے یقیناً اچنبھے اور حیرت واستعجاب کا باعث بن سکتی ہیں جنہوں نے کبھی کتابوں کی گرد جھاڑنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی، جنہیں مطالعہ کتب کی فرصت ہی نہیں اگر فرصت ہے، تو ذوق نہیں جولوگ اس وادی عشق ومحبت میں قدم رکھ چکے ہیں انکو تو بس ایک ہی تمنا ہوتی ہے۔

خلوتے و کتابے وگو شۂ چمنے

وہ مطالعہ میں انہماک اور قلبی شغف میں معمولی خلل بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں ایک مرغ تھا، جو وقت بے وقت بانگ دے دیا کرتا تھا، ایک روز آپ نے اسے پکڑ وا کر ذبح کروادیا اور فرمایا کہ یہ مرغا میرے لیے ناحق علم ومطالعہ کے شغل میں حارج بنا ہوا ہے۔ (حدائق الحنفیہ: ۱۵۳۔ ومناقب کردری: ۴۳۵)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک علمی مباحثہ

موطا کے سماع اور باقاعدہ تلمذ کے زمانہ سے قبل ایک مرتبہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو آغاز شباب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا، تو انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ اگر کسی جنبی (ناپاک) شخص کو پانی کی ضرورت ہے اور پانی مسجد کے اندر رکھا ہوا ہے، باہر ملتا نہیں تو کیا وہ مسجد کے اندر جا کر پانی لے سکتا ہے؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جنبی مسجد کے اندر داخل نہیں ہوسکتا ہے! امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ نماز کا وقت بالکل قریب آ گیا ہے، اور پانی اس کے سامنے موجود ہے تو اب وہ کیا کرے (جبکہ کوئی دوسرا اس کو پانی دینے کے لیے تیار یا موجود نہ ہو) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے پھر وہی جواب دیا، جو پہلے دے چکے تھے۔ اور اسی جواب کو بار بار دہراتے رہے، لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے سوال پر قائم رہے اور انکا اصرار بڑھا، اس حیص وبیص میں کافی وقت گذر گیا۔ تب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تو پھر آپ فرمایئے اسمیں آپ کی رائے کیا ہے؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس شخص کو تیمم کر کے مسجد میں داخل ہو جانا چاہیے، پانی لے کر مسجد سے باہر نکلنا اور غسل کر لینا چاہیے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہیں کے لوگوں میں سے ایک" یہ کہہ کر اٹھے اور چلے گئے، ان کے جانے کے بعد لوگوں نے کہا: یہ "محمد بن حسن ہیں جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص ہیں" یہ سن کر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ تو کہہ رہے تھے میں اہلِ مدینہ سے ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں! لیکن یہ کہتے ہوئے انہوں نے زمین کی طرف اشارہ کیا تھا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا یہ بات تھی جو سوال وجواب میں وہ میرے ساتھ اتنی شدت برت رہے تھے۔ (بلوغ الامانی: ۱۱ وتاریخ بغداد ومناقب کردری)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک علمی مباحثہ

محمد بن عبدالسلام نے اپنے باپ سے روایت کی ہے، انکے والد نے کہا، ایک مرتبہ میں نے امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا، انہوں نے اپنی صواب دید کے مطابق جواب

مرحمت فرمایا، اس کے بعد میں نے وہی مسئلہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا، تو انہوں نے جو جواب دیا، وہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے جواب سے مخالف تھا، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے جواب کے بارے میں دلائل بھی بیان فرمائے، تو میں نے انکی خدمت میں عرض کیا حضرت! امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ تو اس مسئلہ میں آپ سے مختلف ہیں کیا بہتر ہو، تا کہ آپ دونوں جمع ہو کر اس مسئلے پر افہام و تفہیم سے کام لیتے، تو اصل حقیقت کی تنقیح بھی ہو جاتی چنانچہ دونوں مسجد میں گئے اور مسئلہ مذکورہ پر گفتگو شروع کر دی اور باہمی سوال و جواب اور بحث و مناظرہ شروع ہوا، ابتداء میں تو قدرے بات سمجھ میں آ رہی تھی مگر اس کے بعد دونوں حضرات کا باہمی تکلم اور علمی مباحثہ اس قدر غامض اور دقیق پہلوؤں پر جاری تھا کہ ہم انکی سنتے آواز تو تھے مگر بات نہیں سمجھتے تھے۔ (مناقب کردری: ۴۳۱ بحوالہ علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات: ۲۱۲)

ہارون رشید کی ایک مشکل اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا حل

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ کہ اچانک رات کو کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی میں نے دروازہ کھولا تو ایک صاحب کھڑے تھے اور کہنے لگے، کہ امیر المومنین آپ کے منتظر ہیں! امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے رات گئے امیر المومنین کے اس بلاوے پر اپنی جان کا خطرہ ہونے لگا، لہذا میں نے وضو بنایا اور امیر المومنین کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ امیر المومنین نے مجھے دیکھا، تو فرمایا! میں نے آپ کو زبیدہ سے ایک مسئلہ میں اختلاف کے پیش نظر یہاں آنے کی زحمت دی۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ آج دوران گفتگو میں نے زبیدہ سے کہا کہ "خدا نے مجھے امام العدل بنایا ہے اور امام العدل کو اللہ پاک جنت عطا فرمائے گا" زبیدہ نے سنا تو بے دھڑک کہنے لگی، تم ظالم ہو، فاجر ہو تمہارا دعویٰ درست نہیں تمہارا ٹھکانہ جہنم ہوگا، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے صورت حال کو بھانپ لیا، امیر المومنین سے فرمایا: محترم! یہ بتایئے کہ جب آپ سے کوئی معصیت اور گناہ سرزد ہو جاتا ہے، تو کیا آپ اسی حالت معصیت میں رہتے ہیں یا اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں خدا کے خوف کا کبھی خیال آتا ہے؟ خلیفہ نے کہا: حضرت! "جب بھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے تو مجھ پر خدا کا خوف مستولی ہو جاتا ہے اور میں اس کے تصور سے کانپتا رہتا ہوں" امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر یہ واقعہ ہے تو پھر آپ کیلئے خدا کی طرف سے دو جنتیں ہوں گی، کیونکہ اللہ پاک نے خود ارشاد فرمایا ہے۔ ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ ترجمہ: اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے اس کے لئے دو باغ ہیں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس سے بہت مسرور ہوئے اور مجھے واپسی کا حکم فرمایا جب میں گھر پہنچا تو خلیفہ کے فرستادہ نے دراہم کی ایک تھیلی مجھے پیش کی، اور خلیفہ کی جانب سے بڑی مسرت اور خوشی اور امتنان اور تشکر کا اظہار کیا۔ (مناقب کردری: ۴۳۴)

امام اعمش اور آٹے کی تھیلی

امام ابو بکر بن محمد زرنجری نے مناقب ابو حنیفہ میں نقل کیا ہے کہ امام اعمش کو اوائل میں امام اعظم

ابوحنیفہ سے میلان اور لگاؤ کم تھا اور انکے بارے میں کچھ اچھی رائے نہ رکھتے تھے، امام اعمش خلقی طور پر خوبصورت نہ تھے اور طبعی طور پر تیز تھے اپنی مزاجی اور طبعی حدت کی وجہ سے گاہے گاہے مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حلف اٹھا بیٹھے کہ اگر میری بیوی نے مجھے آٹے کے ختم ہونے کی خبر دی یا اس سلسلے میں کچھ لکھ کر دیا یا پیغام دیا یا کسی دوسرے کے سامنے اسکا ذکر کیا کہ مجھے آٹے کے ختم ہونے کی اطلاع ہو یا اس سلسلہ میں کوئی اشارہ کیا، تو اس پر طلاق ہو، بے چاری بیوی حیران و پریشان ہوگئی وہ اس مصیبت سے خلاصی چاہتی تھی، گھریلو ضرورت اور قوت لا یموت کے لیے آخر آٹے کے بغیر کیسے گزارا کیا جا سکتا تھا بڑے بڑے علماء اور فقہاء سے مسئلہ دریافت کیا گیا مگر کوئی حل سامنے نہ آیا مشورہ دینے والوں نے امام ابوحنیفہ سے مشکل حل کرانے کی بات کی تو فوراً امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ماجرا سنا دیا امام اعظم صاحب نے فرمایا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے مسئلہ سہل اور آسان ہے فرمایا۔

رات کو جب امام اعمش سو جائیں تو چپکے سے آٹے کی تھیلی ان کی چادر یا لنگی سے یا ان کے کسی بھی کپڑے کے ساتھ باندھ دیجئے جب صبح اٹھیں گے تو آٹے کی خالی تھیلی کو اپنے کپڑے کے ساتھ بندھا ہوا دیکھ کر خود بخود سمجھ جائیں گے کہ گھر میں آٹا ختم ہو گیا ہے، اس طرح تمہارے معاش اور گذران اوقات کی تدبیر ہوتی رہے گی، چنانچہ امام صاحب کی ہدایت کے مطابق امام اعمش کی بیوی نے ایسا ہی کیا جب امام اعمش خواب سے اٹھے چادر اور لنگی اٹھائی یا کپڑے سمیٹے تو دیکھا کہ آٹے کی تھیلی ساتھ بندھی ہوئی ہے کپڑے کے اٹھانے سے وہ بھی کھنچ کر ان کے پاس آ گئی، سمجھ گئے کہ گھر میں آٹا ختم ہو گیا ہے۔

امام اعمش نے یہ منظر دیکھا تو پس منظر کے مدبر کو بھی جان گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم یہ حیلہ اور خلاصی کی ایسی تدبیر تو ابوحنیفہ ہی کی ہو سکتی ہے اور ہماری بات آگے چل کب سکتی تھی جب ابوحنیفہ موجود ہوں، اس شخص نے تو ہماری عورتوں پر ہماری قلت فہم اور عجز رائے ظاہر کر کے ہماری فضیحت کر دی۔ (عقود الجمان: ۲۷۶ و مناقب موفق: ۱۴۴)

غسل جنابت بھی ہو گیا اور طلاق بھی واقع نہ ہوئی

ایک صاحب امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے بظاہر ایک لاینحل مشکل درپیش ہے اگر غسل کرتا ہوں تو بیوی کو طلاق ہوتی ہے اگر جنابت میں رہتا ہوں تو اللہ ناراض ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اگر میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی پر تین طلاق۔ اب کیا کروں؟ خدارا میری مدد فرمائیے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا ہاتھ پکڑا اور باتوں باتوں میں انہیں وہاں قریب کے ایک نہر کے پل پر لائے اور دفعۃً اسے پانی میں دھکا دے دیا۔ وہ شخص از سرتا قدم پانی میں ڈوب گیا پھر امام صاحب نے اسے باہر نکلوایا اور اس سے فرمایا، جا اب تیرا غسل بھی ہو گیا اور بیوی کو بھی طلاق نہیں ہوئی۔ (مناقب موفق ۱۰۱)

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قیاس سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا

ایک مرتبہ امام اعظم کے پڑوس میں کسی صاحب کا مور یعنی طاؤس گم ہو گیا، بے چارے نے بڑی محبت سے پال رکھا تھا۔ بہت تلاش کی کہیں پتہ نہ چلا بالآخر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنی پریشانی ظاہر کی کہ میرا مور گم ہو گیا ہے اور تلاش بسیار کے باوجود کہیں پتہ نہ چل سکا۔

امام صاحب نے فرمایا اب خاموش ہو جاؤ فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائیگا جب صبح ہوئی اور امام صاحب مسجد تشریف لے گئے تو حاضرین کے مجمع سے دوسری باتوں کے ضمن میں یہ بھی کہا کہ تمہارے اندر کے اس شخص کو حیا اور شرم کرنی چاہیے جو اپنے پڑوسی کا مور چرا کر نماز پڑھنے آتا ہے۔ حالانکہ چرائے ہوئے مور کا پر اس کے سر پر ابھی موجود ہے تو جس شخص نے مور چرایا تھا جلدی سے سر پر ہاتھ مارنے لگا۔ ابوحنیفہ اسے تاڑ گئے جب لوگ چلے گئے تو خلوت میں اسے سمجھا بجھا کر مور اس سے اپنے مالک کو واپس دلوادیا۔ (عقود الجمان: ۲۷۵)

دھوبی کا مسئلہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی ندامت

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید اور قریب ترین اصحاب سے تھے۔ ذہین، اخاذ، فقیہ، اور مسائل کے استنباط و اجتہاد میں کافی دسترس رکھتے تھے، ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا اور ابوحنیفہ کی حوصلہ افزائیوں سے خود اعتمادی پیدا ہوئی ایک طویل اور شدید بیماری سے افاقہ کے بعد اپنی علیحدہ درسگاہ قائم کرلی، نہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی اجازت لی اور نہ امام صاحب نے فی الحال ان کے مجلس درس قائم کرنے کو مناسب سمجھا چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب کو ایک استفتاء سکھلا کر امام ابو یوسف کی مجلس درس میں بھیج دیا کہ ایک شخص نے کسی دھوبی کو کپڑا دھونے کے لیے دیا دھوبی نے اس کو واپس لینے کی تاریخ بتادی جب کپڑے کا مالک متعینہ تاریخ کو کپڑا مانگنے آیا تو دھوبی نے کپڑا واپس دینے سے انکار کردیا۔

پھر اس کے بعد خود دھوبی کپڑا دینے آیا تو کپڑے کے مالک پر اس دھوبی کی اجرت واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہیں کہ اجرت واجب ہوگی تو تم کہہ دینا کہ غلط ہے اور اگر وہ کہیں کہ واجب نہیں ہوئی تب بھی کہہ دینا کہ غلط۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فرستادہ شخص امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس درس میں حاضر ہوا، جس طرح اسے بتایا گیا تھا اس نے وہی کیا اور کہا:

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ذہین اور دوررس تھے، فوراً سمجھ گئے کہ اس کا پس منظر کیا ہے؟

گھبرائے اپنے فعل پر تنبیہ حاصل ہوا فوراً امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا "تمہیں یہاں دھوبی والا مسئلہ لایا"

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنے کیے پر نادم تھے امام ابوحنیفہ نے مسئلہ سلجھاتے ہوئے فرمایا کہ جب دھوبی

کپڑا دھونے سے پہلے کپڑا دینے سے انکار کردیا تھا تب وہ غاصب قرار پایا، اور غاصب کے لیے اجرت نہیں ہوتی، اور جب کپڑا دھونے کے بعد انکار کردیا تھا، تو کپڑا دھونے کی وجہ سے اجرت واجب ہوگئی تھی، اب جب وہ کپڑا از خود واپس لے آیا تو غصب کا جرم ساقط ہوگیا تو اس کا حق اجرت بدستور باقی رہا۔ (وفیات الاعیان: ۵/۴۰۸، وعقود الجمان: ۳۵۳)

عداوت محبت میں بدل گئی

امام وکیع کہتے ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایک بڑے حافظ الحدیث رہا کرتے تھے، مگر انہیں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دشمنی تھی۔ ہمیشہ ان کی مخالفت اور عداوت میں پیش پیش رہتے تھے اچانک ایک روز اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کچھ بات بڑھ گئی تو بیوی سے کہا اگر آج رات تو نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا اور میں نے تجھے طلاق نہ دی تو تجھ پر طلاق ہو عورت نے سنا تو جواباً کہا اگر آج رات میں نے آپ سے طلاق کا مطالبہ نہ کیا تو میرے سارے غلام آزاد ہوں۔

بعد جب ہوش ٹھکانے لگے تو دونوں کو ندامت ہوئی اور دونوں مشہور ائمہ وقت سفیان ثوری اور قاضی ابن ابی لیلیٰ کے پاس حاضر ہوئے مگر الجھا ہوا مسئلہ نہ سلجھ سکا اور بے چارے میاں بیوی دونوں جب وہاں کوئی مخلص نہ پا سکے تو لاچار طوعاً و کرہاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مندرجہ بالا صورت واقعہ بیان کی۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت بغیر کسی تامل کے لاینحل مسئلہ چٹکی میں حل کردیا۔ چنانچہ عورت سے فرمایا تو ابھی سے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرلے اس نے ابوحنیفہ کی ہدایات کے مطابق اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا مرد سے کہا تو عورت کے مطالبہ کے جواب میں یوں کہنا کہ تجھے طلاق ہے اگر تو چاہے اور عورت سے کہا خاوند کے جواب میں یوں کہنا کہ میں ہرگز طلاق نہیں چاہتی چنانچہ دونوں نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم کے مطابق عمل کیا تو ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں سے فرمایا اس عمل کے بعد اب دونوں بری ہوگئے ہو اور طلاق واقع نہ ہوگی اور تمہارے اوپر کوئی حنث نہ ہوگا۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوسی نے امام اعظم کی یہ ذہانت و بصیرت اور اپنے ساتھ شفقت و مروت دیکھی تو سابقہ عداوت سے توبہ کی اور اس کے بعد دونوں میاں بیوی جب بھی نماز پڑھتے تو ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت، رفع درجات کی دعا کرتے اور اس طرح عداوت، محبت میں بدل گئی۔ (عقود الجمان: ۲۸۲)

ابوجعفر منصور اور امام اعظم کا فتویٰ

اہل موصل نے خلیفہ منصور سے عہد شکنی کی تھی۔ اس نے ان سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ عہد شکنی کی صورت میں وہ مباح الدم ہو جائیں گے منصور نے فقہا کو جمع کیا۔ امام ابوحنیفہ بھی تشریف فرما تھے، منصور بولا کیا یہ درست نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**المؤمنون علی شروطھم**" "مومن اپنے شرطوں کے پابند ہیں۔

اہل موصل نے عدم خروج کا وعدہ کیا تھا اور اب انہوں نے میرے عامل کے خلاف بغاوت کی ہے لہذا ان کا خون حلال ہے۔

ایک شخص بولا آپکے ہاتھ ان پر کھلے ہیں اور آپکا قول انکے بارے میں قابل تسلیم ہے اگر معاف کردیں تو آپ معافی کے اہل ہیں اور اگر سزا دیں تو وہ ان کے کئے کی پاداش ہوگی۔

منصور امام ابوحنیفہ سے مخاطب ہوکر بولا آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ہم خلافت نبوت کے حامل امن پسند خاندان نہیں ہیں۔

امام صاحب نے فرمایا کہ اہل موصل نے جو شرط لگائی وہ انکے بس کا روگ نہیں اور جو شرط آپ نے ٹھہرائی وہ آپ کے حدود اختیار میں نہیں۔

کیونکہ مومن تین صورتوں (ارتداد، زنا اور قتل) میں مباح الدم ہوتا ہے لہذا آپ کا ان پر گرفت کرنا بالکل ناروا ہوگا۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد فرمودہ شرط پورا کیے جانے کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

منصور نے فقہاء کو چلے جانے کا حکم دیا پھر خلوت میں امام صاحب سے بہ ہزار منت عرض کیا اے شخص! فتوی وہ درست ہوگا جو آپ کا ہوگا اپنے وطن کو تشریف لے جائے اور ایسا فتوی نہ دیجئے جس سے خلیفہ کی مذمت کا پہلو نکلتا ہو کیونکہ اس سے باغیوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔

اور الکامل لابن اثیر کی روایت کے مطابق منصور نے امام اعظم اور انکے دیگر رفقاء کو واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔ (الکامل: ۵/۲۱۷)

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقت پر سوچتے ہیں جہاں دوسروں کا خیال بھی نہیں پہنچتا

ایک مرتبہ کسی شخص کا اپنی بیوی سے تنازعہ ہوا تو ناراض ہوکر بیوی سے قسم کھاتے ہوئے مخاطب ہوا، کہ جب تک مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے کبھی نہ بولونگا۔

عورت بھی مزاج کی سخت واقع ہوئی تھی مشتعل ہوئی اور جواباً اس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دہرائے جو اسکے خاوند نے کہے تھے، قسم کھاتے وقت غصہ اور اشتعال کی حالت تھی اسکے انجام اور بدترین عواقب پر کسی کی نظر نہ تھی اسلیے دونوں کو مستقبل کا کچھ نہ سوجھا مگر بعد میں جب ہوش ٹھکانے لگے تو دونوں اپنے کیے پر پچھتائے اور مسئلے کا حل تلاش کرنے کرنے نکلے چنانچہ شوہر امام سفیان ثوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت واقعہ بیان کرکے پیش آمدہ مسئلہ کا حکم دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا قسم کا کفارہ ہر حالت میں دینا ہوگا بغیر اسکے ادا کیے چھٹکارا نہیں وہ مایوس ہوکر مزید اطمینان کے لئے امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا حضرت خدارا! آپ اس مسئلہ کی حقیقت پر غور فرمائیں اور راہ نمائی فرمائیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا۔

تشریف لے جایئے! بڑی محبت اور شوق سے اپنے بیوی سے گفتگو کیجئے کسی ایک پر بھی کوئی کفارہ نہیں۔

حضرت سفیان ثوری کو امام اعظم کا فتوی معلوم ہوا تو برہم ہوگئے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

سے ملاقات کر کے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتاتے ہیں۔

چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً شوہر (سائل) کو بلا بھیجا اور سفیان ثوری کی موجودگی میں اس سے کہا کہ اب دوبارہ اصل واقعہ اور استفتاء بیان کریں چنانچہ اس نے حسب سابق تفصیلاً ساری صورت واقعہ اور استفتاء بیان کر دیا تو امام اعظم نے سفیان ثوری سے کہا۔

جو کچھ میں نے پہلے کہا تھا اور جو فتویٰ پہلے دیا تھا وہ درست تھا اور اب بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں۔

سفیان ثوری نے وجہ دریافت کی تو امام صاحب نے فرمایا کہ

جب عورت نے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے کچھ الفاظ کہے تو گویا عورت کیطرف سے بولنے کی ابتداء متحقق ہوگئی پھر قسم کہاں باقی رہ سکتی ہے۔

سفیان ثوری نے جواب سن کر فرمایا حقیقت میں ابوحنیفہ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں تک خیال وگمان بھی نہیں پہنچتا۔ (سیرت النعمان: ۱۸ بحوالہ تفسیر کبیر)

امام باقر رحمۃ اللہ علیہ نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیشانی کو بوسہ دیا

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں امام باقر سے ملاقات ہوگئی، امام باقر کو چونکہ آپ کے بارے میں غلط روایات پہنچی تھیں، اسلیے وہ آپ سے بدگمان رہتے تھے چنانچہ کہنے لگے آپ وہی ابوحنیفہ ہیں جس نے میرے نانا کے دین کو بدل دیا ہے اور قطعی نصوص اور قرآن وحدیث کے مقابلے میں قیاس کو ترجیح دینے کا اصول اپنایا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت احترام وادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کیا، حضرت آپ تشریف رکھیں، تاکہ اصل واقعہ اور صحیح صورت حال آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

چنانچہ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہوگئے تو امام ابوحنیفہ شاگردوں کی طرح ان کے سامنے دوزانوں بیٹھ کر عرض کرنے لگے۔

حضرت! عورت کمزور ہے یا مرد، امام باقر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، عورت۔ پھر امام صاحب نے کہا اور یہ بتائیے کہ عورت کا حصہ کتنا ہے اور مرد کا۔

امام باقر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مرد کے دو حصے ہیں اور عورت کا ایک حصہ۔

تب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے اطمینان اور پر اعتماد لہجے میں فرمایا۔

حضرت اگر میں قیاس سے کام لیتا جیسا کہ آپ تک غلط روایات پہنچی ہیں تو عورت کے ضعیف ہونے کے پیش نظر اس کے دو حصے مقرر کرتا۔

اس کے بعد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

حضرت! یہ بتائیے کہ نماز افضل ہے یا روزہ؟ امام باقر نے جواب دیا کہ نماز افضل ہے تب امام

ابوحنیفہ نے فرمایا۔

حضرت! اگر میں قیاس سے کام لیتا تو عورت سے ایام حیض کی نمازوں کی قضا ادا کراتا اور روزے کی قضا نہ ادا کرتا کیونکہ نماز روزہ سے افضل ہے پھر دریافت کیا کہ حضرت یہ بتایئے کہ منی کا نطفہ زیادہ نجس ہے یا پیشاب؟ امام باقر نے فرمایا پیشاب۔ تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا اگر میں قیاس سے کام لیتا تو پیشاب سے غسل کو واجب قرار دیتا اور منی کے نطفے سے صرف وضو فرض قرار دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

تب امام باقر نے ابوحنیفہ کی نہ زبردست تحسین کی اور امام صاحب کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ (مناقب موفق: ۱۸۳)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی تعبیر

ابن خلکان نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مبارک کو کھود ڈالا ہے اور آپ کی ہڈیاں مبارک جمع کر رہے ہیں صبح کو اٹھے تو پریشان اور حیران تھے بعد میں جب علم تعبیر الرویاء کے مشہور عالم علامہ ابن سیرین کی خدمت حاضر ہوئے، تو ان سے بغیر تعارف کے اپنا خواب بیان کیا ابن سیرین نے فرمایا:

"صاحب هذه الرؤياء يثير علما لم يسبقه اليه احد قبله"

یہ خواب دیکھنے والا علم کی خدمت و اشاعت اس طریقہ سے کرے گا کہ اس سے قبل کوئی بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکا ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

یہ خواب ابوحنیفہ نے دیکھا ہوگا۔

امام اعظم نے عرض کیا، حضرت میں ہی ابوحنیفہ ہی ہوں۔

تو ابن سیرین نے فرمایا: اچھا اپنی پشت اور بایاں پہلو دکھاؤ،

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حسب الحکم اپنا پہلو اور کمر کھول دی ابن سیرین نے امام اعظم کے بازو اور پشت پر تل کے نشان دیکھ کر فرمایا واقعۃ آپ ہی ابوحنیفہ ہی ہیں اور اس کے بعد خواب کی تعبیر بیان فرمائی کہ اس سے مراد علم کا زندہ کرنا اور جمع کرنا ہے (اور یہ خدمت اللہ پاک آپ سے لے گا)۔ (امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حیرت انگیز واقعات: ۱۶۹)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا حکیمانہ فیصلہ

رائے و تدبیر، عقل و فراست اور نکتہ آفرینی امام ابوحنیفہ کے مشہور اوصاف ہیں۔ محمد انصاری کہا کرتے تھے کہ ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت یہاں تک کہ بات چیت، چلنے پھرنے میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا، علی بن عاصم کا قول ہے کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلہ میں اور ابوحنیفہ کی عقل دوسرے پلہ میں رکھی

جائے تو ابوحنیفہ کا پلہ بھاری ہوگا۔

کوفہ کے ایک شخص نے بڑے دھوم دھام سے اپنے دو بیٹوں کی شادی کردی ولیمہ کی دعوت میں شہر کے تمام اعیان واکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری اور امام اعظم ابوحنیفہ بھی شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعۃً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہوگیا، لوگوں نے کہا خیر تو ہے؟ بولا زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہیں تھا۔

سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانے میں بھی ایسا ہوا تھا، اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا البتہ دونوں کو مہر لازم ہوگا۔

مسعر بن کدام، امام ابوحنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا: شوہر خود میرے پاس آئے تو جواب دوں گا لوگ جا کر دونوں شوہروں کو بلا لائے، امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہی تمہارے ساتھ نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے؟ دونوں نے کہا ہاں تب امام ابوحنیفہ نے فرمایا:

تم دونوں اپنی بیوی کو جن سے تمہارا نکاح بندھا تھا، طلاق دے دو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اس کی ساتھ ہم بستر رہ چکی ہے۔ (عقود الجمان: ۲۲۵، علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات: ۱۷۳)

روشندان بنانے سے دیوار گرانے تک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی

ابن مبارک راوی ہیں کہ ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے دیوار میں روشندان کے کھولنے کا مسئلہ دریافت کیا امام صاحب نے فرمایا جب دیوار تمہاری ہے تو اس میں روشندان کھول سکتے ہو (مگر اس کی غرض اذان سننے اور تازہ ہوا کے آنے جانے تک محدود رہے) خبردار! اس سے پڑوسی کے گھر جھانکنا شرعاً ممنوع ہے۔

جب اس کے پڑوسی کو علم ہوا، تو وہ قاضی ابن ابی لیلیٰ کے پاس حاضر ہوا، اور صورت واقعہ بیان کر دی، قاضی صاحب نے اسے روشندان کھولنے سے منع کر دیا، وہ دوسری مرتبہ امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور قاضی صاحب کے امتناعی حکم کی اطلاع عرض کر دی امام صاحب نے فرمایا! لیجیے اب کی بار اپنی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیجیے۔ چنانچہ جب وہ دروازہ کھولنے کے لیے دیوار کے پاس آیا تو قاضی صاحب نے اب کے بار اسے دروازے بنانے سے بھی روک دیا، وہ صاحب، امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ قاضی صاحب نے تو مجھے دروازہ کھولنے سے بھی روک دیا ہے۔

تب اس سے امام صاحب نے کہا تمہاری ساری دیوار کی کل قیمت کتنی ہے؟

عرض کیا کہ تین دینار۔ امام صاحب نے فرمایا تمہارے تین دینار میرے ذمہ واجب ہوئے، جاؤ!

اپنی دیوار وہیں سے گرادو۔

وہ حسب ہدایت دیوار گرانے آیا تو پڑوسی نے حسب سابق اسے منع کیا اور قاضی صاحب کے پاس پھر سے شکایت لایا۔ قاضی صاحب اس سے فرمانے لگے بھائی تم بھی عجیب آدمی ہو کہ وہ اپنی دیوار گرا رہا ہے، اس کی اپنی چیز ہے اس میں جیسا تصرف چاہے کر سکتا ہے اور تم ہو کہ مجھے کہتے ہو کہ میں اسے اپنی دیوار گرانے سے روک دوں۔ قاضی صاحب نے دیوار کے مالک سے بھی کہا۔

"اذھب فاھدمه واصنع ماشئت" جاؤ اپنی دیوار گرادو! اور جو جی چاہے وہی معاملہ اپنی دیوار سے کرو۔

اس صاحب نے عرض کیا، جناب قاضی صاحب! آپ نے مجھے بے جا تعب ومشقت میں ڈالے رکھا اتنے بڑے کام سے تو میرے لیے روشندان بنانا آسان تھا۔ قاضی صاحب کہنے لگے۔

جب تم ایسے آدمی کے پاس جاتے رہے جو میری خطاؤں کو ظاہر کرتا رہا اب جبکہ میری غلطیاں ظاہر ہوگئیں ہیں، اور ستر کی بھی کوئی صورت باقی نہ رہی تو اب میں بات کیسے کر سکتا ہوں جس سے اس کے بعد مجھے مزید فضیحت اٹھانی پڑے۔ (ایضا ۲۴۷،العقود الجمان:۲۵)

دو اور ایک درہم کا اختلاط اور تقسیم

ابن مبارک سے روایت ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کی خدمت میں ایک مسئلہ کا حل دریافت کیا وہ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص کے دو درہم اور دوسرے کا ایک درہم باہم مختلط ہوگئے پھر ان تینوں کے مجموعے سے دو درہم گم ہوگئے مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ دو درہم کون سے تھے اب اس باقی ایک درہم کا کیا بنے گا؟ امام صاحب نے جواب میں فرمایا:

بقیہ ایک درہم تین حصے کر دیے جائیں گے دو حصے (2/3) اس کو ملیں گے جس کے دو درہم تھے **ایک** حصہ (1/3) اس کو ملے گا جس کا ایک درہم تھا۔

ابن مبارک فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے ابن شبرمہ سے ملاقات کی اور اس سے بھی یہی مسئلہ دریافت کیا ہے انہوں نے کہا کہ اس سے پہلے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا ہے، میں نے عرض کیا کہ ہاں! ابوحنیفہ سے دریافت کیا ہے اور مسئلہ کی تفصیل سے ان کو آگاہ کر دیا تو کہنے لگے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے صحت جواب میں غلطی ہوئی ہے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

دو درہم جو گم ہوئے ہیں ان میں سے ایک درہم کے متعلق تو یہ بات یقینی ہوگئی ہے کہ وہ اس کا تھا جس کے دو درہم تھے اب گویا کہ ایک درہم دونوں کا (یعنی جب ایک درہم یقینی طور پر صاحب درہمین کا گم ہوگیا ہے اور باقی ایک ایک درہم کے اختلاط میں گویا درہمیں میں ایک نامعلوم درہم گم ہوا ہے، لہذا اس کے نقصان میں دونوں شریک ہوں گے) اور باقی ایک درہم دونوں میں نصف نصف تقسیم کر دیا جائے گا۔

ابن مبارک کہتے ہیں، میں نے اس جواب کو پسند کیا پھر اس کے بعد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے میری

ملاقات ہوئی، یہ وہی امام اعظم ہیں اگر ان کی عقل روئے زمین پر بسنے والوں کی نصف آبادی کی عقلوں کے ساتھ تولی جائے تو وہ بھاری نکلے تو امام اعظم نے فرمایا ابن شبرمہ سے تم ملے تھے اور تمہارے دریافت کرنے پر انہوں نے یہ جواب (جو اوپر تفصیل سے درج کر دیا گیا ہے) تمہیں دیا تھا کہ بقیہ درہم دونوں میں نصف نصف کر دیا جائے گا میں نے کہا آپ سچ کہتے ہیں، تب امام اعظم نے فرمایا

بھائی! بات ایسے نہیں۔ درحقیقت صورت مسئلہ یہ ہے کہ جب دونوں کے جانب سے تین دراہم کا آپس میں اختلاط متحقق ہو گیا تو ہر ایک درہم میں دونوں کی شرکت اثلاثا (تین تہائیاں) ثابت ہو گئیں دو درہم والے کے لیے دو تہائیاں اور ایک درہم والے کے لیے ایک تہائی، لہذا جو درہم بھی گم ہوگا اس میں حصہ شرکت کے موافق ہر ایک کا حصہ گم ہوگا، لہذا جب ایک درہم باقی رہ گیا تو اس میں بھی حسب شرکت حصہ دو تہائیاں، اور ایک تہائی دونوں کو دیا جائے گا لہذا جس کے دو درہم تھے اس کو دو حصے ملیں گے اور جس کا ایک درہم تھا اس کو ایک حصہ ملے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ابن شبرمہ کا یہ اختلاف دراصل اصول کے اختلاف پر مبنی ہے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جب کئی چیزیں عدم امتیاز کے ساتھ مختلط ہو جائیں تو ان کی تقسیم مال مشترک کی طرح واجب ہے یہ گویا شرکت علی الشیوع ہے جس کی تقسیم واجب ہے لہذا ایک درہم بھی اثلاثا تقسیم ہو گا۔ جس کے دو درہم اس کو 2/3 اور جس کا ایک درہم، اسکو 1/3 حصہ ملے گا۔

جب کہ ابن شبرمہ فرماتے ہیں اگر مال بغیر تمیز کے مختلط ہو جائے تو اس سے شرکت ہی لازم نہیں آتی۔ لہذا دو درہموں میں ایک جو گم ہوا ہے وہ تو یقیناً اسی کا ہے جس کے دو تھے اب دونوں کا ایک ایک رہ گیا ہے اور موجود بھی ایک ہے جس میں احتمال ہے کہ وہ دونوں میں سے کس کا ہے، جب کہ کسی ایک کے لیے بھی مرجح موجود نہیں لہذا باقی درہم نصف نصف تقسیم کیا جائے گا۔ (عقود الجمان ۲۵۸، وخیرات الحسان۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حیرت انگیز واقعات: ۱۷۵)

ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تدبیر برائی کا مداوا برائی سے ہو گیا

ایک شخص نے امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ میرے پڑوسی نے اپنے گھر میں ایک کنواں کھود رکھا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میری دیوار نہ گر جائے۔

امام صاحب نے فرمایا اپنے گھر اسی کنوئیں کے برابر اور قریب ایک نالی کھود لو۔ اس نے اسی طرح کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنواں خشک ہو گیا چنانچہ مالک نے اسے بند کر دیا (ایضا: ۱۷۷)

ایام رمضان میں جماع کا حلف اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تدبیر

ایک شخص نے قسم اٹھائی کہ رمضان کے ایام میں اپنے بیوی سے جماع کروں گا، اب اگر جماع کرتا ہے تو روزہ توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا اور جرم وسزا اور گناہ اس پر مستزاد اور اگر ان ایام میں قربت اختیار نہیں

کرتا تو حانث ہوتا ہے۔ بہت سوں سے پاس یہ مسئلہ لایا گیا مگر جواب کہیں سے بھی نہیں ملا، جب امام اعظم ابوحنیفہ کے سامنے صورت مسئلہ رکھی گئی تو آپ نے ایک ہی چٹکی سے مسئلہ حل کردیا ارشاد فرمایا ''یسافر بھا فیطوء ھا نھارا فی رمضان'' مرد سفر پر روانہ ہو عورت و ہمراہ لے لے، رخصت سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روزہ نہ رکھے اور اپنا مقصد پورا کرے۔ (ایضا ۱۷۱)

ایک دینار کا مستحق معلوم ہوا تو کل ترکہ اور جمیع ورثاء کی تعین کردی

وکیع سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ مجلس ابوحنیفہ میں ایک عورت حاضر ہوئی ہم بھی وہاں موجود تھے، عورت نے عرض کیا کہ۔

میرا بھائی فوت ہوگیا ہے اور اپنے پیچھے اس نے چھ سو دینار کا ترکہ چھوڑا ہے جب وراثت تقسیم ہوئی تو مجھے چھ سو دینار میں صرف ایک دینار دیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ میرے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے اور وہ یہ سمجھتی ہوگی کہ مجھے میت کی بہن ہونے کے ناطے سے زیادہ وراثت کا حق دار ہونا چاہیے اور یہاں صرف ایک دینار میرے حصے کا دیا گیا ہے۔

امام اعظم نے اس سے دریافت کیا کہ یہ تقسیم کس نے کی ہے؟ کہنے لگی داؤد طائی نے، امام صاحب نے فرمایا تجھے ایک دینار کا حقدار ہونا چاہیے اور وہ تجھے مل چکا ہے کہنے لگی وہ کیسے؟ امام صاحب نے فرمایا۔

کیا تیرے بھائی نے اپنے پیچھے دو بیٹیاں نہیں چھوڑیں؟ کہنے لگی ہاں اسکی دو بیٹیاں ہیں۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور اس کی ماں بھی زندہ ہے کہنے لگی درست ہے امام صاحب نے فرمایا اور ان کے علاوہ اس کے ۱۲ بھائی اور ایک بہن بھی بقید حیات ہے کہنے لگی بالکل درست ہے، تو امام صاحب نے عورت کو میراث کی تفصیل سمجھاتے ہوئے فرمایا!

کہ میت کی دونوں بیٹیوں کو ترکہ میں ثلثین (۲) تہائیوں کا استحقاق حاصل ہے، لہٰذا چار سو درہم تو ان کا حق ہے۔

میت کی ماں کے لیے ترکہ میں چھٹا حصہ بنتا ہے لہٰذا سو درہم تو اسکو ملے باقی رہی میت کی بیوی تو اس کا استحقاق وراثت ثمن (آٹھواں) ہے لہٰذا پچھتر ۷۵ دینار تو وہ لے لے گی۔ اب کل ترکہ میں ۲۵ دینار رہ جائیں گے۔ جو باقی ورثاء میت میں ۱۲ بھائی اور ایک بہن (سائلہ) میں تقسیم کرنے ہوں گے۔

لہٰذا ۲۴ دینار بارہ (۱۲) بھائیوں کو ملیں گے۔ اس طرح کہ ہر بھائی کے لیے دو دینار کا استحقاق ہو گا۔ باقی رہا ایک دینار تو وہ تمہارا حق ہے جو داؤد طائی نے تمہیں دلوا دیا ہے۔ (عقود الجمان ۲۶۱، ایضا ۲۰۴)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جنازہ پڑھوادیا تو میاں بیوی قسم سے بری ہوگئے

قاضی شریک کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ بنو ہاشم کے سرداروں میں سے کسی سردار کے بیٹے کے جنازہ میں سفیان ثوری اور ابن شبرمہ، قاضی ابن ابی لیلیٰ، ابوالاحوص مندل حبان اور امام اعظم ابوحنیفہ اکٹھے

ہو گئے۔ ان کے علاوہ جنازہ میں دیگر اکابر علماء، فقہاء اور رؤسائے شہر بھی شریک تھے کہ اچانک جنازہ رک گیا اور لوگ آپس میں جنازہ کی رکنے کی وجہ پوچھنے لگے، چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں اور پھر تحقیقی طور پر یہ معلوم ہوا کہ لڑکے (میت) کی ماں بھی جنازہ کے ساتھ بے چین ہو کر از خود رفتگی کے عالم میں نکل آئی ہے۔ اپنا دوپٹہ جنازہ پر ڈال دیا ہے بے حجابی تو ہو ہی گئی اور سر سے ننگا ہونا اس پر مستزاد۔ اور یہ عورت بھی کوئی معمولی عورت نہ تھی، ہاشمی خاندان سے تعلق رکھنے والی شریف زادی تھی جب لڑکے (میت) کے باپ یعنی خاوند کو علم ہوا کہ میری بیوی سر سے ننگی ہو کر جنازہ کے ساتھ چل رہی ہے جس سے خاندان کی فضیحت اور رسوائی ہو گی تو فوراً باآواز اپنی بیوی کو پکار کر کہا۔

واپس لوٹ جاؤ مگر عورت نے واپس آنے سے انکار کر دیا تو اس نے حلف اٹھایا کہ اگر تو یہیں سے واپس نہ لوٹی تو تجھ پر طلاق ہے (یہاں یاد رہے کہ جنازہ ابھی تک جنازہ گاہ کو نہیں پہنچا تھا نماز جنازہ تو جنازہ گاہ ہی میں پڑھنا تھا بہت سے لوگ جنازہ گاہ میں پہلے سے پہنچے ہوئے تھے مگر یہ قضیہ تو راستے کا ہے)۔

بیوی نے جواباً حلف اٹھا لیا کہ:

''میں اس وقت تک واپس نہ لوٹوں گی جب تک کہ اس پر نماز جنازہ نہ ہو جائے ورنہ میرے جتنے بھی غلام ہیں سب آزاد ہوں''۔

مسئلہ پیچیدہ تھا لوگوں میں چہ مگوئیاں اور سرگوشیاں شروع ہو گئیں بڑے بڑے علماء اور فقہاء موجود تھے مگر کسی سے بات نہیں سلجھ رہی تھی کہ میت کے باپ کی نظر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی اور عرض کیا کہ حضرت! خدارا ہماری مدد کیجیے۔

امام صاحب آگے بڑھے اور لڑکے کی ماں سے دریافت کیا کہ تو نے کس طرح حلف اٹھایا ہے عورت نے ساری بات دہرا دی پھر اس کے خاوند سے پوچھا کہ تیرا حلف کیا تھا اس نے حلف کے الفاظ سنا دیئے۔

امام اعظم نے صورت مسئلہ کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی بغیر کسی کے تامل کے فرمایا۔ جنازہ کی چارپائی رکھ دو لوگوں نے تعمیل کی تو فرمایا نماز جنازہ کے لیے صفیں درست کر دو اور جنازہ گاہ کے بجائے یہیں نماز جنازہ پڑھ لو، میت کے باپ سے کہا، جناب! آگے بڑھیے، اور نماز پڑھا دیجیے چنانچہ وہ آگے بڑھے نماز جنازہ کی صفیں درست ہوئیں جو لوگ پہلے سے جنازہ گاہ میں پہنچ چکے تھے انہیں بھی یہیں بلایا گیا جب نماز ہو چکی تو امام صاحب نے فرمایا، لیجیے، اب میت کو تدفین کے لیے قبرستان لے چلیے۔

عورت سے کہا، اب یہیں سے واپس لوٹ جا کہ تو قسم میں بری ہو چکی کہ نماز جنازہ ہو چکا ہے اور اس کے بعد تیری واپسی ہو رہی ہے۔

لڑکے کے باپ سے کہا لیجیے تو بھی بری ہو چکا ہے کہ عورت تیرے حکم پر واپس لوٹ رہی ہے، ابن شبرمہ نے امام صاحب کے ذہانت اور سریع الفہمی دیکھی تو بے اختیار پکار اٹھے تیرے جیسا ذہین اور سریع الفہم بچہ جننے سے عورت عاجز آ گئی ہے خدا بھلا کرے تیرے لیے علمی مشکلات کے حل میں کوئی کلفت

نہیں۔ (مقتدر ایمان ۲۵ ایلہ ۲۰۵)

رشتوں کے متعلق شریعت کا معیار

رشتوں کے متعلق شریعت کا معیار یہ ہے کہ دین اور تقویٰ کو پیش نظر رکھا جائے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر کہا "میری ایک بیٹی ہے، مجھے اس سے بہت محبت ہے مختلف لوگوں نے پیغام نکاح بھیجا ہے، آپ بتائیں میں اس کے لیے کیسے آدمی کا انتخاب کروں؟" حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "اس کی شادی ایسے آدمی سے کرایئے جو اللہ سے ڈرتا ہو، متقی ہو، کیونکہ اس طرح کے آدمی کو اگر آپ کی بیٹی سے محبت ہوئی تو اس کی عزت کرے گا نفرت ہوگی تو اس پر ظلم نہیں کرے گا۔ (ارشاد الساری شرح بخاری: ۱۱/۳۶۵)

عظیم باپ، عظیم بیٹا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے والد غلام تھے اپنے مالک کے باغ میں کام کرتے تھے ایک مرتبہ مالک باغ میں آیا اور کہا "میٹھا انار لایئے" مبارک ایک درخت سے انار کا دانہ توڑ کر لائے، مالک نے چکھا تو کھٹا تھا اسکی تیوری پر بل آ گئے، کہا "میں میٹھا انار مانگ رہا ہوں تم کھٹا لائے ہو" مبارک جا کر دوسرے درخت سے انار لایا، مالک نے کھا کر دیکھا تو وہ بھی کھٹا تھا، غصہ ہوئے، کہنے لگے "میں نے تم سے میٹھا انار مانگا ہے اور تم جا کر کھٹا لے آئے" ہو مبارک گئے اور تیسرے درخت سے انار لیکر آئے اتفاقاً وہ بھی کھٹا تھا، مالک کو غصہ بھی آیا اور تعجب بھی ہوا، تمہیں ابھی تک میٹھے کھٹے کی تمیز اور پہچان نہیں" مبارک نے جواب میں فرمایا "میٹھے کھٹے کی پہچان کھا کر ہی ہو سکتی ہے اور میں نے اس باغ کے کسی درخت سے کبھی کوئی انار نہیں کھایا" مالک نے پوچھا کیوں؟ اس لیے کہ آپ نے باغ سے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے اور آپ کی اجازت کے بغیر میرے لیے کسی انار کا کھانا کیسے جائز ہو سکتا ہے، یہ بات مالک کے دل میں گھر کر گئی اور تھی بھی یہ گھر کرنے والی بات! تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ واقعتاً مبارک نے کبھی کسی درخت سے کوئی انار نہیں کھایا۔ مالک اپنے غلام مبارک کی اس عظیم دیانت داری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کرایا، اسی بیٹی سے حضرت عبداللہ ابن مبارک پیدا ہوئے حضرت عبداللہ ابن مبارک کو اللہ عزوجل نے علمائے اسلام میں جو مقام عطا فرمایا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ (کتابوں کی درسگاہ میں: ۱۹۰ بحوالہ وفیات الاعیان: ۳/۲۲)

تین مواقع جہاں نفل کا ثواب فرائض سے زیادہ ہے

۱) سلام کرنا ۲) قرض معاف کرنا ۳) قبل از وقت وضو کرنا۔

مسئلہ خنثیٰ

﴿وما خلق الذکر والانثی﴾ میں خنثیٰ مشکل کا ذکر نہیں۔ تو واضح رہے کہ وہ خنثیٰ مشکل ہمارے نزدیک ہے ورنہ اللہ کے علم میں تو اس کا مذکر ہونا یا مؤنث ہونا طے ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص قسم کھالے کہ وہ

فلاں دن نہ مذکر سے گفتگو کرے گا اور نہ مؤنث سے، اور وہ شخص پھر خنثی مشکل سے گفتگو کرے تو حانث ہو جائے گا۔

"والخنثی المشکل عندنا ذکر او انثی عند الله تعالی فیحنث بتکلیمه من حلف لا یکلم ذکرا و لا انثی" (تفسیر جلالین ۵۰۱)

تین چیزوں سے خاتمہ بالخیر میں مدد ملتی ہے

۱) نماز باجماعت اور اس پر مداومت ہو۔۲) مسواک کی عادت۔۳) والدین کی اطاعت۔

(اسلاف کے حیرت انگیز واقعات ۵۳)

نکاح کی تین آفات

۱)...... کسب حلال سے محرومی: یہ سب سے بڑی آفت ہے حلال رزق ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔

۲)...... یاد الٰہی سے دوری: یہ آفت باقی دو آفتوں سے کم عام ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ بیوی بچے اسے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کردیں اور اس کی تمام تر توجہات کا محور اور جدوجہد کا مرکز دنیا کو بنادیں۔

۳)...... ادائے حقوق میں کوتاہی: نکاح کرنے میں تیسری آفت یہ ہے کہ وہ شخص اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنے سے قاصر ہو۔ ان کی ایذاء اور تند تلخ باتوں پر تحمل نہ کرسکتا ہو۔ یہ آفت پہلی آفتوں سے نسبتاً کم خطرناک ہے۔

۱)...... الاولیٰ وهی العجز عن طلب الحلال فان ذلك لا تیسر لكل واحد.

۲)...... والثانیة ان یكون الاهل والد شاغلاعن الله تعالی وجاذبا له الی طلب الدنیا.

۳)...... والثالثة القصور عن القیام بحقوقهن والصبر علی اخلاقهن واحتمال الاذیٰ منهن. (احیاء العلوم جلد:۲۔ کتاب آداب النکاح)

آج کا اختلاف

ایک مرتبہ ایک عیسائی رئیس ایک مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان کی خدمت میں کچھ اشرفیاں ہدیہ کے طور پر پیش کیں۔ اور مولانا کے تبحر علمی اور دینی خدمات کی تعریف کی، اس کے بعد کہنے لگا: حضرت ایک اہم مسئلہ ہے جس کو آج تک کوئی عالم دین حل نہیں کرسکا! میرا خیال ہے کہ آپ اس مسئلے کو حل کرسکیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟

اس عالم نے کہا سفید تھا۔ عیسائی رئیس نے خوب داد دی، کہ حضرت آپ نے تو ایسا مسئلہ حل کردیا جو آج تک بڑے سے بڑا عالم بھی حل نہیں کرسکا۔ پھر ان سے گذارش کی کہ حضرت بہت سارے مسلمان اس مسئلے سے ناواقف ہیں، از راہ کرم اگلے جمع کو یہ مسئلہ ذرا کھول کر بیان فرمادیں۔ حضرت نے فوراً وعدہ کرلیا اور کہا کہ ہمارا کام ہی حق بات کو بیان کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے مشہور عالم کی خدمت میں حاضر

ہوا، ان کو بھی ہدیہ پیش کیا اور ان کی وسعت علمی اور دینی خدمات کی تعریف کی۔ پھر ان سے بھی مؤدبانہ دریافت کیا، حضرت! اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟ انہوں نے کہہ دیا کہ اس کا رنگ کالا تھا۔ عیسائی رئیس نے ان سے بھی مؤدبانہ گذارش کی کہ جمعہ کے بیان میں اس اہم مسئلہ کی وضاحت فرما دیں، تا کہ جاہلوں کے علم میں اضافہ ہو۔ عالم صاحب نے اس کو تسلی دی کہ جناب آپ مطمئن رہیں۔ میں اپنے خطبات جمعہ میں اس مسئلے کو واضح کروں گا۔ چنانچہ اپنے اپنے خطبات جمعہ میں دونوں علمائے کرام نے اس فضول مسئلے کو اپنے من گھڑت دلائل سے خوب واضح کیا، نماز جمعہ کے بعد دونوں علامہ صاحبان کے مقتدی جب ایک چوک میں اکٹھے ہوئے تو ایک گروہ نے کہا: ہمارے حضرت نے آج ایک ایسا مسئلہ حل کر دیا، جسے اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود کوئی عالم حل نہیں کر سکا تھا۔ وہ یہ کہ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کالا تھا۔ دوسرا گروہ کہنے لگا: نہیں اس کا رنگ تو سفید تھا۔

بات بڑھتے بڑھتے گالم گلوچ تک جا پہنچی، پھر مناظرے ہونے لگے، دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر فتوے لگانے شروع کر دئے۔ کہ جو شخص اصحاب کہف کے کتے کو کالا کہے گا۔ اسکے پیچھے نماز نہیں ہوگی۔ ادھر سے جواب آیا کہ جو کتے کو گورا کہے گا۔ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوگی۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارِ﴾ (ندائے منبر و محراب: ۱/۱۰۸)

نکاح شرعی کی تین قسمیں

۱) سنت موکدہ ۲) واجب ۳) مکروہ

۱) مہر، نفقہ اور وطی پر قدرت ہونے کی صورت میں نکاح سنت موکدہ ہے۔ ۲) عورتوں کی طرف شدت اشتیاق کے وقت واجب ہے۔ ۳) اور جس وقت ظلم کا غالب گمان ہو اور فرائض وسنن کے ترک کا، تو ایسی صورت میں نکاح مکروہ ہے۔ (اشرف الہدایہ: ۴/۵)

سینے پر ہاتھ گھر جا کر باندھنا

ایک مرتبہ ایک غیر مقلد نے حضرت مولانا اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ قرآن میں ہے۔ ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور سینے پر ہاتھ باندھو۔ جیسا کہ فتاویٰ ثنائیہ: 534/1 فتاویٰ علماء حدیث: 955/4 پر ہے۔ حضرت نے تحقیقی جواب کے علاوہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ احادیث صحیحہ میں ''وانحر'' کی تفسیر قربانی کرنے سے آئی ہے مگر تمہارا معنی شیعوں والا ہے۔ غیر مقلد نے کہا کہ ہم دونوں معنی لیتے ہیں سینے پر ہاتھ باندھنا بھی اور قربانی کرنا بھی۔ حضرت نے فرمایا۔ قربانی آپ نماز کے بعد گھر جا کر کرتے ہیں تو ہاتھ بھی گھر جا کر باندھ لیا کرو۔

بہشتی زیور کی چیکنگ

ایک مرتبہ ایک غیر مقلد عالم نے کہا کہ فقہ حنفی کے تمام مسائل قرآن وحدیث کے خلاف ہیں حضرت

رحمہ اللہ بہشتی زیور لے کر خود اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ میں بالترتیب وضو کے مسائل سے شروع کر کے ایک ایک مسئلہ پڑھتا ہوں، آپ ہر مسئلہ کے خلاف ایک ایک صحیح صریح غیر معارض حدیث لکھوا دیں، پھر اس غلط مسئلے کے بالمقابل جو صحیح مسئلہ ہو وہ لکھوا کر اس کے موافق ایک ایک صحیح صریح غیر معارض حدیث لکھوا دیں۔ غیر مقلد مولوی بہت پریشان ہوا۔ اور کہنے لگا کہ فقہ حنفی کے سارے مسائل تو حدیث کے خلاف نہیں بلکہ بعض حدیث کے مطابق بھی ہیں اور بعض مخالف بھی ہیں حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: میں بالترتیب ایک ایک مسئلہ پڑھتا جاتا ہوں ان میں سے جو مسئلہ حدیث کے مطابق ہو اسکے مطابق ایک ایک حدیث صحیح صریح غیر معارض لکھوا دیں اور جو مسئلہ حدیث کے خلاف ہو اس کے خلاف ایک ایک حدیث صحیح صریح غیر معارض لکھوا دیں۔ یہ سن کر وہ بھاگ گیا اور ایسے بھاگا جیسے وہ اذان سے بھاگتا ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے:۱۵)

فرشتوں کی آمین

ایک دفعہ ایک بزرگ کی عشاء کی نماز رہ گئی تو انہیں بڑا صدمہ ہوا، انہوں نے سوچا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ ستائیس (۲۷) نمازوں کا اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک ہی نماز ستائیس مرتبہ پڑھ ڈالی اور مطمئن ہو کر سو گئے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم نے نماز تو ستائیس مرتبہ پڑھ لی مگر فرشتوں کی آمین کہاں سے لاؤ گے؟

ف: جب نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے تو امام جب ''ولا الضالین'' کہے تو مقتدی ''آمین'' کہتا ہے۔ مقتدی کے ''آمین'' کہنے کے ساتھ ساتھ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر بڑا احسان ہے۔ (مؤلف)

چار مصلے

ایک صاحب نے حضرت رحمہ اللہ سے اپنا تعارف یوں کرایا، کہ میں ایم اے عربی، ایم اے اسلامیات ہوں، وکالت کرتا ہوں ساتھ ہی ساتھ میں دین میں بھی کافی ریسرچ کی ہے۔ اور مسلکاً میں اہل الحدیث ہوں۔ اس نے بہت سے سوالات کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ سلاطین اسلام پر فخر کرتے ہیں کہ وہ حنفی تھے یہ وہی تو ہے جنہوں نے حرم مکہ میں ساڑھے پانچ سو سال تک اپنی حکومت میں چار مصلے بچھا رکھے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھلا کرے سعودی حکومت کا، جس نے سوائے ایک کے سب لپیٹ دیئے اور اب ایک ہی مصلیٰ ہے حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: جب چار مصلے تھے تمہارا اس وقت بھی کوئی مصلیٰ نہیں تھا اور اب ایک ہے تو تمہارا اب بھی نہیں ہے، ہاں اس سے اتنا پتہ چلا کہ اہل سنت کے مذاہب چار ہی ہیں اور آپ لوگوں کا اہل سنت میں کبھی شمار نہیں ہوا۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے:۱۷)

''بے بے'' سے نماز سیکھنا

ایک دفعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ غیر مقلدین عورتوں کی طرح نماز پڑھتے ہیں، ایک جگہ غیر مقلدین کا وجود نہیں تھا، کوئی غیر مقلد وہاں نماز پڑھنے لگا تو اسکا یہ نیا طریقہ دیکھ کر دو شخص آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ عجیب آدمی ہے کہ خدا نے اسکو مرد بنایا ہے مگر یہ عورتوں کی طرح نماز پڑھتا ہے، تو دوسرے نے کہا کہ اس نے نماز اپنی ''بے بے'' سے سیکھی ہوگی اس لیے ویسی ہی نماز پڑھتا ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۱۷)

مکمل یہودی کون؟

ایک موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار ارشاد فرمایا ہے، کہ جو شخص آمین بالجہر نہیں کہتا، وہ یہودی ہے۔ یہودی آمین بالجہر سے جلتے حسد کرتے ہیں۔ حضرت نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سنن کبری بیہقی 56/2 میں ''ربنا لك الحمد'' اور سلام کا بھی آمین کے ساتھ ذکر ہے بلکہ مجمع الزوائد: 148/2 پر قبلہ کا بھی ذکر ہے جو غیر مقلدین سلام اور ''ربنا لك الحمد'' بلند آواز سے نہیں کہتے وہ کم از کم 2/3 یہودی تو ضرور ہوں گے اور اگر اکیلے پڑھیں تو آمین بالجہر آہستہ کہتے ہیں اس صورت میں تو مکمل یہودی ہونے میں کیا شبہ ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۱۸)

حق بحق دار رسید

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ لامذہب کو شکایت ہے کہ فقہاء نے یہ کیوں تحریر فرمایا؟ کہ بہتر امام وہ ہے جس کی بیوی خوبصورت ہو، ارشاد فرمایا کہ اس کا غلط ہونا لامذہب حدیث صحیح صریح غیر معارض سے ثابت کر کہ امام اس کو بنانا چاہیے کہ جس کی بیوی نہایت بدصورت ہو اور بدسیرت بھی ہو، لامذہب اس مسئلہ کو بہت اچھالتے ہیں۔ اگر واقعی یہ مسئلہ غلط ہے تو انکا پہلا فرض ہے کہ جس لامذہب امام کے نکاح میں خوبصورت بیوی ہو، وہ فوراً اسے طلاق دے دے، کیونکہ یہ احناف کا حق ہے اس سے فقہ کا بغض بھی ثابت ہو جائے گا اور حق بحق دار رسید پر عمل بھی ہو جائے گا، لامذہب پہلے اپنے گھر کی خبر لیں، کہ لغات الحدیث صفحہ 56 پر کیا لکھا ہے؟ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۲۰)

بدھ کے دن جمعہ

جمع بین الصلوتین پر لامذہب کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن میں ہے ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ بیشک نماز مومنوں پر وقت مقررہ کا فرض ہے، جب وقت سے پہلے فرض ہی نہیں تو ادا کیسے ہوگی جیسے حج ذوالحجہ سے پہلے شوال میں ادا کرنا، روزہ رمضان سے پہلے شعبان میں رکھنا، جمعہ بدھ کو پڑھ لینا، موت سے پہلے جنازہ پڑھ دینا اور نکاح سے قبل اولاد حلالی کا ہونا غلط ہے، اسی طرح وقت سے پہلے نماز پڑھنا بھی غلط ہے۔ جہاں جمع کا ذکر ہے وہ صرف صوری جمع ہے مولوی ثناء اللہ

امر تسری نے عبدالحفیظ نامی ایک ملازم کو اجازت دے دی تھی کہ وہ عصر کی نماز ظہر کے وقت میں پڑھ لیا کرے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ۱/۶۱۵)

حدیث میں ائمہ کے نام نہیں

ایک بار مسئلہ تقلید پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا نام حدیث میں نہیں ہے۔ اچھا ذرا صحاح ستہ والوں کے نام اور انکی تصنیفات کے نام تو حدیث سے دکھلا دیں یا پھر انکو بھی چھوڑ دیں۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۲۲)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کا نام

ایک غیر مقلد نے اعتراض کیا کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی کتاب نہیں ہے اگر ہے تو دکھلاؤ اس کے جواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو کتاب لکھی ہے، ذرا اس کا نام تو بتاؤ! بلکہ خود آقا نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کتاب لکھی ہے اسکی زیارت تو کراؤ۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۲۲)

فقہ سے خالی محدثیت

حضرت نے فرمایا کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ "تلبیس ابلیس" میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک محدث نے یہ حدیث یاد کرلی تھی۔ "نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الحلق قبل الصلوۃ یوم الجمعۃ" یہ سمجھتا تھا کہ نماز جمعہ سے پہلے حلق کرانے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ سے وہ چالیس سال تک جمعہ سے پہلے حجامت کرنے سے محروم رہا اور اسے ناجائز سمجھتا رہا۔ یہ غلطی اسے فقہ سے محرومی کی وجہ سے لگی امام خطابی نے اسے سمجھایا کہ حُلق نہیں حِلق ہے جو حلقہ کی جمع ہے مطلب یہ کہ جمعہ سے پہلے گپ شپ لگانے کے لیے حلقے بنا کر نہ بیٹھوں دیکھو! نری محدثیت جو فقہ سے خالی ہے ایسی غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۳۰)

بدبودار چاند

غیر مقلدین کہتے ہیں کہ فقہ کے مسائل قرآن وحدیث کے خلاف ہے فرمایا، کہ ایک عورت نے بچے کو پاخانہ کرایا جیسے پاؤں پہ بٹھا کر کراتی ہیں، تو کچھ گندگی اس کی انگلی کو لگ گئی جس کا اسے پتہ نہ چلا، چاند رات تھی سب عورتیں چاند دیکھنے لگی، تو اس نے بھی وہ گندگی سے آلودہ انگلی ناک پر رکھ لی اسکو بدبو آئی تو کہنے لگی چاند تو نکلا ہے پر بدبودار ہے انصاف سے بتاؤ! کہ یہ بدبو چاند کی تھی یا اس کی انگلی پر لگے پاخانے کی، اسی طرح غیر مقلدین کی فہم وفراست تو اپنی خراب ہوتی ہے نام فقہ کا لے دیتے ہیں کہ وہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۳۱)

کچھ ہی نہیں بہت کچھ

مسئلہ حلالہ پر ایک غیر مقلد نے کہا کہ ہم طلاق ثلاثہ کے بعد کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ

نے فرمایا: کچھ نہ پوچھ یوں بہت کچھ ہوتا ہے اگر طلاق دہندہ اسے ویسے ہی رکھ لے تو اس کا ضمیر اسے لعنت کرے گا وہ شرمسار ہوگا اور اپنے آپ کو گناہ گار سمجھے گا تم جو اسے حلت کا فتویٰ دے کر عورت کو اس کے حوالے کر دیتے ہو، اب وہ اسے حلال سمجھ کر اور نیکی جان کر رکھے گا تو گناہ کو نیکی سمجھنا تو کفر ہے تو کچھ ہی نہیں بہت کچھ ہوتا ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۳۱)

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دلچسپ مناظرہ

اسد بن عمر راوی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت قتادہ بصری رحمۃ اللہ علیہ کوفہ تشریف لائے تو ابو بردہ کے گھر قیام پذیر ہوئے، ان کی تشریف آوری کی خبر شہر میں پھیل گئی لوگ جوق در جوق آنے لگے ایک روز جب وہ گھر سے باہر نکلے تو اعلان کر دیا کہ مسائل فقہ میں جو شخص بھی کوئی مسئلہ پوچھنا چاہے تو آزادانہ پوچھ سکتا ہے، میں ہر مسئلہ کا جواب دوں گا۔ اتفاق سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلس میں موجود تھے، فوراً کھڑے ہوئے اور عرض کیا۔

اے ابوالخطاب (قتادہ بصری کی کنیت ہے) ایسے شخص کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟ جو کئی سال گھر سے باہر رہا پھر اس کی موت کی خبر آ گئی تو بیوی نے یقین کر لیا، کہ واقعۃً اس کا خاوند وفات پا چکا ہے، اس نے دوسری شادی کر لی جس سے اس کی اولاد ہوئی کچھ مدت بعد وہ پہلا شخص آ گیا اور اس کے مر جانے کی خبر جھوٹی ثابت ہوئی پہلا شخص اولاد کے بارے میں انکار کرتا ہے، کہ یہ میری اولاد نہیں دوسرے خاوند کا دعویٰ ہے کہ یہ میری اولاد ہے اس مسئلہ میں دریافت طلب امر یہ ہیں کہ آیا یہ دونوں اس عورت پر زنا کی تہمت لگا رہے ہیں یا صرف وہ شخص جس نے ولد کا انکار کر دیا ہے اس میں آپ کی رائے گرامی کیا ہے؟

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ اگر قتادہ اس مسئلہ میں اپنی رائے سے کوئی بات کریں گے تو خطا ہو جائیں گے اور اگر کوئی حدیث پیش کریں گے تو وہ موضوعی ہوگی مگر قتادہ نے بجائے مسئلہ حل کرنے کے جان چھڑانی ہی مناسب سمجھی اور امام صاحب سے دریافت کرنے لگے، کیا کبھی ایسی صورت پیش آئی بھی ہے بتایا گیا کہ فی الحال تو پیش نہیں آئی۔

فرمانے لگے تو پھر ایسی بات کے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو، جو ابھی تک وقوع پذیر بھی نہیں ہوئی۔ امام صاحب نے فرمایا:

"ان العلماء يستعدون للبلاء ويتحررون منه قبل نزوله فاذا نزل عرفوه وعرفوا الدخول فيه والخروج منه"

علماء کو کسی مسئلے کے پیش آنے سے پہلے اس کے حل، ازالہ اور حکم شرعی کی وضاحت وتعبیر کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔ جب وقوع پذیر ہو تو علماء کو تجربہ نہیں اور جب پیش آئے تو اسے پہچان سکتا اور یہ بھی پہلے سے جانتے ہوں کہ اسے اختیار کرنے یا چھوڑ دینے کی شرعی راہ کون سی ہو سکتی ہے۔ (امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے حیرت انگیز واقعات ۲۱۳)

عورت اس کو مل گئی جس کی بیوی تھی

ایک مرتبہ لولوئی قبیلہ کی جماعت کا کوفہ آنا ہوا، ان میں ایک شخص کی بیوی حسن و جمال اور زیب و زینت میں فائق تھی، کسی کوفی کا اس سے معاشقہ ہوگیا، اور اس نے دعویٰ کردیا یہ عورت میری بیوی ہے۔ جب عورت سے پوچھا گیا تو اس نے بھی کوفی کی بیوی ہونے کا اقرار کرلیا۔ لولوئی بے چارہ جو اس کا اصل خاوند تھا پریشان ہوگیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ عورت میری منکوحہ ہے۔ مگر گواہ موجود نہ تھے۔

جب یہ قصہ امام صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو امام ابوحنیفہ نے قاضی ابن ابی لیلیٰ و دیگر قضاۃ وفقہاء اور عورتوں کی ایک جماعت ہمراہ لے کر لولوئی قبیلہ کے پڑاؤ (قیام گاہ) پہنچے اور عورتوں کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ لولوئی کے خیمہ میں داخل ہوں۔ جب عورت کے اپنی منکوحہ ہونے کا دعویٰ کررہا ہے۔ چنانچہ جب کوئی عورتیں علیحدہ علیحدہ کرکے اوراجتماعی طور پر اس کے خیمہ کے قریب ہوئیں۔ تو ان پر لولوئی کا کتا بھونکنے لگا اور انہیں خیمہ میں داخل ہونے سے رکاوٹ بن گیا، اس کے بعد امام صاحب نے متنازعہ عورت کو حکم دیا کہ وہ لولوئی مرد کے خیمہ میں داخل ہو، چنانچہ جب وہ عورت خیمہ کے قریب ہوئی تو کتا اس کی خوشامد کرنے لگا اور بھونکنا ترک کردیا۔ اور آگے پیچھے قدم لینے۔

امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا: لیجیے مسئلہ حل ہوگیا۔ جو حق تھا وہ ظاہر ہوگیا، جب متنازعہ عورت سے صحیح صورت حال دریافت کی گئی تو اس نے بھی اعتراف کرلیا کہ واقعۃً وہ لولوئی کی بیوی ہے۔ مگر شیطان کے ورغلانے سے وہ کوفی کی منکوحہ ہونے کا اقرار کررہی تھی۔

گمشدہ مال کی تلاش اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ایک عمدہ قیاس

امام ابو یوسف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آکر امام اعظم کی خدمت میں عرض کیا، حضرت! میں نے گھر کے کونے میں کچھ سامان دفن کردیا تھا، مگر اب ذہن پر دباؤ ڈالنے کے باوجود بھی یاد نہیں آرہا کہ وہ کہاں گاڑا تھا۔ خدارا میری مدد فرمایئے۔ امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا جب تجھے یاد نہیں کہ تو نے کہاں گاڑا ہے مجھے بطریق اولیٰ کچھ یاد نہیں ہونا چاہیے۔

یہ جواب سن کر وہ شخص زاروقطار رونے لگا امام اعظم کو رحم آیا۔ تلامذہ کی ایک جماعت ساتھ لی اور اس شخص کے ساتھ اسکے گھر تشریف لے گئے تلامذہ کو گھر کا نقشہ دکھایا اور ان سے پوچھا کہ اگر یہ گھر تمہارا ہوتا تو تم حفاظت کے لیے اپنا کوئی سامان گاڑتے تو کہاں گاڑتے۔

ایک نے عرض کیا، جی میں یہاں گاڑتا، دوسرے نے اپنی جگہ بتائی اور تیسرے نے اپنے قیاس سے کسی جگہ کا تعین کیا، جب پانچوں نے اپنے اپنے قیاس سے مختلف مواقع کی نشاندہی کی تو امام اعظم نے فرمایا کہ انہیں چار پانچ جگہوں میں کسی جگہ گاڑا ہوگا، امام صاحب نے ان کے کھودنے کا حکم دیا، ابھی تیسری جگہ کھودی جارہی تھی کہ خدا کے فضل سے سارا سامان مل گیا۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دیکھا تو مسرت سے چہرہ

حلقہ ہا اٹھا اور ارشاد فرمایا۔

خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے تجھ پر تیری گم شدہ چیز واپس کردی۔ (مقتو ا ممان ۲۶۷ ایضا:۲۲۱)

قاضی ابن شبرمہ نے وصیت تسلیم کرلی

ایک شخص نے مرتے وقت امام ابوحنیفہ کے حق میں وصیت کی۔ آپ اس وقت میں موجود نہ تھے۔ قاضی ابن شبرمہ کی عدالت میں یہ دعویٰ پیش ہوا۔ امام ابوحنیفہ نے گواہ پیش کئے کہ فلاں شخص نے مرتے وقت ان کے لیے وصیت کی تھی۔

ابن شبرمہ بولے، اے ابوحنیفہ! کیا آپ حلف اٹھائیں گے کہ آپ کے گواہ سچ کہہ رہے ہیں؟ امام صاحب نے کہا مجھ پر قسم وارد نہیں ہوتی کیونکہ میں اس وقت موجود نہ تھا۔ ابن شبرمہ نے کہا، آپ کے قیاسات کسی کام نہ آئے۔ امام صاحب نے فرمایا اچھا بتایئے کسی اندھے شخص کا سر پھوڑ دیا جائے اور دو گواہ شہادت دیں تو کیا اندھا شخص حلف اٹھا کر کہے گا کہ میرے گواہ سچے ہیں۔ حالانکہ اس نے انہیں دیکھا نہیں ابن شبرمہ نے کوئی جواب نہ دیا اور وصیت تسلیم کرلی۔ (امام اعظم کے حیرت انگیز واقعات ۲۲۲)

عطاء من عند اللہ

ایک روز گورنر ابن ہبیرہ نے امام صاحب کی خدمت میں ایک انگوٹھی پیش کی، جسکے نگینہ پر ''عطاء بن عبداللہ'' لکھا ہوا تھا، اور کہا یہ انگوٹھی تو بڑی قیمتی ہے مگر اس سے مہر لگانا میں پسند نہیں کرتا کہ غیر کا نام درج ہے اور اسکے ثبت کرنے سے حکم بھی مؤکد نہیں ہوسکتا۔ امام صاحب نے فرمایا لفظ ''بن'' کے (با) کو گول کر کے میم بنادو۔ اور عبد کے نیچے نقطہ کاٹ کر او پر لگادو تو یہ ''عطاء من عنداللہ'' ہو جائیگا۔

گورنر ابوحنیفہ کی اس سرعت انتقال ذہنی سے بے حد متاثر ہوا اور باہمی تعلقات قائم رکھنے اور مزید استوار کرنے کی درخواست اور اس پر اصرار کرتا رہا۔ (ایضا:۱۷۹)

دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستان نشانہ

سفیان بن حسین نامی ایک شخص قاضی ایاس بن معاویہ کی مجلس میں بیٹھ کر کسی آدمی کی غیبت کرنے لگا، قاضی نے اس سے کہا ''آپ نے رومیوں کے ساتھ جہاد کیا؟'' کہنے لگا ''نہیں'' پوچھا ''سندھ اور ہند کے جہاد میں شریک ہوئے ہو؟'' کہا ''نہیں'' فرمانے لگے، ''روم، سندھ اور ہند کے کفار تو آپ سے محفوظ رہے لیکن بے چارہ اپنا ایک مسلمان بھائی آپ سے نہ بچ سکا اور زبان کی تلوار اس پر چلادی'' سفیان پر ان کے اس جملے کا اس قدر اثر ہوا کہ زندگی بھر پھر کسی کی غیبت نہیں کی۔ (البدایۃ والنھایۃ ۹/۹ ۳۳۳ ترجمہ ایاس)

غیبت سے بچاؤ کا نسخہ

امام ابن وھب دوسری صدی ہجری کے مشہور محدث اور فقیہ ہیں فرماتے ہیں میں نے غیبت سے

بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کر دیتا، اگلے دن نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا، لیکن بات بنی نہیں روزہ رکھنا عادت سی بن گئی اور سزا کی تلخی کے بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا، ظاہر ہے جو چیز پر لطف ہو سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے روزہ کی بجائے ہر غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ کرنا شروع کیا۔ یہ سزا نفس کو شاق معلوم ہوئی اور یوں غیبت کے روگ سے نجات ملی۔ (کتابوں کی درسگاہ میں ۴۶)

ایک طرف موت خونخوار شیر کی شکل میں، دوسری طرف۔

بنان حمال چوتھی صدی ہجری کے بزرگوں میں سے ہیں، اصل بغداد کے تھے لیکن مصر میں رہنے لگے تھے، عوام وخواص دونوں میں ان کی بڑی مقبولیت تھی، اللہ والوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے، وہ دلوں کے بے تاج بادشاہ ہوتے ہیں۔ حمال نے بادشاہ مصر ابن طولون کو ایک مرتبہ نصیحت فرمائی۔ ابن طولون تاب سخن نہ لا سکا اور ناراض ہو کر اس نے حکم دیا کہ انہیں خونخوار شیر کے سامنے ڈال دیا جائے، انسان اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے سزا کے بھی عجیب طریقے ایجاد کرتا ہے۔ سزا کا جو طریقہ جس قدر سخت ہوگا اس کے جذبۂ انتقام کو اسی قدر ٹھنڈک پہنچے گی۔

بنان حمال کو خونخوار شیر کے سامنے ڈال دیا گیا۔ شیر لپکا پھر رک کر ان کے جسم کو سونگھنے لگا۔ دیکھنے والے ان کے جسم کے چیر پھاڑ کا نظارہ کرنا چاہتے تھے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد! جب دیکھا کہ شیر انہیں کچھ نہیں کہہ رہا، تب انہیں اس کے سامنے سے اٹھا دیا اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہوئی کہ جب ان سے پوچھا گیا "شیر کے سونگھتے وقت آپ کے دل پر کیا گزر رہی تھی؟" فرمانے لگے "میں اسوقت درندے کے جوٹھے کے متعلق علماء کے اختلاف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کا جوٹھا پاک ہے یا ناپاک"

موت آدمی کے سامنے ہو اور وہ بھی اس ہیبت ناک منظر کے ساتھ لیکن ذہن، فقہ کے ایک اختلافی مسئلہ میں مگن رہے، ایسے اعلام اور یگانہ روزگار شخصیات سے انسان کیا، درندے کیوں محبت نہیں کریں گے۔ یقیناً اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی، جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ۔ (حلیۃ الاولیا، ۱۰/۳۲۴)

حق پسند

عبیداللہ بن حسن عنبری دوسری صدی ہجری کے اکابر علماء میں سے ہیں، وہ بصرہ کے قاضی بھی رہے۔ ا گرد عبدالرحمن بن مہدی نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس کا جواب درست نہیں نے کہا "حضرت! شاید آپ سے غلطی ہوگئی صحیح جواب یہ ہونا چاہیے۔ بڑے علماء اپنی غلطی کی اصلاح سے نہیں شرماتے اور وہ بڑے ہوتے بھی اسی لیے ہوتے ہیں۔ بڑا ہونا یہ نہیں کہ غلطی معلوم ہونے کے بعد بھی اسی پر ڈٹا رہا جائے۔ یہ بڑائی نہیں، ہٹ دھرمی کہلاتی ہے۔ عبیداللہ نے اپنے شاگرد کے صحیح جواب سننے کے بعد بہت ہی کارآمد جملہ ارشاد فرمایا: آپ چھوٹے ہیں لیکن بات آپ ہی کی درست ہے۔

میں بھی آپ ہی کے جواب کی طرف رجوع کرتا ہوں اس لیے کہ باطل میں "سر" اور "رئیس" بننے سے مجھے حق میں "دم" اور "تابع" بننا زیادہ محبوب ہے۔ (کتابوں کی درسگاہ میں ۵۱ بحوالہ حلیۃ الاولیاء ۹/۹)

ایک قلم کے لیے

حضرت عبداللہ بن مبارک کے نام سے کون ناواقف ہوگا اپنے دور میں امام المسلمین تھے۔ ان کے زہد وتقویٰ اور دعوت وجہاد کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز واقعات پڑھ کر آج بھی آدمی کے ایمان میں تازگی، روح میں بالیدگی اور جذبات میں زندگی کی موجیں مچلنے لگتی ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے شام میں کسی سے قلم مستعار لیا۔ واپس کرنا بھول گئے اور ایران کے شہر "مرو" آئے تو وہ قلم یاد آیا۔ وہاں سے دوبارہ شام کا سفر کیا اور جا کر قلم اس کے مالک کو لوٹایا۔ (تاریخ بغداد ۱۰/۱۶۷)

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہارون الرشید کے زمانے میں پورے عالم اسلام کے قاضی القضاۃ تھے، ایک بار ان کے پاس خلیفہ ہارون الرشید اور ایک نصرانی کا مقدمہ آیا، امام نے فیصلہ نصرانی کے حق میں کیا، اس طرح کے درخشاں واقعات تاریخ اسلام کے ورق ورق پر بکھرے پڑے ہیں۔ لوگ اس کو "دور ملوکیت" کہتے ہیں وہ کس قدر مبارک "دور ملوکیت" تھا کہ ایک طاقتور بادشاہ اور خلیفہ اپنی رعایا میں سے ایک غیر مسلم کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں فریق بن کر حاضر ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت جب قریب آیا، تو فرمانے لگے اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں نے اپنے زمانہ قضا میں مقدمات کے فیصلے میں کسی بھی فریق کی جانب داری نہیں کی، حتی کہ دل میں کسی ایک فریق کی طرف میلان بھی نہیں ہوا، سوائے نصرانی اور ہارون الرشید کے مقدمے کے کہ اس میں دل کا رجحان اور تمنا یہ تھی کہ حق ہارون الرشید کے ساتھ ہو اور فیصلہ حق کے مطابق اسی کے حق میں ہو لیکن فیصلہ دلائل سننے کے بعد ہارون الرشید کے خلاف کیا۔

یہ فرما کر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے اور اس قدر روئے کہ دل بھر بھر آیا۔ اس سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کے بلند مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مقدمہ میں دل کا رجحان طبعی طور پر ایک فریق کی طرف تھا اور فیصلہ بھی اس کے خلاف ہوا لیکن اس طبعی رجحان پر بھی انہیں خوف رہا کہ کہیں پکڑ نہ ہو جائے، اللہ اکبر! زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے..... (الدر المختار ۴/۳۱۳)

گام گام احتیاط

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تجارت میں اپنے ایک شریک کے پاس کپڑا بھیجا اور بتایا کہ کپڑے میں یہ عیب ہے، خریدار کو عیب سے آگاہ کر دینا۔ اس نے وہ کپڑا فروخت کیا لیکن خریدار کو عیب بتلانا بھول گیا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جب معلوم ہوا تو اس سے حاصل ہونے والی ساری قیمت صدقہ کر دی، جس کی رقم تیس ہزار درہم تھی۔ (الخیرات الحسان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان ۶۳)

افسوس ناک اجتہاد کا خوشگوار نتیجہ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک عالم نے دریافت کیا کہ "آپ کو بھی اپنے کسی اجتہاد پر افسوس اور پشیمانی بھی ہوئی ہے؟" فرمایا کہ ہاں ایک مرتبہ لوگوں نے مجھ سے پوچھا ایک حاملہ عورت مرگئی ہے اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کر رہا ہے۔ کیا کرنا چاہیے؟" میں نے ان سے کہا" عورت کا شکم چاک کر کے بچہ نکالدیا جائے" لیکن بعد میں مجھے اپنے اجتہاد پر افسوس ہوا۔ کیونکہ بچے کے زندہ نکلنے کا تو مجھے علم نہیں، تاہم ایک مردہ عورت کو تکلیف دینے کے فتوئی پر مجھے افسوس رہا۔ پوچھنے والے عالم نے کہا" یہ اجتہاد تو قابل افسوس نہیں بلکہ اس میں تو اللہ کا فضل شامل رہا کیونکہ آپ کے اس اجتہاد کے برکت سے زندہ نکل کر اس مرتبہ کو پہنچنے والا وہ بچہ میں ہی ہوں۔" (کتابوں کی درسگاہ میں:۷۲)

فراست

قاضی ایاس کی فراست وبصیرت ضرب المثل ہے۔ ایک بار قاضی ایاس چند لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے کہ کوئی خوفناک واقعہ پیش آیا۔ تین عورتیں بھی اس جگہ موجود تھی۔ قاضی ایاس نے کہا" ان تین عورتوں میں سے ایک حاملہ، ایک مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور ایک باکرہ (کنواری) ہے" تحقیق کرنے پر ان عورتوں کے متعلق قاضی ایاس کی بات درست نکلی۔ جب ایاس سے پوچھا گیا کہ آپ کو اس کا اندازہ کیسے ہوا؟ فرمانے لگے" حادثے کے وقت ان عورتوں میں ایک نے ہاتھ پیٹ پر رکھا۔ میں نے سمجھا حاملہ ہے، دوسری نے پستان پر رکھا، میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ مرضعہ ہے، تیسری نے اپنی شرمگاہ پر ہاتھ رکھا میں نے اس سے اس کے باکرہ ہونے پر استدلال کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خوف اور خطرے کے وقت انسان کو فطری طور پر اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز کی فکر ہوتی ہے اور اسی پر ہاتھ رکھتا ہے۔ (شرح مقامات للشریشی:۱/۱۸۳)

ذرا بتائیں چاند کہاں ہے؟

علامہ ابن خلکان نے قاضی ایاس کی فراست کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے۔ مشہور صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی عمر سو سال کے قریب ہوگئی تھی، بھوؤں کے بال سفید ہو چکے تھے، لوگ کھڑے رمضان کا چاند دیکھ رہے تھے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا" وہ سامنے چاند نظر آ گیا، لوگوں نے دیکھا، کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے" وہ سامنے مجھے نظر آرہا ہے" قاضی ایاس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا حقیقت سمجھ گئے ان کی بھوؤں کا ایک بال آنکھ کی جانب جھک گیا تھا۔ قاضی ایاس نے وہ بال درست کرتے ہوئے پوچھا" ابوحمزہ! ذرا بتائیں چاند کہاں ہے؟" حضرت انس رضی اللہ عنہ افق کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے اب تو نظر نہیں آرہا"۔

(کتابوں کی درسگاہ میں ۷۷ بحوالہ وفیات الاعیان ج:۴/۳۷۴)

بدعت کا ارتکاب ڈاکو بھی نہیں کرتا

مشہور مالکی عالم ابن ماجشون کے پاس ان کا ایک ساتھی آ کر کہنے لگا اے ابومروان! آج ایک عجیب قصہ پیش آیا، میں جنگل میں واقع اپنے باغ کی طرف جانے کے لیے نکلا کہ اچانک ایک شخص میرے سامنے آ دھمکا اور کہنے لگا "اپنے کپڑے اتار دو" میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگا "اس لیے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور میں ننگا ہوں"۔ میں نے کہا یہ کیسے بھائی چارگی ہے؟ کہنے لگا "تم ایک مدت تک ان کپڑوں کو پہن چکے ہو، اب میری باری ہے" میں نے کہا "کیا تم مجھے برہنہ کرنا چاہتے ہو؟" کہنے لگا "ہمیں امام مالک سے ایک روایت پہنچی ہے کہ برہنہ حالت میں غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں اور آپ غسل کرنے جارہے ہیں"۔ میں نے کہا تم مجھے لوگوں کے سامنے برہنہ کرنا چاہتے ہو کہنے لگا اگر یہاں کسی کے آنے کا امکان ہوتا تو میں اس طرح تمہارے گلے نہ پڑتا" میں نے کہا اچھا مجھے باغ میں جانے دو میں تمہارے لیے کپڑے بھجواتا ہوں، اس نے کہا ہرگز نہیں، کیا تم اپنے غلاموں کو بھیج کر مجھے گرفتار کروانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں قسم کھاتا ہوں، وہ کہنے لگا تمہاری قسم کسی ڈاکو کے لیے باعث اطمینان نہیں بن سکتی۔ میں نے قسم کھا کر کہا میں ضرور بھیجوں گا اور اپنی خوشی سے بھیجوں گا وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا میں نے عہد رسالت سے لے کر آج تک کے ڈاکوؤں کے بارے میں بڑی سوچ بچار کی مگر مجھے ایسا کوئی ڈاکو نہیں ملا جس نے ادھار کا معاملہ کیا ہو۔ لہذا میں نہیں چاہتا کہ میں اس بدعت کا ارتکاب کروں۔ اس کی یہ دلیل سن کر با دل نخواستہ میں نے کپڑے اتار کر اس کے حوالے کر دیئے۔ (سیر اعلام النبلاء:۱۱/۳۵۱)

بھولی بھالی (مہر کی ادائیگی کس کا فرض ہے)

شروع شروع میں میری اہلیہ دنیا کے رسم و رواج اور آئین و ضوابط سے صرف اتنی بہرہ مند تھی کہ ایک دفعہ نہ جانے کس بات پر میں نے تنبیہ کی مگر اسکی حاضر جوابی پر اس قدر غصہ آیا کہ میرے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا "میرے ساتھ تمہارا نباہ مشکل ہوگا، میرا پیچھا چھوڑ دو اور اپنی راہ لو" اس نے میری برہمی سے بے پرواہ ہو کر لمحہ بھر کے توقف سے جواب دیا، اچھا میں ابھی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی۔ خدا رکھے میری ماں اور میرے بھائی موجود ہیں، آپ میرا مہر معاف کرا دیں۔" میرا یہ سننا تھا کہ غم و غصہ فرو ہو گیا، مسکراتا ہوا باہر نکل آیا اور خدا کا شکر [illegible] کہ اس دور میں مجھے خدا نے کیسی شریک حیات عطا فرمائی ہے جو یہ بھی نہیں جانتی کہ مہر کی ادائیگی کس کا فرض ہے اور اس کی طلبی و معافی بیوی کی طرف سے ہوتی ہے یا شوہر کی طرف سے۔ (جہان دانش:۳۸۵)

مسلمانوں کے طریقے پر زکوۃ ادا کرنا

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا رحمۃ اللہ علیہ اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں، میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب سے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہ قصہ سنا کہ ضلع سہارنپور میں "بہٹ" سے آگے

انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں، اس کے قرب وجوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے اور ان کے مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے اور وہ انگریز دہلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے کبھی کبھی معائنہ کے طور پر آ کر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے، ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں، ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دہلی بھاگا ہوا گیا اور جا کر واقعہ سنایا کہ حضور! سب کی کوٹھیاں جل گئیں آپ کی بھی جل گئی۔

وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، اس نے التفات بھی نہیں کیا ملازم نے دوبارہ زور سے کہا کہ حضور سب جل گیا، اس نے دوسری دفعہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی اور بے فکر لکھتا رہا۔ ملازم نے جب تیسری دفعہ کہا تو انگریز نے کہا کہ میں مسلمانوں کے طریقہ پر زکوٰۃ ادا کرتا ہوں اس لیے میرے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا وہ ملازم تو جواب دہی کے خوف کے مارے بھاگا ہوا گیا تھا، کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کی، وہ انگریز کے اس لاپرواہی سے جواب سن کر واپس آ گیا، آ کر دیکھا تو واقع میں سب کوٹھیاں جل چکی تھیں مگر اس انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔ (آپ بیتی: ۸۸/۱)

ظرافت اور بذلہ سنجی

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم اور سنجیدگی کی وجہ سے کوئی نا ملائم یا غیر مہذب الفاظ اپنی زبان پر نہیں لاتے تھے، کبھی کبھی مزاح کے جملے کہہ دیا کرتے تھے، کوئی مسجد گر کر خراب ہو گئی تھی تو لوگوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں فتویٰ پوچھا، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ مسجد ہے اور اب گر جانے کے بعد بھی مسجد کے حکم میں ہے۔ ایک روز امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ادھر سے گذر ہوا مسجد پر ان کی نظر پڑی، کوڑے کرکٹ سے اٹی پڑی ہے، دیکھ کر انہوں نے مزاحاً فرمایا: "ھذا مسجد ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ" یہ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد ہے۔ (مناقب کردری: ۴۴۲)

مسئلہ کے غور نے عالم نزع کا احساس نہ ہونے دیا

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ کی دوسری بہت سی نعمتوں کیساتھ ایک نعمت علمی انہماک، لسان حق ترجمان کے ساتھ ساتھ بارگاہِ الٰہی سے انہیں قلم کی نعمت بھی عطا ہوئی تھی۔ انہوں نے فقہ واصول پر حدیث ومسائل فقہ پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ مختصر بھی اور طویل بھی۔ ان کتابوں میں خواہ مختصر ہوں یا طویل۔ اپنا مدعا اور منشاء اس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا غرقِ حیرت ہو کر ان کا مطالعہ کرتا ہے، پڑھتا جاتا ہے اور حیران ہوتا جاتا ہے کہ یہ شخص کس پایہ کا آدمی تھا اس کی قلم میں کتنی جامعیت اسکی تحریر میں کتنا اثر اور اس کے انداز انشاء میں کتنی کشش خدا نے بھر دی ہے۔ یہ نازک مسائل کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں جب تک وہ اس کی تحریر کی روشنی میں نہ دیکھے جائیں، سخت نازک اور پیچیدہ نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی کتاب میں وہ اتنے سہل نظر آتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح کا اشکال تھا ہی نہیں یہ صرف ہمارا وہم تھا کہ انہیں دشوار، نازک اور پیچیدہ سمجھ رہے

تھے یہ فکری اور مطالعاتی ذوق، یہ اجتہاد و استنباط مسائل کی طبعی جودت اور یہ ہر قسم کے ہموم و غموم کے علمی دائروں میں دائر کر کے رکھ دیئے اور اپنا سب کچھ علم کے حوالے کر دینے کی برکتیں ہیں۔ کہ وفات کے بعد ایک مخلص نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا، جناب! نزع کی شدت کے وقت کیسے حال ہوا؟ روح کے نکلنے کی حالت کیسے گذری؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں فرمایا: نزع روح کے وقت بھی میں مکاتب کے مسائل میں ایک مسئلہ میں تامل کر رہا تھا، اسی فکر و تامل اور غور و تدبر میں انہماک کی وجہ سے مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میری روح کیسے نکلی؟ روح نکل گئی مگر مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ (حدائق الحنفیہ ۱۵۳)

قاضی ابن ابی لیلیٰ کو اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا

عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ کوفہ کے بہت بڑے قاضی اور مشہور فقیہ تھے، تینتیس سال تک منصب قضاء پر فائز رہے۔

ایک روز امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک پڑوسی ان کی عدالت میں حاضر ہوا، اور کسی شخص کے باغ کے متعلق گواہی دینا چاہی۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ نے ان سے دریافت کیا کہ یہ بتلاؤ کہ جس باغ کے متعلق تم گواہی دے رہے ہو اس میں کل درختوں کی تعداد کتنی ہے؟ جب گواہ یہ نہ بتلا سکے تو قاضی ابن ابی لیلیٰ نے ان کی گواہی (شہادت) کو روک دیا، چونکہ مردود شدہ گواہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوسی تھے۔ عند الملاقات اس نے تمام واقعہ سے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی آگاہ کر دیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کو واپس قاضی صاحب موصوف کی عدالت میں بھیجا اور اسے کہا کہ جاؤ اور قاضی صاحب موصوف سے یہ دریافت کر کے لاؤ کہ آپ بیس سال سے کوفہ کی جس جامع مسجد میں بیٹھ کر فیصلہ کرتے ہیں، اس کے ستونوں کی کتنی تعداد ہے؟ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوسی کی اس گفتگو پر قاضی ابن ابی لیلیٰ کو حیرت اور اپنے کیے پر ندامت ہوئی اور اسکی شہادت قبول کر لی۔ (موفق)

وقوع طلاق ثلاثہ کا ایک پیچیدہ مسئلہ

ایک مرتبہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شخص آیا اور دریافت کیا کہ ایک شخص نے تین قسمیں کھائی ہیں نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور بستا گھر اجڑ جائے گا۔

آپ نے فرمایا کیسی قسمیں؟

سائل نے عرض کیا کہ صاحب واقعہ شخص نے اولاً قسم کھائی کہ

۱..... اگر آج میں کسی بھی وقت کی نماز نہ پڑھوں تو میری بیوی پر تین طلاق۔

۲..... پھر قسم کھائی کہ اگر آج میں اپنی بیوی سے وطی (جماع) نہ کروں تو اس پر تین طلاق۔

۳..... پھر قسم کھائی کہ اگر آج میں غسل جنابت کروں تو اس پر تین طلاق۔

عجیب مخمصہ تھا جو کہیں بھی حل نہیں ہو رہا تھا۔ علماء عاجز آ گئے تھے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی باریک بینی اور دوررسی کی داد دیجیے۔ سر اٹھایا اور ایک چٹکی میں مسئلہ کا حل سامنے رکھ دیا، فرمایا:

۱...... صاحب واقعہ آج عصر کی نماز پڑھ لے۔

۲ نماز عصر سے فراغت کے بعد بیوی سے وطی (جماع) کر لے۔

۳ جب سورج چھپ جائے تو یہ شخص غسل کر لے۔ پھر مغرب اور عشاء کی نماز پڑھ لے۔ طلاق واقع نہیں ہوگی اور تینوں قسمیں بھی پوری ہو جائیں گی۔ (عقود الجمان: ۲۷۷، الموفق)

دیت کس پر؟

مجلس قائم تھی، دقیق فقہی مسائل زیر بحث تھے، سفیان ثوری قاضی ابن ابی لیلی کے علاوہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر ہمعصر علماء بڑے بڑے فقہاء اور جلیل القدر تلامذہ زیر بحث مسائل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص نے سوال کیا کہ:

کچھ لوگ مجلس بنائے بیٹھے تھے، اچانک ایک سوراخ سے سانپ نکلا اور حاضرین مجلس میں سے کسی ایک پر چڑھ آیا، اس نے دیکھا تو ہیبت واضطراب میں سانپ کو دوسرے شریک مجلس پر جھٹک دیا، دوسرے نے تیسرے پر اور تیسرے نے چوتھے پر جھٹک دیا اور چوتھے نے پانچویں پر جھٹکا، بدقسمتی سے پانچویں کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ اس کے ڈسنے سے مر گیا اب مسئلہ عدالت میں مر جانے والے کے ورثاء نے دیت کا مطالبہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ شرعاً دیت کون ادا کرے گا اور کس پر واجب ہوگی؟ فقہاء اکابر علماء اور ائمہ مجتہدین، قرآن وحدیث اور اپنی فقہی صلاحیتوں کے پیش نظر مختلف جوابات دیتے رہے، کسی نے کہا سب پر آئے گی۔ ایک نے کہا پہلے پر آئے گی دوسرے نے کہا آخری پر آئے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سب کی سنتے اور مسکراتے رہے، جب سب نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر پیش کر دیے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی رائے کے خواہاں ہوئے تو آپ نے فرمایا:

جب پہلے شخص نے سانپ کو دوسرے پر جھٹک دیا اور دوسرے آدمی اس کے ڈسنے سے محفوظ رہا۔ تو پہلا شخص بری الذمہ ہو گیا اسی طرح تیسرا بھی، مگر جب چوتھے نے پانچویں پر سانپ پھینک دیا اور وہ اس کے فوراً ڈسنے سے مر گیا تو دیت بھی اس شخص پر آئے گی۔ البتہ اگر چوتھے کے جھٹکنے کے بعد سانپ نے ڈسنے میں کچھ وقفہ کیا اور وقفہ کے بعد ڈسا تو چوتھا آدمی بھی بری الذمہ ہوگا کہ اصل میں مرنے والے نے سانپ سے اپنی حفاظت میں خود کوتاہی کی کہ جلدی سے کام نہ لیا۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کیا اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حسن فقہ کی تعریف کی۔ (دفاع امام ابوحنیفہ: ۱۴۳، بحوالہ عقود الجمان: ۱۶۹)

قرأت خلف الامام

مدینہ منورہ سے کچھ لوگ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان سے وجہ آمد

دریافت کی، تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ سے قرأت خلف الامام پر مناظرہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تم سب بیک وقت میرے ساتھ کیسے مناظرہ کروگے؟

ایک فرد ہوتا تو بات سنی جاسکتی تھی، یہ پوری جماعت ہے کس کس کی بات کو سمجھا جائے گا کس کس کی بات کا جواب دیا جائے گا۔ آپ سب اہل علم وفضل ہیں، بہتر ہوگا کہ اپنے میں ایک بڑے عالم کو منتخب کرلو، اور وہ مجھ سے بات کرے، چنانچہ انہوں نے ایک عالم کو منتخب کرلیا اور کہا یہ ہم سب میں بہت بڑا عالم ہے، یہ آپ سے قرأت خلف الامام پر مناظرہ کرے گا اور باقی ہم سب خاموش رہیں گے اور سنیں گے۔

امام صاحب نے ان سے کہا: اگر واقعۃً اس پر اس کا اعتماد ہے، تو پھر کیا اس کی ہار کو اپنی ہار سمجھو گے انہوں نے کہا ہاں!

تب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بس مناظرہ ختم ہوا اور فیصلہ ہوگیا، اس لیے کہ ہم نماز میں بھی امام کو اسی لیے تو منتخب کرتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"من کان لہ امام فقراء ۃ الامام قراء ۃ لہ"

جن کا امام موجود ہو تو امام کی قرأت ان کی قرأت ہوتی ہے۔ (دفاع امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: ۱۴۵)

فقیہ

فن تعبیر میں "تعبیر الرؤیا" مشہور کتاب ہے، جسمیں لکھا ہے کہ فقیہ، علم فقہ کا عالم حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی خواب میں دیکھے کہ فقیہ اور فاضل ہوا ہے اور اسکی بات خلقت کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول ہوئی ہے، دلیل ہے کہ شرافت اور بزرگی پائے گا اور اس کا نام ملک میں نیکی کیساتھ مشہور ہوگا۔

حضرت جابر مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر ان پڑھ آدمی اپنے آپکو خواب میں فقیہ دیکھے، دلیل ہے کہ وہ سخت گیر سپاہی ہوگا اور اگر اپنے آپ کو پورا عالم دیکھے، دلیل ہے کہ قاضی ہوگا۔ (تعبیر الرؤیا)

عالم

اگر جاہل شخص دیکھے کہ عالم یا فقیہ ہوا ہے، دلیل ہے کہ لوگ اس پر طعنہ کریں گے اور اسکا مذاق اڑائیں گے، اگر عالم یا فقیہ دیکھے، دلیل ہے کہ اسکا علم اور زیادہ ہوگا اگر دیکھے کہ قاضی یا حکیم یا خطیب یا عالم زندہ یا مردہ کسی خوفناک اور ترسناک جگہ سے گزر گیا ہے، دلیل ہے کہ وہاں لوگ امن میں ہونگے اور اُن کا بادشاہ عادل ہوگا۔

حضرت ابراہیم کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اگر دیکھے کہ لوگوں کو علم سکھاتا ہے، حالانکہ اہل علم سے نہیں ہے دلیل ہے، کہ اس سے بھاگے گا اور اگر عالم ہے تو عزت اور مرتبے پر دلیل ہے اگر دیکھے کہ کچھ لے کر علم پڑھاتا ہے، دلیل ہے کہ رشوت لے گا۔

حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ خواب میں عالم چار وجہ پر ہے۔

۱)دولت ۲)قاضی ۳)حکیم ۴)خطیب (تعبیر الرؤیا)

فائدہ عجیبہ

فقہ مالکیہ کی مشہور کتاب ''فیض الرحمن'' میں بحوالہ ''حیوۃ الحیوان'' مذکور ہے کہ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس پر مداومت کرے کہ جب جوتا پہنے تو پہلے دایاں اور پھر بایاں پہنے اور جب نکالے تو پہلے بایاں اور پھر داہنا نکالے، وہ تلی کے درد سے مامون رہے گا۔ (ثمرات الاوراق)

فائدہ فقہیہ

لہو ولعب اور گانے بجانے وغیرہ کی ایسی چیزیں جن کا استعمال شرعاً ناجائز ہے انکو گھر میں رکھنا بھی گناہ اور مکروہ ہے، اگرچہ انکا استعمال نہ کیا جاوے۔

لمافی خلاصة الفتاوی: ٤ /٣٣٨"ولو امسك فی بيته شيئا من المعازف والملاهی كره ويأثمه وان كان لايستعملها لان بامساك هذه الاشياء يكون اللهو عادةً" انتهی

ف: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گھر میں ایسی چیزیں رکھنا بھی مناسب نہیں جن سے گھر والوں کے اخلاق واعمال یا عقائد وغیرہ پر برا اثر پڑے اور اسی لیے فقہاء کرامؒ نے اہل باطل کی کتابوں کو اپنے گھر میں رکھنے سے منع کیا، یہ جزئیہ کتب فتاویٰ میں کہیں نظر سے گزرا ہے مگر اس وقت حوالہ یاد نہیں اور تتبع کی فرصت نہیں۔ (ثمرات الاوراق یعنی کشکول)

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعتی کے پاس بیٹھتا ہے اسکو حکمت نصیب نہیں ہوتی۔ (ایضاً)

حضرت ابوبکر دقاق رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابوبکر دقاق قدس سرہ، جو حضرت جنید کے اقران میں سے تھے، فرماتے ہیں: کہ ایک مرتبہ میں اس میدان میں سے گزر رہا تھا جہاں چالیس سال تک بنی اسرائیل قدرتی طور پر محصور تھے اور نکل نہ سکتے تھے جس کو وادی تیہ کہا جاتا ہے، اس وقت میرے دل میں خطرہ گذرا کہ علم حقیقت، علم شریعت سے مخالف ہے، اچانک غیب سے آواز آئی۔ **"کل حقیقة لاتتبع بالشريعة فهی كفرٌ"**

ترجمہ: جس حقیقت کی موافقت شریعت نہ کرے وہ کفر ہے۔ (ثمرات الاوراق یعنی کشکول)

حضرت امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مبسوط''

حضرت امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ امت کے ان ائمہ میں سے ہیں جن کے علمی احسانات تمام عالم اسلام

پرحاوی ہیں۔ آپ کے نام نامی اور جلالت قدر سے کوئی پڑھالکھا مسلمان ناواقف نہ ہونا چاہیے۔ آپ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خاص شاگرد اور خود امام مجتہد ہیں۔ آپ کی عظیم الشان اور کثیر التعداد تصانیف ہمیشہ مسلمانوں کے لئے مایہ ناز سمجھی جاتی ہیں اور فقہ حنفی کا تو مدار ہی تقریباً آپ کی تصانیف پر ہے۔ ان میں سے ایک مشہور ومعروف تصنیف ''مبسوط'' ہے جو ہزار ہزار صفحے کی چھ جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ علوم اسلامیہ کا یہ عظیم الشان ذخیرہ اب تک طبع نہیں ہوا۔ اور نوادر عالم میں سے سمجھا جاتا ہے۔

حال میں مخدومی واستاذی شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمہ اللہ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کتاب کے متعلق ایک عجیب واقعہ ڈھابیل سے تحریر فرما کر ''المفتی'' میں شائع کرنے کے لئے عطا فرمایا ہے، جو ھدیہ ناظرین کیا جاتا ہے، وھو ھذا۔

حال ہی میں ایک وسیع النظر بدیع الفکر عالم شیخ محمد زاھد بن الحسن الکوثری کا رسالہ بلوغ الامانی فی سیرت الامام محمد بن حسن الشیبانی مطبوعہ مصر ایک دوست نے ھدیہ بھیجا تھا۔ کل اس کا مطالعہ کرتے وقت نظر سے گذرا، بے ساختہ دل میں آیا کہ ''المفتی'' میں شائع کردیا جائے، لمبی چوڑی چیز نہیں ہے مگر بے حد موثر اور کیف آور ہے، امید ہے کہ آپ بھی محظوظ ہوں گے، مبسوط امام محمد کے تذکرہ میں حرف ڈیڑھ سطر کی عبارت ہے۔

"واسلم حکیم من اھل الکتاب بسبب مطالعۃ المبسوط ھذا قائلاً ھذا الکتاب لمحمد کم الاصغر فکیف کتاب محمد کم الاکبر"

یعنی علماء اہل کتاب میں سے ایک بڑے عالم اور حکیم نے امام محمد کی کتاب ''مبسوط'' کا مطالعہ کیا تو اس کتاب کے مطالعہ نے اس کے قلب میں حقانیت اسلام کا یقین پیدا کردیا اور کہہ کر اپنے اسلام کا اعلان کردیا کہ جب تمہارے محمد اصغر (محمد بن حسن) کی کتاب کا یہ حال ہے جو میرے مشاہدہ میں آئی تو محمد اکبر (رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتاب کا کیا حال ہوگا۔ (ثمرات الاوراق یعنی کشکول ۱۰۰)

اختلافات فقہاء میں حق ایک ہے یا متعدد؟

یہ ایک مشہور علمی مسئلہ ہے کہ جن مسائل میں ائمہ مجتہدین مختلف ہیں، ایک چیز کو ایک امام حلال قرار دیتا ہے اور دوسرا حرام، اور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ دونوں امام اہل حق ہیں اور ہر ایک مقلد کو اپنے اپنے امام کے قول پر عمل کرنا جائز بلکہ واجب ہے، تو بحث یہ کی جاتی ہے کہ کیا عند اللہ اس چیز کا حلال ہونا بھی حق ہے اور حرام ہونا بھی، یا حق ایک ہی ہے۔ اسی مسئلہ پر علماء وصول کی مفصل بحثیں ہیں۔ اور ایک مدت مدید تقریباً بیس سال کا عرصہ ہوا ہے کہ سیدی وسندی شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ صدر مہتمم دارالعلوم دیو بند نے اس موضوع پر ایک رسالہ ''ہدیہ سنیہ'' کے نام سے تحریر فرمایا تھا جو اس وقت شائع بھی ہو گیا تھا۔

حال ہی میں اس مسئلہ پر ایک فیصلہ کن تحریر امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی رسالہ ''بلوغ الامانی'' سے حضرت ممدوح نے لکھ کر از راہ شفقت عنایت فرمائی، یہ عبارت چونکہ اس اہم مسئلہ کا نہایت مکمل اور بہترین حل ہے اس لیے احقر نے مناسب سمجھا کہ ''ہدیہ سنیہ'' کی دوسری طباعت اور اس میں اضافے کا انتظار نہ

کروں بلکہ المفتی میں اس ترجمہ وشائع کردوں تاکہ ایک چیز وجود میں آجائے اور دوبارہ جب ہدیہ سنیہ طبع ہوتو اس وقت اس کا بطورِ ضمیمہ ملحق کردینا آسان ہوجائے، نیز تنہا عبارت بھی اس مسئلہ کے لیے کافی ہے اس لیے ناظرین محترمین اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

''ابن ابی العوام نے طحاوی سے اور انہوں نے سلیمان بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نقل فرمایا کہ امام محمد بن حسن نے ہمیں املاء لکھایا جس میں فرمایا کہ جب لوگ کسی مسئلہ میں مختلف ہوں ایک فقیہ ایک شے کو حلال قرار دے او دوسرا حرام قرار دے اور دونوں کو اجتہاد کا حق حاصل ہوتو صواب (حق) اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان دونوں میں سے ایک ہی ہے اور ائمہ کے نزدیک ایک ہی شے حلال اور حرام دونوں نہیں ہوسکتی بلکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی ہے اور مجتہد اس کا مکلف ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد کو اس میں خرچ کرے، تاکہ وہ اس حقیقت پر پہنچ جائے جو اللہ کے نزدیک حق ہے پس اگر اپنی رائے اور اجتہاد میں اس حق کو پہنچ جائے جو اللہ کے نزدیک حق ہے تو اس پر اس کو عمل کرنے کی بھی اجازت ہے اور وہ جس کام کا مکلف تھا اس نے وہ بھی ادا کردیا لیکن جو اللہ کے نزدیک متعین حق ہے، اس پر نہیں پہنچا تو جس چیز کا مکلف تھا وہ تو ادا کردیا اور مستحق ثواب ہوگیا۔ لیکن یہ درست نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ ایک امام نے ایک عورت کو حلال قرار دیا اور دوسرے نے حرام، اور اللہ کے نزدیک دونوں درست اور حق ہیں۔ بلکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی ہے البتہ قوم فقہا، اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوگئی کیونکہ وہ اپنے مقدور بھر اجتہاد کرچکی اس لیے ان کو اس پر عمل کرنا جائز ہوگا اگرچہ ان دونوں میں سے ایک نے ضرور حق مطلوب میں خطاء کی ہے مگر چونکہ وہ اپنی کوشش کو خرچ کرچکا ہے تو اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوگیا، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اس نے خطاء کی کیونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک تمام اشیاء میں حق ایک ہی ہے اور یہ سب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے۔ (ثمرات الاوراق یعنی کشکول: ۱۰۱)

اختلافِ صحابہ رضی اللہ عنہم رحمت ہے

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ہرگز یہ پسند نہیں کہ صحابہ کرام میں مسائل فرعیہ کا اختلاف نہ ہوتا کیونکہ اگر ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑجاتے یہ حضرات مقتداء اور پیشوا ہیں، جو شخص ان میں سے کسی کے مذہب کا عامل ہو، اس کے لیے گنجائش ہے۔ (ثمرات الاوراق یعنی کشکول: ۱۹۲)

اہل حق اور اہل باطل میں ایک خاص فرق

حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد اور جلیل القدر امام ہیں، فرماتے ہیں: کہ مصنفین اہل حق اور اہل باطل میں یہ فرق ہے کہ اہل حق جس باب میں تحریر کرتے ہیں اس باب کے متعلقہ سب روایات لکھتے ہیں خواہ وہ ان کے موافق ہوں یا کہ مخالف۔ اور اہل باطل صرف ان چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کے مذہب ورائے کے مطابق ہوں۔ (سنن دار قطنی)

فقیہ کون ہے؟

مطر وراق رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا آپ نے بتلا دیا۔ مطر رحمہ اللہ نے کہا کہ فقہاء اس مسئلہ میں آپ کے خلاف کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اے مطر! تم نے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے اور تم جانتے ہو کہ فقیہ کس کو کہتے ہیں۔ فقیہ وہ شخص ہے جو متقی اور زاہد اور دوسروں سے بڑھنے کی فکر نہ کرے اور اپنے چھوٹوں سے تمسخر نہ کرے۔ (ثمرات الاوراق ۲۳۵ بحوالہ طبقات)

خوش آواز قاری سے قرآن مجید سننے کا استحباب

امام حدیث حضرت علقمہ بن قیس جو اجلہ تابعین میں اور عبداللہ بن عباس کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے حق تعالیٰ نے تلاوتِ قرآن میں خاص خوش آوازی عطا فرمائی تھی اور حضرت عبداللہ بن مسعود مجھ سے قرآن مجید پڑھوایا کرتے تھے اور فرماتے تھے "اقرأ فداك أبي و أمي" یعنی میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں، قرآن مجید سناؤ! اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ "حسن الصوت تزین" خوش آوازی قرآن کی زینت بڑھا دیتی ہے۔ (ثمرات الاوراق یعنی کشکول ۲۴۰)

خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور شیخ عزالدین بن سلام کا فتویٰ

عزیزی نے السراج المنیر شرح الجامع الصغیر میں حدیث العجماء جبار کے تحت ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت شیخ عزالدین بن سلام کے زمانہ میں ایک شخص خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ فلاں جگہ جاؤ اور زمین کھودو اس میں خزانہ ہے، وہ تم لے لو، اور اس میں سے پانچواں حصہ (جو حسب قاعدہ شرعیہ گڑے ہوئے خزانہ کا زکوۃ ہے) بھی تمہارے ذمہ نہیں۔

صبح ہوئی تو یہ شخص اس مقام پر پہنچا زمین کھودی تو حسب ارشاد خزانہ نکلا اب اس شخص نے اس زمانے کے علماء سے استفتاء کیا کہ شرعی قاعدہ کے موافق مجھے اس میں سے پانچواں حصہ صدقہ کرنا چاہیے۔ لیکن خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وہ حصہ بھی معاف کر دیا ہے، اب میں کیا کروں؟

عموماً علماء نے فتویٰ دیا کہ تم اس قاعدہ سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہو تمہارے ذمہ خمس نہیں لیکن شیخ عزالدین بن سلام نے فرمایا کہ نہیں اس کے ذمہ واجب ہے کہ پانچواں حصہ نکالے کیونکہ خواب میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا درجہ اس حدیث کے برابر ہوگا جو اسنادِ صحیح کے ساتھ روایت کی گئی ہو، لیکن یہاں اس سے زیادہ اصح روایت اس کی معارض ہے، کیونکہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیث میں ہے "في الركاز خمس" اور یہ حدیث یقیناً اس خواب کی حدیث سے اصح ہے اور جب صحیح و اصح میں تعارض ہو تو عمل اصح پر کیا جائے گا۔ (السراج المنیر)

فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" اہل یورپ کی نظر میں

مسٹر عبداللہ بن یوسف علی ایم اے ایل ایل ایم نے اپنی کتاب "انگریزی عہد میں ہندوستان کے

تمدن کی تاریخ'' شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے صفحہ 63 میں لکھا ہے کہ مشہور سحر بیان مقرر اور مقنن اور اڈمنڈ برک نے فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب ''ہدایہ'' کے ایک خلاصہ کے فارسی ترجمہ کا انگریزی ترجمہ دیکھ کر جو الفاظ اس کتاب پر لکھے وہ یہ ہے کہ:

''اس کتاب میں دماغ کی بڑی طاقت نظر آتی ہے اور ایسا فلسفہ قانون ہے کہ جس میں بہت باریکیاں پائی جاتی ہیں۔''

یہ کتاب آج بھی برک کی اس تحریر کے ساتھ آکسفورڈ کی مشہور بوڈلین لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہے۔ برک کو اصل ہدایہ پڑھنے کی تو کیا نوبت آتی، انگریزی ترجمہ بھی اصل کتاب کا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کسی نے فارسی زبان میں ہدایہ کا خلاصہ تیار کیا اس خلاصہ فارسی کا انگریزی ترجمہ دیکھ کر برک نے یہ رائے قائم کی، اگر یہ برطانوی مفکر اور مقنن اصل کتاب ہدایہ کو دیکھ پاتا تو خدا جانے ''صاحب ہدایہ'' اور ''ہدایہ'' کی کتنی عظمت اسکے دل میں قائم ہوتی۔ (ثمرات الاوراق کشکول: ۲۷۵)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ زندہ ہوتے تو ان کی تقلید کرتا

ایک مولوی صاحب نے مولانا کی تقریر سن کر جوش میں آکر فرمایا کہ آپ کے پاس آکر تو حدیث بھی حنفی ہو جاتی ہے، مطلب یہ تھا کہ آپ تو ہر حدیث سے حنفیہ کی تائید فرما دیتے ہیں اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو اسکا جواب نہیں دے سکتے تھے، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ کیا کہا، اگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ زندہ ہوتے تو کیا میں ان کے سامنے بولتا بھی؟ اور بولتا تو کیا؟ میں تو ان کی تقلید کرتا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کو چھوڑ دیتا کیونکہ مجتہد حی کے ہوتے مناسب نہیں ہے کہ مجتہد غیر حی کی تقلید کی جائے اور فرمایا توبہ توبہ! حضرت امام اگر تشریف فرما ہوتے تو میرا یہ طالب علمانہ شبہ ہوتا اور حضرت امام اس کا جواب دیتے۔ اب اس وقت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ ان کے اقوال ہم لوگوں کے سامنے ہیں اور اپنے علم کے موافق ترجیح دے لیتے ہیں۔ (علمائے دیوبند کا تقویٰ: ۱۷)

مصافحہ کے وقت ہاتھ چومنا یا سینے پر رکھنا

بوقت مصافحہ اپنا ہاتھ چومنے یا سینہ پر رکھنے کی کوئی اصل اور کوئی حقیقت نہیں بلکہ جہالت اور اسلامی آداب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مکروہ تحریمی لکھا ہے۔

''و کذا ما یفعله الجهال من تقبيل يد نفسه اذا لقى غيره فهو مكروه اى تحريما'' (فتاویٰ عالمگیری: ۵/۲۴۴)

باپ کو جوتے مارنا جائز نہیں

ایک دفعہ مناظر اسلام حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ تین طلاقیں ایک مجلس کی سنت کے خلاف ہیں اس لیے واقع ہی نہیں ہوتیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے

فرمایا کہ باپ کو جوتے مارنے ناجائز ہیں لیکن اگر کوئی بدبخت مارے تو جوتے لگ جائیں گے یا نہیں؟ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۳۱)

مسائل بہشتی زیور کے، دعویٰ بخاری کا

حضرت رحمہ اللہ تقریر کے لیے ڈیرہ غازی خان تشریف لے گئے، تقریر ہوگئی، تو غیر مقلدین کتابیں لے کر آ گئے اور کہنے لگے: جانا نہیں ہم بات کریں گے۔ حضرت نے فرمایا: بات کرو بات کرنا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور ہمارے امام نے بھی ساری عمر بات ہی کی ہے۔ غیر مقلدین کہنے لگے کہ بات تو کرنی ہے مگر تجھ سے نہیں کیونکہ تو تو ماسٹر ہے۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر آپ قرآن میں دکھلا دیں کہ ماسٹر سے بات کرنا ناجائز ہے تو میں بات نہیں کروں گا، یا صحاح ستہ سے دکھا دیں تب بھی میں بات نہیں کروں گا۔ لیکن تمہاری طرف سے بھی عالم ہونا چاہیے جو بات کرے۔ اس نے کہا میں شیخ الحدیث ہوں۔ حضرت نے فرمایا ذرا نماز ظہر کی رکعات تو بتلا دیں کہ کتنی ہیں اور کیا کیا ہیں؟ لوگ حیران کہ یہ کیا گھٹیا سوال کر دیا ہے؟ اس نے کہا چار سنت، چار فرض، دو سنت، دو نفل، کل بارہ رکعات۔ حضرت نے فرمایا: یہ کہاں سے یاد کی تھیں؟ اس نے کہا: بخاری شریف سے۔ حضرت نے فرمایا: بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ بخاری شریف سے مجھے دکھلا دیں۔ حضرت رحمہ اللہ بخاری شریف اسکے آگے کرتے اور شیخ الحدیث صاحب پیچھے ہٹتے۔ حضرت نے فرمایا: کہ شاید ماسٹر سے بات کرنا تو گناہ ہو، لیکن بخاری شریف کو ہاتھ لگانا گناہ نہیں، اس کے ساتھی بہت پریشان ہوئے کہ یہ کیا راز ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ سولہ احادیث کے خلاف اس نے سنت کہا ہے حالانکہ ان احادیث میں تطوع کا لفظ ہے۔ یہ تو مجتہدین نے ہمیں بتلایا ہے کہ فرض کے علاوہ جس عمل پر حضور ﷺ نے مواظبت فرمائی ہو، وہ سنت ہوتا ہے اور جس پر مواظبت نہیں وہ نفل ہے۔ شیخ الحدیث نے کہا: واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے، رکعات یوں ہیں: چار نفل، چار فرض، دو نفل۔ ان کے ساتھی کھڑے ہو گئے کہ مولانا آپ سنتوں کا انکار کر رہے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ تمہارے گھر کی بات ہے۔ گھر جا کے کر لینا کیونکہ ابھی علم کا اتنا زور ہے کہ پہلے ہی سوال سے بوکھلا کر اس نے سنتوں سے انکار کر دیا ہے۔ اگر میں دوسرا سوال کر دوں تو حضرت کو فرائض بھی نظر نہیں آئیں گے۔ حضرت رحمہ اللہ نے سوال کیا: شیخ الحدیث صاحب! مسجد میں بیٹھے ہیں، سچ بتلانا کہ یہ رکعتیں کہاں سے یاد کی ہیں؟ فرمانے لگے: بہشتی زیور سے (جس کو دن رات گالیاں نکالتے ہیں)۔ ان کا ایک آدمی غصے میں کھڑا ہو گیا کہ بہشتی زیور بالکل غلط کتاب ہے اور خود رکعتیں بھی اسی سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: بھائی! لڑائی گھر جا کے کرنا لیکن اتنی بات ہے کہ آئندہ سچ بتلا دیا کریں کہ رکعتیں بہشتی زیور سے یاد کی ہیں بخاری شریف کا نام نہ لینا، کیوں بھائی یہ کوئی گالی تو نہیں؟ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۳۵)

تقلید کے سترہ ہزار دلائل

ایک پرچی آئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقط قرآن وحدیث پر عمل کرتے تھے۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: معاذ اللہ یہ جھوٹ ہے، یہ "لیتفقهوا فی الدین" کے خلاف ہے مصنف عبدالرزاق حدیث کی ایک کتاب ہے، اسمیں سترہ ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاوی موجود ہیں، نہ فتویٰ دینے والے نے دلیل نقل کی ہے نہ فتویٰ لینے والوں نے دلیل طلب کی۔ گویا ایک حدیث کی کتاب میں تقلید کے سترہ ہزار دلائل موجود ہیں۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ اور بے دینی ہے کہ اس نے اتنے فتاویٰ جات کا انکار کر دیا۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے:۴۶)

حنفیت کا ثبوت قرآن سے

ایک مرتبہ سوال ہوا، کیا حنفیت قرآن سے ثابت ہے؟ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا فطری طور پر ہر آدمی حنفی ہے ﴿اتبع ملة ابراهيم حنيفا﴾ اور مسلم شریف میں ہے "کلهم حنفاء" امام صاحب رحمہ اللہ نے حنفیت مرتب کی ہے اور ہم نے حنفیت میں ان کی اتباع کی ہے۔ (ایضاً:۴۷)

بیوی کبھی دیگر ضرورت مندوں کو بھی دے دیا کریں

ایک مرتبہ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ ایک غیر مقلد مولوی نے تقریر میں کہا: سنو! جو فرض اور سنت میں فرق نہ کریں وہ بے ایمان ہے، ایک آدمی نے کہا، حضرت! ہمیں فرق سمجھا دیں مولوی صاحب نے کہا فرض وہ ہے جس پر ساری عمر عمل کیا جائے اور سنت وہ ہے جس پر کبھی عمل کیا جائے اور کبھی چھوڑ دیا جائے۔ اگر کسی نے سنت پر ہمیشہ عمل کیا تو اس نے سنت کو فرض بنا دیا، لہذا وہ بے ایمان ہے۔ ایک نے سوال کیا کہ یہ فرق کس حدیث میں ہے؟ ایک نے پرچی لکھی کہ داڑھی سنت ہے یا فرض؟ اس نے کہا: ہے تو سنت۔ تو پرچی والے صاحب نے کہا آپ نے جب سے داڑھی رکھی ہے رکھ ہی چھوڑی ہے اس طرح سنت کو فرض کے برابر کر کے کیوں بے ایمان بن رہے ہیں؟ تیسرے نے کہا نکاح سنت ہے یا فرض؟ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "النکاح من سنتی" مولوی صاحب نے کہا: یہ بھی سنت ہے۔ اس آدمی نے کہا آپ نے جب نکاح کیا ہے بیوی اپنے پاس ہی رکھی ہوئی ہے اسکو بھی کبھی کبھی چھوڑ کر دوسرے ضرورت مندوں کو دے دیا کرو ورنہ یہ بھی فرض بن جائے گا اور تم بے ایمان ہو جاؤ گے۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ ان بے چاروں کو تو فرض اور سنت کا فرق بھی معلوم نہیں۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے:۴۷)

ایک غیر مقلد کی حق تلفی

ایک تقریر میں کسی نے پرچی بھیجی کہ تم کہتے ہو کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی تو وہ اپنی بیوی کے حقوق کس وقت پورے کرتے تھے؟ حضرت نے فرمایا: کہ شریعت نے حقوق زوجیت کے لیے دن اور رات کی کوئی پابندی نہیں لگائی، دوسری بات یہ ہیکہ حقوق کی عدم ادائیگی کی

شکایت تو ان کی بیوی کو ہونی چاہیے تھی اور اس نے شکایت کی نہیں، آپ کو کیوں شکایت ہے؟ کیا اس سے آپ کی حق تلفی ہوئی ہے، کہ ہم آپ کی شکایت دور کرنے کی کوشش کریں۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۵۳)

امام اعظم رحمہ اللہ کی فہم وفراست

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: امام صاحب رحمہ اللہ کے دور میں چوری ہوئی، اتفاق سے گھر والے کی آنکھ کھل گئی، اس نے چور پہچان لیے کہ یہ محلے کے آدمی ہیں۔ چور پریشان ہو کر کہنے لگے کہ اس نے پہچان لیا ہے، اس لیے یہ صبح ہمیں پکڑوا کر ہمارے ہاتھ کٹوا دے گا، صرف ایک صورت ہے کہ اسکو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دو، جب اس کے گلے پر انہوں نے انگوٹھا رکھا تو وہ منتیں خوشامدیں کرنے لگا کہ مجھے چھوڑ دو میں کسی کو بھی نہیں بتلاؤں گا، ایک نے کہا کہ تم قسم یوں کھا کر کہو میں تمہارے نام نہیں بتلاؤں گا ہم چھوڑ دیں گے، دوسرے نے کہا کہ نہیں یہ قسم کھالے گا پھر نام بتلا کر قسم کا کفارہ دے دے گا، لہذا یہ قسم یوں کھا کر کہے کہ اگر میں نے نام بتلائے تو میرے بیوی پر تین طلاقیں۔ گویا اس زمانے میں چوروں کو بھی پتہ تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں ورنہ کوئی دوسرا چور کہہ دیتا کہ فلاں جامعہ محمدیہ میں تین طلاق کے بجائے ایک طلاق کا فتویٰ مل سکتا ہے یہ وہاں چلا جائے گا۔ خیر وہ چور اس سے طلاق کی قسم اٹھوا کر مال لے کر چلے گئے صبح وہ آدمی جس مفتی کے پاس جاتا ہے وہ کہتا ہے یا بیوی رکھو یا سامان؟ ایک تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ وہ آدمی بہت پریشان ہوا، ایک آدمی نے مشورہ دیا کہ تم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس چلے جاؤ، وہاں تمہاری مشکل حل ہو جائے گی اس نے امام صاحب کے پاس جا کر پورا واقعہ سنایا، امام صاحب سن کر کہنے لگے: فکر نہ کرو، سامان بھی مل جائے گا اور بیوی بھی آپ کی ہی رہے گی اور چوروں کے ہاتھ بھی کٹ جائیں گے سائل نے پوچھا یہ کیسے ہوگا؟ امام صاحب نے فرمایا یہ میری ذمہ داری ہے امام صاحب نے تھانے دار کو بلا کر ساری واردات سنائی اور فرمایا چور محلے کے ہیں آپ محلے کے تمام بدمعاشوں اور مشتبہ لوگوں کو جمع کر لو پھر تفتیش کے لیے ایک ایک کو الگ الگ بلاؤ اس آدمی سے کہو جو اس کا چور نہ ہو یہ زور سے بولے کہ یہ چور نہیں ہے پھر جب اصل چور آجائے تو پوچھنے پر ہاں یا ناں کچھ نہ کہے تو پھر آپ کو پتہ چل جائے گا کہ چور یہی ہے اس نے ایسے ہی کیا تو چور پکڑے گئے مال بھی برآمد ہو گیا اور بیوی پر طلاق بھی نہ پڑی اور چوروں کے ہاتھ بھی کٹ گئے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۵۶)

بہشتی زیور اور غیر مقلد

حضرت رحمہ اللہ نے ایک آدمی کو سمجھایا کہ لامذہب غیر مقلدین کہتے ہیں کہ فقہ حدیث کے خلاف ہے آپ فقہ کی کوئی کتاب لے کر ایک ایک مسئلہ پر حدیث پوچھتے جائیں اوکاڑہ میں ایک آدمی بہشتی زیور لے کر غیر مقلد مولوی کے پاس چلا گیا اور کہا حضرت یہ کتاب صحیح ہے یا غلط؟ اس نے کہا ساری غلط ہے اس آدمی نے کہا کسی مسئلہ کو غلط نہ تم کہہ سکتے ہو نہ میں کسی مسئلے کو اگر غلط کرے گا تو قرآن کرے گا یا حدیث

رسول ﷺ، اس لیے اس کے مسئلہ پر ایک آیت یا حدیث سنادیں اور یہ سو روپیہ آپ کی فیس ہے آپ پیشگی لے لیں اس نے پہلا مسئلہ پڑھا اور کہا یہ حدیث کے خلاف ہے یا نہیں؟ لامذہب نے کہا کہ نہیں۔ اس آدمی نے کہا حضرت! پھر اس کے مطابق حدیث سنادیں مولوی صاحب ناراض ہو گئے اور کہنے لگے چلے جاؤ یہاں سے۔ اس آدمی نے کہا حضرت آپ سو روپیہ لے لیں اور حدیث سنادیں اللہ تعالیٰ آپ کو قیامت کے دن اجر عطاء فرمائیں گے اس نے کہا میں نہیں سناتا اس آدمی نے کہا اگر آپ فارغ نہیں تو میں کل عصر کے بعد آجاؤں گا۔ لامذہب نے کہا خبردار اگر تو دوبارہ آیا دوسرے دن وہ آدمی عصر کے بعد پھر چلا گیا مولوی صاحب نے اسے دیکھ کر دروازہ بند کر لیا۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۶۱)

تین ماہ میں سنت موکدہ کی تعریف یاد نہ ہو سکی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کئی سال گزرے حضرت اقدس صاحب سیف مولانا بشیر احمد پسروری خلیفۂ اعظم حضرت سلطان العارفین شیخ التفسیر قطب الارشاد حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ حیات تھے کہ مولوی محمد رفیق پسروری سے مناظرہ طے ہوا اس نے اپنا دعویٰ یوں لکھا کہ ماہ رمضان میں آٹھ رکعت تراویح باجماعت سنت موکدہ ہے۔ میں نے کہا کہ آپ تراویح یا سنت موکدہ کی تعریف فرمادیں لیکن صرف کتاب وسنت سے ہو، امتیوں کے اصول سے یا فقہ سے چوری نہ کریں ورنہ چوری کی سزا آپ کو معلوم ہے، آپ کا ایک ہاتھ تو پہلے ہی نہیں ہے دوسرا بھی کٹ جائے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ جو جو کام حضور ﷺ نے ہمیشہ کیے وہ سنت موکدہ ہے، میں نے کہا کہ یہ تعریف نہ جامع ہے نہ مانع ہے اور نہ ہی اسکا حوالہ قرآن وحدیث میں ہے۔ میں نے سب لوگوں سے پوچھا کہ بھائی آپ سب جانتے ہیں کہ پنجگانہ نماز کے لیے آذان بالاتفاق سنت موکدہ ہے جبکہ حضور ﷺ نے زندگی پھر ایک دفعہ بھی آذان خود نہیں پڑھی اس تعریف کے مطابق تو آذان سنت رہی نہ اقامت دوسری بات ہے کہ حضور ﷺ فرائض ہمیشہ ادا کرتے تھے یا نہیں؟ سب کہنے لگے کہ کرتے تھے میں نے کہا کہ پھر اس تعریف کے مطابق تو فرائض بھی سنت بن گئے بات چونکہ عام فہم تھی اس لیے لوگ سمجھ گئے کہ مولوی صاحب کو تو سنت وفرض کی تعریف بھی نہیں آتی اس پر مولوی صاحب نے تین ماہ کی مہلت مانگی تین ماہ تک وہ سنت موکدہ کی تعریف نہ یاد کر سکے اس لیے مجبوراً پولیس کو کہہ کر مناظرہ بند کرادیا۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے: ۱۱۳)

چار رکعات چار امام

ایک غیر مقلد نے حضرت سے پوچھا کہ تم ایک کی تقلید کیوں کرتے ہو؟ حضرت نے فرمایا: کہ جب تم عصر کی نماز پڑھو گے تو چاروں رکعت ایک ہی امام کے پیچھے پڑھو گے یا ایک رکعت کسی ایک کے پیچھے، دوسری رکعت کسی دوسرے کے پیچھے تیسری رکعت کسی تیسرے کے پیچھے اور چوتھی کسی چوتھے کے پیچھے او راسی طرح پہلے امام کو گالیاں دے کر دوسرے کے پیچھے لگ جاؤ گے، پھر دوسرے کو برا بھلا کہہ کر تیسرے

کے پیچھے لگ جاؤ گے اور پھر تیسرے کو صلوتیں سنا کر چوتھے کے اقتداء کرو گے۔ اگر ایک ہی کے پیچھے چاروں رکعات نماز ہو جاتی ہے تو ایک امام کی تقلید میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر امام نہ ہو تو جماعت ہی نہیں اس لیے ہمارا نام ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہے جو'' علیکم بسنتی وعلیکم بالجماعۃ '' کے عین مطابق ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۱۱۷)

ائمہ اربعہ میں اختلاف کی وجہ

ایک مرتبہ کسی نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ ائمہ اربعہ میں اختلاف کیوں ہے؟ فرمایا: انبیاء میں اختلاف کیوں ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں شریعتوں کا اختلاف ہے فرمایا: یہاں زمانوں کا اور علاقوں کا اختلاف ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں ناسخ منسوخ کا اختلاف ہے، فرمایا: یہاں راجح مرجوح کا اختلاف ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۱۳۳)

چار امام اور سات قاری

ایک غیر مقلد کہنے لگے مولوی صاحب میں بہت پریشان ہوں، حضرت نے پوچھا کیا پریشانی ہے؟ کہنے لگا چار امام ہو گئے چار چار۔ حضرت نے فرمایا: سات قاری ہو گئے سات سات۔ سات کا اختلاف بڑا ہے یا چار کا؟ جہاں سات ہیں وہاں تو آپ کو کوئی پریشانی نہیں یہاں صرف چار ہیں تو پریشانی کیوں؟ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۱۳۴)

چار امام

ایک غیر مقلد کہنے لگا مولوی صاحب! چار امام ہو گئے چار، ہم کدھر جائیں، حضرت نے فرمایا: کہ پریشان تو انکو ہونا چاہیے جہاں چار ہوں یہاں تو ہے ہی ایک، یہاں پریشانی کا کیا سوال؟ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۱۳۴)

ایک دلچسپ مکالمہ

ایک غیر مقلد صاحب جو اپنے کسی مدرسہ کے صدر مدرس تھے، ایک موقع پر ان سے بات چیت کے دوران میں نے دریافت کیا کہ جب آپ لوگ فقہ اور اصولِ فقہ کو مانتے ہی نہیں ہیں تو اپنے مدرسوں میں پڑھاتے کیوں ہیں؟ انہوں نے نہایت صفائی سے کہا کہ اصولِ فقہ کے بغیر قرآن وحدیث کے مطالب کا سمجھنا تو بڑی بات ہے صحیح ترجمہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور فقہ اس لیے ہم پڑھاتے ہیں کہ وہ اصول فقہ کے کارخانے کے ڈھلے ہوئے مال ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد صحیح اندازہ لگتا ہے کہ مال کس طرح ڈھالا جاتا ہے، میں نے کہا سچ سچ بتائیے کیا آج علماء اس سے بہتر مال ڈھال سکتے ہیں؟...... تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے اعتراف کیا کہ بہتر تو کیا اس کے برابر بھی نہیں ڈھال سکتے، میں نے کہا کہ جب بہتر بھی نہیں ڈھال سکتے اور اس کے برابر بھی نہیں ڈھال سکتے تو پہلے کے ڈھلے ہوئے مال کے قبول نہ کرنے کی

وجہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ حضرات اپنے عوام سے امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بجائے اپنی تقلید کرانا چاہتے ہیں۔ پیشوائی کی ہوس میں آپ حضرات اپنی قرار واقعی حیثیت تک بھول گئے۔ آپ حضرات نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسے نقاد، بالغ نظر اور مجتہد فی الحدیث امام جنہیں اسانید ورجال کی پوری تفصیلات کے ساتھ لاکھوں حدیثیں یاد تھیں، وہ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید سے اپنے آپ کو مستغنی نہیں سمجھ سکے اور آپ حضرات، بخاری شریف کو صرف الماریوں میں رکھ کر مجتہد بن گئے؟ (عجائب الفقہ ۴۵)

انسانی غیرت کا حیرت انگیز واقعہ

امام بیہقی رحمہ اللہ (م:458ھ) نے اپنی سند سے موسیٰ بن اسحاق قاضی کے زمانے کا ایک انتہائی غیرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ غیرت انسانی کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ جی چاہا کہ نذر قارئین کیا جائے، ہوسکتا ہے اس سے ہماری غیرت جاگ اٹھے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ایک مرتبہ موسیٰ بن اسحاق قاضی کی عدالت میں ایک برقع پوش خاتون نے اپنے شوہر پر پانچ سو اشرفی مہر کا دعویٰ کیا، شوہر مہر کی اس مقدار کا منکر تھا، عورت کے وکیل نے دعویٰ کے ثبوت پر دو گواہ پیش کیے۔ دونوں گواہوں میں سے ایک نے مطالبہ کیا کہ میں عورت کا چہرہ دیکھ کر گواہی دوں گا، چنانچہ گواہ چہرہ دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے یہ دیکھ کر شوہر کی غیرت کو جوش آگیا اور اس نے کہا کہ آخر کس وجہ سے میری بیوی پر اجنبی مرد کی نظر ڈلوائی جا رہی ہے؟ میں قاضی کے سامنے خود گواہی دیتا ہوں کہ میرے ذمے میری بیوی کے مہر کے پانچ سو دینار خالص سونے کے واجب ہیں، مگر میری بیوی اپنا چہرہ ہرگز نہ دکھائے گی، اس غیرت وحمیت کا عورت پر اس قدر اثر ہوا کہ اس نے اسی وقت وہ سارا مہر معاف کر دیا، یہ عجیب واقعہ دیکھ کر قاضی صاحب نے حکم دیا کہ اس واقعہ کو مکارم اخلاق کے یادگار واقعات میں درج کیا جائے۔'' (ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات: ۸۳)

یا اللہ! میری توبہ

میں مسلمان ہو کر آئندہ کبھی بھی تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں پر اور ٹخنوں سے نیچے نہیں کروں گا۔ کیونکہ

۱) ..... تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا، ان ناجائز کاموں میں سے ہے جو انگریز کے منحوس قدم ہمارے درمیان پہنچنے سے پہلے مذہبی نشان اور قومی روایات کے خلاف سمجھے جاتے تھے، اور اب انکی طرف ترقی اور فیشن سمجھ کر تمام لوگ قدم بڑھا رہے ہیں۔

۲) ..... تہبند، ساڑھی، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا ایسا ناجائز فعل ہے جس کی ممانعت کے متعلق تقریباً بخاری شریف میں آٹھ، مسلم شریف میں گیارہ، ابوداؤد شریف میں سات، نسائی شریف میں گیارہ

،ترمذی شریف میں تین ،ابن ماجہ شریف میں سات ،موطاامام مالک میں چار ،الترغیب والترھیب میں پانچ حدیثیں آئی ہیں۔حدیث شریف کی باقی کتب میں اس کے علاوہ حدیثیں موجود ہیں۔

۳) تہبند،شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنے کی برائی کے متعلق بموجب فرمان امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (جامع ترمذی کے صفحہ 303 جلد اول میں) آٹھ صحابہ (یعنی حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ، حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضرت وہیب بن مغفل رضی اللہ عنہ سے احادیث مروی ہیں۔

۴) تہبند،شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا تکبر اور خود پسندی کی وجہ سے ہوتا ہے۔تکبر اور خود پسندی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ابوداؤد 207 جلد دوم فتح الباری 315 جلد دہم ،اسلیے میں تہبند،شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرکے اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کروں گا۔

۵) کپڑا،تہبند،شلوار (وغیرہ) نیچے کرکے چلنے والوں کی طرف اللہ تعالیٰ (رحمت سے) نظر نہیں کریگا۔(یعنی) اسکے اوپر رحمت نہیں کریگا ،بخاری شریف 260 جلد دوم۔اگر مجھ پر اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت نہ کرے تو پھر میرے لیے کیا رہا۔

۶) تہبند(شلوار وغیرہ) کا جو حصہ ٹخنوں (پیر یا ٹخنوں) سے نیچے ہوگا وہ (پاؤں کا حصہ) آگ میں ہوگا۔بخاری 216 جلد دوم ،یا اللہ میری توبہ ،جب کہ میں دنیا کے اندر گرمی کے موسم میں دھوپ میں ننگے پاؤں گھوم نہیں سکتا تو پھر دوزخ کی آگ کیسے برداشت کرسکوں گا۔

۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ایک آدمی تہبند ٹخنوں سے نیچے کرکے گھوم رہا تھا تو اسکو زمین میں دھنسایا گیا اور وہ تاقیامت زمین سے نیچے رہے گا۔بخاری شریف 861 جلد دوم ،مسلم شریف 195/2 ،یا اللہ میری توبہ ،میں پھر ایسا کام نہیں کروں گا ،جس کی وجہ سے دنیا میں ہی عذاب میں گرفتار ہوجاؤں۔

۸) تہبند،شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا ایسا غلط کام ہے ،جس کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: کہ (1) ایسے آدمی سے اللہ تعالیٰ قیامت میں (رحمت سے) بات نہیں کریگا (2) نہ رحمت سے نظر کرے گا (3) نہ گناہوں سے پاک کریگا (4) اسکے لیے دردناک عذاب ہے۔مسلم 71/1۔اگر میں اب بھی تہبند،شلوار وغیرہ ٹخنوں سے اوپر نہ کروں پھر تو میں بڑے نقصان اور خسارے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔

۹) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری تہبند تھوڑی سی نیچے تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! اپنی تہبند اوپر کر۔میں نے اوپر کی ،پھر آپ نے فرمایا اور بھی اوپر کر۔لہذا اس دن کے بعد تہبند کا نیچے ہونے سے (خاص) خیال کرتا ہوں اور آدھی پنڈلی پر باندھتا ہوں۔مسلم شریف 195/2 ،میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فرمانبردار ہوں۔نافرمان نہیں ،اس لیے آئندہ شلوار وغیرہ پنڈلیوں سے نیچے نہیں کروں گا۔

۱۰)...... حضور اکرم ﷺ نے حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنی تہبند آدھی پنڈلی تک اوپر کر، اگر نہیں مانتا تو پھر ٹخنوں سے اوپر تک رکھ، البتہ ٹخنوں سے نیچے کرنے سے بچ۔ کیونکہ تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا خود پسندی اور تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اللہ میاں کو تکبر اور خود پسندی محبوب نہیں لگتی۔ ابوداؤد 208/2، اگر میں نے اب بھی تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے اوپر نہیں کی تو پھر میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی مخالفت اور اللہ تعالیٰ کا غصہ اختیار کر کے کیسے مسلمان کہلواؤں گا؟

۱۱)...... تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا ایسا بد فعل ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایسے آدمی سے دوبارہ وضو دہرایا تھا، آپ ﷺ سے دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ آدمی تہبند ٹخنوں سے نیچے کر کے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ ٹخنوں سے تہبند نیچے کر کے نماز پڑھنا قبول نہیں فرماتا۔ (ابوداؤد: ۲۰۹/۲)

۱۲)...... تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا ایسا بدترین گناہ ہے جو آدمی کو جنت کی خوشبو سے بھی محروم کر دے گا۔ حالانکہ بہشت کی خوشبو ایک ہزار سال کی مسافت سے آتی ہے۔

(طبرانی فی الاوسط بحوالہ الترغیب والترہیب: ۹۱/۳)

۱۳)...... تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا ایسا حرام کام ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو تہبند ٹخنوں سے نیچے دیکھ کر شرماتے ہوئے فرمایا کہ "کیا تو حیض والا ہے" اس پر وہ بولنے لگا۔ کیا مرد کو بھی حیض آتا ہے؟ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تہبند ٹخنوں سے نیچے کرنا عورتوں کا کام ہے اس سے معلوم ہوا کہ تو بھی عورت ہے۔

۱۴)...... تہبند، اور شلوار وغیرہ ٹخنو سے نیچے کرنا ایسا گناہ کا کام ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اوپر قاتلانہ حملہ (صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے) ہوا تھا اور وہ شدید زخمی ہو گئے تھے، شدید زخمی حالت میں ایک آدمی کا تہبند ٹخنوں سے نیچے دیکھ کر **"نہی عن المنکر"** (برائی کے روکنے) کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اس کو فرمایا: اے بھتیجا! (دینی لحاظ سے) اپنا کپڑا (ٹخنوں سے) اوپر کر۔ (بخاری شریف: ۵۲۴)

۱۵)...... تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے اوپر کرنے کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ ٹخنوں سے کپڑے اوپر کرنے سے کپڑا زیادہ پاک رہتا ہے، زیادہ دیر تک چلتا ہے اور اس میں تقویٰ زیادہ ہے۔ (بخاری شریف: ۸۴۴)

بہرحال میں اپنا کپڑا خواہ مخواہ نجاست میں آلودہ نہیں کروں گا اور نہ تو اپنا کپڑا پیروں میں گھسیٹ کر جلدی میں ختم کر دوں گا۔ اور نہ تقویٰ کے خلاف کرنا چاہتا ہوں۔

۱۶)...... سنن دارمی شریف صفحہ نمبر 16 میں نبی کریم ﷺ کی امت کی نشانی اور وصف بیان شدہ ہے کہ آپ کی امتی تہبند اور شلوار آدھی پنڈلیوں پر باندھیں گے۔

ابھی بھی اگر تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کروں تو پھر اگلی کتابوں میں بیان شدہ نشانیوں کے موافق میں نبی کریم ﷺ کا امتی کیسے ہوسکوں گا۔

۱۷) شب برات کی رات کو عام معافیٔ خداوندی کے باوجود تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنے والے کی بخششیں نہیں ہوتیں۔ تو پھر میں کتنا بڑا بدبخت کہلاؤں گا کہ باوجود عام معافی والی رات کے میری معافی نہ ہو۔

۱۸) نماز میں اکڑ اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے تہبند ٹخنوں سے نیچے کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ حل میں ہے (یعنی نہ اس کے گناہ بخشے جائیں گے، نہ بہشت میں داخل کیا جاوے گا، اور نہ حلال اچھے کاموں میں ہوگا، نہ حرام میں ہے (یعنی نہ غلط کاموں سے محفوظ رکھا جائے، نہ اس پر جہنم حرام کیا جائے گا، نہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اسکی عزت ہوگی۔ (ابوداؤد شریف ۱/ ۹۳)

۱۹) نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ: مومن کا تہبند باندھنا دونوں پنڈلیوں کے آدھ تک ہے۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ شریف ۲/ ۳۷۴)

میں تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کر کے کس منہ سے اپنے آپ کو مومن اور مسلمان کہلانے کا مستحق ہوسکوں گا۔

۲۰)...... تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنا، نبی کریم ﷺ کے اتنے سارے فرمودات کی مخالفت کی وجہ سے فسق ہے۔ اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس کا لوٹانا ضروری ہے۔ اس لیے تہبند، ساڑھی، شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنے والے امام کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کا دہرانا لازم اور واجب ہے۔

۲۱)...... اس کی اپنی نماز بھی مکروہ تحریمی ہے۔

۲۲)...... اسکا امام ہونا بھی مکروہ تحریمی ہے۔

۲۳)...... اس کا اذان اور تکبیر کہنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔

چوری کرنا، قتل کرنا، ڈاکہ ڈالنا، زنا کرنا، شراب پینا، جوا کھیلنا، سود کھانا سب گناہ ہیں، جب تک آدمی ان کاموں کا مرتکب ہے پھر بس۔

لیکن تہبند، ساڑھی شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کرنے والا اگر سویا ہوا ہے، تب بھی اس گناہ میں ہے، اور بیدار ہے تب بھی اس گناہ میں ہے، اور جہاد جیسا افضل ترین عمل کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور علم پڑھنے کے لیے گھر سے نکلا ہے، لیکن فرمان نبوی ﷺ کے موافق اس گناہ میں ہے اور "خیر کم من تعلم القرآن وعلمه" کا عمل کر رہا ہے (یعنی دینی تعلیم حاصل کر رہا ہے یا تعلیم دے رہا ہے) تب بھی اس گناہ میں ہے اور قرآن شریف کی تلاوت کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور مسجد میں ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور ذکر کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور خانہ کعبہ جہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے وہاں نماز پڑھ رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے، قرآن شریف کی تلاوت کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور مسجد میں ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور ذکر کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور منیٰ میں قربانی کر رہا ہے تب بھی اس

گناہ میں ہے اور صفا اور مروہ پر دوڑ رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور شیطانوں کو پتھریاں مار رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور مزدلفہ میں وقوف کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے نفل پڑھ رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور ملتزم سے چپٹا ہوا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور حجر اسود کو بوسہ دے رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور عرفات میں رو رو کر گناہوں کی مغفرت طلب کر رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور روضۂ اطہر پر صلوٰۃ وسلام پڑھ رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جہاں ایک نماز کا ثواب ۵۰ ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور نماز پڑھ رہا ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور ہوش کی حالت میں ہے تب بھی اس گناہ میں ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہے تب بھی اس گناہ میں ہے۔

یا اللہ! میں توبہ کرتا ہوں، معافی مانگتا ہوں کہ آئندہ پھر کبھی بھی تہبند، شلوار وغیرہ ٹخنوں پر اور ٹخنوں سے نیچے نہیں کروں گا۔

نہ دیکھیں گے نہ دیکھیں گے انہیں ہر گز نہ دیکھیں گے
کہ جن کو دیکھنے سے رب مرا ناراض ہوتا ہے
نہیں ناخوش کریں گے رب کو اے دل تیرے کہنے سے
اگر یہ جان جاتی ہے خوشی سے جان دے دیں گے

(ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات:۴۱)

احکام اسلام عقل کی نظر میں

چونکہ دین اسلام کا مدار اور معیار اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور عقل پر اسلام کا دارومدار نہیں ہے، نیز حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ایسے عقل پرستوں کے سوالوں کا جواب بھی بہت کم دیا کرتے تھے اور ایسے علماء کو بھی کوستے رہتے تھے جو عقل پرستوں کے سوالات کا جواب دیں اسی بناء پر ایک مرتبہ فرمایا۔

علماء کے اخلاق نے عوام کے اخلاق کو بگاڑ دیا اگر کسی نے حکمتیں پوچھنی شروع کر دیں تو بس انہوں نے بھی حکمتیں بیان کرنا شروع کر دیں، اس کے بعد کہیں اس میں شبہ، اگر کسی قانونی مولوی سے کوئی حکمتیں پوچھے تو وہاں صاف جواب ملے گا کہ حکم پوچھو، حکمت نہ پوچھو ایک شخص نے مجھے لکھا کہ فلاں حکم شرعی میں کیا حکمت ہے؟ میں نے پوچھا کہ آپ کے حکمت کے سوال کرنے میں کیا حکمت ہے؟ تم خدا تعالیٰ کے فعل کی ہم سے حکمت پوچھتے ہو، ہم تمہارے ہی فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں اور ہم نہیں بتلاتے کہ کیا حکمت ہے۔

کیرانہ کا قصہ ہے کہ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ نماز پانچ وقت کیوں مقرر ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری ناک آگے کیوں لگی؟ یہ سن کر بڑے دنگ ہوئے اور کہنے لگے کہ اللہ میاں نے ایسی ہی بنادی، میں نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ نماز بھی میرے ابا جان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، یہ بھی اللہ میاں کی بنائی ہوئی ہے اگر اسرار جاننے کا شوق ہے تو خدا کے ہو جاؤ پھر یہ حالت ہوگی کہ

بنی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید واوستا

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت، عظیم حکیم الامت تھےاور ہر بات کی حکمت ان کے ذہن میں ضرور ہوگی لیکن اس واقعہ میں سائل کا جواب نہ دیا اس وجہ سے کہ اگر ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو پھر قرآن وحدیث کی وقعت نہیں رہے گی اور عقلیات میں لوگ پڑ جائیں گے۔لوگوں کا اس بات سے بچنے کے لیے اس سائل کا جواب نہیں دیا اور علماء کرام کو بھی اس جھنجھال سے بچنے کی ترغیب دی پھر ایسے عقل کے پجاریوں کو تو الزامی جواب دینا چاہیے جیسے کہ حکیم الامت رحمہ اللہ نے حکیمانہ جواب دیا۔

حکیم الامت رحمہ اللہ صاحب نے مزید یہ بھی فرمایا کہ ایک مجذوب صاحب کا قول مجھے پسند آیا،ان سے کسی واقعہ کی نسبت پوچھا گیا،کب ہوگا؟اس نے کہا ہم اللہ میاں کے بھتیجے نہیں کہ چچا جان نے یہ کہا کہ آؤ بھتیجے سے بھی مشورہ کرلیں۔

ریاکاروں کا امتحان

فرمایا کہ جو بار بار جھک کر سلام کرتا ہو،ہر شخص سے "آپ" اور "جناب" سے بات کرتا ہو کہ میں نالائق ہوں،اس کا ایک امتحان بتاتا ہوں کہ جس وقت وہ یہ کہے کہ میں نالائق ہوں اس وقت آپ ذرا کہہ دیجیے،ہاں صاحب!واقعی آپ تو نالائق ہیں پھر دیکھیے وہ کتنا ناچتے ہیں امید ہے کہ ساری عمر کے لیے دشمن ہوجائیں۔

حضرت رحمہ اللہ کی حکمت کا مظاہرہ کیجیے کہ کیسے عجیب انداز سے ریاکاروں کا امتحان بتلایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسا آدمی پھر ایسی بات نہیں کہے گا۔

علمائے عظام سے سنا تھا کہ کسی آدمی کے سامنے اس کی تعریف کرنا اس طرح ہے گویا اس کے منہ کو آپ مٹی سے بھر رہے ہو،اس سے پتہ چلا کہ کسی کی تعریف اس کے سامنے نہیں کرنا چاہیے۔لیکن جب ایک شخص کی اس طرح عادت ہوجائے کہ وہ منہ پر تعریف کرتا ہے اس کا علاج حکیم صاحب یہ بتلاتے ہیں۔

فرمایا:کہ اگر منہ پر تعریف کرے تو اس تعریف سے نہ انکار کرو،نہ اس کو منع کرو کیونکہ اس سے وہ زیادہ تعریف کرے گا اور دوسرے بھی تمہارے معتقد ہوجائیں گے بلکہ (علاج یہ ہے) خاموش رہو،وہ اپنا سا منہ لے کر خاموش ہوجائے گا۔

فرمایا:ایک دلیل وجود صانع کی میری چھوٹے ماموں صاحب نے ایک دہری اسکول انسپکٹر سے بیان کی،وہ خدا تعالیٰ کے وجود کا منکر تھا،اس نے طلبہ سے خدا تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا۔انسپکٹر صاحب سے چھوٹے ماموں نے کہا کہ یہ مضمون بچوں کے کورس میں نہیں ہے اگر ایسا ہی شوق ہے تو مجھ سے پوچھیے اس نے غصہ سے کہا کہ اچھا آپ بتلائیے ماموں صاحب نے فرمایا خدا وہ ہے جس نے آپ کو معدوم سے موجود کیا،کہنے لگا ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے بنایا ہے۔اس منطقی دلیل کو ہم نہیں مانتے،ہم تو سیدھی بات جانتے ہیں کہ اگر خدا کوئی چیز ہے ہماری ایک آنکھ اندھی ہوگئی ہے اس کو درست کردے یہ انسپکٹر

یک چشم تھا ماموں نے مذاقاً فرمایا: "کان من الکافرین" (یعنی کانا تھا کافروں میں) ماموں صاحب بڑے ظریف بھی تھے۔

فرمایا: اچھا میں ابھی خدا تعالیٰ سے عرض کرتا ہوں اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر لبوں کو حرکت دی پھر کان آسمان کی طرف کیا۔ پھر فرمانے لگے میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو اس کی دو آنکھیں بنائی تھیں مگر اس نے کفر اختیار کیا اور ہمارے وجود کا انکار کیا اس لیے ہم نے غصے میں آکر ایک آنکھ پھوڑ دی اب میں ہرگز نہ بناؤں گا، اب اس سے کہو کہ اس آنکھ کو انہی ماں باپ سے بنوالے جنہوں نے اس سارے کو بنایا ہے، واقعی۔

یہ جواب سن کر وہ انسپکٹر جھلا ہی تو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن سکا۔

لفظ ''قرنی'' کا نکتہ

ایک مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طالب علم کا یہ واقعہ ذکر فرمایا کہ ایک طالب علم نے لفظ ''قرنی'' میں بیان کیا کہ اس لفظ میں خلفاء اربعہ کی ترتیب خلافت کی طرف اشارہ ہے، اس طرح کہ لفظ ''قرنی'' میں ہر خلیفہ کے نام کا اخیر حرف موجود ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ''ق'' ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ''ر'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ''ن'' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ''ی'' اور اسی قسم کا ایک لطیفہ شعر کے انداز میں ذکر فرمایا۔

ابوبکر ایک سو علی ایک جانب — خلافت کو گھیرے ہیں باصد صفائی
الف اور یاء کی طرح ان کو جانو — کہ محصور ہے جن میں ساری خدائی
یہ تشبیہ ہے واقعی تو نایاب بھی — الف اور یاء نے یہ ترتیب پائی
وہ اول خلیفہ کے اول میں آیا — یہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

آدمی کی قسمیں

ایک شخص نے حضرت والا سے یہ دریافت کیا کہ کوے کی کتنی قسمیں ہیں؟ تو فرمایا مجھ کو معلوم نہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو آدمی کی قسمیں بیان کردوں اور یہ بھی عرض کردوں کہ آپ کونسی قسم میں داخل ہیں یہ شخص تو ایسے خاموش ہوئے کہ بول کر نہیں دیا۔

فرمایا: آدمی چار قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہے کہ اس میں عقل بھی ہے اور ہمت بھی ہے اور ایک وہ ہے جس میں ہمت اور عقل نہ ہو۔ اور ایک وہ ہے جس میں عقل ہو اور ہمت نہ ہو، اور ایک وہ ہے، جس میں ہمت ہو اور عقل نہ ہو۔

حدیث شریف میں اچھے سوال کو نصف علم کہا گیا ہے لیکن جو لغو سوالات کرے اور بے مقصد سوالات کرے تو اس کا علاج حکیم الامت نے بتلا دیا جیسا کہ ابھی گزرا اور ایسا لغو سوال کرنے والا مذکورہ اقسام میں سے آخری قسم میں داخل ہے۔

آدمی چار قسم کے ہیں

خلیل بن احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آدمی چار قسم کے ہیں:

۱) ایک وہ جو خوب جانتا ہے اور جانتا ہے کہ کم جانتا ہے، یہ عالم ہے اس سے پوچھو، اسکی پیروی کرو۔
۲) دوسرا وہ ہے جو نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ نہیں جانتا، یہ جاہل ہے اسے سکھاؤ۔
۳) تیسرا وہ ہے جو جانتا ہے مگر نہیں جانتا کہ جانتا ہے یہ غافل ہے، اسے ہوشیار کرو۔
٤) چوتھا وہ ہے جو نہیں جانتا مگر بدقسمتی سے نہیں جانتا کہ نہیں جانتا یہ غبی واحمق ہے اس سے بچو، دور بھاگو۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''جو خدا سے ڈرتا ہے وہی فقیہ ہے''۔ (شاہراہ علم ۵۰)

لفظ ''اعیاھما'' کی تجویز

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو چونکہ حکیم الامت کا لقب ملا ہے، اس لیے انہوں نے معراج شریف کے واقعہ میں آسمانوں پر انبیاءؑ کی ترتیب، عجیب انداز سے بیان کی اور اس ترتیب کو لفظ ''اعیاھما'' میں جمع کر دیا ہے۔

فرمایا میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے ناموں کے ذریعہ، کہ پہلے آسمان پر کون ہے اور دوسرے پر کون؟ سہولت کے لئے ''اعیاھما'' کا لفظ تجویز کیا۔ الف سے حضرت آدم علیہ السلام پہلے آسمان پر، عین سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوسرے آسمان پر اور چونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام انکے بھائی ہیں وہ بھی انکے ہمراہ ہیں، اس واسطے انکو بھی انکے ساتھ ملا دیا۔ ی سے حضرت یوسف علیہ السلام تیسرے آسمان پر، الف سے حضرت ادریس علیہ السلام چوتھے آسمان پر ھا سے حضرت ھارون علیہ السلام پانچویں آسمان پر، م سے حضرت موسیٰ علیہ السلام چھٹے آسمان پر اور الف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر جو سب سے اوپر ہیں۔ اس ترتیب سے ایک تو حضرتؒ کی حکمت ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے بیان کرنے کے لئے آسانی ہوتی ہے۔

تصنیفات کی دنیا

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیفات میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں ہے ایک قول کے مطابق حضرت کی تصنیفات کی تعداد نوسو (900) سے اوپر ہے اسکو شاعر نے اپنے شعر میں جمع کر دیا ہے۔

میدان صحافت میں بھی سبقت لے گیا سب پر
کہ نوسو تک پہنچ جاتا ہے تصنیفات کا نمبر

دوسرے قول کے مطابق آپ کی تالیفات ایک ہزار سے زائد ہیں، اس تعداد پر ایک دلچسپ لطیفہ ملاحظہ فرمائیں۔

ایک صاحب نے حضرت کی تصانیف کا ذکر کیا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی تصنیفات فرمائی ہیں تو ہزاروں کتابیں دیکھی ہوں گی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا: ہاں چند کتابیں دیکھی جن کے نام یہ ہیں۔

حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، ان کتابوں

نے مجھے دوسری سب کتابوں سے بے نیاز بنا دیا۔ شاید ایسے ہی حضرات کے متعلق کسی کا شعر ہے۔

وانـت الـكـتـاب الـمـبـيـن ☆ الـذی باحرفه يظهر المضمر

تو ہی وہ واضح کتاب ہے جس کے حروف سے مخفی مضامین ظاہر ہوتے ہیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے بارے میں کسی نے یہ شعر بھی کہا ہے:

مرقع ہے حدیثوں کا الٰہیات کا دفتر
ہمارے واسطے چھوڑا ہے کیا پاکیزہ لٹریچر

آخر میں عرض ہے کہ کیا لکھیں گے اور کہاں تک لکھیں گے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حکیمانہ اقوال پر تو دفتر کے دفتر بھرے جاسکتے ہیں، لیکن اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے آخر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے عرض کرتا ہوں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم آفشانی کرے ☆ سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات: ۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ عام الفیل میں ہوئی تھی۔ اس بات پر سب ہی حضرات مؤرخین متفق ہیں جیسا کہ مشہور مؤرخ و محدث حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (البدایہ والنہایہ: ۳۲۱/۲)

کون سے ماہ میں پیدائش ہوئی تھی، اس سلسلہ میں کل چھ اقوال ہیں۔ (۱) محرم (۲) صفر (۳) ربیع الاول (۴) ربیع الآخر (۵) رجب (۶) رمضان (شرح الزرقانی علی المواهب: ۱۳۰/۱)

البتہ جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ماہ ربیع الاول میں ہوئی ہے۔ (البدایہ لابن کثیر: ۳۱۹/۲) مشہور محقق علامہ محمد زاہد کوثری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ربیع الاول کے علاوہ کسی مہینہ کا قول یہ علمائے ناقدین کے نزدیک سبقت قلم کے قبیل سے ہے۔ (مقالات الکوثری: ۴۰۵)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت دوشنبہ (پیر) کے دن ہوئی تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن دوشنبہ ہونا بالکل غیر متنازع فیہ اور متفق علیہ بات ہے۔ (البدایہ: ۳۱۹/۲) صحیح مسلم میں ہے: حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوشنبہ کے روزہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس دن میں میری ولادت ہوئی تھی اور اس دن میں مجھ پر (سب سے پہلی) وحی نازل ہوئی تھی۔

ماہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ میں آپ کی پیدائش ہوئی تھی؟ بعض علماء لکھتے ہیں کہ اس بارے میں کسی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا ہے جبکہ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ تاریخ معین ہے پھر وہ معین تاریخ کون سی ہے؟ شارح صحیح بخاری علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں کل سات اقوال ذکر فرمائے ہیں۔ (۱) دوم ربیع الاول (۲) آٹھویں ربیع الاول (۳) دسویں (۴) بارھویں (۵) سترھویں (۶) اٹھارھویں (۷) بائیسویں

(المواھب مع شرح الزرقانی ۱/۱۳۱)

علامہ کوثری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ آٹھویں تاریخ کے ختم ہونے کے بعد یعنی نویں تاریخ، دسویں تاریخ اور بارھویں تاریخ کے علاوہ دیگر چار اقوال قابل التفات اور قوی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کسی شمار میں نہیں ہیں۔ تو اب کل بحث کا محور ان تین روایات واقوال میں سے راجح کی ترجیح ہے۔ اس بارے میں غور وفکر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دسویں تاریخ کی روایت کو ابن سعد نے طبقات میں محمد باقر رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس کی سند میں تین راوی متکلم فیہ ہیں۔ اس لیے دس کی روایت قابل ترجیح نہیں ہے جبکہ بارھویں تاریخ کے قول کو محمد بن اسحٰق نے نقل کیا ہے لیکن اس کی سند بیان نہیں ہوئی ہے جیسا کہ مستدرک حاکم میں واقع ہوا ہے لہٰذا اس روایت کا حال ان روایات کی طرح (ناقابلِ اعتبار) ہے جن کی اسناد نہ ہوں البتہ نقلی اعتبار سے آٹھویں تاریخ کے ختم ہونے پر یعنی نویں تاریخ میں پیدائش ہونے کو ترجیح حاصل ہے، اور عقلی اعتبار سے بھی یہی تاریخ متعین ہے جیسا کہ فن ریاضی کے بہت بڑے عالم علامہ محمود پاشا فلکی مصری کی کتاب "تقویم العرب قبل الاسلام" میں مشرق ومغرب کے کئی ایک فلکی ماہرین کے اقوال کو مدنظر رکھ کر کی گئی تحقیق سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں ۱۰ھ ماہِ شوال کی آخری تاریخ کو سورج گہن ہوا تھا (اسی دن آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا) اس حساب سے اگر پیچھے شمار کیا جائے تو آپ ﷺ کی پیدائش ربیع الاول کی نویں تاریخ کو ہونا ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ پیر کا دن یوم پیدائش ہونا تو متفق علیہ ہے اور وہ عام الفیل کی ماہ ربیع الاول کی نویں تاریخ ہی کو آتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نقلاً وعقلاً آپ ﷺ کی ولادت کی معتمد تاریخ نو (۹) ربیع الاول ہے۔ (مقالات الکوثری ص ۴۰۵) بقول علامہ قسطلانی علیہ الرحمہ، جمہور محدثین ومؤرخین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ (المواھب مع الزرقانی: ۱/۱۳۱)

مؤرخین نے آٹھویں تاریخ کا ذکر کیا ہے، علامہ کوثری رحمہ اللہ کی تحقیق کے اعتبار سے اس کا مطلب آٹھویں کا ختم ہونا یعنی نویں تاریخ کا ہونا ہے جبکہ بقول مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ آٹھ اور نو کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ مہینے کے انتیس یا تیس دن ہونے پر مبنی ہے اور جب حساب سے نویں تاریخ ہونا ثابت ہوگیا ہے تو آٹھویں تاریخ کی سب روایات نویں تاریخ کی تائید وتقویت کے لیے پیش کی جاسکتی ہیں۔ (قصص القرآن: ۴/۱۹۰)

محبوب ﷺ کی خاطر

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ اے جبرائیل! تجھے کتنی مرتبہ مشقت کے ساتھ بڑی جلدی سے آسمان سے زمین کی طرف اترنا پڑا؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا: ہاں یا رسول اللہ (ﷺ) چار مرتبہ ایسا ہوا۔ ایک مرتبہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ دوسری مرتبہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن اطہر پر چھری رکھ دی گئی۔ تیسری مرتبہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں

پھینکا گیا۔ چوتھی مرتبہ جب آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے تو مجھے حکم الٰہی ہوا کہ آپ ﷺ کے دانت مبارک کا خون زمین پر نہ گرنے پائے۔ یارسول اللہ (ﷺ) مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے جبرائیل! اگر میرے محبوب کا خون زمین پر گر گیا تو قیامت تک زمین پر نہ کوئی سبزی اُگے گی اور نہ کوئی درخت۔ چنانچہ میں بڑی تیزی سے زمین پر پہنچا اور آپ ﷺ کے خون کو ہاتھوں میں لے لیا۔

رسول اللہ ﷺ کی تاریخ وفات

علماء اور مؤرخین ان دو امور میں تقریباً متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی تھی اور پھر پیر کے دن ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ ۵/۲۷۵)

البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی؟ اس سلسلہ میں تین اقوال مشہور ہیں۔

۱)...... سب سے زیادہ مشہور قول جس کو اکثر مؤرخین و مؤلفین نے اختیار کیا ہے وہ بارہ ربیع الاول کا ہے۔ اس قول کو ابن اسحٰق، ابن سعد، ابن حبان، ابن عبدالبر، ابن الصلاح، نووی، ذہبی اور ابن الجوزی وغیرہ حضرات علماء رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔ (حاشیہ لامع الدراری: ۸/۴۸۵)

اس قول پر ایک قوی اشکال ہوتا ہے جس کو علامہ سہیلی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ بارہ ربیع الاول سے تقریباً تین ماہ قبل ذوالحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن ہونے پر سب روایات متفق ہیں اور یکم ذوالحجہ کو جمعرات کا دن تھا۔ اب ذوالحجہ، محرم اور صفر، ان تینوں مہینوں کو تیس، تیس دن کے فرض کیے جائیں، خواہ انتیس، انتیس دن کے اور خواہ بعض کو انتیس دن کے بعض کو تیس دن کے فرض کیے جائیں، کسی بھی صورت میں بارہ ربیع الاول ۱۱ھ کو پیر کا دن نہیں آتا ہے۔ حالانکہ سب روایات پیر کے دن کے یوم وفات ہونے پر متفق ہیں۔ (الروض الانف: ۷/۵۷۹)

امام مازری نے اور پھر حافظ ابن کثیر نے اس اشکال کا جواب دیا ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ تینوں مہینے تیس دن کے ہوئے ہوں اور اختلاف مطالع کی وجہ سے اہل مکہ اور اہل مدینہ کی ذوالحجہ کے چاند کی رؤیت ومشاہدہ میں اختلاف ہو، اہل مکہ نے جمعرات کے روز کی رات کو دیکھا ہو، اور اہل مدینہ نے جمعہ کی رات دیکھا ہو اور مناسک حج کی ادائیگی اہل مکہ کی رؤیت کے اعتبار سے ہوئی ہو۔ حج سے فراغت پر رسول اللہ ﷺ جب دوبارہ مدینہ زادھا اللہ شرفاً تشریف لے گئے تو اہل مدینہ کی تاریخ کے اعتبار سے تاریخوں کا حساب برقرار رہا۔ اس اعتبار سے وہاں ذوالحجہ کی پہلی تاریخ جمعہ کو، اور اس کی آخری تاریخ سنیچر کے دن ہوگی۔ یکم محرم الحرام اتوار کے دن اور اس کی آخری تاریخ پیر کے دن ہوگی۔ یکم صفر منگل کو اور اس کی آخری تاریخ بدھ کو ہوگی اور یکم ربیع الاول جمعرات کو، تو بارہویں تاریخ پیر کے دن ہوگی۔

(البدایہ والنہایہ: ۵/۲۷۷۔ فتح الباری: ۷/۳۶۷۔ مجموعۃ الفتاوی: ۳/۱۶۷۔ البدائع للتھانوی: ۷/۱۰۷)

شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے اس جواب کو بعید قرار دیا ہے اس لیے کہ اس صورت میں ذوالقعدہ سے ماہِ صفر تک متواتر چار مہینوں کو تیس دن کا ماننا پڑے گا۔ (فتح: ۷/۳۶۷)

۲) دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ۲ ربیع الاول کو ہوا تھا۔ اس قول کو کلبی، ابومخنف اور سلیمان تیمی رحمھم اللہ نے اختیار کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ کا میلان بھی اسی قول کی طرف ہے۔ (فتح الباری ۷/۷۳۶)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اصل جملہ تاریخ وفات کے سلسلہ میں یوں ہو "مات فی ثانی شھر ربیع الاول" (یعنی ماہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو وفات پائی) اور تصحیف و تغییر ہو کر جملہ یوں ہو گیا ہو "مات فی ثانی عشر ربیع الاول" (یعنی ربیع الاول کی بارہویں کو وفات ہوئی) بجائے شہر، بہ معنی ماہ کے "عشر" کا لفظ ہو گیا ہو (اور ثانی عشر کا معنی بارہ ہیں) پھر یہ وہم چل پڑا ہو، اور بلا سوچے سمجھے ایک دوسرے کا اتباع کرنے لگے ہوں۔ واللہ اعلم۔ (فتح الباری ۷/۷۳۶)

امام سہیلی فرماتے ہیں کہ تاریخ وفات دوم ربیع الاول ماننے کی صورت میں ذوالحجہ، محرم اور صفر، تینوں مہینوں کو انتیس، انتیس دن کے فرض کرنا ہو گا، تو ہی ۲ ربیع الاول کو پیر کا دن ہو سکتا ہے۔ (الروض الانف ۷/۵۷۹) اور مسلسل تین مہینے انتیس دن کے ہو سکتے ہیں اگرچہ اس کا وقوع کم ہی سہی لیکن وقوع ضرور ہے۔

۳) تیسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی رحلت یکم ربیع الاول کو ہوئی۔ اس قول کو موسیٰ بن عقبہ، لیث، خوارزمی اور ابن زبیر رحمھم اللہ نے اختیار کیا ہے اور علامہ سہیلی رحمہ اللہ نے اس کو اقرب و اقیس قرار دیا ہے۔ (فتح الباری ۷/۷۳۶۔ الروض الانف ۷/۵۷۹)

یکم ربیع الاول کو تاریخ وفات اس صورت میں ہو سکتی ہے جب ذوالحجہ، محرم اور صفر، ان تین مہینوں میں سے کسی دو مہینے کو انتیس دن کا اور ایک مہینہ کو تیس کا فرض کیا جائے۔ (حوالہ مذکورہ بالا) اور یہ صورت قلیل الوقوع نہیں ہے۔

اس قول کی تائید اس روایت ابن جریر سے ہوتی ہے جس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے، کہ یوم عرفہ کے اکیاسی دن کے بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۱۳) اور یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ سے یکم ربیع الاول تک کے دنوں (ایام) کو شمار کیا جائے تو اکیاسی دن ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فقہی جواہر مولانا مفتی عمر فاروق صاحب ۳۴)

سورج گہن اور اسکا تقاضا

گیارہ اگست 1999ء کی آمد آمد ہے اور بیسوی صدی کا آخری مکمل سورج گہن جو برطانیہ کی تاریخ میں 1927ء کے بعد یعنی تقریباً 72 سال کے بعد ہونے والا مکمل سورج گہن ہے۔ اسکو براہ راست یا بذریعہ ٹی وی دیکھنے کا اشتیاق لوگوں میں روز افزوں ہے، جہاں اور اقوام میں یہ اشتیاق جنون کی حد کو پہنچ رہا ہے، وہیں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میں بھی اسکو دیکھنے کا شوق و تڑپ نا قابل بیان ہے۔ ایسا سماں قائم ہوا ہے کہ جس نے اس صدی کا یہ آخری مکمل سورج گہن نہیں دیکھا، اس نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں دیکھا اور اسکا مآل و حاصل ایک تفریحی مشغلہ سے زائد کچھ نہیں۔ لیکن ہم نے کبھی یہ سوچا کہ آیا سورج گہن

ایک تفریحی مشغلہ کی حیثیت رکھتا ہے، یا اپنے اندر کوئی درس عبرت رکھتا ہے؟ یہ بتی بہلانے کی ایک چیز ہے، یا یہ اپنے اندر کوئی تقاضا رکھتا ہے؟ سطحی اور سرسری نظر سے دیکھنے والا یقیناً یہی کہے گا، کہ سورج گہن تو طلوع وغروب کی طرح طبعی اسباب کے تحت پائی جانے والی چیز ہے، اور اسکا ایک خاص حساب مقرر ہے۔ اہل ہیئت وتقویم ٹھیک ٹھیک منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب لگا کر بتلا دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت سورج یا چاند کا گہن ہوگا اور کہاں نظر آئے گا کہاں نظر نہیں آئے گا، وغیرہ، تو پھر اس میں کسی درس عبرت یا کسی تقاضا کا کیا معنیٰ؟ جو انسان اس نظریے کا حامل ہو، وہ درحقیقت دین سے بھی ناواقف ہے اور علم طبعیات سے بھی نابلد ہے، اس لیے کہ واقعہ ایسا نہیں ہے نہ ازروئے دینیات نہ ازروئے طبعیات۔

اولاً دین وشرع کی رو سے اس کی حیثیت کا جائزہ لیں:

دیکھئے عہد نبوی میں صرف ایک مرتبہ سورج گہن ہوا، ٹھیک اس دن جس دن رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، علوم ریاضی کی مایہ ناز شخصیت محمود پاشا فلکی مصری کی تحقیق کے مطابق یہ ۲۹ شوال ۱۰ھ بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء، پیر کا دن تھا اور گہن صبح ساڑھے آٹھ بجے ہوا تھا۔ (فتح الملہم: ۴۵۲/۴)

زمانہ جاہلیت میں یہ مشہور تھا کہ روئے زمین میں موت یا ضرر جیسے کسی تغیر کے پائے جانے کی بناء پر گہن لگتا ہے، ادھر رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ آپ کے صاحبزادے کی وفات کی وجہ سے سورج گہن ہوا ہے اس لئے آپ نے سورج گہن کی نماز پڑھانے کے بعد جو خطبہ دیا اس میں آپ نے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: کہ ”بے شک سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت کی وجہ سے یا کسی کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کو گہن نہیں لگتا، پس جب تم ان کو گہتے دیکھو، تو اللہ سے دعا مانگو، تکبیر کہو، نماز پڑھو اور خیرات کرو“۔ (صحیح البخاری: ۱۴۲/۱، فتح الباری: ۶۱۳/۲)

اس روایت کے دوسرے طریق میں یہ اضافہ ہے کہ ”سورج گہن اور چاند گہن کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں“۔ (بخاری شریف: ۶۱۳/۱)

سورج گہن ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ باجماعت، صلوٰۃ الکسوف ادا فرمائی اور امت کو بھی اس جیسے موقع پر نماز ودعاء وغیرہ امور خیر کی طرف متوجہ ہونے کی تعلیم وتلقین فرمائی اور واضح بیان فرمایا کہ سورج گہن اور چاند گہن یہ باری تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مظہر ہیں کہ سورج جیسے کرہ عظیمہ کا نور سلب کرلیا، بالفاظ دیگر ہماری دنیا کو اس کے نور سے محروم کردیا، جبکہ سورج کا کرہ ہمارے زمین کے کرہ سے کئی گنا بڑا اور کئی میل دور ہے، اس لیے اس کی عظمت وجلال کے اعتراف کے لیے نماز کو مشروع کیا گیا اور پھر یہ گہن اس وقت کی ایک ادنیٰ جھلک دکھلا دیتے ہیں، جب تمام اجرام فلکیہ بے نور ہو جائیں گے، اس اعتبار سے گہن کے واقعات مذکر آخرت ہیں اور ایسے مواقع پر انابت الی اللہ اور رجوع الی اللہ کی

ضرورت واہمیت سے کون سلیم الطبع وصحیح العقل انسان انکار کرسکتا ہے؟

نیز اللہ کے بندوں کے لیے دعوت فکر ہے کہ سورج کی حرارت وروشنی اور چاند کے نور کی عظیم الشان نعمت جو مخلوق کے فائدہ کے لیے لاکھوں کروڑوں میل کے فاصلے سے پہنچائی جاتی ہے، وہ کتنی قابل قدر اور اس کا خالق ہمارا کتنا بڑا محسن اور مستحق ہزاراں ہزار شکروسپاس ہے اس لیے حکم ہوا کہ جب تک اس عظیم نشانی کا مظاہرہ ہو تم نماز ودعا وغیرہ میں مشغول رہو، اسی طرح غافل، فاسد العقیدہ اور بدکار لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس نشانی میں یہ سبق ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے غضب وعتاب سے ڈریں اور اصلاح حال کی فکر کریں، کہ جب اللہ، شمس وقمر جیسے عظیم کرہ کو اس طرح بے نور کرسکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت وپکڑ کے سامنے ہماری کیا حیثیت اور ہماری کیا بساط؟

یہ تو ہوئی شرعی حیثیت سے گفتگو، علم طبعیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی اس میں آیت اللہ (اللہ کی نشانی) ہونے کا پہلو مخفی نہیں ہے اسلیے کہ اللہ عزوجل کی طرف سے امم سابقہ پر جتنے عذاب آئے، ان کی شکل یہ ہوئی کہ بعض معمولی امور جو روزمرہ اسباب طبعیہ کے ماتحت ظاہر ہوتے رہتے ہیں اپنی معروف حد سے آگے بڑھ گئے، تو عذاب کی شکل اختیار کر گئے مثلاً قوم نوح پر بارش، قوم عاد پر آندھی وغیرہ، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ جب تیز ہوائیں چلتیں تو آپ کا چہرہ متغیر ہوجاتا اس ڈر سے کہ کہیں یہ ہوائیں بڑھکر عذاب الٰہی کی صورت نہ اختیار کرلیں، چنانچہ ایسے مواقع پر آپ بطور خاص دعا واستغفار میں مشغول ہوجاتے۔ (فتح الباری ۲/ ۶۰۴)

اس طرح یہ سورج گہن اور چاند گہن بھی اگرچہ طبعی اسباب کے تحت رونما ہوتے ہیں لیکن یہ اگر اپنی معروف حد سے بڑھ جائیں تو عذاب بن سکتے ہیں، خاص طور سے جدید سائنس کی تحقیق کے مطابق گہن کے لمحات انتہائی نازک ہوتے ہیں۔ کیونکہ سورج گہن کے وقت چاند، سورج اور زمین کے درمیان حائل ہوجاتا ہے تو سورج اور زمین دونوں اپنی کشش ثقل سے، اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں، ان لمحات میں خدانخواستہ اگر کسی ایک جانب کی کشش غالب آجائے تو اجرام فلکیہ کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے۔ لہذا ایسے نازک وقت میں رجوع الی اللہ کے سوا چارہ نہیں۔ (معارف السنن: ۳۵/۵)

اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اسکو تفریحی واقعہ قرار دینے کے بجائے سورج گہن کی نماز ادا کرنا چاہیے۔ جمہور کے نزدیک سورج گہن کی نماز سنت موکدہ ہے۔ مردوں کے لیے حکم یہ ہے کہ اس نماز کو جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کریں، بشرطیکہ امام وہ ہو جو جمعہ اور عیدین کا امام ہو، یا وہ ہو جس کو اس نے امامت کی اجازت دی ہو، ورنہ تنہا پڑھیں، عورتیں بہرصورت اپنے گھروں میں، یہ نماز علیحدہ علیحدہ پڑھیں۔ اس نماز میں جس قدر چاہے قرات پڑھے یہ قرات سراً ہوگی لیکن لوگوں کی اکتاہٹ، کے اندیشہ کے وقت جہر بھی کیا جاسکتا ہے، دونوں رکعتوں میں طویل قرات کرنا افضل ہوگا۔ نیز رکوع وسجود کو بھی طول دے اور نماز کے بعد آفتاب کے صاف ہوجانے اور کھل جانے تک ذکر ودعا، وغیرہ میں مشغول رہیں، اس نماز کی کم از کم

دو رکعت ہیں اور چار رکعت پڑھنا افضل ہے، اس سے زیادہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کو توفیق عطا فرمائے امین۔ (فقھی جواہر: ۳۸)

عقیقہ کی شرعی حیثیت اور احکام

ہمارے معاشرے میں عقیقہ کی شرعی حیثیت اور اسکے احکام کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں عام ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کی شرعی حیثیت اور اسکے احکام کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا جائے۔

''عقیقہ'' یہ عربی لفظ ہے اور عربی زبان میں عقیقہ ان بالوں کو کہا جاتا ہے جو بچہ کی پیدائش کے وقت اسکے سر پر ہوتے ہیں پھر اس کا استعمال اس بکری یا اس بکرے کے لیے ہونے لگا جو بچہ کی ولادت کے موقع پر ذبح کیا جائے اسلیے کہ اس وقت سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں۔ (اعلاء السنن ۱۷/۱۲۰) پھر اس کا استعمال مذکورہ بکرے یا بکری میں محدود نہ رہتے ہوئے دنبہ وغیرہ ہر اس جانور کے لیے ہونے لگا جو نومولود کی طرف سے ذبح کیا جائے۔ (سبل السلام: ۴/۹۷)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل بھی اہل عرب اپنی اولاد کے لیے عقیقہ کیا کرتے تھے جیسا کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے (مشکوۃ المصابیح ۲/۳۶۳) اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اسکی ترغیب دی اور ترمذی، ابو داود وغیرہ سنن کی وہ روایات جن میں رسول اللہ ﷺ کا حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقہ کرنا ثابت ہوتا ہے ان کے ظاہر کو مدنظر رکھتے ہوئے بقول اکثر محدثین یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ترغیب قولی پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے خود بھی اس پر عمل فرمایا ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی فرض یا واجب چیز ہے۔ چنانچہ جمہور علماء کے نزدیک عقیقہ واجب تو نہیں ہے، تاہم سنت یا مستحب ہونے سے انکار بھی نہیں ہوسکتا ہے، بقول علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ حضرات حنفیہ کا عمل، قول استحباب پر ہے۔ (اعلاء السنن ۱۷/۱۰۸) اسی سے عقیقہ کی شرعی حیثیت واضح ہوگئی۔

بعض لوگ عقیقہ کو اس درجہ کی اہمیت دیتے ہیں جو افراط کو مستلزم ہے۔ انکا خیال یہ ہے کہ جس آدمی کا عقیقہ نہ ہوا ہو، اسکی قربانی درست نہیں ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے، جو آدمی ایام قربانی میں صاحب نصاب ہو تو اس پر قربانی کرنا واجب ہے، خواہ اسکا عقیقہ ہوا ہو، یا نہ ہوا ہو، افراط کے مذکورہ نظریہ کے برعکس کچھ لوگ تفریط میں مبتلاء ہیں، صاحب حیثیت ہونے کے باوجود اپنے کسی بھی بچہ کی پیدائش پر عقیقہ کرنے کا دل میں خیال نہیں گزرتا۔ حالانکہ یہ ایک محبوب اور مرغوب عمل ہے اور یہ اپنے اندر کئی ایک اسرار و حکم اور فوائد و مصالح کو لیے ہوئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ ارقام فرماتے ہیں۔

۱)..... من جملہ ان مصلحتوں کے ایک یہ ہے کہ عقیقہ میں اولاد کے نسب کی تشہیر و اشاعت ہوتی ہے۔

۲)..... اس میں سخاوت کے معنی پائے جاتے ہیں۔

۳) نصاریٰ میں جب کسی کا بچہ پیدا ہوتا تھا، اسکو زرد پانی سے رنگا کرتے تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح کرنے سے بچہ نصرانی ہوجاتا ہے۔ پس مناسب معلوم ہوا کہ ملت حنیفہ یعنی دین محمدی میں بھی ان کے اس فعل کے مقابلے میں کوئی ایسا فعل پایا جائے جس فعل سے اس فرزند کا حنفی ہونا اور ملت ابراہیمی واسماعیلی کا تابع ہونا معلوم ہوا۔ سو جس قدر افعال حضرت ابراہیم علیہ السلام واسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مختص تھے اور انکی اولاد میں چلے آئے تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے پر آمادہ ہونا اور پھر اللہ تعالیٰ کا اس کے فدیہ میں ذبح عظیم کے ساتھ انعام کرنا ہے اور ان دونوں کے شرائع میں سے زیادہ مشہور حج ہے، جس کے اندر سر منڈانا اور ذبح کرنا ہوتا ہے، پس ان باتوں میں انکے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ملت حنیفی پر آگاہ کرنا ہے اور اس بات کی اطلاع دینا ہوتا ہے کہ اس فرزند کے ساتھ اس ملت کا برتاؤ کیا گیا ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں بتغیر یسیر)

۴) اللہ تعالیٰ نے بچہ کی صورت میں ایک نعمت دی، تو عقیقہ کے ذریعے اسکی شکر گزاری ہوتی ہے اور بچہ کی سلامتی چاہی جاتی ہے (مرقاۃ شرح مشکوۃ: ۸/۱۵۷) یہ بھی فائدہ ہے کہ عقیقہ کی وجہ سے دنیا میں اس بچہ پر آنے والے بلائیں دفع ہوتی ہیں، اسلیے اکثر علماء فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے عقیقہ نہیں ہو سکتا، اسکی وجہ یہی ہے کہ عقیقہ دنیا کی بلائیں دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ (جس کی اب میت کو ضرورت نہیں)۔ (احسن الفتاوی: ۷/۵۳۶)

۵)..... ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث شریف کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "جو آدمی چاہتا ہے کہ اسکی اولاد بڑی ہوکر اسکی نافرمان نہ بنے تو اسکو بچوں کی پیدائش پر عقیقہ کرنا چاہیے۔" (مرقاۃ: ۸/۱۵۹)

مذکورہ بالا مصالح وفوائد کا تقاضا یہی ہے کہ بچہ کی پیدائش پر بجائے شیرینی تقسیم کرنے کے صاحب حیثیت کو عقیقہ کے حکم پر عمل کرنا چاہیے۔

یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ شریعت مقدسہ نے لڑکا، لڑکی دونوں کی طرف سے عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے بعض لوگ صرف لڑکے کی طرف سے عقیقہ کرتے ہیں، لڑکی کی طرف سے نہیں کرتے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، یہ یہود کا طریقہ ہے۔ جیسا کہ فتح الباری: ۹/۵۰۶ میں نقل کیا گیا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: کہ لڑکے کی طرف سے دو، اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا، یا بکری ذبح کی جائے (ترمذی شریف: ۱/۱۸۳) جڑواں یا زیادہ بچے پیدا ہونے کی صورت میں ہر لڑکے کی طرف سے دو، اور ہر لڑکی کی طرف سے ایک جانور ذبح کرنا چاہیے۔ (فتح الباری: ۹/۵۰۶)

عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے دو، اور لڑکی کی طرف سے ایک جانور مقرر کرنے میں راز یہ ہے کہ یہود کی مخالفت ہو، اس لیے کہ یہود لڑکے کی طرف سے ایک جانور ذبح کرتے تھے تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ لڑکے کی طرف سے دو جانور ذبح کریں اور یہود لڑکی کی طرف سے عقیقہ کرتے ہی نہ تھے تو ان کی مخالفت کے لیے لڑکی کی طرف سے ایک جانور کے ذبح کا حکم دیا گیا (اعلاء السنن: ۱۷/۱۲۲) یہاں یہ بات یاد

رہے کہ لڑکے کے لیے دو جانور ہونا بہتر ہے،لیکن اگر کوئی آدمی لڑکے کے لیے ایک ہی جانور ذبح کرے تو بھی کافی ہو جائے گا۔ (فتح الباری ۵۰۶/۹،احسن الفتاویٰ ۵۳۵/۷)

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ لڑکے کے لیے مذکر اور لڑکی کے لیے مؤنث جانور کا عقیقہ کرنا چاہیے،لیکن اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ترمذی وغیرہ سنن کی روایات میں ہے کہ خواہ مذکر ہو،خواہ مؤنث ہو کوئی حرج ومضائقہ نہیں ہے۔ (جامع ترمذی ۱۸۳/۱)

عقیقہ میں کون سے جانور کو ذبح کرنا جائز ہے،جانور کی عمر کیا ہونا چاہیے؟ کون سے عیوب سے اس کا سالم ہونا ضروری ہے؟ ان سب احکام کو معلوم کرنے کے لیے ایک شرعی حکم کو یاد رکھا جائے کہ جس جانور کی قربانی جائز ہے اس کا عقیقہ میں ذبح کرنا بھی جائز ہے،اس اعتبار سے بڑے جانور میں ایک یا دو حصے بھی بطور عقیقہ ٹھہرائے جاسکتے ہیں (فتح الباری ۵۰۷/۹)

بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عقیقہ کا جانور ذبح کرتے وقت "بسم اللّٰه و اللّٰه اکبر، اللّٰهم لك و اليك هذه عقيقة فلان" (بجائے فلاں کے بچے کا نام لیا جائے) کہنا چاہیے۔ (اعلاء السنن ۱۲۰/۱۷)

عقیقہ سے متعلق ایک متنازع فیہ امر یہ ہے کہ عقیقہ کے جانور کی ہڈیاں توڑی جاسکتی ہیں،یا یہ کہ صرف جوڑوں ہی سے الگ کرنا پڑے گا؟ تو جاننا چاہیے کہ عقیقہ کے جانور کی ہڈیاں بیچ میں سے نہ توڑنے اور جوڑوں ہی سے الگ کرنے میں حنفی اور مالکی مسلک کے اعتبار سے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ عام لوگوں نے ہڈیاں نہ توڑنے کو واجب کا درجہ دے دیا ہے اور ہڈیاں توڑنے کو ناجائز اور ممنوع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ عقیدہ اور خیال غلط اور قابل اصلاح ہے،اسی لیے علماء اس کی تردید کرتے ہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۵۳۷/۷)

عقیقہ کا گوشت کچا بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے اور پکا کر بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے،نیز پکا کر دعوت بھی کی جاسکتی ہے (ردالمحتار ۲۱۳/۵) لیکن عقیقہ کا گوشت پکا کر دعوت کرنے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس کھانے کی قیمت یا کوئی عوض نہ لیا جائے۔ ہمارے زمانہ میں عام طور پر نکاح،شادی وغیرہ کی دعوتوں میں ہدیہ کے نام سے کچھ لینے دینے کا رواج ہے،اس لئے شادی کی ایسی دعوتوں میں عقیقہ کا گوشت شامل نہ کیا جائے اسی طرح تبلیغی اجتماعات میں اگر کچھ روپے کی کوپن دے کر کھلانے کا نظم ہو تو اس میں بھی عقیقہ کا گوشت شامل نہ کیا جائے اور اگر کبھی اس قسم کی دعوتوں میں عقیقہ کا گوشت شامل کرلیا گیا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ عقیقہ کے گوشت کے عوض میں تخمیناً جتنے روپے حاصل ہوئے ہوں،اتنے روپے فقراء ومساکین پر صدقہ کردیا جائے۔

صاحب فتاویٰ رحیمیہ حضرت مفتی لاجپوری صاحب دامت برکاتہم،تو جن دعوتوں میں عوض نہ لیا جاتا ہو،ان میں بھی عقیقہ کا گوشت شامل نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں،اس لیے کہ اس کا رواج ہو جانے میں مستحب طریقہ کے ترک کا اندیشہ ہے۔

عقیقہ کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ ولادت کے ساتویں دن کیا جائے اور گوشت کے تین حصے کیے

جائیں، ایک حصہ گھر والوں کے لیے، ایک حصہ رشتہ داروں کے لیے اور ایک حصہ فقراء و مساکین کو دیا جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۳۱۹/۲)

عقیقہ کا گوشت نومولود کے والدین، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ اصول بلا کسی حرج و مضائقہ کے تناول کر سکتے ہیں بہت سے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ مذکورہ افراد عقیقہ کا گوشت نہیں کھا سکتے یہ بات بے بنیاد ہے۔ (اعلاء السنن ۱۱۸/۱۷)

مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق بچہ کی ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کرنا مستحب ہے، اگر اس دن نہ کر سکے، تو چودھویں دن ورنہ اکیسویں دن عقیقہ کیا جائے۔ (جامع ترمذی ۱۸۳/۱)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے اکیس دن کے ذکر کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ آگے اسی پر قیاس کر لیا جائے (شرح سفر السعادۃ ص ۳۸۳) یعنی اکیس دن کے بعد کیا جائے تو بھی بچہ کے پیدائش کے دن سے ساتویں دن کا خیال رکھا جائے مثلاً جمعہ کے دن ولادت ہوئی تھی تو جب عقیقہ کرے، جمعرات کے دن کرے، بدھ کے پیدائش ہوئی تھی، منگل کے دن کرے، بہت سے علماء نے ساتویں دن کا لحاظ کر کے بالغ ہونے تک کا وقت ذکر کیا ہے کہ بالغ ہونے تک اس کی طرف سے عقیقہ کیا جا سکتا ہے، بالغ ہونے کے بعد اس کی طرف سے عقیقہ کرنے کا حکم ختم ہو جائے گا، ہمارے بزرگوں میں محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ اور صاحب احسن الفتاویٰ فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ جیسے حضرات اکابر نے بالغ ہونے کے بعد بھی انتقال تک عقیقہ کے درست ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

اگر کوئی آدمی بالغ ہونے کے بعد خود اپنا عقیقہ کرنا چاہے تو علماء کی ایک جماعت انکار کرتی ہے جبکہ امام رافعی رحمہ اللہ جیسے علماء اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ فیض الباری شرح بخاری شریف سے بھی جواز معلوم ہوتا ہے۔ (فقہی جواہر ۱۱)

اکابر کے فوٹو حقیقت کے آئینہ میں

شریعت اسلامیہ نے جن امور کو ممنوع ٹھہرایا ہے، ان میں سے جاندار چیزوں کی تصویر سازی (تصویر بنانا) اور تصویر داری (تصویر رکھنا) بھی ہے۔ جاندار چیزوں کی تصویر سازی تو مطلقاً حرام ہے، خواہ چھوٹی تصویر بنائی جائے خواہ بڑی خواہ ہاتھ سے بنائے جائے، خواہ کیمرہ وغیرہ آلات جدیدہ سے، اور تصویر داری کا حکم یہ ہے کہ پاسپورٹ وغیرہ حاجت شدیدہ کی وجہ سے ہو تو ضرورۃً جائز ہے، ورنہ ممنوع و ناجائز ہے، جبکہ وہ تصویر بڑی ہو یا چھوٹی ہو لیکن مستبین الاعضاء (نمایاں اعضاء والی) ہو، پھر اگر اس تصویر رکھنے میں تعظیم کا شبہ ہو، تو ممانعت میں اور بھی شدت آ جاتی ہے۔

آج کل لوگوں میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تبلیغی جماعت کے حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب قدس اللہ اسرارہم جیسے

ہمارے اکابر اور بزرگوں کی طرف منسوب تصاویر، فوٹو تعظیم یا برکت کے لیے رکھنے اور جمع کرنے کا شوق واہتمام روز بروز زیادہ ہورہا ہے، عوام تو عوام، خواص بھی اب اس مرض میں مبتلا ہورہے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس طرح کے فوٹو ممنوع ہوتے، تو یہ اکابر ہرگز اپنا فوٹو نہ بنواتے اور ہم تک نہ پہنچتے نیز یہ خیال کرتے ہیں کہ تصویر داری کی ممانعت اسلیے ہے کہ کہیں رفتہ رفتہ شرک کا سلسلہ شروع نہ ہوجائے اور ہم شرک میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں، اسلیے ہمارے لیے اس کی اجازت ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس سلسلہ میں کچھ عرض کیا جائے، ہوسکتا ہے، اللہ کے کسی بندہ کو یہ تحریر پڑھ کر اپنی غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ تائب ہوجائے۔" **وما ذالك على الله بعزيز وهو ولي التوفيق ولا حول ولا قوة الا به**"

دیکھیے یہاں چند باتیں قابل لحاظ اور غور طلب ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ بزرگوں میں سے **بعض** نے اگر بلا حاجت شدیدہ معتبرہ عندالشرع فوٹو رکھے ہوں، تو ان کے اس فعل سے تصویر داری کے جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مسائل شرعیہ کا ثبوت ادلۂ اربعہ سے ہوتا ہے اور یہ کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان تصاویر میں سے بعض تصاویر کی اکابر کی طرف نسبت مخدوش ہے، ایسی صورت میں تصویر کا اس بزرگ کی طرف منسوب کرنا بہتان ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے ہمارے اکابر میں سے بعض نے جس زمانہ میں کیمرہ کی ایجاد ہوئی، اس وقت اسکے ذریعے فوٹو لینے اور ہاتھ کے ذریعے تصویر سازی میں فرق کیا ہو (کہ ہاتھ کے ذریعے تصویر سازی کے ممنوع ہونے اور کیمرہ سے تصویر کشی کے غیر ممنوع ہونے کے قائل ہوئے ہوں) لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فرق کسی قوی بنیاد پر مبنی نہیں ہے، اسلیے کہ شرعاً یہ بات طے شدہ ہے کہ جو چیز اصل میں حرام یا غیر مشروع ہو، تو آلہ کے بدلنے سے کا حکم نہیں بندلے گا، خمر (شراب) حرام ہے۔ اب چاہے وہ ہاتھ سے تیار کیا گیا ہو، چاہے جدید مشینوں سے۔ اسی طرح قتل حرام ہے چاہے آدمی چھری سے قتل کرے چاہے گولی سے۔ ٹھیک اسی طرح تصویر کے بنانے اور تصویر کے رکھنے سے شرع نے منع کیا ہے۔ تو اب چاہیے وہ نقاش کے برش سے بنائی گئی ہو، اور چاہے فوٹو گرافی کے آلات سے تیار کی گئی ہو۔ "**والواقع ان التفريق بين الصور المرسومة والصور الشمسية**" الخ (تکملہ فتح الملہم ۱۶۳/۴)

چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے اکابر میں سے جو اس وقت جواز کے قائل ہوئے ہوں، ممکن ہے پھر انہوں نے اس سے رجوع کرلیا ہو چنانچہ علامہ قاضی محمد زاہد الحسینی قدس سرہ اپنے اجل مسترشد محقق العصر مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب دامت برکاتھم العالیہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جیسا کہ علماء حق کا ہمیشہ سے یہ شیوہ اور طرز عمل رہا ہے کہ جونہی اپنی فروگزاشت پر نظر پڑی، فوراً رجوع کرلیا، اور اسکو عار یا اپنی سبکی نہیں سمجھا، بلکہ اپنے آپ کو دارین کے مواخذہ سے محفوظ رکھنے پر توجہ فرمائی۔ چنانچہ ان ہر دو اکابر (حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ قبورھما) نے

پہلے تو تصویر کے جواز پر فتوی دیا، مگر بعد میں بفضل خداوندی اس سے رجوع فرمایا 1919ء میں حضرت مولانا سلیمان ندوی صاحب نے تصویر کے جواز کے بارے میں مضمون لکھا تھا، لیکن جنوری 1943ء کے معارف میں حق پسندی کی جرات کے ساتھ رجوع واعتراف کے زیر عنوان انہوں نے اپنے مسلک سے رجوع کا اعلان شائع فرمایا تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا دیا ہوا اعلان بھی ملاحظہ ہو: ''تصویر کا کھینچوانا، رکھنا، شائع کرنا سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھینچوائی تھی اور ''الہلال'' کو باتصویر نکالا تھا۔ اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں میری پچھلی غلطیوں کو چھپانا چاہیے نہ کہ از سرنو تشہیر کرنا چاہیے۔'' (تذکرہ ابوالکلام آزاد ۸۔ کشکول معرفت ۱۴۵/۲)

پانچویں بات یہ ہے کہ کسی عالم دین اور بزرگ کا فوٹو شائع ہونے سے یہ خیال کرلینا کہ جس کا فوٹو ہے اس نے اپنے علم واختیار سے دیا ہوگا، یا اس کے نزدیک فوٹو کی تصویر (کیمرہ کی تصویر) جائز ہے، یہ ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ مدراس انڈیا سے شائع ہونے والے ''بدرالاسلام'' نامی اخبار میں جب مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نوراللہ قبورھما کی طرف منسوب فوٹو شائع ہوئے، تو حضرت مفتی صاحب سے اس بارے میں سوال کیا گیا، حضرت مفتی صاحب نے فوٹو کی ممانعت کے شرعی حکم کو واضح کرنے کے بعد تحریر فرمایا:

"اما اشاعة بعض الجرائد تمثال فوتو غراف بصورنا فنحن لاندری من اخذها واین اخذها ومتی اخذها ولا یخفی ان اخذ رسم الفوتو غراف لایحتاج الی علم صاحب الصورة فان الا حد یتمکن من اخذها مع غفلة صاحب الصورة وكذالك اخذ مثالنا من اخذها"

''یعنی بعض رسائل نے جو ہمارا فوٹو شائع کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارا فوٹو کس نے لیا؟ کہاں لیا؟ اور کب لیا؟ اور ظاہر ہے کہ فوٹو لینے کے لیے صاحب تصویر کا علم ضروری نہیں ہے، کسی آدمی کا فوٹو اسکی بے خبری میں لیا جا سکتا ہے اور ہمارا فوٹو بھی جس نے لیا ہے ہماری بے خبری ہی میں لیا ہے''۔ (کفایت المفتی: ۲۳۷/۹)

اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں حضرت موصوف تحریر فرماتے ہیں کسی کا فوٹو شائع ہو جانے سے یہ خیال کر لینا کہ جس کا فوٹو ہے اس نے اپنے علم واختیار سے دیا ہوگا، یا اس کے نزدیک فوٹو کی تصویر جائز ہے ناواقفیت یا تعصب کا نتیجہ ہے۔ (کفایت المفتی: ۲۴۵/۹)

چھٹی بات یہ ہے کہ ممکن ہے وہ اکابر بلا حاجت شدیدہ تصویر کی ممانعت کے قائل ہوں، پھر کسی حاجت شدیدہ معتبرہ عندالشرع کی وجہ سے انہوں نے اپنا فوٹو بنوایا ہو، اور وہ فوٹو کسی طرح کسی کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

ساتویں بات یہ ہے کہ جن اکابر کے فوٹو رکھنے اور جمع کرنے کو اپنی سعادت سمجھا جاتا ہے (جو کہ درحقیقت شقاوت ہے) خود ان سے قولاً یا فعلاً فوٹو کی ممانعت وشناعت منقول ہے اور انہوں نے اس سے براءت کا اظہار کیا ہے، چنانچہ حضرت مفتی کفایت اللہ قدس سرہ کی تحریر آپ کی نظروں سے گزر چکی۔

حضرت تھانوی قدس سرہ ارقام فرماتے ہیں: ''ان حدیثوں سے (جو حضرت والا نے اس سے قبل تحریر فرمائی ہیں ان سے) تصویر بنانا' تصویر رکھنا سب کا حرام ہونا ثابت ہو گیا۔ (اصلاح اسلامی فصل ۳۶)

شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ، مولانا احمد حسین لاہر پوری کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ''والا نامہ مع کٹنگ فوٹو پہنچا' یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں نے خود اپنے علم و ارادہ سے کبھی فوٹو نہیں کھینچوایا' میری لاعلمی میں ایسا ہو جاتا ہے، نہ میں اسکو جائز سمجھتا ہوں جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خود اسکے ذمہ دار ہیں''۔ (مکتوبات شیخ الاسلام ۴/۲۱۴)

مشہور محدث حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ رقمطراز ہیں ''جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس سورت میں نئے تعلیم یافتہ چند نوجوانوں نے سٹیج کا (جس پر حضرت مدنی قدس سرہ اور دوسرے علماء تشریف فرما تھے) فوٹو لینے کی کوشش کی تو حضرت مدنی قدس سرہ نے نہایت گرجدار آواز میں انکو ڈانٹا اور فوٹو نہیں لینے دیا''۔ (روزنامہ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ۴۱)

آٹھویں بات یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ بزعم خود جن اکابر کی تعظیم و محبت میں ان کے فوٹو جمع کر رہے ہیں اگر وہ اکابر بقید حیات ہوتے اور انکو ہماری اس حرکت کا علم ہوتا' تو کیا وہ ہماری اس حرکت سے جو کہ سراسر خلاف شرع ہے خوش ہوتے؟ اور اسے اپنی تعظیم سمجھتے؟ ظاہر ہے کہ وہ ہرگز خوش نہ ہوتے اور اپنی محبت کے خلاف سمجھتے، اسلیے کہ ہمارے اکابر اتباع شرع سے خوش ہوتے تھے اور احکام شرع کی خلاف ورزی سے انکو قلبی اذیت و کوفت ہوتی تھی، تو یہ بھی خوب محبت و تعظیم ہے کہ محبوب و معظم شخصیت کے لیے جو امر دل آزاری کا باعث ہے وہ ہمارے لیے مایہ افتخار بنا ہوا ہے کہ ہمارے پاس فلاں فلاں بزرگوں کے فوٹو ہیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

نویں بات یہ ہے کہ بعض لوگ اکابرین کے فوٹو رکھنے اور جمع کرنے کو باعث برکت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ فعل باعث برکت نہیں ہے بلکہ یہ تو باعث نحوست ہے، کیونکہ اس سے بنص حدیث صحیح ''لاتدخل الملائکة بیتاً فیه کلب ولا صورة'' ملائکہ رحمت کا آنا موقوف ہو جاتا ہے۔

دسویں بات یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں تصویر سازی اور تصویر داری کی ممانعت کا حکم محدود وقت کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ قیامت تک کے لیے ہے (حاجات شدیدہ اپنی جگہ مستثنی ہیں جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا ہے) اور یہ حکم ممانعت عوام و خواص دونوں کے لیے ہے۔

بعض خواص یہ سمجھتے ہیں کہ جاندار کی تصویر داری کی حرمت اسلیے ہے کہ کہیں شرک کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے اور ہم تو ایسا کرنیوالے نہیں ہیں، اس لیے بزرگوں کے فوٹو جمع کرنے کا ہمارا عمل ممانعت کے ذیل میں نہیں آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال فاسد ہے، اولاً تو اسلیے کہ ہمارے پاس شرک سے مامون و محفوظ رہنے کی کوئی ضمانت اور گارنٹی نہیں ہے۔ ''الایمان بین الخوف والرجاء'' ہر آن پیش نظر رہے۔ ثانیاً: اسلیے کہ ہوسکتا ہے ہم ان تصویر سے شرک میں مبتلا نہ ہوں، لیکن ہماری نسل کے بارے میں احتمال ہے

کہ ہماری چھوڑی ہوئی تصاویر ان میں سے کسی کے لیے شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن جائے ''والدال علی الشر کفاعلہ''۔ ثالثاً ایسے ہی ممانعت کے حکم شرعی کا یہی ایک سبب مان لیا، حالانکہ اسکے کئی ایک اسباب ہیں (ملاحظہ ہو احکام القرآن للتھانوی 517/3) جن میں سے ملائکہ رحمت کا اسے ناپسند کرنا ہے وہ سبب تو اب بھی پایا جارہا ہے، پھر کیسے ہمارا عمل ممانعت کے ذیل میں نہیں آئے گا؟ بالفاظ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

سطور بالا سے بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ بزرگوں کے فوٹو محبت وتعظیم کے لیے یا برکت کے لیے رکھنے اور جمع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تو اب جو لوگ تائب ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پھر ان تصاویر کے ساتھ جو ہمارے پاس ہیں، ہم کیا سلوک کریں؟ تو ان کے لیے ''الافاضات الیومیہ ج ۷ کا ملفوظ نمبر ۴۴ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، جس سے وہ اپنے سوال کا حل بآسانی نکال سکیں گے۔

ایک صاحب نے (حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ سے) عرض کیا کہ حضرت! ایک صاحب کے پاس حضور ﷺ کے نامزد حضور کی تصویر ہے، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ (حضرت حکیم الامت قدس سرہ) نے فرمایا کہ حضرت مولانا (شاہ اسماعیل) شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں بھی ایسی ہی بات پیش آئی تھی، ایک شخص نے آخر حضرت شہید صاحب سے سوال کیا کہ میرے پاس ایک تصویر ہے جو حضور ﷺ کے ساتھ نامزد ہے، میں اس کے ساتھ کیا معاملہ اور کیا برتاؤ کروں؟ فرمایا معاملہ کیا ہوتا؟ حضور کے نامزد ہونے سے حکم شرعی نہیں بدلتا، پھر یہ شخص حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس پہنچا اور یہی عرض کیا حضرت شاہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ جاندار ہے یا بے جان؟ عرض کیا کہ بے جان۔ فرمایا کہ جب صاحب تصویر بے جان ہو گئے تھے، کیا معاملہ کیا گیا تھا؟ عرض کیا کہ غسل وکفن دے کر دفن کر دیا گیا تھا، فرمایا: تم بھی ایسا ہی کرو، کیوڑے اور گلاب سے غسل دو، اور بہت قیمتی کپڑے میں لپیٹ کر کسی ایسی جگہ دفن کر دو، جہاں کسی کا پاؤں نہ آئے، بات ایک ہی ہے کہ محو کر دی جائے مگر عنوان کا فرق ہے، دوسرے طریق کا اختیار کرنا سہل ہو گیا پھر بتدریج اول طریقہ گوارا ہو جائے گا۔ یہ حکایت سن کر پھر سائل نے (حضرت حکیم الامت سے) عرض کیا کہ جن کے پاس وہ تصویر ہے وہ صاحب یہ کہتے تھے کہ اس کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور حضرت کے سپرد کر کے چلا آؤں گا، حضرت جو معاملہ چاہیں اسکے ساتھ فرمائیں، فرمایا: کہ ہیں بڑے ہوشیار، اپنے نزدیک وہ باادب رہنا چاہتے ہیں، خیر کوئی حرج نہیں میں ہی اس میں کیا کروں گا جو شریعت کا حکم ہے وہی کروں گا، یہاں ایک طرف تو ہے ھذا امتثال رسول اللہ ﷺ اور ایک طرف ہے ھذا احکم رسول اللہ ﷺ دیکھ لو، کون مقدم ہے؟ اور ایک اس سے بھی اچھا فیصلہ ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ کے سامنے اگر یہ پیش کی جاتی تو حضور ﷺ کیا معاملہ فرماتے؟ ظاہر ہے کہ اتنا بھی نہ فرماتے جتنا حضرت شاہ صاحب نے فرمایا بلکہ مولانا

شہید ہی جیسا فتویٰ اور عمل فرماتے پھر فرمایا (حکیم الامت قدس سرہ) نے کہ حضرت مولانا شہید اور حضرت شاہ صاحب کی تجویزوں میں یہ فرق ہے کہ ایک کا نفع عام ہے اور ایک کا نفع تام، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز کا نفع عام ہے اور حضرت شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نفع تام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نفع عام سے نفع تام افضل ہے، گو نفع عام اسہل ہے۔ (الافاضات الیومیہ ۷/۲۵۴)

ایک اور ملفوظ کا مفہوم ملاحظہ ہو: ''حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ سے ایک مرتبہ کھتولی (ایک بستی کا نام ہے) میں رسول اللہ ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے نامزد تصاویر جو حیدرآباد سے آئی تھیں، کے احترام کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا کہ وہ احترام کے قابل نہیں ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ سے نکالی جانے والی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تصاویر کے ساتھ اور تصاویر کی طرح معاملہ کیا تھا (یعنی انکا ازالہ فرمایا تھا) ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ طبیعت احترام کرنے کو چاہتی ہے، لیکن حکم شرعی کے مقابلہ میں طبیعت کو ترجیح و دخل نہیں دینا چاہیے حکم کو ماننے ہی میں احترام ہے'' واللہ الموفق للصواب۔ (فقہی جواہر ۵۳)

فقہاء کا مقام اور ان کی مقبولیت

سچ تو یہ ہے کہ فقہاء کا مقام سب سے بڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ معانی کے خواص کو پہچانتے ہیں بخلاف حکماء کے، ان کی نظر صرف اجسام کے خواص پر محصور ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں۔ (۱) فقہاء (۲) صوفیاء اور فقہاء کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے "**من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین**" جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کا ارادہ ہوتا ہے اس کو دین کی سمجھ یعنی فقہ عطا کرتے ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا، پوچھا: آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا: مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! مانگو، کیا مانگتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کردی جائے، جواب ملا، کہ اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے۔ ہم نے تم کو فقہ اسی لیے عطا کیا تھا کہ تم کو بخشنا منظور تھا۔ لیکن اس سے مامون العاقبۃ ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ فقہاء پر سوء خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں۔ اس لیے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ اگر حق تعالیٰ فقیہ کو عذاب دینا چاہیں گے تو فقہ کو اس سے سلب کر لیں گے۔ (تحفۃ العلماء ۲/۵۸۴)

ہماری اور فقہاء کی مثال

فقہاء بھی اپنی تحقیق پر ضابطہ کے دلائل بیان کرتے ہیں مگر ان دلائل کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں والا عصا لے کر چلے تو اس کا چلنا عصا پر موقوف نہیں۔ فقہاء کو حق تعالیٰ نے آنکھیں عطا فرمائی تھیں۔ جس کو

ذوق اجتہادی کہتے ہیں، ان کو ضرورت ان عصاؤں کی نہ تھی مگر ہم کو ضرورت ہے۔

ہماری مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا، اس کے سہارے کا مدار ہی عصا پر ہے۔ اگر وہ عصا لے کر نہ چلے تو وہ خندق میں گرے۔

بعض باتیں وجدانی اور ذوقی ہوتی ہیں۔ ایک صاحب نے عرض کیا۔ ذوق صحیح کس طرح پیدا ہو؟ فرمایا: اہل ذوق کی خدمت سے پیدا ہوتا ہے۔ (حوالہ بالا)

ایک علمی مناظرہ

یاقوت حموی، معجم الادباء میں ابن حزم علی بن احمد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کہتے ہیں کہ ایک دن ابن حزم کی ملاقات فقیہ ابوالولید سلیمان بن خلف باجی، صاحب تصانیف کثیرہ سے ہوگئی، اتفاق سے دونوں میں کسی مسئلہ پر بحث ومباحثہ ہوا، اور اس نے مناظرہ کی شکل اختیار کرلی۔ جب وہ ختم ہوا تو فقیہ ابوالولید باجی نے ابن حزم سے کہا: (اس تیزیٔ کلام اور بحث ومناظرہ پر) مجھے معذور سمجھیے، اس لیے کہ میرا اکثر مطالعہ پہرہ دار کے چراغ کی روشنی میں ہوا ہے۔

ابن حزم نے کہا: مجھے بھی معذور سمجھیے، اس لیے کہ میرا اکثر مطالعہ سیم وزر کے بنے چراغوں کی روشنی میں ہوا ہے۔

یاقوت حموی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: درحقیقت ابن حزم کا اشارہ اس طرف تھا کہ تونگری وخوشحالی، حصول علم سے روکنے اور اسے کھونے والی چیز ہے۔ (صبر واستقامت کے پیکر)

دونمازوں کو جمع کرنا

دونمازوں کو جمع کرنا، یعنی ظہر کو اس کے آخر وقت میں پڑھنا، پھر اس کے ختم پر وقت عصر آگیا تو اس کو پڑھنا، اور اسی طرح مغرب وعشاء میں کرنا، مریض ومسافر کو ضرورۃً جائز ہے، اسے جمع صوری اور جمع فعلی کہتے ہیں، لیکن جمع وقتی اور حقیقی جیسے کہ عرفات میں ظہر کے وقت عصر پڑھی جاتی ہے۔ اور مزدلفہ میں عشاء کے وقت مغرب پڑھی جاتی ہے، اس طرح کسی اور صورت میں جائز نہیں۔ (قدوری باب صلاۃ المسافر: ۳۸)

اذان کا جواب

نماز کی چند اذانیں سنے تو پہلی اذان کا جواب دینا ضروری ہے، باقی اذانوں کا جواب ضروری نہیں۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ سب کا جواب دے۔ (ردالمحتار ۱/۲۶۸)

احترام اذان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ایک زمانے میں دارالعلوم کی مسجد کے مؤذن جان محمد مرحوم ترکی تھے جب وہ اذان کہتے تھے تو لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کے باوجود بلاتکلف ان کی اذان اسٹیشن سے سنی جاتی تھی ان کی آواز اتنی تیز تھی کہ کافی دور تک جاتی تھی جب ان کی اذان شروع ہوتی تھی تو بہت

سے ہندو ادب سے بیٹھ جایا کرتے تھے کہ اب اللہ تعالیٰ کا نام لیا جا رہا ہے۔ (جواہر حکمت)

رونے سے ایک کی نماز فاسد اور ایک کی صحیح

ایک شخص وہ جو درد و مصیبت کی وجہ سے رویا، اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور دوسرا جنت یا جہنم کے ذکر سے رویا، اس لیے اس کی نماز نہیں فاسد ہوئی۔ (فتاویٰ عالمگیری ۱/۹۴)

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے کثرتِ علم کا سبب

ابن مدینی کہتے ہیں: امام شعبی سے کسی نے پوچھا: آپ کو اتنا بہت سا علم کہاں سے آ گیا؟ انہوں نے کہا: چار باتوں کی وجہ سے۔ (۱) کسی (کاپی یا کتاب کے) بھروسہ پر نہ رہنا۔ (۲) طلب علم کے لیے شہروں میں گھومنا۔ (۳) جمادات کی طرح صبر سے کام لینا (۴) کوے کی مانند صبح سویرے اٹھنا۔ (تذکرۃ الحفاظ ۱/۸۱)

طلب علم کے لیے سفر کو ترجیح دینا

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا: ایک شخص علم حاصل کرنا چاہتا ہے، آیا وہ اس کے لیے مختلف مقامات کا سفر کرے یا کسی ایک ہی زبردست عالم سے وابستہ رہے؟

انہوں نے فرمایا: سفر کرے، اور مختلف شہروں کے علماء کے پاس جا کر ان کے علوم قلمبند کرے اور لوگوں کو سونگھ سونگھ کر ان سے علم حاصل کرے۔ (فتح الباری ۱/۱۵۹)

عقل و فہم اور تفقہ فی الدین پیدا کرنے کا طریقہ

کھلی ہوئی بات ہے، جب چاہو تجربہ کر لو۔ ملنا جلنا کم کر دو، ادھر ادھر فضول دیکھنا بھالنا بند کر دو، معاصی سے اجتناب کرو، اس سے خود بخود فہم اور عقل میں نورانیت پیدا ہوگی۔ جو لوگ بک بک بہت کرتے ہیں، ان کا فہم اور ان کی عقل برباد ہو جاتی ہے، ادھر ادھر دیکھنے بھالنے سے اور معاصی سے حواس منتشر ہو جاتے ہیں، عقل خراب ہو جاتی ہے، مشاہدہ کی بات ہے۔ (حسن العزیز ۱/۴۰۳)

اردو کی شرعی حیثیت

اس وقت اردو زبان کی حفاظت، دین کی حفاظت ہے، اس بناء پر یہ حفاظت حسب استطاعت واجب ہوگی۔ اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا معصیت اور موجب مواخذہ آخرت ہو گا۔ واللہ اعلم۔ (تحفۃ العلماء ۱/۲۵۴ بحوالہ البدائع)

تفقہ فی الدین کی حقیقت

تفقہ فی الدین تو اور چیز ہے اگر وہ صرف الفاظ کا سمجھنا ہوتا تو کفار بھی تو الفاظ سمجھتے تھے، وہ بھی فقیہ ہوتے اور اہل خیر ہوتے۔ تفقہ فی الدین یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ دین کی حقیقت کی پوری معرفت ہو۔ سو ایسے لوگ حنفیہ میں بکثرت ہیں۔ (حسن العزیز ۴/۳۲۶)

''دابۃ'' کا فقہی مسئلہ

اگر کسی آدمی نے کسی کے لیے ''دابۃ'' کی وصیت کی تو اس سے مراد گھوڑا، گدھا اور خچر ہوں گے۔ اسلیے کہ ''دابۃ'' ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلتی ہے، لیکن عرف عام میں یہ لفظ صرف چوپاؤں کے لیے مستعمل ہے، اس لیے عرف کے اعتبار سے ہی وصیت پر عمل کیا جائے گا، اور اگر ایک شہر میں عرف ثابت ہوگیا تو یہی عرف دوسرے شہروں میں قابل قبول ہوگا۔ جیسا کہ کسی نے قسم کھائی کہ وہ ''دابۃ'' پر سواری نہیں کرے گا پس اگر وہ شخص کسی کافر پر سوار ہوگیا تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کافر کے لیے بھی ''دابۃ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ روٹی نہیں کھائے گا، لیکن اس نے چاول کی روٹی کھالی تو وہ حانث ہوجائے گا۔

ابن سریج نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اہل مصر کے عرف پر محمول کیا ہے کہ اگر سواری سے ان کی مراد تمام جانور ہیں تو لفظ ''دابۃ'' سے بھی وہی مراد ہوگا۔ لیکن اگر عرف عام میں ''دابۃ'' سے مراد گھوڑا ہو، تو پھر جس کے لیے وصیت کی گئی ہے اسے گھوڑا ہی دیا جائے گا، جیسا کہ اہل عراق کا طریقہ ہے، لفظ ''دابۃ'' کے مفہوم میں چھوٹا، بڑا، مذکر و مؤنث، عمدہ و خراب ہر قسم کا جانور شامل ہوگا۔

متولی کا قول ہے کہ وصیت میں ہر وہ جانور دیا جائے گا جس پر سواری ممکن ہو۔ (حیوۃ الحیوان ۴۹/۲)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک قصہ

مناقب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں مذکور ہے کہ خلیفہ مامون الرشید نے آپ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو کس لیے پیدا فرمایا ہے؟ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ بادشاہوں کو ذلیل کرنے کے لیے۔ پس مامون ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مکھی میرے جسم پر بیٹھی ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جی ہاں! جب آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ مکھی آپ کے جسم کے اس حصہ پر بیٹھی ہے جہاں کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے آپ کے سوال کا جواب منکشف فرما دیا۔ پس خلیفہ مامون الرشید نے کہا، کہ اللہ کی قسم! آپ نے بہت عمدہ جواب دیا ہے۔ (حیوۃ الحیوان: ۱۰۵/۲)

ف: شفاء الصدور اور تاریخ ابن نجار میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک اور لباس مبارک پر کبھی مکھی نہیں بیٹھی۔ (ایضا)

مرغی کے متعلق فقہی مسائل

۱)...... فتاویٰ قاضی حسین میں مرقوم ہے کہ اگر آدمی نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ اگر تو نے یہ مرغیاں فروخت نہ کیں تو تجھے طلاق ہے۔ پس اگر عورت نے ان مرغیوں میں سے ایک مرغی ذبح کردی تو اس پر

طلاق پڑ جائے گی۔ اور اگر اس عورت نے مرغی کو زخمی کیا، پھر فروخت کر دیا تو پھر طلاق واقع نہیں ہوگی۔ پس اگر اس عورت نے مرغی کو شدید زخمی کر دیا کہ اسے ذبح کرنے کی گنجائش نہ رہے تو پھر بیع صحیح نہیں ہوگی اور طلاق واقع ہو جائے گی۔

۲) ایسی مرغی جس کے پیٹ میں انڈے ہوں تو اس کو انڈوں کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ ایسی بکری کو جس کے تھنوں میں دودھ ہو، دودھ کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳) وہ انڈہ جو مردہ پرندے کے پیٹ میں ہو، اس کے متعلق فقہاء کرام کے تین مذاہب ہیں۔ پہلا مذہب جس کو الماوردی، رویانی اور ابوالقطان، ابوالفیاض وغیرہ نے نقل کیا ہے، یہ ہے۔ اگر وہ انڈہ سخت ہو تو پاک ہے، ورنہ نجس ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ وہ انڈہ مطلقاً پاک ہے، کیونکہ وہ پیٹ سے جدا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ وہ انڈہ مطلقاً نجس ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کیونکہ پرندے کے پیٹ سے خارج ہونے سے پہلے انڈہ ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ (حیوۃ الحیوان ۲/۶۵)

بکری کے بچہ کی پرورش کتیا کے دودھ سے

اگر بکری کے بچہ کی پرورش کتیا کے دودھ سے ہوئی ہو، تو وہ شرعی اعتبار سے ''جلالہ'' جانوروں کی طرح ہے۔ اسکا گوشت کھانا مکروہ ہے، لیکن اس کے متعلق ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا گوشت کھانا مکروہ تنزیہی ہے۔ صاحب ''الشرح الکبیر'' اور ''الروضۃ'' اور ''المنہاج'' کے مصنف نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ نیز الرویانی اور اہل عراق کا بھی اس پر عمل ہے۔ ابواسحٰق مروزی نے کہا ہے کہ (بکری کا وہ بچہ جس کی پرورش کتیا کے دودھ سے ہوئی ہو) اس کا گوشت کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ، بغوی رحمہ اللہ اور امام رافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ علامہ دمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''جلالہ'' جانوروں سے مراد وہ جانور ہیں جن کی غذا نجاست وغیرہ ہو، اور وہ گندگی وغیرہ کے ڈھیر پر پھرتے رہتے ہوں، چاہے وہ اونٹ ہو، بیل ہو، گائے ہو یا بکری ہو یا مرغی وغیرہ ہو، تحقیق جلالہ جانوروں کا شرعی حکم (حیوۃ الحیوان) باب الدال میں الدجاج کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مرغی کھانے کا ارادہ فرماتے تو اسے چند ایام روک کر اس کی حفاظت فرماتے۔ پھر اس کے بعد اس کا گوشت استعمال فرماتے۔ (حیوۃ الحیوان ۲/۱۷۲)

سب کا تیمم ٹوٹ جائے گا

پانی کے مالک نے لوگوں سے کہا کہ تم میں سے جو شخص چاہے اس پانی سے وضو کرے، تو اگر چہ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہوں، اس صورت میں سب لوگوں کا تیمم ٹوٹ جائیگا۔

"ان قال صاحب الماء لجماعة من المتيممين ليتوضأ بهذا الماء ايكم شاء على الانفراد والماء يكفى لكل واحد منفرد اينتقض تيمم كل واحد" (شرح وقایہ ۱/۹۶)

مجوسی کی شکار کی ہوئی مچھلی

اگر مجوسی، مچھلی کا شکار کرے تو وہ مچھلی پاک ہوگی۔ اس کی دلیل حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میں نے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا، کہ وہ مجوسی کی شکار کی ہوئی مچھلی کو کھالیا کرتے تھے۔ اور انکے دل میں کوئی چیز نہیں کھٹکتی تھی۔ اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے۔ لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے ٹڈی کے متعلق اختلاف کیا ہے۔ (حیوۃ الحیوان: ۱۹۵/۲)

مچھلی کو ذبح کرنا مکروہ ہے

مچھلی کو ذبح کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر وہ بہت بڑی ہو تو اس کو ذبح کر لینا مستحب ہے تاکہ اس کی آلائش خون کی شکل میں جاری ہو جائے۔ رافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ چھوٹی مچھلی کو بغیر اس کی آلائش صاف کیے ہوئے پکالیا گیا ہو اور اس کی آلائش اس کے بطن سے نہ نکلی ہو تو اس کا کھانا جائز ہے۔ رویانی نے کہا ہے کہ میرے نزدیک ایسی مچھلی طاہر ہے اور قفال کا بھی یہی قول ہے۔ (حیوۃ الحیوان: ۱۵۹/۲)

قسم کھا کر حانث نہ ہو جانا

اگر انسان قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا تو وہ مچھلی کا گوشت کھانے پر حانث نہیں ہوگا، اس لیے کہ عرف عام میں مچھلی پر لحم (گوشت) کا اطلاق نہیں ہوتا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں "لحما طریا" فرما کر مچھلی پر گوشت کا اطلاق کیا ہے۔

اسی طرح وہ شخص بھی سورج کی روشنی میں بیٹھنے سے حانث نہیں ہوگا جو یہ قسم اٹھائے کہ وہ چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھے گا، اگرچہ سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ کا نام دیا ہے۔

اسی طرح وہ شخص بھی زمین پر بیٹھنے سے حانث نہیں ہوگا، جو یہ قسم اٹھائے کہ میں فرش پر نہیں بیٹھوں گا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش سے تعبیر کیا ہے لیکن عرف عام میں فرش کا اطلاق زمین پر نہیں ہوتا۔ (ایضا)

انڈے چھین کر اپنی مرغی کے نیچے رکھنا

جب کوئی آدمی کسی سے انڈے چھین کر اپنی مرغی کے ذریعے ان انڈوں سے بچے نکلوا لے، تو ان بچوں کا مالک وہ شخص ہوگا جو انڈوں کا مالک ہے اور یہ بچے "عین المغصوب" ہیں۔ جن کا واپس کرنا ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ غاصب انڈوں کی قیمت کا ضامن ہوگا، بچوں کو نہیں لوٹائے گا، کیونکہ بچے انڈوں کے علاوہ ایک دوسری مخلوق ہیں۔ انڈے تو ضائع ہو گئے ہیں۔ اب ان کا ضمان واجب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مومنون میں فرمایا ﴿ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ﴾۔ (حیوۃ الحیوان: ۵۰۳/۲)

مینڈک کے متعلق فقہی مسائل

اگر پانی میں مینڈک کی موت واقع ہو جائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے، جیسے دوسرے غیر ماکول

جانوروں کی ہلاکت سے پانی ناپاک ہوجاتا ہے۔ ''الکفایہ'' میں ماوردی کے حوالہ سے ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے، کہ پانی میں مینڈک کی موت سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے شیخ نے اس حوالہ کو غلط قرار دیا ہے اور فرمایا کہ ''الحاوی'' اور دیگر کتب میں اس قول کا ذکر نہیں ملتا۔ جب مینڈک ماءقلیل (تھوڑے پانی) میں مرجائے تو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مینڈک کو غیر ماکول تسلیم کرتے ہیں تو بغیر کسی اختلاف کے پانی مینڈک کی موت سے نجس ہوجائے گا اور الماوردی نے اسکے متعلق دو قول نقل کیے ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ دیگر نجاستوں کی طرح مینڈک کی موت سے بھی پانی نجس ہوجائے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پسو کے خون کی طرح مینڈک کا پانی میں مرجانا معاف ہوگا۔ اس سے پانی نجس نہیں ہوگا۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (حیوۃ الحیوان:۲/۵۰۴)

مینڈکوں کے شور سے حفاظت کی ترکیب

(جب مینڈک کے فقہی مسائل کا ذکر ہوا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلچسپ بات بھی ذکر کی جائے) قزوینی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں موصل میں تھا۔ اور ہمارے دوست نے اپنے باغ میں حوض کے قریب ایک قیام گاہ بنوائی تھی، اور میں بھی اپنے دوست کیساتھ اسکے باغ میں بیٹھا تھا۔ پس اس حوض میں مینڈک پیدا ہوگئے۔ جن کی ٹرٹراہٹ (ٹریں ٹریں کی آوازیں) گھر والوں کے لئے باعث اذیت تھی۔ پس وہ مینڈکوں کے شور کو ختم کرنے سے عاجز آگئے، یہاں تک کہ ایک آدمی آگیا تو اس نے کہا کہ ایک طشت اوندھا کر کے حوض کے پانی پر رکھ دو۔ پس گھر والوں نے ایسا ہی کیا، پس اسکے بعد پھر مینڈکوں کے ٹرٹرانے کی آواز سنائی نہیں دی۔

محمد بن زکریا رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جب پانی میں مینڈکوں کی کثرت ہوجائے، تو اس پانی پر طشت میں چراغ جلا کر رکھ دیا جائے، تو مینڈک خاموش ہوجائیں گے اور پھر انکی آواز کبھی بھی سنائی نہیں دے گی۔ (حوالہ بالا)

انزال منی سے وجوب غسل اور پیشاب وغیرہ سے عدم وجوب غسل

اس کی عقلی وجہیں تین ہیں۔

۱)...... انزال منی کیساتھ قضاء شہوت میں ایسی لذت کا حصول ہوتا ہے کہ جس سے پورا بدن نفع مند ہوتا ہے، اس لیے اس نعمت کے شکریہ میں پورے بدن کے غسل کا حکم ہوا، اسی سبب سے وجوب غسل کے لیے خروج منی ''علی وجه الدفق والشهوة'' کی قید ہے کہ بغیر انکے لذت کا حصول نہیں ہوتا، اسی لیے اس صورت میں وضو واجب ہوتا ہے نہ کہ غسل۔

۲)...... جنابت پورے بدن کی قوت سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے اسکی زیادتی کا اثر پورے جسم سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہذا جنابت سے پورا بدن ظاہر و باطن بقدر امکان دھونے کا حکم ہوا۔ اور یہ باتیں

پیشاب وغیرہ میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

(۴) نماز یعنی بارگاہ الٰہی میں حاضری کے لئے کمال نظافت چاہیے اور کمال نظافت پورے بدن کے غسل ہی سے حاصل ہوگا، مگر پیشاب وغیرہ جسکا وقوع کثیر ہے، اس میں خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے بندوں کی آسانی کے لئے وضو کو غسل کے قائم مقام کردیا اور جنابت کا وقوع چونکہ کم ہے اس لیے اس میں پورے بدن کا دھونا لازم قرار دیا۔ (عجائب الفقہ بحوالہ بدائع الصنائع ۳۶/۱)

وہ خون جو اپنے لیے پاک، دوسرے کے لئے ناپاک

شہید کا خون جو خود اس کے لئے پاک ہے اور دوسرے کے لئے ناپاک ہے "دم الشهيد طاهر في حق نفسه نجس في حق غيره" (الاشباہ والنظائر: ۸۶)

ف: لہٰذا شہید کا خون کسی کو لگ گیا اور خون کی مقدار درہم سے زیادہ ہوئی تو اس کو دھونا ضروری ہوگا۔ (مؤلف)

دس خون پاک ہوتے ہیں

(۱) شہید کا خون (۲) وہ خون جو ذبح کے بعد گوشت میں رہ گیا (۳) وہ خون جو ذبح کے بعد رگوں میں باقی رہ گیا (۴) جگر اور تلی کا خون (۵) دل کا خون (۶) وہ خون جو انسان کے بدن سے بہا نہیں (۷) کھٹمل کا خون (۸) پسو کا خون (۹) کلنی کا خون (۱۰) مچھلی کا خون۔ (الاشباہ والنظائر: ۱۶۷)

طلباء کو کتابیں دینا

لوگ قرآن کے وقف کرنے کو بہت ثواب سمجھتے ہیں۔ فقہ کی کتاب "ھدایہ" وقف کرنے کو کوئی ثواب نہیں سمجھتا، اگرچہ لینے والا قرآن کو پڑھے بھی نہ۔ کیونکہ قرآن اس قدر طبع ہوگئے ہیں کہ کوئی ان کو پڑھتا بھی نہیں۔ ہر عمل اپنے آثار اور غایت کے اعتبار سے افضل ہوتا ہے۔ ہر عمل کی غایت دیکھنا چاہیے لیکن عوام الناس اسکو نہیں سمجھتے۔ (دعوات عبدیت: ۵۶/۹)

مدرس کی شرعی وفقہی حیثیت

مدرسی عقد اجارہ ہے۔ یہ (مدرس) اجیر خاص ہے، تسلیم نفس سے استحقاق اجر ہوجائے گا، پس اگر یہ اس وقت میں حاضر رہا تو مستحق ہے ورنہ نہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۳۴/۶)

مہتمم ومدرس کی تنخواہ کی فقہی حیثیت

ہر تنخواہ، اجرت نہیں بلکہ بعض تنخواہ حق احتباس بھی ہوتی ہے، جیسے بیوی کا نفقہ اور رزق القاضی وغیرہ۔ ہاں! اجرت اور نفقہ میں فرق ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ میں تعین نہیں ہوتا بلکہ اس میں قدر ضرورت کا استحقاق ہوتا ہے، زیادہ کا استحقاق نہیں ہوتا، مگر کبھی نفقہ زوجہ میں بھی فرض (تعین) جائز ہے، تاکہ نزاع نہ

ہواور جانبین کے مصالح محفوظ رہیں، اس تعین سے وہ نفقہ ہونے سے نہیں نکل جاتا۔ چنانچہ نفقہ زوجیہ فرض قاضی کے بعد نفقہ ہی رہتا ہے، اسی طرح اگر مدرسین کی تنخواہ معین ہو، تو محض تعیین سے وہ تنخواہ اجرت تعلیم نہ ہوگی بلکہ حق احتباس اور نفقہ میں داخل رہے گی، مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تنخواہ تو اجرت ہے اور کس کی تنخواہ نفقہ ہے؟ اگر تنخواہ اجرت ہے تو گناہ اسمیں بھی نہیں کیونکہ متاخرین کا فتوی جواز پر ہو چکا ہے مگر اسکو تعلیم وتدریس میں ثواب بھی کچھ نہیں کیونکہ اسکا مقصود معتنی تنخواہ ہے اس حالت میں یہ تعلیم طاعت نہیں غایت مافی الباب ایک عمل مباح ہے جس پر اجرت لینا متاخرین کے فتوی میں جائز ہے۔ فی نفسہ تعلیم دین طاعت تھی مگر چونکہ اسکی نیت تعلیم دین کی نہیں بلکہ مقصود اجرت ہے اسلیے "لکل امرئ مانوی" کے قاعدہ سے یہ ثواب کا مستحق نہیں"۔ (تحفۃ العلماء ۸۲/۱)

ایک احتیاط

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تین موقعوں پر آواز اونچی کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے: (۱) جنازے کیساتھ (۲) جنگ کے وقت (۳) اللہ کا ذکر کرتے وقت (سیر کبیر ۸۹/۱)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بے شک اللہ تعالی تین موقعوں پر خاموشی (یعنی آواز پست کرنے) کو پسند کرتے ہیں": (۱) ذکر وتلاوت کے وقت (۲) جنگ کے وقت (۳) جنازے کے وقت۔ (تفسیر ابن کثیر ۲۱۹/۲)

علامہ ابن نجیم حنفی عالم یوں لکھتے ہیں:

جنازے کے ساتھ آواز بلند کرنا، ذکر کے ساتھ ہو یا تلاوت قرآن کے ساتھ یا کسی اور کلمے کے ساتھ، یہ سب مکروہ ہے، اور مکروہ تحریمی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص جنازے کیساتھ آہستہ آواز سے اللہ کا ذکر کرتا رہے تو اس میں حرج نہیں، اسکی اجازت ہے۔ (البحر الرائق ۱۹۹/۲) نوٹ: آجکل جنازوں میں آوازیں بلند کیجاتی ہیں یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتے

اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک حاملہ عورت کو، جس نے زنا کیا تھا، رجم کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حاملہ عورت کا رجم اسکے وضع حمل کے بعد ہوتا ہے، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے یہ جملہ نکلا کہ "لولا علی لهلك عمر" (اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتے چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود تھے، اسلیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہلاکت سے بچ گئے)۔ (النحو الیسیر: ۱۳۰)

ایک مسئلہ میں دو غلطیاں

عیسی بن ابان ایک مشہور محدث ہیں، زیادہ تر درس حدیث میں مشغول ومنہمک رہا کرتے تھے، استنباط

واجتہاد اور تفقہ کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی۔ایک دفعہ بغرض حج مکہ مکرمہ، ذی الحجہ کے اول عشرہ میں پہنچے اور ایک ماہ اقامت کی نیت کر کے نماز قصر کی بجائے اتمام کرنے لگے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بعض شاگردوں نے انکو متنبہ کیا کہ ابھی تو آپ مسافر ہیں، اقامت کی نیت آپ کی صحیح نہیں کیونکہ ابھی تو آپ کو منیٰ عرفات جانا ہے، چنانچہ اب قصر کرنے لگے لیکن جب منیٰ سے واپس لوٹے تو بھی قصر کرتے رہے، حالانکہ مکہ مکرمہ میں اب پندرہ یوم سے زائد ٹھہرنا تھا اس قصر پر پھر ٹوکا گیا تو بہت احساس ہوا، اور فرمانے لگے کہ ایک مسئلہ میں مجھ سے دو غلطیاں ہوئیں۔اس احساس کے بعد حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے درس اور مجلس میں شرکت کرنے لگے یہاں تک کہ فقیہ کہلانے لگے۔(ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات:۱۴۰)

ف: تو ہمیں بھی چاہئے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں شرم محسوس نہ کریں۔(مؤلف)

عدالت جھک گئی

ایک عالی مرتبہ بزرگ خاتون کو عدالت میں ایک مرد اور ایک عورت کے ہمراہ گواہی دینے کے لئے جانا پڑا، قاضی نے دونوں عورتوں کے بیانات جدا جدا لینے چاہے۔بزرگ خاتون نے الگ گواہی دینے سے قرآن کی آیت ﴿ان تضل احداهما فتذكر احداهما الاخرى﴾ (البقرہ:۲۸۲) کی بناء پر انکار کر دیا اور عدالت سے کہا کہ خدا نے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر اس غرض سے قرار دی ہے کہ اگر ایک کوئی بات بھول جائے تو دوسری یاد دلائے، ظاہر ہے کہ جدا جدا گواہی سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

قاضی نے اس قرآنی استدلال کو قبول کر لیا اور دونوں خواتین کی گواہی ایک ہی ساتھ لی۔یہ بزرگ خاتون حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ تھیں۔(حوالہ بالا)

ف: اللہ تعالیٰ آج کی عورتوں کو بھی قرآن فہمی کا ایسا ذوق نصیب فرمائیں۔(مؤلف)

ایسی سنت جو فرض سے افضل ہے

مسافر کا ماہ رمضان میں روزہ رکھنا، ایسی سنت ہے جو مقیم کے فرض روزے سے افضل ہے۔اسی طرح جمعہ کی نماز کے لیے اذان سے پہلے جانا، ایسی سنت ہے جو اذان کے بعد جانے کے فرض سے افضل ہے، جیسا کہ شامی:۸۵/۱ میں ہے۔

"صوم المسافر فی رمضان فانه اشق من صوم المقیم فهو افضل مع انه سنة وكالتبكير الى صلاة الجمعة فانه افضل من الذهاب بعد النداء مع انه سنة والثانی فرض"

سنت ولیمہ

10 دسمبر 32ء قبل عصر، احقر نے دریافت کیا، کہ کیا ولیمہ تیسرے دن مسنون ہے؟ فرمایا: جی ہاں! میں نے کہا کہ آج نکاح ہو، تو پرسو ولیمہ ہو؟ فرمایا: ہاں! پھر فرمایا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بہت توسیع

کی ہے، وہ سات دن بھی کہتے ہیں مسلسل۔ میں نے کہا کہ برابر سات دن تک کھلاتا رہے یہ تو نہیں کہ ساتویں روز کھلائے؟ فرمایا: کہ جی ہاں! (ملفوظات محدث کشمیری رحمۃ اللہ ۱۴۱)

تکفیر کا اصول

بخاری ص ۱۰۲۲ (کتاب استتابۃ المرتدین) کے تحت فرمایا:

بعض جاہل مولوی فقہ کی عبارت سے کہ ۹۹ وجہ کفر کی ہوں اور ایک اسلام کی تو تکفیر نہ کریں گے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی میں ۹۹ کفر ہوں اور ایک اسلام کی چیز تو تکفیر نہ کرو، حالانکہ اس کا حکم یہاں موجود ہے کہ ایک وجہ ہی کفر کی ہو تو کافر ہی ہے۔ اگرچہ ۹۹ وجہ اسلام کی بھی موجود ہوں اور مطلب عبارت فقہ کا یہ ہے کہ کوئی کلمہ کسی ایک کا نقل ہوتا ہوا پہنچا۔ جس میں ۹۹ وجہیں اور احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال اسلام کا بھی ہو تو تکفیر کا حق نہیں ہے۔ پس وہاں ایک کلمہ ہے نہ کہ خود کفر ہوں۔ ۹۹ اس لیے کہ کفر کی تو ایک ہی چیز ہزار اسلام کی چیزوں پر غالب ہوگئی۔ میں نے بہاولپور میں کہا کہ اگر کوئی شخص بیس سال تک عبادت کرے، پھر صرف ایک سجدہ کرے، بت کو، اور مر جائے تو اس کو کافر کہو گے یا مسلمان؟ ایسی واضح چیزوں میں سمجھ کھو بیٹھے ہیں جاہل مولوی۔ ایک بڑے عالم مجھ سے کہنے لگے کہ تاویل کے ساتھ کلمہ کفر کہے تو کافر نہیں ہوتا، میں نے کہا کہ کس کتاب میں ہے۔ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے، میں سمجھا تھا کہ کسی کتاب کا حوالہ دیں گے تو جواب دوں گا پھر میں نے کہا کہ خیالی درس کی کتاب ہے، اس کے آخری صفحہ پہ ہے کہ تاویل ضروریات دین میں غیر معتبر ہے اور مؤول بھی کافر ہے (پوری تفصیل اکفار الملحدین میں کر دی ہے)

فقہ سب سے زیادہ مشکل فن ہے

فرمایا علوم اسلامیہ میں سے فقہ سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اور میں (علامہ کشمیری رحمۃ اللہ) ہر علم میں اپنی رائے رکھتا ہوں سواء فقہ کے، کہ اس کے اجتہادی مسائل میں تفقہ کرنا میری استطاعت وقدرت سے باہر ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اور علامہ شامی مبصر ہیں، لیکن تفقہ میں شاہ صاحب بڑھے ہوئے ہیں اور جزئیات پر حاوی، شامی زیادہ ہیں اور نقل کا سامان بھی ان کے پاس زیادہ ہے۔

شہادت باللہ یا بالطلاق؟

فرمایا: شہادت میں پیش ہونا تو ضروری ہے مگر صرف ''اشہد'' سے شہادت دینا کافی ہے اور حلف طلاق کے لیے تو مجبور کیا ہی نہیں جا سکتا، البتہ حلف باللہ کے لیے کہا جائے گا مگر مجبور اس پر بھی حاکم نہیں کر سکتا ہے۔

فوٹو اور تصویر میں فرق

احقر نے فوٹو کے متعلق دریافت کیا کہ مصری علماء فوٹو اور تصویر میں فرق کرتے ہیں اور اول کو عند الشرع جائز، اور دوم کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ ان کا مسئلہ غلط ہے۔ اور فوٹو اور تصویر کا حکم واحد ہے، باقی ضرورت کے مواقع کا استثناء دوسری چیز ہے (اسی طرح حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

رحمۃ اللہ نے بھی فرمایا)۔

واجب کا درجہ

فرمایا: فخر الاسلام بزدوی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ واجب کے معنی ایسے ہیں کہ مثلاً کوئی شخص کام کو جارہا ہو، اور دوسرا شخص اس کو اپنا بوجھ دیدے کہ ہمارے گھر پہنچا دینا، تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ یہ چیز سر پڑ گئی۔ اسی طرح واجبات ہیں کہ فرض تو تھے ہی یہ بھی سر پڑ گئے حالانکہ دلیل ظنی سے ثابت ہوتے ہیں۔
(ملفوظات محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ)

داڑھی کی مقدار

احقر نے داڑھی کی تحدید یک مشت کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے ثابت ہے، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تحدید نہیں بلکہ عرف پر ہے پھر 27 اکتوبر 31ء کو احقر نے موجودگی مولانا حفظ الرحمن صاحب وغیرہ یہ دریافت کیا کہ یک مشت سے داڑھی کم رکھنے یعنی کٹوانے میں اور منڈوانے میں گناہ برابر ہے یا تشکیک ہے؟ فرمایا کہ منڈوانے میں کترانے سے زیادہ گناہ ہے البتہ اگر جڑ سے کتروائے تو منڈوانے کے ہی برابر ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ مالکی حج کرنے آتے ہیں جن کی داڑھیاں خس خسی یا منڈی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مغرب کے شافعی حجاج آتے ہیں، جن کی داڑھی منڈی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس قدر عمل شریعت ودین پر رہ گیا۔ حنفیہ حجاج کی عموماً داڑھیاں ہوتی ہیں۔ (ملفوظات محدث کشمیریؒ)

ف: یہ علامہ کشمیریؒ کے زمانہ کی بات ہے، آج کی صورتحال کا خود ہی اندازہ لگالیں۔ (مؤلف)

غیبت سے بچنے کا ایک واقعہ

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ (م 1014ھ) تحریر فرماتے ہیں:

ایک بزرگ نے کہا کہ میرا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ہے۔ آپ سے سوال ہوا کہ کیوں طلاق دینا چاہتے ہیں؟ فرمایا: میں اپنی بیوی کے عیب کیسے ذکر کروں، جب انہوں نے بیوی کو طلاق دیدی تو سوال ہوا کہ کیوں دی؟ فرمایا: اجنبیہ عورت کے عیب کیوں ذکر کروں؟ (سچے واقعات: ۵۴)

ایسی سنت جو واجب سے افضل ہے

ابتداء بہ سلام ایسی سنت ہے جو واجب یعنی سلام کے جواب سے افضل ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"الا بتداء بالسلام سنة افضل من رده الجواب" (الأشباه والنظائر)

ماہ صفر

نہ اس مہینہ کی کوئی فضیلت منقول ہے، نہ اس میں کوئی حکم خداوندی ہے، نہ کوئی عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ثابت

ہے البتہ ایک فرمان ضرور آپ ﷺ سے مروی ہے۔

عرب کے کافر، اسلام سے قبل اس ماہ کو منحوس سمجھتے تھے، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تعلیم دی ''**ولا صفر**'' یعنی نحوست فلاں چیز میں بھی نہیں ہے فلاں چیز میں بھی نہیں اسی طرح صفر کے مہینہ میں بھی نہیں ہے۔ (مسلم)

انتباہ: افسوس صد افسوس! کہ جو مسلمان مرد وعورت اسی کو منحوس جانتے ہیں۔ وہ کفار عرب کی پیروی اور پیارے نبی کریم ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس ماہ کے آخری چہار شنبہ میں کسی برکت یا فضیلت کا قائل ہونا بھی غلط ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ (ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات)

نماز کا اس قدر اہتمام

ذوالحجہ کے اواخر، سن 23 ھجری کو نماز فجر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ایک مجوسی غلام نے قاتلانہ حملہ کر کے کاری زخم لگائے، وہ اس مذموم مقصد کے لیے پہلے سے محراب میں بیٹھا ہوا تھا، جونہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز کی نیت باندھ کر سورۃ فاتحہ کی قرأت شروع کی، اس نے محراب سے نکل کر فوراً آپ کو زخمی کر کے گرا دیا۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے فوراً آگے بڑھ کر مختصر نماز پڑھائی۔ قاتل ابولولو فیروز نے بھاگنے کی کوشش میں کئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو زخمی کیا، اور آخر جب دیکھا کہ گرفتار ہو گیا ہے تو خودکشی کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر ان کے گھر لایا گیا، ہوش میں آئے، تو سب سے پہلی بات یہ کی کہ نماز کا وقت باقی ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! فرمایا: مجھے قبلہ رو کر دو۔ اسی حالت میں نماز ادا کی۔ (حوالہ بالا)

عید کی نماز کا طریقہ

اول نیت کرے، کہ میں دو رکعت نماز واجب عید الفطر مع چھ تکبیرات زائدہ کے پڑھتا ہوں۔ پھر تکبیر اولی کہہ کر ہاتھ باندھ کر پوری ''**سبحانك اللھم**'' پڑھ کر پھر دو مرتبہ ''اللہ اکبر'' (تکبیر) کہے اور ہاتھ کانوں تک لے جائے اور چھوڑ دے پھر تیسری مرتبہ تکبیر'' اللــہ اکبر'' کہہ کر ہاتھ باندھ لے، اور خاموش ہو کر قرأت سنے، پھر دوسری رکعت میں قرأت کے بعد تین مرتبہ'' اللہ اکبر'' کہہ کر ہاتھ کانوں تک تینوں مرتبہ لے جائے اور چھوڑ دے۔ پھر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع کرے، دعا نماز عید کے بعد مانگنی چاہیے، خطبہ کے بعد دعا ثابت نہیں۔

صدقہ فطر کے ضروری مسائل

صدقہ فطر دو قسم کے لوگوں پر واجب ہوتا ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ جن پر زکوۃ فرض ہے ان پر صدقہ فطر بھی واجب ہے، مگر صدقہ فطر میں سال گزرنا شرط نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جو مسلمان اتنا مالدار ہو کہ اس پر زکوۃ واجب نہیں، لیکن ضروری اسباب سے زائد اتنی قیمت کا مال واسباب ہے جتنی قیمت پر زکوۃ واجب ہو۔ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت بازاری نرخ سے، تو اس پر بھی صدقہ فطر واجب ہے، مثلاً کسی

کے دو گھر ہیں۔ ایک میں خود رہتا ہے اور ایک پڑا ہے یا کرایہ پر دے دیا ہے، تو دوسرا مکان ضرورت سے زائد ہے، اگر اس کی قیمت اتنی ہو جتنی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو اس پر صدقہ فطر واجب ہے البتہ اگر اسی پر اس کا گزر بسر ہو تو یہ مکان ضروری اسباب میں داخل ہو جائے گا اور اس پر صدقہ فطر واجب نہ ہوگا۔

اختلافی مسائل میں علمائے دیوبند کا مسلک

ہمارے مشائخ کا مسلک، اختلافی مسائل کے اندر یہ تھا کہ نصوص سے جو چیز مستنبط ہوئی، اس کو انہوں نے بیان کر دیا اور بس۔ اب اگر کوئی اس سے اختلاف کرتا ہے تو اس کی تردید کے درپے نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ اس کا سلسلہ لمبا ہو جاتا ہے، سوال چلتا ہے پھر اس کا جواب چلتا ہے پھر جواب الجواب چلتا ہے پھر اور آگے چلتا ہے اور آگے چلتا ہے اور یہ شقاق تک مفضی ہو جاتا ہے۔ (اہل علم کے لیے جواہر پارے: ۳۲)

استنجاء کے فوائد

ذرا اسلام میں دیکھ لیجیے! مٹی کے ڈھیلے سے اور حجر (پتھر) کے ذریعے سے استنجاء کیا جاتا ہے، اور اس کا معمول ہونا چاہیے، یہ بہترین چیز ہے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے طہارت بھی حاصل ہوتی ہے اور نظافت بھی حاصل ہوتی ہے، اس لیے کہ مٹی جاذب ہے، پیشاب کے قطرات کو جذب کر لیتی ہے۔ دوسرا یہ کہ مٹی جراثیم کش ہے، اگر پیشاب کے قطروں کے ساتھ کچھ جراثیم ہوں، تو ان کو مار دیتی ہے۔ تیسرا یہ کہ مٹی کے استعمال سے بدبو، زائل ہو جاتی ہے، صابن سے بدبو، زائل نہیں ہوتی ہے بلکہ صابن کی خوشبو میں نیچے آ کر وہ بدبو دب جاتی ہے، بدبو مغلوب ہو جاتی ہے لیکن یہ مٹی بدبو کو بالکل ختم کر دینے والی ہے، جس کاغذ سے لوگ استنجاء کرتے ہیں۔ اس میں یہ اثر نہیں ہوتا۔ (امثال عبرت للتھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

ارشاد فرمایا: عورتوں کو بڑے استنجاء میں ڈھیلا لینا اچھا ہے کیونکہ اس میں تقلیل نجاست ہے اور چھوٹے استنجاء میں بھی جائز ہے مگر اس میں ایک بات قابل غور ہے وہ یہ کہ مردوں کے مبال (پیشاب گاہ) تو چھوٹا ہے اور عورتوں کی زیادہ جگہ ہے اس میں اندیشہ ہے کہ کوئی حصہ اس چیز کا اندر چلا جائے اور ڈھیلا سخت بھی ہوتا ہے اس لئے اگر اس کا کوئی حصہ اندر چلا جائے تو تکلیف ہوگی۔ (ملفوظات حکیم الامت ۴۵/۱۵)

ف: ایک ڈاکٹر نے مٹی کے ڈھیلے سے استنجاء پاک کرنے کے متعلق کہا ہے کہ مٹی بہت سے زخموں کا علاج ہے تو پیشاب میں جو مادہ تیزاب کا ہے اس کی مضرت روکنے کے لئے مٹی کا استعمال مصلحت ہے۔

دور نبوت کے مفتیان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۲) عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن الخطاب (۳) عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان (۴) علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (۵) عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف (۶) ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (۷) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۸) معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل (۹) عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر (۱۰) حذیفہ رضی اللہ عنہ (۱۱) زید رضی اللہ عنہ (۱۲) سلمان رضی اللہ عنہ (۱۳) ابو درداء رضی اللہ عنہ (۱۴) ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ۔ (گلہائے رنگا رنگ: ۲۲)

مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء کرام رضی اللہ عنہم

(۱) سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ (۲) ابو بکر رضی اللہ عنہ بن عبد الرحمن بن الحرث (۳) قاسم رضی اللہ عنہ (۴) عبید اللہ رضی اللہ عنہ (۵) عروہ رضی اللہ عنہ (۶) سلیمان رضی اللہ عنہ (۷) خارجہ رضی اللہ عنہ۔ (گلہائے رنگا رنگ ۲۳)

ائمہ مذاہب اربعہ

۱)..... امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ انتقال ۱۵۰ھ بغداد میں ہوا، عمر ستر ۷۰ سال کی ہوئی۔

۲)..... امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ ۹۳ھ (مشہور قول کے مطابق) میں پیدا ہوئے اور مدینہ ۱۷۹ھ میں انتقال ہوا۔

۳)..... امام شافعی ابو عبد اللہ محمد بن ادریس رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے مصر میں اواخر رجب ۲۰۴ھ میں انتقال ہوا۔

۴)..... امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کنیت ابو عبد اللہ تھی، بغداد میں ۲۴۱ھ ربیع الثانی میں انتقال ہوا۔ (گلہائے رنگا رنگ: ۲۴)

بکرے کی حلت اور سؤر کی حرمت پر پنڈت سے گفتگو

ارشاد فرمایا: کہ ایک مرتبہ ایک پنڈت میرے پاس آیا، کبھی کبھی آیا کرتا تھا، کہنے لگا: مولوی صاحب! آپ کے مذہب میں ایک مسئلہ بڑا عجیب ہے میں نے کہا ہم سارے ہی عجیب ہیں، آپ نے دیکھا ہی کیا ہے بتلایئے؟ دو جانور ایک صورت و شکل کے، ایک کو آپ حلال کہتے ہیں اور دوسرے کو حرام۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ میں نے کہا پنڈت جی! جواب ذرا کڑوا ہے ناگوار نہ گزرے اس نے کہا ہوگا ہی نہیں جواب۔ میں نے کہا جواب تو ایسا ہے کہ اگر سمجھ میں آ گیا تو ناک کے بال بھی جل جائینگے، منہ سے حلق تک سب چھل جائیگا اور زندگی بھر یہ سوال کبھی زبان پر نہیں لاؤ گے لیکن چونکہ آپ سے تعلق ہے، اسلیے زیادہ کڑوے اجزاء نکال کر ہلکی کڑواہٹ کے ساتھ پیش کرتا ہوں، سنیئے! کون اندھا ہے جو بکرے اور سور کو ایک جیسا کہے گا (میں نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا)

بکرے کی داڑھی ہے، سؤر کی داڑھی نہیں۔

بکرا گھاس پات کھاتا ہے، سؤر پاخانہ اور دوسری غلاظتیں کھاتا ہے۔

بکری کے تھن دو ہوتے ہیں اور سؤرنی کے زیادہ، بکری کے تھن دونوں رانوں کے بیچ ہوتے ہیں اور سؤرنی کے سینے پر ہوتے ہیں۔

بکرے کے سینگ ہوتے ہیں اور سؤر کے سینگ نہیں ہوتے۔

غرض، صورت اور اعضاء کی خلقت دونوں کی الگ الگ ہے، لیکن ہم نے مانا کہ دنیا میں اندھے بھی رہتے ہیں، ان کی رعایت بھی ضرور کرنی ہے (جن کو یہ فرق نظر نہیں آتا)

اچھا، آپ بتلایئے کہ آپکی والدہ زندہ ہیں۔

اس نے کہا ہاں! زندہ ہے۔

میں نے پوچھا، بہن ہے کوئی؟

اس نے کہا ہاں ہے۔

میں نے کہا! بیوی ہے؟ کہا ہاں،

میں نے پوچھا، بچے بھی ہیں؟ اس نے بتایا دو بچے ہیں۔

میں نے کہا، کس سے؟

اس نے کہا، کس سے کیا مطلب؟

میں نے کہا، بھئی آپ کے گھر میں تین عورتیں ہیں، ایک آپ کی والدہ، آپ کی بہن، تیسری آپ کی بیوی، وہ دو بچے آپکے کس عورت سے ہیں؟

اس پر غصہ میں جواب دیا، بیوی سے ہیں اور کس سے ہوتے۔

میں نے کہا، آپ کی بیوی، والدہ، بہن تینوں عورتیں ہیں، شکل وصورت بھی ایک ہی ہے دونوں ایک جیسی ہیں، دو آنکھیں ان (بیوی) کی۔ دو آنکھیں ان (والدہ) کی، دو کان، دو ہاتھ، دو پیر، بیوی کے بھی والدہ کے بھی شکل بھی ایک، اعضاء بھی ایک، خلقت بھی ایک لیکن کیا وجہ ہے آپ اپنے لیے بیوی کو حلال سمجھتے ہیں اور والدہ کو حرام؟ (انکی پیشانی پر تغیر آیا) پھر بیوی اور ماں میں تو عمر کا فرق بھی ہے۔ بیوی اور بہن میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا، عمر بھی ایک جیسی ہوگی کیا وجہ ہے کہ آپ بہن کو اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں اور بیوی کو حلال سمجھتے ہیں۔

پنڈت جی غصہ میں آکر کہنے لگے، دیکھئے یہ ہیں مسلمان، یہ ہیں انکے اخلاق، یہ ہے ان کی تمیز، پہنچ گئے ماں، بہن پر۔

میں نے کہا: پنڈت جی! آپ غلط سمجھ گئے، میں آپ کی ماں، بہن پر نہیں پہنچ رہا ہوں، آپ ایسا سمجھے تو واقعی غصہ کی بات ہے کسی شریف آدمی کی ماں بہن کے پاس کوئی غیر آدمی پہنچ جائے تو غصہ آہی جاتا ہے۔ آپ کا غصہ بالکل صحیح ہے لیکن سمجھے آپ غلط (آپ ہی نے سوال کیا تھا کہ ایک ہی شکل وصورت دو جانور ہیں۔ اسلام عجیب ہے کہ ایک کو حلال اور ایک کو حرام کہہ دیا اسی کا جواب سمجھا رہا ہوں) بس اب اول فول بکنا شروع کیا۔

میں نے کہا دیکھئے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جواب بہت زیادہ کڑوا ہے تاہم اس میں سے بہت کڑوے اجزاء میں نے نکال لیے تھے کہنے لگے کہہ دو، وہ بھی کہہ دو، میں نے کہا کہہ دوں؟ اس نے کہا ہاں میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اب کچھ تحمل کا مادہ پیدا ہو گیا ہے تو سنئے مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق تو نہیں، کیا وجہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کو خود کے لیے حلال سمجھتے ہیں اور میرے لیے حرام، مجھے اجازت دو اور دو بچے مجھ

سے بھی جنوادو۔ اسی طرح مجھ اور آپ کے بہنوئی میں کوئی فرق نہیں کیا وجہ ہے کہ اپنی بہن کو اپنے بہنوئی کے لئے آپ جائز سمجھتے ہیں اور میرے لئے ناجائز، اسی طرح کیا وجہ ہے کہ اپنی والدہ کو اپنے والد کے لیے حلال سمجھتے ہیں اور میرے لیے حرام کہتے ہو حالانکہ بظاہر مجھ میں اور آپ کے والد میں کوئی فرق نہیں بلکہ پرانے وضع قطع کے ہوں تو شاید ان کی بھی داڑھی ہو، غرض ہم دونوں ایک سے ہیں کیا وجہ ہے کہ ان کے لیے آپ کی والدہ حلال اور میرے لیے حرام؟ پنڈت جی بہت بہت شرمندہ ہوئے اور جتنے الفاظ انکی ڈکشنری میں تھے غصہ میں سارے ہی کہہ دیئے میں نے کہا پنڈت جی اب بہت ہو گیا اب ذرا سنبھل کر بیٹھو آپ کا غصہ اور ناراض ہونا حماقت اور جہالت ہے آپ اپنے مذہب سے واقف نہیں جو ناراض ہو رہے ہیں آپ کی کتاب ستیارتھ پرکاش ص ۱۲۹ میں لکھا ہے کہ جو شخص روپیہ حاصل کرنے کے لئے یا علم حاصل کرنے کے لئے باہر پردیس میں گیا ہو، اور اسکے پیچھے اسکی بیوی کو اولاد حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اسکے واسطے جائز ہے کہ اپنے پڑوسی سے حاصل کر لے۔ میں نے کتاب کھول کر دکھادی اسکے بعد میں نے کہا اب بتایئے میں نے کیسے خلاف کیا اگر کوئی آپ کے پڑوس میں رہتا ہو اور آپ کہیں باہر گئے ہوں اور آپکی بیوی کو اولاد حاصل کرنے کی خواہش ہو تو آپ کی کتاب کی رو سے بالکل جائز ہے کہ غیر سے اولاد حاصل کرلے۔ بس اب اٹھ کر چل دیئے۔ میں نے کہا پنڈت جی معاف کرنا سؤر کا جواب تو ایسا ہی ہے۔ اس نے کہا ہاں اب مجھے سؤر بھی کہہ دو میں نے کہا کہ میں بہت دیر سے کہہ رہا ہوں کوئی نہ سمجھے تو میں کیا کروں۔ (ملفوظات فقیہ الامت سے ماخوذ)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دہریئے سے گفتگو

ایک ملحد مادہ پرست خلیفہ ہارون الرشید کے پاس آیا، اور کہا:

اے امیر المومنین! تیرے عہد کے علماء مثلاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اتفاق کیا کہ اس دنیا کا کوئی خالق ضرور ہے، ان میں سے جو عالم و فاضل ہو اسے یہاں ضرور حاضر ہونے کا حکم دیا جائے تاکہ میں تیرے سامنے اسکے ساتھ بحث کروں کہ "دنیا کا کوئی بنانے والا نہیں"۔

ہارون الرشید نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پیغام بھیجا اور کہا:

اے تمام مسلمانوں کے امام! آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ایک مادہ پرست آیا ہوا ہے اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کا صانع کوئی نہیں، اور آپ کو مناظرے کی دعوت دیتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں ظہر کے بعد جاؤں گا وقت مقررہ پر خلیفہ نے امام صاحب کا استقبال کیا آپ کو ساتھ لایا اور بلند مقام پر جگہ دی۔ امراء اور رؤساء، دربار میں جمع ہوئے ملحد نے کہا:

اے ابوحنیفہ! آپ نے آنے میں دیر کیوں کر دی؟

امام صاحب نے کہا:

مجھے ایک عجیب بات پیش آئی، اس لیے دیر ہو گئی کہ میرا گھر دریائے دجلہ کے اس پار ہے، میں اپنے

گھر سے نکلا اور دجلہ کے کنارے آیا تاکہ اسے عبور کر دوں میں نے دجلہ کے کنارے ایک پرانی اور شکستہ کشتی دیکھی جس کے تختے بکھر چکے تھے، جونہی میری نگاہ اس پر پڑی، تختوں میں اضطراب پیدا ہوا، پھر انہوں نے حرکت کی اور اکٹھے ہو گئے ایک حصہ دوسرے کے ساتھ پیوست ہو گیا اور بغیر کسی بڑھئی سالم کشتی تیار ہو گئی، میں اس کشتی پر بیٹھا پانی عبور کیا اور یہاں آ گیا۔

ملحد نے کہا:

اے رئیسو! جو کچھ تمہارا پیشوا اور امام اور تمہارے عہد کا افضل انسان کہہ رہا ہے، اسے سنو کیا تم نے اس سے زیادہ جھوٹی بات سنی ہے، یہ تو خالص جھوٹ ہے جو تمہارے فاضل ترین عالم سے ظاہر ہوا ہے۔

یہ سن کر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مخاطب ہوئے اور فرمایا:

تمہارا کیا خیال ہے میں غلط کہہ رہا ہوں؟

ملحد نے کہا: جی ہاں! کیا غلط نہیں تو یہ صحیح ہے کہ کشتی بغیر بنانے والے کے بن جائے آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

سن اے کافر مطلق! اگر کسی کارندے اور بڑھئی کے بغیر کشتی حاصل نہیں کی جا سکتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر عظیم نظام دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں آ جائے اور بغیر کسی چلانے والے کے چل سکے۔ تو صانع کی نفی کا کیسے قائل ہو گیا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

(ماخوذ از مخزن اخلاق)

رومی وزیر کے تین سوالات اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات

قیصر روم نے ایک دفعہ خلیفہ منصور کے پاس اپنا وزیر اس غرض سے بھیجا کہ وہاں کے علماء اور فضلاء کو جمع کر کے ان سے تین سوالات دریافت کرے، اگر وہ ان کے مسکت اور تسلی بخش جواب دے دیں تو ٹھیک ورنہ خلیفہ کو کہنا کہ آئندہ خراج ادا کرنا ہوگا۔

خلیفہ منصور نے دربار لگایا اور علماء کو جمع کیا ان میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ رومی وزیر منبر پر بیٹھا اور اپنے سوال پیش کئے۔ مختلف اصحاب علم نے جواب دیئے، مگر بات قاطع نہ ہو سکی۔ آخر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جوابات دینے کی اجازت حاصل کی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (رومی وزیر سے): تم اس وقت سائل کی حیثیت میں ہو اور میں مجیب (جواب دینے والا) پس منبر پر بیٹھنا سائل کا نہیں بلکہ مجیب کا منصب ہے۔

خلیفہ: ہاں بات بہت درست ہے (اس پر رومی وزیر منبر سے اتر آیا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس جگہ

اطمینان سے بیٹھ گئے۔اس ڈرامائی صورت واقعہ سے مجلس کا ماحول تبدیل ہو گیا)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (رومی وزیر سے) اب اپنے سوالات پیش کرو۔

رومی وزیر: میرا پہلا سوال یہ ہے کہ خدا سے پہلے کیا چیز تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: تم ایک، دو، تین، چار، پانچ کی گنتی تو جانتے ہو۔ذرا یہ بتاؤ کہ ایک سے پہلے کون سا عدد ہے؟

رومی وزیر: ایک سے پہلے کوئی عدد نہیں، یہی سب سے پہلے ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: تو پھر جب محض حسابی عدد "ایک" کا حال یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی عدد کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو خدا جو حقیقت میں واحد (ایک) ہے اس سے پہلے کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے؟

رومی وزیر: میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ خدا کا منہ کس طرف ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: پہلے یہ بتاؤ کہ چراغ کی روشنی کا منہ کس طرف ہے؟

رومی وزیر: چاروں طرف۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: اب سوچو کہ آگ جو عارضی نور ہے جب اس کیلیے کوئی خاص سمت معین نہیں کی جا سکتی کہ اس کا منہ فلاں طرف ہے تو پھر اس اصلی نور یعنی خدا کے لیے کوئی خاص رخ کیونکر معین ہو سکتا ہے۔

رومی وزیر: میرا تیسرا سوال یہ ہے کہ خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: اس وقت اس نے اپنے دوسرے کاموں کیساتھ ایک کام یہ بھی انجام دیا ہے کہ اس نے تمہیں منبر سے اتار کر میرے سامنے کھڑا کر دیا ہے اور تمہاری جگہ مجھے منبر پر بٹھا دیا ہے۔

رومی وزیر ساکت ہو گیا اور اس کا سر جھک گیا خلیفہ منصور اور مجمع علماء حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حاضر جوابی اور نکتہ رسی پر حیران رہ گئے۔ (اسلامی انسائیکلوپیڈیا۔منشی محبوب عالم)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا دلچسپ واقعہ

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے والد ابراہیم ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے، ان کی والدہ نے فکر معاش کی وجہ سے انہیں ایک دھوبی کے حوالے کر دیا لیکن انہیں پڑھنے کا شوق تھا۔ یہ جا کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں بیٹھنے لگے، والدہ کو علم ہوا تو انہوں نے منع کیا، اور اس بناء پر کئی روز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں نہ جا سکے۔ ذہین اور شوقین طالب علم کی طرف استاذ کی توجہ طبعی بات ہے۔ جب کئی دن کے بعد وہ درس میں پہنچے تو امام صاحب نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی انہوں نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے درس کے بعد انہیں بلایا ایک تھیلی حوالے کی جس میں سو درہم تھے اور فرمایا کہ "اس سے کام چلاؤ اور جب ختم ہو جائیں تو مجھے بتانا" حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی مجھے امام صاحب کو یہ بتانے کی نوبت نہیں آئی کہ تھیلی ختم ہو چکی ہے، ہمیشہ جب پیسے ختم ہو جاتے امام صاحب خود ہی مزید پیسے عطا فرما دیتے، جیسے انہیں ختم ہونے کا الہام ہو جاتا ہو۔

ان کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہوں گی کہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے کوئی مستقل ذریعہ معاش ہونا چاہیے ،اس لیے ایک مرتبہ انہوں نے امام ابوحنیفہ سے کہا یہ یتیم بچہ ہے میں چاہتی ہوں کہ کوئی کام سیکھ کر کمانے کے لائق ہو جائے۔ اس لیے آپ انہیں اپنے درس میں شریک ہونے سے روکیے۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ''یہ تو پستے کے تیل میں فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے'' والدہ نے اسے مذاق سمجھا اور چلی گئیں۔

لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے اسی علم کی بدولت وہ قدر و منزلت عطا فرمائی کہ میں قاضی القضاۃ کے منصب تک پہنچا، اور اسی دوران بکثرت خلیفہ وقت ہارون الرشید کے دستر خوان پر کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ایک روز میں ہارون الرشید کے پاس بیٹھا تھا کہ اس نے ایک پیالہ مجھے پیش کیا اور بتایا کہ بڑی خاص چیز ہے جو ہمارے لیے بھی کبھی کبھی بنتی ہے میں نے پوچھا: امیر المومنین یہ کیا ہے؟ کہنے لگے یہ پستے کے روغن میں بنا ہوا فالودہ ہے یہ سن کر مجھے حیرت کی وجہ سے ہنسی آ گئی۔ ہارون الرشید نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے سارا قصہ سنایا، وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا اور کہنے لگا کہ:

''اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر رحم فرمائے وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو چشم سر سے نظر نہیں آ سکتا''۔ (تاریخ بغداد للخطیب: ۲۴۵/۱۴)

دودھ خراب ہو گیا تو کتے پئیں گے

عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ میں نے ایک شخص سے کہا کہ تیری بیٹی اتنی بڑی ہے شادی کر۔ کہنے لگا ابھی دودھ کی بو آتی ہے۔ بخاری مرحوم نے کہا اگر دودھ خراب ہو گیا تو بندے نہیں پئیں گے پھر کتے پئیں گے۔ سمجھ لینا میں کچھ کہہ گیا ہوں۔ یہ آج کل عام بیماری ہے، اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔ تمہاری بیٹیاں بتول سے زیادہ پاک دامن ہیں؟ بی بی بتول تقریباً ۱۹ سال کی تھی، بی بی فرماتی ہے میں آٹا گوندھ رہی تھی کہ ابا آ گئے فرمایا: بیٹی آٹے کو چھوڑ دو، اور کپڑے بدل کر ہاتھ دھو کر اندر بیٹھ جاؤ! ابوبکر کی بی بی آئے گی اور تجھے سنوارے گی۔ آج خدیجہ ہوتی تو تیری شادی کا مزا کچھ اور ہوتا، افسوس! کہ میری بیٹی یتیم ہو کر جا رہی ہے۔

آنسو آ گئے خدیجہ یاد آ گئی، بی بی نے کہا، حضرت! تنور تیار ہے، آٹا مل رہی ہوں۔

آپ میرے ہاتھ کی روٹی پسند کرتے ہیں اس کا انتظام میں کر رہی ہوں۔ فرمایا بیٹی: آج! روٹی کھا لوں تو امت سالوں دیر کرے گی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) روٹی اس وقت کھائے گا جب خدا کا حکم ہوگا۔ میں اسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کر رہا ہوں جس کی اس ماہ مبارک میں آمد ہوئی۔ (گلہائے رنگا رنگ: ۲۰۶)

میں نماز پڑھ رہا تھا

ایک روز نواب مرزا داغ دہلوی (۱۸۳۱ء۔ ۱۹۰۵ء) نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور انہیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اس وقت داغ نے سلام پھیرا ملازم نے کہا ''فلاں

صاحب آئے تھے اور چلے گئے‘‘ فرمانے لگے ’’دوڑ کر جا، ابھی راستے میں ہوں گے‘‘ وہ بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا کر لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ ’’آپ آ کر چلے کیوں گئے؟ وہ کہنے لگے ’’آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لیے میں چلا گیا‘‘ داغ نے فوراً کہا: ’’حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا، **’’لا حول ولا قوۃ‘‘** تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے‘‘۔

ناقص العقل کی قابلِ داد عقل و بلاغت

ابوالاسود، زیاد بن ربیعہ والیٔ عراق کی اولاد کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن ابوالاسود کی اہلیہ نے زیاد کے یہاں اُپنے لڑکے کی تولیت کا دعویٰ کر دیا۔ ابوالاسود کی اہلیہ نے امیر کے سامنے بیان دیا کہ یہ میرا لڑکا مجھ سے زبردستی لینا چاہتے ہیں، حالانکہ میرا شکم اس کا ظرف، میری چھاتی اس کی سقایہ اور میری آغوش اس کی سواری رہی ہے۔

ابوالاسود نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ کیا تو اس طریقہ سے مجھ کو دبانا چاہتی ہے حالانکہ میں نے اس لڑکے کو تیرے شکم میں رکھا اور تیرے وضع حمل سے پہلے میں نے اس کو (بحالتِ نطفہ) وضع کیا تھا۔ عورت نے کہا کہ تیری اور میری اس سلسلہ میں برابری نہیں ہو سکتی، اسلیے کہ جس وقت یہ تیرے شکم میں تھا، تو بہت ہلکا تھا اور جب تجھ سے منتقل ہو کر میرے شکم میں آیا تو بوجھل ہو کر رہا، تیرے شکم سے وہ شہوت کے ساتھ خارج ہوا، لیکن جب میرے شکم سے برآمد ہوا تو سخت تکلیف کے ساتھ نکلا۔

امیر زیاد نے عورت کا بیان سن کر ابوالاسود سے کہا کہ یہ عورت مجھ کو زیادہ عاقلہ معلوم ہوتی ہے، لہٰذا آپ اس کا لڑکا اس کو دے دیں۔ یہ اس کی پرورش اچھے طریقے سے کرے گی۔ (گلہائے رنگا رنگ: ۳۰۱)

شادی سادی ہونی چاہیے

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ طواف کر رہے تھے۔ میں نے طواف کے دوران حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی بیٹی سے شادی کا پیغام دیا، تو وہ خاموش رہے اور میرے پیغام کا کوئی جواب نہ دیا، میں نے کہا کہ اگر یہ راضی ہوتے تو کوئی نہ کوئی جواب ضرور دیتے اب اللہ کی قسم! میں ان سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ اللہ کی شان وہ مجھ سے پہلے واپس پہنچ گئے، میں بعد میں مدینہ آیا، چنانچہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں داخل ہوا اور جا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انہوں نے خوش آمدید کہا اور فرمایا: کب آئے ہو؟ میں نے کہا ابھی پہنچا ہوں، انہوں نے فرمایا ہم لوگ طواف کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے کا دھیان جما رہے تھے اس وقت تم نے مجھ سے (میری بیٹی) سودہ بنت عبداللہ کا ذکر کیا تھا، حالانکہ تم مجھ سے اس بارے میں کسی اور جگہ بھی مل سکتے تھے میں نے کہا ایسا ہونا مقدر تھا، اس لیے ایسا ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا اب تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

میں نے کہا اب تو پہلے سے بھی زیادہ تقاضا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں حضرت سالم اور حضرت عبداللہ کو بلا کر میری شادی کردی۔ (حیاۃ الصحابہ ۳/۳۵۴)

ایک تاریخی شادی

ایک باپ جب اپنی لڑکی کو کسی کے حوالے کرتا ہے، تو یہ اس کے لیے نازک ترین وقت ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ شاید وہی لوگ کرسکتے ہیں جو خود اس تجربے سے گزرے ہوں۔ بڑے بڑے لوگوں کے قدم اس مقام پر آکر پھسل جاتے ہیں۔

ان حالات میں بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک باپ اپنی لڑکی کے نکاح کے لیے امیر کبیر شہزادے کے بجائے ایک غریب طالب علم کو پسند کرے۔ موجودہ زمانے میں تو اس کو سوچا بھی نہیں جاسکتا مگر تاریخ کا ایک دور ایسا گذرا ہے جب یہ ناممکن چیز نہ تھی بلکہ وقوع پر آئی تھی۔

سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ ایک جلیل القدر تابعی ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال مدینہ کے ایک صحابی کے گھر میں پیدا ہوئے، اور 75 سال کی عمر میں 94ھ کو انتقال فرمایا۔

سعید بن مسیب کو بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا، مشہور حافظ حدیث حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان کے خسر تھے اس وجہ سے خصوصیت کے ساتھ استفادہ کا موقع ملا، چنانچہ سعید بن مسیب کی روایات کا بڑا حصہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کے احادیث پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ اور عالم تھے۔ میمون بن مہران رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں جب مدینہ گیا اور وہاں کے سب سے بڑے فقیہ کا پوچھا تو لوگوں نے مجھے سعید بن مسیب کے گھر پہنچادیا۔ ابن حبان کے الفاظ ہیں، وہ تمام اہل مدینہ کے سردار تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کو جب کوئی مسئلہ میں اشکال پیش آتا تو وہ ان کے پاس لکھ بھیجتے تھے۔

زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے بارے میں فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ نماز باجماعت کا اتنا اہتمام تھا کہ چالیس سال تک ایک وقت کی نماز بھی باجماعت ناغہ نہیں ہوئی۔ مدینہ کے تاریخ میں حرہ کا واقعہ نہایت مشہور ہے۔ یہ واقعہ یزید اور عبداللہ بن زبیر کے اختلاف کے زمانے میں پیش آیا اہل مدینہ نے جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حمایت میں عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کو سردار بنا کر یزید کی بیعت توڑ دی، اس وقت یزید کی فوجیں تین دن تک مدینۃ الرسول میں قتل عام کرتی رہیں اور اس کو لوٹتی رہیں۔ اس پرآشوب زمانہ میں کوئی شخص گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ مسجدوں میں بالکل سناٹا رہتا تھا۔ ایسے نازک وقت میں بھی سعید بن مسیب مسجد ہی میں جا کر نماز پڑھتے تھے۔ لوگ انہیں دیکھ کر کہتے ذرا اس بوڑھے مجنوں کو دیکھو، کہ اس حالت میں بھی مسجد نہیں چھوڑتا۔

اموی حکومت کا بانی مروان بن حکم اپنے بعد علی الترتیب عبدالملک اور اس کے بھائی عبدالعزیز کو خلیفہ بنایا گیا تھا، مروان کے بعد عبدالملک کی نیت میں فتور آیا، اس نے عبدالعزیز کو ولی عہدی سے خارج

کر کے اپنے لڑکوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد بنانا چاہا، لیکن پھر قبیعہ بن ذویب کے سمجھانے سے رُک گیا عبدالملک کی خوش قسمتی سے جلد ہی عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا۔

اب عبدالملک کے لیے میدان صاف تھا، اس نے ولید اور سلیمان کو ولی عہد بنا کر ان کی بیعت کے لیے صوبیداروں کے نام فرمان جاری کر دیئے۔ ہشام بن اسماعیل جو مدینہ کا والی تھا، اس نے اہل مدینہ سے بیعت کے لیے سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا، انہوں نے جواب دیا میں عبدالملک کی زندگی میں دوسری بیعت نہیں کر سکتا۔

یہ ایک بہت سنگین معاملہ تھا، کیونکہ سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت کے معنی یہ تھے کہ مدینہ سے ایک بھی ہاتھ بیعت کے لیے نہ بڑھے۔ چنانچہ ہشام نے سعید بن مسیّب کو کوڑے سے پٹوایا، اور ان کو سخت سزائیں دیں، اس کے بعد ابوبکر بن عبدالرحمان کو ان سے گفتگو کے لیے بھیجا گیا۔ واپسی کے بعد ہشام نے پوچھا، کیا سعید مار کے بعد کچھ نرم پڑے؟ ابوبکر نے جواب دیا۔ تمہارے اس سلوک کے بعد خدا کی قسم! وہ پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے ہین اپنا ہاتھ روک لو۔

عبدالملک نے تدبیر سوچی اور جو شخص کوڑوں کی مار سے راضی نہیں ہوا تھا اس کو دنیا کے لالچ سے رام کرنے کا منصوبہ بنایا، سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لڑکی جو خوبصورتی اور سیرت دونوں میں بہت ممتاز تھی اور اسی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم (یافتہ) بھی تھی اس نے سوچا کہ ولی عہد سے اس کا نکاح کر کے اس کو اپنی بہو بنا لے، اس طرح باپ خود نرم پڑ جائے گا، اس نے امیر مدینہ ہشام بن اسماعیل المخذومی (جو سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز بھی تھے) کے ذمہ سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کو راضی کرنے کا کام سپرد کیا۔

ہشام کو اپنی ناکامی کی پوری امید تھی، لیکن خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے اس کے بعد کہا۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے، عبدالملک بن مروان نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کے لیے عوام سے بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے، بیعت لینے سے قبل امیر المومنین یہ بھی چاہتے ہیں کہ ولید کو آپ اپنی دامادی کا شرف بخشیں۔

یہ سنتے ہی سعید بن مسیّب کے چہرے کا رنگ غصہ سے متغیر ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ان دونوں میں سے کچھ بھی منظور نہیں۔

اس انکار کے نتیجے میں سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کو دوبارہ مختلف قسم کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اور طرح طرح سے ان پر دباؤ ڈالے گئے۔ مگر وہ اپنے انکار پر برابر قائم رہے اور دوسری طرف یہ سوچتے رہے کہ کوئی مناسب رشتہ سامنے آئے، تو لڑکی کا عقد کر دیا جائے، اس کے بعد قریش کے ایک گمنام اور غریب آدمی ابووداعہ کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔

مشہور مؤرخ ابن خلکان نے خود ابووداعہ کی زبانی یہ واقعہ نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے، جس کا

ترجمہ حسب ذیل ہے۔

''میں سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ میں پابندی سے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ مدت تک حاضر نہ ہو سکا، اس کے بعد جب گیا تو انہوں نے پوچھا، اتنے دنوں سے تم کہاں تھے؟ میں نے جواب دیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکا، انہوں نے کہا پھر ہمیں کیوں نہ تم نے باخبر کیا ہم بھی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے، اس کے بعد جب میں اٹھنے لگا تو انہوں نے کہا تم نے دوسری بیوی کا کوئی انتظام کیا؟ میں نے کہا خدا آپ پر رحم فرمائے، کون میرے ساتھ شادی کریگا، جب کہ میں دو چار درہم سے زیادہ کی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں انہوں نے کہا کہ اگر میں کروں تو تم کرنے کے لئے تیار ہو، میں نے کہا بہت خوب اس سے بہتر کیا ہے اس کے بعد انہوں نے اللہ کی حمد بیان کی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور اسی وقت دو یا تین درہم پر میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا (حنفیہ کے نزدیک دس درہم سے کم پر نکاح جائز نہیں)۔ ابووداعہ کہتے ہیں کہ میں اسکے بعد وہاں سے اٹھا اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں اپنے مکان پر پہنچا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ اب رخصتی وغیرہ کے لئے قرض کہاں سے حاصل کروں؟ میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس دن میں، روزہ سے تھا نماز کے بعد چاہا کہ میں کھانا کھاؤں، جو کی روٹی تھی اور زیتون کا تیل اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی میں نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی، سعید میں نے سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کو چھوڑ کر اس نام کے ہر شخص کو تصور کیا کیونکہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ تو چالیس برس سے اپنے گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں دیکھے نہیں گئے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کھڑے تھے انکو دیکھ کر معاً خیال ہوا کہ شاید انکا خیال بدل گیا ہے اور وہ فسخ نکاح کرانے آئے ہیں۔ میں نے کہا اے ابو محمد (ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت) آپ نے کیوں زحمت فرمائی، مجھے بلا بھیجا ہوتا انہوں نے کہا نہیں اس وقت مجھ ہی کو تمہارے پاس آنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا پھر کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا مجھے خیال آیا کہ تم اپنے گھر میں تنہا ہو گے، حالانکہ اب تو تمہاری شادی ہو چکی ہے مجھے گوارا نہیں ہوا کہ تم تنہا رات بسر کرو اور یہ ہے تمہاری بیوی۔ انہوں نے صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر کے باہر سے خود ہی دروازہ بند کر دیا اور واپس چلے گئے۔

میری بیوی شرم کے مارے گر پڑی، پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کے بعد چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی، وہ لوگ جمع ہوئے اور پوچھا کیا قصہ ہے؟ میں نے کہا سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے آج اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا اور آج ہی اچانک وہ گھر بھی پہنچا گئے اور یہاں وہ گھر میں موجود ہے لوگوں نے آ کر اسے دیکھا اور میری ماں کو خبر ہوئی تو وہ بھی آ گئیں اور انہوں نے کہا اس کو چھونا تمہارے لیے حرام ہے جب تک میں حسب دستور تین دن تک اسے بنا سنوار نہ لوں، چنانچہ میں تین دن تک رکا رہا۔ اسکے بعد اسکے پاس گیا میں نے پایا کہ وہ ایک حسین و جمیل خاتون ہے۔ کتاب اللہ کی حافظہ اور سنت رسول اللہ کی عالمہ ہے اور حقوق شوہر کو خوب پہچاننے والی ہے۔ ابووداعہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ماہ تک میں گھر ہی پر رہ

گیا اس دوران میں سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا نہ کوئی حال معلوم ہوا، اور نہ ان سے ملاقات ہوئی پھر ایک مہینے کے بعد میں انکی صحبت میں حاضر ہوا، اس وقت وہاں مجلس قائم تھی، میں نے سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کوئی بات چیت نہ کی، یہاں تک کہ جو لوگ مسجد میں تھے، سب چلے گئے۔ اسکے بعد جب میرے سوا کوئی وہاں نہیں رہ گیا تو انہوں نے پوچھا تمہارے ساتھی کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا بہتر حال ہے انہوں نے کہا: "ان رابك شئ فالعصا" (یعنی وہ کوئی ناپسندیدہ حرکت کرے تو اسے مارو)

پھر میں اپنے گھر لوٹ آیا، یہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کی لڑکی تھی جس کے لئے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکے ولید کا پیغام دیا تھا جب اس نے اس کو ولی عہد بنایا تھا تو سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے شہزادہ ولید سے رشتہ کرنے سے انکار کیا جس کی وجہ سے عبدالملک، سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پڑ گیا، یہاں تک کہ سخت سردی کے دن انہیں کوڑے سے پیٹا گیا، اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالا گیا۔ (ابن خلکان ۱/۲۰۷، ماہ نامہ رضوان لکھنو، اکتوبر ۱۹۶۶ء، ۸)

قسطوں میں زیادہ قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو دکان دار قسطوں میں اشیاء فروخت کرتے ہیں، وہ عام بازاری قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، مثلاً ایک موٹر سائیکل کی قیمت عام بازار میں تیس ہزار ۳۰۰۰۰ روپے ہے لیکن قسطوں میں فروخت کرنے والے ۳۵۰۰۰ روپے اس کی قیمت لگائیں گے۔ اب اگر اس کی قیمت طے ہوجائے اور قسطیں متعین ہوجائیں کہ کتنی قسطوں میں اس کی ادائیگی کی جائے گی تو یہ صورت جائز ہے، البتہ اگر خریدار نے کوئی قسط وقت پر ادا نہ کی تو اس کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جب ایک مرتبہ قیمت متعین ہوگئی تو اس میں اضافہ کرنا بعد میں جائز نہیں ہے۔ (تقریر ترمذی ۱/۱۰۴)

ف: عموماً قسط کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ ہوتا ہے جو ناجائز ہے۔ (مؤلف)

نماز جنازہ سیکھو، اور پڑھو!

سوال: کہ جب کسی شخص کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت میں اس کے اولیاء میں جو قریب ترین ہوتا ہے، اس کو نماز جنازہ پڑھانے کا حق ہے، مثلاً بیٹا ہے یا باپ ہے وغیرہ۔ تو سوال ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ مطلع فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں؟

جواب: آپ نے جو سوال کیا ہے، کہ ولی اقرب کو زیادہ حق ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ تو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ نماز میں مرحوم کے لیے دعائے مغفرت ہوتی ہے، تو ولی اقرب جس درد و غم سے دعا کرے گا، اتنا کوئی اور نہیں کرسکتا، اور جب کوئی دعا، دل سے کی جاتی ہے تو قبول ہوتی ہے۔ علماء نے اور بھی وجوہات لکھے ہیں لیکن بندہ کے ذہن میں یہ وجہ ہے۔

آج کل بہت سے لوگ نماز جنازہ نہیں جانتے، ان کو نماز جنازہ سیکھنی چاہیے تا کہ وقت آنے پر

مرحوم آپ کی دعا سے مغفرت سے محروم نہ رہے۔ (بکھرے موتی ۳/۵۵)

نماز کب گناہ سے روکتی ہے؟

سوال: بعد سلام عرض ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور گناہوں سے بچاؤ نہیں ہوتا، حالانکہ قرآن میں ہے کہ نماز بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے؟

جواب: اس کو ایک مثال سے سمجھیے کہ جس طرح دواؤں کی مختلف تاثیرات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں دوا فلاں بیماری کو روکتی ہے اور واقعۃً ایسا ہوتا ہے لیکن کب؟ جب دو باتوں کا التزام کیا جائے۔

۱) دوا کو پابندی سے اس طریقہ اور شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے جو حکیم یا ڈاکٹر بتلائے۔

۲) پرہیز یعنی ایسی چیزوں سے اجتناب کیا جائے جو اس دوا کے اثرات کو زائل کرنے والی ہوں۔

اسی طرح نماز کے اندر بھی یقیناً اللہ نے ایسی روحانی تاثیر رکھی ہے کہ یہ انسان کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ لیکن اس وقت جب نماز کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان آداب وشرائط کے ساتھ پڑھا جائے جو اس کی صحت وقبولیت کے لیے ضروری ہوں۔ (بکھرے موتی: ۳/۳۱۸)

دین میں زیادہ باریکیاں نکالنا؟

یہاں ایک بات سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ شبہات میں زیادہ باریکیاں نکالنا اس شخص کے لئے مناسب ہے جس کے اور حالات بھی بلند ہوں۔ اسکے ورع اور تقویٰ کا معیار بھی اچھا ہو، لیکن جو شخص کھلم کھلا محرمات کا ارتکاب کرے اس کے بعد باریکیاں نکال نکال کر متقی بننے کا شوق رکھے، تو اس کے لئے یہ صرف ناموزوں ہی نہیں بلکہ قابلِ مذمت ہوگا۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک عراقی نے پوچھا کہ اگر حالتِ احرام میں مچھر مار دے، تو اسکی کیا جزاء ہونی چاہیے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو، تو شہید کر ڈالا، اب مجھ سے مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلے آئے ہیں، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کانوں سے سنا کہ دنیا میں وہ میرے دو پھول ہیں۔

اسی طرح بشر بن الحارث سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک شخص کی والدہ یہ کہتی ہے کہ تو اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا اگر وہ شخص اپنی والدہ کے تمام حقوق ادا کر چکا ہے اور اس کی فرمانبرداری میں اس معاملہ کے سوا اور کوئی بات باقی نہیں رہی، تو اسے طلاق دے دینی چاہیے، اور اگر ابھی کچھ اور مراحل بھی باقی ہیں تو طلاق نہیں دینی چاہیے۔ (ترجمان السنۃ: ۲/۲۲۲)

ہمارے اکابر کی جامعیت

نماز کے بعد لوگوں میں اسکا چرچا ہوا۔ عربیوں میں تو اس کا چرچا کم ہوا، لیکن ہندیوں میں اس کا چرچا زیادہ ہوا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسکی شکایت ہوئی مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ چونکہ عارف تھے، صاحب

حال پر ملامت نہیں کرتے تھے کیونکہ حضرات عارفین کو لغزش کا انشا معلوم ہوتا ہے اسی لیے حضرت سنتے رہے اور ہنستے رہے کیونکہ نماز تو فاسد ہوئی نہ تھی چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز کے اندر دعا اگر غیر عربی میں ہو تو حرام ہے مگر مفسد صلوۃ نہیں اور حرمت اس لیے نہ تھی کہ مغلوب الحال تھے، معذور تھے، اس لیے حضرت تبسم فرماتے رہے۔ باقی زبان سے اس تفصیل کا اس لیے اظہار نہ فرمایا کہ فتنہ ہوگا (اس موقعہ پر حضرت کی جامعیت پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ جامع۔ (ملفوظات حکیم الامت ۲۹/۳)

اصلاح کے باب میں شدت اور حدت کا فرق

فرمایا کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں ایک شخص کو دیکھا جس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے تھا۔ آپ نے بعد وعظ اس سے کہا کہ ذرا ٹھہر جایئے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ خلوت میں بٹھا کر یوں فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ڈھلک جاتا ہے اور حدیث میں یہ وعیدیں آئی ہیں۔ اور آپ اپنا پائجامہ دکھلانے کے لئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ خوب غور سے دیکھنا کہ کیا واقعی میرا خیال صحیح ہے یا محض وہم ہے، اس شخص نے شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ حضرت آپ کے اندر تو یہ عیب کیوں ہوتا، البتہ میرے اندر ہے مگر اس طریق سے آج تک مجھے کسی نے سمجھایا نہیں تھا اب میں تائب ہوتا ہوں، ان شاء اللہ، آئندہ ایسا نہ کروں گا، ہمارے اکابر کا ہمیشہ سے یہی معمول رہا ہے کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے، نہایت احترام سے اسکو نصیحت کرتے ہیں تشدد نہیں کرتے اور بعض میں جو اس شدت کا شبہ ہوتا ہے

جس کی حقیقت غیرت ہے لوگ حدت اور شدت میں فرق نہیں کرتے۔ حدت اور ہے شدت اور ہے۔ حدت لوازم ایمان سے ہے، مومن بہت غیرت مند ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی کسی کی بیوی کو چھیڑے تو غصہ آتا ہے اب اگر دیکھنے والا یہ کہے کہ یہ تو بہت تیز مزاج ہیں تو اس سے یہ کہا جائے گا کہ کمبخت کچھ نہ کہنا تو بے غیرتی ہے، اس لئے دیندار کو خلاف دین پر تحمل نہیں ہوتا۔ (ملفوظات حکیم الامت ۳/۳۳)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے میرے سامنے دریافت کیا کہ حیض کے زمانے میں جو نمازیں قضا ہوتی ہیں ان کی تو قضا نہیں اور جو روزے قضا ہوتے ہیں ان کی قضا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نہ مانو گے، تو سر پر اتنے جوتے لگیں گے، جو بال ہیں وہ بھی نہ رہیں گے۔ اس کے بعد ہمارے حضرت نے فرمایا جب تک تعلیم سادہ رہی لوگوں کے ایمان بہت قوی رہے اور جب سے یہ نئی روشنی شروع ہوئی، لوگوں کے ایمان ضعیف ہو گئے۔ ہر بات میں لم اور کیف۔ لوگوں کے قلوب سے خدا اور رسول کی عظمت اٹھ گئی، موٹی بات ہے کہ جب ہم نے خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان لیا تو انکے احکام میں چون و چرا کیسی؟ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۳۵)

عارف کا ہذیان بھی عرفان ہوتا ہے

۱) فرمایا کہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ مفقود الخبر کی عورت کے بارہ میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بتلادیا۔ سائل نے عرض کیا اس میں تو بڑا حرج ہے اور دین میں حرج نہیں، مولانا نے فرمایا کہ جہاد میں تو اس سے بھی زیادہ حرج ہے، اسکا شریعت میں حکم کیوں ہے، بڑے آئے حرج حرج کرنے والے، جاؤ اپنا کام کرو ہمارے حضرت نے فرمایا کہ دیکھئے مجذوب تھے مگر بات کیسی عمدہ فرمائی۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ عارف کا ہذیان بھی عرفان ہوتا ہے۔

۲) فرمایا کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عارف کو اگر ہذیان بھی ہوتا ہے تو وہ بھی عرفان ہی ہوتا ہے۔ مولوی محمد اسحاق صاحب ایک میرے دوست ہیں، ان کو ایک مرتبہ بہت زور کا بخار چڑھا۔ اس میں ایک مسئلہ بیان کیا کہ حدیث میں آتا ہے "المومن لاینجس" اسکا قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ جنابت کی حالت میں آپ سے ہٹنے لگے، تو آپ نے فرمایا "المومن لاینجس" اور قواعد فقہیہ میں سے ہے "المیت ینجس" (چنانچہ قبل غسل میت کے پاس تلاوت قرآن شریف کو فقہاء نے ناجائز کہا ہے اور بعد غسل جائز ہے کیونکہ میت ایسا نجس نہیں کہ بعد غسل بھی ناجائز ہی رہے)۔

تو ثابت ہوا "المومن لایموت" "بس مقولہ مشہورہ روز روشن کی طرح ثابت ہوگیا" الاان اولیاء اللہ لایموتون "اور گو اس میں کچھ عملی خدشہ ہی ہے مگر ایسی حالت میں ایسا استدلال عجیب ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت:۱۱/۱۲۳)

حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا کشف

فرمایا: کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف تھے، مگر کشف دائمی نہیں ہوتا، ایک دفعہ انکے پیچھے ایک شخص بالوں کی ٹوپی اوڑھے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا، بعد سلام اسے دیکھ کر فرمایا کہ ارے! ننگے سر نماز مکروہ ہوتی ہے، اس نے عرض کیا حضرت ننگے سر نہیں ہوں بالوں کی ٹوپی اوڑھ رہا ہوں، بس چپ ہوگئے (جامع کہتا ہے) گہے بر طارم اعلیٰ نشیم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم۔ (ملفوظات حکیم الامت:۱۱/۴۳)

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا دقیق تصوف

فرمایا: کہ مولوی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دہلی سے بہلی میں سوار ہوکر اپنے وطن کاندھلہ کو تشریف لارہے تھے بزرگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر شخص سے اسکے مذاق کے موافق گفتگو کرتے ہیں اس بہلی والے سے بہلی ہی کے متعلق کچھ پوچھنے لگے کہ بیلوں کو راتب کتنا دیتے ہو اور کیا بچت ہوجاتی ہے؟ اس سلسلہ میں اس کی زبان سے یہ بھی نکل گیا کہ یہ بہلی ایک رنڈی کی ہے اور میں نوکر ہوں

بھلا مولانا رنڈی کی گاڑی میں کیسے بیٹھ سکتے تھے (کسی طالب علم نے کرایہ کر کے لادی ہوگی مولانا کو پتہ نہ تھا) اب مولانا کا دقیق تقویٰ دیکھئے، فوراً نہ اترے تاکہ اس کی دل شکنی بھی نہ ہو تقویٰ بھی بر تاہم شخص کو نہیں آتا، ذرا دیر کے بعد بولے کہ بہلی والے بہلی کو روک لینا مجھے پیشاب کی ضرورت ہے، اس نے بہلی روکی آپ نے اتر کر پیشاب کیا اور اسکے ساتھ استنجاء سکھلاتے چلے، کہاں تک چلتے آخر ڈھیلا پھینک دیا، اس نے کہا بیٹھ جائے فرمایا ٹانگیں شل ہوگئیں ہیں ذرا دور پیدل چلوں گا تھوڑی دور چل کر اس نے پھر عرض کیا پھر ٹال دیا پھر کہا پھر ٹال دیا پھر وہ سمجھ گیا اور کہا کہ مولانا میں سمجھ گیا کہ یہ رنڈی کی گاڑی ہے آپ اس میں بیٹھیں گے نہیں پھر لیجانے سے کیا فائدہ؟ حکم دیجئے، لوٹ جاؤں۔ فرمایا ہاں بھائی بیٹھوں گا تو نہیں مگر تم کو کاندھلہ چلنا ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی اسکے پاس کرایہ کو آیا ہو اور اس نے انکار کر دیا ہو تو خواہ مخواہ نقصان ہوگا (یہاں یہ شبہ ہے کہ جب کرایہ دینا ہی تھا تو پھر کاندھلے تک خالی بہلی کیوں لائے تو بات یہ ہے کہ بعض طبیعتیں بلا کارگزاری کے لینا گوارا نہیں کرتیں یا اس کے سوا کوئی وجہ ہو) لہٰذا آپ کاندھلہ تک ویسے ہی پیدل آئے اور ہر منزل پر بیلوں کو گڑ، گھی اور گھاس دانہ کا ویسا ہی انتظام کیا اور مکان آ کر اس کو کرایہ دے کر واپس کیا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۴۹/۱۱)

بعض بدعتیوں کی بدعقلی کی ایک حکایت

فرمایا: کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بعض بدعتیوں کی حس اور عقل کے متعلق فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں اپنے بچپن کے زمانے میں جب کہ اچھی طرح پیشاب کے بعد ڈھیلا لینا بھی نہ جانتا تھا، کسی کے ہمراہ "پیران کلیر" کے میلہ میں گیا اتفاق سے جو غسل کا وقت تھا، اس وقت میں خاص مزار شریف کے پاس کھڑا ہوا تھا، سقہ جو آیا اس نے ایکدم مشک چھوڑ دی اور اسکی مشک چھوٹنے کے ساتھ ہی آدمیوں کا ریلا اندر آ گیا میں چونکہ بچہ تھا، ہجوم کیوجہ سے اس پانی میں گر گیا اور تمام کپڑے شرابور ہو گئے جب میں باہر نکلا تو لوگوں نے میرے تمام کپڑے اتار کر مجھے ننگا کر دیا، اور اس کا پانی نچوڑ کر تبرک سمجھ کر پی گئے اور پائجامہ کا پانی بھی پی گئے، جو یقیناً ناپاک تھا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۵۸/۱۱)

علماء دین کی توہین اور طعن و تشنیع کرنے کا نتیجہ

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جو لوگ علماء دین کی توہین اور ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ ان کا قبر میں قبلہ سے منہ پھر جاتا ہے اور یوں بھی فرمایا کہ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۸۶/۱۱)

شرعی احکام کو بے چون و چرا ماننا چاہیے

فرمایا: کہ کیرانہ میں ایک وکیل نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں فرض ہوئی، اسکی کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا کہ تمہارے ناک جو منہ پر بنی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر گدی پہ ہوتی، تو بری معلوم ہوتی میں نے کہا کہ ہرگز نہیں اگر سب کے گدی پر ہوتی تو بری بھی معلوم نہ ہوتی بس

اسکے بعد چپکے ہی تو ہو گئے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۹۹/۱۱)

ف: آجکل ایک فیشن چل نکلا ہے کہ احکام شرعیہ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو پوچھنا اور صرف پوچھنا ہی نہیں بلکہ اپنی اطاعت کو اس حکمت ومصلحت کے تابع بنانا کہ اگر حکمت ہماری سمجھ میں آئے گی تو عمل کریں گے ورنہ نہیں کریں گے مثلاً سود حرام ہے۔ تو آج کہنے والے کہتے ہیں کہ پہلے بتاؤ یہ کیوں حرام ہے ؟اس کا فائدہ کیا ہے؟ حرمت کی مصلحت کیا ہے؟ پھر ہم اس حکم پر عمل کریں گے۔ یہ حماقت کی بات ہے۔ (انعام الباری: ۱/ ۱۷۲)

بیویوں میں عدل کرنا واجب ہے

فرمایا: کہ اگر کوئی ہدیہ، دو عدد ایک چھوٹا ایک بڑا لاتا ہے، تو مجھے گھروں میں تقسیم کرنے کے وقت عدل میں بڑی دقت ہوتی ہے مثلاً کوئی ڈلیاں لایا ایک چھوٹی ایک بڑی تو میں اسے کیسے تقسیم کروں۔ بس اس سے کہتا ہوں کہ بھائی تم میری ملک نہ کرو کیونکہ میرے اوپر عدل واجب ہے اور تمہارے اوپر عدل واجب نہیں۔ تم ہی مقرر کردو کہ کونسی بڑے گھر اور کون سی چھوٹے گھر بھیجی جائے، ایسے ہی دھوبی کو اپنے دھونے کے کپڑے بھی خانقاہ سے دیتا ہوں، کیونکہ یہ یاد رکھنا دشوار ہے کہ پہلے کس کے یہاں سے گئے تھے اور اب کس کے یہاں سے جانا چاہیے۔ اور کپڑے درزی کو سلوانے کے لیے بھی یہیں سے دیتا ہوں اور ایسے ہی پہلے جب زنانے میں جاتا تھا تو جتنے منٹ ایک مکان میں ٹھہرتا تھا گھڑی کے حساب سے اتنے ہی منٹ دوسرے مکان میں ٹھہرتا تھا، مگر اب اس میں توسع ہو گیا کیونکہ گھر والوں نے خود اس میں رواداری کردی۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۲۶/۱۱)

تصویر دیکھنے کا شرعی حکم

فرمایا: کہ اگر تصویر قصداً دل خوش کرنے کو دیکھے، تو حرام ہے، اور اگر بلاقصد نظر پڑ جائے تو کچھ حرج نہیں۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ صنعت کے لحاظ سے دیکھے تو فرمایا: کہ مصور کی صنعت تو کیا چیز ہے، صانع حقیقی کی بعض مصنوعات کو بھی دیکھنا حرام ہے جیسے امارد و نساء کو بنظر صنعت دیکھنے لگے، فقہاء نے اس کو خوب سمجھا ہے لکھتے ہیں کہ اگر شراب کی طرف فرحت کے لیے نظر کرے تو حرام ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ اچھی چیز کو دیکھ کر رغبت ہوتی ہے (تبسم سے فرمایا) کہ ایک مسخرے نے کہا کہ مولانا! مولوی محمد مظہر صاحب مدرس سہانپور کو میں لاجواب کرونگا، اس نے مولوی صاحب کے پاس آ کر سوال کیا کہ لونڈے کو اگر اس نیت سے گھورے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسا بنایا ہے تو کیسا ہے؟ فرمایا: جہاں سے تو نکلا اسے دیکھ اس میں اللہ تعالیٰ کی صنعت بہت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ اتنی چھوٹی جگہ سے تو اتنا بڑا نکل آیا۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۳۳/۱۱)

ڈاڑھی باعث وجاہت ہے

فرمایا: کہ داڑھی عجیب چیز ہے، اس سے آدمی بہت شکیل وحسین معلوم ہوتا ہے بلکہ ایک شخص تو کہتے تھے، بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ اب تو اس کی بڑی گت بنا رکھی ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۳۶/۱۱)

صوفیاء اور فقہاء ، حکمائے امت ہیں

فرمایا: کہ مولوی صاحب نے لکھا تھا، کہ مجھے اول درجہ میں تو محدثین سے محبت ہے، پھر فقہاء سے، پھر صوفیاء سے، میں نے لکھا کہ مجھے اس ترتیب سے ہے، اول صوفیاء سے، پھر فقہاء سے، پھر محدثین سے، کیونکہ صوفیاء اور فقہاء حکمائے امت ہیں اور ان کے امت پر بڑے احسان ہیں پھر صوفیاء اہل محبت ہیں۔

ریاء کی حقیقت

فرمایا: کہ ایک شخص کا خط آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ اس طرح عبادت کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ لوگ دیکھیں۔ نماز بھی چھپ کے پڑھتا ہوں، تسبیح پڑھنے میں اگر کوئی آجاتا ہے تو اس کو کپڑے میں چھپا لیتا ہوں، تاکہ ریاء نہ ہو۔ میں نے لکھا ہے کہ کبھی اسلام چھپانے کو بھی جی چاہا، کیونکہ دولت اسلام تو بڑی چیز ہے، اس میں بھی تو ریاء ہے (مجمع کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا) محققین کا قول ہے کہ عام آدمی تو اظہار عبادت کو ریاء سمجھتے ہیں اور خواص اخفاء عبادت کو ریاء سمجھتے ہیں کیونکہ اخفاء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی نظر مخلوق پر ہے اور اصل طریق یہ ہے کہ اپنی طرف سے نہ اظہار کا قصد کرے، نہ اخفاء کا۔ اپنے کام سے کام رکھے (جامع کہتا ہے کہ مخلوق کی ذم ومدح کا امیدوار نہ رہے بس یہ مذاق پیدا کرے)

دل آرامے کہ داری دل درو بند
اگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

ریاء، فقط اظہار عبادت سے تھوڑا ہی ہوتی ہے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی عبادت کو اس نیت سے ظاہر کرنا کہ لوگ میری بزرگی کے معتقد ہو جائیں، باقی رہا نفس اظہار سو وہ کوئی ریاء نہیں اور اگر کسی کے اعتقاد کا بلا اختیار آئے، تو وہ وسوسہ ریاء ہے، ریاء نہیں۔ بس اپنی طرف سے قصداً اظہار نہ کرے، نہ یہ کہ لوگوں میں چھپتا پھرے، دیکھا اس طریق میں کیسے کیسے دھوکے ہیں۔ بلا رہبر اس طریق میں چلنا بہت مشکل ہے۔

گر ہوائے ایں سفر داری دلا ☆ دامن رہبر بگیر وپس بیا
بے رفیقی ہر کہ شد در راہ عشق ☆ عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق
در ارادت باش صادق اے فرید ☆ تابیابی گنج عرفان راکلید
نفس نتواں کشت الا ظل پیر ☆ دامن آن نفس کش راسخت گیر

شیطان بڑے دور کی جھاتا ہے، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو ذکر جہر تعلیم کیا اس نے کہا کہ اس میں تو ریاء ہوگی، فرمایا کہ جب ذکر خفی کرو گے اور لوگ دیکھ کر یہ کہیں گے کہ نہ معلوم اس وقت شاہ صاحب عرش کی سیر کر رہے ہیں یا کرسی کی۔ تو کیا یہ ریاء نہ ہوگی، بس جاؤ، اپنا کام کرو، ایک نقشبندی نے چشتی سے کہا کہ میں نے سنا ہے آپ ذکر جہر کرتے ہیں اشارہ لطیف تھا، کہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا اور ریاء ہوگی چشتی نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ذکر خفی کرتے ہیں (مطلب یہ کہ جب خفی کی بھی لوگوں کو خبر ہوگی تو

خفی سے یہ فائدہ ہوا) اور ذکر جہر سے بچنے کا سبب بجز نفس کا ایک کید بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جب ذکر جہر کرے گا تو ظاہر ہے پڑوسیوں کو خبر ہوگی اور جس دن نہ اٹھے گا تو سمجھیں گے کہ آج شاہ صاحب نہیں اٹھے اور ذکر خفی میں جس دن چاہے کرو جس دن چاہے نہ کرو کبھی اسلیے خفی کو اختیار کیا جاتا ہے، یہ ہیں دھوکے جن پر مبصرین ہی کی نظر پہنچتی ہے اس واسطے شیطان پر ایک فقیہ ہزار عابدوں سے بھاری ہے۔ حدیث ہے ''فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد'' یونکہ شیطان مدت میں تو ایک کید بناتا ہے اور یہ اس کے کید پر مطلع ہو کر ذرا سی دیر میں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/ ۱۴۴)

آجکل کے مجتہدین کی مثال

فرمایا: کہ بعض لوگ جمعہ، زوال سے پہلے پڑھ لیتے ہیں۔ خدا جانے یہ کہاں سے سمجھا ہے اور اس باب میں جو شیخین کی حدیث ہے'' ماکنا نقیل لانتغدی الابعد الجمعة '' اس سے تو صرف یہ پتا چلتا ہے کہ ہم قیلولہ بعد جمعہ کے کرتے تھے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ جمعہ وقت سے پہلے ادا کر لیتے تھے انہوں نے قیلولہ اور کھانے کو تو اپنی جگہ اور وقت سے نہ ہٹایا اور جمعہ کو ہٹا دیا، کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ جمعہ اپنے وقت پر ہوا اور قیلولہ وقت سے مؤخر ہو جائے۔ مجھے پر یاد آیا کہ ایک عقلمندوں کی بستی میں ایک سوداگر ایک شخص کی دیوار کے سایہ تلے دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور مالک بھی دیکھا کرتا تھا ایک روز اس نے اپنی چٹائی بالکل دیوار کی جڑ سے ملا کر بچھائی دوپہر تک وہ کھسک کر تھوڑی نیچے آگئی تو آپ نے اس سوداگر سے کہا کہ دیکھو بھائی یہ اچھا نہیں جو تم نے ایک بالشت ہماری دیوار ہٹادی آج کل کے نئے مجتہدین کی بھی ایسی ہی مثال ہے کہ قیلولہ اور غذا میں فرق نہ آئے، چاہے جمعہ اپنے وقت سے ہٹ جائے۔ ایک ایسے ہی جمعہ پڑھنے والے شخص نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کروں؟ میں نے کہا جو نمازیں پڑھی ہیں وہ دہراؤ اور یہ سب کلام غیر مجتہد مدعی اجتہاد کے ساتھ ہے اور جو واقع میں مجتہد ہو، اس کو حق ہے کہ نص کو اپنے ذوق سے کسی خاص محل پر محمول کرے، ان کے ساتھ یہ کلام نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/ ۱۴۶)

ننانوے قتل کرنیوالے کی توبہ کے بارے میں چند سوالات

ایک عالم نے سوال کیا کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے ننانویں خون کر کے توبہ کی اور ایک عالم کے پاس گیا کہ میں نے ننانویں خون کئے ہیں، میری توبہ مقبول ہے یا نہیں؟ اس نے کہا نہیں، تو اس نے اس کو بھی قتل کر دیا کہ اب پورے سو ہی۔ پھر ایک شخص نے دوسری بستی کے ایک عالم کے پاس جانے کا پتہ بتلایا، وہ اس بستی کی طرف چلا اور راستہ میں مر گیا تو طالب یہ امر ہے کہ جب وہ توبہ کر چکا تھا تو پوچھتا کیا پھرتا تھا، ارشاد فرمایا کہ توبہ کر چکا تھا مگر مقبول ہونا معلوم نہ تھا، اس لیے پوچھتا پھرتا تھا۔ سوال: جب توبہ کر چکا تھا تو ملائکہ رحمت وعذاب میں اسکے متعلق منازعت کیوں ہوئی؟ ارشاد: غلبہ اثر معصیت یا توبہ میں اختلاف تھا، اس لیے ملائکہ نے اجتہاد کیا جو فیصلہ کے وقت ایک غلط بھی ثابت ہوا اور اجتہاد غلط بھی ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں۔ سوال: کیا ملائکہ کا اجتہاد بھی غلط ہوتا ہے؟ ارشاد: کیوں نہیں

ہو سکتا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملائکہ کو بعض اوقات قواعد کلیہ بتا دیئے جاتے ہیں کہ جو ایسا ایسا کرے وہ ایسا ہے جب ہی تو ان اجتہاد کی نوبت آئی۔ سوال: باوجود حقوق العباد مغفرت کیسے ہوئی؟ ارشاد: اللہ کو یہ بھی تو اختیار ہے کہ خصم کو راضی کرادیں کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ اہل حقوق کو میدان قیامت میں محلات دکھائے جائیں گے وہ دیکھ کر کہیں گے یہ کس کے لیے ہیں؟ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: جو اپنے حقوق ہمارے بندوں سے معاف کرے سوال: اس سے یہ بھی استدلال ہوسکتا ہے کہ حقوق العباد بھی معاف ہوجائیں گے۔ ارشاد: اس سے استدلال کی کیا ضرورت ہے جبکہ اسکی خود حدیث میں تصریح موجود ہے جیسے ابھی گزرا، حقوق العباد کے مضمون پر ایک بے باک شخص کا قصہ آیا کہ نانوتہ میں ایک شخص کہنے لگا کہ ہمارے حقوق بھی تو لوگوں پر ہیں قیامت میں اپنے حقوق والوں سے کہہ دیں گے کہ ان سے لے لو، اگر یہ تمسخر ہے تو جواب ہی کی ضرورت نہیں اور اگر سچ مچ یہ عقیدہ ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ موازنہ کیسے ہوگا کہ جس قدر دوسرے کے حقوق آپ پر ہیں اتنے ہی دوسرے پر آپ کے حقوق ہیں، پھر یہ نہ معلوم کہ وہاں ایسے عقد ہو سکے گا یا نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۴۷/۱۱)

بیس برس بعد کفر کے اقرار سے سابقہ امامت کا حکم

فرمایا: کہ اگر ایک شخص نے بیس برس تک ایک مقام پر امامت کی اور پھر یوں کہنے لگا کہ میں کافر تھا، تو اس موقع پر فقہاء نے لکھا ہے کہ پچھلی نمازیں سب کی ادا ہوگئیں اور اس کلمہ سے وہ اب کافر ہوگیا۔ اس وجہ سے اب اس کا اعتبار بھی نہ کیا جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لئے کہتا ہو۔ اور بیس برس پہلے سے وہ کافر نہ ہو، مسلمان ہو، اور ابھی کافر ہوا ہو۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۵۸/۱۱)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں سود حلال کردو

فرمایا: کہ بعض لوگ کہتے ہیں مولویوں سے کہ ہندوستان میں سود حلال کردو کیونکہ گو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ حربی سے سود کا لینا جائز ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول کوئی حجت بھی نہیں۔ میں کہا کرتا ہوں جی ہاں آپ کو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تمام قولوں میں یہی ایک قول پسند آیا ہے، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول نماز میں، روزہ میں داڑھی میں حجت نہیں ہے۔ بس سود میں حجت ہے جیسے ایک شخص نے کسی سے پوچھا کہ قرآن میں تمام آیتوں میں تم کو کونسی آیت پسند ہے؟ کہا ﴿کلوا واشربوا﴾ کسی نے اسکو ایک شعر میں اس طرح کہا ہے۔

ہم توبہ جب کریں گے شراب وکباب سے
قرآن میں جو آیا ''کلوا واشربوا'' نہ ہو

اس کا ایک شخص نے خوب جواب دیا ہے۔

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں کے جناب
جب آگئے "واشربوا" کے "ولاتسرفوا" نہ ہو

پھر اس سے پوچھا دعاؤں میں کونسی دعا پسند ہے کہا ﴿رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۱۶۰)

قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں مانگنا چاہیے

فرمایا: کہ قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگنا چاہیے حتیٰ کہ دفن کے وقت بھی انتظام شریعت اس میں ملحوظ ہے تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ مردہ سے حاجت مانگی جاتی ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۱۶۴)

مہمان اور دستر خوان کے چند آداب

فرمایا: کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر سائل آ کر سوال کرے، تو مہمان کو دستر خوان سے دینا جائز نہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی کسی برتن میں کھانا بھیجے، تو اس میں کھانا جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے برتن میں کر کے کھائے۔ لیکن اگر مزہ یا وضع بدل جانے کا اندیشہ ہو جیسے فرنی وغیرہ تو اسی برتن میں کھانا جائز ہے۔ ایسے ہی اگر چند مجلسیں کھانے کی ہوں تو اپنی مجلس میں اگر کھانے کی کمی پڑ جائے تو اپنے سامنے سے دے سکتا ہے اور اگر دوسری مجلس میں ضرورت پڑے تو دینا جائز نہیں ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۱۶۶)

ناخن ترشوانے کی مدت کی ایک حکمت

فرمایا: کہ ایک طبیب نے ناخن ترشوانے کی ایک مدت لکھی ہے کہ اس کے بعد ناخنوں میں سمیت (زہریلے اثرات) پیدا ہو جاتی ہے۔ (شریعت نے بھی ایک مدت مقرر کر لی ہے، عجب نہیں یہی حکمت ہو۔)

فقہ الفقہ کا اہتمام

فرمایا: کہ لوگ یہاں آ کر مجھ سے فقہ کے مسائل دریافت کرتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں، کہ بھائی! فقہ تو دوسری جگہ بھی پوچھ لو گے۔ یہاں مجھ سے فقہ الفقہ پوچھو، جس کا دوسری جگہ اہتمام نہیں۔

سنت پر عمل سنت سمجھ کر ہی کرنا چاہیے

فرمایا: کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں بعض منافع و معالج معاشیہ بھی ہیں، مگر ہم کو اس نیت سے عمل نہ کرنا چاہیے، بلکہ سنت سمجھ کر کرنا چاہیے۔ میرے گھر آج کدو پکا تھا، میں نے پوچھا، کیا شام کو بھی کدو ہی پکے گا؟ کہا ہر روز نہیں پکاتے، جب موسم آتا ہے، تو سنت سمجھ کر ثواب کے لیے کبھی کبھی ڈال لیتی ہوں۔ ہمارے حضرت نے فرمایا: سبحان اللہ! ہم کو یہ نیت کبھی کبھی نصیب نہ ہوئی۔

آجکل کی سفارش، سفارش نہیں ہوتی

فرمایا کہ آج کل کی سفارش، سفارش نہیں ہوتی، بلکہ جبر کیا جاتا ہے، جو سراسر حرام ہے۔ زیادہ زور

ڈالنے سے مخاطب کو ضرور تکلیف ہوتی ہے، تو یہ کون سی خوبی ہے کہ ایک مسلمان کو تو راحت پہنچائی اور دوسرے کو تکلیف۔ نیز جو سفارش شریعت کے خلاف ہو اس میں برکت بھی نہیں ہوتی۔ ایک شخص نے کسی کو سفارش لکھوانا چاہا۔ میں نے کہا کہ میں ان سے پوچھ لوں کہ تم کو تکلیف تو نہ ہوگی۔ دو لفافے لاؤ، چنانچہ وہ دو لفافے لائے میں نے ان کو لکھا کہ فلاں شخص یہ چاہتے ہیں، اگر تم کہو تو ان کو سفارش لکھ کر دے دوں۔ وہاں سے پھر جواب ہی نہ آیا لیکن ان کا کام ہو گیا اور انہوں نے (جن کو سفارشی خط لکھا تھا) ان کو (جو سفارشی خط لکھانے آئے تھے) بواسطہ خط میں یہ لکھا کہ تم نے ان (یعنی حضرت مولانا مدظلہم) کو کیوں تکلیف دی (ایک صاحب نے مجلس میں سے عرض کیا کہ حضرت کے یہ دو الفاظ سفارش کے دوسروں کے صفحہ کے صفحہ مضمون سے اچھے ہوتے ہیں) فرمایا خیر یہ تو حسن ظن ہے، دیکھیے حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا لونڈی تھیں، ان کا حضرت مغیث سے نکاح ہوا تھا پھر یہ آزاد کر دی گئیں (آزادی کے بعد شریعت کا یہ حکم ہے کہ لونڈی چاہے، اپنا نکاح رکھے چاہے نہ رکھے اس کو اختیار ہے) تو حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا نے نکاح فسخ کر دیا تھا۔ حضرت مغیث کو چونکہ ان سے عشق تھا وہ بازاروں میں روتے تھے، حضور نے ان کی یہ حالت دیکھ کر حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تم مغیث سے نکاح کر لو، انہوں نے حضور سے سوال کیا کہ حضور یہ حکم ہے یا مشورہ آپ نے فرمایا: یہ مشورہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں مانتی۔ ہمارے حضرت نے فرمایا: کہ اب تو کوئی مرید اپنے پیر سے ایسی بات کہہ دے، فوراً ہی کہیں گے مجلس سے نکال دو۔ مردود ہو گیا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۱/۱۹۲)

تملیک سے قبل مالک کا انتقال ہو جائے تو اس رقم میں ورثاء کا حق آجاتا ہے

فرمایا: کہ یہاں مدختم میں جب کوئی رقم آتی ہے تو ان کا پورا پتہ لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اگر درمیان میں ان کے انتقال کی خبر آجائے تو بقیہ رقم ان کے وارثوں کے نام منی آرڈر کر دی جائے۔ اس پر ایک پیر جی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ واپسی کی کیا ضرورت ہے اس وقت سے مغفرت کی دعا شروع کر دیا کرو، میں نے کہا یہ حق وارثوں کا ہے اس کی ملک سے نکل چکا، یہ تو ایسی مثال ہوگی کہ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ میں کہا کرتا ہوں کہ پیر کے لیے صاحب علم ہونا بھی ضروری ہے (دیگر، حضرت والا نے ایک ارشاد میں اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ دین کی دعا پر اجرت جائز نہیں۔ یہاں دوسرا قاعدہ جاری ہوگا۔ جامع)
(ملفوظات حکیم الامت: ۱۱/۱۹۵)

دوسرا نکاح کرنے کی بعض مناسب شرائط

فرمایا: کہ ایک شخص نے مجھ سے عقد ثانی کے متعلق مشورہ پوچھا، تو میں نے کہا کہ تمہارے پاس کتنے مکان ہیں۔ اس نے کہا ایک ہے، میں نے کہا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کتنے مکان ہونے چاہئیں؟ میں نے کہا، تین ہونے چاہئیں، انہوں نے پوچھا، تین کس کے لیے؟ میں نے کہا تین اس لیے ہونے چاہئیں کہ دو مکان تو دونوں بیویوں کے رہنے کے لیے ہوں اور تیسرا مکان اس لئے کہ جب ان دونوں سے اختلاف ہو جائے تو آپ اس تیسرے مکان میں دونوں سے الگ رہیں کیونکہ جب تم ان سے

روٹھو گے تو کہاں رہو گے؟ وہ یہ سن کر رک گئے پھر جس عورت سے وہ نکاح کرنا چاہتے تھے اس کا دوسری جگہ نکاح بھی ہو گیا مگر پھر انہوں نے کانپور جا کر دوسرا نکاح کیا۔ (ہنس کر فرمایا) کہ یہ یوں سمجھے کہ اسی عورت کی (جس کا نکاح دوسرے سے ہو گیا) ممانعت تھی۔ ہمارے حضرت نے فرمایا کہ تعدد ازواج میں تو جہاں مرد تیز مزاج ہو تو سب ٹھیک رہتے ہیں ورنہ جہاں ملا آدمی ہوا سے تو نکو بنا لیتی ہیں۔ یہاں ایک شخص کے چار بیویاں ہیں، سب میں خوب اتفاق ہے، وہ کسی کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ بات یہ ہے کہ سب مظلوم ہیں اور مظلوموں میں اتفاق ہو ہی جاتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۲۰۰)

دو فریق کے درمیان فیصلہ کرنے کا اصول

فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو یہ کہہ کر بتایا تھا کہ اے علی! جب تک دونوں فریق کے بیان نہ سن لو، اس وقت تک کسی قسم کا فیصلہ نہ کرنا۔

ایک فریق کے بیان پر کبھی فیصلہ نہیں دینا چاہیے

فرمایا: کہ میں کبھی ایک فریق کے بیان پر فیصلہ نہیں دیا کرتا اس میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے، اور روایات تو اکثر غلط ہوتی ہیں اور نہ کسی کو مقرب بناتا ہوں کیونکہ اس سے لوگ خائف رہتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک قصہ ہے کہ آپ کے پاس دو شخص پہنچے اور جا کر یوں عرض کیا کہ اس کے پاس ننانویں بکریاں ہیں اور میرے پاس ایک بکری ہے لیکن اس نے اس کو بھی لینا چاہا، تو آپ نے فرمایا کہ اس نے تجھ پر ظلم کیا۔ پھر داؤد علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ میں نے غلطی کی جو ایک کے بیان پر فیصلہ دے دیا پھر آپ نے استغفار فرمایا اور بظاہر اس میں ایک اشکال ہے کہ آپ نے ایک کے بیان پر فیصلہ کیسے دیا مگر واقع میں اس بیان پر قطعی فیصلہ نہیں دیا تھا بلکہ معنا وہ قضیہ شرطیہ تھا اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ اگر ایسا کیا ہے تو ظلم ہے۔ رہا استغفار تو بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کو قضیہ شرطیہ کی صورت میں استعمال نہیں کیا بلکہ قضیہ حملیہ استعمال کیا اگرچہ قضیہ شرطیہ ہی مراد تھا۔ مگر لفظوں میں بھی اس کا استعمال ہونا چاہیے تھا، ایک صاحب نے عرض کیا کہ ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ حکم بالحق نہ تھا، فرمایا کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے یاد رکھنا چاہیے کہ امر و نہی زمانہ مستقبل کے لیے آتا ہے پس یہاں پر ماضی میں حکم بغیر الحق کا اشکال نہیں رہا۔ بعضوں کو ﴿وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا﴾ سے یہی شبہ ہو گیا ہے کہ کیا آپ نے خائن کی طرف داری کی تھی جس کی ممانعت ہوئی، سو یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ آپ خائنین کے طرف دار نہ بنیے، جیسا کہ اب تک نہیں بنے یعنی جیسے ماضی میں بھی نہیں رہے۔ جیسے باپ کہتا ہے کہ ایسا کبھی نہ کرنا، جیسا اب تک نہیں کیا۔ پس صیغہ امر میں دلالت مستقبل پر ہوتی ہے امر کی دلالت زمانہ ماضی پر سمجھنا یہی غلطی ہے اور داؤد علیہ السلام کے اس قصہ کو یہود نے اس طرح سے رنگا ہے کہ آپ کی ننانویں بیویاں تھیں اور ایک لشکری کی صرف ایک بیوی تھی آپ کی اس پر نظر پڑ گئی تو آپ فریفتہ ہو گئے پھر

وہ لشکری کی مہم پر گیا اور وہاں جا کر مارا گیا اس کے قتل کے بعد اسے آپ نکاح میں لے آئے، فرشتوں کو نصیحت کے لیے بھیجا تھا توبہ، توبہ! یہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسا خیال بالکل غلط اور برا عقیدہ ہے اور تعجب ہے کہ اس کو بعض مفسرین نے بھی لیا ہے۔ دراصل ان کا فرشتہ ہونا ہی ثابت نہیں بلکہ ظاہر اواقع میں وہ انسان ہی تھے اور ان کا بکریوں کے متعلق مقدمہ تھا۔ فافہم! (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۲۱۵)

حقوق واجبہ کو ترک کر کے مستحبات میں مشغول ہونا جائز نہیں

فرمایا: کہ بعض وقت قرآن شریف کا پڑھنا بھی ممنوع ہوسکتا ہے، جیسے کوئی شخص قرآن شریف یاد کرنا چاہتا ہے، جو کہ مستحب ہے مگر بیوی، بچوں کے لیے گذر کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو اس کو قرآن کے یاد کرنے میں وقت صرف کرنا حرام ہے، کیونکہ واجب میں خلل پڑتا ہے۔ فافہم! (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۲۲۹)

ایک پیچیدہ مقدمہ اور اس کا فیصلہ

فرمایا: کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذہانت اور علم کے متعلق ایک واقعہ دیکھا کہ دو شخص سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ کھانے کو بیٹھے ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور ایک کے پاس تین تھیں، ایک راہ گیر بھی ادھر کو آنکلا، چونکہ عرب کے لوگ کریم ہوتے ہی ہیں انہوں نے اس کو بھی اپنے ساتھ کھانے کو بٹھالیا جب کھا کر اٹھنے لگا، تو باقتضائے کرم آٹھ درہم پیش کر کے چلا گیا۔ اور ان میں سے تین روٹی والے شخص نے کہا: کہ چار چار درہم تقسیم کرلو۔ دوسرا بولا کہ نہیں میری پانچ روٹی تھیں مجھے پانچ دو اور تمہاری تین تھیں تم تین لو دوسرے کو کچھ ضد چڑھ گئی۔ آخر دونوں یہ جھگڑا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں لے گئے۔ آپ نے بھی تین والے سے فرمایا کہ اس میں تیرا کیا نقصان ہے، پانچ اور تین کی نسبت پر یہ راضی ہے اسی طرح کرلو اس نے کہا ہم تو انصاف چاہتے ہیں تو فرمایا کہ انصاف ہی چاہتے ہو تو ایک تم لے لو اور سات اس کو دیدو، اس نے اس میں شور وشغب کیا تو آپ نے فرمایا کہ آٹھ روٹی تھیں اور تین کھانے والے تو یوں سمجھو ہر شخص نے ہر روٹی میں سے ایک ایک ثلث کھایا آٹھ روٹیوں کے چوبیس حصے ہوئے اور تینوں کے حصے میں آٹھ آٹھ آئے جس میں سے تین والے نے اپنے نو حصوں میں سے آٹھ کھا لیے اور ایک بچا، اور پانچ والے کے پندرہ حصے ہوئے جس میں سے اس نے اپنے آٹھ کھا لیے تو سات بچے پس درہم اسی نسبت سے تقسیم ہوں گے۔ (تاریخ الخلفاء: ۵۹)

سترہ اونٹوں کی تقسیم کا فیصلہ

ایک واقعہ ہے کہ تین شخصوں کے اونٹ مشترک تھے (نہ معلوم کس وجہ سے اس خاص نسبت سے اشتراک ہوا کہ) ایک تو آدھے کا، اور دوسرا ثلث کا، اور تیسرا نویں حصے کا شریک تھا۔ اور سترہ اونٹ تھے، وہ آپس میں تقسیم نہ ہوتے تھے۔ فیصلے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، آپ نے غلام سے فرمایا کہ ہمارے اصطبل میں سے ایک اونٹ لے آؤ، اور ان سے پوچھا کہ اگر ہم اٹھارہ میں سے اسی نسبت سے

حصے دے دیں، تو راضی ہو، انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ کیونکہ ہر ایک کو زیادہ ملتا تھا مثلاً سترہ میں سے آدھا ساڑھے آٹھ ملتے اور اب نو ملیں گے۔ علیٰ ہذا آپ نے آدھے والے سے کہا، نو لے جاؤ اور ثلث والے سے کہا کہ چھ لے جاؤ اور نویں والے سے کہا کہ دو لے جاؤ، اور غلام سے کہا کہ ہمارا اونٹ اصطبل میں باندھ دو۔ یہ حساب کس کا ہے مگر یہ وہ حضرات تھے نہ کہیں سلیٹ قلم لے کر بیٹھے اور نہ مدرسوں میں پڑھا۔

(ملفوظات حکیم الامت ۱۱/۲۴۰)

کبوتر کے متعلق فقہی مسائل

علامہ دمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبوتر کی بیٹ، ماکول (جو جانور کھائے جاتے ہیں) وغیر ماکول چوپاؤں (جو جانور نہیں کھائے جاتے) کی لید و گوبر وغیرہ کی خرید و فروخت باطل ہے۔ اور اس سے حاصل ہونے والی قیمت حرام ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، گوبر وغیرہ کی بیع کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ہر جگہ کے لوگ بغیر کسی انکار کے اس کی بیع پر متفق ہیں۔ نیز کبوتر کی بیٹ، ماکول وغیر ماکول جانوروں کی لید و گوبر کی بیع اس لیے بھی جائز ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے اس لیے دوسری چیزوں کی طرح اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہونی چاہیے، امام شافعی رحمہ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر کوئی چیز حرام فرماتے ہیں تو اس کی قیمت بھی حرام قرار دیتے ہیں۔

(رواہ ابوداؤد باسناد صحیح، حیوۃ الحیوان ۱/۶۳۱)

ایک فقہی مسئلہ (سانپ اور سپیرا)

کتاب الاحبار میں آداب سفر کے باب میں مذکور ہے، جب کوئی شخص سفر یا حضر میں موزہ پہنے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ اسکو پہننے سے پہلے جھاڑ لے تاکہ سانپ اور بچھو کے کاٹنے کے ممکنہ خطرہ سے محفوظ رہے، اس مسئلہ کی دلیل ابوامامہ باہلی کی حدیث ہے (جو ہم انشاء اللہ "باب الغین" میں لفظ غراب کے تحت ذکر کریں گے)

فتویٰ امام نووی میں اس مسئلہ کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی سپیرا سانپ پکڑ لے جیسا کہ ان کی عادت ہے اور سانپ اس کو ڈس لے جس سے سپیرے کی موت واقع ہو جائے تو اس صورت میں سپیرا گنہگار ہوگا یا نہیں؟ پس اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر اس سپیرے نے سانپ کو اس نیت سے پکڑا ہے کہ لوگ اس کے فن پر اعتماد کرنے لگیں اور وہ اس فن میں مہارت بھی رکھتا ہو، تو غالب گمان کے مطابق تو وہ سانپ سے محفوظ و مامون رہے گا، البتہ اگر اسکے باوجود سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو سپیرا گنہگار نہیں ہوگا اگر سپیرے سے کوئی سانپ فرار ہو کر کسی کو نقصان پہنچا دے تو سپیرے سے کوئی ضمان نہیں لیا جائے گا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے زہد میں لکھا ہے کہ ایک سپیرا جس کے پاس پٹاری اور چند سانپ تھے، یمن میں کسی کے ہاں مہمان ہوا، پس رات کے وقت پٹاری سے سانپ نکلا اور گھر کے کسی فرد کو ڈس لیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، پس یمن کے گورنر نے اس واقعہ کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا، پس حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سپیرے پر کوئی ضمان نہیں ہے البتہ سپیروں کو تاکید کی جائے اگر آئندہ وہ کسی کے گھر میں بطور مہمان کے قیام کریں تو اہل خانہ کو اس بات کی بھی اطلاع دے دیں کہ میرے پاس سانپ بھی ہیں۔ (رواہ الامام احمد فی الذھد، حیوۃ الحیوان: ۶۸۱/۱)

مغرب کی نماز میں چودہ بار تشہد پڑھنا

ایک مقتدی کی مغرب کی نماز میں چودہ بار تشہد پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ مقتدی نے قعدہ اولیٰ میں امام کو پاکر پہلی بار تشہد پڑھا اور امام پر سجدہ سہو واجب تھا، تو سجدہ سہو کے بعد امام کیساتھ تیسری بار تشہد پڑھا، پھر امام کو یاد آیا کہ نماز میں آیت سجدہ تلاوت کی ہے اور سجدہ نہیں کیا ہے تو سجدہ تلاوت کے بعد پھر چوتھی بار امام کے ساتھ تشہد پڑھا کہ سجدہ تلاوت، قعدۂ اخیرہ کو ختم کر دیتا ہے، پھر امام نے سجدہ سہو دوبارہ کرنے کے بعد تشہد پڑھ کر سلام پھیرا، تو مقتدی کو پانچویں بار امام کے ساتھ تشہد پڑھنا پڑا، اس لیے کہ سجدۂ تلاوت کے سبب امام کا پہلا سجدۂ سہو بے کار ہو گیا تھا۔

اب مقتدی چھوٹی ہوئی رکعتوں کو پوری کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو اپنی دوسری رکعت کے قعدہ میں چھٹی بار تشہد پڑھا، پھر اس نے تیسری رکعت میں ساتویں بار تشہد پڑھا اور اس سے بھی کوئی واجب بھول کر چھوٹ گیا تھا، تو سجدہ سہو کے بعد آٹھویں بار تشہد پڑھا۔ اس کے بعد اسے بھی سجدہ تلاوت یاد آیا، تو سجدۂ تلاوت کے بعد نویں بار تشہد پڑھا۔ اور چونکہ سجدۂ تلاوت کے سبب سجدہ سہو بے کار ہو گیا۔ اس لیے سجدہ سہو کے بعد دسویں بار تشہد پڑھ کر سلام پھیرا۔

اور جب مقتدی امام کے ساتھ پانچویں بار تشہد پڑھ چکا، اگر اسکے بعد امام کو یاد آیا کہ ہم نے نماز کی کسی رکعت کا ایک ہی سجدہ کیا ہے، تو نماز کا چھوٹا ہوا سجدہ کرنے کے بعد امام کے ساتھ مقتدی کو چھٹی بار تشہد پڑھنا پڑا۔ اور نماز کے سجدہ نے چونکہ پھر سجدہ سہو کو باطل کر دیا اس لیے امام نے پھر تیسری بار سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھ کر سلام پھیرا، تو مقتدی کو امام کے ساتھ کل سات بار تشہد پڑھنا پڑا، اور اگر مقتدی کو بھی اپنی چھوٹی ہوئی رکعتوں کے پڑھنے میں اسی قسم کا معاملہ پیش آیا یعنی اس سے بھی نماز کا سجدہ بھول کر چھوٹ گیا، تو مقتدی کو تین رکعت کی نماز میں کل چودہ مرتبہ تشہد پڑھنا پڑے گا۔

(عجائب الفقہ بحوالہ درمختار مع شامی: ۳۱۳/۱)

ایک دینی پیشوا کی ایک گناہ کی وجہ سے گھر بیٹھے رسوائی

ایک عورت بکریاں چرایا کرتی تھی اور ایک راہب کی خانقاہ تلے رات گزارا کرتی تھی۔ اس کے چار بھائی تھے۔ ایک دن شیطان نے راہب کو گدگدایا، وہ اس سے زنا کر بیٹھا، اسے حمل رہ گیا۔ شیطان نے

راہب کے دل میں (یہ بات) ڈال دی کہ اب بڑی رسوائی ہوگی، اس سے بہتر ہے کہ اسے مار ڈال اور کہیں دفن کر دے۔ تیرے تقدس کو دیکھتے ہوئے تیری طرف تو کسی کا خیال بھی نہ جائے گا اور اگر بالغرض پھر بھی کچھ پوچھ پچھ ہو، تو جھوٹ موٹ کہہ دینا، بھلا کون ہے جو تیری بات کو غلط جانے اس کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی ایک روز رات کے وقت موقعہ پا کر اس عورت کو مار ڈالا اور کسی اجڑی زمین میں دبا آیا۔

اب شیطان، اس کے چاروں بھائیوں کے پاس پہنچا، اور ہر ایک کے خواب میں اسے سارا واقعہ سنایا، اور اس کے دفن کی جگہ بھی بتادی۔ صبح جب یہ جاگے تو ایک نے کہا کہ میں نے تو آج کی رات ایک عجیب خواب دیکھا ہے، ہمت نہیں پڑتی کہ آپ سے بیان کروں، دوسرے نے کہا نہیں کہو تو سہی چنانچہ اس نے اپنا پورا خواب بیان کیا کہ اس طرح فلاں عابد نے اس (کی بہن) سے بدکاری کی پھر جب حمل ٹھہر گیا تو اسے قتل کر دیا، اور فلاں جگہ لاش دبا آیا۔ ان تینوں میں سے ہر ایک نے کہا مجھے بھی یہی خواب آیا ہے اب تو انہیں یقین ہو گیا کہ سچا خواب ہے۔

چنانچہ انہوں نے جا کر حکومت کو اطلاع دی، اور بادشاہ کے حکم سے اس راہب کو خانقاہ سے ساتھ لیا اور اس جگہ پہنچ کر زمین کھود کر اس کی لاش برآمد کی۔ کامل ثبوت کے بعد اسے شاہی دربار میں لے چلے، اس وقت شیطان اس کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب میرے کئے کوتک (کرتوت) ہیں اب بھی اگر تو مجھے راضی کر لے تو جان بچادوں گا اس نے کہا جو تو کہے! کہا مجھے سجدہ کر لے اس نے یہ بھی کر دیا۔ پس پورا بے ایمان بنا کر شیطان کہتا ہے میں تجھ سے بری ہوں میں تو اللہ تعالیٰ سے (جو تمام جہانوں کا رب ہے) ڈرتا ہوں، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا، اور پادری صاحب کو قتل کیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۴۴/۵)

صرف بہشتی زیور نا کافی ہے

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میرے پاس بہشتی زیور موجود ہے، مجھ کو جو دین کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں دیکھ لیتا ہوں۔ گویا ان کے نزدیک سارا دین بہشتی زیور ہی کے اندر آ گیا ہے یا انکو ان مسائل کے علاوہ جو اس میں ہیں، کسی اور مسئلہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اس میں شک نہیں کہ بہشتی زیور میں ایک کافی تعداد مسائل کی موجود ہے لیکن اولاً اس میں زیادہ تر وہ مسائل ہیں جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں یا عورتوں اور مردوں میں مشترک ہیں۔

اور اس سے قطع نظر مسائل اس میں اس قدر نہیں ہیں کہ ان کے بعد دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو، اور یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے سارے مسائل مطالعہ سے حل ہی ہو جائیں اور کسی مسئلہ میں شبہ ہی نہ پیدا ہو۔ ضرورت اس کی ہے کہ سبقاً سبقاً کسی عالم سے پڑھا جائے۔ (دعوات عبدیت ۸۱/۸)

مشتبہ اور مشکوک سے احتیاط

تجارت میں زیادہ احتیاط برتنا خسارہ میں پڑنا ہے۔ مشہور تابعی ابن سیرین کا پیشہ تجارت تھا۔ ان کا

حال یہ تھا کہ خندہ پیشانی کے ساتھ نقصان اٹھاتے تھے لیکن مشتبہ اشیاء کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے بیع کے طور پر غلہ خریدا۔ اس میں انہیں اسی ۸۰ ہزار کا فائدہ ہوا، لیکن ان کے دل میں شک پیدا ہوگیا کہ اس منافع میں سود کا شائبہ ہے اس لیے پوری رقم چھوڑ دی حالانکہ اس میں مطلق ربو (سود) نہ تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۷/۱۴۵)

پردہ پوشی

حضرت سعید بن مسیب جلیل القدر تابعی اور دنیائے اسلام کے امام اور مقتداء مانے جاتے تھے۔ وہ اگرچہ احکام خداوندی کے باب میں بڑے سخت گیر تھے لیکن کسی کے گناہ کی پردہ دری نہ کرتے تھے اور خود دوسروں کو بھی پردہ پوشی کی تلقین کرتے تھے۔ ابن حرملہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں صبح کو باہر نکلا تو ایک شخص کو نشہ کی حالت میں پایا، اس کو زبردستی اپنے گھر گھسیٹ لایا، اس کے بعد سعید سے ملاقات ہوئی ان سے پوچھا کہ ایک شخص نے ایک شخص کو نشہ کی حالت میں پایا اس صورت میں وہ کیا کرے؟ اس کو حاکم کے سپرد کر کے اس پر حد جاری کرائے؟ ابن مسیب نے جواب دیا اگر تم اس کو اپنے کپڑے سے چھپا سکو تو چھپا لو۔ یہ سن کر میں گھر واپس آیا۔ اس وقت وہ شخص ہوش میں آچکا تھا مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر شرمندگی طاری ہوگئی، میں نے اس سے کہا کہ تم کو شرم نہیں آتی اگر تم اس حالت میں پکڑے جاتے اور تم پر حد جاری کی جاتی تو لوگوں کی نگاہوں میں تمہاری کیا آبرو رہ جاتی۔ تم زندگی ہی میں مردہ ہو جاتے، تمہاری شہادت تک قبول نہ کی جاتی۔ یہ نصیحت سن کر اس شخص نے کہا: خدا کی قسم! آئندہ کبھی ایسا نہ کروں گا۔ اس کی پردہ پوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے تائب ہوگیا۔ (طبقات ابن سعد: ۵/۱۳۱)

خدا کی امان میں

حضرت سالم بن عبداللہ حد درجہ محتاط اور زاہد تھے۔ آپ کے نزدیک مسلمان کا خون اتنا محترم تھا کہ مجرم مسلمان پر بھی ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حجاج بن یوسف نے آپ کو ایک ایسے شخص کے قتل کا حکم دیا۔ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے معاونین میں تھا آپ تلوار لے کر مجرم کی طرف بڑھے اور پاس جا کر پوچھا۔ تم مسلمان ہو؟ اس نے کہا ہاں! میں مسلمان ہوں لیکن آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اسے پورا کیجیے، آپ نے پوچھا تم نے صبح کی نماز آج پڑھی ہے؟ اس نے کہا ہاں پڑھی ہے یہ سن کر سالم لوٹ گئے اور حجاج کے سامنے تلوار پھینک کر کہا: یہ شخص مسلمان ہے آج صبح تک اس نے نماز پڑھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ خدا کے حفظ و امان میں آگیا۔ حجاج نے کہا: ہم اس کو صبح کی نماز کے لیے تھوڑا ہی قتل کرتے ہیں بلکہ اس لیے قتل کرتے ہیں کہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے معاونوں میں ہے۔ فرمایا: اس کے لیے اور لوگ موجود ہیں جو عثمان کے خون کا انتقام لینے کے ہم سے زیادہ حقدار ہیں۔ سالم کے والد حضرت عبداللہ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا: سالم نے سمجھداری سے کام لیا۔ (طبقات ابن سعد: ۵/۱۴۵)

کھوٹے سکوں کا مصرف

حضرت عبداللہ خیاط رحمۃ اللہ علیہ بڑے متقی اور محتاط بزرگ تھے، ان کا ایک گاہک مجوسی تھا، وہ ان کی دکان پر کپڑے سلواتا اور اجرت میں کھوٹے سکے دیتا، وہ اس سے لے لیا کرتے۔

ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا، کہ وہ اپنی دوکان سے کہیں گئے اور اسی اثناء میں مجوسی آیا، اس نے اپنے کپڑے لیے اور کھوٹے سکے دیئے۔ عبداللہ کے شاگرد نے سکے واپس کئے تو پھر اس نے کھرے سکے حوالے کئے، جب عبداللہ آئے اور شاگرد سے پوچھا کہ اس مجوسی کا کرتہ کہاں ہے؟ اس نے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا تم نے برا کیا ایک عرصے سے میں وہ سکے لیکر صبر کر رہا تھا، میں وہ سکے لیتا اور ایک کنویں میں ڈال دیتا کہ کہیں پھر کسی کو ان سے دھوکہ نہ دیا جائے۔ (الرسالة القشيرية، باب الخلق)

کھوٹے سکوں کے بارے میں عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دھوکہ میں مل گیا تو پھر وہ بھی اس طرح دوسرے کو دھوکے میں دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طرح دھوکا کھانے والوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے سکوں کو ضائع کر دیا ہے۔ (علم وہدایت کے چراغ ۲۹۰)

ف: ہمیں بھی اس طرز عمل کو اپنانے کی ضرورت ہے کیونکہ جعلی نوٹ بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں انکو آگے نہیں چلانا چاہئے۔ (مؤلف)

حق کی خاطر

قاضی شریح بن حارث رحمۃ اللہ علیہ تاریخ اسلام کے مشہور قاضی ہیں، وہ دینداری، فضل وکمال ذکاوت اور اپنے عدل اور انصاف میں خاص شہرت رکھتے ہیں، ان کے متعلق ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن کی مثالیں مشکل سے ملتی ہیں۔ انکے لڑکے اور بعض دوسرے اشخاص کے درمیان کسی حق کے بارے میں تنازعہ تھا لڑکے نے واقعہ بتایا کر پوچھا کہ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعویٰ کروں ورنہ خاموش رہوں۔ شریح نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کر کے دعویٰ کرنیکا مشورہ دیا لیکن جب مقدمہ انکے سامنے پیش ہوا تو لڑکے کے خلاف فیصلہ دیا، فیصلہ دیکر جب گھر آئے تو لڑکے نے کہا اگر میں نے آپ سے پہلے مشورہ نہ کرلیا ہوتا تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن مشورہ دینے کے بعد آپ نے مجھے ذلیل کیا۔ شریح نے جواب دیا، جانِ پدر! تو مجھے ان لوگوں سے زمین بھر کے آدمیوں میں عزیز ہے، جب تو نے مجھ سے مشورہ کیا تو مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا، اگر میں اسوقت تجھ سے ظاہر کر دیتا تو ان سے صلح کر لیتا اور ان لوگوں کا حق ضائع ہو جاتا۔ (طبقات ابن سعد ۶/۹۳)

سلام میں سبقت

قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نہایت خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھے، سلام میں ہمیشہ خود سبقت کرتے تھے قاسم کا بیان ہے، کہ کوئی شخص سلام میں شریح پر سبقت نہیں کر سکتا تھا۔ عیسیٰ بن حارث کا بیان ہے کہ "میں ہمیشہ

سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر کبھی کامیاب نہ ہوا، میرا انکا اکثر راہ میں سامنا ہوتا تھا میں اس انتظار میں رہتا کہ اب سلام کروں کہ اتنے میں وہ قریب پہنچ کر "السلام علیکم" کہہ دیتے۔" (طبقات ابن سعد ۹۷۰/۲)

سلام کی حدیث میں بڑی تاکید آئی ہے اور ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملے تو اسے یہ دعائیہ فقرہ اپنی زبان سے ضرور کہنا چاہیے۔ یہ ایک بندے کی طرف سے دوسرے بندے کے لئے سلامتی کی دعا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "افشوا السلام" "سلام کو خوب پھیلاؤ۔ مگر آج ہمارے معاشرے میں سے یہ دعائیہ فقرہ بھی غائب ہوتا جارہا ہے اب تو دیندار طبقہ کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک سلام کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ پہلے انہیں کوئی سلام کرے، تو جواب دیں گے حالانکہ یہ نیکی کا کام ہے اور نیکی میں جو سبقت کرے اسکا درجہ بڑا ہوتا ہے۔ (علم وہدایت کا چراغ: ۷۷)

جذام کے فقہی مسائل

کتاب القواعد میں شیخ صلاح الدین عراقیؒ نے ذکر کیا ہے کہ "نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی مہلک امراض میں مبتلا شخص کسی تندرست آدمی کے ہاں نہ جائے۔ اس حدیث سے یہ بات (اشارۃ النص کے ذریعے) معلوم ہوئی اگر کسی بچے کی ماں برص یا جذام کے مرض میں مبتلا ہو، تو اس (ماں) کے ذمے سے پرورش کا حق ساقط ہو جاتا ہے، اس لیے کہ ماں کے ساتھ رہنے اور اسکا دودھ پینے کی وجہ سے بچے کو برص، جذام ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔"

علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شیخ صلاح الدین عراقی نے لکھا ہے وہ بالکل واضح ہے کیونکہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسکی تائید کی ہے اور مالکیہ سے بھی یہی منقول ہے کہ اگر کوئی (برص یا جذام کا) مریض تندرست وصحت مند لوگوں کے ساتھ مسافر خانے یا ہوٹل وغیرہ میں رہنا چاہتا ہو تو اس پر پابندی لگادی جائے گی یہاں تک مسافر خانے یا سرائے میں رہنے والے مریض کو ٹھہرنے کی اجازت دے دیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی مجذوم پہلے ہی سرائے خانے میں رہتا ہو، بعد میں اس سرائے میں تندرست لوگ قیام کرنے کے لئے آجائیں تو اس مجذوم کو خوف زدہ کر کے سرائے سے نکال دیا جائے گا، بشرطیکہ تندرست وصحت مند آدمیوں کی یہی خواہش ہو۔

علامہ دمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہے کہ اہل علم نے اس کی تصریح کی ہے اگر کوئی ایسی لونڈی ہو، جس کا مالک جذام کے مرض میں مبتلا ہو تو باندی کے لیے مناسب ہیکہ وہ اپنے آقا کو جو کہ جذام کے مرض میں مبتلا ہے ہم بستری (صحبت) کا موقع دے۔

ایک صورت یہ ہے کہ اگر کسی ایسے آدمی جو جذام کے مرض میں مبتلا ہو، اپنی بیوی کو ہم بستری کے معاملے میں پابند نہ کیا ہو، تو ان دونوں (میاں بیوی) میں تفریق کرائی جاسکتی ہے بیوی خود مختار ہے اور اسکی خود مختاری کو اس معاملے میں شریعت اسلامیہ نے تسلیم کیا ہے۔ (حیوۃ الحیوان ۶۰/۱)

امتیاز سے نفرت

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ بڑے عابد اور متقی بزرگ تھے۔ انکی ذات علم وعمل کی جامع تھی۔ وہ ہر ایسے امتیاز سے جس سے لوگوں کی توجہ انکی طرف ہو، بچتے تھے۔ اکثر نماز میں اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کو آگے بڑھا دیتے۔

ابن عون کا بیان ہے کہ ابن ہبیرہ کے خروج کے زمانہ میں بھی ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کیساتھ انکا نماز کا وقت آیا، تو انہوں نے مجھے نماز پڑھانے کا حکم دیا میں نے اسکی تعمیل تو کی لیکن نماز پڑھانے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ نماز اسی شخص کو پڑھانا چاہیے جسکو قرآن زیادہ یاد ہو، فرمایا ''مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھوں اور لوگ یہ کہیں کہ ''محمد'' لوگوں کی امامت کرتے ہیں۔'' (طبقات ابن سعد: ۷/۱۴۸)

سفارش کے معاوضہ میں ہدیہ

حضرت مسروق بن اجدع رحمۃ اللہ علیہ، علمائے تابعین میں سے تھے۔ وہ اصل علم، خوف خدا کو سمجھتے تھے اور اسکے مقابلے میں غرور علم، کو جہل تصور کرتے تھے۔ بے حد محتاط اور متقی تھے۔ انکا حال یہ تھا کہ ادنی ادنی باتوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، جسکا کوئی کام ان سے نکلتا تھا اس سے ہدیہ تک قبول نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی معاملے میں ایک شخص کی سفارش کی، اس نے شکریہ میں ایک لونڈی لاکر پیش کی، یہ دیکھ کر سخت برہم ہوئے اور کہا اگر مجھے پہلے تمہارے اس خیال کا علم ہوتا تو میں کبھی تمہاری سفارش نہ کرتا جتنی سفارش کر چکا، وہ کر چکا اب جتنی ضرورت اور باقی رہ گئی ہے اسکے بارے میں میں کچھ نہ کہوں گا۔ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ ''جو شخص کسی کا حق دلانے یا ظلم کے انسداد کے لئے کسی کی سفارش کرے اور اسکے معاوضہ میں اسکو ہدیہ دیا جائے اور سفارش کرنیوالا اس سے قبول کرے۔ وہ ہدیہ اس پر حرام ہے''۔
(طبقات ابن سعد: ۶/۵۴)

انوکھی وضع کی تجارت

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے تفقہ، شان اجتہاد واستنباط اور ملکۂ تخریج وتفریع اور قیاس ورائے میں سب سے یگانہ اور ممتاز تھے۔ اور مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت، فقہی مسائل میں انہی کی مقلد ہے۔ انکی فقہ اپنے اصول، گیرائی لچک وسعت اور رخصت، سہولت کے اعتبار سے ''الدین یسر'' کی صحیح تعبیر ہے اور یہ انکا اتنا بڑا فکری اور علمی کارنامہ ہے جسے دنیائے اسلام کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ امام صاحب کا آبائی پیشہ تجارت تھا لیکن انکی تجارت بھی بالکل انوکھی اور نرالے طرز کی تھی، وہ ان خوش اوصاف اور دیانت دار تاجروں میں تھے جو تجارت پیشہ لوگوں کیلئے بھی کامل نمونہ تھے، خرید وفروخت میں کبھی بھی دیانت داری کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک عورت فروخت کے لئے ریشمی کپڑا امام صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لائی، امام صاحب نے قیمت دریافت کی تو اس نے سو(100) کی رقم بتائی، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ مال تو زیادہ قیمت کا ہے اس نے سو(100) اور بڑھا دیئے۔ اسطرح وہ ایک ایک سو بڑھاتی گئی حتی کہ چارسو تک پہنچ گئی امام صاحب نے فرمایا: یہ چارسو سے بھی زیادہ کا ہے، وہ کہنے لگی آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں؟ امام صاحب نے فرمایا کسی دکاندار کو بلاؤ جو اسکی قیمت لگائے، چنانچہ وہ ایک شخص کو لے آئی اور اس نے وہ پارچہ پانچ سو میں خریدلیا۔ (الخیرات الحسان:۲۴)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ خریدار ہونیکی صورت میں بھی بائع کے نفع نقصان کا خیال رکھتے تھے اور موقع پاکر اسے لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا، اسکی خیرخواہی ورہنمائی کرتے تھے۔ (علم وہدایت کے چراغ:۶۲)

خریدار کی رعایت

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مالدار تاجر ہونے کے باوجود استغناء کی شان رکھتے تھے۔ حرص وطمع بالکل نہ تھی۔ بے انتہا امانت دار تھے، اور دیانت داری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے نفس پر ہرطرح کی سختی روا رکھتے تھے، اگر خریدار نادار ہوتا تو بے تامل اپنا نفع چھوڑ دیتے یا نفع میں سے کچھ بطور کمیشن کے دے دیتے، چنانچہ ایک دفعہ ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نادار ہوں یہ کپڑا جتنے میں آپکو پڑا ہے اتنے میں دیدیجئے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا چار درہم دیدو، وہ کہنے لگی، میں بڑھیا ہوں میرا مذاق نہ اڑایئے، امام صاحب نے ارشادفرمایا" بڑی بی دو کپڑے میں نے خریدے تھے، ایک کپڑا اصل لاگت سے چار درہم کم پر بیچ ڈالا، اس لیے یہ کپڑا چار درہم میں پڑا ہے۔

اسی طرح ایک دوست کو خاص قسم رنگ کے ریشم کی ضرورت پیش آئی وہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس یہ غرض لے کرآیا امام صاحب فرمانے لگے:"ذرا صبر کرو کوئی اس قسم کا کپڑا آگیا تو تمہارے لیے خریدلوں گا۔"

چنانچہ ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ وہ کپڑا آگیا وہ ہی دوست دوبارہ آیا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:" میاں تمہاری ضرورت پوری ہوگی ہے۔" اور کپڑا نکال کردے دیا۔ اس دوست نے پوچھا، کتنے کا ہے؟ کہنے لگے صرف ایک درہم کا وہ دوست کہنےلگا مجھے آپکے بارے میں یہ گمان نہ تھا کہ آپ میرا مذاق اڑائیں گے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے مذاق نہیں اڑایا، اصل بات یہ ہے کہ میں نے بیس اشرفی اور ایک درہم میں دو کپڑے خریدے تھے۔ ان میں سے ایک کپڑا بیس اشرفی میں بیچ ڈالا، اس لیے یہ ایک درہم میں رہ گیا۔ (تاریخ بغداد:۳/۳۶۲)

تجارت میں احتیاط اور تقویٰ

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تجارت نہایت وسیع تھی لاکھوں کالین دین تھا، اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا ایسے بڑے کارخانے کے ساتھ دیانت اور احتیاط کا اسقدر

خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبہ (دانہ) بھی انکے خزانے میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ اس احتیاط میں کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ مگر انکو پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اپنے شریک کاروبار حفص بن عبدالرحمن کے پاس خز (ریشم) کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے خریدار کو جتا دینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا۔ تھان بیچ ڈالے اور خریداروں کو عیب کی اطلاع نہ دی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوا تو نہایت افسوس کیا تھانوں کی قیمت جو تمیں ہزار درہم تھی سب خیرات کر دی۔ (تاریخ بغداد: ۳۸۵/۳)

بلاغرض حق گوئی

خلیفہ منصور اور حرہ خاتون (منصور کی بیوی) میں کچھ رنجش ہوگئی تھی۔ خاتون کو شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ منصور نے کہا کہ کسی کو منصف قرار دو، اس نے امام صاحب کا نام لیا، اسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردہ کے قریب بیٹھی کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو فیصلہ کریں خود اپنے کانوں سے سنے۔ منصور نے پوچھا: شرع کی رو سے مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے؟ امام صاحب نے کہا چار، منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سنتی ہو! پردہ سے آواز آئی کہ ہاں سنا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے منصور کیطرف خطاب کر کے کہا "مگر یہ اجازت اس شخص کے لئے خاص ہے جو عدل پر قادر ہو۔ ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اچھا نہیں" خدا خود فرماتا ہے: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ امام صاحب گھر آئے تو ایک خادم پچاس توڑے لیے ہوئے حاضر ہوئے کہ خاتون نے نذر بھیجی ہے اور کہا ہے کہ آپ کی کنیز آپکو سلام کہتی ہے۔ اور آپ کی حق گوئی کی نہایت مشکور ہے۔ امام صاحب نے روپے واپس کر دئے اور خادم سے فرمایا کہ جا کر خاتون سے کہنا کہ میں نے جو کچھ کہا کسی غرض سے نہیں کہا بلکہ میرا فرض منصبی تھا۔" (سیرت النعمان)

حق پرستی

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک زمانے میں حاکم کوفہ نے حکم دے دیا تھا کہ فتویٰ نہ دیا کریں۔ چنانچہ انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن امام ممدوح گھر میں تشریف رکھتے تھے بی بی اور بچے پاس تھے صاحبزادی نے روزہ کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا بیٹا! یہ مسئلہ اپنے حماد سے پوچھ لو۔ مجھ کو حاکم کی طرف سے فتویٰ دینے کی ممانعت ہے اسلیے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ (ابن خلکان: ۴۵۲/۱)

اس سے بڑھ کر حق پرستی اور کیا ہو سکتی ہے عہدۂ قضا قبول نہ کرنا اپنے نفس کا حق تھا جسکو انہوں نے حاکم اور خلیفہ کے مقابلے میں برسر دربار نہیں چھوڑا۔ اور فتویٰ نہ دینا حاکم کا حق تھا جسکو انہوں نے خلوت اور گھر کی چار دیواری کے اندر بھی ملحوظ رکھا۔ (علم وہدایت کے چراغ: ۶۷)

ظالم حکمرانوں کے مقابلے میں اعلان حق

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ میں پیدا ہوئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کو دیکھا، ان سے علم حاصل کیا

آپ کی آنکھیں نورانی زندگی میں کھلیں۔ مدینہ کی عظمت اور شان میں پرورش پائی، مدینہ منورہ اس وقت علم کا گہوارہ، نور کا مخزن اور معرفت کا سرچشمہ تھا، مدینہ کی عظمت کا نقش دل پر جم گیا اس شان اور تقدس کا اثر آپ کے افکار آپ کی فقہ اور آپ کی زندگی میں نمایاں ہے۔ تقریباً پچاس سال تشنگان علم آپ کے فیض تعلیم و تربیت سے سیراب ہوئے۔ اسلامی شریعت کے اصول مرتب کر کے ایک مکتبۂ خیال کے جاری کرنے والے اور بانی ہیں۔ جابر امراء اور ظالم حکومتوں کے مقابلے میں اعلان حق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایمان کامل اور خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہوں۔ امام دارالہجرۃ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ اپنے گوناگوں اوصاف کے ساتھ اس امر میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ایام حج میں خلافت عباسیہ کی طرف سے عام منادی کرادی گئی تھی کہ امام مالک اور ابن ابی الذویب کے سوا اور کوئی شخص فتویٰ نہ دے۔ چھ چھ مہینے کی مسافت طے کر کے لوگ حضرت امام صاحب سے فتویٰ پوچھنے آتے۔ امام صاحب بڑی آزادی سے فتویٰ دیتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب نے ایک فتویٰ دیا کہ کوئی شخص کسی جبر سے بیوی کو طلاق دے دے تو طلاق نہیں پڑتی۔ والیٔ مدینہ نے یہ حکم دیا کہ آئندہ سے یہ فتویٰ نہ دو۔ بلکہ یہ فتویٰ دو کہ طلاق پڑ جائے گی۔ مگر چونکہ یہ بات امام صاحب کے نزدیک صحیح نہ تھی اس لیے والیٔ مدینہ کی سطوت کا امام صاحب پر جادو نہ چل سکا ہمیشہ یہی فتویٰ دیتے رہے کہ جبراً طلاق نہیں پڑتی۔

والی مدینہ نے آپ کو غصہ میں طلب کیا اور اس نے ہدایت کی کہ ہاتھ میں ہتھکڑیاں پیچھے سے ڈالی جائیں۔ اونٹ کی ننگی پیٹھ پر سوار کر کے مالک کو میرے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ اس انداز سے امام صاحبؒ لائے گئے۔ مگر اونٹ پر بھی بلند آواز سے فرما رہے تھے کہ جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو جان لے کہ میں مالک، انس کا بیٹا اور اسی مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں کہ جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جا رہا ہے کہ ''**طلاق المکرہ لیس بشیء**'' یعنی جبریہ طلاق کوئی چیز نہیں!

ظالم سپاہیوں نے کس کر ہتھکڑی ایسی ڈالی تھی کہ کندھا اتر گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ والی نے امام صاحب کو ستر کوڑے اور لگوائے۔ مگر امام صاحب نے صبر و استقلال سے تکلیف کو برداشت کیا اور جو رائے تھی اس پر قائم رہے۔ یہ تھی امام صاحبؒ کی جلالت شان۔ (حیات مالک، از علامہ سید سلیمان ندوی)

مرتبہ کے مطابق برتاؤ

خلیفہ ہارون الرشید مجلس درس میں آیا تو مسند سے نیچے اتر کر اس کو بیٹھنا پڑا لیکن ایک بار امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو آپ نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی وہ اٹھ گئے تو طلبہ سے کہا کہ ''یہ عراق کے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں'' اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علی قدر مراتب عزت کرنی چاہیے۔ (حیات مالک، از علامہ سید سلیمان ندوی)

طلب علم مہد سے لحد تک

طلب علم کی راہ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی بادیہ پیمائی (صحرانوردی) برابر جاری رہی۔ تمام ممالک اسلامیہ کا چکر لگایا نہ وہ محنت سے گھبراتے نہ مشقت سے جی چراتے اور نہ زیادہ حاصل کرکے بھی سیری ہوتی۔ کتابوں کا بوجھ پیٹھ پر لدا ہوتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی جانے پہچانے آدمی نے اس طرح حالت سفر میں دیکھا۔ اور احادیث کی روایت اور کتابت کی کثرت دیکھ کر اعتراضاً کہا "اتنا کچھ حفظ کر ڈالا، اتنا کچھ لکھ ڈالا، اور اتنی روایت کر ڈالی پھر بھی عالم یہ ہے کہ آج کوفہ جارہے ہیں تو کل بصرہ، آخر کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟ حتیٰ کہ جب درجہ امامت پر متمکن ہوگئے۔ تو آپ کے ایک ہم عصر نے دیکھا کہ قلم دوات ہاتھ میں ہے اور برابر لکھتے جارہے ہیں۔ وہ کہنے لگا، ابوعبداللہ! آپ اس رتبہ بلند تک پہنچ چکے ہیں اور یہ عزت پائی ہے کہ امام المسلمین کہلائے جاتے ہیں پھر بھی آپ یہ کیا کرتے ہیں؟ امام احمد نے فرمایا" جب تک قبر کا منہ نہ دیکھ لوں گا قلم دوات کا ساتھ بھلا کیسے چھوٹ سکتا ہے؟ آپ اکثر یہ بھی فرمایا کرتے اس وقت تک برابر تحصیل علم کرتا رہوں گا تاوقتیکہ قبر میں نہ چلا جاؤں۔" (امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ مصنفہ ابوزہرہ)

انتہائی احتیاط پسندی

ایک بار ایک قرض کی ادائیگی کے پیش نظر آپ نے سونے کی ایک شئے رہن رکھ دی اور جب آپ کے پاس روپے کا انتظام ہوگیا تو وہ دائن کے پاس گئے تاکہ رقم دے کر اپنی شئے واپس لے لیں۔ چنانچہ دائن رہن شدہ شئے جب واپس دینے لگا تو اسے شبہ ہوگیا۔ کیونکہ اس کے پاس بالکل ویسی ہی ایک اور شئے بھی رہن رکھی تھی۔ اس نے دونوں چیزیں امام موصوف کو دے دیں اور عرض کیا ان میں سے جو آپ کی ہو وہ پہچان کرلیجیے۔ لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی انتہائی احتیاط پسندی کی یہ کیفیت تھی کہ آپ نے دونوں چیزیں واپس کردی اور کوئی بھی نہ لی۔ گویا کہ آپ اپنے ہی مال سے دستبردار ہوگئے اور شک کے سبب نقصان اٹھانا گوارا کرلیا۔ (علم وہدایت کا چراغ: ۸۱)

تزکیۂ نفس کے خلاف

ایک مرتبہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہوگئے۔ تو آپ کے صاحبزادے آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کیا: "میرے پاس کچھ رقم ہے جو متوکل (خلیفہ) نے ہدیے کے طور پر دی تھی۔ کیا اس کے ذریعے میں حج کرسکتا ہوں؟" آپ نے فرمایا: "ہاں کرسکتے ہو" بیٹے نے عرض کیا "اگر ایسی رقم آپ کے پاس ہوتی تو کیا آپ بھی اس کو اپنے صرف میں لے آتے؟" یہ سنا تو ارشاد فرمایا: بیٹے! میں خلیفہ کے عطایا کو حرام نہیں سمجھتا لیکن ان کا لینا تزکیۂ نفس کے خلاف سمجھتا ہوں۔ (امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ مصنفہ ابوزہرہ)

مرضی کے خلاف فتویٰ

ایک روز امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دوسرے علماء کے ساتھ ہارون رشید کے محل میں بیٹھے ہوتے تھے، اتفاق سے

اسی وقت ہارون رشید بھی آ گیا۔ تمام حاضرین اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد ہارون نے امام محمد رحمہ اللہ کو تخلیہ میں بلایا، امام محمد رحمہ اللہ اندر گئے تو ہارون نے ان سے کہا کہ بنوتغلب (نصاریٰ) کو نقض عہد کر کے میں قتل کرانا چاہتا ہوں۔ امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں امان دی تھی۔ اس لیے نقض عہد کی گنجائش نہیں ہے، ہارون نے کہا کہ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کا بپتسمہ (عیسائی بنانا) نہ کریں لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے بپتسمہ کے باوجود انہیں امان دی تھی۔ اس پر ہارون نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے جنگ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ امام محمدؒ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے جنگ کرنا چاہئے تھا۔ حالانکہ ان لوگوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بلاشرط صلح کی تھی۔ اس پر ہارون بہت خفا ہوا، اور ان کو محل سے نکلوادیا۔ (مناقب کردری ۲/ ۱۶۳)

حاضر جوابی

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ اسی لیے جب کوئی بات یا مسئلہ سامنے آتا تو وہ فوراً جواب دیتے۔ ایک بار ہارون کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے، ظہر یا عصر کے وقت انہوں نے امامت کی۔ چونکہ یہ مسافر تھے اس لیے قصر کیا، یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر نمازیوں سے کہا کہ ''اپنی نماز پوری کر لو، میں مسافر ہوں'' اہلِ مکہ میں سے ایک شخص نے نماز ہی میں کہا، ہم لوگ یہ مسئلہ تم سے اور جس نے تم کو سکھایا ہے اس سے بہتر جانتے ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا یہ تو ٹھیک ہے۔

لیکن یہ مسئلہ اگر تم کو معلوم ہوتا تو نماز میں بات چیت نہ شروع کر دیتے۔ اس جواب پر ہارون بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اگر نصف سلطنت کے بدلہ مجھے یہ جواب مل جاتا تو بھی میں پسند کرتا۔ (مفتاح السعادۃ: ۱۰۴)

اہلِ علم کے لیے کام کی بات

حضرت ابن مہدی اہلِ علم کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ جب آدمی اپنے سے زیادہ صاحب فضل و کمال سے ملے تو اس کی صحبت کو غنیمت سمجھے۔ اگر اپنے برابر سے ملے تو اس سے استفادہ اور مذاکرہ کی کوشش کرے۔ اور اگر اپنے سے کم تر آدمی سے ملے تو اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئے اور اس کو اپنے علم و فضل سے فائدہ پہنچائے۔ (علم و ہدایت کے چراغ: ۹۸ بحوالہ صفوۃ الصفوۃ)

اتباعِ سنت کا حکیمانہ طریقہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ ادب اور حسن معاشرت کا نمونہ تھے۔

حدیث کی مجلس میں ان کا ادب دیکھنے والا ہوتا تھا۔ یوں تو عام مجلسوں میں بھی وہ خلافِ اسلام کوئی فعل نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک بار مجلس میں کسی شخص کو چھینک آئی۔ اس نے "الحمد للّٰه" نہیں کہا۔ آپ پھر دیر منتظر رہے پھر اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی! جب چھینک آئے تو کیا کہنا چاہیے؟ اس نے کہا، "الحمد للّٰه"! آپ نے جواب میں "یرحمك اللّٰه" کہا اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور دوسروں کو اتباع سنت کی ترغیب ہو۔ (تاریخ بغداد جلد ۱۱)

علماء کا بگاڑ

امام سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم کو منفعت کا نہیں خلق خدا کی ہدایت کا ذریعہ بنایا، اور وہ اس ذمہ داری سے ہر وقت گراں بار رہتے تھے، فرماتے ہیں: کہ جب علماء میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے تو ان کی اصلاح کون کر سکتا ہے؟ ان کا بگاڑ دنیا کی طرف ان کا میلان ہے۔ وہ دین کے طبیب ہیں اور روپیہ، پیسہ مرض ہے تو جب طبیب خود ہی مرض پال لینے پر تل جائے تو اس کا علاج کون کر سکتا ہے؟

فرماتے ہیں کہ! "اگر میں جانتا کہ لوگ علم رضائے الٰہی کے لیے طلب کرتے ہیں تو خود ان کے گھر جا کر تعلیم دیتا، لیکن لوگ اس لیے علم حاصل کرتے ہیں کہ ان کو لوگوں میں مقبولیت حاصل ہو اور "حدثنا سفیان" کہہ کر اپنی مجلس میں رونق پیدا کریں۔ فرمایا کہ: جب کوئی خدا سے تقویٰ اختیار کرنے کے لیے علم حاصل کرتا ہے تو اس جذبہ ہی کی وجہ سے دوسروں پر اس کو فضیلت ہوتی ہے۔

علماء تین طرح کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ عالم جو اللہ کو پہچانتا ہو اور اس کے احکام اور اوامر کو بھی، اس کی علامت یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا ہے اور اس کے اوامر اور حدود کا لحاظ کرتا رہے۔

دوسرا وہ عالم جو اللہ کو پہچانتا ہے مگر اس کے اوامر سے ناواقف ہے اس کی علامت یہ ہے کہ خدا سے ڈرتا تو ہو مگر اس کے اوامر کی اچھی طرح پرواہ نہ کرتا ہو۔

تیسرا وہ عالم جو اوامر ہی سے واقف ہو مگر خدا کا علم اسے نہ ہو۔ اس کی پہچان یہ جبکہ وہ نہ خدا سے ڈرتا ہے اور نہ اس کے اوامر کی پرواہ کرتا ہے۔ (صفوۃ الصفوۃ)

اعتراف خطا بھی کمال ہے

۱)...... علامہ ابو اسحاق شیرازی رحمۃ اللہ علیہ علماء شافعیہ میں درجہ امامت رکھتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ پانچویں صدی ہجری میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا زہد و تقویٰ میں بھی اپنے ہمعصروں میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ علماء کا بہت بڑا طبقہ ان سے فیض یاب ہوا۔ ان کی ایک خوبی اور بھی اپنے ہم عصروں میں سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کے سامنے اپنی تحقیق اور اجتہادی غلطی جب واضح ہو جاتی تو اس کے اعتراف میں پس و پیش نہ کرتے۔ انصاف پسندی کے ساتھ فروتنی کے وصف نے لوگوں کے دل میں ان کی وقعت بہت بڑھا دی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک بار لوگوں نے ایک استفتاء ان کی خدمت میں پیش کیا انہوں نے اسوقت جو خیال

میں آیا لکھ دیا۔ اتفاقاً وہ استفتاء مع جواب کے امام ابونصر بن صباغ کی نظر سے گذرا۔ انکو علامہ ممدوح کی ہمسری کا دعویٰ تھا۔ اور واقعی تھے بھی وہ اسی پائے کے بزرگ۔ اسے ابن صباغ نے دیکھتے ہی صاحب فتویٰ سے کہا کہ اس کاغذ کو ابواسحاق کے پاس پھرلے جاؤ اور کہو کہ اس پر نظر ثانی کیجیے۔

علامہ ابواسحاق نے دیکھا تو حقیقت میں وہ فتویٰ غلط تھا۔ اپنے فتوے کو درست کیا اور اس کے نیچے یہ جملہ لکھ دیا۔

''الحق ما قاله الشيخ ابن صباغ و ابو اسحق يحطى'' یعنی جو ابن صباغ نے لکھا وہی صحیح ہے اور ابواسحٰق غلطی پر ہے۔ (سیر علماء، از عبدالحلیم شرر)

۲) مکہ معظمہ میں ایک بزرگ عالم قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمہ اللہ بھی ان کے حلقے میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے ایک دن شیخ نے کسی مقام پر ایک فقہی مسئلہ میں غلطی کی اس وقت تو شاہ صاحب خاموش رہے جب درس ختم ہو چکا تو اس وقت پاس جا کر چپکے سے متنبہ کیا کہ یہ مسئلہ مجھ کو اس طرح یاد ہے ان بزرگ نے فوراً تمام طلباء کو پکار کر واپس بلایا، سب جمع ہو گئے تو کہا: ''قد غلطنا فى هذه المسئلة و نبهنا عليه هذا الشيخ، و الصحيح هكذا'' یعنی ہم نے اس مسئلہ میں غلطی کی جس پر ہم کو اس شیخ (ہندی یعنی شاہ صاحب) نے متنبہ کیا، اور صحیح تقریر اس کی یوں ہے پھر شاہ صاحب کی بیان کردہ تقریر کا اعادہ کیا۔

ف: دیکھئے! علماء یہ حضرات ہیں، کہ ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی رکاوٹ نہ ہوئی کہ ہم سے یہاں غلطی ہو گئی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یوں بھی کہدیا کہ اس شیخ نے ہم کو متنبہ کیا حالانکہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے خفیہ اسی لیے متنبہ کیا تھا کہ اگلے دن یہ اس مقام کی صحیح تقریر اپنی طرف سے کر دیں گے مگر انکو اتنا صبر کہاں تھا، اسی وقت سب کو بلا کر صاف اپنی غلطی کا اقرار کیا اور اپنے محسن کو بھی ظاہر کر دیا جس نے غلطی پر متنبہ کیا تھا اگر ہم جیسے ہوتے تو اول تو اپنی غلطی ہی کو تسلیم نہ کرتے، اسی میں بحث شروع کر دیتے اور جو تسلیم بھی کرتے تو اس طرح صاف صاف اقرار نہ کرتے اور جو کرتے بھی تو یہ ظاہر نہ کرتے کہ اس غلطی پر ہم کو کسی دوسرے نے متنبہ کیا ہے بلکہ اگلے دن اس طرح تقریر کرتے کہ طلباء پر یہ ظاہر ہوتا کہ شیخ کو خود ہی تنبیہ ہوئی ہے آخر یہ تکبر اور تصنع نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات: ۱۰۹)

سجدہ کی آیتیں

سجدہ کی آیتیں، عیدین وجمعۃ المبارک اور ہر وہ نماز کہ جن میں قراءت آہستہ کی جاتی ہے امام کو پڑھنا مکروہ ہے۔ يكره للامام ان يقرأ اية السجدة فى صلاة يخافت فيها و كذا فى نحو الجمعة والعيد...... الى آخره. (غنیۃ: ۴۷۳)

تین مسجدوں کے مقتدیوں کی فرض نماز ایک ہی امام کے پیچھے

اس کی صورت یہ ہے کہ دیہات کے ایک امام نے گاؤں کی مسجد میں لوگوں کو ظہر نماز کی ادا فرض

پڑھائی، پھر وہ شہر میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی نیت سے چلا تو اس کی فرض نماز ظہر کی باطل ہوگئی۔ راستہ میں کسی نے اسکو بتایا کہ شہر میں جمعہ کی نماز ہوگئی تو اس نے گاؤں کی دوسری مسجد میں لوگوں کو پھر ظہر نماز کی ادا فرض پڑھائی، اور جب شہر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی جمعہ کی نماز نہیں ہوئی ہے تو وہ جمعہ پڑھنے کے لئے چلا تو پھر اسکی فرض نماز ظہر کی باطل ہوگئی اور جب جمعہ پڑھنے کے لئے امام کے پیچھے کھڑا ہوا تو جمعہ کے امام کا پہلی رکعت میں وضو ٹوٹ گیا، تو اس نے اسی دیہات کے رہنے والے امام کو خلیفہ بنایا، اس نے سب کو نماز جمعہ پڑھائی۔ اس طرح تینوں مسجدوں کے مقتدیوں کی فرض نماز ایک ہی امام کے پیچھے ہوگئی۔ (غنیۃ: ۵۷۶)

دورانِ نماز، قرات میں جواب دینا

کسی نے پوچھا: تیرے پاس کیا کیا مال ہیں؟ تو نماز پڑھنے والے نے جواب میں یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ ﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ﴾ یعنی گھوڑے، خچر اور گدھے (پ۱۴ع۷) یا کسی نے پوچھا: آپ کہاں سے آئے؟ تو جواب میں اس نے یہ آیت کریمہ پڑھی ﴿وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ﴾ یعنی بہت سے کوئیں جو بیکار پڑے ہیں اور بہت سے محل جو گچ کئے ہوئے ہیں۔ (پ۱۷،ع۱۳)

ف: تو اس طرح ان آیات کے پڑھنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (درمختار مع شامی: ۱/۴۱۷)

فضول احتمال لائق توجہ نہیں

فرمایا: کہ ان ہی مولانا سے ایک طالب علم نے درس میں پوچھا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ غروب وطلوع شمس کے وقت نماز ممنوع ہے کیونکہ طلوع وغروب، شیطان کے سینگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ سو غروب کے وقت تو یہ امر معقول ہے کہ سجدہ سینگوں کے سامنے ہوگا لیکن طلوع کے وقت تو پیچھے ہوگا، اس میں کیا حرج ہے؟ فرمایا: کہ اس وقت یہ ڈر ہے کہ کہیں پیچھے سے سینگ نہ اڑا دے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۱/۳۴۲)

امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

فرمایا: کہ امام نخعیؒ کی حکایت ہے کہ آپ ایک مرتبہ کسی کرایہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے تھے، راستہ میں کوئی چیز گر گئی، گھوڑا ذرا آگے بڑھ گیا جب معلوم ہوا، تو گھوڑے کو وہیں روک کر خود اتر کر وہ چیز اٹھا کر لائے اور پھر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ کسی نے عرض کیا کہ گھوڑے ہی کو لوٹا کر اس کو اٹھا لیتے فرمایا کہ یہ مسافت عقد میں نہ ٹھہری تھی اس لیے ایسا کرنا جائز نہیں تھا۔ ہمارے حضرت نے فرمایا: کہ سلف میں اور ہم میں یہ فرق ہے کہ اگر ہم ہوتے، تو اس کے جائز کرنے کے لئے ہزار بہانے نکال لیتے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۱/۵۶۰)

ایک ظریف شخص کی حکایت

فرمایا کہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا: روزہ رکھوگے؟ کہا ہمت نہیں، پھر افطار کے وقت کہا کہ افطاری کھاؤ گے؟ کہا کہ اگر فرض ادا نہ ہو سکتے تو کیا سنت بھی ادا نہ کریں، ایسے کیا بالکل کافر ہی ہو جائیں؟

(ملفوظات حکیم الامت: ۱۱/۲۶۰)

بعیر (اونٹ) کے چند فقہی مسائل

۱) اگر کسی نے مرنے کے بعد بعیر کی وصیت کی تو اس وصیت میں اونٹنی بھی شامل ہوگی لیکن اگر کسی نے بکری کی وصیت کی تو اس میں بکرا شامل نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے اونٹنی کی وصیت کی یا بکرے کی وصیت کی تو ان دونوں صورتوں میں بکرا اور اونٹ شامل نہیں ہوں گے۔ ظاہری عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے لیکن عرف کے کلام عرب کے خلاف ''بعیر'' کو جمل کا درجہ دے دیا ہے۔ امام رافعی فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی کلام عرب میں نص کو اتار دینے کی وجہ سے ایک واسطہ معلوم ہوگا مثل جب عرف عام میں ''بعیر'' جمل کے معنوں میں کثرت سے استعمال ہونے لگے لیکن اگر عرف عام میں کثرت سے استعمال نہ ہوا ہو تو پھر لغت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ ان جیسے مسائل میں نص کے خلاف تصحیح کرنا بعید ہے اس لیے کہ امام شافعیؒ لغت کو زیادہ جانتے تھے اس لیے کوئی بھی مسئلہ سوائے عرف عام میں مشہور ہونے کی وجہ سے اپنی اصل سے خارج نہیں ہوگا اس لیے اگر کوئی مسئلہ صحیح ہوگا تو وہ عرف عام میں مشہور ہوگا ، بخلاف امام شافعی کے قول کے کہ لغت کی اتباع کرو ورنہ عرفؒ عام کی اتباع ہی اولیٰ ہے۔

۲)..... اگر کسی کنویں میں دو اونٹ گر جائیں اور وہ اونٹ دونوں ایک دوسرے کے اوپر ہوں تو اگر اوپر والے کو نیزہ مارا گیا اور نیچے والا اونٹ اوپر والے اونٹ کے بوجھ تلے دب کر مر گیا ہو تو یہ حرام ہو جائے گا اس لیے کہ اسے نیزہ نہیں لگا ہے لیکن اگر نیزہ دونوں اونٹوں کے لگ گیا ہو تو دونوں اونٹ حلال ہوں گے نیز اگر اس بات کا شک ہو کہ نیچے والا اونٹ اوپر والے کے بوجھ سے مرا ہے یا نیزہ کی وجہ سے مرا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس کے نیزہ جان نکلنے سے پہلے لگا ہے یا بعد میں لگا ہے، امام بغویؒ کے فتویٰ کے مطابق حلال اور حرام دونوں صورتوں کا احتمال ہے جیسے کہ اگر کوئی غلام غائب ہو جائے تو کیا اسے کفارہ میں آزاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔

۳)..... اگر کسی نے غیر مقدور (قابو سے باہر) جانور پر تیر چلایا پھر وہ مقدور ہو کر غیر ذبح میں پہنچ گیا، وہ حرام ہوگا اور اگر غیر مقدور جانور کو تیر مارا پھر وہ غیر مقدور ہو گیا تو وہ مذبح میں پہنچنے کی صورت میں حلال ہوگا اور غیر مذبح میں پہنچنے کی صورت میں اس کی حرمت کا فتویٰ دیا جائے گا۔ (حیوۃ الحیوان: ۱/۳۵۴)

سلام پھیرنے کے باوجود خارج نماز نہ ہونا

کسی شخص پر سجدہ سہو واجب ہو، مگر سہو ہونا یاد نہ ہو، تو اس صورت میں سلام پھیرنے کے باوجود نماز سے باہر نہیں ہوتا، بشرطیکہ سجدۂ سہو کرے، لہٰذا جب تک کہ کوئی فعل منافی نماز نہ کیا ہو، اسے حکم ہے کہ سجدۂ سہو کرے اور تشہد وغیرہ پڑھ کر نماز پوری کر لے۔ (درمختار مع شامی: ۱/۵۰۳)

یوم جمعہ مؤخر نہیں ہوسکتا

علی بن ہشام کہتے ہیں: حجاج نے ایک شامی شخص کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔ اس کو ابوحمیر کہا جاتا تھا۔ جمعہ کا دن تھا، وہ جمعہ پڑھنے جا رہا تھا، راستہ میں ایک عراقی سے ملاقات ہوئی عراقی نے پوچھا: ابوحمیر! کہاں جا

رہے ہو؟ کہا، جمعہ پڑھنے۔ عراقی نے کہا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے جمعہ (کا دن) موخر کر دیا۔

یہ سن کر وہ گھر واپس لوٹا، جب دوسرے دن حجاج سے ملاقات ہوئی تو حجاج نے پوچھا: ابوحمیر! آپ کہاں تھے؟ ہمارے ساتھ جمعہ میں شریک نہیں ہوئے، تو کہنے لگا: مجھے ایک عراقی ملا، اس نے کہا، امیر المومنین نے جمعہ موخر کر دیا ہے، تو میں واپس لوٹ گیا، یہ سن کر حجاج ہنسا اور کہنے لگا، اے ابوحمیر! آپ کو معلوم نہیں کہ جمعہ کا دن موخر نہیں ہو سکتا۔ (احمقوں کی دنیا اردو اخبار الحمقی والمغفلین: ۱۶۸)

بیوقوف گواہ

ابوالفضل احمد ہمدانی کہتے ہیں، ایک عورت قاضی کے پاس آ کر کہنے لگی، میرے شوہر نے مجھے طلاق دی ہے۔ قاضی نے عورت سے پوچھا آپ کے پاس گواہ ہے؟ عورت نے کہا: جی ہاں "میرا پڑوسی" میرا گواہ ہے۔ اور عورت نے پڑوسی کو حاضر کیا، قاضی نے اس سے پوچھا بھائی آپ نے اس کے شوہر کو طلاق دیتے ہوئے سنا ہے؟ کہنے لگا میرے سردار! میں بازار گیا، وہاں گوشت، روٹی، شیرہ اور زعفران خریدا، قاضی نے کہا، میں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا۔ صرف یہ بتاؤ! کیا آپ نے اس عورت کی طلاق سنی ہے یا نہیں؟ پڑوسی نے کہا پھر میں یہ سامان گھر پر رکھ کر پھر بازار گیا، لکڑی اور سرکہ خریدا، قاضی نے کہا: یہ باتیں چھوڑ دو، اس نے کہا کہ بات تو ابتداء سے ہی کرنی چاہیے۔ یہ بہت اچھی لگتی ہے، پھر کہنے لگا، اس کے بعد میں گھر میں ٹہل رہا تھا میں نے اسکے گھر میں چیخ و پکار کی آوازیں سنیں۔ اور میں نے طلاق کی آوازیں سنیں، پھر آگے کا مجھے پتہ نہیں کہ اس عورت نے اس کو طلاق دی یا شوہر نے اس کو طلاق دی ہے۔ (ایضاً: ۲۵۲)

وضو کہاں سے کروں؟

ابوسیار کہتے ہیں: میرے اور میرے پڑوسی کے درمیان ایک کنواں مشترک تھا۔ اس میں ایک چوہا گرا۔ میں وضو کی وجہ سے پریشان ہو گیا کہ وضو کہاں سے کروں؟ پڑوسی نے مجھ سے کہا، آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آؤ! ہمارے ہاں سے پانی بھر کر وضو کرلو۔ (یہ نہیں سوچا کہ یہ ایک ہی کنواں ہے)۔

بے نمازی کی حکایت

بعض لوگ نماز شروع کر کے پھر چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ نمازی مشہور ہو گئے ہیں۔ استیلاء شہرت حاصل ہو چکا ہے۔ اب وہ عید ہی کی نمازی ہوں گے کیونکہ نمازی کی ایک قسم یہ بھی ہے۔

چنانچہ ایک واعظ ایک گاؤں میں پہنچے اور وعظ میں کہا "بے نمازی سؤر ہیں" یہ سن کر گاؤں کے لوگ بگڑ گئے اور لاٹھیاں لے کر چڑھ آئے، مولوی صاحب نے کہا، کیوں آئے؟ خیر تو ہے، کہا: تم نے ہم کو سؤر کہا تھا۔ کہنے لگا میں نے تم کو تھوڑی کہا تھا تم تو نمازی ہو کیا تم کبھی عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے تھے۔ گاؤں والوں نے کہا، ہاں! عید کی نماز پڑھ لیتے تھے۔ کہا پھر تم بے نمازی کدھر ہوئے میں نے تم کو سؤر نہیں کہا اس پر سب راضی ہو گئے۔ (حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات)

نمازیوں کی قسمیں

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ نمازی چار قسم کے ہیں۔

(۱) ٹھاٹھ کے (۲) آٹھ کے (۳) کھاٹ کے (۴) اور تین سو ساٹھ کے

۱) ٹھاٹھ کے وہ جو پنجگانہ پڑھتے ہیں۔

۲) آٹھ کے وہ جو آٹھویں دن صرف جمعہ پڑھتے ہیں۔

۳) کھاٹ کے وہ جو مجبوراً نماز جنازہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۴) اور تین سو ساٹھ کے وہ جو صرف عید کے دن شامل نماز ہوتے ہیں۔

عالم نما جاہل کی حکایت

ایک عامل بالحدیث کی حکایت ہے کہ امامت کے وقت نماز میں ہلا کرتے تھے اور تنہا نماز پڑھتے ہوئے نہیں ہلتے تھے۔ کسی نے پوچھا، امامت کے وقت تم کو کیا ہو جاتا ہے جو اس قدر ہلتے ہو؟ کہا، حدیث میں آیا ہے کہ امام کو ہلنا چاہیے۔ لوگوں نے کہا، ذرا ہم بھی دیکھیں، تو آپ حدیث کی مترجم کتاب اٹھا لائے، اس میں حدیث ''من ام منکم فلیخفف'' کا ترجمہ یہ لکھا تھا کہ ''جو شخص امام بنے ہلکی نماز پڑھائے یعنی طویل نہ کرے۔'' آپ نے ہلکی کو ''ہل کے'' پڑھا، کیسے ترجمہ کا ناس کیا۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

ایجاب و قبول

ایک طالب علم تھے دل لگی باز، ان کے ایک دوست نے پوچھا، آج کل کس شغل میں ہو، کہا کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں، کہا، مبارک ہو، بڑا کام مارا، کیا اس کی کوئی صورت ہو گئی ہے؟ کہا جی ہاں! ایجاب ہو گیا ہے، قبول باقی ہے یعنی آدھا کام تو ہو گیا ہے، آدھا باقی ہے۔ پوچھا، کیوں کر؟ کہا، ہم تو راضی ہیں مگر وہ راضی نہیں تو آدھا کام (ایجاب) ہو گیا اور آدھا کام (قبول) باقی ہے۔

اس میں اختلاف ہے

ایک طالب علم تھا۔ کتابیں پڑھ کر اپنے گھر چلا۔ تو استاد سے پوچھا کہ حضرت یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مجھے آتا جاتا کچھ بھی نہیں مگر وہاں عالم سمجھ کر مسائل پوچھیں گے، تو کیا کروں گا؟ استاد تھے بڑے ذہین۔ انہوں نے کہا کہ ہر سوال کے جواب میں یہ کہہ دیا کرنا کہ ''اس میں اختلاف ہے'' اور واقع میں کوئی مسئلہ مشکل سے ایسا ہو گا جس میں اختلاف نہ ہو، سوائے عقائد توحید و رسالت وغیرہ کے۔ تو ہر بات کا یہی جواب دینا کہ اس میں اختلاف ہے۔ انہوں نے ہر سوال کے جواب کے لیے یہ یاد کر لیا کہ اس میں اختلاف ہے۔ تھوڑے دنوں میں لوگوں میں ان کی ہیبت بیٹھ گئی۔ کہ بڑا عالم متبحر ہے، بڑا وسیع النظر ہے مگر ﴿ فوق کل ذی علم علیم ﴾ کوئی صاحب پرکھ گئے کہ اس نے سب کو الو بنا رکھا ہے۔ آ کر

کہا، مولانا! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے، انہوں نے کہا، فرمایئے! کہا "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اس میں آپ کی تحقیق کیا ہے؟ کہنے لگے۔ اسمیں اختلاف ہے، بس آپ کی قلعی کھل گئی۔

اسی طرح تھیٹر میں ایک شخص نے اشتہار دیا کہ آج نیا تماشہ ہوگا کہ حاضرین کسی بھی علم اور کسی بھی فن کا سوال کریں ہم اس کا جواب دیں گے۔ بس جناب لوگ بڑے مشکل سوال چھانٹ کے تھیٹر پہنچے، کوئی انگریزی میں، کوئی عربی میں، کوئی اردو، فارسی میں غرض ہر زبان میں ہر فن کے سوالات لے کر پہنچے۔ وہ حضرت پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور سب کے سوالات باری باری سننا شروع کیے۔ ساری رات ان سوالات میں ختم ہوگئی۔ (اور پھر چھٹی ہوگئی)۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

ٹال دینے کی ترکیب

کسی نے معقولی (منطقی) طالب علم سے مسئلہ پوچھا گلہری کنویں میں گر پڑی ہے پاک کرنے کے لیے کتنے ڈول نکالیں جاویں؟ یہ بے چارے نری منطق جانتے تھے۔ فقہ کی خبر نہ تھی۔ اب آپ نے اپنا جہل چھپانے کے لئے اس سے پوچھا: گلہری جو گری ہے دو حال سے خالی نہیں یا خود گری یا کسی نے گرادی ہے، پھر اگر خود گری ہے تو دو حال سے خالی نہیں، دوڑ کر گری یا آہستہ گری۔ اور اگر کسی نے گرائی ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا آدمی نے گرائی یا جانور نے۔ اور ہر ایک کا حکم جدا ہے، تو اب بتلاؤ! کیا صورت ہوئی؟ سائل نے پریشان ہو کر کہا کہ صاحب اسکی تو خبر نہیں۔ کہنے لگے، پھر کیا جواب دیں؟ وہ بے چارہ گھبرا کر چلا آیا ان کی منطق کا کیا جواب؟ یہ محض ترکیبیں ہیں۔ اور یہ بھی بعضوں کو آتی ہیں اور بعضوں کو نہیں آتی جسے نہیں آتی وہ کیا کریگا؟ کہ غلط سلط مسئلہ بتا دے گا۔ یہ خرابی ہوگی جاہل کے داعی عامہ یعنی واعظ بننے میں۔ اسلیے فرمایا کہ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ﴾ کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے۔

(حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات)

روپیہ مسجد میں لگایا

ایک شخص مسجد کے لیے چندہ جمع کرتا تھا، جہاں جب تھوڑا بہت جمع ہوگیا، اسے بیٹھ کر کھا پی لیا۔ چندہ مانگنے لگا، جب کوئی اس سے پوچھتا، پہلا روپیہ کہا گیا؟ تو قسم کھا کر کہہ دیتا، مسجد میں لگا دیا۔ اسکے ایک پڑوسی نے کہا کہ ظالم! تو جھوٹی قسم نہ کھایا کر، مسجد میں تو کہاں لگاتا ہے تو آپ نے اس سے کہا، کہ آؤ میرے ساتھ چلو، دکھلاؤ! پھر مسجد میں جا کر روپیہ کو دیوار سے لگا دیا اور کہا کہ میں اس پر قسم کھایا کرتا ہوں کہ مسجد میں لگا دیا۔ بس دیوار سے روپیہ کو لگا دیتا ہوں۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

ایک عجیب واقعہ

ہمارے ملنے والوں میں سے ایک صاحب حافظ اکبر تھے، سمجھدار پڑھے لکھے۔ ایک دفعہ وہ بھی اور دو شخص اور، امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ امام کو نماز میں حدث ہوا تو انہوں نے ان ہی حافظ اکبر کو پیچھے

سے آگے کھڑا کر کے خلیفہ بنادیا اور خود وضو کرنے چلے گئے، مقتدی دو شخص رہ گئے، ان میں سے ایک بولا یہ کیا ہوا؟ یعنی کیا قصہ ہے کہ امام چلا گیا اور مقتدی امام بن گئے، دوسرا بولا چپ رہ یوں بھی ہوا کرتا ہے۔ خیر یہ دونوں جاہل تھے مزا یہ کہ حافظ اکبر صاحب جو امام بنے ہوئے تھے آگے کھڑے ہوئے فرماتے ہیں کہ اب میں کس کو نماز پڑھاؤں؟ ظالموں نے سب ہی کی نماز غارت کردی۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

چندہ کرنے کا ڈھنگ

مولوی عبدالرب صاحب نے سہارنپور کی جامع مسجد کے متعلق ایک زنانہ وعظ میں فرمایا تھا: وعظ میں اول تعمیر مسجد کے فضائل بیان فرمائے، پھر کہا افسوس ہماری بہنیں اس فضیلت سے محروم رہ گئیں چونکہ مسجد مکمل ہو چکی ہے سارا کام قریب الختم ہے پھر کہا خوب یاد، ایک کام تو ابھی باقی ہے اور اصل کام وہی ہے، اور وہ فرش کا کام ہے۔ کیوں کہ مسجد میں نماز تو فرش ہی پر پڑھتے ہیں۔ بس ہماری بہنوں کو مسجد کا فرش بنوا دینا چاہیے۔ اس میں یہ لطف ہوگا کہ جب فرشتے نمازیوں کی نمازوں کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کریں گے، تو یوں عرض کریں گے لیجئے حضور! "بندوں کی نماز میں بندیوں کی جانمازیں"۔ (ایضاً)

حقیقت سے بے خبری کا نتیجہ

ایک حافظ صاحب کی حکایت ہے، گو فحش ہے مگر توضیح کے لیے کافی مثال ہے۔ وہ یہ کہ شاگردوں نے کہا: کہ حافظ جی نکاح میں بڑا مزا ہے۔ حافظ نے کوشش کر کے ایک عورت سے نکاح کرلیا، شب کو حافظ جی پہنچے اور روٹی لگا لگا کر کھاتے رہے۔ بھلا کیا خاک مزا آتا، صبح کو خفا ہوتے ہوئے آئے کہ سر کہتے تھے کہ نکاح میں بڑا مزا ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی مزا نہیں آیا۔ لڑکے بڑے شرارتی ہوتے ہیں کہنے لگے جی حافظ جی یوں مزا نہیں آیا کرتا، مارا کرتے ہیں، تب مزا آتا ہے۔ اگلے دن حافظ جی نے بے چاری کو خوب ہی زدوکوب کی مارے جوتوں کے بے چاری کا برا حال کردیا غل مچنے پر اہل محلہ نے حافظ جی کو بہت برا بھلا کہا بڑی رسوائی ہوئی صبح کو پہلے دن سے زیادہ خفا ہوتے ہوئے آئے اور شاگردوں سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا حافظ جی مارنے کے یہ معنی نہیں جو بتایا اس کے موافق عمل کیا جب حافظ جی کو معلوم ہوا، واقعی اس میں تو مزا ہی مزا ہے، حقیقت سے بے خبری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

مذاق بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے

ایک شخص اپنی بیوی سے کہا کرتا تھا کہ تو بہت نماز پڑھتی ہے نماز پڑھنے سے تجھے کیا ملے گا؟ وہ کہتی، جنت ملے گی اس پر کہتا اچھا وہاں بھی ملانوں، موذنوں اور غریبوں ہی کے ساتھ رہے گی، دیکھ ہم دوزخ میں جائیں گے بڑے بڑے لوگ ہونگے شداد، نمرود، فرعون، قارون۔ ہم ان کے ساتھ ہونگے۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

نا اہل واعظ نہیں ہوسکتا

کانپور میں ایک شخص نے ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہیں تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں۔ وہ کہتا ہے واہ ہماری بیوی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے پھر اس نے بیوی سے جاکر کہا کہ لوگ تمہارے فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں۔ اس نے ''شرح وقایہ'' کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقع نکال کر باہر بھیج دیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہو تو قربانی جائز ہے اور اس بکرے کا کوئی بھی عضو تہائی سے زیادہ نہیں کٹا، بلکہ کم ہی ہے گو مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا۔ (ایضاً)

نامحرم عورت کا ٹیلیفون میں سلام کرنے کا حکم

اگر نامحرم عورت نامحرم مرد کو کسی ضرورت کے تحت فون کر رہی تو سلام نہ کرے۔ اگر سلام کرلیا، یا کسی غیر محرم مرد نے ٹیلیفون پر سلام کیا، تو خوفِ فتنہ کی وجہ سے سلام کا جواب واجب نہیں، البتہ دوسرے کو سنائے بغیر آہستہ سے جواب دیا جائے تو بہتر ہے۔ (ردالمحتار:۳۶۹/۶ الحظر والاباحۃ)

مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کا حکم

اگر لوگ مسجد میں نماز اور ذکر واذکار و وظائف میں مشغول ہوں، تو ان کو سلام نہ کیا جائے، کیونکہ سلام تو ملاقات کرنے والوں کے اکرام وتعظیم کے لیے ہوتا ہے، مسجد میں بیٹھنے والوں کا مقصد زیارت وملاقات نہیں، اس لیے مسجد میں داخل ہونے یا مسجد سے نکلتے وقت نمازیوں کو سلام کرنے سے احتراز کیا جائے۔
(فتاوی عالمگیریہ:۳۲۵/۵)

دونوں نے بیک وقت سلام کیا تو....؟

دو آدمیوں نے بیک وقت ایکدوسرے کو سلام کیا تو دونوں پر سلام کا جواب واجب ہوگا ''فان سلما معاً یرد کل واحد''۔ (ردالمحتار:۴۱۶/۶)

ایک سبق آموز واقعہ

ایک شخص کسی زمانہ میں بہت فقیر نادار تھا۔ کوئی اس کو سلام بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ کسی کو سلام کرتا تو لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد حالت بدل گئی، وہ بڑا مالدار بن گیا۔ اب لوگ اس کو بکثرت سلام کرنے لگے، لیکن وہ کسی کے سلام کا جواب نہیں دیتا، بلکہ یوں کہتا تھا کہ پہنچا دوں گا۔ ایک دفعہ راستے میں لوگوں نے پکڑ کر پوچھا: کہ آپ سلام کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ تو اس صاحب نے کہا کہ دیکھیے! میں اسی محلہ کا باسی ہوں، جب میں غریب تھا تو کوئی مجھے سلام نہیں کرتا تھا اگر میں کسی کو سلام کرتا تو اکثر جواب سے محروم رہتا۔ آج اللہ تعالیٰ نے میری حالت بدل دی، اب

ہر طرف سے سلام کی بارش ہونے لگی ہے، تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سلام مجھے نہیں بلکہ میری تجوری کو کیا جا رہا ہے۔ بس میں آپ لوگوں کا سلام سن لیتا ہوں اور شام کو تجوری کے پاس جا کر کہہ دیتا ہوں کہ فلاں فلاں نے تجھے سلام کیا ہے۔

ف : واقعی حدیث شریف کا حکم ہے کہ ہر مسلمان کو سلام کیا جائے، امیر ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، کالا ہو یا گورا، دنیا کے کسی خطے کا رہنے والا، بس مسلمان ہونا شرط ہے۔ اور سلام کا مقصد اپنے مسلمان بھائی کی تعظیم ہے، اس کے لیے سلامتی کی دعا کرنا اور اپنے لیے سلامتی کی دعا حاصل کرنا ہو۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ (سلام کے فضائل ومسائل:۸۹)

خدا حافظ (فی امان اللہ) کہنے کا حکم

کسی کو رخصت کرتے وقت سنت یہی ہے کہ "السلام علیکم" ہی کہا جائے لیکن آج کے دور میں بہت سے مسلمانوں نے اس سنت کو چھوڑ کر لفظ "خدا حافظ" یا "فی امان اللہ" کہنا شروع کر دیا ہے۔ فی نفسہ تو یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے لیکن اصل سنت رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنا گناہ ہے اور ناجائز ہے۔ ہاں البتہ اگر "السلام علیکم" کہا جائے اور اس کے ساتھ کبھی "خدا حافظ" یا "فی امان اللہ" کبھی کوئی اور دعائیہ کلمہ کہہ دیا جائے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن سلام کے ساتھ لفظ "خدا حافظ" یا "فی امان اللہ" کو التزاماً کہنا کہ بس اسی لفظ کو سلام کا جزء بنالیا جائے تو یہ بدعت ہو جائے گی اس سے اجتناب کیا جائے۔

باندی سے پوشیدہ طور پر ہمبستری کے بعد حیلہ کے ذریعے غسل کرنا

ضمرہ شوذب سے نقل کرتے ہیں: کہ ایک شخص کی ایک باندی تھی۔ اس نے اس (باندی) سے پوشیدہ طور پر ہمبستری کی پھر (جب خود غسل کرنا اور اس کنیز کو نہلانا چاہا) اپنی بیوی سے کہا: کہ حضرت مریم اس رات میں غسل کیا کرتی تھی، تم سب غسل کرلو۔ تو (اس حیلہ سے) خود بھی غسل کرلیا اور بیوی اور کنیز نے بھی غسل کرلیا۔ (لطائف علمیہ:۱۷۷)

ایک فقیہ کی اپنے ہی خط کو دیکھ کر شرمندگی

مجھ سے ابوبکر خطاط نے بیان کیا، کہا: ایک فقیہ شخص تھا۔ جس کا خط بہت بھدا تھا، دوسرے فقہاء اس پر بدخطی کا عیب لگایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کوئی خط تمہارے خط سے زیادہ بھدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ان کے اس اعتراض سے جھلایا کرتا تھا، ایک دن بازار میں اس کی ایک مجلد کتاب پر نظر پڑی جو فروخت ہو رہی تھی اس کا خط اس کے خط سے بھی بدتر تھا تو اس نے کشادہ دلی سے اس کی قیمت دی اور اس کو ایک دینار اور ایک قیراط میں خرید لیا اور اس کتاب کو لیکر آیا کہ فقہاء پر اپنی حجت قائم کرے، تاکہ وہ اس کو پڑھیں۔ جب یہ انکے پاس آیا تو پھر انہوں نے اس کی بدخطی کا ذکر شروع کر دیا، اس نے کہا (تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ میرے خط سے زیادہ برا کوئی خط نہیں ہو سکتا) مجھے ایسا خط مل گیا ہے جو میرے خط سے بھی بھدا ہے، اور میں نے

اس کے خریدنے پر بہت بڑی قیمت صرف کی ہے، تاکہ تمہارے اعتراضات سے چھٹکارا ملے، اور وہ کتاب ان کے آگے رکھ دی۔ انہوں نے اس کے صفحات الٹانا شروع کر دیے، جب آخر پر نظر پڑی تو اس پر ان ہی حضرت کا نام لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کتاب کو بھی جوانی میں لکھا تھا ان کو دکھایا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ (لطائف علمیہ: ۱۸۹)

مسائل ضروریہ میں علماء کا اختلاف نہیں ہے

مولویوں کا جن چیزوں میں اختلاف ہے وہ ان مسائل ضروریہ میں نہیں ہے جو روزانہ پیش آتے ہیں، جو لوگ حنفی مذہب کے پابند ہیں وہ اگر حنفی مسلک کے کسی عالم و مفتی سے مسئلہ پوچھیں گے اور وہ واقعی عالم ہے اور فقہ حنفی پر عبور رکھتا ہے تو وہ فقہ حنفی ہی کے مطابق بتائے گا اور اسکے علاوہ دوسرا کوئی عالم جو فقہ حنفی کا ماہر ہو، وہ بھی وہی بتائے گا جو پہلے شخص نے بتایا ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان لوگوں سے مسائل پوچھ لیتے ہیں جنھیں مسائل کا علم نہیں، اور انہوں نے جو مسئلہ غیر ذمہ دارانہ طور پر غلط بتایا اسے علماء کا اختلاف بنا کر اچھالتے ہیں اور خود کو عمل سے بری کر لیتے ہیں۔ (حیلے اور بہانے: ۲۷)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

سنا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کسی نے غیبت کی، حضرت امام صاحب کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاس ہدیہ لے کر گئے، اس نے کہا کہ آپ نے یہ زحمت کیوں گوارا فرمائی؟ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ آپ ہمارے محسن ہیں اس لیے ہدیہ پیش کر رہا ہوں، اس شخص نے عرض کیا میں نے تو کبھی آپ کے ساتھ احسان نہیں کیا، فرمایا: کہ سنا ہے آپ نے ہماری غیبت کی ہے، یہ آپ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ میدان آخرت میں آپ ہمارے گناہ اپنے سر لیں گے اور اپنی نیکیاں ہمارے حساب کے پلڑہ میں ڈال دیں گے! آخرت کے محسن سے بڑھ کر کون محسن ہوگا؟

غیبت کرنے سے نفس کو جو تھوڑا سا مزا آتا ہے، اس مزے کے لیے آخرت کی بربادی کرنا کتنی بڑی بے وقوفی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نقصان کے کام سے بچائے، آمین۔ (حیلے اور بہانے: ۸۹)

مہر نہ دینا اور رسمی طور پر معاف کرا لینا

اکثر بیویوں کا مہر ادا نہیں کرتے ہیں اور رسمی طور پر معاف کرا لیتے ہیں۔ بیوی یہ سمجھتی ہے کہ شوہر کے ساتھ بدمزگی پیدا ہو جائے، تو اس سے زندگی دوبھر ہو جائے گی اور مہر بہر حال ملنا ہے نہیں، لہذا معافی کے الفاظ ہی کہہ دوں۔ لہذا وہ رسمی طور پر دل کے اوپر سے معاف کر دیتی ہے۔ ایسی رسمی معافی کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا﴾

''سواگر تمہاری بیویاں نفس کی خوشی سے مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دیں تو اس کو مرغوب اور خوشگوار سمجھ کر کھالو۔''

دیکھو اللہ جل شانہ نے یوں ارشاد فرمایا: کہ جو نفس کی خوشی سے چھوڑ دے اس کو کھالو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دل کے اوپر سے رسمی طور پر معاف کر دینے سے حلال نہیں ہوتا، اگر ان کے نفس کی خوشی معلوم کرنا ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مہر اس کے ہاتھ میں دے دو، اور خوب صاف واضح الفاظ میں بتاؤ، کہ یہ تیرا مال ہے جو چاہے کر...... تجھے پورا اختیار ہے پھر بھی وہ اپنی خوشی سے دے دے، تو قبول کرلو اوپر کی جھوٹی معافی کو حیلہ بنا کر ان کا مال نہ دباؤ۔ (حیلے اور بہانے: ۹۸)

ایک غلط فہمی کہ غصہ میں طلاق نہیں ہوتی

بہت سے لوگ میاں بیوی کے جھگڑے میں طلاق دے ڈالتے ہیں، جب غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو باوجودیکہ کبھی طلاق بائن یا مغلظہ ہو جاتی ہے۔ پھر بھی بیوی بنا کر رکھے رہتے ہیں، ''ان کا نفس اور بے پڑھے جاہل مفتی فتویٰ دے دیتے ہیں کہ غصہ میں طلاق نہیں ہوتی۔'' یہ غصہ والا حیلہ بالکل غلط ہے۔ شریعت کے رو سے طلاق غصہ میں بھی ہو جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ نشہ پی کر نشہ میں طلاق دے دے تو وہ بھی واقع ہو جاتی ہے، جاہلوں کے فتویٰ پر عمل کر کے زندگی بھر گناہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ غصہ والا حصہ بالکل بناوٹی اور خود ساختہ ہے۔ (حیلے اور بہانے: ۲۰۵)

تین طلاق کے بعد چاروں اماموں کے نزدیک رجوع درست نہیں

بعض لوگ تین طلاق دے دیتے ہیں اور پھر بھی سابقہ بیوی کو بیوی بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ جب ان کو توجہ دلائی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے شافعیؒ مذہب پر عمل کر لیا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ جن کے بعد رجوع جائز نہیں ہوتا۔ حضرت امام شافعیؒ کا نام جھوٹ لیتے ہیں، اور اس جھوٹ کو حیلہ بنا کر زندگی بھر، زنا...... کرتے رہتے ہیں۔ چاروں مذہبوں میں تین طلاقوں کے بعد رجوع کرنے کی گنجائش نہیں رہتی، خواہ الگ الگ کر کے دی ہوں یا ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہوں خوب سمجھ لیں۔ (حیلے اور بہانے: ۱۰۵)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے درجات

ابن ابی رجاء نے محمد یہؒ سے (جو ابدال میں شمار ہوتے تھے) روایت کی ہے کہ میں نے وفات کے بعد ایک مرتبہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا اے ابو عبداللہ! خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی اور خدا تعالیٰ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو علم کا خزانہ نہ بناتا اگر تم کو عذاب دینے کا ارادہ رکھتا'' میں نے پوچھا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کیا گزری؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا ''فوقی'' یعنی وہ مجھ سے ایک درجہ اونچے ہیں جنت میں، میں نے

پھر سوال کیا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا سنایے؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "فوقہ بطبقات" یعنی وہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بہت طبقے اوپر اعلی علیین میں ہیں" (علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات، ۱۲۱/۲)

فقہی ریاست کا بے تاج بادشاہ

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

"انتھت الیہ ریاسۃ الفقہ بالعراق بعد ابی یوسف"

ترجمہ: عراق میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ پر فقہ کی ریاست اور سرداری ختم ہے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں جو انکا مد مقابل قرار دیا جائے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید لکھا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ وقت اور اعاظم رجال ان کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے ہیں اور اپنے فن پر انہوں نے یادگار تصانیف چھوڑی ہیں کہ وہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ ذکی اور ذہین فرد تھے۔

اسی طرح خطیبؒ نے بھی اپنی سند کے ساتھ یحیٰی بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ مجھ سے ابن اکثمؒ نے کہا کہ تم امام مالکؒ سے ملے ہو؟ انکے حلقہ درس میں بیٹھے ہو؟ ان سے سماعت کی ہے؟ اور اس کے ساتھ ساتھ امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت اور معیت بھی تمہیں حاصل رہی ہے، ذرا یہ تو بتاؤ کہ ان دونوں بزرگوں میں زیادہ بلند مرتبت فقیہ کون تھا؟ میں نے جواب دیا: "امام محمد بن حسنؒ" (علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات: ۱۷۳/۲)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب وتلامذہ کے اسماء گرامی

محقق العصر علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر مگر جامع سوانح عربی زبان میں بڑی تحقیق اور تدقیق کیساتھ "بلوغ الامانی فی سیرۃ محمد ابن الحسن الشیبانیؒ" کے نام سے لکھی ہے ان کی تحقیق اور وسعت نظر پر اعتماد کرتے ہوئے ہم ذیل میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کے ناموں کی دی ہوئی فہرست نقل کیے دیتے ہیں۔

ابو حفص احمد بن حفص العجلی رحمۃ اللہ علیہ، ابوسلمان جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوعبیدہ ہروی رحمۃ اللہ علیہ، عمرو حرانی رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن سماعہ تمیمی رحمۃ اللہ علیہ، علی بن معبد رحمۃ اللہ علیہ، معلیٰ بن منصور رحمۃ اللہ علیہ، ابوبکر بن ابی مقاتل رحمۃ اللہ علیہ، اسد بن فرات رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن مقاتل رحمۃ اللہ علیہ، یحیٰی بن معین رحمۃ اللہ علیہ، علی بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ، موسیٰ بن نصر رحمۃ اللہ علیہ، شداد بن حکیم رحمۃ اللہ علیہ، حسن بن حرب، ابن جبلہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوالعباس حمید رحمۃ اللہ علیہ، ابوالتوبہ رحمۃ اللہ علیہ، عبیداللہ بن ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، ابو برید رحمۃ اللہ علیہ، مصعب بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ، ایوب بن حسن رحمۃ اللہ علیہ، خلف بن ایوب رحمۃ اللہ علیہ، علی بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ، عقیل بن عنیسہ رحمۃ اللہ علیہ، علی بن مہران رحمۃ اللہ علیہ، عمرو بن مہیر رحمۃ اللہ علیہ، یحیٰی بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ، ابوعبدالرحمان رحمۃ اللہ علیہ، علی بن حسن رحمۃ اللہ علیہ، ہشام بن عبیداللہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ، شعیب بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ، علی بن صالح رحمۃ اللہ علیہ، اسماعیل بن توبہؒ، ابوبکر ابراہیمؒ، ابوزکریاؒ، ابوموسیٰؒ، سفیان بن سحبانؒ، محمد بن عمر واقدیؒ۔ (علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات: ۱۸۷/۲)

شادی کی ایک غیر شرعی رسم

ارشاد فرمایا کہ آجکل یہ بھی ایک رسم چل پڑی ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں سے مطالبہ کرتے ہیں ہمیں یہ دو، ہمیں اتنا روپیہ دو، کیا یہ سوال نہیں؟ رشوت نہیں؟ دیندار گھرانوں میں بھی یہ رسم چل پڑی ہے اس کو برا نہیں سمجھتے یہ بھی تو رشوت ہی کی طرح ہے جو بالکل ناجائز ہے، حرام ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کا گندہ مال جب کھائے گا، استعمال کریگا تو پھر انجام کیا ہوگا؟ حدیث میں ہے کہ ایک شخص رو رو کر دعائیں مانگتا ہے مگر اسکا کھانا حرام اسکا لباس حرام تو پھر اسکی دعا کیسے قبول ہوگی؟ ہرگز نہیں اسلئے اس سے بہت سخت احتیاط کرنی چاہیے اور جولوگ اس طرح سے جو کچھ لے چکے ہیں انکو فوراً واپس کر دینا چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کرنا چاہیے۔ (ملفوظات ابرار ۴۷)

فقہاء کا امت پر احسان

ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ان علماء کرام کو کہ انہوں نے کتاب وسنت سے مسائل کو مستنبط فرما کر ہمارے لیے آسانی فرمادی، انہیں حضرات کی برکت سے حدود کا علم ہوا کہ کونسی چیز کہاں جائز ہے، کہاں حرام ہے مثلاً ہر غصہ حرام نہیں ہوتا۔ بلکہ جو غصہ نفسانی غرض کے لئے ہو، وہ حرام ہے اور جو غصہ اصلاح کے لئے ہو وہ ٹھیک ہے۔ (ملفوظات ابرار:۵۲)

کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

اصمعی نے ہارون کے دربار میں امام زفرؒ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی یوں کہے "انت طالق مابین واحدة الی ثلث" تو کتنی طلاقیں ہوں گی؟ آپ نے کہا ایک کیونکہ مابین کے استعمال میں حدین داخل نہیں ہوتیں۔ اسی پر اصمعی نے کہا کہ اگر کوئی "ماسنك؟" کے جواب میں "مابین ستین الیٰ سبعین" کہے تو آپکے قاعدہ کے مطابق اسکی عمر نو سال کی ہوئی، پاس امام زفر متحیر رہ گئے۔ (معدن الحقائق شرح کنز الدقائق:۳۲۷)

حلال جانوروں کی سات چیزیں حرام ہیں

سات چیزیں حلال جانور کی کھانی منع ہیں، (۱) ذکر (۲) فرج مادہ (۳) مثانہ (۴) غدود یعنی حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے (۵) خصیہ (۶) پتہ مرارہ جو کلیجی میں تلخ پانی کا ظرف ہے (۷) اور خون سائل قطعی حرام ہے باقی سب اشیاء کو حلال لکھا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۲/ ۲۲۳)

نکاح اور رخصتی میں فاصلہ

آج کل کے منکرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نکاح کرنے کے بعد رخصتی کو لٹکائے رکھتے ہیں، نکاح بھی اس لیے کرتے ہیں کہ دوسرا پھنس جائے یہ طریقہ بالکل غلط ہے فوراً رخصتی کرنی چاہیے یہاں ایک مولانا صاحب کے سسرال والوں نے بھی ایسا ہی کرنا چاہا کہ ابھی نکاح کرلیں رخصتی بعد میں کریں

گے، مولانا صاحب نے خود ہی منع کر دیا بعد میں مجھے پتا چلا تو میں نے کہا کہ سسرال والوں کو پیغام بھیج دیں کہ سابقہ نسبت ختم، جب نکاح و رخصتی اکٹھے کرنے کا ارادہ ہو تو رابطہ کریں اس وقت سرے سے غور کریں گے، اس دوران جانبین آزاد ہیں جہاں چاہیں رشتہ کرلیں، جیسے ہی یہ پیغام پہنچا انہوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے کہ ہماری کوئی شرط نہیں، یوں دماغ درست ہوتا ہے، علماء سے تعلق اور پھر ایسی جہالت کی باتیں۔

منگنی اور شادی کے درمیان یا نکاح اور رخصتی کے درمیان زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کا فاصلہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک مہینے کی مدت کو شرعاً کئی معاملات میں مدت طویلہ شمار کیا گیا ہے۔ ایک ماہ سے زیادہ فاصلہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ منگنی یا نکاح ہو جانے کے بعد جانبین کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جاتا ہے جس سے تہیج (شہوات نفسانی) پیدا ہوتا ہے لہذا گناہ کے اسباب پیدا کرنے کی بجائے جائز طریقے سے اس تہیج (شہوات نفسانی) کی تسکین کی جائے۔ (جواہر الرشید:۶/۴۲)

جہیز میں سامان جہاد

فرمایا: جہاد کے جذبات رکھنے والی جو خواتین مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہیں انکے گھر والے اگر جہیز دینے پر اصرار کریں تو میں جہیز میں بمبار طیارے اور جنگی مہارت رکھنے والے بہترین قسم کے دس گھوڑے طلب کروں گا۔ حاضرین علماء میں سے ایک عالم نے اس عدد کی تخصیص معلوم کی تو حضرت اقدس نے جواب میں فرمایا کہ یہ عدد برکت اور کثرت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ (جواہر الرشید:۶/۴۳)

نام بتانے کی ضرورت

کئی لوگوں کی آوازوں میں باہم مشابہت ہوتی ہے: "النغمة تشبه النغمه" اسی طرح مختلف لوگوں کے خط میں ایک دوسرے سے مشابہت ہوتی ہے "الخط یشبه الخط" مشابہت کیوجہ سے بسا اوقات غلط فہمی ہو جاتی ہے اسی لیے شہادت میں قاضی کے روبرو حاضر ہونا ضروری ہے دور بیٹھ کر ٹیلیفون پر یا انٹرنیٹ پر بات کرے یا خط میں لکھے تو شہادت قبول نہیں ہوگی آوازوں میں مشابہت کی وجہ سے یہ حکم ہے کہ کسی سے ٹیلیفون پر بات کریں یا کسی کے گھر جائیں اور باہر سے بات کریں تو اپنا نام بتائیں، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے کسی سے پوچھا: کون؟ اس نے کہا: میں۔ فرمایا:

میں، میں کیا، نام بتاؤ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ایک بار رسول ﷺ کی خدمت میں ان کی بہن حاضر ہوئیں جن کی آواز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی آواز سے مشابہ تھی اس لئے آپ ﷺ انکی آواز سن کر چونک گئے۔ (جواہر الرشید:۶/۴۷)

سورۂ فاتحہ کے بعد آمین

فرمایا کہ غیر نماز میں بوقت تلاوت سورۃ فاتحہ کے بعد آمین پڑھنا جائز نہیں کیونکہ آمین غیر قرآن ہے اسے قرآن کے ساتھ ملتبس ہرگز نہ کریں البتہ دل میں کہہ سکتے ہیں۔ (جواہر الرشید:۶/۴۷)

سنت کی چار قسمیں

فرمایا: آج کل یہ مرض بہت زیادہ ہوگیا ہے کہ ہر ادب کو سنت کہہ دیتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ سنت کی چار قسمیں ہیں۔

۱) سنت شرعیہ۔ ۲) سنت عادیہ۔ ۳) سنت طبیہ۔ ۴) سنت ضروریہ۔

سنت شرعیہ ہی اصل اور قابل اتباع ہے جس کے لئے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ (جواہر الرشید: ۷۴/۶)

سلام کا مشرکانہ طریقہ

عام طور پر مسلمانوں میں یہ ہندوانہ رسم چل گئی ہے کہ سلام کہنے کو سلام کرنا کہتے ہیں یہ ہندوؤں سے لیا گیا ہے، ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق بڑوں کو سجدہ کیا جاتا ہے مگر ہر وقت اور ہر جگہ سجدہ کرنا ممکن نہیں اس لئے زمین کی بجائے ہاتھ پر سجدہ کرتے ہیں پھر اس میں بھی تخفیف کر کے سر جھکا کر سامنے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہیں انکے زعم میں یہ سجدے کے قائم مقام ہے زمین کی بجائے ہاتھ اور سر رکھنے کی بجائے ہاتھ کی طرف سر جھکا دیتے ہیں گویا زمین پر سجدہ ہوگیا مسلمانوں میں یہ رسم چل پڑی کہ وہ بھی سلام کے الفاظ کہنے کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ بچوں کو سکھاتے ہیں کہ ''سلام کرو'' پھر وہ ہاتھ سے پیشانی کی طرف اشارہ کرتا ہے اسلام میں ایسے سلام کرنے کا شرک نہیں بلکہ زبان سے السلام علیکم کہنے کا حکم ہے البتہ اگر کبھی کسی عذر سے سلام یا اس کے جواب کا سنانا ممکن نہ ہو جیسے گاڑی کی کھڑکی وغیرہ بند ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ایسی حالت میں ہاتھ کا اشارہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اشارہ ہندوؤں کی طرح پیشانی کی طرف نہ ہو اور نہ سر جھکایا جائے۔ (جواہر الرشید: ۹۶/۶)

اللہ کے دشمنوں سے براءت کا ایک عجیب لطیفہ

ایک مجاہد نے بتایا کہ ہم ایک مرتبہ میران شاہ سے بنوں جا رہے تھے راستے میں ظہر کا وقت ہوگیا، فلائنگ کوچ میں سب افغانی سوار تھے سوائے ایک پاکستانی ڈاکٹر کے جو عیسائی تھا سب لوگ نماز کے لئے اترے وہ ڈاکٹر نہ اترا، جب سب نماز پڑھ کر واپس آگئے تو افغانیوں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتا؟ اس نے بتایا کہ میں کرسچن ہوں۔ افغانی سمجھے نہیں کہ کرسچن کیا بلا ہے، انہوں نے کہا کہ خو کرسچن ہو تو ٹھیک ہے نماز تو پڑھو۔ ایک جاننے والے نے بتایا کہ کرسچن کا مطلب ہے عیسائی یہ سن کر افغانیوں نے شور مچا دیا: ''خودا کا پردے دا کا پردے۔'' ''اچھا یہ تو کافر ہے یہ تو کافر ہے'' (جواہر الرشید: ۱۰۷/۶)

عورتوں کا ناک چھدوانا

عورتیں جو ناک چھدواتی ہیں یہ نہایت قبیح رسم ہے میں اسے ناجائز تو نہیں کہتا مگر اس کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ یہ ہندوؤں کی رسم ہے ہندوستان میں اسلام آیا تو لوگوں نے موٹی موٹی باتیں تو سیکھ لیں

لیکن ہندووانہ رسمیں ترک نہیں کیں۔ ہندوؤں میں یہ رسم ایک خاص نظریہ پر مبنی تھی کہ شادی کے وقت ناک میں نکیل ڈال کر اسے شوہر کے حوالے کر دیا جاتا تھا پھر شوہر چاہے اس پر کتنا ہی ظلم کرے حتی کہ ظلم سہتے سہتے مر بھی جائے مگر وہ شوہر کو چھوڑ نہیں سکتی تھی حالانکہ اسلام میں ایسا جبر نہیں، اسلام میں تو یہ ہے اگر نباہ نہ ہو سکے تو طلاق دے دے، یہ تو بہت سخت گناہ ہے کہ معلق کر دے نہ رکھے نہ چھوڑے یہ ہندو تو نکیل ڈال کر شوہر کے حوالے کر دیتے ہیں ان کے ہاں عورتوں کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر ہوتی ہے اور پھر جب شوہر مر جاتا ہے تو عورت دوسرا نکاح نہیں کر سکتی بلکہ پہلے تو یہ لوگ عورت کو بھی شوہر کے ساتھ ہی جلا دیا کرتے تھے اور یہاں ہندوستان کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ ڈولی آئی ہے کھٹولی جائے گی یعنی کچھ بھی ہو جائے اب بس شوہر کے ساتھ ہی گزارہ کرنا ہے اسی لئے شادی کے وقت نکیل ڈال کر شوہر کے حوالے کیا جاتا ہے اسی لئے شوہر کے مرنے پر نکیل اتار دی جاتی ہے پھر کبھی زندگی بھر نہیں پہن سکتی۔

ایک بار مکہ مکرمہ میں ایک سعودی نے مجھ سے پوچھا کہ تم ہندوستانی لوگ عورتوں کو نکیل کیوں ڈالتے ہو یہ تو صحیح نہیں ہمارے ہاں تو نکیل اونٹوں کے ڈالی جاتی ہے اور وہ بھی ان اونٹوں کے جو بہت سرکش ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ نکیل ہی کی وجہ ہے کہ ہندوستان میں طلاقیں بہت کم ہوتی ہیں اگر نکیل نہ ہوتی تو وہاں بھی تم لوگوں کی طرح روز روز طلاقیں ہو رہی ہوتیں۔ انہوں نے بات تو صحیح کہی کہ یہ غلط رسم ہے میں نے انہیں نکیل کا فائدہ بتا دیا وہ اس کا جواب نہ دے سکے، لیکن نکیل کی جو مصلحت میں نے انہیں بتائی وہ تو اب باقی نہیں رہی آج کی عورت ناک چھیدنے کے باوجود بھی شوہر سے دب کر نہیں رہتی بلکہ یہ تو شوہر کے گلے میں خاردار لگام ڈال کر اس پر سواری کرتی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ دعا بھی پڑھتی ہوگی۔

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾

یہ ایک سوراخ تو کیا پوری ناک بھی کٹوا لے تو بھی شوہر کی فرمانبردار اور تابع نہ ہوگی۔

جن خواتین نے ناک نہیں چھدوائی وہ یہ دو دعائیں مانگا کریں۔

"اللّٰھم اجرنی من عذاب النکیل"

"یا اللہ! میں نکیل کے عذاب سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔"

"الحمد للّٰہ الذی عافانی مما ابتلاکن بہ من عذاب النکیل والتشبہ بالنوق"

"اللہ کی حمد ہے جس نے مجھے اس چیز سے بچایا جس میں تمہیں مبتلا کیا ہے یعنی نکیل کا عذاب اور اونٹنیوں سے مشابہت سے۔"

اور جنہوں نے ناک چھدوالی ہے وہ یوں استغفار کیا کریں۔

"استغفر اللّٰہ مما اذنبت من الرضا بعذاب النکیل"

"میں استغفار کرتی ہوں اس گناہ سے کہ میں نے نکیل کے عذاب پر رضا ظاہر کر دی۔" (جواہر الرشید: ۱۰۸/۶)

میں مسائل بناتا نہیں بتاتا ہوں

لوگ میرے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ عجیب عجیب نئے نئے مسائل نکالتا رہتا ہے جو پہلے کبھی نہیں سنے، حقیقت یہ ہے کہ میں مسائل اپنی جیب سے نہیں نکالتا، مسائل تو قرآن وحدیث کے ہیں، میں مسائل بناتا نہیں بتاتا ہوں، میرے بتائے ہوئے مسائل پر لوگوں کو تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ عوام علماء سے تعلق نہیں رکھتے ان سے مسائل نہیں پوچھتے علماء کا بھی یہ قصور ہے کہ وہ ضرورت کے مسائل عوام کو از خود نہیں بتاتے جب کہ میرا یہ معمول ہے کہ عوام لاعلمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی جن بغاوتوں میں مبتلا ہیں اور امت تباہ ہورہی ہے میں ایسے مسائل عوام تک پہنچانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا ہوں۔ اللہ کی وہ بغاوتیں جو معاشرے میں عام ہوچکی ہیں یہ ہیں:

۱) ڈاڑھی منڈانا یا کٹانا۔ ۲) بے پردگی۔ ۳) تصویر کی لعنت۔ ۴) گانا باجا۔ ۵) ٹی وی (یہ تصویر اور گانا باجا دونوں لعنتوں کا مجموعہ ہے)۔ ۶) سود کی لعنت۔ ۷) مردوں کا ٹخنے ڈھانکنا۔ ۸) غیبت کرنا سننا۔ (جواہر الرشید: ۱۳/۶)

مذاق میں طلاق دینے کا حکم

تین چیزیں ایسی ہیں جسکا جھوٹ اور مذاق بھی سچ اور واقع ہے۔ (۱) نکاح (۲) طلاق (۳) رجعت۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

"ثلاث جدهن جد وهز لهن جد، النكاح والطلاق والرجعة" (بخاری شریف)

ف: ہمارے فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ "الحمد للہ" کہنا چاہتا تھا اور منہ سے "انت طالق" نکل گیا تو پھر بھی طلاق واقع ہوجائے گی۔ (مؤلف)

بیس معاملات جو بحالت اکراہ بھی صحیح ہوتے ہیں

بیس معاملات جو بحالت اکراہ بھی صحیح ہوتے ہیں صاحب نہر نے ان کو ان اشعار میں جمع کیا ہے۔

طلاق وایلاء ظهار ورجعة ☆ نكاح مع الا ستيلاء عفو عن العمد
رضاع وايمان وفي ونذرة ☆ قبول لايداع كذا تصلح عن عمد
طلاق على جعل يمين به اتت كذا ☆ لعتق والا سلام تدبير للعبد
وايجاب احسان وعتق فهذه ☆ تصح مع الاكراه عشرين في العدد

(معدن الحقائق شرح کنز الدقائق: ۳۲۵)

کان کاٹ دے تو پانچ سو دینار، سر کاٹ دے تو پچاس دینار لازم ہوں

سوال: وہ کون ہے؟ جو کسی کا کان کاٹ دے تو اس پر پانچ سو دینار لازم ہوں اور اگر سر کاٹ دے تو پچاس دینار؟

جواب: اس نے ایک بچے کا کان اس وقت کاٹ دیا جب اس کا سر ولادت کے وقت باہر نکلا تھا، اب اگر بچہ زندہ بچے تو نصف دیت جوکہ پانچ سو دینار ہے واجب ہوگی، اور اگر اس حالت میں اس نے بچے کا سر کاٹ دیا تو اس میں غرہ واجب ہوگا۔ جوکہ باندی یا غلام جو پچاس دینار کے برابر ہونے کی صورت میں آئے گا، کیونکہ جنین کی دیت **مولود** کی دیت کا نصف عشر (پوری دیت کے دسویں حصے کا آدھا) ہوتی ہے۔ (فقہی پہیلیاں: ۱۷۷)

سلف و خلف

فقہاء کی اصطلاح میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے امام محمد رحمہ اللہ تک سلف، اور امام محمد رحمہ اللہ سے شمس الائمہ حلوانی تک خلف کہلاتے ہیں۔

متقدمین و متاخرین

۱) جنہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ، ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کا زمانہ پایا۔ ۲) تیسری صدی کے انتہاء تک کے علماء متقدمین کہلاتے ہیں، اور (۱) جنہوں نے ائمہ ثلاثہؒ سے فیض حاصل نہیں کیا۔ (۲) یا تیسری صدی کے بعد والے علماء، متاخرین کہلاتے ہیں۔

ائمۂ اربعہ

ائمۂ اربعہ سے مراد (۱) امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ (۲) امام مالک رحمہ اللہ (۳) امام شافعی رحمہ اللہ (۴) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔

ف: دین کی تکمیل ۱۰ ھجری ۹ ذی الحجہ بروز جمعۃ المبارک کو ہوئی۔

دین مکمل ہونے کے ۷۰ سال بعد ۸۰ ہجری میں امام ابوحنیفہؒ پیدا ہوئے۔ ۸۳ سال بعد ۹۳ ہجری میں امام مالکؒ پیدا ہوئے۔ ۱۴۰ سال بعد ۱۵۰ ہجری میں امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔ ۱۵۴ سال بعد ۱۶۴ ہجری میں امام احمد بن حنبلؒ پیدا ہوئے۔

ائمہ ثلٰثہ

اگر ائمہ ثلٰثہ احناف کہا جائے تو ان سے مراد امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ ہوتے ہیں۔ اور اگر مطلق ائمہ ثلٰثہ کہا جائے تو ان سے مراد امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ مراد ہوتے ہیں۔ (از مقدمہ قدوری)

شیخین و طرفین و صاحبین

شیخین سے مراد امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں۔ اور طرفین سے مراد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ ہیں اور صاحبین سے مراد امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ ہیں۔

فقہ کے شرعی احکام

(نقشہ)

مثبت ق منفی

عزیمت ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق ق رخصت حرام ق ق مکروہ

فرض، واجب سنت، نفل تحریمی، تنزیہی فرض عین، فرض کفایہ ق ق ق سنت ھدیٰ،

سنت زوائد مؤکدہ، غیرمؤکدہ

مسجد میں صفوں کی ترتیب

یہ جو مسجد کی صفوں کی ترتیب ہے، پہلی، دوسری، تیسری، آخر تک جب مسجد خالی ہوتو بھی (ترتیب کے اعتبار سے) انکی فضیلت وہی ہوتی ہے جو جماعت کے وقت ہوتی ہے اکثر لوگوں کواس کے بارے میں علم نہیں ہے جب مسجد خالی ہوگی، آپ سے پوچھا جائے گا کہ ''مومن مسجد'' (جہاں حضرت نے یہ بیان فرمایا، اس مسجد کا نام ''مومن مسجد'' ہے) کی پہلی صف کون سی ہے؟ تو کیا آپ وضو خانے کے پاس والی صف کو پہلی صف بتلائیں گے؟ بلاتکلف آپ اس پہلی صف کو ہی مسجد کی پہلی صف بتلائیں گے، تو خالی مسجد میں بھی پہلی صف کی فضیلت حاصل ہوگی، کوشش یہ کرو، کہ اگر نوافل پڑھنے میں یا خالی مسجد میں ذکر کرنا ہے۔ تو آگے بڑھو، پہلی صف میں آکر کرو، صرف جماعت ہی نہیں بلکہ یہ (بہرحال) مسجد کے آداب میں سے ہے۔ (طریق الفلاح لطلاب الصلاح:۵)

نیند کی عجیب نیت

سونے میں بھی ایک ارادہ کرلو، کہ معاصی سے بچارہوں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچارہوں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا: کہ حضرت! آپ کا سونا بھی عبادت ہے فرمایا، کہ میاں یہ بڑوں کی بات ہے، ہم اس مقام کے نہیں ہیں۔ ہم تو سوجاتے ہیں گناہوں سے بچے رہتے ہیں اور گناہ سے بچے رہنے کی نیت سے سوجاتے ہیں، اور بہت ہی اچھا ہے وہ سونا کہ آدمی گناہوں سے بچارہے، بڑا مبارک ہے وہ سونا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے کہ جس عمر میں معاصی کا صدور زیادہ ہوسکتا ہے اس عمر میں نیند بھی زیادہ عطا فرمائی۔ نوجوانوں کو نیند زیادہ آتی ہے، ویسے بھی مشہور ہے ''جوان کی نیند'' بالکل ٹھیک ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے سے انکو گناہوں سے بچالیا۔ (ایضاً)

ناپاک چیز لگے تو نماز صحیح اگر پاک لگے تو فاسد

سوال: وہ کون ہے؟ جسکو نماز کی حالت میں ناپاک چیز لگے، تو نماز اسکی صحیح ہو اور اگر پاک پانی لگے تو

نماز فاسد ہو۔ جواب: یہ امام ہے، جسکو یہ گمان ہو کہ اس کی نکسیر پھوٹی ہے، اور کسی کو اپنا نائب بنائے اب اگر واقعی خون ہے اور وضو کر کے بناء (نماز مکمل) کرے تو اسکی نماز بھی صحیح ہے اور مقتدیوں کی بھی" اور اگر خون نہ ہو تو استخلاف (خلیفہ بنانا) صحیح نہ ہوا لہذا اسکی نماز بھی فاسد ہے اور مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہے"۔ (فقہی پہیلیاں:۴۹)

ایک جلالی بزرگ کی حکایت

قصبہ رامپور میں ایک بزرگ تھے، حضرت حکیم ضیاء الدین صاحبؒ بڑے تیز مزاج تھے بس رعد اور برق تھے۔

ایک بار حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان کے یہاں مہمان تھے ایک مسئلہ طلاق کا پیش آیا مولانا نے فتویٰ دیا ایک ملانی کہنے لگیں کہ قرآن مجید میں تو اس کے خلاف لکھا ہے حکیم صاحب بگڑ گئے کہا: اری چل بیٹھ چڈو، تو کیا جانے قرآن کو، اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پر ایک بال بھی باقی نہ رہے گا تو کیا جانے چڑیل! کہ قرآن کسے کہتے ہیں؟

ف: جواب مخاطب کے علم اور فہم کے مطابق دینا چاہیے چنانچہ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سوال کیا کہ حیض میں عورت کو نمازیں تو بالکل معاف ہیں، انکی قضا بھی واجب نہیں لیکن روزے بعد کو رکھنے پڑتے ہیں اسکی کیا وجہ ہے؟

مولانا نے فرمایا: کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ پر عمل نہ کرو گے تو اتنے جوتے سر پر پڑیں گے کہ سر پر بال بھی نہ رہیں بس یہی وجہ ہے۔

اس کے چلے جانے کے بعد مولاناؒ سے ایک طالبعلم نے اسکی وجہ دریافت کی تو مولاناؒ نے فرمایا اس میں حرج ہے اور اس میں حرج نہیں اور بعضے اور نکات بھی بیان فرمائے اور جاہل کو یہ جواب دیا کہ اگر عمل نہ کرو گے تو اتنے جوتے لگیں گے کہ سر پر ایک بال بھی نہ رہے گا تو اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات:۸۱)

وضو کرنے اور کپڑوں کی طہارت میں ایک عجیب حکمت

جاننا چاہیے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی پھل کے اوپر کا چھلکا اور بدن کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کا چھلکا اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری اور مغز اور ظاہر ہے کہ مقصود مغز ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح اس ظاہری پاکی سے بھی قلب کا پاک ہونا اور نورانی بنانا مقصود ہے شاید تم کو شبہ ہو کہ کپڑے کے دھونے سے قلب کس طرح پاک ہو سکتا ہے لہذا سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک ایسا خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری طہارت کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب چاہے دیکھ لو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوتے ہو تو اپنے قلب میں ایسی صفائی اور انشراح پاتے ہو جو وضو سے

پہلے نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ وضو ہی کا اثر ہے جو بدن سے آگے بڑھ کر دل تک پہنچا ہے۔ (تبلیغ دین ۲۱)

قلب سے فتویٰ لینے کی ضرورت

ایک بات یہ بھی جس کا خیال رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ علماء کے فتوے پر اکتفا نہ کیا کرو، بلکہ اپنے دل سے پوچھا کرو کہ اس معاملہ میں دل کیا کہتا ہے۔ جناب رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ تم اپنے دلوں سے بھی فتوے لیا کرو اگرچہ مفتی فتوے دے چکیں۔ بات یہ ہے کہ گناہ مسلمان کے دل میں ضرور چبھا کرتا ہے، کیونکہ جو چیز ضرر پہنچانے والی ہوگی وہ دل میں کھٹکے بغیر نہ رہے گی پس جو شیٔ درحقیقت حرام ہوگی یا جو کام فی الواقع گناہ ہوگا اس کو تمہارا دل بے کھٹکے ہرگز قبول نہ کرے گا اور ہر چیز کی اصلیت اس طرح پر دل کے فتویٰ سے معلوم ہو جایا کرے گی۔ (تبلیغ دین: ۶۰)

ہنسی مذاق کا جھوٹ

جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جھوٹ بولنا مسلمان کی شان نہیں اور ایمان اور جھوٹ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے سے قلب میں کجی آ جاتی ہے اور خواب بھی سچے نظر نہیں آتے اس لئے مذاق میں بھی دوسروں کے ہنسانے کو جھوٹ نہ بولو۔ ہمیشہ جھوٹے خیالات اور خطرات سے قلب کو بچائے رکھو ورنہ قلب میں کجی پیدا ہو جائے گی اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایسے آدمیوں کو خواب بھی سچا نظر نہیں آتا۔ ایک مرتبہ کسی عورت نے اپنے صغیر سن بچے کو بلایا اور کہا کہ آؤ ہم تمہیں ایک چیز دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت سے دریافت فرمایا کہ اگر بلانے سے بچہ آ گیا تو کیا چیز دے گی؟ عورت نے کہا چھوارے دیدونگی آپ نے فرمایا کہ اگر کچھ دینے کا ارادہ نہ ہوتا اور صرف بہلانے کے لئے ایسا لفظ نکلتا تو یہ بھی زبان کا جھوٹ شمار ہوتا۔ (تبلیغ دین: ۱۱۴)

کذبِ مصلحت آمیز کا جواز اور اس کی حکمت

البتہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ سچ بولنے سے کسی ایسے گناہ یا نقصان کا اندیشہ ہو جو جھوٹ کے گناہ سے زیادہ ہے مثلاً دو مسلمانوں میں صلح کرا دینے یا جہاد میں دشمن کو دھوکہ دینے یا بی بی کو رضامند اور خوش کرنے کے لئے جھوٹ بول دینے کی حدیث میں اجازت آئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں میں عداوت اور رنج رہنے سے جو برا نتیجہ پیدا ہوگا وہ جھوٹ کے نقصان سے بڑھا ہوا ہے، اس طرح جنگ کے راز کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ اگر دشمن کو اطلاع ہوئی اس کو حملے کا موقع ملے گا اور ہزاروں پاک جانیں تلف ہو جائیں گی اس لئے اصل بات کا ظاہر نہ کرنا اور جھوٹی بات بنا دینا افضل ہوا اسی طرح خاوند کے بعض اسرار بی بی سے مخفی رہنے کے قابل ہیں۔ پس اگر راست گوئی کے سبب کوئی خیال اس پر ظاہر ہو گیا اور میاں بی بی میں نااتفاقی ہوگئی تو جو برا اثر پیدا ہوگا اس میں جھوٹ بولنے کی بہ نسبت زیادہ گناہ ہے، پس ایسی صورت میں جھوٹ بولنے کی اجازت ایسی ہے جیسے کوئی شخص دو بلاؤں میں مبتلا ہو جائے تو

آسان اور ہلکی مصیبت کو ترجیح دے کر اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے کسی شخص کے بھوکا مر جانے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے مردار بھی حلال ہے اسی طرح اپنا یا اپنے یا مسلمان بھائی کا مال ظالم کے ہاتھ سے بچانے کو یا کسی کی خفیہ رکھی ہوئی امانت کو محفوظ رکھنے کے لئے دوسروں کے سامنے انکار کر دینا اور جھوٹ بول دینا جائز ہے اور اپنی معصیت کا انکار کر دینا بھی اسی وجہ سے جائز ہے کہ فسق و فجور کا اعلان حرام ہے یا اپنی بیوی سے یہ کہہ دینا کہ میری دوسری بیوی تمہاری سوت مجھے تم سے زیادہ پیاری نہیں ہے یہ سب باتیں اسی بناء پر جائز ہیں کہ اس جھوٹ سے ایک ضرر دفع کیا گیا ہے۔ (تبلیغ دین ۱۱۲)

مولویوں کا انداز غیبت

سب سے بدترین غیبت وہ ہے جس کا رواج مقتداء اور دیندار لوگوں میں ہو رہا ہے کیونکہ وہ غیبتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو نیک سمجھتے ہیں انکی غیبتیں بھی نرالے انداز کی ہوتی ہیں مثلاً مجمع میں کہنے لگے کہ "اللہ کا شکر ہے اس نے ہم کو امیروں کے دروازوں پر جانے سے بچا رکھا ہے ایسی بے حیائی سے خدا پناہ میں رکھے۔" اس کلمہ سے جو کچھ انکا مقصود ہے وہ ظاہر ہے کہ امراء کے پاس بیٹھنے والے مولویوں پر طعن کرنا اور انکو بے حیا کہنا منظور ہے اور ساتھ ہی اپنی صلاحیت تقویٰ جتار ہے اور ریاکاری کا گناہ کما رہے ہیں اسی طرح مثلاً کہنے لگے کہ "فلاں شخص کی بڑی اچھی حالت ہے اگر اس میں حرص دنیا کا شائبہ نہ ہوتا جس میں ہم مولوی مبتلا ہو جاتے ہیں۔" اس فقرہ سے بھی جو کچھ مقصود ہے وہ ذرا سے تامل سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ انکا بے صبرا ہونا ظاہر کرتے ہیں اور اپنی طرف حرص کی نسبت اسی نیت سے کرتے ہیں کہ سننے والا انکو متواضع سمجھے، اور یہی غیبت ہے، ساتھ ہی ریاکاری بھی ہے۔ زیادہ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ یہ حضرات غیبت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو غیبت سے محفوظ اور پارسا سمجھتے ہیں۔ یا مثلاً بول اٹھے "سبحان اللہ! بڑے تعجب کی بات ہے" اور جب اتنا کہنے پر لوگوں نے اس بات کے سننے کے شوق میں ان کی جانب کان لگائے تو کہنے لگے "کچھ نہیں فلاں شخص کا خیال آ گیا تھا حق تعالیٰ ہمارے اور اس کے حال پر رحم فرما دے اور توبہ کی توفیق دے" اس فقرہ کا بھی جو کچھ منشاء ہے وہ عقلمند پر مخفی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا یہ کلمہ ترحم و شفقت یا دعا کی نیت سے نہیں ہوتا جیسا کہ ظاہری الفاظ سے وہم پڑتا ہے اس لئے کہ اگر دعا کرنی مقصود ہوتی تو دل ہی دل میں کیوں نہ کر لیتے سبحان اللہ کہکر لوگوں کو متوجہ کرنا اور معصیت کا اشارہ کرنا ہی کیا ضروری تھا؟ یا کسی شخص کا عیب ظاہر کرنا بھی کوئی شفقت یا خیر خواہی کی بات ہے؟ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہے کہ غیبت سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی غیبت مت کیا کرو مگر دل ان کا غیبت کو مکروہ نہیں سمجھتا بلکہ اس نصیحت کرنے سے محض اپنی دینداری اور تقویٰ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی مجمع میں غیبت ہوتی ہے تو ناصح اور پارسا بنکر کہنے لگتے ہیں کہ "میاں! غیبت کرنا گناہ ہے اس سے ہم سننے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں" یہ لوگ کہنے کو تو کہہ جاتے ہیں مگر دل ان کا مشتاق رہتا ہے کہ کاش یہ شخص ہماری

نصیحت پر عمل نہ کرے جو کچھ کہہ رہا ہے کہے جائے اور ہمیں سنائے جائے بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ غیبت سننے کا انتظار بھی ہے اور پھر یوں بھی سمجھتے ہو کہ ہم منع کر کے گناہ سے سبکدوش ہو گئے۔ یاد رکھو کہ جب تک غیبت کرنے اور سننے کو دل سے برا نہ سمجھو گے تو اس وقت تک غیبت کے گناہ سے ہر گز نہ بچو گے۔ کیونکہ غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں برابر ہیں اور جس طرح زبان سے غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح دل سے غیبت کرنا بھی حرام ہے البتہ چند صورتوں میں خاص لوگوں کی غیبت کرنا جائز ہے، جس کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔ (تبلیغ دین ۱۱۷)

بدعتی کی غیبت کرنا جائز ہے

کسی شخص سے کوئی بدعت یا خلاف شرع امر کے رفع کرنے میں مدد لینی ہو یا کسی کو اس کے فتنہ سے بچانا ہو تو اس سے بھی ان بدعتی لوگوں کا حال بیان کرنا اگر چہ ان کی غیبت کرنا ہے مگر جائز ہے۔ (تبلیغ دین ۱۱۹)

فتویٰ کی ضرورت سے کسی کی غیبت کرنا درست ہے

مفتی سے فتویٰ لینے کے لئے استفتاء میں امر واقعی کا اظہار کرنا بھی جائز ہے اگر چہ اس اظہار حال میں کسی کی غیبت ہوتی ہو۔ دیکھو! رسول اللہ ﷺ سے حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میرا خاوند ابوسفیان رضی اللہ عنہ اتنا بخیل ہے کہ بقدر کفایت بھی مجھ کو خرچ نہیں دیتا۔" اور ظاہر ہے کہ یہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی شکایت اور غیبت تھی مگر چونکہ مفتی شریعت ﷺ سے استفسار کیا جا رہا ہے کہ اس صورت میں میرے لئے شریعت کیا حکم دیتی ہے، لہٰذا اس غیبت میں کچھ حرج نہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صورت میں بھی یہ غیبت اسی وقت جائز ہے کہ جب اس میں اپنا یا کسی مسلمان کا فائدہ متصور ہو۔ (تبلیغ دین ۱۱۹)

تھیلی اور امام

کسی بدو نے ایک تھیلی چوری کی جس میں ایک درہم تھا پھر وہ نماز کے لئے مسجد میں آیا اس کا نام "موسیٰ" تھا اتفاقاً امام نے یہ آیت پڑھ لی۔ ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَامُوسَىٰ﴾ ترجمہ: اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ بدو نے کہا: بخدا! "تو جادوگر ہے" تھیلی پھینکی اور مسجد سے بھاگ نکلا۔ (لطائف ونوادر ۹۷)

بدو اور امام مسجد

بدو نے امام کے پیچھے نماز پڑھی امام نے دوران قرات یہ آیت پڑھی ﴿أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ﴾ (المرسلات: ۱۶) "ترجمہ: کیا ہم نے مار کھپایا پہلوں کو۔ بدو پہلی صف میں کھڑا تھا یہ آیت سن کر پچھلی صف کی طرف کھسک گیا امام نے اگلی آیت پڑھی: ﴿ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ﴾ (المرسلات: ۱۷) "پھر ان کے پیچھے بھیجا پچھلوں کو۔ وہ مزید پیچھے کھسک گیا امام نے اس سے بھی اگلی آیت پڑھی۔ ﴿كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ﴾ (المرسلات: ۱۸)"

ترجمہ: ہم ایسا ہی کرتے ہیں گنہگاروں اور مجرموں کے ساتھ بدو کا نام بھی مجرم تھا۔
جب یہ آیت سنی تو یہ کہتا ہوا نماز چھوڑ کر بھاگا اللہ کی قسم اب ہلاکت کی باری میری ہے، راستے میں کچھ دوسرے بدوؤں سے اس کی ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا مالك يامجرم ؟ مجرم کیا ہوا؟
اس نے جواب دیا۔

''ان الامام اهلك الاولين والا خرين واراد ان يهلكني في الجملة والله مارأيتهٗ بعد اليوم

ترجمہ: امام صاحب نے پہلوں پچھلوں سب کو ہلاک کر دیا یا آخراب مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں آج کے بعد اس کا چہرہ نہیں دیکھوں گا۔ (لطائف ونوادر: ۹۲)

عورت کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

''طالقانی'' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ہیں وہ بے پرواہ بہت تھے ایک دن انہوں نے ابن عقیل سے پوچھا ''عورت کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا اس کی شادی اس کا بیٹا کرا سکتا ہے'' ابن عقیل نے جواب دیا، ''اس کا جواب قدر تفصیل طلب ہے اگر وہ کنواری دوشیزہ ہو تو جائز ہے اور اگر ثیبہ (جس کا نکاح ہو چکا ہو خواہ مطلقہ ہو یا نہیں) ہو تو جائز نہیں ہے۔''
طالقانی نے کہا میں نے آج تک ایسی تفصیل نہیں سنی تھی۔ (لطائف ونوادر: ۵۳۷)

ایضاً پر ہی اکتفا کیا

ایک بزرگ نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے پہلی رکعت میں تو غیر معمولی دیر لگ گئی۔ لیکن بعد میں مقتدیوں کو جلدی کے مارے رکوع و سجود بھی دشوار ہو گیا۔ نماز ختم ہونے پر جب نمازی نکلے، تو ایک صاحب فرمانے لگے کہ ''امام صاحب نے پہلی رکعت میں تو بہت پڑھا تھا لیکن بعد میں تین رکعتوں میں صرف ایضاً ہی پر اکتفا کیا۔'' (مخزن اخلاق: ۴۸۴)

نماز میں کلھیا تیل کا خیال آنا

کوئی شخص بازار میں کلھیا تیل خریدے ہوئے چلے آتے تھے۔ اتنے میں اذان ہوئی اور مسجد بھی نظر آئی انہوں نے تیل کلھیا فصیل (دیوار) پر رکھ دی اور پھر جماعت میں شریک نماز ہو گئے۔ لیکن خیال کلھیا کی طرف تھا کہ کتا، بلی یا کوئی اور نہ لے جائے۔ امام نے بڑی بڑی سورتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے نیت توڑ کر کلھیا فصیل سے اٹھائی اور منہ کے سامنے رکھ کر دوبارہ شریک نماز ہو گئے۔ اور جھلا کر امام صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، اب تجھے بھی قسم ہے جو آج ہی سارا قرآن شریف ختم نہ کر دے ہم نے بھی کلھیا سامنے رکھ لی ہے۔ (حوالہ بالا)

نماز تراویح

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا: ''لوگ کہتے ہیں کہ جو آدمی نہار منہ سات عدد پختہ تر کھجوریں کھالے تو وہ اس کے پیٹ میں تسبیح پڑھتی ہیں۔'' انہوں نے جواباً فرمایا:

''ان کان ھذا فینبغی للوزینج اذا أکل ان یصلی التراویح''

ترجمہ: ''اگر واقعی یہی ہوتا ہے تو وزینج (فارسی زبان میں اعلیٰ اور قیمتی قسم کی ایک مٹھائی کا نام ہے) کھانے کی صورت میں اسے نماز تراویح پڑھنی چاہیے۔'' (حدائق: ۱۳۱)

شک وتردد سے نجات کا حل

ایک مرتبہ حجاج شاعر ایک گلی سے گزرا جس میں نالہ تھا۔ تو رک کر سوچ میں پڑ گیا کہ اسکے چھینٹے مجھ پر پڑیں گے یا نہیں۔ جب تردد اور اضطراب بڑھ گیا اور کوئی فیصلہ نہ کرپایا تو آکر پرنالے کے نیچے بیٹھ گیا، کہنے لگا، اب اطمینان ہوگیا اور یقین نے شک کو ختم کردیا۔ (کتابوں کی درسگاہ میں: ۱۰۹)

یہ آشیانہ کسی شاخِ گل پہ بار نہ ہو

مولانا ولی رازی صاحب اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں:

دل کی دنیا کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے آج مجھے ایسے ہی ایک بے تاج بادشاہ کی یاد آگئی ہے جسے بچپن میں راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔ یہ صاحب کشف وکرامت بزرگ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاد حضرت مولانا اصغر حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب ہیں جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت میاں صاحب کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد تھی جس میں حضرت میاں صاحب نمازیں ادا فرماتے تھے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسجد کے راستے میں ایک حویلی نما مکان تھا جسکے دروازے پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ حضرت میاں صاحب جب شام کے وقت اس دروازے کے سامنے سے گزرتے تھے تو اپنے جوتے اتار لیتے تھے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس پر حیرت تھی کہ حضرت میاں صاحب ایسا کیوں کرتے ہیں؟ شروع میں پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی آخر ایک روز موقع دیکھ کر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھ ہی لیا کہ حضرت! اس مکان میں کون رہتا ہے؟ اور آپکے جوتے اتارنے کا کیا سبب ہے؟ پہلے تو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''میاں! کیا کروگے پوچھ کر'' پھر کچھ وقفے کے بعد فرمایا کہ ''اس مکان میں ایک پیشہ ور رنڈی رہتی ہے۔'' اب اسکی عمر ڈھل چکی ہے لیکن جب یہ جوان تھی تو یہاں لوگوں کا ہجوم روزانہ رہتا تھا اور اس مکان میں کافی آمد ورفت تھی اب یہ بے چاری روزانہ شام کو بن سنور کر بیٹھتی ہے اور انتظار کرتی ہے کہ کوئی آئے۔'' سو مجھے خیال آیا کہ شام کو جو لوگ اسکے دروازے سے گزرتے ہوں گے۔ انکے جوتوں کی چاپ سن کر اسکو ایک امید پیدا ہوتی ہوگی کہ شاید کوئی اسکے پاس آیا اور پھر جب یہ چاپ دور ہو جاتی ہوگی تو اسکی امید ٹوٹتی ہوگی تو میاں! ہم کیوں کسی کی

ناجائز امید پیدا کرنے اور پھر اسکے توڑنے کا سبب نہیں۔ ہماری پڑوسن ہے۔ اپنی ذات سے اسکو تکلیف دینا تو صحیح نہیں۔ ذرا سوچیے! ان اللہ والوں کی نظر کتنی باریک ہے کہاں نظر پہنچی؟ پڑوسی کے حقوق کی بات تو سب ہی نے پڑھی ہے لیکن اس وقت نظر کیساتھ پڑوسی کے حقوق کا خیال رکھنا صرف اہل دل کا حصہ ہے اور اللہ یہ فہم ونظر دل کی صفائی اور ٹیوننگ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔'' ان اللہ والوں کی زندگی صحیح معنوں میں اس شعر کا مصداق تھی۔

؎ تمام عمر اسی احتیاط میں گزری — یہ آشیانہ کسی شاخ گل پر بار نہ ہو (کتابوں کی درسگاہ میں: ۱۳۵)

میرے لیے دین عزیز تر ہے

مولانا نور احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور دارالعلوم کراچی کے ناظم اول اور بانیوں میں سے تھے۔ انکی سوانح حیات انکے صاحبزادے مولانا رشید اشرف صاحب نے لکھی ہے۔ وہ ایک رشتے کے سلسلے میں انکی دینی حساسیت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

''راقم الحروف کی ہمشیرہ کا ایک اچھا رشتہ آیا، لڑکا کینیڈا میں تھا، تعلیم یافتہ خوب رو، حسب ونسب اور وجاہت والا، اسکے والدین جو ہمارے بعض واقف کاروں کے رشتہ دار تھے، پاکستان میں بہتر سے بہتر رشتہ کے لئے کوشاں تھے، تلاش وجستجو کے بعد نظر انتخاب ہمارے گھرانے پر پڑی، بڑے چاؤ سے رشتہ منظور کیا گیا، کینیڈا میں ہونے کی بناء پر لڑکا اپنے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے محدود وقت ہی کے لئے پاکستان آسکتا تھا، اسلئے اسکے بارے میں یہ طے تھا کہ وہ نکاح سے ایک دو روز قبل پاکستان آئیگا اور چند ہی روز بعد اہل خانہ کیساتھ واپس کینیڈا چلا جائیگا، ان حالات کی بناء پر راقم کے والد ماجد نے احتیاطاً یہ شرط عائد کی تھی کہ لڑکے سے ملاقات ہونے پر کوئی بے اطمینانی کی بات سامنے آئی تو عین موقع پر بھی عذر کیا جاسکتا ہے، چونکہ ظاہری اسباب میں بے اطمینانی کی وجہ نہ تھی اسلئے فریق آخر نے یہ شرط منظور کرلی، اگرچہ مجموعی حالات کے لحاظ سے کسی بھی فریق کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہ تھی کہ یہ رشتہ نہ ہو سکے گا، اسلیے دونوں طرف سے تیاریاں مکمل تھیں، دو دن قبل لڑکا کینیڈا سے آیا، حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، حسن وصورت، ظاہری وجاہت طرز تکلم اور آداب معاشرت کے لحاظ سے ہمارے تصور میں بہتر نکلا، دل کو اطمینان ہوا، لیکن اس سے بات چیت کے بعد پردہ کے بارے میں آزاد خیالی محسوس ہوئی، جس سے فکر ہوئی'' دینی تصلب کی بناء پر اس سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ کی تشویش دو چند تھی، بعض اعزہ نے اطمینان دلایا کہ خاندان سے جڑنے کے بعد یہ کمی بھی دور ہوجائیگی اس لئے اتنے اچھے رشتے کو رد کرنا مناسب نہیں، لیکن دینی معاملات میں حساس ہونے کی بناء پر حضرت والد صاحبؒ کی تشویش رفع نہ ہوئی فرمانے لگے کہ کینیڈا کے ماحول میں اس آزاد خیالی کے کم ہونے کے مقابلے میں بڑھنے کا اندیشہ زیادہ ہے بالآخر اپنی حمیت دینی کی بناء پر نکاح سے ایک دن قبل حضرت والد صاحبؒ نے یہ رشتہ رد فرمادیا۔ اس تقریب نکاح میں تمام تیاریاں مکمل تھیں شادی کارڈ تقسیم کیے جاچکے تھے، فریقین کی تقریبات کے لئے ہال بک تھے،

طعام وغیرہ کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے اس فیصلے کی بناء پر ہر طرح کی قربانی دینی پڑی، لیکن حضرت والد صاحب کی غیرت ایمانی نے سب کو برداشت کیا، شاید اسی کی برکت تھی کہ انہی ہمشیرہ کی بعد میں مدینۃ الرسول ﷺ سے دہلوی خاندان کے ایک حافظ و عالم کا رشتہ آیا جو منظور کیا گیا۔ (متاع نور ۳۱۵)

ایک دلچسپ مناظرہ

قاضی ابن ابی لیلیٰ سے متعلق ایک لطیفہ مؤرخین ذکر کرتے آئے ہیں۔ ہوا یوں کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ کسی کام سے خلیفہ منصور کے دربار میں آئے یا بلائے گئے ادھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی طلبی ہوئی دربار میں سوال اٹھایا گیا کہ سوداگر اپنے مال کے متعلق گاہک سے اگر یہ کہدے کہ جس سودا کو آپ لے رہے ہیں میں اس کے عیوب اور نقائص سے بری ہوں اسکے باوجود بھی اگر آپ لینا چاہتے ہوں تو لے سکتے ہیں۔

اب سوال یہ تھا کہ اسکے بعد اگر اس سودے میں کوئی عیب یا نقص ظاہر ہو جائے تو خریدار کے لئے خیار عیب یعنی واپسی کا حق باقی رہتا یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، سوداگر اس اعلان کے بعد بری الذمہ ہو جاتا ہے سودے کا واپس لینا اس پر لازم نہیں۔

قاضی ابن ابی لیلیٰ نے کہا اور اپنے کہنے پر اصرار کیا کہ سودے میں جو عیب ہو جب تک ہاتھ رکھ کر بائع (سوداگر) اسکو متعین نہیں کریگا اسوقت تک لفظی برأت کافی نہیں!

دونوں میں مسئلہ پر گرما گرم بحث ہونے لگی خلیفہ منصور دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ بالآخر جب قاضی ابن ابی لیلیٰ اپنے موقف سے نہ ہٹے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے دریافت فرمایا کہ فرض کیجئے کسی شریف عورت کا ایک غلام ہے وہ اس کو بیچنا چاہتی ہے لیکن غلام میں یہ عیب ہے کہ اسے عضو مخصوص پر برص کا داغ ہے تو فرمایئے کہ کیا آپ اس شریف عورت کو حکم دیں گے کہ عیب پر ہاتھ رکھ کر خریدار کو مطلع کردے۔

قاضی ابن ابی لیلیٰ نے اپنے بات کی ہٹ میں کہا کہ ہاں اس عورت کو مرد کے اس مقام پر ہاتھ رکھنا ہوگا۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اس فتوے سے حاضرین مجلس پر برا اثر پڑا۔ لکھا ہے کہ خلیفہ منصور قاضی صاحب کے اس فتوے کیوجہ سے ان پر بہت برہم ہوا۔ (دفاع امام ابوحنیفہؒ ۱۷۸)

متفرقات

۱) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے صرف گیارہ یا بارہ سال چھوٹے تھے۔ ۲) بحالت جنابت اگر سونے کے لئے وضو کرے جیسا کہ مشروع ہے تو یہ وضو ناقض وضوء سے نہیں ٹوٹے گا۔

"اذا سالت وضوء لیس ینقضه سوی الجماع وضوء النوم للجنب"

علامہ نووی کی شرح مسلم المنهاج میں یہ بات انہوں نے کتاب الایمان کے ختم پر فرمائی۔ (نایاب تحفہ: ۱۲۶)

اکابر کی فتویٰ دینے میں احتیاط

حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کوئی بات دریافت کی، آپ نے جواب دیا مجھے یہ مسئلہ اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس شخص نے کہا: میں تو آپ کے سوا کسی کو اس منصب کے لائق جانتا ہی نہیں! اسی لیے آپ کے پاس آیا، حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"لاتنظر الی طول لحیتی و کثرۃ الناس حولی"

ترجمہ: میری لمبی داڑھی اور میرے اردگرد لوگوں کی بھیڑ کو مت دیکھو۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱/۸۱)

غیر ضروری مسائل سے گریز

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں امام زفر رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ یہ اپنے علم و فضل اور ملکۂ اجتہاد میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہم پایہ تھے۔ ان کے زمانہ میں فلسفہ کے اثر سے بہت سے ایسے مباحث اور لفظی اختلاف پیدا ہو گئے تھے جن کی حیثیت دین میں تو کچھ نہیں تھی، مگر سوء اتفاق سے وہ اس وقت توحید و آخرت کے مسائل کی طرح اہم ہو گئے تھے اور جو لوگ ان کلامی مسائل اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے، انکے دامن پر بھی لوگ دو چار چھینٹیں ڈال ہی دیتے تھے۔ امام صاحبؒ اور انکے تقریباً تمام اصحاب و تلامذہ ایسے غیر ضروری مسائل و مباحث سے گریز کرتے تھے، مگر پھر بھی لوگوں نے ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں جن سے انکا کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔

اس وقت قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ عام طور سے موضوعِ بحث بنا ہوا تھا اور اسکے بارے میں لوگ ائمہ سے عموماً سوالات کرتے تھے۔ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ ان لایعنی باتوں سے بہت گریز کرتے تھے، مگر پھر بھی کبھی کبھی زبان کھولنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک روز کسی نے قرآن کے بارے میں پوچھا، انہوں نے جواب دیا "القرآن کلام اللہ" یعنی "قرآن کلام الٰہی ہے۔" یہ نہایت عاقلانہ جواب تھا۔ مگر سائل کا مقصد کچھ اور تھا، اس لئے اس نے فوراً پوچھا کہ کیا وہ مخلوق ہے؟ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے ذرا تند مگر ہمدردانہ لہجے میں فرمایا کہ: اگر تم ان دینی مسائل کے سوچنے اور غور کرنے میں مشغول ہوتے جن میں میں مشغول ہوں تو وہ میرے لئے بھی مفید ہوتا اور تمہارے لئے بھی۔ اور جن مسائل کی فکر میں تم پڑے ہوئے ہو وہ تمہارے لئے مضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کیلئے وہ چیزیں ثابت کرو جن سے وہ خوش ہو، اور جن چیزوں کا تم کو خدا نے مکلف نہیں بنایا ہے اس میں اپنی جان ناحق نہ کھپاؤ۔ (تبع تابعین ۱۸۸)

علم کا فطری ذوق اور مطالعہ میں انہماک

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد حضرت امام محمد شیبانی بچپن ہی سے علم کا ذوق رکھتے تھے۔ ذکاوت و ذہانت بلا کی تھی، وہ آغاز شعور ہی سے مسائل میں ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ بڑوں کی نگاہیں بھی وہاں تک کم پہنچتی تھیں۔ انکے اسی فطری ذوق اور استعداد کو دیکھ کر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ "انشاء اللہ

یہ لڑکا رشید ہوگا۔" ایک روز ان کے ایک سوال پر فرمایا" تم تو بڑوں جیسا سوال کرتے ہو، میرے پاس آمد ورفت رکھو۔"

محمد بن سماعہ جوان کے خاص تلامذہ میں ہیں،فرماتے تھے کہ امام محمد رحمہ اللہ مطالعہ میں اس قدر انہماک ہوتا تھا کہ اگر کوئی شخص ان کو سلام کرتا تو انہماک اور بے خبری میں جواب دینے کے بجائے اس کے لئے دعا کرنے لگتے تھے۔ پھر وہ شخص کچھ اور الفاظ زیادہ کر کے جب دوبارہ سلام کرتا تو وہی الفاظ دہرا دیتے تھے۔ (بلوغ الامانی)

ان کے نواسے فرماتے ہیں کہ" (امام محمد کی وفات کے بعد) میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا کہ نانا گھر میں رہتے تھے تو کیا کرتے تھے؟ انہوں نے اشارہ کر کے بتایا کہ فلاں کوٹھری میں رہا کرتے تھے، اور گردوپیش کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ میں نے مطالعہ کے وقت انکو کبھی بولتے ہوئے نہیں سنا، بجز اس کے کہ وہ ابرو اور ہاتھ کے اشارے سے اپنی ضرورت بتلا دیا کرتے تھے۔" (کردری:۲/۱۶۴)

علمی شغف کا یہ حال تھا کہ کپڑے میلے ہوجاتے تھے لیکن جب تک کوئی دوسرا شخص کپڑا نہ بدلواتا وہ کپڑے نہیں بدلتے تھے۔ گھر میں ایک مرغ پلا ہوا تھا جو رات کو اکثر بانگیں دیا کرتا تھا۔ انہوں نے اہل خانہ سے کہا کہ اسے ذبح کردو۔ ان کی بانگ بے ہنگم کی وجہ سے علمی کام میں خلل پڑتا ہے۔ (علم وہدایت کے چراغ:۱۱۳)

ابو یوسف! آپ کا جواب غلط ہے

قاضی ابو یوسفؒ، امام کسائیؒ کے ہمراہ ہارون الرشید کے پاس آئے۔ دونوں میں علمی مذاکرہ کے ساتھ طنز و مزاح بھی ہوا، امام کسائیؒ نے کہا:" امیر المؤمنین! یہ کوئی آپ کے دماغ پر چھا گیا ہے۔" ہارون نے کہا:" ابو یوسف! یہ (یعنی امام کسائی)" مجھے ایسے انوکھے تراشے پیش کرتے ہیں کہ میرا دل ان کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔"

"ابو یوسف! میں تجھ سے ایک مسئلہ پوچھوں؟" امام کسائی نے کہا۔

"نحو کا یا فقہ کا؟" قاضی ابو یوسفؒ نے دریافت کیا۔

"نہیں، فقہ کا" امام کسائی بولے۔ اس پر ہارون الرشید کی ہنسی چھوٹ گئی، انہوں نے کہا:" تم فقہ میں ابو یوسفؒ کا امتحان لیتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا:" ہاں" پھر قاضی ابو یوسفؒ سے مخاطب ہوئے اور کہا:

امام کسائی:" ایسے شخص کے متعلق تم کیا فتوی دیتے ہو جس نے اپنی بیوی سے کہا:" انت طالق ان دخلت الدار" (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے)

قاضی ابو یوسفؒ:" اگر عورت گھر میں داخل ہوئی تو اسے طلاق ہوجائے گی۔"

امام کسائی:" ابو یوسف! جواب غلط ہے"

ہارون پھر ہنس پڑے اور کہا:" یہ غلط ہے تو درست جواب کیا ہوگا" امام کسائی نے کہا:" اگر اس نے "أن دخلت الدار" کہا تو طلاق فی الفور واقع ہوجائے گی، عورت چاہے بعد میں گھر میں داخل ہو یا نہ

ہو، اور اگر اس نے "إن دخلت الدار" کہا تو جب تک عورت گھر میں داخل نہ ہو طلاق واقع نہیں ہوگی۔" (ابن عاصم حدائق ۳۷۴)

فقہ نہایت مشکل چیز ہے

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ جی ہاں فقہ نہایت مشکل چیز ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور لوگ زیادہ تر اس میں بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں خصوصاً بعضے غیر مقلدین اس باب میں بڑے دلیر ہیں۔ ہمارا مذہب تو بحمد اللہ مدون ہے مگر ان مدعی غیر مقلدوں کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر جو جی آیا فتویٰ دیدیا۔ ایک مرتبہ ایک غیر مقلد مولوی صاحب نے یہ چھاپ دیا کہ دادا کی بیوی سے نکاح جائز ہے، مراد یہاں دادا کی بیوی سے دادی نہیں بلکہ دادا نے کسی عورت سے دوسرا نکاح کرلیا وہ مراد ہے۔ اس پر لتاڑ پڑی غنیمت ہے دوسرے رسالہ میں رجوع کرلیا مگر ان بزرگ کو پہلے سے کیسے جرات ہوئی؟ بس یہ حالت ہے ان لوگوں کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شرارت سے ایسا کرتے ہیں مگر جب اتنا ذہن اور فہم نہیں جتنا ان حضرات میں تھا پھر خواہ مخواہ اجتہاد کی ہوس کیوں کرتے ہیں۔ خود کچھ آتا نہیں اور دوسروں کے اجتہاد پر اعتراض ہے دوسروں کی تقلید سے عار ہے اور خود مجتہد بنتے اور تمام دنیا سے اپنی تقلید کے امیدوار ہیں۔ یہ خود بدفہمی اور بدعقلی کی بات ہے تمام دنیا کے عقلاء مل کر بھی فقہاء کی جوتیوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ موٹر میں تیل تو ہے۔ سومیل کے چلنے کا مگر ارادہ کر دیا دو سومیل کا ایسی مثال ہے ان لوگوں کی، پھر اپنے پر دوسروں کو قیاس کرنا کہ وہ بھی ایسے ہی بے دلیل کہہ دیا کرتے ہوں گے سخت نادانی ہے۔ ان حضرات پر اعتراض کرنے کا کیا کسی کا منہ ہے اسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند درنوشتن شیر و شِیر

(الافاضات الیومیہ: ۲۰۲/۶)

مذہب حنفی کے متعلق حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو امام صاحب کا مذہب حدیثوں میں ایسا روشن نظر آتا ہے جیسا کہ نصف النہار میں آفتاب۔ بات یہ ہی ہے معرفت کے لئے فہم کی ضرورت ہے بدفہم لوگ شب و روز معترض رہتے ہیں۔ بینائی تو اپنی خراب اور آفتاب پر اعتراض۔ (ایضاً: ۵۲/۳)

تصوف آسان، فقہ مشکل

ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں سب علوم سے زیادہ آسان تصوف کو سمجھتا ہوں اور سب سے زیادہ مشکل فقہ کو۔ (الافاضات الیومیہ ۱۶۷/۳)

ایک گائے کے آٹھ حصے

فرمایا: کہ ایک بڑے تماشہ کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ ایک گائے قربانی کے لیے خریدی تھی اس میں آٹھ حصے دار ہو گئے تھے جب ذبح کر چکے تب معلوم ہوا کہ آٹھ حصہ دار ہیں۔ تو کیا اگر اب ایک کو الگ کر دیں تو قربانی صحیح ہو جائے گی یا نہیں؟ اس پر فرمایا کہ اس الگ کر دینے پر یاد آیا کہ ایک شخص نماز میں ایک ٹانگ اٹھائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا۔ جب نماز ختم کر چکا کسی نے پوچھا کہ میاں یہ ٹانگ الگ کئے ہوئے نماز کیوں پڑھ رہے تھے کہتا ہے کہ اس ٹانگ میں نجاست لگی تھی اور نماز کا وقت تھا تنگ، دھو سکا نہیں اس وجہ سے اسکو نماز سے الگ کر دیا۔ قربانی کے بعد ان کا آٹھواں حصہ دار الگ کر دینا بھی ایسا ہی ہوگا۔ لوگوں میں فہم اور عقل کا تو بالکل نام ونشان نہیں رہا۔ (ایضا:۳/۱۷۰)

بزرگوں کے برکات سے متعلق ایک فقہی غلطی

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ برکات کے متعلق ایک نازک غلطی عام ہے نہ پیروں کو اسکا خیال نہ سجادوں کو، وہ یہ کہ جو چیزیں بزرگوں کی ہوتی ہیں انکو تبرکات میں رکھ لیتے ہیں حالانکہ انمیں ورثاء کا بھی حق ہوتا ہے ایک صاحب نے عرض کیا کہ شاید وقف کر دیتے ہوں فرمایا اول تو کوئی وقف نہیں کرتا دوسرے اگر کرے بھی تو بوجہ عدم اجتماع شرائط کے وہ وقف جائز بھی نہیں ہوگا پیرزادوں میں علماء بھی ہوئے ہیں۔ مگر کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا اور یہ جواب تو اس پر ہے کہ جو کوئی وقف کرتا بھی ہو مگر یہاں تو کوئی وقف بھی نہیں کرتا یوں ہی مر جاتے ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب کے بعض ملبوسات میرے پاس تھے جو جائز طریق سے مجھکو ملے تھے۔ مگر میں نے دوسروں کو دیدیئے ایک تو اسی لیے کہ میرے بعد انکو کوئی ذریعہ آمدنی کا نہ بنا دے دوسرے اسی محذور سے بچنے کے لئے جسکا ابھی ذکر ہوا ہے باقی حضرت نے توجہ سے جو دعائیں کی تھیں وہ تبرکات میرے پاس ہیں۔ (ایضا:۳/۲۶۷)

فقہ کے مآخذ یعنی احکام شرعیہ کے دلائل

احکام شرعیہ کے دلائل صرف چار ہیں۔ قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ تمام شرعی احکام انہی میں سے کسی نہ کسی دلیل سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اسی لیے اسکو "فقہ کے مآخذ" بھی کہا جاتا ہے۔ (نوادر الفقہ:۱/۶۳)

اصلی حنفیت

ہمارے تمام سلف صالحین احناف اس امر پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے ہمیں قرآن مجید پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے۔ جب قرآن کا صریح حکم مل جائے تو پھر اور کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ نمبر دوم: سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے ارشادات مبارکہ ہیں۔ جب ان دونوں مقامات سے کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے

تو پھر اجماع امت کو دیکھا جائے گا اگر یہ طے پا گیا ہے تو فبہا ورنہ شرعاً قیاس کرنے کی اجازت ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ ہر انسان قیاس کرنے کی بجائے کسی اعلیٰ درجہ کے متقی، عابد، زاہد، ماہر علوم کتاب اللہ وسنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قیاس پر عمل کرے اسی کا نام تقلید ہے۔ (خطبات حضرت لاہوری ۲/۲۵۱)

فلمی دھنوں میں نعت

آج کل بعض عوامی شاعر فلمی دھنوں پر نعت لکھتے ہیں اور ایسے ہی نعت مذہبی اجتماعات میں پورے طور سے فلمی سروں میں پڑھی جاتی ہے۔ ایسی نعت کے لئے شاعر مخرب اخلاق فلمی ریکارڈ سنتے ہوں گے جبھی تو وہ ان سروں پر نعت کہتے ہیں ایسے نعت خوانوں اور ایسے دوسرے شائقین کو مخرب اخلاق فلمی ریکارڈ سننے کا چسکا پڑتا ہے۔ شریعت اس کے بارے میں کیا حکم دیتی ہے؟

اس کو شومئی قسمت کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے کہ اول تو ہم ہر نیک کام سے روز بروز دور ہوتے جارہے ہیں اور اگر کبھی اچھا کام کرنے کا جذبہ پیدا بھی ہوتا ہے تو اس میں جب تک کچھ ناجائز اور حرام کی آمیزش نہ کرلیں، تسکین نہیں ہوتی۔ سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے بلاشبہ یہ نعت جیسی روح پرور عبادت کو کھیل تماشا بنانا اور اسکے ساتھ کھلا مذاق ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ نے ردالمحتار میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جب کوئی شخص پانی کو شراب کے مشابہ بنا کر شراب کی طرح پئے تو اس کے لیے حرام ہے''

چنانچہ فقہاء نے کہا اگر کوئی شخص لہو وطرب کے ساتھ پانی یا کوئی اور حلال مشروب شرابیوں کی ہیئت بنا کر پئے تو یہ صورت حرام ہے۔ علامہ ابن عابدین نے بھی فقہاء کے اس قول سے اتفاق کیا ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ ''**من تشبه بقوم فهو منهم**'' (جو شخص کسی قوم یا گروہ کی نقالی کرے وہ انہی میں سے ہے) تو جب ناجائز کام کی نقالی کی اجازت مباح چیزوں میں بھی نہیں تو ایک عبادت کو حرام کے مشابہ بنا کر پیش کرنا تو ناجائز ہونے کے علاوہ عبادت کیساتھ کھلا مذاق ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی گستاخ نہایت خوش ذائقہ مٹھائی سڑے ہوئے کیچڑ میں رکھ کر کسی حاکم کو بطور تحفہ پیش کرنے کی جسارت کرے۔ ایسے نعت گو حضرات کو اس فعل قبیح سے مناسب طریقہ سے روکنا چاہئے اور انکی ہمت افزائی سے پورا اجتناب کرنا چاہیے۔ (نوادر الفقہ: ۲/۳۵۲)

عورتوں کو بھی ''السلام علیکم'' کہنا چاہیے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ عورتوں میں رسم ہے کہ جب آپس میں ملنے کے وقت سلام کا موقع ہوتا ہے تو فقط لفظ ''سلام'' کہتی ہیں مگر کاندھلہ میں تو پہلے سے اور یہاں تھوڑے روز سے جولڑکیاں ہیں آپس میں پورا سلام کرتی ہیں۔ ''السلام علیکم'' اب الحمد اللہ اس کی رسم ہوگئی ہے جو نہایت مبارک بات ہے۔ (الافاضات الیومیہ ۶/۲۰۴)

سلطنت صرف فقہ حنفی پر چل سکتی ہے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا: کہ امام ابوحنیفہؒ کی عجیب نظر ہے ان کا فتویٰ ہے "من کسر لمسلم بر بطا او طبلا او مزمارا او دفافھو ضامن" اور وجہ اسکی یہ لکھی ہے کہ "الامر بالمعروف بالید الی الامراء لقدر تھم وباللسان الی غیرھم" یعنی آلات لہو کو توڑ ڈالنا واعظ کو یا کسی عامی کو جائز نہیں۔ اگر کوئی توڑ ڈالے گا، تو ضمان لازم آئیگا، کیونکہ یہ کام سلطان کا ہے وہ ایسا احتساب کر سکتا ہے توڑ پھوڑ کر سکتا ہے سزا دے سکتا ہے۔ امام صاحبؒ کے اس فتوے میں کس قدر امن اور فساد سے تحفظ کیا گیا ہے حاصل یہ ہے کہ یہ اختیارات سلطان کیساتھ خاص ہیں ورنہ اگر عوام کو ایسی گنجائشیں دی جاویں۔ رات، دن عوام میں جدال وقتال رہا کرے ایک انگریز نے لکھا ہے "کہ سلطنت کسی فقہ پر نہیں چل سکتی بجز فقہ حنفی کے۔" یہ ایک سیاسی تجربہ کار کا قول ہے۔ (ایضاً ۶/۱۰۱)

بغیر سہارے سونے میں وضو کا حکم

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بدوں سہارے بیٹھے ہوئے سوجانے پر فتویٰ تو یہی ہے کہ وضو نہ جائیگا لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ پہلے لوگوں کے قویٰ مضبوط ہوتے تھے، انکا بدن کسا رہتا تھا اب قویٰ کمزور ہوگئے بدن ڈھیلا ہوجاتا ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ وضو کرے۔ یہ فتویٰ نہیں مگر احتیاط کا درجہ ہے۔ (ایضاً: ۶/۱۹۷)

ایک نازک مسئلہ کا زبانی جواب

فرمایا: کہ ایک صاحب کا خط آئرلینڈ سے آیا ہے لکھا ہے کہ میں عنقریب ہندوستان آنے والا ہوں اور میرا روپیہ بینک میں جمع ہے اسکے سود کو لے کر کہاں خرچ کرنا چاہیے۔ میں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ اس کو لیکر ہندوستان آجاؤ اور پھر آکر مسئلہ پوچھو۔ ایسا جواب اس لیے لکھا کہ نازک مسئلہ ہے معلوم نہیں تحریر سے کچھ غلط فہمی ہوجاوے۔ پھر فرمایا: کہ بہت ہی دور جگہ ہے لیکن ان جہازوں اور ریل کی بدولت کچھ بھی دور نہیں۔ (ایضاً: ۶/۲۹۴)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فقہی اختلاف ہمارے لیے رحمت ہے

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ایک ہی استاد جب اپنے شاگردوں کو ٹریننگ دیتا ہے انکے اعمال ایک جیسے ہونے چاہیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی ایک ہی استاد تھے انکے اعمال میں فرق کیوں ہے؟ حکمت اسمیں یہ ہے کہ اعمال کے فرق کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں فائدہ دیا ہیکہ ہم اپنی صورت حال کے مطابق ان میں سے کسی ایک کی پیروی کرلیں۔ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا اب اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی چار صورتیں ممکن ہے پہلی صورت یہ کہ آدمی عشق الٰہی میں اتنا مست ہو کہ جو کچھ ہو سب کا سب اللہ کے راستے میں خرچ کردے اگر یہ صورت ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نقش قدم

پڑ ہے اور اگر کبھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اسکی زندگی میں توازن ہے یعنی دین ودنیا دونوں میں اس نے توازن رکھا ہوا ہے تو وہ آدھا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرے اور بقیہ آدھا اپنے اہل وعیال کی ضروریات کے لیے رکھے ایسے شخص کے بلئے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے راستے کے قدم موجود ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ بعض اوقات انسان کو اللہ تعالیٰ اتنا غنی بنادیتے ہیں کہ وہ جتنا بھی خرچ کرے اسکے مال میں کچھ فرق نہیں پڑتا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں چوتھی صورت یہ کہ کبھی انسان پر فقر و فاقہ میں ایسا معاملہ ہوتا ہے کہ اسکے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زندگی اس کے لئے مینارنور ہے کیونکہ ان پر پوری زندگی میں کبھی زکوۃ فرض ہی نہیں ہوئی کبھی کچھ جمع ہی نہیں کیا اب ان چاروں صورتوں میں سے انسان جس حال میں بھی ہو اس کے لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں نمونے موجود ہیں پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے وسعت پیدا کردی۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات ۱۶)

ائمہ اربعہؒ کا احسان

پھر اللہ رب العزت نے اپنے اور بندے پیدا فرمائے جو قرآن اور حدیث کے حامل بن گئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ چاروں حضرات علم کے آفتاب و ماہتاب تھے انہی سے اللہ رب العزت نے کام لیا کہ انہوں نے قرآن اور حدیث کو پڑھ کر لاکھوں سے زیادہ مسائل اخذ کئے اور امت کے لئے اس کو پکی پکائی کھیر بنادی تا کہ آنے والے لوگ آسانی سے ان پر عمل کرسکیں ان حضرات کا امت پر بڑا احسان ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱۵ھ سے فتویٰ دینا شروع کیا ۱۳۰ھ میں اپنے استاد کے جانشین بنے اس وقت سے ان کے مقلدین و متبعین میں اضافہ ہوتا چلا گیا صاحب ارشاد الساری نے لکھا ہے کہ حضرت طارق بن شہاب بجلی رضی اللہ عنہ نے ۱۲۳ھ میں وفات پائی اس قول کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی تقلید عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے شروع ہوگئی تھی۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۲۲)

محدثین اور فقہاء کے فرائض منصبی

پھر ایک جماعت محدثین کی بنی جس نے حدیثوں کو اکٹھا کیا۔ ان کی مثال صیدلیہ (میڈیکل سٹور) والوں کی مانند تھی جن کے پاس ساری دوائیاں پڑی ہوتی ہیں محدثین کے پاس اسی طرح احادیث کا ذخیرہ ہوتا تھا فقہاء کی مثال اطباء کی مانند تھی جس طرح صرف اطباء ہی دوائی دے سکتے ہیں اسی طرح فقہاء مسئلہ بتاسکتے تھے۔ امام ترمذی نے کتاب الجنائز میں لکھا ہے کہ "الفقهاء اعلم بمعاني الاحاديث" کہ فقہاء ہی احادیث کے معنی کو بہتر سمجھنے والے ہیں۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۲۲)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور شجرہ محدثینؒ

یہ عجیب بات ہے کہ محدثین کا سلسلہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر منتہی ہوتا ہے۔ چند مثالیں دے دیتا ہوں۔

۱) امام ابوحنیفہ..... امام ابو یوسف..... شیخ یحیٰ بن معین محدثؒ..... امام بخاری
۲) امام ابوحنیفہؒ..... امام ابو یوسفؒ..... شیخ یحیٰ بن معین محدثؒ..... امام مسلم
۳) امام ابوحنیفہؒ..... امام ابو یوسفؒ..... شیخ یحیٰ بن معین محدثؒ..... امام ابوداودؒ، امام نسائیؒ
۴) امام ابوحنیفہؒ..... امام ابو یوسفؒ..... شیخ یحیٰ بن معین محدثؒ..... ابویعلی موصلیؒ (صاحب مسند)
۵) امام ابوحنیفہؒ..... محدث عبداللہ بن مبارک..... شیخ یحیٰ بن اکثمؒ..... امام ترمذیؒ..... امام ابن ماجہؒ
۶) امام ابوحنیفہؒ..... امام محمدؒ..... امام شافعیؒ..... امام احمد بن حنبلؒ
۷) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ مسعر بن کدام محدثؒ..... امام بخاریؒ..... امام ابن خزیمہؒ..... دار قطنیؒ
۸) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ مسعر بن کدام محدثؒ..... امام بخاریؒ..... امام خزیمہؒ..... حاکم..... امام بیہقیؒ
۹) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ مکی بن ابراہیم محدثؒ..... شیخ ابوعوانہؒ طبرانیؒ۔
۱۰) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ مکی بن ابراہیم محدثؒ..... شیخ ابوعوانہؒ..... ابن عدیؒ
۱۱) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ فضل بن رکین محدثؒ..... امام دارمیؒ
۱۲) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ فضل بن رکین محدثؒ..... امام ذہبیؒ
۱۳) امام ابوحنیفہؒ..... شیخ فضل بن رکین محدثؒ..... شیخ اسحاقؒ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۲۳)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفہ منصور کو لاجواب کرنا

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا کمال عطا فرمایا تھا امت میں ایسے کمال دکھانے والے شاید بہت ہی کم حضرات گذرے ہوں گے ایک مرتبہ وقت کے بادشاہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ، امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور ایک اور فقیہ کی گرفتاری کا حکم دے دیا وہ چاہتا تھا کہ ان چاروں میں سے کسی ایک کو چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) بنائے لیکن چاروں نہیں بننا چاہتے تھے چنانچہ پولیس والوں نے انکو گرفتار کرلیا۔ راستے میں ایک جگہ جب پہنچے تو جو چوتھے فقیہ تھے وہ بیٹھے بیٹھے اس طریقے سے اٹھے جیسے قضائے حاجت کی ضرورت ہو پولیس والے انتظار میں رہے اور وہ تو گئے تو چلے ہی گئے یہ حیلہ تھا۔ اب باقی تین رہ گئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے میں قیافہ لگاؤں کہ ہوگا کیا کہ دوسرے نے کہا ہاں لگائیں کہنے لگے میں وہاں جا کر ایسی بات کہوں گا کہ خلیفہ منصور کے پاس اسکا جواب نہیں ہوگا لہذا میں چھوٹ جاؤنگا امام شعبی بھی کوئی حیلہ کرلیں گے۔ البتہ سفیان ثوری پھنس جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب تینوں حضرات کو دربار میں پہنچایا گیا تو امام شعبی ذرا آگے بڑھے اور جا کر خلیفہ منصور سے کہنے لگے خلیفہ صاحب آپکا کیا حال ہے؟ آپ کے بیوی بچوں کا کیا حال ہے؟ آپ کے محل کا کیا حال ہے؟ آپ کے

اصطبل کا کیا حال ہے؟ آپ کے گھوڑوں کا کیا حال ہے؟ آپ کے گدھوں کا کیا حال ہے؟ خلیفہ منصور و عجیب لگا کہ میں جس شخص کو چیف جسٹس بنانا چاہتا ہوں وہ سب کے سامنے میرے گدھوں اور گھوڑوں کا حال پوچھ رہا ہے دل میں سوچا کہ یہ شخص اس اہم منصب کے قابل نہیں، چنانچہ امام شعبی سے کہنے لگا کہ میں آپ کو قاضی القضاۃ نہیں بنا سکتا امام شعبی اس طرح بچ گئے پھر خلیفہ امام ابوحنیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: ابوحنیفہ! میں نے آج کے بعد آپ کو چیف جسٹس بنادیا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ میں چیف جسٹس بننے کے قابل نہیں ہوں۔ خلیفہ منصور نے کہا نہیں نہیں آپ اسکے قابل ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خلیفہ صاحب! اب دو باتیں ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا یا تو وہ ٹھیک ہے یا وہ غلط ہے اگر تو وہ غلط ہے تو جھوٹ بولنے والا شخص چیف جسٹس نہیں بن سکتا اور اگر وہ سچ ہے تو میں کہہ ہی رہا ہوں کہ میں چیف جسٹس بننے کے قابل نہیں ہوں اب خلیفہ حیران، اگر کہے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو نے ٹھیک کہا تو ابھی ابوحنیفہ چھوٹتے ہیں اگر کہے کہ تو نے غلط کہا تو بھی ابوحنیفہ چھوٹتے ہیں امام اعظم ابوحنیفہ نے وقت کے خلیفہ کو بھرے دربار میں لاجواب کردیا۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات ۲۴۰)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی معاملہ فہمی کا واقعہ

ایک دفعہ میاں بیوی آپس میں خلوت کے لمحات میں تھے۔ خاوند بات کرنا چاہتا تھا مگر بیوی کچھ ناراض ناراض سی تھی حتی کہ خاوند نے غصہ میں آکر کہہ دیا اللہ کی قسم! جب تک تو نہیں بولے گی تو میں تیرے ساتھ نہیں بولوں گا جب خاوند نے قسم اٹھائی تو بیوی نے بھی قسم اٹھائی کہ اللہ کی قسم! جب تک تو پہلے نہیں بولے گا میں بھی نہیں بولوں گی اب وہ بھی چپ یہ بھی چپ رات تو گزر گئی صبح کو دماغ ذرا ٹھنڈے ہوئے تو سوچنے لگے کہ کوئی تو حل ہونا چاہیے چنانچہ وہ سفیان ثوری کے پاس گئے انہیں سارا واقعہ سنایا اور پوچھا کہ اب اس کا کیا حال ہے؟ فرمایا دونوں میں سے جو پہل کریگا وہ حانث بن جائیگا اس دور میں جو حانث بن جاتا تھا اس کی گواہی قبول نہیں کی جاتی تھی کیونکہ وہ معاشرے میں اعتماد کے قابل نہیں رہتا تھا لہذا دونوں کی خواہش تھی کہ ہماری قسم نہ ٹوٹے اب دونوں پریشان خاوند کو خیال آیا کہ امام ابوحنیفہ سے پوچھنا چاہیے چنانچہ انکے پاس پہنچا تو حضرت نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ کہنے لگا حضرت میں بیوی کو بلا رہا تھا مگر وہ بولتی نہیں تھی مانتی نہیں تھی میں نے غصہ میں کہہ دیا کہ اللہ کی قسم! جب تک تو مجھ سے نہیں بولے گی میں تجھ سے نہیں بولوں گا تو وہ لڑنے کے لئے ہی تیار تھی اس نے بھی قسم اٹھالی کہ جب تک تو نہیں بولے گا میں نہیں بولوں گی اب ہم پھنسے ہوئے ہیں حضرت نے فرمایا جاؤ تم اسکے ساتھ بات کرو وہ تمہاری بیوی ہے میاں بیوی بن کے رہو۔ خاوند ہنستا مسکراتا گھر آیا اور کہنے لگا میڈم کیا حال ہے؟ ہیلو آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ بیوی نے کہا بس تو حانث بن گیا کہنے لگا میں تو حانث نہیں بنا اس نے کہا وہ کیوں کہنے لگا میں امام ابوحنیفہ سے پوچھ کر آیا ہوں اس دور میں علمی ذوق بہت زیادہ تھا بیوی کہنے لگی اچھا ابھی جا کر مسئلہ پوچھتی ہوں میاں بیوی پہلے سفیان ثوری کے پاس پہنچے ان کو جا کر بتایا تو وہ کہنے لگے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو حرام کو حلال کرتا پھر رہا ہے چلو میں

بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں انہوں نے کیسے یہ مسئلہ بتادیا جب یہ سب امام ابوحنیفہ کے پاس پہنچے تو سفیان ثوری نے کہا ابوحنیفہ! تم نے حرام کو حلال کیسے کردیا؟ امام ابوحنیفہ مسکرا کر کہنے لگے، حضرت! میں نے تو حرام کو حلال نہیں کیا، حلال کو حلال کہا ہے آپ ان سے سنیں وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے ان سے پوچھا کہ کیا کہہ رہے ہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت! پہلے خاوند نے کہا کہ جب تک تو نہیں بولے گی میں تجھ سے نہیں بولوں گا اس کے جواب میں بیوی نے بھی قسم اٹھائی۔ آپ دیکھیں تو سہی وہ کس سے بات کرتے ہوئے کہ قسم اٹھارہی تھی خاوند ہی سے تو بات کررہی ہے لہذا خاوند کی قسم پوری ہوگئی اب بیوی کی قسم باقی تھی اس لیے میں نے خاوند سے کہا جاؤ تم اس سے بولو گے تو اس کی بھی قسم پوری ہوجائے گی، تم دونوں میاں بیوی بن کر زندگی گزارو۔ سفیان ثوریؒ اس نکتہ بخی اور معاملہ فہمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۲۵)

عجیب سوال کا حیران کن جواب

اسی طرح ایک اور آدمی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔ فرمایا: کہ تم بھی پوچھو کہنے لگا، آپ یہ بتائیں کہ پاخانہ میٹھا ہوتا ہے یا نمکین۔ آپؒ نے فرمایا میٹھا ہوتا ہے۔ کہنے لگا آپ کے پاس اس کی دلیل کیا ہے؟ فرمایا: کہ مکھیاں نمکین چیز پر نہیں بیٹھتیں، ہمیشہ میٹھی چیز پر بیٹھتی ہیں۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۴۷)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ رب العزت نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کمال عطا فرمایا تھا مدینہ طیبہ میں چلتے تھے تو جوتے نہیں پہنتے تھے حتیٰ کہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے اور فرماتے تھے "مالک کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس جگہ کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے پامال کرے جس جگہ پر محبوب صلی اللہ علیہ وسلم چلتے رہے ہوں" جب راستے میں چلتے تھے تو راستے کے کنارے پر چلتے تھے کہ کہیں میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین شریفین کی جگہ پر میرے قدم نہ پڑجائیں اور مالک کہیں بے ادبی کا مرتکب نہ ہوجائے۔ پوری زندگی مدینہ طیبہ میں گذاری لیکن صرف ایک دفعہ حج کیا کیوں؟ اس لیے کہ کہیں دیار محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر موت واقع نہ ہوجائے۔

(اسلاف کے حیرت انگیز واقعات :۴۷)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے کتنا بلند مقام عطا فرمایا تھا؟ ایک مرتبہ معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اسی حالت میں بال کٹوانے کے لئے حجام کے پاس پہنچ گئے اس نے دور سے دیکھا تو سوچا کہ اتنے معمولی کپڑے ہیں اس کے پاس کیا ہوگا چنانچہ اس نے دور سے ہی کہہ دیا کہ میرے پاس وقت نہیں۔ حضرت سمجھ گئے، غلام سے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ دینار ہیں؟ اس نے کہا جی تھیلی بھری ہوئی ہے

فرمایا یہ ساری تھیلی اسے دے دو۔ تھیلی بھی دے دی اور اس سے کہا کہ میں تجھ سے بال بھی نہیں کٹواتا باہر نکل کر تاریخی شعر ارشاد فرمایا۔

علی ثیاب لو یباع جمیعها

بفلس لکان الفلس منهن اکثرا..... الخ

کہ میرے اوپر ایسے کپڑے ہیں کہ اگر ان تمام کپڑوں کو پیسوں کے عوض میں بیچ دیا جائے تو ایک درہم بھی ان کپڑوں کی قیمت سے زیادہ ہو جائے مگر ان کپڑوں میں ایک ایسی جان ہے کہ اگر تم ساری دنیا میں ڈھونڈ کر دیکھو تو تمہیں اس وقت ایسی جان نظر نہیں آئے گی۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۲۸)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی استقامت

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ استقامت کے پہاڑ تھے۔ مسئلہ خلق قرآن میں ان پر اتنے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ہاتھی پر لگائے جاتے تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ مگر امام بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پر لگ رہے ہیں تو زبان سے صرف اللہ کا ذکر جاری ہے تکلیف کی وجہ سے کراہنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ (اسلاف کے حیرت انگیز واقعات:۲۸)

ہزار آدمیوں کو گن کر اپنے آپ سے غافل رہنا

ایک سوال ہے جو پرانے زمانے سے لوگ نظم کی صورت میں دہراتے رہے ہیں۔

اتعرف فی الوری شخصا ☆ یومن الف شخص منه یقبل

ویمنع قتلهم حقا وهذا ☆ بغفلته بسيف الشرع يقتل

یعنی وہ کون ہے جو ہزار آدمیوں کے لیے امن طلب کرے اور قبول ہو جائے اور وہ لوگ قتل سے بچ جائیں لیکن امن طلب کرنے والا خود قتل سے نہ بچے بلکہ قتل ہو جائے۔ جواب یہ ہیکہ یہ حربی ہے اس نے ہزار حربیوں کے لیے امان طلب کیا اور ان کو امان دیدی گئی، جب وہ لوگ آئے تو ہزار آدمیوں کو گنا، اور اپنے آپ کو ان میں شمار نہیں کیا تو اس کو قتل کیا جائے گا۔

کافی عرصہ پہلے طلبہ نے مجھ سے درس کے دوران یہ سوال پوچھا تھا میں نے فی البدیہہ نظم میں اس کا یوں جواب دیا۔

نعم هذاك حربی اتانا ☆ لالف منهم التا مين يسئل

وجاء وا بعد تامين وزادوا ☆ على الالف الذى التا مين حصل

نصونهم ونقتله اذالم ☆ يامن نفسه وسهى واغفل

(فقہی پہیلیاں اردو ترجمہ:۱۴۰)

رزق حلال کے انوارات

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پہنچے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بیٹیوں کو بتایا

کہ ایک بڑے عالم آرہے ہیں ان کے لئے اچھا کھانا تیار کرنا ہے چنانچہ بیٹیوں نے اچھا کھانا تیار کر کے کمرے میں رکھ دیا۔ رات تہجد کے لئے مصلیٰ بھی رکھ دیا اور وضو کے لئے لوٹا بھی رکھ دیا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ آئے اور کھانا کھایا اور لیٹ گئے صبح اٹھے تو نماز فجر کے لیے مسجد تشریف لے گئے بچیاں کمرے میں صفائی کرنے کے لئے آئیں تو دیکھا کہ برتن میں جو تین آدمیوں کا کھانا رکھا تھا وہ سارا ہی ختم ہو چکا تھا مصلیٰ جیسا رکھا ویسے ہی پڑا ہے پانی جیسے بھرا تھا ویسے ہی موجود ہے یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئیں کہ ان کی تعریفیں تو بہت سنیں تھی مگر یہ تو بڑے بسیار خور نکلے تہجد بھی نہیں پڑھی اور صبح بھی بے وضو ہی چلے گئے۔

جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ گھر آئے تو بیٹی نے ساری کہہ سنائی سچے لوگ تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو صورت حال بتائی کہ میری بیٹی تو یہ پوچھ رہی ہے کہنے لگے حضرت! جب میں نے پہلا لقمہ کھایا تو مجھے اپنے سینے میں نور نظر آیا ہر لقمے پر میرے سینے کا نور بڑھ رہا تھا میں نے کہا معلوم نہیں زندگی میں اتنا حلال اور پاک رزق پھر مجھے نصیب ہوگا یا نہیں کیوں نہ اس کھانے کو اپنے جسم کا حصہ بنالیا جائے میں نے اس لئے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا پھر میں بستر پر سونے کے لئے لیٹا تو میرے سینے میں نور اتنا تھا کہ میں قرآن کی آیتوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں غور وفکر اور تدبر کرتا رہا حتی کہ اسی طرح صبح کا وقت ہو گیا درمیان میں خیال تو آیا کہ تہجد پڑھ لوں مگر میں نے کہا کہ علم کا ایک باب سیکھنا ہزار رکعت نفل پڑھنے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے لہذا میں اسی علمی سوچ بچار میں مشغول رہا صبح جب آپ آئے تو میں فجر پڑھنے چلا گیا، نہ میرا وضو ٹوٹا اور نہ ہی مجھے وضو کرنے کی ضرورت پیش آئی اس لیے میں نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھ لی۔

فقہ حنفی کا اعزاز

امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے چار فقہیں عطا فرمائیں۔ ان میں سے فقہ حنفی وہ فقہ ہے جس کو مسلمان ممالک کے اندر قانون کی حیثیت سے لاگو ہونے کا شرف حاصل رہا ہے جب خلافت عثمانیہ کا دور تھا تو ملک کا قانون فقہ حنفی کے مطابق اسلامی شریعت تھا اور جب برصغیر پاک وہند میں مغل بادشاہوں کا دور تھا اس وقت اس برصغیر میں بھی حکومت کی طرف سے فقہ حنفی نافذ تھی یہ اعزاز صرف فقہ حنفی کو حاصل ہے اور الحمد اللہ آج آپ دیکھئے کہ پاکستان، ہندوستان، افغانستان، بنگلہ دیش، ترکی، ازبکستان، ترکمانستان، آذربائیجان، قزاقستان، تاجکستان، شیکرستان، تاتارستان، رشیا، یوکرائن، عراق، شام، اور ترکی میں فقہ حنفیہ پر عمل کرنے والوں کی اکثریت ہے غور کیجئے کہ یہ آدھی دنیا سے زیادہ علاقہ بنتا ہے۔

بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر ایک صاحب کا اشکال

پس دیوبند سے سہارنپور جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔

دیوبند ہی میں مجھ کو ایک خط ملا جس میں بہشتی زیور کے اس مسئلہ پر اعتراض تھا کہ ''مرد مشرق میں اور عورت مغرب میں اور انکا نکاح ہو جائے اسکے بعد بچہ پیدا ہو جائے تو نسب ثابت ہوگا؟''

جب سہارنپور پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص بازاروں میں یہ اعتراض بیان کرتا پھرتا ہے اور مجھ سے ایک دن پہلے مولانا خلیل احمد صاحب کے پاس بھی آیا تھا اور مولانا کے دو گھنٹے خراب کئے پھر بھی نہیں مانا۔ جب سہارنپور پہنچا تو میرے پاس بغل میں بہشتی زیور دبائے ہوئے آئے میں نے کہا فرمایئے اس نے بہشتی زیور کھول کر سامنے رکھ دیا، اور کہا: اس کو ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے کہا اسکو میں نے چھپنے سے پہلے ملاحظہ کر لیا تھا بعد میں ملاحظہ کی حاجت نہیں۔ کہا کہ اس مسئلہ کی بابت کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا کہ یہ بتلاؤ کہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا یا اسکی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہا کہ مسئلہ تو معلوم ہو گیا وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا کہ آپکو کچھ مسائل اور بھی معلوم ہیں؟ کہا ہاں! میں نے کہا آپکو سب کی وجہ معلوم ہے؟ کہا نہیں۔ میں نے کہا بس اسکو بھی ایسے ہی مسائل کی فہرست میں داخل سمجھ لیجئے۔...اگر وہ کہتا ہے کہ سب کی وجہ معلوم ہے تو میں کہتا کہ میں سننا چاہتا ہوں پھر ایک ایک کو پوچھتا۔ بس وہ شخص بالکل خاموش ہو گیا کہ اب کیا کروں؟.....مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے خوش ہو کر فرمایا کہ تم نے دو گھنٹے کا جھگڑا اس قدر جلد ختم کر دیا۔ (تحفۃ العلماء: ۲/۳۰۸)

ایک عامی شخص کا جزئی مسئلہ کی دلیل کا مطالبہ

ایک نابینا شخص نے مجھ سے ایک فرعی مسئلہ کی دلیل پوچھی میں نے کہا آپ بڑے محقق معلوم ہوتے ہیں آپ کو ہر بات کی تحقیق کا شوق ہے اس فرعی مسئلہ کی تحقیق سے مقدم اصول دین کی تحقیق ہے وہ آپ غالباً کر چکے ہونگے تب ہی تو فرعی مسئلہ کی تحقیق کی نوبت آئی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو میں اصل الاصول یعنی توحید کے مسائل کی دلیل پوچھتا ہوں اور اس پر ملاحدہ (بے دین لوگ) کے شبہات کرونگا، ذرا میرے سامنے بیان تو کیجئے آپ نے اسکے متعلق کیا تحقیق کر لی ہے؟ اور نقلی جواب نہ دینا کیونکہ توحید کے ثبوت کے لئے عقلی دلیل چاہئے کیونکہ مخاطبین غیر مسلمین ہیں کہنے لگے یہ تو میں نہیں کر سکتا میں نے کہا ڈوب مرو اصل الاصول میں تو تقلید کرتے ہو اور فرع میں تحقیق کا شوق ہوا ہے۔ (تحفۃ العلماء: ۲/۸۱۰)

غیر مقلدین بھی حنفی ہیں

فرمایا: کانپور میں ایک دفعہ میرا وعظ ہوا وہاں غیر مقلدین رہتے ہیں میں نے وعظ میں کہا کہ مسائل دو (۲) طرح کے ہیں منصوصہ اور غیر منصوصہ۔ سو غیر منصوصہ میں ظاہر ہے کہ رائے کا ہی اتباع کرو گے اور اپنی رائے سے زیادہ بڑے کی رائے زیادہ قابل اتباع ہے اور یہاں سوائے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے مذاہب کے فتاویٰ مل نہیں سکتے تو لامحالہ ان مسائل میں امام صاحب کا اتباع کرو گے اور ایسا کرتے بھی ہو تو تم زیادہ مسائل میں عملاً حنفی ہوئے اور اعتبار اکثر کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے تم عملاً حنفی ہو گئے تو پھر اپنے کو حنفی کیوں نہیں کہتے کہ جھگڑا فساد بھی نہ ہو۔

غیر مقلدین بھی تو حنفی ہیں کیونکہ کوئی گیہوں کا ڈھیر ایسا نہیں ہوتا جس میں جو نہ ہو مگر باعتبار غالب

کے وہ ڈھیر گیہوں کا کہلاتا ہے اسطرح تارکین تقلید کے اعمال میں بھی غالب حنفیت ہے کیونکہ دو قسم کے اعمال ہیں دیانات اور معاملات ہیں۔ اور معاملات میں حنفیہ ہی کے فتوے سے اکثر کام لیتے ہو اور دیانات میں بھی غیر منصوص زیادہ ہیں جس میں حنفیت کا لباس لیا جاتا ہے اختلاف کی مقدار بہت کم ہوتی ہے بس اسکے پیچھے کیوں علیحدہ ہوئے ہو چنانچہ ایک منصف غیر مقلد نے کہا کہ غیر مقلد تو عالم ہوسکتا ہے ہم جاہل کیا تقلید چھوڑیں گے۔ (تحفۃ العلماء:۸۸۹/۲)

نمبر دو (۲) کے حنفی

شاید تم کو یہ شبہ ہو کہ اس صورت میں حنفی کہتے ہیں لوگوں کو دھوکہ ہوگا کہ شاید یہ بھی متعارف حنفی ہیں یعنی فی جمیع المسائل۔ تو ہم میں اور دوسرے حنفیوں میں فرق ہی نہ رہا سو فرق میں بتلائے دیتا ہوں وہ یہ کہ حنفی کی دو (۲) قسم ہو جائیں گی ایک نمبر اول یعنی فی جمیع المسائل، وہ تو ہم ہوئے۔ دوسرے نمبر دوم یعنی فی اکثر المسائل وہ تم ہوئے بس تو اپنے کو حنفی نمبر دوم کہہ دیا کرو، دھوکہ نہ ہوگا۔ (تحفۃ العلماء۔۸۸۹/۲)

جمعہ کی اذان کے بعد خرید وفروخت

جمعہ کے دن اذان اول کے بعد ہر قسم کی خرید وفروخت ناجائز ہے لہذا اگر کوئی شخص اذان اول کے بعد کسی قسم کی خرید وفروخت کا معاملہ کرے گا تو وہ گناہ گار ہوگا البتہ فی نفسہ یہ بیع صحیح ہو جائے گی، اور اس بیع سے جو آمدنی ہوگی اسکو حرام نہیں کہا جائیگا۔ (جدید تجارت:۱۵۲)

اخبار کی خرید وفروخت

حالات وقت کی اطلاع اور انکی اصلاح کی غرض سے اخبار اور دیگر رسائل کی خرید وفروخت اور تقسیم فی نفسہ جائز ہے اور جہاں تک اخبارات اور رسائل میں تصاویر وغیرہ ہونے کا تعلق ہے تو چونکہ وہ تصویریں ضمناً ہوتی ہیں انکو مقصود اور آرائش وغیرہ کے لئے خریدا نہیں جاتا اور ضمناً تصویر کی خرید وفروخت کی گنجائش ہے۔ (تصویر کے شرعی احکام:۴۷)

باوضو رہنے کے فوائد

باوضو رہنے کی عادت رکھے اس کی کئی فائدے ہیں۔

۱) باوضو رہنے والا مقبول الدعوات ہو جاتا ہے۔ ۲) اس کی موت آ گئی تو شہداء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

۳) شیاطین کا تسلط [illegible] گا۔ ۴) نماز اس کو تکبیر اولیٰ کیساتھ مل جاتی ہے۔

۵) اسکی [illegible] سے حکام مسخر ہو جاتے ہیں۔ ۶) [illegible] بات میں اثر ہوتا ہے چہرہ کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

باوضو رہنا چاہیے اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے [illegible] بات ہے انسان ارادہ کرے تو ارادہ کیساتھ ان کی امداد شامل حال ہو جاتی ہے۔ (طریق الفلاح لطلاب الصلاح:۲)

چار عورتوں کے لئے عدت نہیں ہے

اول: مطلقہ غیر مدخولہ کے لیے عدت نہیں۔ دوم: حربیہ عورت جو دار الحرب میں اپنے شوہر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں امان کے ساتھ داخل ہوئی اس پر بھی عدت نہیں۔ سوم: جن دو بہنوں سے ایک شخص نے بیک وقت نکاح کیا۔ چہارم: چار عورتوں سے زیادہ کیساتھ نکاح کیا تو ان دو صورتوں میں بھی ان عورتوں پر فسخ نکاح کے بعد عدت نہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۴۷۱/۱)

عدت، دو برس

بیوہ عورت کی عدت دو برس پر ختم ہونے کی صورت یہ ہیکہ شوہر کی موت سے دو سال پر لڑکا پیدا ہوا اور اس سے پہلے عورت نے عدت گزرنے کا اقرار نہیں کیا تھا اس لیے کہ حمل کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (پارہ: ۲۸ سورۃ طلاق) ''اکثر مدة الحمل سنتان'' (فتاویٰ عالمگیری: ۴۸۲/۱)

اینٹوں کا شمار کرنا

ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ جسے امام صاحبؒ کے حنفی سوانح نگاروں نے اگرچہ بیان نہیں کیا ہے لیکن طبری وغیرہ میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی اینٹوں کے گننے کا کام امام صاحبؒ نے جو اپنے ذمہ لیا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ مدینۃ السلام کی اینٹوں کا قصہ تھا جب معمولی معمولی شخصی مکانوں میں دس بیس لاکھ اینٹیں خرچ ہو جاتی ہیں تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ مدینۃ السلام کے لیے کتنی اینٹوں کی ضرورت ہوتی ہوگی یقیناً کروڑہا کروڑ سے بھی ان کی تعداد اگر متجاوز ہو تو تعجب نہیں ہے اتنی اینٹوں کا شمار کرنا آسان نہ تھا آخر وہی عقل حنفی جو مسائل شرعیہ کی گتھیوں کے سلجھانے میں نت نئے نکتے نکالا کرتی تھی اس وقت بھی کام آئی لکھا ہے کہ:

''امام صاحبؒ نے ایک بانس منگوایا، اور جس نے جتنی اینٹیں ڈھالی تھیں ان کو اسی بانس سے ناپ دیتے تھے''۔ (حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی: ۲۷۲)

امام کی تکبیر کو تلقی سے تعبیر کر کے نہی اس کو چسپاں کرنا

میمون بن المز رع نے بیان کیا کہ میرے والد اور جماز ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے شام کے وقت اور میں ان دونوں کے پیچھے تھا ہمارا گزر ایک امام پر ہوا جو منتظر کھڑا تھا کہ کوئی ادھر سے گزرے تو اس کو ساتھ لے کر جماعت سے نماز پڑھ لے جب اس نے ہم کو دیکھا تو فوراً نماز کے لئے تکبیر شروع کر دی تو اس سے جماز نے کہا کہ چھوڑ یہ کیا کرنے لگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تلقی جلب سے منع کیا ہے تلقی جلب سے مراد ہے اس قافلۂ تجارت سے ملنا جو اموال تجارت دوسرے شہروں سے لاتے تھے صحیحین میں ہیکہ جب تاجروں کا قافلہ مدینہ سے باہر پڑاؤ کرتا تھا تو لوگ وہیں جا کر مول تول شروع کر دیتے تھے یہ بات عوام کے لئے موجب تکلیف ہوتی تھی اس لیے حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ کوئی ان سے سودا کرنے کے لئے

باہر جا کر نہ ملے جماز نے اپنے قافلہ والوں کے مشابہ ظاہر کر کے امام کی تکبیر کو تلقی سے تعبیر کیا اور اس نے ہی یہاں چسپا کر دیا۔ (لطائف علمیہ ۲۱۸)

بن بلائے دعوت میں شرکت شرعاً صحیح نہیں ہے

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں ایک شخص تھا جس کو ابوشعیب کہا جاتا تھا اور اسکے پاس ایک غلام گوشت پکانے والا تھا ابوشعیب نے اپنے غلام سے کہا کہ کھانا تیار کرے تاکہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں۔ ابوشعیب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صراحت کے ساتھ مدعو کیا کہ کل پانچ حضرات ہوں گے پانچویں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔

(جب تشریف لے چلے) تو ایک شخص آپ کے پیچھے ہو گیا (وہاں پہنچ کر) رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شعیب سے فرمایا کہ آپ نے پانچ کی دعوت کی تھی جن میں سے پانچواں مجھے ہونا چاہیے تھا اور یہ شخص ہمارے پیچھے آ گیا اگر آپ اجازت دیں تو شریک طعام ہو جائے ورنہ واپس ہو جائے ابوشعیب نے کہا کہ میں اجازت دیتا ہوں۔ (لطائف علمیہ:۲۸۱)

شعیب کا ایک عورت سے اس کی ذہانت کی بناء پر نکاح

یہ بھی ذکر ہے کہ شعیب نے ایک عورت سے نکاح کا ارادہ کیا پھر اس سے کہا کہ میری عادت خراب ہے تو اس نے کہا کہ آپ سے زیادہ بری عادت اس کی ہوگی جو آپ کو بری عادت اختیار کرنے پر مجبور کر دے۔ شعیب نے کہا بس اب تو میری بیوی ہے۔ (لطائف علمیہ:۳۴۱)

شوہر کے اختیار کا خوبصورت استعمال

شعبیؒ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھا اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ ''تیرے اپنے بارے میں تجھ کو اختیار دیتا ہوں (اس طرح عورت کو طلاق کا حق حاصل ہو گیا) پھر وہ پچھتایا تو بیوی نے کہا دیکھئے آپ کے ہاتھ میں یہ اختیار بیس برس سے تھا آپ نے اس کی اچھی طرح حفاظت کی اور اسکو برقرار رکھا تو دن کی ایک گھڑی میں ہرگز اس کو ضائع نہ کروں گی جب کہ وہ میرے ہاتھ میں پہنچ گیا اب میں اسکو آپ ہی کو واپس کرتی ہوں اس کی گفتگو نے اس شخص کو حیرت میں ڈال دیا اور اسکو طلاق نہیں دی''۔

کنواری اور ثیب کے درمیان فرق

ایک شخص کے سامنے دو جاریہ پیش کی گئی ایک کنواری تھی دوسری ثیب (وہ عورت جس سے ہمبستری ہو چکی ہو) اس شخص کو کنواری کی طرف رغبت ہوئی تو ثیب نے کہا اس کی طرف آپ کیوں راغب ہوئے ؟ میرے اور اس کے درمیان صرف ایک ہی رات کا فرق ہے کنواری نے جواب دیا ''**وان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون**''

(ترجمہ): اور ایک دن تیرے رب کے نزدیک تمہاری شمار کے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے

اس پر اس کو دونوں ہی پسند آ گئیں تو دونوں کو ہی خرید لیا۔

ایک دلالہ کا ایک شخص کے نکاح کے لئے کوشش اور حیلہ

ایک دلالہ (یعنی ایک عورت جو کسی شخص کے نکاح کے لیے کوشاں تھی) لوگوں کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ میرے پاس ایسا شوہر (امیدوار) ہے جو لوہے سے لکھتا ہے اور شیشہ سے مہر کرتا ہے وہ راضی ہو گئے اور نکاح کر دیا تو وہ نائی ثابت ہوا۔

نرگس کی طاق

ایک دلالہ نے ایک مرد سے کہا کہ میرے پاس ایک عورت ہے گویا وہ نرگس کی طاق ہے اس نے نکاح کر لیا جب دیکھا تو بدصورت بڑھیا نکلی۔ اس شخص نے دلالہ سے کہا کہ تو نے ہم سے جھوٹ بولا اور دھوکہ دیا اس نے کہا خدا کی قسم میں نے ایسا نہیں کیا میں نے اسکو نرگس کی طاق سے تشبیہ دی تھی کیونکہ اسکے بال سفید اور چہرہ زرد اور پنڈلیں سبز ہیں اور یہ سب باتیں نرگس میں موجود ہیں۔

صدقہ لینا اور زکوٰۃ واجب ہونا

ایک بڑھیا ایک میت پر روئی اس سے کہا گیا کہ اس میت کو حق کیسے حاصل ہوا کہ تم اس کو روؤ۔ اس نے کہا کہ ہمارے پڑوس میں رہتا تھا اور یہاں اسکے سوا اور کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کو صدقہ لینا حلال ہو اور وہی مر گیا (اسلیے روئی ہوں) اور ہم میں جو کوئی بھی ہے وہ ایسا ہے کہ خود اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ (لطائف علمیہ:۳۴۹)

ایسا واجب جس کے چھوٹنے پر سجدہ سہو واجب نہیں

قرآن مجید کی سورتوں کے پڑھنے میں ترتیب واجب ہے مگر اس کے چھوٹنے پر سجدہ سہو نہیں اس لیے کہ وہ واجباتِ تلاوت سے ہے واجباتِ نماز سے نہیں ہے۔ (ردالمحتار:۱/۳۰۷)

دو ہی رکعت پڑھنا واجب ہے

مسافر نے مسافر کی اقتداء کی پھر اسے حدث لاحق ہوا تو وہ وضو بنانے کے لیے گیا کسی سے کلام نہیں کیا اور اقامت کی نیت کر لی پھر جب واپس ہوا تو امام نماز سے فارغ ہو چکا تھا تو اس صورت میں اقامت کی نیت کے باوجود بناء کرنے میں مسافر پر چار رکعت پڑھنا واجب نہیں ہوا بلکہ دو ہی رکعت پڑھنا واجب رہا۔ (نورالانوار:۳۶)

کافروں سے اسلامیات کی ڈگری لینا دین کا مزاق ہے

جسے کافروں نے اسلامیات کی ڈگری دی ہو (جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے) وہ صحیح اپنا اسلام تو باقی رکھ لے یہی غنیمت ہے، دوسروں کو اسلام کی کیا تبلیغ کرے گا؟ اور ایک عجیب بات ہے کہ لڑکے لڑکیاں سب

اکھٹے بیٹھ کر بے پردگی کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔عین اسلامیات کے گھنٹہ میں اسلام کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس پر طرہ یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ کریں گے۔اپنے علم وعمل کی فکر کرو گناہ سے بچو تبلیغ کرنی ہے تو قرآن وحدیث کے ماہر ہو۔ (حیلے اور بہانے:۱۱۸)

حائک کا لطیفہ

ایک دلچسپ لطیفہ نقل کیا جاتا ہے کہ موسیٰ بن عیسیٰ مکہ کا عباسیوں کی طرف سے والی تھا۔حج کے زمانہ میں وہاں،ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ سرکاری قضاۃ بھی پہنچے ہوئے تھے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی،وہیں تھے کسی وثیقہ کے لکھوانے کی ضرورت موسیٰ بن عیسیٰ کو پیش آئی پہلے اس نے دونوں سرکاری قاضیوں کو بلوا کر لکھنے کی فرمائش کی لیکن جو لکھتا،دوسرا اس میں نقائص نکال کر رکھ دیتا،اسی جھگڑے میں وثیقہ تیار نہ ہوسکا آخر یہ دونوں حضرات تشریف لے گئے تھوڑی دیر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی کسی ضرورت سے موسیٰ کے پاس پہنچے،دیکھ کر بہت خوش ہوا،اور وثیقہ کا قصہ امام صاحب کے سامنے دہرایا اور امام صاحب تو اسی قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے فرمایا کہ کاتب کو بلوایئے میں لکھواتا جاتا ہوں وہ لکھے یہی ہوا کاتب آیا وہیں بیٹھے بیٹھے امام صاحب نے وثیقہ لکھوادیا اور موسیٰ کے حوالہ کیا جیسا چاہتا تھا ٹھیک اس کی مرضی کے مطابق تھا جب امام صاحب چلے گئے تب دونوں سرکاری قاضیوں کو اس نے بلا کر وثیقہ خود پڑھ کر سنایا دونوں سنتے رہے اور کوئی نقص اول سے آخر تک نہ نکال سکے موسیٰ نے بتایا کہ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا لکھوایا ہوا وثیقہ ہے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔لکھا ہے کہ جب باہر نکلے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ:''اماتری ھذا الحائك جاء نی ساعته کتبه''''یعنی تم نے اس جولاہے کو دیکھا کہ اسی وقت اس نے لکھ دیا۔کہتے ہیں کہ تب دوسرے نے کہا بھائی! جولاہا بھی کہیں ایسی عبارت لکھ سکتا ہے۔(حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی:۲۵۶)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک لڑکا تیزی کے ساتھ چلا جارہا تھا امام صاحب نے فرمایا کہ صاحبزادہ سنبھل کر چلو،گر پڑوگے،وہ لڑکا بولا کہ آپ سنبھل کر چلیں اس لیے کہ آپ کے سنبھلنے سے عالم سنبھل جاوے گا اور آپ کے بگڑنے سے عالم بگڑ جاوے گا اور میرے گرنے سے تو صرف مجھ ہی پر اثر ہوگا۔امام صاحب بچے سے یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے ان حضرات میں یہ خوبی تھی''لاتنظر الی من قال وانظر الی ماقال''پر پورا عمل تھا یعنی وہ حضرات قائل کو نہیں دیکھتے تھے بات کو دیکھتے تھے کہ کس درجہ کی ہے یہاں یہ کیفیت ہے کہ چھوٹوں کی بات کو کان لگا کر سنتے بھی نہیں بلکہ بڑوں کی باتوں کو بھی نہیں سنتے اور بڑوں کے ارشاد پر عمل نہیں کرتے۔(حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات:۵۵)

جان جانے کے ڈر سے روزہ توڑ دینا واجب ہے

ایک مرتبہ ایک رئیس زادہ سے روزہ رکھوایا گیا گرمی کے دن تھے دوپہر تک تو بے چارہ نے نباہ دیا مگر

عصر کے وقت پیاس سے سخت پریشان ہوا، رئیس نے روزہ کشائی کا بہت اہتمام کیا تھا تمام خاندان کی اور دوستوں کی دعوت کی تھی آخر بہلایا تھوڑی دیر اور صبر کرو مگر اس بیچارہ کو تاب کہاں تھی۔ اول تو اس نے لوگوں کی منتیں خوشامدیں کیں مگر کسی ظالم نے اس کی جان پر رحم نہ کیا اور کسی نے ایک گھونٹ بھی پانی نہ دیا آخر وہ خود اٹھا رئیس نے اتنا سامان کیا تھا کہ مٹکوں میں برف بھری گئی تھی وہ مٹکے سے لپٹا کہ کچھ تو پانی سے قریب ہو اور لپٹتے ہی جان نکل گئی اس کا وبال ان بے رحم ماں باپ پر ہوا۔

ف: شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ اگر جوان کی بھی جان نکلنے لگے تو روزہ توڑ دینا واجب ہے مگر اہل رسوم کے نزدیک معصوم بچہ کو بھی اجازت نہیں۔ (حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات: ۱۹۱)

جنازہ میں بالغ ہونے کے باوجود نابالغ کی دعا پڑھنا

جو شخص کہ بالغ ہونے سے پہلے پاگل ہوا اور زندگی بھر پاگل رہا کبھی مکلف نہ ہوا۔ تو اسکی موت پچاس سال یا اس سے زیادہ میں ہوا تو اس کی نماز جنازہ میں نابالغ کی دعا پڑھی جائیگی۔ (الجوہرالنیرہ: ۱/۱۰۸)

ایک ہی دن میں تین شوہروں سے مہر وصول کرنا

عورت حاملہ تھی، شوہر نے اسے طلاق دیدی تو عورت نے اس سے پورا مہر وصول کیا اور طلاق کے فوراً بعد اسے بچہ پیدا ہوا۔ عدت ختم ہوگئی تو اسی روز اس نے دوسری شادی کر لی مگر دوسرے شوہر نے فوراً خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیدی، تو اس سے آدھا مہر وصول کیا اور چونکہ اس صورت میں عدت نہیں اس لیے عورت نے اسی روز تیسرے شوہر سے شادی کی جو فوراً مر گیا، تو اس کے ترکہ سے عورت نے پورا حق مہر وصول کیا۔ اس طرح ایک عورت نے ایک ہی روز میں تین شوہروں سے تین مہر وصول کیئے۔ (الاشباہ والنظائر: ۳۹۶)

باوجود نکاح کے ہمبستری حرام

نکاح کے باوجود اپنی بیوی سے مندرجہ ذیل صورتوں میں ہمبستری حرام ہے۔

(۱) حالت حیض میں (۲) حالت نفاس میں (۳) فرض اور واجب روزہ کی حالت میں (۴) نماز کا وقت تنگ ہونے کی صورت میں (۵) حالت اعتکاف میں (۶) حالت احرام میں (۷) ایلاء میں (۸) ظہار میں کفارہ ادا کرنے سے پہلے (۹) وطی بالشبہ کی عدت میں (۱۰) عورت کے آگے اور پیچھے کا مقام ایک ہو جانیکی صورت میں، جب تک کہ آگے کے مقام میں ہمبستری ہونے کا یقین نہ ہو۔ (۱۱) جبکہ عورت اپنی کمسنی، مرض، یا موٹاپے کی وجہ سے ہمبستری کو برداشت نہ کر سکے (۱۲) جبکہ عورت مہر معجل لینے کے لیے اپنے کو شوہر سے روکے تو اس صورت میں بھی ہمبستری حرام ہے۔ (الاشباہ والنظائر: ۳۳۵)

سات سو علماء کا ایک ہی جواب

شقیق بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں، میں نے سات سو علماء سے پانچ سوال کیئے سب نے ایک ہی جواب دیا۔

۱۔ عقل مند کون ہے؟ جو دنیا کو ناپسند کرتا ہو!

۲۔۔۔۔ سمجھدار اور دانا کون ہے؟ جو دنیا سے دھوکا نہ کھا جائے!
۳۔۔۔۔ غنی کون ہے؟ جو اللہ کی تقسیم پر راضی ہو!
۴۔۔۔۔ فقیہ کون ہے؟ جو زیادہ کا مطالبہ نہ کرے۔ (غالباً مال و دنیا)
۵۔۔۔۔ بخیل کون ہے؟ جو اپنے مال میں سے اللہ کا حق نہ دے!(تنبیہ الغافلین:۴۵۳)

اگر مانگنے پر چھپا لینے کا خدشہ ہو تو؟

جب کسی کا قیمتی سامان دوسرے کے گھر میں گر گیا اور مالک کو خوف ہے کہ اگر وہ گھر والے سے مانگے گا تو وہ چھپا لے گا، تو اس صورت میں بلا اجازت دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز ہے۔ (الاشباہ والنظائر:۸۸)

ایک وزیر کی ذہانت

حضرت والا نے اپنے خادم سے فرمایا: کہ دوات میں ڈالنا ہے حوض سے پانی لے آؤ وہ کٹورا بھر لائے۔ اس پر فرمایا: کہ دوات کے تناسب سے پانی لانا چاہیے تھا اس پر ایک واقعہ بیان فرمایا کہ سفر میں ایک حسین لڑکی پر ایک باوجاہت آدمی نے دعویٰ کیا کہ یہ میری لڑکی ہے اور تھی وہ ایک غریب قوم کی لڑکی۔ وزیر کے ہاں مقدمہ آیا اس نے طرفین کا بیان سن کر عجیب فیصلہ دیا اس لیے کہ شہادت دونوں طرف نہ تھی دونوں مسافر تھے سفر کا معاملہ تھا وہ فیصلہ یہ کیا کہ وزیر نے لڑکی سے کہا کہ ہم دوات میں پانی ڈالیں گے وہ ایک بڑا کٹورا بھر کر لائی، وزیر نے کہا کہ یہ لڑکی اس غریب کی ہے اس لیے کہ یہ دوسرا شخص لکھا پڑھا آدمی ہے کیا اس نے کبھی دوات کے لیے لڑکی سے پانی نہیں مانگا ہوگا اگر یہ اس کی لڑکی ہوتی تو بقدر ضرورت پانی لاتی۔ عجیب فیصلہ ہے اور گو صرف اتنا شرع میں کافی نہیں لیکن اس کے بعد جھوٹا آدمی بالضرور اقرار کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اقرار شرع میں حجت ہے۔ (الافاضات الیومیہ:۲۴۸/۶)

ایک جاہل امام کی جہالت

ایک جاہل امام نے نماز پڑھائی۔ دوران نماز، سجدہ سہو کر لیا بظاہر کوئی ایسا فعل جس پر سہو کا سجدہ واجب ہوتا ہو، سرزد نہیں ہوا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ ''حضرت! یہ سجدہ سہو کیسے؟'' امام نے کہا: جاہل لوگ ہو تم! سمجھتے ہو نہیں۔ بتاؤں گا تو مانو گے نہیں، لیکن لوگوں کا اصرار بڑھ گیا آپ بتا دیجئے تاکہ ہمارے علم میں اضافہ ہو جائے۔ آخر کار امام نے کہا کہ غور سے سنو! شور شرابہ نہیں کرنا، سارے لوگ متوجہ ہو کر سننے لگے امام نے کہا کہ اصل میں ہوا یہ تھا کہ نماز کے دوران میں مجھ سے ایک ہلکی سی ریح خارج ہو گئی چونکہ اس ریح پر واجب یہ تھا کہ یہ نہ نکلے چونکہ یہ نکل گئی اس نے ترک واجب کیا اور ترک واجب پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اسی وجہ سے میں نے سجدہ سہو کر لیا۔

(لوگ تو سمجھ گئے کہ ریح کے نکلنے پر تو وضو ہی ٹوٹ جاتا ہے اور نماز باطل ہو جاتی ہے سجدہ سہو کہاں سے واجب ہو جاتا ہے) اب لوگوں نے کہا کہ ہم پر بھی واجب ہے کہ تمہاری خاطر تواضع (گوشمالی) کریں

تاکہ ہم ترک واجب کے مرتکب نہ ہوں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بڑھیا سے دھوکہ

امام صاحب فرماتے ہیں کہ عمر بھر میں کسی کے دھوکہ میں نہیں آیا البتہ ایک بڑھیا نے مجھے دھوکا دیا۔ بڑی استاد تھی، ایک چادر لقطہ کا پڑا ہوا تھا لقطہ کے مال کو دیکھ کر واجب ہے اٹھانا اور تشہیر کرنا امام صاحب چلے جارہے تھے بڑھیا بھی سامنے سے آرہی تھی اس کو معلوم ہوا کہ چادر لقطہ پڑا ہوا ہے اس نے سوچا کہ اگر خود اٹھاتی ہوں تو میرے ذمہ پڑتا ہے کوئی ایسی ترکیب کروں کہ یہ (امام صاحب) اٹھائیں کہ پورا حق ادا کردیں گے ورنہ دوسرا شخص شاید خیانت کرے اور خود ذمہ داری سے بچنا چاہا اس نے کیا ترکیب کی کہ چادر کے پاس آکر گونگی بن گئی اور اشارہ سے ہوں ہوں کرنے لگی امام صاحب سمجھے کہ یہ اس کا چادر ہے گر گیا ہے اس کو اٹھوانا چاہتی ہے۔ امام صاحب اس چادر کو اٹھا کر اسے دینے لگے تو وہ بولی کہ یہ لقطہ ہے میرا نہیں ہے، اس کی تشہیر کرو، امام صاحب چادر کو لئے لئے پھرتے تھے کہ بھائی کس کی ہے؟ بڑھیا بڑی استاد تھی فقیہ تھی فقیہ۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد ۷ او تقریر ترمذی)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست

ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ ایک دن ہم اپنے محترم استاد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک آدمی نے ایک رقعہ پیش کیا آپ نے اسے پڑھا اور مسکرا دیئے پھر آپ نے اس پر کچھ لکھا اور اسے واپس دیدیا، ہمیں اندازہ ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے جسے ہم نہیں دیکھ سکے لہذا ہم اس آدمی کے پیچھے ہوئے اس سے رقعہ لے کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

سل المفتی المکی ھل فی تزاور ☆ وضمة مشتاق الفؤاد جناح؟

”مکی مفتی سے پوچھ، کہ محبوب کی زیارت کرنے اور اس سے معانقہ کرنے میں کوئی گناہ ہے؟“

اسکے کے نیچے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے جواب لکھا تھا۔

اقول معاذ اللہ ان یذھب التقی ☆ تلاصق اکباد بھن جراح

”میں کہتا ہوں: اس بات سے اللہ کی پناہ کہ زخمی دلوں کا ملنا تقویٰ کو متاثر کرے۔“

ربیع کہتے ہیں ”امام شافعیؒ کی طرف سے اس قسم کے فتویٰ کا صدور مجھے بہت تعجب خیز معلوم ہوا، لہذا میں نے کہا“ اے ابوعبداللہ! آپ ایک نوجوان کو ایسا فتویٰ دے رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ”اے ابومحمد! یہ ایک ہاشمی نوجوان ہے جس نے اس مہینہ (رمضان) میں شادی کی ہے اور یہ نوجوان بھی ہے اس نے سوال کیا ہے بیوی سے جماع کئے بغیر بوس و کنار میں کوئی گناہ ہے یا نہیں؟ پھر میں نے اسکو یہ فتویٰ دیا۔“

چنانچہ میں نے اس نوجوان کا پیچھا کیا اور ساری صورتحال سے آگاہی چاہی، اس نے بھی وہی بات بتائی، جو امام صاحب نے فرمائی تھی، میں نے اس سے بہترین فراست کسی کی نہیں دیکھی۔ (دیوان الامام

(الشافعی ۳۸)

مسئلہ بتایا مگر ادھورا.....!

ایک گنوار کا قصہ ہے کہ گاؤں میں ایک واعظ صاحب آئے اور انہوں نے بیان کیا کہ جب تک نیت نہ کرے روزہ نہیں ہوتا اور نیت بتائی کہ یوں کہنا چاہیے" وبصوم غد نویت من شهر رمضان " کوئی ایسا ہی ٹٹ پونجیا واعظ ہوں گے جیسے گشتی واعظ، اور کھانے کمانے والے ہوا کرتے ہیں ورنہ نیت کی حقیقت بھی بیان کر دیتے، پھر غلطی نہ ہوتی۔ اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ دن میں چودھری صاحب بے دھڑک حقہ پی رہے ہیں۔ کہا: مردود رمضان ہے تو نے روزہ نہیں رکھا؟ کہا: مولوی جی! خفا مت ہو، تم ہی نے تو یہ مسئلہ بیان کیا تھا کہ بے نیت کے روزہ نہیں ہوتا۔ اور جو نیت تم نے بتائی تھی وہ مجھے یاد نہیں ہوئی، اب اسے یاد کر کے روزہ رکھا کروں گا۔ آج میں نے سوچا کہ روزہ تو ہوا ہی نہیں پھر حقہ کا ذائقہ کیا چھوڑوں۔

ف: اس حکایت کو سن کر ہم لوگ ہنستے ہیں اور اس روزہ نہ رکھنے والے کو گنوار سمجھتے ہیں مگر انصاف سے کہیے اس میں قصور کس کا ہے؟ قصور واعظ کا ہے، بات کہی مگر ادھوری، مسئلہ اس طرح بتایا کہ اس گنوار سے اس پر عمل نہ ہو سکا، جب اس نے دیکھا کہ اس طرح تو میرے بس کا نہیں ہے تو عمل ہی کو چھوڑ دیا۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات: ٦٦)

حلال کو حلال میں ملا کر کھا رہا ہوں

ایک دفعہ شاہ جیؒ، مولانا محمد علی جالندھری اور دیگر احباب دسترخوان پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی صاحب نے سویاں چائے میں ڈال کر کھانا شروع کر دی، شاہ جیؒ نے دیکھا تو مسکرا کر فرمایا: " یہ آرائیں کچھ بھی بن جائیں مگر انہیں کھانے کا سلیقہ نہ آیا۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا: شاہ جی! حلال میں حلال ملا کر کھا رہا ہوں، بھلا آپ کو کیوں کراہت ہو رہی ہے؟ شاہ جیؒ خاموش رہے چند منٹ گزرے اور دیکھا کہ اب بقایا کچھ تھوڑا حصہ کھانے کا رہ گیا ہے تو چپکے سے انکی چائے اور سویوں میں سادہ پانی انڈیل دیا اور ہنس کر فرمایا: لو میں نے تیسرا حلال بھی شامل کر دیا اور اب، اور مزے سے کھاؤ۔ سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے"۔ (بخاریؒ کی باتیں)

حکایت حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ و امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

فرمایا: کہ ایک دفعہ امام صاحب امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ شب کے وقت اونٹ پر سوار جا رہے تھے۔ سواری آرام کی تھی دونوں سو گئے اور ایسے وقت آنکھ کھلی کہ نماز فجر کا وقت تنگ ہو گیا۔ جلدی جلدی اتر کر وضو کیا امام صاحب نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو امام بنا کر نماز پڑھی تو انہوں نے اپنے اجتہاد سے صرف فرض واجب ادا کیے باقی سنن و مندوبات سب ترک کر دیئے، مگر دوڑے کہ شاید امام صاحب ناراض ہو گئے جب سلام پھیرا تو امام صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا "الحمد لله يعقوبنا فقيه"۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۴/ ۱۵۳)

آمین کی تین قسمیں

فرمایا: کہ پہلے انگریز بڑے لائق ہوتے تھے ایک ریاست میں آمین کا جھگڑا تھا تو ایک انگریز نے اپنی تحقیقات میں لکھا کہ تحقیق سے معلوم ہوا کہا آمین تین قسم پر ہے آمین بالسر، یہ مذہب ہے بعض علماء کا اور آمین بالجہر، یہ بھی مذہب ہے بعض علماء کا اور ایک قسم ہے۔ آمین بالشر وہ کسی کا مذہب نہیں ہے اور اسی وقت اسی کا زیادہ وقوع ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۴/ ۱۴۳)

ایک حنفی کو جواب

فرمایا: ایک شخص کا خط آیا ہے ان صاحب نے لکھا ہے کہ میں ہوں تو حنفی مگر چونکہ خود امام صاحب کا ہی قول ہے کہ اگر میرا قول حدیث کے خلاف ہو تو اسکو چھوڑ دو اس واسطے میں فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہوں اور آپ سے بھی دریافت کرتا ہوں کہ میں کیا کروں آیا پڑھوں یا نہیں؟ میں نے جواب لکھا کہ جب حدیث کے مقابلہ میں امام کا قول کوئی چیز نہیں میرا قول کیا ہوگا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۵/ ۲۶۹)

اسلامی تعزیرات پر اعتراض اور اسکا جواب

آج کل متمدن اقوام نے قصاص بالسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موذی ہے کیونکہ اس میں روح نکلنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جاتا ہے۔ پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے، جس پر بیٹھتے ہی ایک سیکنڈ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہوگی؟ اور روح پر کیا گزرتی ہوگی؟ مگر چونکہ دیکھنے والوں کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے اسلیے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں ہے، اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کٹنے، خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس لیے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں! یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کرلی تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہو اور اس سے قیاس کرلیا کہ جب میرے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ تکلیف نہیں مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے تمام مغیبات کے انکار کی، جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے۔ انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم اصلی کی دلیل بنالیا ہے حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا وہ اس وقت بھی معدوم اصلی تھا؟ اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت و دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی؟ تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں اسی طرح تم کو اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی۔

دلیل عقلی کا مقتضی تو یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جس طریق میں جان نکلنے کا

راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی اور جس صورت میں گھونٹ کر دبا کر جان نکالی جائے ان میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی گو دیر کم لگے گی۔ (اشرف الجواب: ۵۱)

قواعد فقہیہ اور اختلاف علماء

فرمایا: کہ بعض اوقات فقہیہ قواعد کسی خاص واقعہ میں متعارض ہو جاتے ہیں ایک عالم کی نظر ایک ضابطہ پر ہوتی ہے دوسرے کی نظر دوسرے ضابطے پر اس لیے اختلاف رائے پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے سورۃ عبس میں جس واقعہ کے متعلق رسول ﷺ پر عتاب آیا کہ آپ ﷺ نے ایک غریب نابینا مسلمان کی طرف زیادہ توجہ دینے کی بجائے روساء مشرکین کی طرف زیادہ توجہ کیوں فرمائی۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی کہ رسول کریم ﷺ کے پیش نظر یہ قاعدہ تھا کہ اصول دین کی تعلیم مقدم ہے فروع کی تعلیم پر، رؤساء مشرکین سے جو خطاب ہو رہا تھا وہ اصولی تعلیم کا تھا نہ نابینا صحابی، جو کچھ بات کرتے وہ فروع دین کے متعلق ہوتی کیونکہ وہ مومن اور اصول دین کے پہلے سے پابند تھے اس لیے رسول ﷺ نے ان کو ان سے مقدم کر دیا لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسرا ضابطہ بھی تھا۔ جس پر آنحضرت ﷺ کی اس وقت نظر نہ گئی وہ یہ کہ وہ کام مقدم رکھنا چاہیے جس کا نفع متوقع اور اس کے کامیاب ہونے کی امید زیادہ ہو بمقابلہ اس کام کے جس کا نفع موہوم اور کامیابی کی توقع کم ہو، یہاں معاملہ ایسا ہی تھا کہ رؤساء مشرکین کے لیے تعلیم اصول کا اثر موہوم تھا اور مسلمان کے لیے تعلیم فروع کا نفع یقینی۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کو ترجیح دینے کی ہدایت فرمائی۔ اور عتاب اس پر ہوا کہ آپ ﷺ نے اس ضابطہ پر توجہ کیوں نہ فرمائی۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۴۸/۲۴)

لفظ ''صلعم'' سے درود وسلام کا حکم

فرمایا کہ حضور ﷺ کے نام مبارک کے ساتھ درود شریف پڑھنا واجب ہے، اگر کسی نے صرف لفظ'' صلعم'' قلم سے لکھ دیا، زبان سے درود وسلام نہیں پڑھا تو میرا گمان یہ ہے کہ واجب ادا نہیں ہوگا۔

مجلس میں چند علماء بھی تھے انہوں نے اس سے اختلاف کیا اور عرض کیا کہ آج کل لفظ ''صلعم'' پورے درود پر دلالت تامہ کرنے لگا ہے اس لیے کافی معلوم ہوتا ہے حضرتؒ نے فرمایا کہ میرا اس میں شرح صدر نہیں ہوا اور اصل بات تو یہ ہے کہ حضور ﷺ جیسے محسن خلق کے معاملہ میں اختصار کی کوشش اور کاوش ہی کچھ سمجھ میں نہیں آتی اگر آپ ﷺ ہمارے معاملہ میں اختصارات سے کام لینے لگیں تو ہم کہاں جائیں؟ احقر جامع عرض کرتا ہے کہ جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے سب سے زیادہ ضرورت اختصار کی حضرت محدثین کو تھی جن کی ہر سطر میں تقریباً حضور ﷺ کا نام مبارک آتا ہے مگر آپ ائمہ حدیث کی کتابوں کا مشاہدہ فرمالیں کہ انہوں نے ہر ہر جگہ نام مبارک کے ساتھ پورا درود وسلام لکھا ہے اختصار کرنا پسند نہیں کیا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۰۹/۲۴)

''صلعم'' لکھنے والے کے ہاتھ کاٹے گئے

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جانثار صحابی ہے۔ جب صحابی کا نام آئے تو ''رضی اللہ عنہ'' اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' پڑھنا چاہئے۔ کچھ بدنصیب ایسے بھی ہے جو درود میں بخل کرتے ہیں اور کچھ بخیل ایسے بھی ہیں جو ''صلعم یا ؐ'' لکھ دیتے ہیں، تخفیف کر دیتے ہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود میں بھی بخل، سب سے پہلے جس نے لفظ ''صلعم'' ایجاد کیا تو محدثین کے فتوے کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے، نماز کا چور ہوتا ہے، مال کا چور ہوتا ہے، دینار کا چور ہوتا ہے، دس دینار کا چور اس کا ہاتھ کاٹا جائے اور جو شان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا چور ہے اس کی سزا تو بڑی سخت ہونی چاہئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کائنات میں وہ بدترین بخیل انسان ہے جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے''۔

''صلعم'' کیا درود ہوتا ہے؟ صلعم درود نہیں ہے، والد کا نام کوئی اس طرح کاٹ کے لے سکتا ہے۔ یہ تو انگریزی کی ضلالت وگمراہی ہے جو ہمارے اندر گھس آئی ہے۔ (ماہنامہ القاسم' رمضان ۱۴۲۹ھ)

چھینک لینا اور اس کا جواب

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان چھینک لے اور الحمد اللہ کہے تو سننے والوں پر مثل سلام کے یرحمک اللہ کہہ کر اس کا جواب دینا واجب ہے اس لیے اس میں کلام ہے کہ چھینکنے والے کو الحمد للہ با آواز بلند کہنا بہتر ہے تاکہ لوگ یرحمک اللہ کہہ کر جواب دیں تو انکو بھی ثواب ملے اس کے لیے بھی دعا ہو۔ علامہ شامیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے حضرتؒ نے فرمایا کہ جس جگہ لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں اور یہ خطرہ ہو کہ ہم نے با آواز بلند الحمد للہ کہا تو ان کو جواب دینے میں تکلیف ہوگی۔ ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ بلند آواز سے الحمد للہ نہ کہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۳۱/۲۴)

یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یارسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نداء پر ایک ارشاد

فرمایا: کہ میرا ایک وعظ حیدرآباد دکن میں ہوا بضمن گفتگو یہ مسئلہ آ گیا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یارسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ الفاظ سے نداء کرنا کیسا ہے تو میں نے کہا کہ قرآن کریم سورہ حجرات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات ظاہری میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں موجود تھے اس وقت باہر سے آپ کو آواز نہ دیں کہ یہ بے ادبی ہے تو جو لوگ ہندوستان سے حضور کو پکاریں یہ کیسے بے ادبی نہ ہوگی؟ (ملفوظات حکیم الامت: ۳۲۹/۲۴)

تقسیم میراث، ایک دعوت کا قصہ

قاضی صاحب پڑوسی کے ہاں میری دعوت ہوئی (قاضی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور ترکہ تقسیم

نہیں ہوا، نابالغ بھی وارث ہیں) کھانا مکان پر آیا، واپس کرنا تو خلاف مصلحت تھا، میں نے ان کی فرائض نکالی اور کھانے کی قیمت لگائی۔ جتنے پیسے نابالغوں کے حصے کے نکلے وہ قاضی صاحب کے گھر بھیج دیئے اور کہلا بھیجا کہ آپ برانہ مانیں اور واپس نہ کریں بضرورت شرعی ایسا کیا گیا ہے انہوں نے اہلیت کی کہ ان کو لے گیا اور نابالغ وارث کی ملک کردی۔ (ایضا:۲۹/۱۴۰)

ہاتھی حلال ہے یا حرام؟

پھر فرمایا: کہ امام محمد کی ایک روایت میں ہاتھی نجس العین ہے اسی واسطے سواری کو مکروہ کہا ہے اور امام مالک کے نزدیک حلال ہے چنانچہ سنا ہے کہ حبشہ میں افریقہ میں کھایا جاتا ہے۔ (ایضا)

مشہور قول کے مطابق ہاتھی کا گوشت حرام ہے ''الوسیط'' میں ہاتھی کے گوشت کی حرمت کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ '' ذوناب'' یعنی لڑنے اور قتل کرنے والے جانوروں میں سے ہے اس لیے اس کا گوشت حرام ہے لیکن اس کے برعکس ایک شاذ قول بھی ہے جسے رافعی نے ابوعبداللہ سے نقل کیا ہے (شوافع میں سے ہیں) کہ ہاتھی حلال ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ ہاتھی مسلمانوں کے طعام میں سے نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھی کے گوشت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ امام شعبیؒ نے ہاتھی کا گوشت کھانے کی رخصت دی ہے۔ (حیوۃ الحیوان للدمیری:۲/۵۲۷)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ناراض ہوتے ہیں یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ!

فرمایا: ایک شخص نے مجھ سے کہا میں جماعت کی نماز اس واسطے نہیں پڑھتا کہ یا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ناراض ہوتے ہیں یا امام شافعیؒ یعنی اگر فاتحہ پڑھوں تو ابوحنیفہ کے خلاف اور نہ پڑھوں تو شافعیؒ کے خلاف۔ لہٰذا میں علیحدہ پڑھتا ہوں جس میں یہ جھگڑا نہ رہے۔ میں نے کہا جماعت کی نماز میں تو آپ کو ایک کی ناراضی کا خوف ہے اور ترک نماز جماعت سے دونوں ناراض ہوتے ہیں اسکا خوف تو زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو جہالت کا مقولہ ہے ایک شخص نے اسی سے ایک اچھی بات نکالی وہ یہ کہ امامت اختیار کرلی کہ دونوں کا اختلاف رہے ہی نہیں دونوں راضی رہیں نہ مقتدی بنے نہ اختلاف کی نوبت آئے۔

فقیہ جامع ہونا چاہیے

فقہ بڑی مشکل چیز ہے۔ فقیہ کو بڑا جامع ہونا چاہیے فقیہ بھی اور محدث بھی ہو متکلم بھی ہو سیاسی دماغ بھی رکھتا ہو بلکہ کہیں کہیں طب کی بھی ضرورت ہے۔ فقہ بڑی مشکل چیز ہے مگر آجکل بعض لوگوں نے اسکی کیا قدر کی ہے کہ فقہاء پر سب وشتم کرتے ہیں یہ گروہ نہایت درجہ مفسد ہے یہ لوگ جان جان کر فساد کرتے ہیں اور اشتعال دلاتے ہیں بعض وقت تو ذرا سی بات میں بڑا فتنہ ہو جاتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت:۴/۱۰۱)

امام صاحب پر ایک اعتراض کا جواب

پھر اس شخص نے بیان کیا کہ اسی ہندو داروغہ کے سامنے غیر مقلدوں نے امام صاحب ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر

اعتراض کیا کہ امام صاحب قائل ہیں کہ اگر کوئی محرم عورت سے نکاح کرے اور وطی کرے تو اس پر حد واجب نہیں یہ کیسی غلطی ہے؟ فرمایا: حضرت والا نے، اسی مسئلہ میں امام صاحب پر فدا ہو جانا چاہیے۔ اس کے لیے دو مقدموں کی ضرورت ہے ایک یہ حدیث میں ہے "ادر ؤ الحدود بالشبهات" ایک مقدمہ یہ ہوا اور دوسرا یہ کہ شبہ کسے کہتے ہیں؟ شبہ کہتے ہیں مشابہ حقیقت کو اور مشابہت کے لئے کوئی وجہ شبہ ہوتی ہے اور اسکے مراتب مختلف ہیں کبھی مشابہت قوی ہوتی ہے اور کبھی ضعیف، امام صاحب نے حدود کے ساقط کرنے کے لئے ادنیٰ درجہ کی مشابہت کو بھی معتبر مانا ہے اور شبہ کی صورت پیدا ہو جانے سے حد کو ساقط کر دیا۔ انصاف کرنا چاہیے کہ یہ کس درجہ عمل بالحدیث ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ایک صحیح معنیٰ کو برے اور مہیب الفاظ کی صورت پہنا دی جائے اس مسئلہ کی حقیقت تو غایت درجہ کا اتباع حدیث ہے لیکن اسکو اس طرح بیان کیا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ امام صاحب نے نکاح بالمحرمات کو چنداں برا نہیں سمجھا اور بھی چند مسائل اسی طرح بری صورتوں سے بیان کر کے اعتراضات کئے جاتے ہیں البتہ اعتراض جب تھا کہ اس پر امام صاحب کوئی زجر و احتساب تجویز نہ کرتے۔ ایسے موقعوں پر جہاں حد کو ہمارے فقہاء ساقط کرتے ہیں تعزیر کا حکم دیتے ہیں ایسے موقعے تمام ائمہ کے نزدیک بہت سے ہیں کہ شبہ سے حد ساقط ہوگئی۔

آخر حدیث کی تعمیل کہیں تو ہوگی اور کوئی تو موقعہ ہوگا جہاں "ادرؤ الحدود بالشبهات" کر کے دیکھا جائے تو اسکا مطلب ہے کہ وہ فعل جس پر حد، شبہ سے ساقط ہوگئی چنداں برا نہیں سمجھا گیا صرف فرق اتنا رہا کہ امام صاحب ادنیٰ شبہ کو بھی کافی سمجھتے ہیں اور لوگ تھوڑے شبہ کو معتبر نہیں سمجھتے۔ پھر غایت درجہ کا اتباع حدیث پر ہوا یا وہ کیا اندھیر ہے کہ ایسا شخص جو حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر مقدم رکھے وہ تو کس قدر عامل بالحدیث ہے فدا ہو جانا چاہیے ایسے شخص پر امام مالک صاحب تو خبر واحد پر بھی قیاس کو مقدم رکھتے ہیں ان کو لوگ عالم بالحدیث کہتے ہیں اور امام صاحب حدیث ضعیف پر بھی قیاس کو مقدم نہیں رکھتے اور انکو تارک حدیث کہتے ہیں۔

حضرت والا نے اہل بڑھل گنج سے فرمایا کل بوقت وعدہ دعوت ہم نے تخمینہ دس آدمیوں کا کیا تھا اسوقت اندازہ ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ آدمی ہو جائیں گے لوگوں نے عرض کیا اسکا کیا خیال؟ فرمایا: کہ پندرہ کیا سولہ ہو جائیں تو کیا ہے فرمایا اطلاع تو کر دینا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۰۲/۴)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بھائی کا قصہ متعلق حضور قلب فی الصلوۃ

بیان فرمائی کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی شیخ احمد اپنے بھائی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے نماز نہ پڑھتے تھے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے والدہ سے شکایت کی کہ بھائی میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے والدہ نے ان کو بلا کر ڈانٹا کہ یہ کیسی مخالفت ہے انہوں نے کہا بہت اچھا آپ کے حکم سے پڑھ لوں گا جب وقت نماز کا آیا تو وہ شریک ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں ایک کتاب لکھ رہے تھے اس روز اس کتاب میں حیض کا بیان تھا

کوئی مسئلہ حیض کا لکھ رہے تھے اس میں مصروفیت تھی اس وقت نماز میں بھی اس کا خیال رہا۔ شیخ احمد کو منکشف ہوگیا بس نیت توڑ دی اور والد کے پاس پہنچے اور مسئلہ پوچھا کہ اگر دم حیض کسی کپڑے میں لگا ہوا ہو تو نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کہا نہیں کہا جب کپڑا آلودہ ہونے سے نماز نہیں ہوسکتی ہے تو قلب اگر دم حیض میں ہو تو کیسے ہو جائے گی۔

وہ اسی سے سمجھ گئیں اور کہا حیض نجاست ظاہری ہے اگر اس کی آلودگی سے نماز نہیں ہوتی تو نجاست حقیقی یعنی گناہ کی آلودگی سے کیسے ہو جائے گی؟ وہ دم حیض کی طرف متوجہ تھے اور تم تجسس میں مبتلا تھے تمہاری حالت بدتر ہے یا ان کی؟ متوجہ الی اللہ تم دونوں میں سے ایک بھی نہ تھا دوسرے کی نماز پر تو اعتراض اور اپنی خبر نہیں کہ اس سے بھی بدتر ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۳۰/۴)

ایک بے ادب کا قصہ

ذکر ہوا ایک بے ادب نے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی تاریخ لفظ ''سگ'' سے نکالی ہے فرمایا: کیا حال ہوگا ایسے لوگوں کا کہ جو لفظ کسی عامی مسلمان کو بھی کہنا جائز نہیں ایسے بڑے امام مقبول عند المحققین والائمہ کی نسبت کہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت:۱۳۹/۴)

بے ادب کا منہ قبلہ سے قبر میں پھر جاتا ہے

اور فرمایا: کہ مولوی عبداللہ صاحب نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس کا جی چاہے قبر کھول کر دیکھ لے مولوی کا منہ قبلہ سے پھرا ہوا ہوگا اس پر مولوی ابوالحسن صاحب نے عرض کیا میں نے یہ بات حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے خود سنی ہے حضرت کے یہ لفظ تھے جو کوئی ائمہ پر طعن کرتا ہے اسکا منہ قبر میں قبلہ سے پھر جاتا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ منہ قبلہ سے پھر گیا یہ اسوقت فرمایا تھا جس وقت کہ مولوی صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ (ملفوظات حکیم الامت:۱۳۹/۴)

حساب فرائض امام محمد صاحب رحمہ اللہ کی ایجاد ہے

حساب فرائض امام محمد صاحب کی ایجاد ہے جس سے کس قدر حساب دانی معلوم ہوتی ہے اس طرح سے اس کو منضبط کیا ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں مل سکی اور سہولت اس قدر رکھی ہے کہ کسر کا کام ہی نہیں رہا ہمارے مقتداء اس قدر ہوئے ہیں کہ کسی قوم میں اور اس کے علماء میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت:۲۲۵/۴)

الوداع الوداع یا شہر رمضان!

روزے کے ختم پر ہم کو تعلیم کی گئی ہے۔ "للصائم فرحتان، فرحة عند الافطار وفرحة عند لقاء ربه" (روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک افطار، ''صغیر یا کبیر'' کے وقت دنیا میں اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت) خواہ کسی قسم کی خوشی ہو، سب محمود و مطلوب ہے باقی رہا رنج اس کے مطلوب

ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے بہر حال رنج نہ واقع ہے اور نہ اس کی کوئی اصل ہے۔ پس تاسف اور رنج کرنا اور خطبہ میں ''الوداع الوداع یا شہر رمضان'' پڑھنا بالکل بے اصل ہے۔ (اغلاط العوام ۸۰)

عورتیں اگر امام بنتیں تو.....؟

کچھ عورتوں کی برائی کا ذکر تھا فرمایا کہ عورتیں ضعیف ہیں یہ نہیں کہ طینت خراب ہے ہر امر میں دیکھتا ہوں کہ ان میں تاثر بہت زیادہ ہے حوصلہ ہوتا ہے اگر امام بنتیں تو شاید محراب چھوڑ کر نکل جاتیں ان کا تو بند ہی رہنا اچھا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت)

صوت عورت بھی عورت ہے

فرمایا: کہ بعض فقہاء نے صوت عورت کو عورت کہا ہے گو بدن مستور ہی ہو کیونکہ گفتگو اور کلام سے بھی عشق اور میلان ہو جاتا ہے۔ (حوالہ بالا)

ف: عورت کو شریعت نے بلند آواز کے ساتھ بات کرنے سے منع کیا اس طور پر کہ اجنبی مرد بھی اس کی آواز نہ سنے اور اسی طرح عورت کے لئے اجنبی مردوں کے ساتھ ضرورت کے وقت نرم اور دلکش لہجہ میں بات کرنا بھی ناجائز ہے۔ البتہ اگر ضرورت ہو مثلاً گھر میں کوئی مرد نہ ہو اور دستک دینے والے کو جواب دینا ہو، یا ٹیلی فون اٹھایا اور جواب دینا ہو یا کوئی اور ضرورت ہو تو اس وقت بھی سخت اور غیر ملائم لہجہ میں بات کرنے کی اجازت ہے۔ (مؤلف)

تجدید ایمان اور تجدید نکاح کا طریقہ

فرمایا: کہ تجدید ایمان کے لیے صرف دو چار آدمیوں کے سامنے ''**لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ**'' زور سے کہہ دینا اور اپنی غلطی پر اظہار ندامت کافی ہے اور تجدید نکاح میں اعلان عام کی بھی ضرورت نہیں، نہ خطبہ کی ضرورت ہے نہ قاضی کی نہ پانچوں کلموں کی بلکہ کسی خاص مجلس میں دو آدمیوں کے سامنے ایجاب وقبول کر لیا جاوے۔

اثر طعام حرام

فرمایا: کہ جس چیز کا خود کھانا حرام ہے اسے اولاد کو کھلانا بھی حرام ہے بلکہ جانوروں کو بھی کھلانا حرام ہے، جانوروں کو خود نہ کھلاؤ بلکہ ایسی جگہ رکھ دو کہ وہ خود آ کر کھالیں یاد رکھو! کہ اپنی اولاد کو جو حرام مال کھلاتا ہے وہ انکے اندر شرارت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

خیالِ غلط

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شریعت میں سختی بہت ہے، ناجائز بہت اور جائز کم نکلتے ہیں سو اول تو یہ خیال غلط ہے کہ شریعت میں ناجائز کا فتویٰ بہت زیادہ ہے پوچھنا ہی بہت کم ہے اتفاق سے کبھی پوچھا

جسکو "ناجائز" بتلانا پڑا ، کثرت سے پوچھو ، تو معلوم ہو کہ جائز زیادہ ہے۔
دوسرے اگر ناجائز کا فتویٰ زیادہ بھی ہو تب بھی آپ کو پوچھنا ضروری ہے تاکہ تمہارا عقیدہ تو درست رہے کیونکہ حرام کو حلال جاننا بعض صورتوں میں کفر ہو جاتا ہے۔ (اغلاط العوام ۲۲۶)

خواب کی بات پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا

ایک نومسلم صاحب نے خواب میں اپنے والد کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا بیان کیا حالانکہ وہ بظاہر اسلام نہیں لائے تھے انہوں نے عرض کیا کہ مولوی اصغر حسین نے اس خواب کی بابت فرمایا: کہ ممکن ہے کہ دل میں اسلام لائے ہوں لیکن اپنا اسلام ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی ہو، نومسلم صاحب نے حضرت سے دریافت کیا اگر اس سے میرے لیے اپنے والد کی بابت کوئی خاص حکم ودعاواستغفار وغیرہ کا تو نہیں ثابت ہوتا؟ فرمایا کہ جی آپکے لیے اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا بالخصوص خواب کی بات پر کوئی حکم کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ خواب میں جو نظر آتا ہے وہ ایک قسم کا ظل ہوتا ہے جسکا واقعہ اکثر محتاج تعبیر ہوتا ہے پھر فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک صاحب تشریف لائے اور ایک دوسرے شخص کو بھی ساتھ لائے اور عرض کیا: یا امیر المومنین! اسکے اوپر حد جاری فرمائی جاوے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ خواب کے زنا پر کہیں حد کا حکم دیا جا سکتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نے زنا کا اقرار کیا ہے۔ اس سے میری سخت توہین ہوئی ہے اسکو ضرور سزا ملنی چاہیے حضرت نے فرمایا: کہ اچھا اسکو دھوپ میں کھڑا کر دو اور جلاد کو حکم دیا کہ اسکے سایہ پر سو (۱۰۰) درے لگا دے کیونکہ خود اس شخص نے تو زنا کیا نہیں ہے اسکے وجود ظلی نے اسکا ارتکاب کیا ہے چنانچہ اسکے سایہ کو جو اسکا وجود ظلی ہے، درے لگا دیے گئے۔ پھر فرمایا: سبحان اللہ! خلفائے اسلام بڑے زیرک اور عاقل ہوئے ہیں۔ (ملفوظات: ۱۶/۱۱۰)

فتویٰ کا اثر نہ ہوا مہنگائی کا ہوا

پوڑیہ کے رنگ کے ڈبوں کا ذکر کیا تھا کہ بارہ، تیرہ آنہ میں جو آتا تھا اب بیس یا تیس روپیہ میں آنے لگا۔ فرمایا: کہ عورتوں نے اس رنگ کو مولویوں کے فتویٰ سے نہ چھوڑا مگر اب چھوڑیں گی۔ (ملفوظات حکیم الامت)

عامل بالحدیث کا قصہ

ایک عامل بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات کے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علماء سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے؟ مجھ سے کس لیے پوچھتے ہو؟ تو حالانکہ وہ اپنے ملک میں بہت ہی پختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپا نہیں کرتی۔ زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمارے علماء تو آمین، رفع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے، یہ مسائل انکو نہیں آتے، آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے غرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا سننا اور ہے گننا اور ہے۔ (اشرف الجواب: ۲۲۹)

نماز کا ایک ضروری مسئلہ

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایک شخص مسجد میں پہنچا اسکو خیال ہوا کہ اذان اور جماعت ہو چکی ہے اس خیال سے اس نے اپنی نماز پڑھ لی بعد میں معلوم ہوا کہ نہ اذان ہوئی نہ جماعت پھر دوبارہ جو نماز میں شرکت کرے گا تو کیا فرضوں کی نیت کرے گا؟ فرمایا: کہ ایک سوال اس میں اور اضافہ کرلیا جائے کہ کن کن اوقات میں شرکت کرلے اور کن میں نہیں تاکہ سوال اور جواب دونوں مکمل ہو جائیں۔ پھر فرمایا: کہ عصر مغرب و فجر میں تو شرکت نہیں کرسکتا اور عشاء اور ظہر میں شرکت کرسکتا ہے۔ اب تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ اس میں نیت نفلوں کی ہوگی اور فرض ادا ہو چکے دوبارہ فرض نہ ہوں گے اور یہ شخص فرض کی امامت بھی نہیں کرسکتا۔ عرض کیا ایک شخص یہ کہتا ہے کہ پہلے جو فرض پڑھے ہیں وہ نفلیں ہوں گی اب دوبارہ جو پڑھے گا وہ فرض ہوں گے۔ فرمایا: کہ یہ اس نے غلط بیان کیا اس کی بالکل ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص نے سرکاری خزانہ میں مال گزاری کا روپیہ داخل کیا اور اس کے بعد حاکم خزانہ کے پاس ڈالی لے کر گیا اب کہتا ہے کہ جو رقم میں نے پہلے داخل کی ہے اس کو تو ڈالی سمجھو سو یہ کہنا محض لغو ہوگا ایسی ہی اس کی مثال ہے کہ فرض جو پڑھ چکا انکو نفل بتلانا اور نفل کو فرض بتلایا (یہ مثال مسائل کی رعایت سے دیکھی ورنہ اس کی حاجت نہیں)۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۳۰۹/۷)

ایک اکثری کلیہ

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت یہ سنا ہے کہ جس دن رجب کی چوتھی تاریخ ہوتی ہے اسی دن رمضان کی پہلی۔ فرمایا: کہ یہ اکثری ہے کلی نہیں۔ پھر رجب اور رمضان شریف ہی کی کچھ تخصیص نہیں سب مہینوں میں یہی بات ہے کہ جس مہینہ کی جس روز چوتھی ہوگی اس سے تیسرے مہینہ کی اسی روز پہلی ہوگی مثلاً محرم کی جس دن چوتھی ہوگی صفر کا مہینہ چھوڑ کر ربیع الاول کی اس دن پہلی ہوگی۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۷۵/۸)

بینک کے سود کا مصرف

ایک صاحب نے عرض کیا کہ ڈاک خانہ میں روپیہ جمع کر دیا جائے اور سود نہ لیا جائے اس کا کیا حکم ہے کہ بینک والے اس روپیہ کو بامانت بجنسہ محفوظ تھوڑا ہی رکھتے ہیں اس روپیہ پر دوسروں سے سود لیتے ہیں تو اس جمع کرنے میں اعانت ہوئی، معصیت کی۔ اور اس کا نفع کوئی نہ ہو، اور بینک والوں کو فائدہ پہنچا اور اس کے سر پر مفت گناہ کا بار رہا۔ باقی اگر غلطی سے روپیہ جمع ہو چکا ہو تو اخف المفسد تین یہی ہے کہ غرباء پر تقسیم کر دیا جائے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۸۳/۸)

ماموں اور چچا سے پردہ

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ متاخرین فقہاء نے تو اپنے ماموں اور چچا سے بھی

پردہ کو مناسب کہا ہے۔ بڑی دور نظر پہنچی ہے کہ بوجہ محرم ہونے کے اپنے لیے تو نہیں مگر اپنی اولاد کے لیے تو اس نظر سے دیکھیں گے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۸/ ۲۶۳)

نماز جنازہ میں پچھلی صف افضل ہے

سوال کیا کہ نماز جنازہ میں صف آخر کیوں افضل ہے؟ فرمایا کہ دو وجہ معلوم ہوتی ہے ایک یہ کہ جنازہ نماز تو ہے نہیں بلکہ دعا ہے جو لوگ پیچھے ہیں وہ گویا آگے والوں کو شفیع گردانتے ہیں۔ پس جتنا کوئی پیچھے ہیں اس کے شفیع زیادہ ہیں اس لیے ان کو فضیلت ہوگی، دوسرے جو پیچھے ہیں وہ "تشبه بعبادة الصنم" سے بہ نسبت آگے والوں کے بعید ہیں اس لیے فضیلت ہونی چاہیے۔ یہ بات طالبعلموں کے سمجھنے کی ہے اصولیین نے حسن وقبح کی بحث میں اس تشبہ کا، پھر اس کے موثر نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۸/ ۲۲۸)

بی بی تمیزہ کا وضو

ایک دفعہ بزرگی رجسٹری ہونی چاہیے پھر وہ ایسی پختہ ہوجاتی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو، مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نام کی ایک فاحشہ عورت تھی ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضو کرواکے نماز پڑھوائی اور تاکید کردی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا یہ کہہ کر وہ چلے گئے ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! پڑھا کرتی ہوں انہوں نے کہا کہ وضو بھی کیا کرتی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وضو اس روز آپ نے کرا نہیں دیا تھا، سو جیسا اس کا وضو پکا تھا کہ نہ بدکاری سے ٹوٹا نہ ہگنے سے نہ سونے سے آجکل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل نہیں آتا حتی کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہی ہیں۔

امام صاحب کو تنخواہ میں چنے ملنے سے امامت کا عذر

فرمایا کہ حافظ صاحب بڑے بزرگ صاحب نسبت متقی شخص تھے ریاست میں امامت پر ملازم تھے ایک مرتبہ ریاست کی طرف سے تنخواہ میں بجائے روپیوں کے جملہ ملازمین کو چنے دیئے گئے چنانچہ حافظ صاحب کو بھی چنے ہی ملے، بیچارے بہت پریشان کہاں تک چنے کھاتے اور نواب صاحب سے کچھ عذر کرنا چنوں کے نہ لینے کا مناسب نہ خیال کیا ایک ترکیب کی کہ جب نماز کا وقت ہو جھٹ وضو کر اور دو ایک آدمیوں کو ساتھ لے جو اسوقت موجود ہوں جماعت سے نماز پڑھ کے بیٹھ جائیں لوگ کہیں کہ حافظ صاحب! نماز پڑھایئے جواب میں فرمائیں کہ بھائی پڑھ لی کچھ عذر تھا اس لیے جلد پڑھ لی۔

جب چند روز متواتر یہی قصہ لوگوں نے دیکھا کہ حافظ صاحب لوگوں کے آنے سے پہلے ہی جماعت کر لیتے ہیں اور فرمادیتے ہیں کہ کچھ عذر ہے اور عذر کو ظاہر بھی نہیں کرتے لوگوں کو ناگوار ہوا نواب صاحب تک شکایت پہنچائی نواب صاحب کو بھی ناگوار ہوا، اور حافظ صاحب کو بلا کر دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے آپ اس قدر جلد نماز کیوں ادا کر لیتے ہیں جواب میں فرمایا کہ ہے تو شرم کی بات مگر کیا کروں جب آپ دریافت

کرتے ہیں تو عرض کرنا پڑا کہ چنے کھانے کی وجہ سے وضو نہیں ٹھہرتا اس لیے فوراً ہی نماز ادا کر لیتا ہوں نواب صاحب نے کہا کہ او ہو آپ بھی بڑے حضرت ہیں یہ معاملہ تھا اور حکم دے دیا کہ تنخواہ میں مولوی صاحب کو روپیہ دے دیے جائیں پھر فرمایا کہ چاہے بزرگ ہی کیوں نہ ہو جائیں جن کی طبیعت میں ذکاوت و مزاح ہوتا ہے وہ ہر وقت ظاہر ہوتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۳۹/۱۸)

جو لوہے سے کٹ جائے وہ شہید، ایک عجیب فتویٰ

فرمایا کہ ایک خط آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک شخص ریل سے کٹ گیا کسی صاحب نے فتویٰ دیا کہ اس کی نماز جنازہ نہ ہونی چاہیے کیونکہ یہ لوہے سے کٹ مرا ہے فرمایا کہ یہ خوب فتویٰ دیا کہ جتنے کالے اتنے ہی میرے باپ کے سالے۔ لوہے کے کٹے ہوئے سب شہید ہی ہوتے ہیں بیچارے کو بے نماز ہی دفن کرا دیا۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۸/ ۵۳)

چرم قربانی کا نمازی سے سوال

فرمایا کہ کانپور میں بقر عید کو ہم سب لوگ مسجد میں بیٹھے تھے مدرسہ کیلئے کھالیں آ رہی تھیں ان کے جمع کرنے کے لیے عشاء کی نماز کے بعد تک بیٹھنا پڑا۔ ایک شخص عشاء کی نماز کے بعد آیا۔ بیٹھنے والوں کو یہی خیال ہوا کہ یہ بھی کھال لایا ہوگا۔ اس سے دریافت کیا کہ بھائی تو کیا لایا اس نے کہا کہ صاحب کچھ نہیں میں تو نماز پڑھنے آیا ہوں۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۵۹/۱۸)

ضرورت کی صورت میں نماز جنازہ کی سہل ترکیب

جمعہ میں، میں نے لوگوں سے بطور اعلان کے کہا کہ اگر تم کو جنازہ کی پوری نماز نہیں آتی تو یوں کیا کرو، کہ وضو کر کے کھڑے ہو گئے اور چار دفعہ "اللہ اکبر" کہہ دیا بس فرض ادا ہو جائیگا۔ کیونکہ رکن صرف چار تکبیریں ہی ہیں اور میں نے یہ کی تو تھی خیر خواہی۔ مگر لوگوں کے نزدیک ہو گئی بدخواہی۔ بعض لوگ اس پر کہنے لگے کہ واہ واہ، ہم نے تو اب تک سنا بھی نہیں کہ ایسے بھی نماز ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ہمارے قصبہ میں ایک مردہ کو کہ وہ "جذامی" تھا بلا نماز دفن کر دیا مجھ کو شام کو خبر ہوئی میں طلباء کو ساتھ لے کر وہاں گیا اور اس کی قبر پر نماز پڑھی اور یہ جو صورت میں نے نماز کی لوگوں کو بتلائی تھی یہ جاہلوں کے لیے ایک آسان صورت ہے اس طرح نماز پڑھنے سے فرض ادا ہو جاتا ہے اور مردہ کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس پر بس کریں کہ نماز جنازہ کے سیکھنے کا قصہ ہی نہ کریں۔ غرض دیہات والوں کو خبر ہی نہیں اسلامی امور کی۔ (ملفوظات ۱۹۱/۱۹)

بارہ سال کا مفتی

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے خود ایک دفعہ فرمایا: کہ میں بارہ سال کی عمر میں فتاویٰ دینے لگا

تھا، اور نو سال کی عمر میں فقہ ونحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔

﴿ ذلك فضل الله يوتيه من يشآء ﴾ (بڑوں کا بچپن ۲۹)

تین طلاق کا اہم مسئلہ

کسی شخص نے آپ (امام صاحب) سے پوچھا کہ ایک شخص نے کہا آج اگر جنابت کا غسل کروں تو تین طلاق۔ پھر کہا اگر آج کے دن کوئی نماز چھوڑوں تو تین طلاق۔ پھر کہا: آج بیوی سے ہم صحبت نہ ہوں تو تین طلاق، وہ شخص کیا کرے اور اسکی خلاصی کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص عصر کی نماز پڑھ کر اپنی بیوی سے ہم بستر ہو، آفتاب ڈوبنے پر غسل کرے اور مغرب اور عشاء کی نماز ادا کرے اس لیے آج کے دن کی نمازوں سے پانچ وقت کی نماز مراد ہے۔ (ائمہ اربعہ کے دلچسپ واقعات ۱۳۲)

انڈہ نہ کھانے کی قسم اور اس کا حل

ایک شخص نے قسم کھائی کہ انڈہ نہ کھائیں گے پھر قسم کھائی کہ فلاں شخص کے آستین میں جو چیز ہے وہ ضرور کھائیں گے دیکھا گیا تو وہ انڈہ ہی تھا فرمایا کسی مرغی کے نیچے رکھ دے جب بچہ ہو جائے تو بھون کر کھالے یا پکا کر مع شوربا کے سب کھالے۔

علامہ احمد بن حجر مکیؒ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک حیلہ یہ ہیکہ اسکو حلوے میں ڈال دے پس قسم پوری ہو جائے گی، اس لیے کہ اس نے آستین کی چیز کو کھالیا اور یہ نہیں صادق آتا ہے کہ اس نے انڈہ کھایا اس لیے کہ وہ مستہلک ہو گیا۔ (ایضاً:۱۲۳)

ایک ''واؤ'' کیساتھ یا دو ''واؤ'' کیساتھ

کہتے ہیں کہ ایک اعرابی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس مسجد میں آیا اور کہا کہ ''بواوام بواوین ؟''تو امام صاحبؒ نے فرمایا: ''بواوین ''اعرابی نے کہا ''بارك الله فيك كمافي لاو لا'' اور چل دیا امام صاحبؒ کے شاگرد حیران رہ گئے اور امام صاحبؒ سے اعرابی کے سوال کے بارے میں دریافت کیا تو امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اعرابی تشہد کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ دو واؤ کیساتھ ہے جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد یا ایک واؤ کیساتھ ہے جیسا کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تشہد ہے؟ تو میں نے بواوین کہا تو اس نے دعا میں کہا ''بارك الله فيك كمافي لاولا'' یعنی

''كما بارك في شجرة زيتونة لاشرقية ولا غربية'' (فقہی پہیلیاں:۲۱۳)

اہل علم کی توجہ کیلئے....

یونس مدنی کہتے ہیں میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند انسان نہیں دیکھا، ایک دن میں نے ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں مناظرہ کیا، پھر ہم اپنی مصروفیات میں مشغول ہو گئے چند دن کے بعد مجھ سے ملے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

''یاابا موسی !الا یستقیم ان نکون اخوانا وان لم نتفق فی مسألۃ''

اے ابو موسیٰ! کیا یہ درست روش نہیں ہے کہ ہم کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود آپس میں بھائیوں کی طرح رہیں۔ (ائمہ اربعہ کے دلچسپ واقعات: ۲۲۲)

ایک عجیب جواب

ایک مرتبہ ایک آدمی نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مسئلہ پوچھا کہ میرا باپ کہتا ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا تم اس کو طلاق نہ دو! وہ کہنے لگا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدیں؟ یہ سن کر امام احمد نے فرمایا جب تمہارا باپ عمر رضی اللہ عنہ جیسا بن جائے تو تم بھی یہ کام کر لینا۔ (سیرت ائمہ اربعہ:۲۱۶ بحوالہ رجال السند والہند: ۱۳۵)

ادب واحترام

۱)...... ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید نے پچھنے لگوائے (فاسد خون نکلوایا) اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے مسئلہ معلوم کیا کہ اس سے وضو ٹوٹ گیا یا باقی ہے؟ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: وضو باقی ہے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے نیا وضو کئے بغیر نماز پڑھائی تو حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے بھی ان کی اقتداء میں نماز ادا کر لی، حالانکہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک یہ تھا کہ اس سے وضو ختم ہو جاتا ہے چنانچہ جب حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ ان (ہارون الرشید) کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا: اس جیسی باتوں کی وجہ سے ائمہ کی اقتداء میں نماز نہ پڑھنا اہل بدعت کا شعار اور طریقہ ہے۔ (مجموعۃ الفتاویٰ)

۲)...... اسی طرح کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ابن عبدالعظیم فرماتے ہیں کہ مشہور و معروف محدث علی ابن المدینیؒ سواری پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس آئے اور پھر کسی مسئلے میں دونوں کے درمیان اس قدر بحث و مباحثہ ہوا کہ دونوں حضرات کی آوازیں خلاف عادت بلند ہونے لگیں، مجھے یہ ڈر محسوس ہوا کہ کہیں ان کے درمیان ناراضگی نہ ہو جائے لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا جب حضرت علی بن المدینیؒ نے جانے کا ارادہ کیا تو حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان کی سواری کی لگام پکڑ کر ان کے ساتھ ہو لئے۔ (جامع بیان العلم: ۳۸۰)

۳)...... امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مجلس میں حضرت ابراہیم بن طہمان کا ذکر آیا امام احمد رحمہ اللہ بیماری کی وجہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے یکدم سیدھے بیٹھ گئے فرمانے لگے صالحین اور نیک لوگوں کے تذکرے کے وقت ٹیک لگا کر بیٹھنا مناسب نہیں۔ (ائمہ اربعہ کے دلچسپ واقعات: ۲۸۹)

اسراف سے احتراز

ایک نواب صاحب کوہ منصوری پر گئے، وہاں دیا سلائی (ماچس) کی ضرورت ہوئی تو مستقل موٹر کو دیا

سلائی لینے کے واسطے تیرہ میل کے فاصلے پر بھیجا گیا، پھر اس خیال سے کہ نہیں وہ ایک درجن نہ لے آئے اور اسراف ہو، دوسری موٹر بھیجی گئی یہ کہنے کے لئے کہ درجن نہ لے آئیں، ایک ڈبہ لے لیں حالانکہ دیا سلائی کا بڑا ڈبہ گھر میں موجود تھا۔

ایک نواب صاحب کا بیجا اسراف

ایک نواب صاحب نے ملازم رکھا، صرف اس کام کے لئے کہ وہ ان کو روزانہ سوتے وقت ایک پاؤ دودھ گرم کر کے پلایا کرے، اس نے اس میں خیانت کی، ایک چھٹانک دودھ خود پی لیتا اور بقیہ میں اتنا ہی پانی ملا کر مقدار پوری کر دیتا۔ نواب صاحب نے محسوس کرلیا۔ اس لئے صرف اسکی نگرانی کے لئے ایک اور ملازم رکھا۔ یہ اس سے مل لیا۔ اور کہا، آج سے ایک چھٹانک تیرا بھی سہی۔ نواب صاحب کو اب پہلے سے بھی پتلا دودھ ملنے لگا۔ آخر احساس ہوگیا، تیسرا ملازم رکھا صرف ان دونوں کی نگرانی کے لئے۔ یہ دونوں اس سے مل لئے اور ایک چھٹانک اس کا بھی تجویز کرلیا۔ اب نواب صاحب کو ایک چھٹانک دودھ اور تین چھٹانک پانی ملنے لگا۔ احساس ہونے پر کہا کہ دنیا میں امانت نہیں رہی سب خائن ہوگئے۔ لہٰذا ایک ملازم اور بڑھایا جو ان تینوں کی نگرانی کیا کرے۔ اس نے ان تینوں سے پوچھا۔ کہو بھائی، کیا بات ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ بات ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا میں انتظام کرتا ہوں۔ دودھ کو تو گرم کرنے کے لئے چولہے پر رکھدیا اور خود نواب صاحب کے پاس بیٹھ کر کہانیاں سنانی شروع کردی یہاں تک کہ نواب صاحب پر نیند غالب آگئی اور سوگئے، اب اس نے دودھ کی بالائی لی اور اس کو نواب صاحب کی مونچھوں پر لگا دیا۔ صبح کو جب نواب صاحب اٹھے تو اس کو ڈانٹ کر کہا۔ کیوں بے تو نے ہمیں رات دودھ نہیں پلایا۔ اس نے عرض کیا کہ سرکار سوگئے تھے۔ تو جگا کر پلایا ہے۔ دیکھو بالائی ابھی تک مونچھوں کو لگی ہوئی ہے۔ آئینہ دکھلایا۔ نواب صاحب نے دیکھ کر دونوں مونچھوں کو تاؤ دیا اور کہا کہ دودھ تو بس رات پیا ہے، ویسے تو روزانہ یہ لوگ پانی ہی پلاتے ہیں۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف:۳۷)

ارے فلانے! مجھے لوٹا تو دیدے وضو کا

ایک مولانا صاحب بڑے ہوشیار اور تیز تھے، ایک شخص نے ان کو دعوت کی۔ وقت مقررہ پر بلانے کے لئے آیا۔ اس کے ساتھ تشریف لے گئے یہاں تک کہ وہ مولانا کو ایک مکان کے سامنے کھڑا کر کے خود اس کے اندر چلا گیا۔ (کہ اطلاع کرے) مکان پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد پردہ کے پیچھے سے آواز دی کہ تشریف لے آیئے اور خود ایک طرف کواڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ جب مولانا مکان کے اندر داخل ہوگئے تو وہ چپ چاپ نکل کر بھاگ گیا۔ مولانا نے اندر دیکھا کہ میاں بیوی کھانے میں مشغول ہیں۔ انھوں نے مولانا کو دیکھا تو ڈانٹ کر کہا۔ یہ کون چلا آرہا ہے مکان میں؟ اس پر مولانا بتکلف نابینا بن گئے اور ہاتھوں سے درودیوار کو ٹٹولتے ہوئے فرمایا۔ ارے فلانے مجھے لوٹا تو دیدے وضو کا۔ یہ سن کر مالک مکان نے سمجھا

کہ بیچارہ کوئی نابینا ہے، غلطی سے مسجد کے بجائے یہاں آ گیا۔ اس لئے ان کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ سے باہر پہنچا دیا اور مسجد کا راستہ بتا کر اندر چلا گیا۔ تب مولانا وہاں سے قیام گاہ پر تشریف لائے۔

امام کے اوصاف

پنڈی بھٹیاں سے ایک صاحب، حضرت امیر شریعت کی خدمت میں ملتان حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ شاہ جی! ہمارے ہاں ایک جامع مسجد کے لئے عمدہ خطیب کی ضرورت ہے۔ شاہ جیؒ نے فرمایا۔ ''عمدہ؟'' اس نے عرض کیا۔ جی ہاں! شاہ جیؒ نے دریافت فرمایا۔ ''آخر کیسا عمدہ؟'' نو وارد نے عرض کیا۔ شاہ جی! خطیب مرغوب ہو، بہت خوب ہو۔ حضرت امیر شریعت نے فرمایا: ''عالم بھی ہو؟'' انہوں نے عرض کیا، ''جی ہاں'' شاہ جی نے فرمایا ''فتوے کا کام بھی دے سکتا ہو؟'' عرض کیا۔ ''جی ہاں'' حضرت جی نے فرمایا ''با اخلاق بھی ہو؟'' اس شخص نے عرض کیا۔ جی ہاں! شاہ جی نے فرمایا۔
بھائی! پھر آپ کی مسجد کے لئے کسی نبی کی ضرورت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی پیغمبر کے پیدا ہونے کا قائل نہیں ورنہ کہیں نہ کہیں سے ضرور ڈھونڈ لاتا۔ (باتیں انکی یاد رہیں گی ۱۰۰)

قبلہ اور بیت المقدس

شہر مظفر گڑھ کے ایک صاحب، حضرت امیر شریعتؒ سے جیل میں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور دوران ملاقات عرض کیا۔

''قبلہ! بخیریت ہیں آپ؟''

حضرت شاہ جی نے فرمایا: ''جی بیت المقدس''

ملاقاتی نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''جی! میں بیت المقدس تو نہیں ہوں'' یہ سن کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''پھر میں قبلہ کہاں سے ہوں''۔

ہماری قسمت میں ہے ہی حرام

مفتی محمود گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چوری کا حال یہ ہے کہ ایک کاشتکار مجھے اپنے کھیت پر ملا، اس نے بتایا کہ یہ میرا کھیت ہے چنوں کا اور یہ برابر والا دوسرے کا ہے۔ جب مجھے چنے لینے ہوتے ہیں تو اپنے کھیت میں سے نہیں لیتا، دوسرے کے کھیت میں سے لیتا ہوں، اور جب اس کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ میرے کھیت میں سے لیتا ہے۔ اس کا مجھے بھی علم ہے، اس کو بھی علم ہے۔ وہ بھی حرام کھاتا ہے، میں بھی حرام کھاتا ہوں، ہماری قسمت میں ہے ہی حرام۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف ۵۳)

ف: اگر خدائے پاک حرام چیزوں اور ناجائز کاموں سے منع نہ فرماتا تو بھی سلیم الطبع اور عقل مند انسان کے لئے ضروری تھا کہ ان سے پرہیز کرتا۔ (مؤلف)

شیطان اور منافقت

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:
شیطان نے کتنی جرأت کا ثبوت دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو نہیں مانا اور آخر تک نہیں مانا۔ ابدی لعنت کو قبول کرلیا مگر منافقت نہیں کی۔ اگر ہم اس کو مشورہ دیتے کہ کم بخت انہیں مانتا آدم کو دل سے نہ سہی ظاہراً تو سجدہ کرلے۔ مقابلہ کر کے کیوں جہنمی بنتا ہے؟ وہ کیا کہتا؟ یہی تو جواب دیتا۔ کہ جہنم منظور ہے مگر منافقت نہیں ہوسکتی۔ مگر وہ باطل کے لئے اتنی صلابت واستقامت کا ثبوت دے تو ہم حق کے لئے کیوں نہ دیں۔ (ماہنامہ تبصرہ لاہور۔ امیر شریعت نمبر: ۴۰)

تم نے مجھے منکوحہ سمجھا یا روٹی؟

ایک مرتبہ ضلع میانوالی میں قیام کے دوران ایک دیہاتی سفید ریش، حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس میں آیا اور بجائے ''السلام علیکم'' کہنے کے ''بسم اللہ بسم اللہ'' کہہ کر پاؤں چھونے لگا۔ حضرت نے فوراً ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ ''میاں! بسم اللہ عام طور پر دو جگہ پڑھی جاتی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے یا اپنی منکوحہ عورت کے پاس جانے سے پہلے۔ تم نے مجھے کیا سمجھا، روٹی یا منکوحہ بیوی؟''
نو وارد سخت نادم ہوا۔ آپ نے محبت آمیز لہجہ میں اسے سمجھایا کہ مسلمان جب کسی مجلس میں آئے تو پہلے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہے جو شریعت کا حکم اور کار ثواب ہے۔ (پیام اسلام، امیر شریعت نمبر: ۱۰۲)

کھانے میں سنت وفرض

ایک مولانا صاحب دعوت کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے اصرار کر کے انہیں بہت زیادہ کھلا دیا۔ یہاں تک کہ اب ان کے شکم میں ایک ماشہ غذا کی بھی جگہ باقی نہیں رہی۔ تو کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے برتنوں کو تو صاف ہی نہیں کیا۔ حالانکہ برتنوں کو صاف کرنا سنت ہے۔ مولانا صاحب نے فرمایا۔ ٹھیک ہے برتن صاف کرنا سنت ہے مگر جان بچانا فرض ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں سنت ادا کروں یا فرض پر عمل کروں؟ یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ (اکابرین کے پاکیزہ لطائف: ۱۳۱)

دو قبرستانوں کے درمیان دفن کرو

ایک واعظ جو بہت ہی خوش طبع اور حاضر جواب تھے۔ لوگوں نے ان سے تفریحاً یہ سوال کیا کہ اگر کوئی نصرانی ''**لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ**'' نہ پڑھے مگر اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرے اور مر جائے تو اس کو نصرانیوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے یا مسلمانوں کے قبرستان میں؟ تو خوش مزاج واعظ نے تفریحاً برجستہ یہ جواب دیا کہ اس کو دونوں قبرستانوں کے درمیان میں دفن کرنا چاہیے تاکہ قبر میں بھی یہ شخص مذبذب ہی رہے۔ نہ ادھر کا رہے نہ ادھر کا رہے۔

ہم بم ساز ہیں، تم بم بار ہو

حضرت مولانا انعام الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر سنایا تھا کہ حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنایا تھا۔ کہ ''ہم بم ساز ہیں (کہ مدارس میں علماء تیار کرتے ہیں) اور تم بم بار ہو'' (کہ اُن علماء کو مختلف ممالک میں تبلیغ میں بھیج دیتے ہیں)۔ (حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ اور جماعت تبلیغ: ۳۷)

فتوائے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

اگر کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہوکر کفر کی فتح ونصرت کے لئے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان کی اعانت کرے، اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو، تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے، یہ صورت کفر کی انتہائی صورت ہے اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی اشد حالت ہے، جس سے زیادہ کفر و کافری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے وہ سارے گناہ ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں، جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے، یا ان کا وقوع دھیان میں آ سکتا ہے، سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔

''جو مسلمان اس کا مرتکب ہو، وہ قطعاً کافر ہے اور بدترین قسم کا کافر ہے۔''

اس نے صرف قتل مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے، بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنان حق کی اعانت و نصرت کی ہے، اور یہ بالاتفاق و بالاجماع کفر صریح و قطعی مخرج الملۃ ہے۔ جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقہ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی، تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور حمل سلاح علی المسلم کے بعد کیونکر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے۔ (ارشادات مدنیؒ: ۲۲۱)

ف: شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کی روشنی میں امریکی ایماء پر جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے معصوم طلبہ وطالبات پر گولیاں چلانے والوں کا حکم واضح ہو جاتا ہے۔

یاد رہے! کہ امریکی صدر بش واضح طور پر اعلان کر چکا ہے کہ لال مسجد (مسجد شہداء) کے خلاف آپریشن ہماری دہشت گردی اور اسلامی انتہا پسندی کے خلاف عالمی جنگ کا حصہ ہے۔

ہنسی کا نقصان

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے فرمایا: ''میں ایک دن ہنسا اور مجھے اس پر آج تک ندامت ہے، واقعہ یہ ہوا کہ عمرو بن عبید قدری سے میرا مناظرہ تھا، جب مجھے اپنی فتح محسوس ہوئی تو مجھے ہنسی آ گئی''۔ عمرو نے کہا: ''آپ علمی گفتگو میں ہنستے ہیں۔ جائیے میں آپ سے کبھی بات نہ کروں گا۔ مجھے اس ہنسنے پر سخت افسوس ہے۔ اس لئے اگر میں نہ ہنستا تو اس سے اپنی بات منوا لیتا (حق کا قائل کر لیتا) اور اس کی علمی اصلاح ہو جاتی۔'' (اسلامی آداب معاشرت: ۱۶۴/۱)

خاموشی کے فوائد

کسی حکیم ودانا شخص نے کہا ہے۔" خاموشی وسکوت میں سات ہزار بھلائیاں ہیں۔ جو سب کی سب سات کلمات میں جمع ہیں، جن میں سے ہر کلمہ ہزار بھلائیوں پر مشتمل ہے۔"

۱)...... خاموشی بلا کسی محنت ومشقت کے عبادت کا ثواب دلاتی ہے۔

۲)...... خاموشی بلا کسی زینت کے ساز وسامان کے زیور ہے۔

۳)...... خاموشی بغیر کسی بادشاہت وحکومت کے ہیبت ورعب کا ذریعہ ہے۔

۴)...... خاموشی بلا دیوار کے محفوظ باغیچہ ہے۔

۵)...... خاموشی کسی سے عذر خواہی کرنے سے بے نیاز کرنے کا ذریعہ ہے۔

۶)...... خاموشی کراماً کاتبین کو راحت پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

۷)...... خاموشی اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے۔ (ایضاً: ۲/۶۶)

سب سے بڑا سود

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ سب سے بڑا سود بلا حق کسی مسلمان کی عزت کے بارے میں لب کشائی کرنا ہے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ ان دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنہیں عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے یعنی وہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہیں نبی کریم ﷺ نے جیتے جی دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ مسلمان کی پردہ دری، اس کے بارے میں بلا وجہ لب کشائی، اس کی تحقیر وتذلیل اس پر اپنی بڑائی کا اظہار، اس کی غیبت، اسے برا بھلا کہنا، گالم گلوچ، اس پر تہمت والزام لگانے کو سود سے تشبیہ دی جس میں انسان ناحق اپنے مال سے زیادہ دوسرے سے لیتا ہے، اسے سب سے بڑا سود اس لئے قرار دیا گیا کہ مسلمان کی عزت وآبرو، اللہ جل شانہ، کی نظر میں بڑی عظیم ووقیع ہے۔ مال کی بہ نسبت اس کا درجہ ومکانت بہت بڑی ہے، اس لئے کسی مسلمان کی پردہ دری کرنا اس کے لئے نہایت شدید ہوتا ہے۔ اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ناحق پردہ دری کو گناہ شدید قرار دیا گیا، لیکن بعض مرتبہ صاحب حق کو اپنا حق وصول کرنے کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر کوئی کسی کے حق کو ادا نہ کرے اور وہ اسے کہے، اے ظالم! میرا حق دے دو، ظلم نہ کرو۔ یا واقعۃً کوئی ظالم ہو، اسے ظالم کہہ کر ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے، اسی طرح عدالت میں کسی گواہ پر جرح کرنا، یا محدثین کا راویوں پر کلام کرنا ان میں موجود سبب جرح کا بیان یہ اس میں شامل نہیں، ایسا کرنا جائز اور درست ہے۔ (اسلامی آداب معاشرت: ۳/۱۸۵)

غیبت کن صورتوں میں جائز ہے؟

۱)...... دادرسی کے وقت مثلاً قاضی یا حاکم کے سامنے اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کسی کا تذکرہ کرنا،

مظلوم ایسا کر سکتا ہے، یہ غیبت میں شامل نہیں ہے۔

۲) کسی برائی کی تبدیلی کے لئے مدد طلب کرنے اور مجرم و راہ راست پر لانے کی خاطر۔

۳) استفتاء کے لئے مفتی کے سامنے مثلاً یوں کہے کہ فلاں نے میرے ساتھ ظلم کیا یا ایسا معاملہ کیا۔ اس سے کس طرح خلاصی ہوگی؟

۴) مسلمان کو شر سے بچانے کے لئے، جیسے کسی چیز میں کوئی عیب ہو اور کوئی اسے خریدنا چاہتا ہو، یا کسی شخص سے گواہی طلب کی جائے یا مشورہ لیا جائے۔

۵) کوئی شخص کسی عیب پر دلالت کرنے والے لفظ سے معروف ہو جیسے لنگڑا، کبڑا وغیرہ اور وہ اسی نام سے پہچانا جاتا ہو، تو پھر اس نام سے پکارنا غیبت نہیں بنے گا۔

۶) فسق و فجور میں کھلم کھلا مصروف رہتا ہو، اور اس نام سے پکارنے کو معیوب بھی نہ سمجھتا ہو، جیسے شرابی، ہیجڑا وغیرہ۔ لیکن اگر انہیں اس کے علاوہ کسی اور نام سے پکارا جائے تو غیبت بن جائے گا، مثلاً شرابی کو ہیجڑے کے نام سے پکارنا وغیرہ۔ (اسلامی آداب معاشرت ۶/۲ ۷)

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب مجھ سے کوئی معافی مانگتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ پہلے غلطی بتاؤ۔ وہ کہتا ہے، میں نے آپ کی غیبت کی تھی۔ بتاؤ غیبت کیا تھی؟ پھر معاف کروں گا۔

کہتے ہیں کہ دل میں یہ نیت ہوتی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ جو بات یہ بتائے اس سے اپنی کوئی اصلاح ہو جائے۔ اس نے جو غیبت کی تھی بظاہر اس نے برائی بیان کی تھی۔ بہت سے لوگ سامنے تو برائی نہیں کرتے لیکن پیچھے بیان کرتے ہیں۔ جب پیچھے بیان کرتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میرے بارے میں کیا سمجھتے ہیں اور کیا برائی بیان کرتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کوئی برائی ایسی بیان کریں جو واقعی موجود ہو تو اس سے اصلاح ہو جائے گی، اس نیت سے پوچھتا ہوں کہ بتاؤ کہ کیا نیت کی تھی؟ پھر معاف کروں گا۔ (انعام الباری ۷/۲۹ ۷)

چھینک کا غیر مسنون جواب

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ایک صاحب، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پڑوس میں تھے۔ انہیں چھینک آئی اور انہوں نے "الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ" کہا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں بھی "الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ" کہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح جواب دینا نہیں سکھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ سکھایا ہے۔ کہ ہم "الحمد للہ علی کل حال" کہیں۔

یعنی سنت طریقہ یہ ہے کہ چھینک آنے پر "الحمد لله، الحمد لله رب العالمین یا الحمد لله علی کل حال یا الحمد لله رب العالمین علی کل حال" کہا جائے۔ اس میں "السلام علی رسول الله" کا اضافہ کرنا درست نہیں، ادعیہ اذکار میں جتنا منقول ہو، اسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اپنی طرف سے اس میں اضافہ یا کمی نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے اذان میں "أشهد ان محمد ارسول الله" پر "صلی الله علیه وسلم" کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ نے لکھا ہے کہ چھینکنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ آہستہ آواز سے چھینکے اور زور سے "الحمد لله" کہے تاکہ لوگ "الحمد لله" سن کر "یرحمك الله" کہیں جب تک "الحمد لله" نہ سنیں گے "یرحمك الله" کہنا ان پر لازم نہ ہوگا۔ لکھا ہے۔ ایک صاحب کو چھینک آئی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر تم نے "الحمد لله" کہا تو "یرحمك الله" (اللہ تم پر رحم کرے)۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین مرتبہ تک چھینکنے پر "یرحمك الله" کہو۔ اس سے زائد چھینک آئے تو پھر وہ شخص زکام کا مریض ہے۔ (ایضاً: ۱۵۰)

حج اور جہاد

ایک حدیث میں ہے "الحج جهاد لاقتال فيه" (حج ایک ایسا جہاد ہے جس میں قتال نہیں)

حج اور جہاد میں جن چیزوں میں مناسبت ہے وہ درج ذیل ہیں: ان مناسبات کو اگر مجاہدین پیش نظر رکھیں تو ان کو واقعی حج میں روحانی نظاروں کے ساتھ جہاد کی تمرین اور تربیت بھی نظر آئے گی۔

۱)...... حج میں ایک مرکز ہوتا ہے جہاں تمام حجاج جمع ہوتے ہیں اور اسی مرکز کی ہدایات کے مطابق وہ قیام اور سفر کرتے ہیں۔ یونہی مجاہدین کا بھی ایک مرکز ہونا چاہیے جس کے ہاتھ مجاہدین کی باگ ڈور اور انتظام وانصرام ہو، وہاں کبھی کبھاران کا اجتماع بھی ہو اور باہمی صلاح مشورے بھی ہوں۔

۲)...... حج میں ایک امیر ہوتا ہے اگرچہ دوسری عبادات اور امور خیر کی طرح اب امیر حج ہونا ایک بے جان سی رسم بن کر رہ گیا ہے لیکن اسلامی شریعت میں اس کی بڑی اہمیت اور مقام ہے، اسی طرح جہاد میں بھی ایک امیر ضروری ہے جس کی اطاعت ہر مجاہد پر لازم ہوگی۔ اطاعت امیر کی بغیر مجاہدین میں نظم ونسق قائم رہنا محال ہے۔

۳)...... حج کا مخصوص لباس احرام ہے اور دوران حج کسی قسم کی زیبائش وآرائش جائز نہیں بلکہ اس کے برعکس پراگندگی، سادگی اور درویشانہ حالت کو پسند کیا گیا ہے۔ خوشبو کا استعمال حرام ہے اور سلا ہوا کپڑا استعمال کرنا جرم ہے۔ مجاہدین کی بھی شان یہ ہونی چاہیے کہ سادگی سے رہیں۔ تعیش وتنعم سے محترز رہیں جس مجاہد کو ہر وقت اپنے لباس کی بناوٹ وسجاوٹ اور جسم کی آرائش کی فکر لگی رہے وہ جہاد کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کرسکتا۔ جہاد میں تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ہفتوں غسل کرنا نصیب نہیں ہوتا اور بسا

اوقات چیتھڑوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

۴) حاجی ترک وطن کرتا ہے، عزیز و اقارب کی جدائی کا غم برداشت کرتا ہے، خانگی راحتوں اور آسائشوں کو خیر باد کہتا ہے، مجاہد کو بھی یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ حج میں طواف اور سعی ہے جس کے لئے میلوں دوڑنا پڑتا ہے۔ اور پہلوانوں کی طرح اکڑ کر بھی۔ اور بتایا یہ گیا ہے کہ نوافل پڑھنے سے زیادہ ثواب طواف اور عمرے کرنے کا ہے۔ جتنا زیادہ سے زیادہ ممکن ہو طواف کرو اور دوڑ لگاؤ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے نازک مزاج کے لئے طواف اور سعی کی کثرت ممکن نہیں۔ جسے ننگے پاؤں چلنے کی عادت ہی نہ ہو بلکہ وہ عادی ہوا ئیر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر کرنے کا اور نرم اور دبیز قالینوں پر پاؤں رکھنے کا۔ معاذ اللہ، کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں طواف اور سعی کو محض ایک ورزش کہہ رہا ہوں کیونکہ یہ دونوں بہت بڑی عبادتیں ہیں اور اگر کوئی کم فہم انسان ان دو ورزش کی نیت سے بجالائے گا تو وہ ثواب سے بھی محروم ہوگا اور ذہنی تحریف کا بھی مرتکب ہوگا لیکن بلاتشبیہ عرض ہے کہ جہاد میں جسمانی ریاضت کا، اٹھک بیٹھک کا، دوڑ اور جمپ لگانے کا بے پناہ ثواب ہے۔

۵) حج میں مکہ سے منیٰ، وہاں سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے منیٰ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ ایک جگہ اچھی طرح ٹکنے نہیں پاتے کہ دوسرے مقام کی طرف کوچ کرنے کا حکم ہو جاتا ہے۔ حاجی کو روا نہیں کہ وہ چون و چرا کرے، یونہی مجاہد کو بھی ہر وقت آمادۂ سفر رہنا چاہیے جس محاذ پر اس کی ضرورت ہو۔ اور جہاں اسے بلایا جائے، بلا توقف وہاں حاضر ہو جائے۔ اپنی راحت اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہرگز نہ کرے۔ جہاد تو نام ہی تسلیم وانقیاد و قربانی اور ایثار کا ہے۔

۶) دوران حج فسق وفجور، فحش گوئی، جدل اور نزاع کی سختی سے ممانعت ہے۔ بلکہ حکم ہر ایک کو یہ ہے، کہ حج میں شریک ساتھیوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھے کسی کی دل آزاری نہ کرے، ممکن ہے کہ اس کی ذرا سی بے احتیاطی اور کسی ساتھی کی دل شکنی اس کے سارے سفر کو اکارت کرے اور باطل کردے، یونہی مجاہدین پر لازم ہے کہ وہ ایک ڈسپلن کے ساتھ رہیں اپنے ساتھیوں کی ضروریات کو مقدم جانیں ان کے جذبات واحساسات کا خیال رکھیں اور زبان درازی سے کسی کی دل آزاری نہ کریں، ورنہ ان کا باہمی خلفشار، ان کی شکست اور پسپائی کا سبب بن جائے گا۔

۷) حجاج کرام عرفات اور مزدلفہ سے واپس منیٰ آتے ہیں تو جمرات کی رمی کرتے ہیں جو کہ شیطان کی تمثیل ہیں اگر حج میں شیطان کی تمثیلوں پر سنگ باری کا حکم ہے تو جہاد میں شیطانی قوتوں پر گولہ باری کا حکم ہے۔

۸) حج میں آخر میں حسب حیثیت جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور خون بہا کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی سنت کو زندہ کیا جاتا ہے۔ جہاد کا بھی آخری اور بلند ترین مقام یہ ہے کہ ضرورت پڑے تو جان کا نذرانہ جان دینے والے کے حضور پیش کردے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے لخت جگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی صورت میں انسانی جان ہی کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

۹) دوران حج اگر کوئی ''جنایت'' ہو جائے تو اس کی جزا دی جاتی ہے۔ یونہی اگر جہاد میں کسی مجاہد سے غلطی ہو جائے تو اسے کسی نہ کسی صورت میں سزا دی جا سکتی ہے۔

۱۰) حاجی حج سے فارغ ہو کر سلے ہوئے کپڑے پہنتا ہے اور طواف کے لئے کعبہ میں دوبارہ حاضر ہوتا ہے۔ مجاہد پر بھی لازم ہے کہ وہ اس وقت تک فوجی لباس نہ اتارے جب تک کہ جہاد کے مقاصد پورے نہ ہو جائیں۔ اور فارغ ہونے کے بعد مرکز میں آ کر رپورٹ دے۔

۱۱)..... حجاج کرام حسب مواقع تلبیہ اور تکبیر و تہلیل با آواز بلند پڑھتے ہیں تو ماحول پر عجب سماں طاری ہو جاتا ہے۔ یونہی مجاہدین نعرہائے تکبیر اس زور سے لگاتے ہیں۔ کہ کفار کے دل دہل جاتے ہیں اور فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

''تفسیر الہام الرحمٰن'' میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ: ''حج کی مشروعیت تمرین اور اعمال حرب کی تیاری کے لئے ہے اور اس کا بیان سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۶ تا آیت ۲۰۳ میں ہے۔ یہ تمام کی تمام آیتیں مسائل حج کے بارے میں ہیں۔ اور حدیث میں وارد ہے: '' **الحج جهاد لا قتال فيه**'' (حج ایک جہاد ہے جس میں قتال و جنگ نہیں) اس کے معنی یہی ہیں کہ اعمال حربیہ کی تمرین و ترغیب کی جائے سوائے قتال اور جنگ کے، اور حج کا ماحصل دو چیزیں ہیں اول مسلمانوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے نفقات ایک خاص جگہ میں جمع کریں۔ دوم یہ کہ اعمال حرب و جہاد کی تمرین، پھر جب یہ لوگ اس پر قائم ہو جائیں اور اس تمرین میں مستفید ہو گئے اور ان کو اس کی خاص عادت ہو گئی تو اب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ توجہ سے اعمال جہاد انجام دینے پر قادر ہوں گے۔'' **اليه تحشرون**'' کو مفسرین نے حشر قیامت پر محمول کیا ہے اور حشر عرفات کو حشر یوم القیامۃ کا ایک نمونہ کہا ہے۔ ہم ایسی چیزوں کے استنباط اور مسائل حج بیان کرنے سے انکار نہیں کرتے لیکن ہم انہیں پر اکتفا نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں سباق مسائل حج اور مسائل جہادی بیان کرنا مقصود ہے۔ تو حشر سے مراد حشر جنود للجہاد ہے۔ کیونکہ اسلام ابتداءً مطوعین (اطاعت گذاروں) کی قوت ہی سے قائم ہوا ہے۔ اور حج میں صرف اعمال جہاد کی تمرین اور ترغیب دی جائے اور ان مطوعین ہی کو تمرین و ترغیب دی جائے۔ پھر جب ہم نے حدیث پیش کر دی ''**الحج جهاد لاقتال فيه**'' تو کس کی طاقت ہے کہ حج کو اعمال جہاد سے خالی کر دیوے لیکن شاہان ظلم و جور اور شیاطین زہاد (**قاتلهم الله**) نے تمام اعمال مسلمین کو باطل اور خراب کر دیا۔

اسی طرح حج میں فدیہ کا حکم ہے کہ جو شخص مأمور بہا مناسک کی خلاف ورزی کرے اس کی جزاء و بدلہ کا حکم فرمایا ہے۔ یہی حال نظام حرب کا ہے اگر کوئی فوجی آدمی کسی مامور بہ امر کی مخالفت کرے گا

بغیر مجازات اس لئے چھوڑا جاسکتا ہے کہ یا عوام کیلئے مردھوں گے یا عورتیں۔ اعمال حرب کی تمرین و تدریب اس سے بہتر طریقہ پر ممکن ہے۔

اور اعدائے دین اسلام بظاہر قرآن کی قوت اور حج کی قوت عملیہ کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان سے اسلام کی عزت ہے۔ اس لئے اعدائے اسلام پوری قوت، پوری طاقت ان ہر دو کی توہین و بے عزتی اور دونوں کو ضعیف و کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

حج کے لئے جمع ہونے والوں پر لازم ہے کہ ان تین مہینوں میں چند امور اپنے لئے لازم قرار دے لیں: اول یہ کہ عورتوں کا نام چھوڑ دیں۔ دوم یہ کہ جو معاملات قانون میں ہیں ان کی مخالفت نہ کریں۔ فساد کو بالکل ترک کر دیں۔ سوم یہ کہ جنگ و جھگڑا قطعاً ترک کر دیں۔ جب ایک امت کی امت ان امور کو تین ماہ تک اپنے لئے لازم کر لے گی۔ تو وہ اپنے اندر بے شمار اوصاف اجماعیہ مسکریہ پیدا کر لے گی۔ اور یہ اس پر قادر ہو جائیں گے جسے انہوں نے دوران قیام حرم میں قائم کیا تھا، کیوں کہ یہاں اُن لوگوں نے احکام شرعیہ اور قوت ارادیہ بنفسہ پر قائم کیا تھا۔ بغیر سلطان اور بلا حاکم کے انہوں نے اس کا التزام کیا تھا، اب فتح کے بعد اس کی قدرت اور استطاعت رکھتے ہیں کہ اپنے لئے حکومت اجتماعیہ متوسطہ بنالیں۔ (ماہنامہ الولی، صفر المظفر ۱۴۱۱ھ)

نعمت استرجاع ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ پڑھنا

استرجاع یعنی ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ پڑھنا اس امت کے لئے خاص انعام ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت کو ایک چیز ایسی دی گئی ہے۔ جو کسی اُمت کو نہیں دی گئی سابقہ امتوں میں سے، اور وہ یہ کہ مصیبت کے وقت تم ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ کہو۔ اور اگر کسی کو یہ استرجاع دیا جاتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیا جاتا جس وقت کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی جدائی میں فرمایا تھا "یا اسفیٰ علی یوسف" ہائے افسوس یوسف علیہ السلام پر۔ (روح کی بیماریاں اوران کا علاج)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ یعنی مصیبت اور غم کے وقت زبان کو انا للہ وانا الیہ راجعون کے ورد میں مشغول کیا جائے۔ اور دل کو اس کے معنی کے تصور میں کہ ہم اللہ ہی کی ملک ہیں اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اپنے مملوک میں اختیار ہے۔ غلام کو چاہیے کہ مالک کے تصرف پر راضی رہے۔ اس لئے اس موقع پر تصرف حق پر راضی رہنا چاہیے۔ (شریعت وطریقت)

ہمارے حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قید نہیں لگائی کہ یہ الفاظ تم عقل سے، اخلاص سے اور دل سے ادا کرنا بلکہ صرف قال ہے۔ یعنی صرف زبان سے ان الفاظ کو ادا کرنا کافی ہے۔ بس ان الفاظ کے ادا کرنے پر جو انعام اس مومن کو دیا جاتا ہے، وہ عالم امکاں میں کسی کو نہیں دیا جاتا۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دھد　　آنچہ در وہمت نیاید آں دھد

تو ﴿ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ﴾ کلوروفارم ہے۔ آگے فرمایا
﴿ اولٰئک علیھم صلوٰت من ربھم ورحمۃ ﴾ جوانعام دینا چاہیے تھا وہ تمام تر دے دیا۔ یعنی
وہ رحمت کا مورد بنادیا اور اس کو ہدایت دے دی۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیں۔ ان کو نہ شیطان
راہ کر سکے گا نہ نفس گمراہ کر سکے گا اس لئے کہ وہ اب ہماری حفاظت میں آ گیا۔ تو اس آزمائش پر اتنا بڑا
ہے۔

جب بھی کوئی ناگوار بات پیش آئے۔ چاہے وہ معمولی سی کیوں نہ ہو اس پر ﴿ انا للّٰہ و انا الیہ
جعون ﴾ کہہ لو۔ ان شاء اللہ صابرین کی فہرست میں داخل ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو
ے گی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مورد بن جاؤ گے۔ (مصائب اوران کا علاج ۱۰۲)

نت استرجاع کی تکمیل

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں اور مسنون یہ ہے کہ ﴿ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ﴾ کے بعد یہ کہے ﴿ اللّٰھم
ـرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا ﴾ اے اللہ مجھے اجر عطا فرما، میری مصیبت میں اور اس سے
ز کوئی نعمت مجھے عطا فرما۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی
ے کو مصیبت پہنچے اور وہ یہ دعا پڑھ لے یعنی ''اناللہ۔۔۔ خیرا منہا'' تک تو حق تعالیٰ شانہ اس کو اجر عطا
ماتے ہیں۔ اور اس سے بہتر نعمت عطا فرماتے ہیں پس جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ (ان کے شوہر) کی وفات ہوئی تو
وں نے اس کو پڑھا اور حق تعالیٰ نے ان سے بہتر عطا فرمایا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔
جس شخص نے مصیبت پر ﴿ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ﴾ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ شانہ اس کی مصیبت کے
سان کی تلافی فرماتے ہیں اور اس کے عقبیٰ کو احسن کر دیں گے اور اس کو ایسا نعم البدل عطا فرمائیں گے
س سے وہ خوش ہو جائے گا۔ (روح کی بیماریاں اوران کا علاج)

نائل استرجاع

مصیبت خود بخود یاد آ جائے تو اناللّٰہ الخ پڑھ لے کہ اس وقت اناللّٰہ الخ پڑھنے کا بھی وہی ثواب ہوگا
ین مصیبت کے وقت پڑھنے کا ثواب تھا۔ (فضائل صبر وشکر)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اس معمولی تکلیف پر بھی انا للّٰہ
پڑھو۔ یہ بھی ایک مصیبت ہے اور اس پر بھی ثواب ملے گا۔ (روضۃ الصالحین)
فرمایا جو بات ناگوار گزرے وہی مصیبت ہے اور اس پر انا للّٰہ الخ پڑھنا ثواب ہے۔
(ملفوظات کمالات اشرفیہ)

للّٰہ پڑھنا اسی امت کا خاصہ ہے

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مصیبت پر انا للّٰہ پڑھنا، اسی امت کو تعلیم ہوا ہے۔ کسی اور کو

ملا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام وضو ورحطا ہوتا آپ نے یا اسفی علی یوسف (ہائے افسوس یوسف علیہ السلام پر) فرمایا ہے۔ اناللہ نہیں پڑھا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ دو اجر بھی بہت اچھے ہیں اور علاوہ بھی بہت اچھا ہے۔ ۞ اولئک علیہم صلوٰت من ربہم ورحمۃ ۞ یہ دو اجر اور بدل ہیں۔ ۞ واولئک ھم المھتدون ۞ یہ زائد اور علاوہ ہے۔ (مصائب اور ان کا علاج ۱۰۴)

وہ قریبی رشتہ دار جن سے پردہ فرض ہے

۱) چچازاد ۲) پھوپھی زاد ۳) ماموں زاد ۴) خالہ زاد
۵) دیور ۶) جیٹھ ۷) نندوئی ۸) بہنوئی
۹) پھوپھا ۱۰) خالو ۱۱) شوہر کا بھتیجا ۱۲) شوہر کا بھانجا
۱۳) شوہر کا چچا ۱۴) شوہر کا ماموں ۱۵) شوہر کا پھوپھا ۱۶) شوہر کا خالو

(مواعظ حضرت مفتی رشید احمد صاحب ؒ)

چاند نظر آ گیا

ایک سال لوگ رمضان کا چاند دیکھنے گھروں سے باہر نکلے اور ان میں پیش پیش جلیل القدر صحابی حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ لوگوں نے آسمان کی طرف غور سے دیکھا، انہیں کہیں چاند نظر نہ آیا لیکن حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پکار پکار کہہ رہے ہیں، وہ دیکھو چاند نظر آ گیا۔ اور اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے لوگوں کو چاند کی سمت بتا رہے ہیں۔ لوگوں نے بڑی کوشش کی، پھر بھی کسی کو چاند نظر نہ آیا۔ وہاں حضرت ایاس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا۔ ایک لمبا سفید بال بھووں سے اوپر اٹھ کر آنکھ کے سامنے آیا ہوا ہے۔ حضرت ایاس نے بڑی ادب واحترام سے اجازت لی، پیار سے اپنا ہاتھ بڑھایا بڑی محبت سے سلیقے سے آنکھ پہ ہاتھ پھیر کر بال کو بھووں کے ساتھ برابر کر دیا۔ اور پھر پوچھا جناب والا! اب فرمائیے، کیا چاند نظر آ رہا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور فرما رہے ہیں اب چاند مجھے دکھائی نہیں دے رہا واقعی بالکل دکھائی نہیں دے رہا۔ دراصل ضعف بصارت کی وجہ سے آنکھ کے سامنے آیا ہوا سفید بال انہیں باریک سا چاند معلوم ہو رہا تھا۔ (حیاۃ تابعین ؒ کے درخشاں پہلو: ۱۰۲)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قوت استدلال

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قوت استدلال، بیدار مغزی اور زود فہمی کے بارے میں کوئی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔

تاریخ وسیر کی کتابوں میں ایسے واقعات درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ امام موصوف اپنے مدمقابل کو دلائل سے ایسا زچ کرتے کہ وہ بات کرنے کے قابل ہی نہ رہتا جیسا کہ امام مالک نے ان کے

بارے میں فرمایا کہ اگر یہ اپنے مدمقابل کو کہہ دیں کہ تیرے سامنے جو مٹی پڑی ہے، یہ سونا ہے تو اسے سونا ثابت کرنے کے لئے ایسے دلائل دیں گے۔ کہ بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ واقعی یہ سونا ہے۔ لیکن اگر یہ کسی دینی مسئلے میں ایک موقف اختیار کر لیں تو اسے حق ثابت کرنے میں تو یہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

کوفہ میں ایک ایسا گمراہ شخص رہائش پذیر تھا۔ جسے بعض لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اس کی باتیں غور سے سنا کرتے۔ اس نے ایک دفعہ لوگوں سے کہا (نعوذ باللہ "نقل کفر کفر نہ باشد") کہ عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) حقیقت میں یہودی تھا۔ اور وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی یہودی ہی رہا۔ امام ابو حنیفہ نے جب یہ بات سنی، تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آپ فوراً اس کے پاس پہنچے اس سے ملاقات کی اور فرمایا، میں آج ایک خاص کام کے لئے آیا ہوں۔ اس نے کہا چشم روشن دل ماشاد فرمائیے۔ کیا کام ہے؟ سر آنکھوں پر خوش آمدید آپ فرمائیں آپ جیسے معزز انسان کی بات کو قبول کرنا سعادت ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کی نسبت میں اپنے فلاں ساتھی سے کردوں، کیا آپ کو منظور ہے، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ لیکن منگیتر کا ذرا تعارف تو کرائیں، کہ وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ بڑا مالدار اور اپنی قوم میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، بڑا سخی ہے، کھلے ہاتھ کا مالک ہے، حافظ قرآن ہے، شب زندہ دار ہے، اللہ کے خوف کی وجہ سے آہ وزاری کمال انداز میں کرتا ہے۔ اس نے اتنی تعریف سن کر کہا بس بس اتنا ہی کافی ہے ایسا شخص ہی میرا داماد بننے کے قابل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے خوشگوار موڈ کو دیکھتے ہوئے کہا: میری یہ بات بھی ذرا غور سے سنیں، اس میں ایک برائی بھی ہے۔ اس نے چونک کر کہا وہ کیا؟

آپ نے فرمایا: وہ شخص یہودی ہے۔ یہ بات سن کر وہ شخص بدکا، اور کہنے لگا: ارے یہودی ہے۔ اے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ! کیا آپ میری بیٹی یہودی کے نکاح میں دینا چاہتے ہیں؟ اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کسی یہودی کے ساتھ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ خواہ اس میں زمانے بھر کی خوبیاں جمع کیوں نہ ہوجائیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اب کیوں اچھلتے ہو۔ اپنی بیٹی کا یہودی کے ساتھ نکاح کرنے سے کیوں اتنا بدکتے ہو۔

تجھے یہ کہتے ہوئے قطعاً شرم نہ آئی کہ نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ایک یہودی سے کردی۔ کچھ شرم کرو حیا کرو، بے غیرت انسان تیرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

وہ شخص یہ باتیں سن کر کانپنے لگا۔ اور فوراً پکار اٹھا، الٰہی میری توبہ! مجھے بخش دے! یہ بری بات جو میری زبان سے نکلی، یہ افتراء اور بہتان جو میں نے باندھا، الٰہی مجھے معاف کردے۔ بلاشبہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ (حیات تابعین کے درخشاں پہلو ۶۱۳)

تحکیم کے جواز کا فتویٰ

ایک دفعہ کا واقعہ ہے، ضحاک شاری نامی ایک خارجی، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ اور اس نے دیکھتے

جی یہ کہا اے ابوحنیفہ اللہ سے معافی مانگو۔ توبہ کرو۔ آپ نے پوچھا میں نے کیا جرم کیا ہے جس کی معافی مانگوں۔

خارجی نے کہا آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین پیدا ہونے والے اختلافات میں تحکیم کے جواز کا فتوی دیا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے کہا کہ تم اس مسئلے پر میرے ساتھ مناظرہ کرنا چاہتے ہو۔ خارجی نے کہا، ہاں میں تیار ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہمارے درمیان ہونے والے مناظر کا فیصلہ کون کرے گا؟

خارجی نے کہا جس کو آپ چاہیں، جج بنالیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خارجی کے ساتھیوں پر نظر دوڑائی اور فرمایا اس کو حکم بنالیں۔ میں آپ کے ساتھی کو جج بنانے پر راضی ہوں کیا تم بھی راضی ہو۔

خارجی خوش ہو گیا۔ اور اس نے کہا مجھے منظور ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم آج خود میرے اور اپنے درمیان ہونے والے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے تحکیم کو جائز قرار دیتے ہو۔ اور اللہ کے دو عالی شان صحابہ کے درمیان ہونے والے اختلافات کو مٹانے کی خاطر تحکیم کا انکار کرتے ہو۔ مجھے افسوس ہے تیری عقل و دانش پر، اور تیرے انداز فکر پر۔

یہ سن کر خارجی ششدر رہ گیا اور اسے کوئی جواب سوجھائی نہ دیا۔ (ایضا ۲۱۴)

کیا وہ شخص مومن مرا یا کافر؟

ایک روز سرزمین اسلام میں شر کا بیج بونے والا گمراہ کن فرقہ جہمیہ کا سربراہ جہم بن صفوان، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کے لئے آیا۔ اس نے کہا میں آپ کے ساتھ چند ضروری باتیں کرنے کے لئے آیا ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تمہارے ساتھ بات کرنا معیوب ہے۔

جن نظریات کا تو حامل ہے اس میں غور وخوض اور بحث و تمحیص آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔

جہم نے کہا، یہ آپ نے فیصلہ مجھ پر کیسے صادر کر دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ نہ مجھ سے کبھی ملے ہیں اور نہ ہی آپ نے میری کبھی کوئی بات سنی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آپ کی بہت سی ایسی باتیں مجھ تک پہنچ چکی ہیں۔ جن کا صدور کسی مسلمان سے ممکن نہیں۔

جہم نے کہا: کیا تم غیب کی بنیاد پر فیصلہ دیتے ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تیرے نظریات لوگوں میں عام پھیل چکے ہیں، عام و خاص بخوبی اس نظریات سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس بنا پر میرے لئے تیرے بارے میں یہ فیصلہ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ درجہ تواتر کو پہنچ چکے ہیں۔

جہم نے کہا: میں آپ سے صرف ایمان کے بارے میں سوال کرنا چاہتا ہوں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ابھی تک تجھے ایمان کا ہی پتہ نہیں چلا کہ آج اس کے بارے میں مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو؟ جہم نہیں! مجھے ایمان کا تو علم ہے لیکن اس کے چند پہلوؤں میں چنداں شکوک و

شبہات ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ایمان میں شک وشبہ کفر ہے۔ جہم نے کہا آپ کے لئے یہ درست نہیں کہ مجھے اس وقت کفر کیساتھ منسلک کرو۔ جب تک میری طرف سے ایسی کوئی بات معلوم نہ کرلو۔ جو کفر کے مترادف ہو، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا چلو، پوچھو، جو تم پوچھنا چاہتے ہو؟

جہم نے کہا مجھے کوئی ایسا شخص بتایئے جس نے اللہ کو اپنے دل سے پہچانا ہے۔ اور اس نے یہ جان لیا ہو کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں، کوئی ہمسر نہیں اور اس نے اللہ کو اس کی صفات کے ذریعے پہچانا ہو۔ حالانکہ اس جیسی کوئی چیز نہیں۔

پھر وہ شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس نے اپنی زبان سے ایمان کا اعلان نہیں کیا۔

کیا وہ شخص مؤمن مرا یا کافر؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی موت، حالت کفر میں ہوئی۔ وہ جہنمی ہوگا۔ جبکہ اس نے اپنی زبان سے اس ایمان کا اقرار نہیں کیا جس کی معرفت اس کے دل نے حاصل کر لی تھی۔ جبکہ زبانی وضاحت کے سلسلے میں وہاں کوئی مانع اور رکاوٹ بھی نہیں۔

جہم نے کہا: وہ بھلا مؤمن کیوں نہیں اس نے تو اللہ کی معرفت اسی طرح حاصل کی جیسا کہ کرنے کا حق ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر تم قرآن کو حجت مانتے ہو قرآن پر تیرا ایمان ہے۔ تو میں قرآن حکیم سے دلائل پیش کروں اور اگر قرآن پر تیرا ایمان نہیں تو میں عقلی دلائل سے اپنی یہ بات ثابت کروں۔

جہم نے کہا میں قرآن کو حجت مانتا ہوں۔ اور قرآن کی صداقت پر میرا ایمان ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایمان کو جسم انسانی کے دو اعضاء کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ دل اور زبان، ایمان کی صحت کے لئے ان دونوں کا اعتراف واقرار ضروری ہے۔ صرف ایک کا اعتراف قابل قبول نہیں ہوگا۔ کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اسکی وضاحت ملتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ، وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (المائدہ: ۸۵)

انہوں نے اپنے دل سے حق پہچان لیا تھا۔ اور اپنی زبان سے اس کا اقرار بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انکے زبانی اعتراف کی بنا پر ایسے باغات میں داخل کیا جن میں نہریں بہتی ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

والاسباط وما اوتی موسی وعیسی وما اوتی النبیون من ربھم ﴿ (البقرہ ۱۳۶)

اللہ نے انہیں زبانی اقرار کا حکم دیا ہے صرف دلی معرفت پر اکتفا نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

"قولوا لا الہ الا اللہ تفلحون"

تم اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، کامیاب ہو جاؤ گے۔

آپ نے صرف دلی معرفت کو فلاح و کامیابی کا معیار قرار نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ زبانی اقرار کو بھی لازمی قرار دیا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا

"یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ"

اس فرمان میں یہ نہیں کہا کہ جس نے اللہ کو دل سے پہچان لیا وہ جہنم سے باہر آ جائے گا۔

اگر ایمان کا تعلق صرف دل سے ہوتا، زبانی اقرار کی کوئی حیثیت نہ ہوتی تو ابلیس بڑا مومن ہوتا، وہ اپنے رب کو پہچانتا تھا کہ اس نے اسے پیدا کیا، وہی اسے مارے گا، وہی اسے زندہ کریگا، اسی نے راندہ درگاہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا مکالمہ قرآن میں بیان کیا ہے:

﴿ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین ﴾

تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس آدم کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ابلیس نے یہ کہا۔

﴿ رب فانظرنی الی یوم یبعثون ﴾ (الحجر ۳۶)

میرے رب مجھے قیامت تک مہلت دے دیجئے۔

اس نے یہ بھی کہا:

﴿ فبما اغویتنی لاقعدن لھم صراطک المستقیم ﴾

جیسا کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر تیرا خیال درست ہوتا تو اکثر کافر مومن کہلاتے کیونکہ وہ اپنے دلوں سے رب تعالیٰ کو پہچانتے تھے جبکہ اپنی زبانوں سے اقرار نہیں کرتے تھے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ وجحدوا بھا واستیقنتھا ﴾ (النمل: ۱۴)

دیکھئے ان کے دلی یقین کی بنا پر انہیں مومن قرار نہیں دیا بلکہ انکے زبانی انکار کی وجہ سے انہیں کافر قرار دیا گیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مسلسل قرآن وحدیث کے دلائل دیئے جا رہے تھے۔ جنہیں سن کر جہم کے

چہرے پر پریشانی وپشیمانی کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ دلائل کی جھ مار سن کو وہ یہ کہتے ہوئے کھسکنے لگا۔ کہ آپ نے مجھے بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے۔ میں پھر بھی دوبارہ آپ کے پاس آؤں گا، یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ اس کے بعد اس نے نہ آنا تھا اور نہ ہی وہ آیا۔ (حیات تابعین کے درخشاں پہلو: ۲۱۵)

مسجد میں بعض جائز کام بھی ناجائز ہیں

مسجد میں وہ جائز فعل بھی جائز نہیں، جس کے لئے مسجد نہیں بنائی گئی۔ حتی کہ اپنی گمشدہ (کھوئی ہوئی) چیز کے لئے اعلان کرنا، خرید وفروخت کرنا، دنیا کی باتیں کرنا، ان باتوں کے لئے جمع ہو کر بیٹھنا، بدبودار چیز کھا کر مسجد میں جانا جائز نہیں۔ (احکام مسجد از افادات تھانوی ۳۰)

مسجد اور عیدگاہ میں بچوں کو لے جانے کی مذمت

ہمارے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جنبوا مساجد کم صبیانکم" یعنی اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو۔

آج کل عام طور سے بچوں کو عیدگاہ میں لے جانے کا رواج ہو گیا ہے۔ جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھلا ضرور لئے ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ ہر سال تکلیف اٹھانے کے باوجود پھر بھی لوگوں کو اس کا ذرا بھی احساس اور تمیز نہیں ہوتی۔ شاید ہی کوئی سال ایسا ہوتا ہو کہ بچے عیدگاہ میں جا کر عین نماز کے وقت رونا، چیخنا، چلانا نہ شروع کرتے ہوں بلکہ ایک، دو، تو ان میں سے ہگ موت بھی دیتے ہیں۔ خود میرے سامنے کا واقعہ ہے، میرے زمانہ طالب علمی میں ایک میرے عزیز کم عمر بچے کو میرٹھ کی عیدگاہ میں لے گئے اور بچے نے عین نماز کے وقت قضائے حاجت کی فرمائش کی، اسکی فرمائش سن کر سخت پریشانی ہوئی۔ اول تو عین نماز کا وقت، دوسرے میرٹھ کی عیدگاہ جس میں ہزاروں کا مجمع اور قریب میں ایسا کوئی جنگل بھی نہیں جس میں اس کو بٹھلا دیا جاتا۔ پھر نماز کھڑے ہونے کا وقت بھی بالکل قریب۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک حلوائی کو چار آنہ دے دیئے گئے۔ اس نے اپنے تخت کے نیچے اس کو بٹھلا لیا۔ چاروں طرف سے کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ اوپر رنگ برنگ کی مٹھائی اور نیچے یہ تحفہ بھرا ہوا تھا۔ (ایضا: ۵۴)

ایک زبردست غلطی اور ایک غلط فہمی

بعض لوگ مسجد اور مدرسہ کے لئے زبردستی چندہ وصول کرتے ہیں۔ یہ اس سے بھی بدتر ہے (کہ آدمی اپنے لئے ایسا کرے) کیونکہ اگر اپنے نفس کے لئے کرتا تو اپنے کو دنیوی نفع پہنچاتا اور جب حق تعالی کے لئے ایسا کیا تو خدا تعالی بھی راضی نہ ہوئے اور اپنے پاس بھی نہ رہا۔ "خسر الدنیا والاخرۃ" (دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان ہوا)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لئے تو مانگتے نہیں، اللہ کے واسطے مانگتے ہیں، لیکن یہ عذر باطل ہے۔ اس لئے کہ معصیت ہر حال میں معصیت ہے، دین کے واسطے بھی معصیت حلال نہیں ہو جاتی، بلکہ

اسکی برائی زیادہ سخت ہے۔ معصیت وثواب کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ حرام و دین کا آلہ بنانا اور ثواب کا اعتقاد رکھنا سخت معصیت ہے۔ (احکام مساجد، افادات تھانوی ۹۲)

ایک مسجد کی تعمیر کا واقعہ

تھانہ بھون کے اسٹیشن پر ایک مسجد بنی ہے۔ جب اس کا کام شروع ہوا تو ہمارے پاس کل آٹھ روپے تھے، وہاں ایک مولوی صاحب پرانی روش کے تھے، انہوں نے پوچھا کہ مسجد کے لئے کتنے روپیہ جمع ہوئے۔ لوگوں نے آٹھ روپے، کہنے لگے، آٹھ روپے؟ اور مسجد کا کام شروع کرا دیا۔ انہوں نے بڑا تعجب کیا اور یہ کہا کہ جب تک دو ہزار روپے جمع نہ ہو، تعمیر کو ہاتھ نہ لگانا، آٹھ روپے سے بھی بھلا کہیں مسجد تیار ہوا کرتی ہے۔ مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے کہا، آپ نے اللہ میاں کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے۔ خدا کے پاس تو سارے خزانے ہیں اس کے یہاں روپے کی کیا کمی ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

میں نے کہا کہ تم بنیاد رکھو اور کسی کا کہنا مت مانو۔ تم اللہ کا نام لے کر کھداؤ، اللہ میاں ہی اس کو غیبی سامان سے بھر دیں گے۔ ان مولوی صاحب نے کہا کہ میاں لڑکے ہو کچھ سمجھتے نہیں، میں نے کہا کہ جب لڑکوں سے کام چل جائے تو بڈھوں کے بولنے کی ضرورت نہیں اور واقعی ان کے اعتبار سے ہم لڑکے تھے۔ جب یہ آٹھ روپے ختم ہو گئے اور روپیہ نہ رہا تو میں نے ناظم تعمیرات سے کہہ دیا کہ کسی سے چندہ مت مانگنا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ حال ہو گیا کہ میں بازار کسی کام کے لئے جا رہا ہوں اور لوگ پکار رہے ہیں کہ میاں فلاں صاحب ادھر آیئے، میں کہتا ہوں کہ بھائی مجھ کو جانا ہے وہ کہتے کہ جی ذرا ٹھہرو! تو پھر وہ خود آتے اور کوئی چار روپیہ دے جاتا، غرض لوگ بلا بلا کر روپیہ دیتے تھے۔ اس زمانہ میں بیگم بھوپال کے صاحب زادہ بیمار تھے، وہ اس قدر پریشان تھیں کہ ڈاک تک نہ دیکھتیں تھیں۔ اس حالت میں، میں نے ناظم تعمیرات سے کہہ دیا کہ تم ان کے پاس لکھ دو کہ یہاں ایک مسجد بن رہی ہے۔ ایک کار خیر ہے۔ اگر اس میں حصہ لینا چاہیں تو حصہ لے سکتی ہیں۔ میں آپ سے چندہ نہیں مانگتا، صرف اس لئے اطلاع کر دی کہ شاید علم ہونے پر پھر آپ کو خیال ہو کہ مجھے کیوں نہ اطلاع کی گئی۔ اس کار خیر میں مجھے کیوں نہ شریک کیا گیا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ مسجد میں کتنے روپے خرچ ہوں گے، تخمینہ کر کے اطلاع کیجئے۔ ہمارے دوستوں نے کہا کہ کچھ زیادہ لکھ دیجئے، کیوں کہ خرچ اگر زیادہ ہو گیا تو زیادہ روپے کی ضرورت ہو گی۔ اور تعمیر کا کام ایسا ہی ہے کہ کبھی بڑھ جاتا ہے۔ میں نے کہا نہیں جی۔ اللہ میاں کے یہاں کچھ کمی نہیں ہے اور بعد میں ضرورت ہو گی تو وہ پھر انتظام کر دیں گے۔ غرض ان کو صحیح تخمینہ کی بلا کم وبیش اطلاع کی گئی۔ روپیہ آ گیا اتفاق سے کام بڑھ گیا اور روپے کی اور ضرورت پڑی۔ میں نے ناظم سے کہا کہ ایک خط اور لکھ دو بیگم صاحبہ کو، اور اس کا مضمون یہ ہو کہ جو روپیہ آپ نے بھیجا تھا وہ تو سب لگ گیا اور اتفاق سے کام بڑھ گیا۔ آپ کو اطلاع اس لئے نہیں کی جاتی ہے۔ کہ آپ خواہ مخواہ اس کی تکمیل ہی کریں بلکہ اس لئے کی جاتی ہے کہ بعد میں آپ کو ناگواری نہ ہو کہ مجھے کیوں نہیں اطلاع کی۔ آپ سے چندہ کی درخواست نہیں کی جاتی۔

آپ اگر آزادی سے دینا چاہتیں دے دیں۔ چنانچہ خط پہنچتے ہی فوراً روپیہ آ گیا۔

ایک اور واقعہ

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر لوگ خالص نیت کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں تو اپنے آپ ہی لوگ آ آ کر خدمت کریں گے۔

کانپور میں جب میں پڑھاتا تھا، تو مدرسہ کی مسجد میں طلبہ کے لئے ایک حوض تیار کرانے کی ضرورت ہوئی۔ روپیہ تھا نہیں اور کسی سے چندہ مانگنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ بس میں نے مدرسہ والوں سے کہا کہ تم اپنے اختیار کا کام کر دو۔ اور ایک جگہ متعین کر کے گڑھا کھدوا دیا گیا اور چھوڑ دیا گیا، لوگ دریافت کرتے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ حوض ہے۔ جتنی ہماری اندر طاقت تھی۔ اور جتنا سامان ہمارے پاس تھا۔ اتنا ہم نے کر لیا۔ آگے اللہ تعالیٰ مالک ہے۔ دو ایک دن تو یونہی پڑا رہا۔ اس کے بعد ایک دن محلّہ میں ایک بڑی بی نے مجھ کو اپنے گھر بلایا۔ جو پہلے بھی کبھی بلایا کرتی تھی۔ اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ ایک حوض تجویز ہوا ہے۔ اس کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟ میں نے کہا، جتنا کام میرے اختیار میں تھا اتنا کرا دیا۔ کہنے لگی، کیا تخمینہ ہے؟ میں نے کہا۔ پانچ سو روپیہ، کہنے لگی، میں دوں گی۔ میرے سوا کسی اور کی رقم نہ لگے۔ اب اور لوگ آنے شروع ہو گئے۔ کہ صاحب! ہمارے پانچ سو روپیہ قبول فرمائیے۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک بی بی نے ایسا کہہ دیا ہے۔ ہاں! ایک سائباں کی تجویز ہے۔ کہ اس کے اوپر ڈالا جائے۔ کہنے لگے۔ تو پھر ہم اس کے لئے دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح حوض بھی تیار اور سائباں بھی تیار ہو گیا۔ تھوڑا سا کام شروع کر دینے سے کام قابو میں رہتا ہے۔ (احکام المسجد از افادات تھانویؒ: ۸۶،۸۵)

ایک دلچسپ استدلال

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شب قدر معلوم کرنے کے لئے طاق اعداد میں غور کیا تو سات کا عدد اس کے لئے زیادہ موزوں نظر آیا۔ جب سات کے عدد میں غور کیا تو معلوم ہوا: کہ آسمان بھی سات ہیں اور زمینیں بھی سات اور دریا بھی سات، صفا اور مروہ کے درمیان بھی سات ہی مرتبہ سعی کی جاتی ہے، کعبہ کا طواف بھی سات ہی مرتبہ کرتے ہیں، سنگریزے بھی سات ہی پھینکے جاتے ہیں۔ آدمی کی تخلیق (پیدائش) بھی سات اعضاء سے ہوئی ہے۔ آدمی کے چہرے میں بھی سات ہی سوراخ بنائے گئے ہیں یعنی دو کان، دو نتھنے، دو آنکھیں اور ایک منہ۔ قرآن کی قرأت بھی سات ہیں، سجدہ بھی سات ہی اعضاء سے کیا جاتا ہے، دوزخ کے دروازے بھی سات ہیں، دوزخ کے نام بھی سات ہیں، دوزخ کے طبقے بھی سات ہیں، اصحاب کہف بھی سات ہیں، عاد کی قوم بھی سات راتوں میں ہوا سے ہلاک ہوئی، حضرت یوسف علیہ السلام بھی سات برس جیل خانے میں رہے۔ سورۃ یوسف میں جن گایوں کا ذکر آیا وہ بھی سات تھیں، قحط بھی سات سال رہا، سات ہی سال فراخی اور کشادگی رہی (فرعون کے خواب اور حضرت یوسف علیہ السلام کی بیان کردہ تعبیر کی

طرف اشارہ ہے) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حج کے بعد سات روزے رکھو۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ کتا برتن میں منہ ڈال دے تو سات دفعہ اسے دھونا چاہئے، پہلی مرتبہ مٹی سے پھر پانی سے۔ حضرت ایوب علیہ السلام مصیبت میں سات برس گرفتار رہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میری امت کے شہید بھی سات طرح کے ہیں: (۱) وہ جو خدا کی راہ میں مارے گئے۔ (۲) وہ جو طاعون کی بیماری میں مریں۔ (۳) جو سل کی بیماری سے مریں۔ (۴) جو پانی میں ڈوب کر مریں۔ (۵) جو آگ میں جل جانے سے مریں۔ (۶) جو اسہال یعنی دستوں کی بیماری سے مریں۔ (۷) اور وہ عورت جو نفاس کی حالت میں مر جائے۔"

اللہ تعالیٰ نے قسم بھی مسلسل سات چیزوں کی کھائی ہے: (۱) آفتاب (۲) چاشت کا وقت (۳) چاند (۴) دن (۵) رات (۶) آسمان (۷) اور جس نے آسمان و زمین کو بنایا (یہ کل سات ہوئے)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قد بھی سات گز لمبا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی سات گز لمبا تھا۔

دلچسپ نتیجہ: اس بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے سات کے حساب سے بنایا ہے اگر شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہے تو اوپر کے بیان سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ شب قدر غالباً ستائیسویں شب کو ہوگی۔

بے استعدادوں کیساتھ دماغ تھکانا فضول ہے

میرے پاس ایک مرتبہ ایک موذن آیا کہنے لگا کہ قرآن شریف سے مسح رجل بھی ثابت ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ لاکر دکھایا وہ ترجمہ اگرچہ صحیح اور بامحاورہ ہے لیکن اسکو بھی خود دیکھ کر سمجھنا مشکل ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ "دھوا پنے منہ اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو" اس کے بعد ہے "وارجلکم" اس کا عطف ہے "ایدیکم" پر اور وہ معمول ہے اغسلوا کا۔ ترجمہ میں یہ لکھا تھا "اور پیروں کو" آپ کو بوجہ صرف ونحو نہ جاننے کے یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ یہ کس کے ساتھ متصل ہے آپ نے اس کو قریب کے ساتھ متصل کیا اور ظاہر ہے کہ جو شخص صرف ونحو سے واقف نہ ہوگا وہ قریب ہی کے ساتھ متصل کریگا اور جاننے والا یہ دیکھ لے گا کہ "ارجلکم" ہے منصوب، لہٰذا مجرور کے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ قراءت بھی دوسری لی جائے اس وقت دوسرے قواعد سے اس عطف کا پتہ چلے گا۔ مجھ کو سخت پریشانی ہوئی کہ اسکو کیونکر سمجھاؤں اور کیونکر کہوں اس کا عطف "ایدیکم" ہے۔ کیونکہ یہ عطف ہی کو نہیں جانتا اس کے ساتھ دماغ تھکانا فضول ہے کیونکہ یہ اس کی استعداد سے بالکل باہر ہے یہ بھی آجکل مرض ہو گیا ہے۔ کہ لوگ اپنی استعداد سے زیادہ سوال کرتے ہیں۔ (امثال عبرت ۱۵۶)

ایک غیر مقلد کی کم علمی کی مزاحیہ حکایت

ایک شخص نے ایک غیر مقلد سے پوچھا کہ یہ حنفی فاسق ہیں۔ سائل نے کہا کہ یہ لوگ امام کے ساتھ سورۂ فاتحہ کو قصداً ترک کرتے ہیں۔ کیوں کہ حدیث میں ہے "لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب" بلا فاتحہ

کے نماز نہیں ہوتی اور تارک صلوۃ کے متعلق حدیث میں ہے۔ ''من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر'' تو اس حساب سے تو ان کو کافر ہونا چاہیے۔ کہنے لگے اس میں تاویل ہوسکتی ہے۔ سائل نے کہا ایسی تاویل تو'' لاصلوۃ الابفاتحۃ الکتاب ''میں بھی ہوسکتی ہے مگر آپ تو اس میں کوئی تاویل نہیں کرتے تو پھر'' فقد کفر ''میں کیوں کرتے ہیں؟ اور ان کو فاسق کیسے کہتے ہیں؟ اس کو اس کا جواب نہیں بن پڑا۔

ف یہ تمام خرابی بے اصولی کی ہے۔ علم بے اصول ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہاں نہ علم ہوتا ہے نہ سمجھ نہ تدبر۔ جو جی میں آیا کہہ دیا۔ (امثال عبرت ۳۰۹)

یک من علم را دہ من عقل مے باید

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرفرماتے ہیں کہ ایک طالب علم ہمارے ہم سبق تھے۔ عورتوں نے ان کے وطن میں ان سے وعظ کے لئے کہا۔ وعظ میں آپ نے کہا کہ عورتوں کو بھی ختنہ کرانی چاہیئے، یہ سن کر عورتیں بہت بگڑیں اور ان کو خوب گالیاں سنائیں کہ اپنی ماں کی کرا، اپنی بہن کی کرا، انہیں پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا۔ یہ خبر دیوبند پہنچی تو میں نے کہا کہ تمہیں یہ کیا شامت سوار ہوگئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اجی میں نے تو یہ سوچا کہ معمولی مسئلے مسائل کیا بیان کروں، وہ تو معلوم ہی ہیں وہ مسئلہ بتاؤں کہ کسی کو نہ معلوم ہو، میں نے کہا کہ بھلے مانس یہ فعل کون سا سنت ہے۔ فقہاء نے بھی لکھا ہے کہ یہ سنت نہیں ہے پھر ایک غیر ضروری مسئلہ کو بیان کر کے خواہ مخواہ کیوں برائی مول لی یہ کون سی عقلمندی تھی کہ عورتوں میں ایک ایسا مسئلہ بیان کرنے بیٹھ گئے۔

ف: مقولہ ہے کہ ''یک من علم را دہ من عقل مے باید''

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مستورات میں، میں نے وعظ اور آیت تلاوت کی اس میں جب ﴿وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ﴾ پر پہنچا تو میں بڑا پریشان ہوا کہ اس کا ترجمہ کیا کروں۔ معاً اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ اپنی آبرو کی حفاظت کرنے والے یا ناموس کہہ دیا جاوے یہ اور بھی اچھا ہے۔ بعضے واعظوں کو دیکھا غضب کرتے ہیں۔ صاف صاف کہہ ڈالتے ہیں۔ (حسن العزیز)

جاہل حافظ کی حکایت

ایک جاہل نے کسی مولوی سے نکاح پڑھانے کے لئے کہا تھا۔ انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مرد وعورت میں باہم قرابت محرمیت ہے۔ مولوی صاحب نے کہا، نکاح نہیں ہوسکتا اس کی خوشامد کی، مگر مولوی صاحب کیسے مانتے۔ اس نے ایک مؤذن سے پڑھوالیا اور صبح آ کر مولوی صاحب سے کہا کہ واہ تم تو بڑے عالم مشہور ہو، تو تم سے ایک نکاح نہ ہوسکا۔ دیکھو مؤذن نے پڑھ دیا۔

ف: یہ علماء کی غلطی ہے کہ وہ لوگوں کی دل شکنی کا خیال کرتے ہیں۔ اور جواب دینے بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ایسی وسعت اخلاق میں لوگوں کی دین شکنی ہے جو دل شکنی سے اشد ہے۔ (امثال

(عبرت ۳۴۸)

غیر شرعی رسومات

۱) بلند شہر میں ایک رئیس زادے کے باپ کا انتقال ہو گیا، ان کے اعزہ چاروں طرف سے جمع ہو گئے اور ایک بارات سی آ گئی، رئیس زادے نے سب کے لئے عمدہ کھانے پکوائے جب کھانا چنا گیا تو اس نے مہمانوں سے کہا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ پہلے میری بات سن لیجئے پھر کھانا شروع کیجئے گا۔ سب لوگ ہاتھ روک کر بیٹھ گئے اس نے سب کو مخاطب کرکے کہا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اس وقت مجھ پر کیسا سانحہ گذر رہا ہے۔ اسوقت میرے والد ماجد کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کیسا صدمہ ہوتا ہے۔ تو کیا یہی انصاف ہے کہ مجھ پر تو یہ مصیبت گذرے اور تم آستین چڑھائے مرغن کھانا کھانے کو تیار ہو گئے۔ کیوں صاحب یہی ہمدردی ہے؟ بس مجھ کو جو کہنا تھا کہہ چکا، اب کھانا شروع کیجئے۔ بھلا اب کون کھاتا جب سر پر جوتیاں پہلے ہی پڑ گئیں، سب لوگ دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور رئیس زادے نے غربا کو بلا بھیجا کہ بیٹھو کھاؤ۔ تمہارے کھانے سے میرے باپ کی روح کو ثواب پہنچے گا اور یہ برادری کے کھاتے پیتے لوگ آستین چڑھا کر بیٹھ گئے ان کے کھانے سے ان کو کیا ثواب ملتا اور میری رقم بھی برباد ہو جاتی۔ غرض غریبوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دعا دیتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے بعد برادری کے چند معزز لوگ اسطرف جا کر بیٹھے اور غمی کی رسوم میں مشورہ کرنے لگے۔ سب نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ واقعی یہ رسمیں بالکل عقل کے خلاف ہیں اور شریعت کے خلاف تو ہیں ہی، ان سب کو یک لخت موقوف کر دینا چاہیئے۔ کسی نے ان رئیس زادے سے کہا کہ میاں! جب تم کو کھلانا منظور نہ تھا تو پہلے ہی سے یہ بات کہدی ہوتی۔ اتنا انتظام ہی تم نے کیوں کیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ اگر میں یہ انتظام نہ کرتا اور کھانا تیار کرنے سے پہلے یہ بات کہتا تو لوگ یوں سمجھتے کہ اپنی بچت کے لئے یہ بات کی ہے۔ اب کسی کا یہ منہ نہیں رہا کہ مجھے یہ الزام دے سکے۔ کیونکہ میں نے کھانے ایسے عمدہ تیار کرادیئے تھے۔

۲) قصبہ کیرانہ کے رہنے والے ایک حکیم صاحب فرماتے تھے۔ کہ میرے پاس ایک گوجر آیا، اس کا باپ بیمار ہو رہا تھا کہنے لگا کہ حکیم صاحب جس طرح ہو سکے اب کی مرتبہ اس کو اچھا ہی کر دیجئے کیونکہ قحط بہت ہو رہا ہے اگر بڈھا مر گیا تو مرنے کا تو ایسا غم نہیں مگر چاول بہت مہنگے ہیں۔ (غیر شرعی رسومات کو کس طرح پورا کروں گا) ان کو کس طرح کھلاؤں گا۔

ف: دین میں تنگی نہیں ہے لیکن ہم لوگوں نے خود غیر شرعی رسومات داخل کر کے شریعت کو مشکل بنا دیا ہے جیسے مرگ کی رسومات، تیجہ، نواں، چالیسواں وغیرہ اس کی شریعت میں کچھ اصل نہیں اپنی طرف سے بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ مالی کمزوری کی وجہ سے جب ان غیر شرعی رسوم پر عمل نہیں ہوتا تو شریعت پر الزام لگاتے ہیں کہ شریعت پر چلنا مشکل ہے۔ (امثال عبرت)

شیطان کی جوتوں کیساتھ پٹائی کرنا

ایک شخص جب حج کو گیا تو کنکریاں مارتے وقت ایک لمبا جوتا لے کر ان تین پتھروں میں سے ایک پتھر کو خوب پیٹ رہا تھا اور شیطان کو کہہ رہا تھا کہ کم بخت! فلاں دن تو نے مجھ سے یہ گناہ کرایا تھا اور فلاں رات کو تو نے مجھے زنا میں مبتلا کیا تھا اور چوری کرائی تھی۔

ف کئی شخص اپنی کم علمی کی وجہ سے ہر گناہ کی ذمہ داری شیطان ہی پر ڈالتے ہیں حالانکہ تمام گناہ شیطان ہی نہیں کراتا، نفس بھی برابر کا شریک ہے جس کو حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ فرماتے ہیں۔

شیطان و نفس دونوں ہیں دشمن تیرے مگر
دشمن وہ دور کا ہے یہ دشمن قریب کا
نفس و شیطان ہیں خنجر در بغل
وار ہونے کو ہے اے غافل سنبھل

(امثال عبرت ۳۷۱)

معقولی طالب علم کی حکایت

کسی معقولی طالب علم سے مسئلہ پوچھا گیا۔ کہ گلہری کنویں میں گری پڑی ہے پاک کرنے کے لئے کتنے ڈول نکالے جاویں۔ بے چارے نری معقول جانتے تھے فقہ کی خبر نہ تھی اب آپ نے اپنا جہل چھپانے کے لئے اس سے پوچھا کہ گلہری جو گری ہے دو حال سے خالی نہیں یا خود گری یا کسی نے گرادی۔ پھر اگر خود گری ہے تو دو حال سے خالی نہیں ہے دوڑ کے گری یا آہستہ، اگر کسی نے گرائی ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا آدمی نے گرائی یا جانور نے، اور ہر ایک کا جدا حکم ہے تو اب بتلاؤ کیا صورت ہے سائل نے پریشان ہو کر کہا کہ صاحب اس کی خبر نہیں، کہنے لگے پھر کیا جواب دیں۔

ف : اور یہ جھوٹ بولا کہ ہر شق کا جدا حکم ہے۔ جدا حکم کیا ہوتا سب کا حکم ایک ہی ہے وہ بے چارہ گھبرا کے چل دیا ان کی منطق کا کیا جواب دیتا۔ تو یہ محض ترکیبیں ہیں اور یہ بھی بعضوں کو آتی ہیں اور بعضوں کو نہیں آتی وہ کیا کرے گا کہ غلط سلط مسئلہ بتادے گا۔

امامت کے لئے دو اماموں کے جھگڑنے کی مزاحیہ حکایت

دو شخص عیدگاہ کی امامت کے مدعی تھے دونوں جا کے مصلے پر کھڑے ہو گئے بعض مقتدی ایک کی طرف تھے۔ اور بعض دوسرے کی طرف گویا کچھ ان کے ووٹ دینے والے تھے اور کچھ ان کے۔ غرض تمام صفوف میں دونوں کے مقتدین کا مجمع خلط ملط تھا ایک نے ''اللہ اکبر'' کہا تو دوسرے امام کے مقتدی یہ سمجھے کہ ہمارا کہہ رہا ہے۔ اور جب دوسرے امام نے کہا ''اللہ اکبر'' تو پہلے کے مقتدی سمجھے ہمارا امام کہہ رہا ہے غرض بڑی پریشانی ہر جزو میں رہی قومہ، رکوع، سجدہ، قعدہ سب میں یہی لطف رہا۔ ایک امام نے ''الحمد'' ختم

کرلی تو اب دوسرے کا انتظار ہے کہ یہ سورۃ چھوٹی پڑھتا ہے۔ یا بڑی اگر بڑی پڑھے گا، میں چھوٹی شروع کردوں گا کہ پہلے رکوع میں جا ملوں اور اگر چھوٹی سے چھوٹی شروع کرے گا تو میں جلدی جلدی ختم کرکے رکوع کردوں گا، بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رکوع میں پہنچا تو دوسرے کے بعض مقتدی غلطی سے رکوع میں جھک گئے تو پاس والا اس کے کہنی مارتا ہے کہ یہ ہمارا امام نہیں، وہ بے چارہ پھر کھڑا ہو گیا۔

ف: جھگڑے کا کسی جگہ اگر امکان بھی نہ ہو تو بدخصلت انسان وہاں بھی جھگڑا پیدا کرلیتا ہے تو دیکھئے یہاں ان لوگوں نے نماز میں بھی جدال (جھگڑا) کھڑا کرلیا۔ (الدعوۃ الی اللہ ۱۹)

ایک قاری کے شاگرد کی مزاحیہ حکایت

ایک قاری صاحب نے اپنے شاگردوں کو حکم کر رکھا تھا۔ کہ ہر بات قرأت سے کیا کرو۔ ایک دفعہ حقہ پیتے ہوئے قاری صاحب کے عمامہ پر چنگاری گر پڑی شاگرد نے قاری صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم "قرأت کے ساتھ پڑھ کر نہایت ترتیل سے کہا جناب قاری صاحب، جناب قاری صاحب!" آپ کے عمامہ شریف پر آگ کی ایک چنگاری گر پڑی ہے"۔ اور ہر جگہ خوب مد کھینچا اتنی دیر میں عمامہ کی انگل جل گیا۔

ف: کئی قاریوں کو فن تجوید پر اس قدر ناز ہوتا ہے۔ کہ عامی شخص کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (امثال عبرت:۴۰۲ بحوالہ التحصیل والتسہیل)

ٹی وی اور ڈیجیٹل تصویر کے بارے میں شرعی حکم

مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا اجلاس مورخہ ۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ بمطابق یکم مئی ۲۰۰۶ء بروز دوشنبہ جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴ میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس الیکٹرونک میڈیا کے استعمال کے شرعی احکام پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔ جس میں اب تک اس موضوع پر ہونے والی تحقیق اور شرکاء مجلس کی طرف سے تیار کئے گئے مقالات کا جائزہ لیا گیا (جو انشاء اللہ مجلس کی طرف سے ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوں گے) اور شرکاء مجلس نے مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کیں۔

۱)...... ٹیلی ویژن کے مروجہ پروگراموں کی اکثریت بحالات موجودہ ایسی ہے جس میں بے حیائی، بے پردگی، فحاشی، عریانی اور دین بیزاری کا دور دورہ ہے۔ اور اس کے نتیجے میں معاشرہ اخلاق باختگی، جرائم اور دہشت گردی کا جتنا شکار اس دور میں ہوا ہے، اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ اور کیبل کے ذریعے جس طرح دنیا کے ایک سرے سے نشر ہونے والے پروگرام دنیا کے دوسرے سرے پر دیکھے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مزید تباہی مچادی ہے اور کوئی ایسا پروگرام تلاش کرنا مشکل ہے جو کسی نہ کسی منکر شرعی سے خالی ہو اور اگر ٹیلی ویژن گھر میں موجود ہو، تو ان منکرات سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے مجلس تمام مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ بحالات مذکورہ ٹیلی ویژن اپنے گھروں میں رکھنے سے اجتناب کریں۔

۲) بحالات موجودہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اسلام، مسلمانوں، علماء دین اور دینی مراکز و مدارس پر جو حملے کئے جارہے ہیں اور ملحدانہ افکار، باطل نظریات اور تحریف دین کی جس طرح ترویج ہورہی ہے، ان کا ممکنہ جائز ذرائع سے دفاع بقدر استطاعت مسلمانوں، بالخصوص علماء کی ذمہ داری ہے۔

۳) جہاں تک اس فقہی سوال کا تعلق ہے کہ ٹی وی اسکرین یا ڈیجیٹل کیمروں پر نظر آنے والی جانداروں کی شکلیں تصویر کے حکم میں ہیں یا نہیں، تو اس کے بارے میں اس بات پر تمام شرکاء مجلس کا اتفاق ہے کہ ان شکلوں کا اگر پرنٹ لے لیا جائے یا ان کو کسی بھی چیز پر پائیدار طریقہ سے نقش کرلیا جائے تو ان پر تصویر کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

۴) جب ان شکلوں کا پرنٹ نہ لیا جائے یا انہیں کسی اور طریقے سے پائیدار طریقہ پر نقش نہ کیا جائے، اس وقت تک ان پر تصویر کے احکام جاری کرنے میں شرکاء مجلس کے درمیان اختلاف رائے ہے اور اس سلسلے میں بنیادی طور پر تین مختلف آراء سامنے آئی ہیں:۔

(الف)۔ایک رائے یہ ہے کہ چونکہ عرفاً اس صورت میں بھی انہیں تصویر سمجھا جاتا ہے، اس لئے ان پر بھی تصویر کے احکام جاری ہوں گے، اور اگر ان میں کوئی اور منکر شرعی نہ ہو، تب بھی وہ صرف تصویر ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں۔

(ب)۔دوسری رائے یہ ہے کہ یہ شکلیں تصویر کے حکم میں داخل تو ہیں لیکن مسئلہ مجتہد فیہ ہے اس لئے حاجت عامہ کی بنیاد پر اور بالخصوص جہاد اور دفاع عن الاسلام کی وقتی ضرورت کے تحت ان کے استعمال کی گنجائش ہے۔

(ج)۔تیسری رائے یہ ہے کہ یہ شکلیں جب تک کسی چیز پر پائیدار طریقہ سے نقش نہ ہو، وہ تصویر کے بجائے عکس سے قریب تر ہیں، لہٰذا اگر دوسرے منکرات و محظورات سے خالی ہوں تو محض تصویر ہونے کی بناء پر وہ ناجائز نہیں ہیں۔

تینوں آراء دلائل پر مبنی ہیں اور ہر رائے پر شرکاء کی طرف سے متعدد مفصل مقالات لکھے گئے ہیں جن کی تعداد تقریباً ۲۹ ہے، یہ مقالات مجلس کی طرف سے الگ شائع کئے جائیں گے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ مورخہ ۲۷ تا ۲۹/ اپریل ۲۰۰۵ء کو جمعیت علماء ہند کی طرف سے حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فقہی اجتماع اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بلایا تھا، اس کی روئیداد اور قرارداد سے واضح ہوتا ہے کہ اس اجتماع میں بھی کم و بیش انہی تین مختلف آراء کا اظہار کیا گیا تھا۔

(یہ روئیداد ماہنامہ البلاغ کے شمارہ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ مطابق فروری ۲۰۰۶ء میں شائع ہوچکی ہے)

۵) جو دارالافتاء مجلس سے وابستہ ہیں، وہ دیانۃً مذکورہ تین آراء میں سے جس کو حق سمجھیں، اس کے مطابق فتویٰ دیں، مگر چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اس لئے دوسری آراء کا بھی احترام کریں، اور ان کو تنقیص و ملامت کا نشانہ نہ بنائیں۔

۲) جو علماء مذکورہ بالا تین آراء میں سے دوسری یا تیسری رائے کو "فیما بینھم و بین اللہ" درست سمجھ کر دین کے دفاع یا اس کی اشاعت کی خاطر الیکٹرانک میڈیا کی کسی ایسے پروگرام میں آتے ہیں جو دوسرے منکرات سے خالی ہو تو انہیں مخالف رائے رکھنے والے بھی معذور سمجھیں اور ان پر اعتراض نہ کیا جائے۔

آخر میں مجلس اس نکتے کو دوبارہ پوری اہمیت سے ذکر کرنا چاہتی ہے۔ کہ ڈیجیٹل تصویروں کے بارے میں مذکورہ بالا اختلاف رائے ایک علمی اور نظریاتی مسئلہ سے متعلق ہے، جہاں تک ٹیلی ویژن کے موجودہ پروگراموں کی اکثریت کا تعلق ہے، وہ کسی اختلاف کے بغیر بحیثیت مجموعی بہت سے منکرات شرعیہ پر مشتمل ہیں، جنہوں نے معاشرے میں فساد برپا کیا ہوا ہے، اس لئے مسلمانوں سے مجلس اپیل کرتی ہے کہ بحالت موجودہ، ٹی وی، اپنے گھر میں رکھنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس اجلاس میں درجہ ذیل مدارس دینیہ کے ممتاز مفتیان کرام حضرات نے شرکت فرمائی اور انہوں نے مندرجہ بالا قراردادوں سے اتفاق کیا۔

۱) جامعہ دارالعلوم کراچی
۲) جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
۳) جامعہ اشرفیہ لاہور
۴) دارالافتاء والارشاد کراچی
۵) جامعہ فاروقیہ کراچی
۶) جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
۷) جامعہ اشرف المدارس کراچی
۸) جامعہ [illegible]
۹) جامعہ حمادیہ کراچی
۱۰) دارالتربیۃ الاسلامیۃ ([illegible])
۱۱) مدرسہ عثمانیہ بہادر آباد کراچی (ماہنامہ البلاغ کراچی جمادی الاخری ۱۴۲۸ھ و ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ)

نصرانی کا زکوٰۃ دینا

حدیث میں ہے "حصنوا اموالکم بالزکوۃ" (ادائے زکوٰۃ سے اپنے مالوں کی حفاظت کرو) یعنی زکوٰۃ دینے والے کے مال کو اللہ تعالیٰ تمام آفتوں سے بچاتا ہے۔ یہ حدیث سن کر ایک نصرانی نے اپنے مال کی زکوٰۃ دی۔ لوگوں نے کہا تھا کہ تمہارے مذہب میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس نے کہا: میں محمد ﷺ کو آزماتا ہوں کیونکہ میرا مال تجارت میں لگا ہوا ہے۔ اور راہ خطرناک ہے، میں نے اپنے مال کی زکوٰۃ دی ہے اگر میرا مال صحیح وسلامت مجھ تک پہنچا تو خیر ورنہ تلوار کے زور سے اپنا مال ان سے لے لوں گا۔ اس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ قافلہ لٹ گیا، وہ نصرانی مکہ کا رہنے والا تھا۔ یہ خبر سن کر اپنی قوم کو اس نے ساتھ لیا اور سب کے سب تلواریں کھینچ کر آپ ﷺ سے لڑنے کو مسجد نبوی ﷺ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی یہ سب راہ ہی میں تھے کہ ایک شریک کا خط پہنچا کہ میرا اونٹ لنگڑا ہو گیا تھا، اس مجبوری کی وجہ سے شب کو فلاں مقام پر رہ گیا اور سب قافلے والے آگے روانہ ہوئے، وہ لوٹے گئے، میں بچ گیا۔ نصرانی یہ خط پڑھ کر خوش ہوا، اور تلوار پھینک کر کہنے لگا، واقعی محمد ﷺ کا قول سچا ہے اور

حاضر خدمت ہو کر اسلام لایا اور تمام عمر زکوۃ دیتا رہا۔ (حوالہ مذکورہ بالا ۱۶۲)

رتی کے بدلے شہر

جو اپنے مال کی زکوۃ دیتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہر رتی کے بدلے ایک ایسا شہر جنت میں عطا فرمائیں گے جس میں ستر محل اور ہر محل میں ستر کوٹھڑیاں اور ہر کوٹھڑی میں ستر تخت اور ہر تخت پر ستر فرش اور ہر فرش کی موٹائی ستر گز کی ہے اور اس پر ایک بڑی آنکھوں والی حور بیٹھی ہے۔

تین آنکھیں

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخ تین آنکھوں پر حرام کر دی گئی ہے۔

۱) جو خدا کے خوف سے روئی ہو۔ ۲) جو اللہ کی راہ میں جاگی ہو۔ ۳) جو محرمات سے بچی ہو۔ (حوالہ مذکورہ بالا: ۱۶۳)

دین فروش پروفیسر سے ملاقات

حضرت نے فرمایا کہ ایک مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس مجلس میں ایک صاحب جن کی سیرت شرعی تھی نہ صورت۔ وہ علماء کرام پر برس رہے تھے کہ یہ مولوی فرقے بناتے ہیں، فرقہ پرست ہیں، دین فروش ہیں اور یہود کے احبار ورہبان کی طرح حرام خور ہیں، امامت اور دین کے کاموں کی تنخواہ لیتے ہیں جو بالکل حرام ہے اور جو امام تنخواہ لے اس کی اقتداء میں نماز بالکل نہیں ہوتی، یہ سب مولوی مشرک ہیں، دین سے دور ہیں، دوسروں کو دین سے دور کرتے ہیں، دین فروش یہودی ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں یہ واقعتاً قرآن وحدیث یا فقہ میں ہے یا آپ نے یہودی احبار ورہبان کی طرح خود ہی گھڑ لیا ہے؟ یہ تو واضح ہے کہ احبار ورہبان کے ایجنٹ تو آپ ہیں اور الزام لگا رہے ہیں علماء پر۔ آپ وہ آیت یا حدیث پیش کریں کہ تنخواہ دار امام کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ وہ کہنے لگا کہ کیا انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام نے نہیں فرمایا کہ "ہمارا اجر اللہ پر ہے" حضرت نے فرمایا کہ اگر کوئی ڈاکٹر کہے کہ میں دوا کے پیسے نہیں لیتا تو اس سے یہ بات کہاں سے ثابت ہوئی کہ جو دوا کے پیسے لے، وہ حرام لے رہا ہے۔ آپ یہ دکھائیں کہ کسی نبی نے یہ فرمایا ہو کہ جو امام تنخواہ لے اس کی اقتداء میں نماز جائز نہیں۔ کہنے لگا کہ یہ تو صاف طور پر کسی حدیث یا آیت میں نہیں ہے۔ البتہ یہ ہے کہ میری آیتوں کو نہ بیچو۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ آیت آپ نے کہاں سے پڑھی؟ اس نے کہا قرآن پاک میں ہے۔ حضرت نے پوچھا کہ وہ قرآن پاک آپ کو کہاں سے ملا؟ تو کہنے لگا کہ میں نے خود دکان سے خریدا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ایک آیت

کے بیچنے سے بھی منع فرمایا ہے مگر ملک میں پورا قرآن پاک بیچا اور خریدا جا رہا ہے، کیا یہ اس آیت کے خلاف نہیں؟ اور اس خریدے ہوئے قرآن پاک پر تلاوت کیسے جائز ہے؟ کیا وہ تمام ادارے جو قرآن پاک کی نشر و اشاعت کرتے ہیں اور قرآن پاک فروخت کر رہے ہیں وہ سب دین فروش اور یہود کے احبار و رہبان ہیں اور آپ ان سے خرید کر پڑھ رہے ہیں تو گویا ان دین فروشوں سے تعاون کر رہے ہیں۔ اب وہ صاحب خاموش ہو گئے۔

حضرت نے پوچھا کہ آپ کا کیا شغل ہے؟ کہنے لگا کہ میں ایک کالج میں اسلامیات کا پروفیسر ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ اسلامیات پڑھا کر تنخواہ تو نہیں لیتے؟ جھجک کر بولا: کیوں نہیں! تنخواہ تو لیتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تو آپ خود ہی دین فروش نکلے۔ آپ کے فتویٰ کے مطابق تو آپ بھی یہود کے احبار و رہبان میں سے ہیں اور دنیا بھر میں اسلامیات کے پروفیسر سب دین فروش ہوئے۔ پھر حضرت نے پوچھا کہ جناب کی تنخواہ کتنی ہے؟ تو کہنے لگا کہ صرف اٹھارہ ہزار روپے۔ حضرت نے فرمایا کہ جو بے چارہ امام صرف ایک ہزار روپے تنخواہ لیتا ہے اس کو آپ دین فروش اور حرام خور کہتے ہیں اور جو اٹھارہ ہزار تنخواہ لے تو وہ یقیناً بڑا دین فروش اور حرام خور ہوا۔ حضرت نے پوچھا کہ ہر اسلامی حکومت میں اسلامی تحقیقاتی ادارے ہیں جن میں دینی مسائل کی تحقیقات ہوتی ہیں اور ان میں کام کرنے والے محققین لاکھوں روپے حکومت سے معاوضہ وصول کرتے ہیں، کیا یہ سب ادارے اور حکومتیں دین فروش ہیں اور یہودی مشن کے کل پرزے ہیں؟ کہنے لگا کہ نہیں، وہ دین فروش تو نہیں البتہ وقت کی پابندی کی تنخواہ لیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا تو ائمہ مساجد اور معلمین قرآن کی متعلق بھی یہی مان لیں۔ کہنے لگا: نہیں وہ تو نماز کی مزدوری لیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جب امام مسجد کسی دوسری جگہ کام کے سلسلے میں جاتا ہے تو وہ وہاں نماز کے بعد کھڑا ہو کر لوگوں سے نماز کی مزدوری طلب کرتا ہے کہ میں نے نماز پڑھی ہے لہٰذا مجھے ایک سو روپیہ مزدوری دے دو۔ کہنے لگا: نہیں۔ حضرت نے فرمایا: تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز کی تنخواہ نہیں لیتا بلکہ وقت کی پابندی کی تنخواہ لیتا ہے۔ (علمی معرکے اور مجلسی لطیفے ۱۰۳)

گالی کے بدلے گالی دینا صحیح نہیں

درس کی حالت میں ایک دن ایک آدمی نے امام اعظم صاحبؒ کو گالی دی اور نامناسب الفاظ ستعمال کیے۔ امام صاحبؒ کے شاگرد اس کو کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ امام صاحبؒ نے منع فرمایا اور خود بھی جواب نہ دیا۔ درس سے فراغت کے بعد جب آپ گھر تشریف لے جانے لگے تو یہ جاہل آدمی بھی پیچھے آتا رہا اور گالیاں دیتا رہا۔ جب آپکا گھر قریب آیا تو آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے اور اس آدمی کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ میرے گھر کا دروازہ ہے۔ اگر آپ کے دل میں کچھ باقی ہو تو اس کو پورا کر لیجئے۔ کہیں آپ کے دل میں کچھ باقی نہ رہے۔

یہ سن کر وہ آدمی بہت شرمندہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور انہوں نے اس کے مقابلہ میں کیا جواب دیا اور نیز حضرت امام صاحبؒ تو دین وفقہ کے ماہر تھے اور ان کو اس طرف خوب توجہ تھی کہ گالی کے بدلے گالی دینا صحیح نہیں ہے۔

ف : محترم قارئین! یہ ہوتی ہے بردباری اور برداشت اور حوصلہ کہ نہ خود پریشان ہوئے اور نہ ہی پلٹ کر اس کو برا کہا لیکن اگر امام صاحبؒ بھی کچھ کہہ دیتے تو خود بھی پریشان ہوتے اور آدمی بھی مزید غصہ ہوتا اور جتنا اس نے کہا تھا اس سے زیادہ کہتا اور بے کار بات بڑھتی۔ مگر وہ اس طرح کے رویہ سے خود شرمندہ ہوا۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ اگر کسی کو ہم پر بلاوجہ غصہ آ رہا ہے جبکہ ہمارا کوئی قصور بھی نہیں تو ہم خود خاموشی اختیار کریں۔ اس سے جھگڑے میں اضافہ نہیں ہوگا۔ بڑوں نے فرمایا ہے کہ ایک چپ سو(۱۰۰) کو ہرا دیتی ہے۔ (ذوق وشوق حصہ دوم''علم وعمل''۴۷)

''حقیقت نکاح'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے حقیقت نکاح دریافت کی، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

۱)...... ''لزوم مهر ''یعنی مہر لازم ہو جاتا ہے۔ سائل نے سوال کیا'' ثم ماذا؟''یعنی پھر کیا؟ فرمایا:

۲)...... ''سرور شهر ''یعنی ایک ماہ کی خوشی۔ سائل نے پوچھا'' ثم ماذا؟'' پھر کیا؟ فرمایا:

۳)...... ''غموم دهر ''یعنی عمر کے غم۔ سائل نے پوچھا'' ثم ماذا؟'' پھر کیا؟ فرمایا:

۴)...... ''کسور ظهر ''یعنی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ سائل نے پوچھا'' ثم ماذا؟'' پھر کیا؟ فرمایا:

۵)...... ''نزول قبر ''یعنی قبر میں اترنا۔ (مخزن اخلاق:۲۲۵)

پگڑی کھول کر باندھنا

ایک مولوی صاحب نے مسجد میں وعظ کہتے ہوئے یہ بیان کیا کہ ''جو شخص آج کے روز جتنی مرتبہ اپنی پگڑی کھول کر باندھے گا، اسے اتنے ہی نفل پڑھنے کا ثواب ہوگا'' ایک کنجڑے کا لڑکا بھی موجود تھا، یہ سن کر فوراً اپنی پگڑی کھول کر باندھنے لگا۔ اس کے باپ نے خفا ہو کر کہا: کم بخت! یہ کیا کرتا ہے؟ پگڑی پھٹ جائے گی، تو کیا نفل سر پر باندھے گا؟ (مخزن اخلاق:۴۹۱)

نجاست غلیظہ میں خون سے مراد

نجاست غلیظہ میں خون سے مراد انسان یا کسی جانور کا بہنے والا خون ہے، جس سے بارہ خون مستثنیٰ ہیں:

(۱) غیر سیال خون (۲) شہید کا خون (۳) لاغر گوشت (۴) رگیں (۵) کلیجہ (۶) تلی (۷) دل (۸) مچھلی (۹) پسو (۱۰) مچھر (۱۱) کھٹمل (۱۲) جوں کا خون۔ اور پیشاب سے مراد انسان اور غیر ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب ہے۔ جن میں چمگادڑ اور چوہا مستثنیٰ ہے، کیونکہ چمگادڑ کا پیشاب پاک ہے۔ اور چوہے

سے احتراز نہایت مشکل ہے، اسی پر فتویٰ ہے۔ (معدن الحقائق ۱۲۹)

عوام کو مغالطہ سے بچانے کا اہتمام

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بنیہ پر ڈگری مع سود کے ہوگئی اور سود بھی کافی مقدار آٹھ سو روپیہ تھا مولانا نے سود کے لینے سے انکار فرمایا۔ سب جج جو ایک مولوی آدمی تھے انہوں نے مولانا سے کہا کہ درمختار میں تو یہ لکھا ہے۔ ''لاربی بین المسلم والحربی ''یعنی مسلمان اور حربی کافر کے درمیان سود کا معاملہ بحکم سود نہیں (تو اس کافر بنیہ کو آپ کیوں رقم چھوڑتے ہیں) حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ مسئلہ مجھے بھی یاد ہے مگر درمختار بغل میں دبائے کہاں کہاں پھرونگا لوگوں میں تو چرچا یہ ہوگا کہ شیخ محمد نے سود لیا۔ (حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات:۱۶۵)

چار عورتیں بغیر ارتداد وطلاق کے شوہر پر حرام

تین عورتیں ڈھائی سال کی عمر سے کم تھیں اور ایک عورت بڑی تھی اس نے تین چھوٹی عورتوں کو اپنا دودھ پلا دیا، تو چاروں عورتیں بغیر ارتداد وطلاق کے شوہر پر حرام ہوگئیں ''اذا تزوج الرجل صغیرۃ وکبیرۃ فارضعت الکبیرۃ الصغیرۃ حرمتا علی الزوج'' (ہدایہ۲/۳۳۳)

دو مردار جانور حلال ہیں

ایک مچھلی، دوسرا ٹڈی، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے۔ '' قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احلت لنا میتتان ودمان: المیتتان الحوت والجراد، والدمان الکبد والطحال''۔

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے لیے دو مردار جانور اور دو خون حلال کئے گئے ہیں۔ مردار جانور تو مچھلی اور ٹڈی ہیں، اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں۔ (احمد، ابن ماجہ، دارقطنی ،مشکوۃ شریف:۳۶۱)

پچیس باتیں

سونے والا پچیس باتوں میں جاگنے والے کے حکم میں ہے:

(۱) جبکہ روزہ دار سو رہا ہو، اور اس کے حلق میں پانی کا قطرہ چلا گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (۲) سونے کی حالت میں عورت سے کوئی ہمبستری کرے تو اس کا روزہ چلا جائیگا۔ (۳) احرام کی حالت میں سو رہا ہو اور کوئی اس کے بال مونڈ دے، تو کفارہ واجب ہوگا۔ (۴) احرام کی حالت میں عورت سو رہی ہو اور شوہر اس سے ہمبستری کرے تو عورت پر کفارہ لازم ہوگا۔ (۵) احرام باندھے ہوئے سو رہا تھا کہ اسی حالت میں کسی شکار پر گر گیا جس کے سبب وہ مر گیا تو کفارہ لازم ہوگا۔ (۶) احرام کی حالت میں کسی سواری پر سو رہا تھا کہ نویں ذی الحجہ کو سورج ڈھلنے کے بعد اور دسویں ذی الحجہ کو اجالا ہونے سے پہلے اس کی سواری کسی وقت میدان عرفات سے ہو کر گزر گئی تو اس نے حج پالیا۔ (۷) جبکہ شکار پر ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' کہہ کر تیر

پھینکا گیا اور وہ تیر کے زخم کے سبب کسی سونے والے کے پاس گر کر مر گیا تو حرام ہوگا جیسے کہ جاگنے والے کے پاس گر کر مرنے سے حرام ہوتا ہے جبکہ وہ ذبح پر قادر ہوتا ہے۔ (۸) سونے والا کسی کے سامان پر گر جائے جس کے سبب وہ ٹوٹ جائے تو ضمان واجب ہوگا۔ (۹) جبکہ باپ دیوار کے کنارے سو رہا ہو اور بیٹا سونے کی حالت میں، باپ کے اوپر چھت سے گر کر ہلاک ہو جائے۔ تو بعض فقہاء کے قول پر باپ وراثت سے محروم ہوگا اور یہی صحیح ہے۔ (۱۰) کسی سونے والے کو اٹھا کر دیوار کے نیچے کر دیا اس کے بعد دیوار گری اور وہ مر گیا تو دیوار کے نیچے کرنے والے پر ضمان لازم نہیں ہوگا۔ (۱۱) مرد اپنی بیوی کیساتھ ایسی جگہ پر تنہائی میں ہوا کہ جہاں کوئی اجنبی سو رہا تھا تو خلوت صحیحہ نہیں پائی گئی۔ (۱۲) مرد کسی گھر میں سو رہا تھا کہ اس کی بیوی وہاں آئی اور تھوڑی دیر ٹھہر کر چلی گئی۔ تو خلوت صحیحہ ثابت ہوگئی۔ (۱۳) عورت کسی گھر میں سو رہی تھی کہ اس کا شوہر وہاں آیا اور تھوڑی دیر بعد چلا گیا تو خلوت صحیحہ پائی گئی۔ (۱۴) عورت سو رہی تھی کہ ڈھائی سال سے کم عمر کا بچہ آیا اور اسکی پستان سے دودھ پی لیا تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ (۱۵) نمازی سو گیا اور اسی حالت میں اس نے کلام کیا تو اسکی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (۱۶) نمازی سو گیا اور حالت قیام میں اس نے قرأت کی تو وہ قرأت ایک روایت میں معتبر ہوگی۔ (۱۷) تیمم کرنے والے کی سواری ایسے پانی سے گزری کہ جس کا استعمال ممکن تھا اور وہ سو رہا تھا تو اس کا تیمم ٹوٹ گیا۔ (۱۸) سونے والے نے آیت سجدہ تلاوت کی، جسے کسی شخص نے سن لیا تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہوگا جیسے کہ جاگنے والے سے سننے پر واجب ہوتا ہے۔ (۱۹) یہ سونے والا جب بیدار ہوا تو اسے کسی شخص نے بتایا کہ تم نے سونے کی حالت میں آیت سجدہ تلاوت کی ہے تو بعض فقہاء کے نزدیک اس پر بھی سجدہ تلاوت واجب ہے۔ (۲۰) کسی شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا، پھر قسم کھانے والا اس کے پاس آیا جبکہ وہ سو رہا تھا تو اس نے کہا: اٹھ! مگر سونے والا اٹھا نہیں، تو بعض فقہاء کے قول پر اسکی قسم نہیں ٹوٹے گی لیکن صحیح یہ ہے کہ ٹوٹ جائیگی۔ (۲۱) عورت کو طلاق رجعی دی پھر عورت جبکہ سو رہی تھی، شوہر نے اسے شہوت کیساتھ چھوا، تو رجعت ہوگئی۔ (۲۲) طلاق رجعی دینے والا شوہر سو رہا تھا کہ عورت نے اس کا شہوت کیساتھ بوسہ لے لیا تو حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک مراجعت ہو جائے گی۔ (۲۳) مرد سو رہا تھا کہ اسی حالت میں اجنبی عورت نے مرد کے ذکر کو اپنی شرمگاہ میں داخل کر لیا اور مرد نے بیدار ہونے کے بعد عورت کے اس فعل کو جانا تو حرمت مصاہرت ثابت ہوگئی۔ (۲۴) عورت نے کسی سونے والے مرد کا شہوت کیساتھ بوسہ لیا تو حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی۔ (۲۵) جبکہ نماز میں سو جائے اور احتلام ہو تو غسل واجب ہوگا اور بناء نہیں کر سکتا۔ (عجائب الفقہ)

امام اعظم رحمہ اللہ کے فضائل میں دو پسندیدہ باتیں

بلخ کے مشہور حنفی امام خلف ابن ایوب جو خود بھی حد سے زیادہ محتاط تھے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر کر کے کہا کرتے تھے۔ ''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے خصائل و عادات میں ان کی یہ دو باتیں مجھے سب سے

زیادہ پسند آئیں، یعنی قضا کی خدمت انہوں نے جو نہ قبول کی، حالانکہ اس کے لئے انہیں طرح طرح کی ترغیبیں بھی دی گئیں اور دھمکیوں سے بھی ڈرائے گئے مار بھی کھائی ایک بات تو یہ اور دوسرا ان کا یہ خاص طریقہ کہ قرآن کی تفسیر میں انہوں نے حصہ نہیں لیا" (حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ۳۹۶)

تدفین کے لئے نماز جمعہ کا انتظار نہ کریں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ نماز فجر کے بعد بروز جمعہ اگر کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو قبل از جمعہ اس کو دفن کیا جائے یا بعد نماز جمعہ؟ فرمایا: کہ جلد سے جلد دفن کردینا چاہیے، جمعہ کے بعد کا انتظار نہ کیا جائے۔ عرض کیا اس وجہ سے دیر کرتے ہیں کہ نماز جمعہ کے بعد نمازی زیادہ ہونگے۔ فرمایا: مسئلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں بے چاروں کو خبر نہیں دیر کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ عرض کیا کہ یہ بھی سنا ہے کہ جمعہ کے روز جو مرجاتا ہے اس کا حساب قیامت تک فرشتے نہیں لیتے۔ فرمایا: اس حدیث کا محمل یہی ہے مگر یہ بھی یادرکھنے کی بات ہے کہ یہ یوم جمعہ کی فضیلت ہے نماز جمعہ سے قبل یا بعد کو کوئی دخل نہیں۔

(الافاضات الیومیہ ۴۵)

صلوۃ اللیل اور صلوۃ تہجد میں فرق

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا: کہ یہ دو نمازیں الگ الگ ہیں، ایک صلوۃ اللیل اور ایک تہجد کی۔ تو سونے سے قبل تو صلوۃ اللیل ہوگی گو وہ بھی قائم مقام تہجد کے ہوجاتی ہے اور سونے کے بعد تہجد ہوگا جس کے خاص فضائل آئے ہیں لغت میں تہجد کے معنی ہیں "القیام من النوم" (ملفوظات تھانوی)

عشر اور خراج کے مصرف میں فرق

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ خراج کا روپیہ رفاہ عام میں صرف ہوسکتا ہے مگر عشر کا یہ مصرف نہیں وہ زکوۃ کے مصرف میں صرف ہوسکتا ہے۔ (الافاضات الیومیہ ۲۲۱)

اعتکاف اور ریح کا مرض

فرمایا: کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ میں اعتکاف کیا کرتا ہوں اور اب مرض ہوگیا ہے ریح کا۔ ایسی صورت میں مسجد میں بیٹھنا یا رہنا، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ میں نے جواب میں لکھدیا ہے کہ اعتکاف نہ چھوڑو، اگرچہ ہوادار ہو۔ اس پر ایک مولوی صاحب نے تبسم آمیز لہجے میں عرض کیا کہ حضرت نہ معلوم وہ کیا سمجھیں گے؟ فرمایا: اس سے مراد مسجد کی کھڑکیاں بھی تو ہوسکتی ہیں جو کھلی ہوئی ہوں اسے ہوا آئے گی اور اعتکاف ہوگا۔

فرمایا کہ اس ہوا پر ایک حکایت یاد آئی یہاں پر ایک حافظ صاحب تھے بچوں کو پڑھایا کرتے

تھے۔ انہوں نے ایک قاعدہ مقرر کیا تھا۔ اور وہ اس وجہ سے کہ لڑکے وہیں پر بیٹھے بیٹھے بدبو پھیلاتے رہتے تھے، حافظ صاحب نے پریشان ہو کر حکم دیا کہ باہر جا کر ایسا کرو۔ اب اس کیلئے ضرورت ہوئی اصطلاح کی کہ کیا کہہ کر اجازت لیا کریں؟

حافظ صاحب نے یہ تجویز فرمایا کہ یہ کہہ کر اجازت لیا کرو کہ ''چڑیا چھوڑ آؤں'' بس بچوں کو ایک بات ہاتھ آ گئی، ہر وقت کا ان کے لئے شغل ہو گیا ایک ادھر سے اٹھتا ہے حافظ جی! "چڑیا چھوڑ آؤں" ایک ادھر سے اٹھتا ہے کہ حافظ جی! "چڑیا چھوڑ آؤں" حافظ جی بے چارے دق آ گئے، تب کہا کہ اب یہیں چھوڑ دیا کرو۔ (الافاضات الیومیۃ: ۱۹۶)

نماز میں غلط جگہ ''بسم اللہ'' پڑھنا

ایک صاحب نے خط میں دریافت کیا تھا کہ قیام میں ''**سبحانک اللھم**'' سے پہلے اور رکوع میں ''**سبحان ربی العظیم**'' سے پہلے اور قعدہ میں ''**التحیات**'' سے پہلے بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے؟ جواب لکھا گیا کہ ''بدعت ہے''۔ (ایضا: ۲۴۰)

مفقود الخبر میں حرج

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ایک شخص نے سوال کیا کہ مفقود الخبر کے مسئلہ میں تو بڑا حرج ہے۔ فرمایا: جی ہاں! جہاد میں اس سے بھی بڑا حرج ہے، گرمی کے روزوں میں بھی بڑا حرج ہے، سب کو قرآن سے نکال دو۔ حرج حرج لیے پھرتا ہے۔ (ایضا: ۳۷۰)

کان کا میل نکالنے سے متعلق ایک لطیفہ اور ایک مسئلہ

فرمایا کہ آج کان کا میل نکلوایا ہے کیونکہ کئی دن سے خفیف درد تھا گو کان کے اندر کوئی سلائی وغیرہ ڈالنا اس مقولہ کے خلاف ہے کہ "ناک میں انگلی" کان میں تنکا مت کر، مت کر، مت کر، آنکھ میں انجن، دانت میں منجن نت کر نت کر۔ جو شخص کان کا میل نکالنے آئے تھے ان کے والد کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے مجھے ایک فتویٰ لکھوا کر اپنی ایک بیاض میں رکھ لیا تھا وہ میل نکلوانے والوں کو دکھلا دیتے تھے کیونکہ عموماً یہ خیال ہے کہ کان کا میل نکلوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے حالانکہ نہیں ٹوٹتا اس لئے میں نے لکھ کر انہیں دیدیا تھا۔ (الافاضات الیومیۃ: ۱۵۸)

امام صاحبؒ کی تکفیر مسلم میں احتیاط اور ذہانت

فرمایا: کہ امام صاحب کی مجلس میں ایک شخص آیا۔ اور عرض کیا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ " کوئی کافر جہنم میں نہیں جائیگا" اس کا کیا حکم ہے؟ امام صاحب نے شاگردوں سے فرمایا کہ جواب دو، سب نے عرض کیا کہ یہ شخص کافر ہے اور نصوص کا مکذب ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تاویل کرو۔ عرض کیا

کہ ناممکن ہے۔ فرمایا یہ تاویل ہے کہ جہنم میں جانے کے وقت کوئی شخص اس وقت کافر نہ ہوگا یعنی لغوی کافر بلکہ مومن لغوی ہوگا گو شرعی کافر ہو کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف اس پر ہو جائے گا تو کسی امر واقعی کا اس وقت منکر نہ ہوگا۔

﴿ هذه جهنم التى يكذب بها المجرمون ﴾

(یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے تھے) بلکہ بعض جہنم کے انکشافات کا فر کو زائد ہونگے، مومن کو نہیں ہوں گے جو کہ برق خاطف (چمکنے والی بجلی) کی طرح گزر گیا۔ کیا ٹھکانہ ہے امام صاحب کی ذہانت اور احتیاط کا۔ (ایضا ۲۱۸)

کرایہ کے دو ضروری مسئلے

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اکثر کرایہ کے مکان میں درخت ہوتے ہیں امرود کے یا بیری وغیرہ کے ان کا پھل کرایہ دار کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا: کہ بلا اذن جائز نہیں۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا کہ گائے کو کوئی دودھ پینے کے لئے کرایہ پر لے لے، یہ جائز نہیں۔ اس پر فرمایا کہ فقہ کا باب بھی نہایت ہی اہم ہے۔ مجھ کو تو فتویٰ دیتے ہوئے بڑا ہی خوف معلوم ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو اس میں بڑی جرأت ہے۔ ذرا خوف نہیں کرتے۔ (ایضا ۱۷۴)

یمین لغو پر مواخذہ

تین چیزوں کے بارے میں یمین لغو پر مواخذہ ہے۔ طلاق، عتاق اور نذر، مثلاً کسی شخص نے قسم کھائی کہ میں اپنی بیوی کو فلاں تاریخ میں طلاق دے چکا ہوں اس خیال سے کہ واقعی اس نے طلاق دی ہے، حالانکہ حقیقت میں اس نے طلاق نہیں دی ہے تو اس یمین لغو پر مواخذہ ہے یعنی اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ "وقس عليه العتاق و النذر"۔ (الاشباہ والنظائر ۱۷۵)

وہ جانور جس کا گوشت کھانا جائز اور بیچنا ناجائز

جو شخص مالک نصاب نہیں ہے اس نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا تو وہ ایسا جانور ہے جسکا کھانا حلال ہے مگر اس کا بیچنا جائز نہیں۔ (الاشباہ والنظائر ۲۳)

مسواک کے دس فائدے

(۱) منہ کو صاف کرتی ہے۔ (۲) پروردگار کی رضامندی کا ذریعہ ہے۔ (۳) فرشتوں کو خوش کرنے والی ہے۔ (۴) نگاہ کو تیز کرتی ہے۔ (۵) کھانے کے ہضم میں مدد کرتی ہے۔ (۶) بلغم کو نکالتی ہے۔ (۷) نماز کا ثواب بڑھاتی ہے۔ (۸) مسوڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔ (۹) منہ کی بدبو زائل کرتی۔ اور (۱۰) خوشبو پیدا کرتی ہے۔ (تنبیہ الغافلین ۴۶۷)

''مسواک''، عظیم شخصیات کی نظر میں

۱۔ حضرت محمد ﷺ: ''مسواک کیا کرو، کیونکہ مسواک منہ کی پاکی ہے اور حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے، جبرائیل علیہ السلام مجھے ہمیشہ مسواک کی وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں مجھ پر اور میری امت پر فرض نہ ہو جائے اگر مجھے اپنی امت پر دشواری کا خوف نہ ہوتا تو میں ان پر مسواک فرض کر دیتا، اور میں اس قدر کثرت سے مسواک کرتا ہوں کہ مجھے اپنے منہ کے اگلے حصے کے چھل جانے کا خوف ہے''۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ: ''مسواک کرنا تمہارے لیے لازم ہے اس میں کوتاہی نہ کرو، بلکہ ہمیشہ استعمال کرتے رہو، کیونکہ اس میں حق تعالیٰ کی رضا ہے اور اس سے نماز کا ثواب ننانوے یا چار سو گنا بڑھ جاتا ہے''۔

۳۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ: ''مسواک کرنا نصف ایمان ہے اور وضو بھی''۔

۴۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا: ''مسواک موت کے سوا ہر مرض کی شفا ہے''۔

۵۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ: ''مسواک انسان کی فصاحت میں اضافہ کرتی ہے''۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ: ''مسواک (قوت) حافظہ کو بڑھا دیتی ہے اور بلغم کو دور کرتی ہے''۔

۷۔ عبدالعزیز بن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ: ''دو عادتیں مسلمان کی بہترین عادات میں سے ہیں ایک رات میں تہجد ادا کرنا، دوسرے مسواک پر مداومت کرنا''۔

۸۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ: ''اگر کسی شہر کے باشندے، مسواک کا انکار کریں تو امام ان سے مرتدین کی طرح قتال کرے''۔

۹۔ ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ: ''مسواک کی فضیلت پر سب کا اتفاق ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں اور سب کے نزدیک مسواک کر کے نماز پڑھنا بلا مسواک کی نماز سے افضل ہے''۔

۱۰۔ شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ: ''مسواک کے فضائل میں ایک سو سے زائد احادیث منقول ہیں پس تعجب ہے ان لوگوں پر بلکہ ان بہت سے فقہاء پر جو اس سنت (مسواک) کو باوجود احادیث کے کثرت کیساتھ منقول ہونے کی ترک کرتے ہیں۔ یہ بڑا خسارہ ہے''۔

نروں کی تعداد زیادہ ہے یا مادوں کی؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قدر و منزلت، منصور کے دربار میں کس حد تک بلند ہو چکی تھی، اسکا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ عام درباریوں کا ایسی صورت میں امام سے رشک وحسد چنداں محل تعجب کی بات نہیں لیکن معمولی نوکر چاکر، خدام اور شاگرد پیشہ والے کسی سے جلنے لگیں تو اس کے یہ

معنی ہیں کہ بادشاہ محض مجالس عامہ ہی میں نہیں بلکہ اپنی خانگی زندگی میں بھی اس شخص کے فضل و کمال کا ذکر کرتا رہتا ہے۔

بہر حال قصہ یہ ہے کہ راوی اس کے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں کہ منصور کا ایک بڑا منہ چڑھا غلام تھا منصور اس کو بہت مانتا تھا اس شخص کے دل میں بھی امام صاحب کی طرف سے حسد پیدا ہوا، جب منصور، امام صاحب کی تعریف کرتا تو وہ منہ چڑھالیتا اور جھوٹ سچ باتیں ادھر ادھر کی انکی طرف منسوب کرتا۔ اپنے اس جاہل غلام کو منصور منع بھی کیا کرتا تھا کہ تجھے ان سے کیا تعلق؟ مگر خلیفہ سے وہ اتنا شوخ تھا کہ باوجود بار بار ممانعت کے امام کی بدگوئیوں سے باز نہیں آتا منصور نے ایک دن جب ذرا اصرار کیساتھ ڈانٹ کر منع کیا تو اس نے کہا کہ آپ ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں میں جاہل آدمی ہوں بھلا میرے سوالوں کا جواب دے دیں تو میں جانوں۔ منصور نے کہا کہ اچھا بھائی تو بھی حوصلہ نکال لے، دھمکایا بھی، اگر ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تیری باتوں کا جواب دے دیا تو پھر تیری خیر نہیں مگر اس جاہل کو اپنے سوالوں پر ناز تھا، خلیفہ سے اجازت مل ہی چکی تھی۔ امام صاحب کسی وجہ سے منصور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے غلام نے خطاب کر کے کہا آپ ہر بات کا جواب دیتے ہیں میرے سوالوں کو حل کیجئے تو میں جانوں، امام صاحب کیا بولتے، یہی کہا ہوگا کہ پوچھ بھائی! کیا پوچھتا ہے؟ اس نے گہر افشانی شروع کی کہ جناب بتایئے! دنیا کے ٹھیک بیچ میں کونسی جگہ ہے؟ اس جہالت کا جواب کیا ہوسکتا تھا؟ امام صاحب نے فرمایا: کہ وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے ظاہر ہے کہ اس کی تردید وہ کیا کرسکتا تھا، چپ ہو گیا اور دوسرا سوال پیش کیا کہ خدا کی خلقت میں زیادہ تعداد سر والوں کی ہے یا پاؤں والوں کی؟ امام صاحب نے اسی انداز میں فرمایا کہ پاؤں والوں کی۔ اس نے کہا کہ دنیا میں نروں کی تعداد زیادہ ہے یا مادوں کی؟ امام صاحب نے فرمایا: کہ نر بھی بہت سے ہیں اور مادہ کی کمی نہیں۔ اچھا تو بتا تو کس میں ہے؟ چونکہ وہ خصی غلام تھا، جھینپ گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ شاہی دربار کے چونچلے ہیں، امام صاحب کو ناگوار تو گزرا ہوگا لیکن جس مقصد سے وہ سب کچھ انگیز کر رہے تھے اس جہالت کو آپ نے برداشت فرمالیا۔ کہتے ہیں۔ کہ امام کی خاطر سے منصور نے غلام کو ہٹوایا اور کہا کہ آئندہ تم ان کے متعلق اپنے اس برے رویئے سے باز آجاؤ۔ (حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی: ۲۸۸)

اگر چہ یہ ایک مہمل سا بے معنی حصہ ہے لیکن اگر صحیح ہے تو اس سے جیسا کہ میں نے عرض کیا اس اثر اور نفوذ عام کا پتہ چلتا ہے جو امام کو اندر باہر الغرض منصور کی درباری خانگی زندگی میں ان کو حاصل ہو گیا تھا اسی کے رد عمل کی یہ مختلف شکلیں ہیں جنہیں مورخین نے بیان کیا ہے۔

ف: لیکن مجھے اس قصے میں ایک کلیہ مل گیا یعنی اس قسم کے مہمل سوالوں کا بہترین جواب یہی ہوسکتا ہے کہ کچھ ایسی باتیں جواب میں کہہ دی جائیں جن سے سوال کرنے والا خود مشکلات میں مبتلا

ہوجائے۔ آخر خود سوچئے کہ امام کے اس جواب پر کہ جس جگہ تو بیٹھا ہے وہی وسط دنیا ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جسکی تردید کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ پہلے ساری دنیا کی پیمائش کی جائے بغیر اسکے امام کے اس دعوے کی تردید کی کیا شکل ہوسکتی ہے۔

طوسی نے جو سوال امام سے کیا تھا کہ اس کا جو جواب دیا گیا، بعض روایتوں میں ہے کہ امام اپنے جواب کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ مجھے اپنے استاد حماد بن ابی سلیمان سے یہ گر ہاتھ آیا ہے کہ ایسے موقعوں پر سوال کے جواب میں ایسی بات کہنی چاہیئے کہ خود سائل پر جواب کی ذمہ داری عاید ہوجائے، ہٹ دھرم و جہال سے جان بچانے کا یہ اچھا اور کارگر گر ہے۔ (ایضاً ۲۸۸)

دین کی بات

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سر سید احمد خان بچپن میں ایک ہی استاذ مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد رہے ہیں۔ بڑے ہوکر ان کے خیالات میں اتنی تبدیلی آئی کہ ایک نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور دوسرے نے علی گڑھ کالج۔ ایک مرتبہ حضرت نانوتوی کو سر سید احمد خان نے لکھا: ''حضرت! دین کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہونی چاہئے۔'' مولاناؒ نے جواب دیا: '' آپ نے الٹا لکھ دیا، اصل بات یہ ہے کہ عقل کی کوئی بات دین کے خلاف نہیں ہونی چاہئے۔'' (ماہنامہ بنات عائشہ رضی اللہ عنہا، ذی القعدہ ۱۴۲۶ھ)

نماز عید کے لئے عیدگاہ میں جمع ہونا شریعت کو مطلوب ہے

اور اگر کسی کو اس اجتماع کی مطلوبیت میں کلام ہو، جیسا کہ اس وقت بعض نام کے مشائخ بجائے عیدگاہ کے اپنی مساجد میں بلا ضرورت صرف امتیاز کے لئے عیدین پڑھتے ہیں تو میں اس کا ثبوت حدیث سے دیتا ہوں۔ دیکھئے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن باوجود اس کثرت ثواب کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی موقع پر عیدگاہ تشریف لے گئے اور مسجد نبوی میں نماز نہیں پڑھی۔ پس معلوم ہوا کہ عیدگاہ کا اجتماع ایک مہتم بالشان مطلوب ہے اور ممکن ہے کہ عیدگاہ کا ثواب ہی اس پچاس ہزار ثواب سے زیادہ ہوتا ہو، اور اسی کثرت کیفی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کو چھوڑ کر عیدگاہ جاتے ہوں، اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچے کے سامنے ایک گنی اور دس روپے پیش کئے جاویں، تو بچہ دس روپوں کو عدد میں زیادہ دیکھ کر انہیں کو اٹھالے گا لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے ان کو پیش کیا جاوے، تو وہ روپوں کو چھوڑ دیگا اور گنی اٹھالے گا کیونکہ گنتی میں گو ایک اور دس کا فرق ہے لیکن کیفاً وہ ایک ان دس سے زیادہ ہے۔ پس اسی طرح ممکن ہے کہ عیدگاہ کے اجتماع میں کیفاً اس قدر ثواب ہے کہ مسجد نبوی کے اجتماع میں ہونہ ہو، اور ہر چند کہ یہ تضاعف ثواب مسجد نبوی کا مخصوص ہے فرائض کے ساتھ، اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی کو استدلال مذکورہ میں خدشہ ہو کہ صلوٰۃ عیدین میں یہ تضاعف مسجد نبوی میں نہ ہوگا پس استدلال تام نہیں، سو جواب یہ ہے کہ واجب بھی ملحق ہوتا ہے فرض

کے ساتھ، پس دونوں کا یکساں حکم ہوگا اور عیدین کے اجتماع میں بالخصوص یہ بھی بھید ہے کہ مسلمان مختلف اطراف سے سمٹے ہوئے ہر ایک میدان میں جمع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا اجتماع ان کے بدخواہوں کے قلب پر موثر ہوتا ہے اور اسلامی شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اعظم مقاصد ملت سے ہے اور اس خاص اجتماع میں مطلق اجتماع جو متحقق ہے وہ خود بھی اسرار مہمہ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ایک ادنیٰ راز یہ ہے کہ سب کی عبادات مجتمع ہوکر جو سرکار میں پیش ہونگی۔ اگر بعض بھی قابل قبول ہوئیں تو اس کی برکت سے یقیناً بھی مقبول ہوں گی۔ اور انہیں حکمتوں سے شرع میں جماعت کا بہت اہتمام ہے حتیٰ کہ جماعت کی نماز اگر وسوسوں کے ساتھ بھی ہو تب بھی تنہا نماز سے بدرجہا بڑھ کر ہے اسلئے کہ وہ شرعاً مطلوب ہے اور قطع وساوس اس درجہ مطلوب نہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب بادشاہ دین ہم سے لالچ کرنے کو چاہیں تو پھر اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ہو) اس لئے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوگیا کہ اگر جماعت کی نماز میں وسوسے آویں اور تنہائی میں اجتماع قلب ہو تو تنہا پڑھنا بہتر ہے، جماعت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس کو اپنی اس غلطی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ بعض اکابر نے خود اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ہم ان بزرگوں پر اعتراض نہیں کرتے مگر ان کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ۲۷/۳۷۵)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل کو ترجیح ذوق سے دی ہے

ایک شخص نے تعویذ کی درخواست کی کہ تعویذ دو۔ فرمایا: میں نہیں سمجھا پھر اس نے زور سے اور بلند آواز سے کہا کہ تعویذ دو، فرمایا میں نہیں سمجھا پھر اس نے کہا کہ بخار کیلئے، فرمایا کہ پہلے کیوں نہیں کہا تھا۔ یہ قصہ ہو رہا تھا کہ ایک اور نے کہا کہ تعویذ دو، فرمایا کہ دیکھئے کہ ابھی یہ بات ہو رہی ہے، فرمایا کہ اس واسطے اصولیوں نے لکھا ہے کہ "خصوص مورد کا اعتبار نہیں عموم الفاظ کا اعتبار ہے"۔ دوسرے یہ سمجھا کہ سوال شاید پہلے سے ہوگا، حالانکہ میں نے دلیل بھی بیان کردی۔ اسکے بعد ایک شخص نے کوئی اصولی سوال کیا تو حضور نے اسکو جواب دیکر فرمایا: بات کہنے کی تو نہیں مگر کہہ دیتا ہوں کہ اصول فقہ کی اصلیت کیا ہے مجتہدین کی ترجیح کی بنا ان اصول پر نہیں جو اصول فقہ میں مذکور ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قوانین تجویز نہیں کیے بلکہ ترجیح کی بنا، ذوق پر ہے اور ذوق ایسی چیز ہے کہ ہر شخص اسکو مانتا ہے عامی سے عامی بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ محدثین نے بھی اسکو مانا ہے بعض دفعہ حدیث کو "معلول" کہتے ہیں اور دلیل معلول ہونے کی کچھ بیان نہیں کرسکتے صرف یہ کہتے ہیں کہ ذوق یہ چاہتا ہے مگر افسوس! کہ فقہاء پر محدثین بھی اعتراض کرتے ہیں کہ یہ رائے سے ترجیح دیتے ہیں اصل ظاہر کی قول کو، اگر عامی

کے ہاں پیش کریں تو وہ بھی یہ کہے گا۔" القاء البول فی الماء" پیشاب پانی میں ڈالنا اور" القاء الماء فی البول" پانی پیشاب میں ڈالنا کا ایک ہی حکم ہے، مگر داؤد ظاہری پر تعجب ہے کہ حدیث میں" لایبولن احد کم فی الماء الراکد" (ہرگز نہ پیشاب کرے تم میں سے کوئی شخص پانی میں) ہے" لایلقین فی الماء" (نہ ڈالے پانی میں) نہیں۔اس واسطے"القاء" (ڈالنا) اور "تعوط" جائز ہے مگر یہ بالکل ذوق کے خلاف ہے۔اور اصلی چیز ذوق ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل کو ترجیح ذوق سے دی ہے مثلاً رفع الیدین (نماز میں ہاتھ اٹھانا اور نہ اٹھانا) اور عدم رفع الیدین کی حدیثیں سنیں، تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق اس طرف گیا کہ نماز وجودی ہے اور رفع الیدین بھی وجودی ہے، اس واسطے رفع الیدین کرنا چاہیے گو عدم رفع بھی جائز ہو اور کسی عارضہ سے ہو، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق ادھر گیا کہ اصل نماز میں سکون ہے اور رفع الیدین خلاف سکون ہے، اس واسطے عدم رفع الیدین کو ترجیح دی۔ گو رفع الیدین بھی جائز ہے مگر عارضہ سے ہوا، مثلاً اعلام اصم بہروں کو بتانے کیلئے)

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنے مشائخ سے عقیدت زیادہ ہوتی ہے، امام صاحب کے مشائخ رفع الیدین نہیں کرتے تھے، اس واسطے انہوں نے نہیں کیا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مشائخ رفع الیدین کرتے تھے انہوں نے کیا۔ تیسری وجہ ترجیح عادات اور واقعات بھی ہوتے ہیں امام صاحب کوفہ میں تھے وہاں پانی بہت تھا اس واسطے پانی میں تنگی فرمائی اور عشر فی عشر (دہ دردہ) کا حکم دیا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ میں رہے وہاں پانی میں وسعت مناسب تھی اور اسطرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۱ ص ۷)

فرض، سنت اور واجب وغیرہ کا معنون ہونا

کسی نے دریافت کیا کہ حضرت! فرض، واجب، سنت، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی تھے؟ فرمایا کہ ہاں! یہ معنون تو موجود تھا، گو یہ عنوان موجود نہ ہو، مثلاً واجب وہ جسکی دلیل ظنی ہو اور ظنی دو طریق سے ایک ظنی الثبوت دوسرا ظنی الدلالۃ۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ظنی الثبوت تو نہ تھا مگر ظنی الدلالۃ تھا۔ ان صطلاحات کے بنانے کی وجہ علماء کو یہ پیش آئی کہ لوگوں نے عمل کرنے میں کمی زیادتی شروع کردی تو اب یہ مجبوری پیش آئی کہ یہ فعل جو ترک کیا گیا ہے اسکا کیا رتبہ ہے؟ تو مجتہدین نے دلائل کو دیکھ کر یہ استنباط کیا کہ یہ واجب یا سنت یا فرض ہے۔ مثلاً سر کا مسح کسی نے پورا کیا کسی نے نصف پر اکتفاء کیا اب ضرورت پڑی اس تحقیق کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہ نہ تھا، بلکہ وہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے عمل شروع کردیتے اگر بعد کے لوگ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح اسی طریق پر عمل کرتے جاتے تو ان اصطلاحات کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر لوگوں کی بے عملی نے یہ ابواب فتوی تصنیف کرائے۔

سہو فی الصلوٰۃ ہم کو بھی ہوتا ہے اور انبیاء کرام کو بھی

فرمایا سہو فی الصلوٰۃ ہم کو بھی ہوتا ہے اور انبیاء کرام کو بھی، اور علت بھی (دونوں) کی مشترک ہے

یعنی عدم توجہ الی الصلوٰۃ مگر علت العلت میں فرق ہے۔ مجھ یہ کہ ہم تو "توجہ الی الشئی ھو اسفل من الصلوۃ" ہے (یعنی نماز سے نیچے درجہ کی طرف) اور انبیاء کو "توجہ الی الشئی ھو اعلیٰ من الصلوۃ" ہے (نماز سے اونچے درجہ کی چیز کی طرف) پھر فرمایا کہ یہ وجہ بعد میں نظر سے بھی گزری اور جی بہت خوش ہوا۔ لوگوں کا جی تو شاید ایسی چیز سے زیادہ خوش ہوتا جو پہلوں کی سمجھ میں نہ آئی ہو اور میرا جی ایسے علوم سے خوش ہوتا ہے جسکی طرف سلف بھی، لوگ بھی گئے ہوں کیونکہ جو علوم سلف کے خلاف ہوں وہ بدعت ہونگے تو جب بدعت حاصل ہو تو اس پر کیا خوشی ہوگی؟ (ملفوظات حکیم الامت ۲۶/۳۶۲)

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ بچپن میں جو دعا پڑھتے تھے

فرمایا: کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ چھوٹی عمر میں "**اللھم انا نستعینک علی طاعتك**" (اے اللہ! ہم آپ سے آپ کی اطاعت پر مدد چاہتے ہیں) پڑھتے تھے اس سے ذہن اور علم میں برکت ہوتی ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۶/۳۹۲)

ایک انوکھا استدلال

ایک مرتبہ ایک آدمی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "اے ابوعبداللہ آپ بھڑ کے کھانے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا: "حرام ہے؟"

اس نے پوچھا: "آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟"

آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔"

﴿وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: ۷)

"جس چیز کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دیں، وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آ جاؤ۔"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"میرے بعد آنے والوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کرو" یہ تو قرآن و حدیث ہوئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی سن لو، کہ آپ نے بھڑ کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے عقل بھی کہتی ہے کہ جس چیز کے قتل کا حکم دیا جائے اس کا کھانا بھی حرام ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۸۹)

حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھنا

حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کے حروف اچھے نہ تھے ایک مرتبہ تہجد پڑھ رہے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی انکے پیچھے شریک ہونا چاہا لیکن ان کی غلطیوں کی وجہ سے گھر آ کر تہجد ادا کیا۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا، پوچھا آپ کے نزدیک کونسا عمل زیادہ پسندیدہ ہے؟ ارشاد ہوا:

''الصلوۃ خلف الحبیب العجمی'' (حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھنا)

ف: دیکھئے یہ رتبہ ہے بعض غلط پڑھنے والوں کا، حق تعالیٰ کی نظر قلب پر ہے اگر کوئی صحیح نہ پڑھ سکے اس کا غلط صحیح سے بھی بڑھ کر ہے غرض تلاوت بڑی چیز ہے جس کی طرف سے لوگوں میں عام غفلت ہے۔ (حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات:۳۳)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ایک محدث کے ساتھ جو کوفہ کے بہت بڑے محدث ہیں، مشہور ہے کہ محدث نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ تمہارے استاد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے خلاف کیوں کیا؟ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: کس مسئلہ میں؟ کہا: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ باندی کی بیع طلاق ہے (یعنی جو باندی کسی کے نکاح میں ہو، اگر مالک اس کی بیع کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کر دے تو بیع ہوتے ہی باندی پر طلاق ہو جائیگی) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ باندی کی بیع طلاق نہیں، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم ہی نے تو ہم سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع جاریہ کو طلاق نہیں قرار دیا۔ محدث نے کہا میں نے ایک یہ حدیث بیان کی۔ کہا تم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو خرید لیا اور آزاد کیا تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو اختیار دیا کہ خواہ اپنا نکاح شوہر سابق سے برقرار رکھیں یا فسخ کر دیں تو اگر بیع جاریہ سے ہی طلاق واقع ہو جایا کرتی تو اختیار دینے کے کیا معنی؟ محدث سوچنے لگے اور کہا: اے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ! کیا یہ مسئلہ اس حدیث میں ہے؟ کہا: ہاں! محدث نے کہا ''و اللّٰہ انتم الاطباء ونحن الصیادلۃ'' لہٰذا! تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں۔ صاحبو! فقہاء کے بیان کے بعد اب تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ فلاں حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور فلاں آیت سے وہ مسئلہ مگر بدون بیان فقہاء کے اسکا سمجھنا دشوار اور سخت دشوار ہے اسی کا نام اجتہاد ہے اور یہی وہ فہم ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''الافھما اوتیہ الرجل فی القرآن''۔ (اشرف الجواب کامل:۱۷۳)

نئے مسائل کے جوابات

پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز میں نماز ہو سکتی ہے، یا نہیں؟ اب بتلائیے کہ اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں۔ پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا، نہ فقہاء اس کو جانتے تھے، نہ کوئی حکم لکھا اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں، اور ایسے ایسے نئے مسائل کا جواب دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا، اگر اجتہاد فی الفروع بھی نہ ہو سکے تو شریعت کے نامکمل

ہونے کا شبہ ہوگا، جو بالکل غلط ہے، شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں قیامت تک، جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ میں شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول، قواعد سب سے پہلے مجتہدین بیان کرچکے ہیں جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ (اشرف الجواب کامل ۳۷۱)

اس شبہ کا جواب کہ زکوۃ دینے سے مال کم ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے ہیں اور زکوۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہوجاتے ہیں بڑھنا تو درکنار، برابر بھی نہیں رہتے، بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر نظر ہوتی یہ شبہ نہ ہوتا، مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھتا ہوا مال اپنے کام آئے چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہوجائے اور ایک شخص کے پاس دس روپیہ ہوں لیکن دس کے دس کے اسکے کام آئے یہ شخص اس سے بدرجہاں بڑھ کر ہے سو ہم کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ دو شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے سوائی چین وآرام سے زندگی گزرتی ہے اور دوسرا حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے آج چوری ہوگئی کل کوئی مقدمہ قائم ہوگیا خود بیمار ہوگئے، بچے بیمار ہوگئے۔ عطار کے روپیہ جارہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہورہا ہے بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اسکے کام آرہی ہے جو مال بڑھنے سے غرض ہے وہ اسکو حاصل ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتا ہے اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ بھی ہمارے لیے ہیں۔ (اشرف الجواب کامل: ۳۴۷)

اظہار لاعلمی، عیب یا خوبی؟

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ان تمام اوصاف کی جامع تھی جن کی کسی مفتی، فقیہ اور مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے من جملہ ان کے صفات میں ایک اعلیٰ صفت یہ بھی تھی کہ امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزئیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو نہایت متانت وکشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے تھے کہ میں نہیں جانتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ابن وہب فرماتے ہیں: ''اگر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی 'لا ادری' (میں نہیں جانتا) لکھا کرتا تو کتنی تختیاں بھر جاتیں''۔

ایک مرتبہ ایک شخص نہایت دور دراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا: امام صاحب نے فرمایا کہ ''میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا'' سائل کہنے لگا ''میں چھ مہینے کی راہ طے کرکے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے میں جا کر ان کو کیا جواب دوں گا'' امام صاحب نے فرمایا: کہہ دینا کہ مالک نے کہا کہ میں جواب نہیں دے سکتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد عبدالرحمن بن مہدی نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص چند روز تک فتوی کے جواب کے لئے حاضر خدمت ہوا، ایک دن اس نے عرض کیا "میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا جو کچھ جواب ہو، ارشاد فرمائیے" یہ سن کر آپ نے سر جھکا لیا، تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر فرمایا "میں اس مسئلہ کا جواب دیتا ہوں جس کے متعلق پوری معلومات پر دسترس رکھتا ہوں، تمہارے اس مسئلے کو میں اچھی طرح نہیں جانتا"۔ (ائمہ اربعہ کے دلچسپ واقعات: ۱۸۵)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فتوائے کفر میں احتیاط

ایک مرتبہ حضرت والا سے ایک مولوی صاحب نے یہی گفتگو کی کہ ہم بریلی والوں کو کیوں کافر نہ کہیں، فرمایا: کافر کہنے کے واسطے وجہ کی ضرورت ہے، نہ کہ کافر نہ کہنے کے لئے، تو وجہ آپ بتلائیے کہ کیوں کہیں؟ مولوی صاحب نے بہت سی وجوہات پیش کیں اور حضرت والا نے سب کی تاویل کی گو بعید تاویلیں، بالآخر مولوی صاحب نے کہا اگر کچھ بھی وجہ نہ ہو تو یہ کیا کافی نہیں ہے کہ وہ ہم کو کافر کہتے ہیں اور یہ ثابت ہے کہ مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر ہے۔ پس اگر ہم اپنے آپ کو مسلمان جانتے ہیں اور وہ ہم کو کافر کہتے ہیں، تو ہم کو یہ بات ماننی چاہیے کہ کفر لوٹ کر انہیں پر پڑتا ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ ہمیں اپنے اسلام میں شک ہے۔

فرمایا: غایت سے غایت دلیلوں کا نتیجہ یہ ہے کہ کفر لزومی ہے کفر صریح تو نہ ہوا، پس وہ اگر واقع میں کافر ہوں اور ہم نہ کہیں تو ہم سے قیامت کے دن کیا باز پرس ہوگی، اور اگر ہم کافر کہیں تو کتنی رکعت (نفل) کا ثواب ملے گا؟ سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ تضییع وقت ہے اور نئی کام بہت ہیں۔ رہا یہ کہ کافر نہ کہنا بغرض احتیاط ہے مگر سوال نماز کے متعلق ہے اور اس کے لئے شبہ تکفیر مسلم کافی علت ہے تو" **الیقین لایزول بالشك**" اس شبہ کا جواب ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۹/ ۲۲۷)

نکاح کا عجیب وغریب مسئلہ

ایک شخص نے ایک عورت سے پوشیدہ طور پر نکاح کیا جب اسکا لڑکا پیدا ہوا، تب وہ شخص مکر گیا اور عورت نے قاضی ابن ابی لیلیٰ کے پاس دعویٰ دائر کیا، قاضی صاحب نے عورت کو نکاح کا گواہ لانے کا حکم دیا عورت نے کہا: کہ اس شخص نے مجھ سے اس طرح نکاح کیا کہ اللہ تعالیٰ ولی ہے اور دونوں فرشتے گواہ ہیں۔

قاضی صاحب نے دعویٰ خارج کردیا وہ عورت امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ قاضی صاحب کے پاس جا اور کہہ کہ مدعا علیہ کو بلوائیے اور میں گواہ لاتی ہوں جب وہ اسکو بلائیں تو کہہ، کہ ولی اور شاہدین کے نہ ہونے کا انکار کر، اس شخص سے نہ ہو سکا اور اس نے نکاح کا اقرار کرلیا۔ لہٰذا قاضی نے مہر اس کے ذمہ لازم کیا اور لڑکا اس شخص کو دلایا۔

تنبیہ: اس مسئلہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ولی اور گواہ دونوں میں سے کوئی نہ تھے اس لیے کہ اس صورت

میں تو نکاح بالا جماع باطل ہوگا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ نکاح پوشیدہ طور پر دو مجہول گواہوں کے سامنے ہوا، تو جب وہ عورت اس کو ثابت نہ کر سکی، تب اس نے یہ کہا کہ "اللہ تعالیٰ کی ولایت اور فرشتوں کی گواہی کیساتھ ہوا۔ اس لیے امام صاحب نے اسے وہ بات سکھائی۔ جس کی وجہ سے اگر عورت سچی ہے تو اس شخص کو مجبوراً نکاح کا اقرار کرنا پڑے اور امام صاحب اللہ تعالیٰ سے ڈرانے والے تھے" اور واقعہ وہی تھا جو آپکو الہام ہوا۔ (ائمہ اربعہ دلچسپ واقعات ۱۱۸)

کنکھجورے کا حکم

فرمایا کہ کنکھجورہ چاہے مر کر گل سڑ بھی جاوے اور ریزہ ریزہ ہو جاوے لیکن کنواں ناپاک نہیں ہوتا، گو پانی پینا جائز نہیں جب تک اتنا پانی نہ نکالا جائے کہ غالب گمان ہو جاوے کہ اب اس کے ریزے نکل گئے ہوں گے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۲۳/۳۴۴)

ف: کنکھجورا اگر کھال سے چمٹ جائے یا کان میں گھس جائے تو اس پر سفید شکر ذرا سی ڈال دیں، وہ کھال کو اسی وقت چھوڑ دے گا۔ (مؤلف)

سوال حرام پر دینا حرام ہے

فرمایا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس شخص کو مانگنا حرام ہے اسکو اسکے مانگنے پر دینا بھی حرام ہے البتہ دینے والے کو اگر معلوم نہ ہو تو معذور ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۳/۳۸۹)

تبحر فقہ، نور فہم اور حقیقت شناسی

احقر نے دریافت کیا کہ زکوۃ کا روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں فیس منی آرڈر اس رقم زکوۃ میں لی جاسکتی ہے۔ محصلین زکوۃ کی اجرت تو زکوۃ میں سے دینا جائز ہے اسی لئے اس پر قیاس کیا فیس منی آرڈر کی لی جاسکتی ہے؟ فرمایا کہ اول تو ہم میں قیاس واجتہاد کی صلاحیت نہیں۔ ثانیاً یہ قیاس بھی ظاہر الفساد ہے کیونکہ عامل کی اجرت کو تحصیل زکوۃ میں دخل ہے وہ ملحق بالزکوۃ ہو سکتی ہے اور منی آرڈر کی فیس کو تحصیل زکوۃ میں دخل نہیں بلکہ ترسیل زکوۃ میں دخل ہے جسکی حقیقت بعد حصول کے جدا کرنا ہے۔ ثالثاً وہ تصرف ہے امام کا اور یہ تصرف ہے غیر امام کا " فاين هذا من ذالك رابعاً" وہاں عامل مسلم ہے یہاں عملہ ڈاک بعض اوقات غیر مسلم بھی ہوتے ہیں۔ خامساً مقیس علیہ خلاف قیاس ہے پس حکم مورد نص پر مقتصر رہیگا۔ اس پر قیاس، مجتہد کو بھی جائز نہیں۔

ف: اس سے حضرت والا کا تبحر فقہ و نور فہم، حقیقت شناسی صاف ظاہر ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۳/۵۰۱)

اندھے کو سلام نہ کرنا خیانت ہے

فرمایا کہ راستہ میں کبھی کوئی اندھا ملتا ہے تو میں بعض اوقات اسکو سلام نہیں کرتا، مزاج پرسی نہیں

کرتا مگر بعد میں شرما جاتا ہوں اور اپنے کو بے حد ملامت کرتا ہوں کہ یہ تو خیانت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۳/۱۹۳)

رنڈیوں کی نماز جنازہ کا حکم

فرمایا کہ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ صاحب سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ رنڈیوں کی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں فرمایا کہ رنڈوں (یعنی انکے آشناؤں) کی تو نماز جنازہ پڑھتے ہو پھر دونوں میں کیا فرق ہے؟ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۳/۲۸۲)

حقیقت رسی استحضار قواعد فقہیہ

(۱) فرمایا کہ کافر کا نابالغ بچہ جب تک عاقل و ممیز نہ ہو مستقلاً مسلمان نہیں سمجھا جائے گا بلکہ "تبعا للدار الاسلامی" یا "تبعا لاحد الابوین المسلم" مسلمان کہا جائے گا۔ اگر نہ احد الابوین مسلم ہے، نہ خود بچہ ممیز ہے تو اس کے مسلمان ہونے کا حکم نہ کہا جائیگا اور اگر دار الاسلام ہے تو اسکو مسلمان کہا جائیگا اور ہندوستان کے دار الاسلام ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے لیکن ایسے اختلاف میں بچہ کے نفع کی رعایت کو ترجیح دی جاوے گی اور اسکو مسلمان سمجھا جاوے گا اور اس پر جنازہ کی نماز پڑھی جاوے گی۔

ف: اس جواب سے حضرت والا کا استحضار قواعد فقہیہ صاف ظاہر ہے۔

(۲) ایک صاحب نے یہ مسئلہ پیش کیا کہ ہندہ کا نکاح زید سے ہوا، لیکن رخصتی نہیں ہوئی۔ زید نے نکاح کا دعویٰ کیا، تو عدالت نے قانون کے مطابق نکاح ثابت نہ کیا۔ زید کا دعویٰ خارج کر دیا گیا لیکن بے شمار لوگ ہندہ کے گاؤں میں زید کے نکاح کا ثبوت دیتے ہیں۔ کیا عدالت کے نفوذِ حکم سے اب ہندہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے یا زید ہی کے نکاح میں رہی؟

فرمایا کہ اول تو حاکم عدالت کا مسلمان ہونا شرط ہے دوسرے حاکم مسلم کی قضا بھی صرف عقد و فسخ میں نافذ ہوتی ہے اور عدم ثبوت عقد، نہ عقد ہے نہ فسخ، لہذا یہ قضا مؤثر نہیں، اسکے مقتضیٰ پر دیانۃً عمل جائز نہیں۔

ف: یہ جواب بھی حضرت والا کی حقیقت و استحضار قواعد فقہیہ پر دال ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۳/۵۰۹)

حنفیہ کی فضیلت، ایک علمی لطیفہ

فرمایا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ بطور لطیفہ فرمایا کرتے تھے کہ حنفیت کلام مجید سے ثابت ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾

اولی الامر سے مراد مسلمان سلاطین و ملوک ہیں اور سلاطین و ملوک اکثر حنفی ہوئے ہیں، چنانچہ اب بھی مدت سے سلاطین روم حنفی ہوتے آرہے ہیں، اور حنفی کا مطیع فروع میں عامل بالحنفیہ ہوگا۔ (ایضاً: ۲۹/۶۱۲)

سپرٹ ملی روشنائی سے اسمائے مقدسہ لکھنا بے ادبی ہے

فرمایا کہ سرخ پوڑیہ سے ''اللہ'' یا ''محمد'' ﷺ کا نام لکھنا میرے نزدیک ناپسندیدہ ہے کیونکہ پوڑیہ میں اسپرٹ کا شبہ ہے اور اگرچہ بعض اسپرٹ شیخین کے نزدیک طاہر ہے لیکن امام محمدؒ کے نزدیک مطلقاً طاہر نہیں اور اختلافی مسائل میں حتی الوسع بچنا اولی ہے خاص کر جبکہ اکثر کا فتویٰ بھی امام محمدؒ کے قول پر ہے۔ (ملفوظات حکیم الامتؒ: ۱۳/ ۴۷)

امام سے پہلے رکوع سجدہ کرنا سخت گناہ ہے

ایک روز بعد نماز ظہر ایک شخص سے فرمایا کہ تم نماز میں امام سے پہلے رکوع اور سجدہ کرتے ہو، یہ سخت گناہ ہے اور نہایت ہی برا ہے ظاہر ہے، کہ امام سے پہلے تو نماز سے فراغت نہیں ہوسکتی کہ جلدی سے چھٹکارا ہوجائے۔ پھر جلدی کرنے سے کیا فائدہ؟ پھر یہ فرمایا کہ کوئی شبہ نہ کرے کہ آپ نے نماز میں اسکو ایسا کرتے کیونکر دیکھ لیا، کیونکہ اول تو آنکھ کی شعاعیں بلا اختیار ہی چپ و راست میں پھیلتی ہیں دوسرے فقہاء نے لکھا بھی ہے کہ اگر امام کو کوئی شک ہوجائے تو مقتدی کو چپ و راست سے دیکھ لینا جائز ہے۔ سو جیسے اصلاح اپنی نماز کی مصلحت ہے۔ اسی طرح مصلحت دوسرے کی نماز کی۔ سو اسکے لئے بھی دیکھ لینا درست ہے۔ پھر فرمایا کہ میرٹھ میں ایک مولوی صاحب تھے، وہ رکوع اور سجدے میں دائیں بائیں دیکھتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا کہ یہ درست نہیں۔ کہنے لگے تجھ کو کیونکر معلوم ہوا کہ نماز میں، میں نے ادھر ادھر دیکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اعتراض میں ظاہر ہوگئی پھر فرمایا کہ بعض لوگ اسی کو بڑا ہنر سمجھتے ہیں اور اسی لیے مولوی بنتے ہیں کہ دوسروں پر ہر بات میں غالب آئیں اور حق کو قبول نہیں کرتے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۳/ ۲۳)

کھانا کھاتے شخص کو سلام نہ کیا جائے

فرمایا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص کھانا کھا رہا ہو، اس پر سلام نہ کرنا چاہیے، اسکی وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔ ایک مرتبہ میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک صاحب نے سلام کیا تو میرے گلے میں ٹکڑا اٹک گیا، اسوقت معلوم ہوا کہ یہ راز ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۳/ ۱۷۷)

جنازہ میں فرض صرف چار تکبیریں ہیں

مسئلہ: جنازے کی نماز میں صرف چار تکبیریں رکن ہیں، باقی دعائیں وغیرہ سب سنت ہے جہاں کوئی نماز پڑھانے والا نہ ملے وہاں نیت باندھ کر تکبیرات اربعہ کہہ لینا کافی ہے۔ فرض ادا ہوجائیگا اور جنازہ بے نماز پڑھے دفن کردینے کا گناہ نہ ہوگا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۱۳/ ۲۰۶)

نماز جنازہ کی مزدوری لینا ناجائز ہے

فرمایا: میں نے کانپور میں ایک جنازہ پڑھایا تو ایک شخص نے فراغت کے بعد مجھ کو ایک روپیہ دیا اور کہا یہ آپ کی نذر ہے، میں نے کہا کہ آخر وجہ کیا ہے؟ ہم کئی دنوں سے یہاں قرنطینہ میں ہیں، آج دیا پہلے نہ دیا، یہ تو نماز جنازہ کی مزدوری معلوم ہوتی ہے۔ اس نے کہا: ہے تو یہی۔ میں نے کہا: نماز پر مزدوری کہاں جائز ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۳/۱۱۰)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مجتہد اعظم ہونے کا ثبوت

فرمایا: غیر مقلدین کہتے ہیں کہ امام صاحب کو ۱۷ حدیثیں پہنچی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے بھی کم پہنچتیں تو امام صاحب کا اور زیادہ کمال ظاہر ہوتا، کیونکہ جو شخص علم حدیث میں اتنا کم ہو، اور پھر بھی وہ جو کچھ کہے اور لاکھوں مسائل بیان کرے اور وہ سب حدیث کے موافق ہوں تو اس کا مجتہد اعظم ہونا بہت زیادہ مسلم ہوگیا۔ یہ ابن خلکان مورخ کی جسارت ہے ورنہ صرف امام محمدؒ کی وہ احادیث جو وہ اپنی کتابوں میں امام صاحب سے روایت کرتے ہیں۔ دیکھو! صدیوں ملیں گی۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۴/۱۵۶)

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا رشک

حضرت مولانا قاسم صاحب نے ایک دفعہ فرمایا: اگر کوئی اس زمانے میں قسم کھاوے کہ میں فقیہ کو دیکھوں گا تو جب تک مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو نہ دیکھے بار نہ ہوگا اور ایک دفعہ دونوں خلوت میں باتیں کررہے تھے۔ بعض خدام نے کان لگا رکھا تھا مولانا قاسم صاحبؒ نے فرمایا: یار تمہاری ایک بات پر مجھے رشک ہے کہ تم فقیہ ہو۔ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ کے مجتہد ہونے پر تو مجھے رشک نہ آیا اور ہم نے دو چار مسئلے سیکھ لیے تو آپکو رشک آنے لگا۔ کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ عرش پر بیٹھے ہوئے فتویٰ لکھ رہے۔ اور مولوی شبیر علیؒ نے بچپن میں ایک خواب دیکھا ایک بی بی حسین آئی انہوں نے پوچھا مولانا اشرف علی صاحبؒ کے مکان یہاں ہیں، میں نے کہا آؤ ہم بتلاتے ہیں۔ پھر شبیر علی نے پوچھا آپ کون ہیں؟ کہا میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بی بی ہوں۔ شبیر علی نے ان سے مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب دیا پھر کچھ شبہات پیش کئے وہ کہنے لگی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پیچھے آرہے ہیں ان سے پوچھنا اور انکے ساتھ تمہارے مجمع کا ایک بزرگ بھی ہے دیکھا تو مولانا گنگوہیؒ امام صاحب کے ساتھ ہیں۔ شبیر علی نے امام صاحب سے پوچھا یہ کہاں ساتھ ہوئے فرمایا یہ تو ہمارے ہی ساتھ رہتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۵/۳۸)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ

فرمایا: امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نمازی کو دیکھ کر، ایک نے کہا: لوہار ہے اور ایک نے کہا: بڑھئی۔ پوچھنے سے معلوم ہوا دونوں پیشہ کرتا تھا ایک پیشہ اب کرتا ہے۔ کہاں تک فراست ہے۔ حکیم

غلام مصطفی صاحب نبض پکڑ کر بتلا دیتے ہیں نمازی ہے یا بے نمازی یعنی بے دیکھے عورتوں کو اور سنا ہے ہیں نمازی کی ہر چیز میں نور ہوتا اس کا اثر نبض میں ہوتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ١٥/ ٧٥)

ایک حنفی کو جواب

فرمایا ایک شخص کا خط آیا ہے ان صاحب نے لکھا ہے کہ میں ہوں تو حنفی مگر چونکہ خود امام صاحب کا ہی قول ہے کہ اگر میرا قول حدیث کے خلاف ہو تو اسکو چھوڑ دو، اس واسطے میں فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہوں اور آپ سے بھی دریافت کرتا ہوں کہ میں کیا کروں آیا پڑھوں یا نہیں؟ میں نے جواب لکھا کہ جب حدیث کے مقابلہ میں امام کا قول کوئی چیز نہیں میرا قول کیا ہوگا۔ (ملفوظات حکیم الامت ١٥/ ٢٦)

اہل بلغار پر نماز عشاء نہیں

فرمایا: مولانا مرتضی حسن صاحب نے حضرت والاؒ کے سامنے بیان کیا کہ مجھ کو شبہ تعارض ہوا کہ موافق تصریح فقہاء اہل بلغار پر نماز عشاء نہیں کیونکہ ان پر وقت عشاء نہیں آتا اور حدیث میں ہے کہ جب خروج دجال کے وقت پہلا دن سال بھر کا ہوگا تو اندازہ سے متعدد نمازیں پڑھی جائیں۔ حالانکہ طلوع وغروب متعدد نہیں ہوگا، میں نے یہ شبہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لکھا، انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا: جب آؤ گے، زبانی بیان کردیں گے۔ پھر جب میں گنگوہ گیا تو یاد دلایا۔ فرمایا: مسئلہ جو اہل بلغار کے متعلق ہے یہی صحیح ہے اور حدیث خروج دجال اس کے مخالف نہیں کیونکہ اسوقت بھی طلوع وغروب روزانہ ہوگا، صرف جہاں اس کا فتنہ ہوگا وہاں یہ نمایاں نہیں ہوگا۔ اسلئے اندازہ سے سب نمازیں پڑھی جائیں گی میں نے عرض کیا اس کی کوئی دلیل حدیث سے بھی ہے۔ فرمایا: وہاں ہے، پھر کئی بار فرمایا: بتلاؤں؟ ایک حدیث میں آتا ہے کہ دجال کے نکلنے کی علامت پانچ سواروں کا ظاہر ہونا فرمایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلوع وغروب بند ہو جاتا تو علامت متحقق ہو جاتی تو پھر سواروں کے انتظار کے کیا معنی؟ (ملفوظات حکیم الامت ١٥/ ٢٩٥)

اللہ تعالیٰ کو ہنسانے والے کام

حدیث مبارک میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

١) میدان حج میں جب ننگے پاؤں، چہروں پر گرد، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، نہ خوشبو، نہ خوبصورتی اور لبیک لبیک کہتے ہوئے، بندے پھر رہے ہیں تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان لوگوں کو گھروں سے نکال لائی ہے؟ بیوی بچے چھوڑے، وطن چھوڑ کر آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح بے وطن ہوئے ہیں..... میری محبت ہی میں تو پھر رہے ہیں...... اللہ تعالیٰ ہنستے ہیں اور فرشتوں سے کہتے ہیں، تمہیں گواہ کرتا ہوں، میں نے ان سب کی مغفرت کردی، یہ میری محبت میں گھر بار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں، میں کریم ہوں..... یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ گھر بار چھوڑیں اور میں توجہ نہ دوں، میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ اللہ تعالیٰ خوش ہو کر مغفرت فرماتے ہیں اور اسی خوشی کو

ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲) جب تکبیر کہنے والا تکبیر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کر آ رہے ہوں کہ پہلی صف میں جگہ ملے، گویا ہر ایک کی یہی خواہش ہے، وہ پہلی صف میں شامل ہو، یہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آئے ہیں، ان میں سے ہر ایک، دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، آخر یہ کیوں دوڑ رہے ہیں؟..... یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں.... یہ میرا دربار جان کر آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا قریب ہو جائیں گے اتنا ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

۳)..... شوہر اور بیوی سو رہے ہیں، اچانک شوہر کی آنکھ کھلی اور اس کا جی چاہا کہ تہجد پڑھوں.... اس نے اپنی بیوی کے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھی... اس نے کہا، کیا مصیبت ہے؟ شوہر نے کہا، دو رکعت نفل پڑھ لے، تہجد کا وقت ہے.... یہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے، اس کے پاس لیٹی ہوئی تھی، میٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ شوہر کی بات سن کر اس کا شکریہ ادا کرتی ہے..... وہ بھی دو رکعت پڑھتی ہے..... اسی طرح اگر بیوی اپنے شوہر کو اٹھائے اور وہ ہڑ بڑا کر اٹھے تو اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ تعالیٰ کی انتہائی رضا کا سبب ہیں ..... اسی لئے اسے ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (خطبات حکیم الاسلام)

ایک لطیفہ رگانا بجانا حرام نہ ہوتا

ہندوستان کا ایک گویا (گانے والا) ایک مرتبہ حج کرنے گیا، حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہا تھا تو اس زمانے میں راستے میں قیام کے لئے منزلیں ہوتی تھیں۔ اس نے بھی رات گزارنے کے لئے ایک منزل پر قیام کیا، تھوڑی دیر کے بعد اسی منزل پر ایک عرب گویا آ گیا، اور عرب گویے نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کر دیا۔ اس عرب گویے کی آواز بہت خراب اور بھدی تھی۔ ہندوستانی گویے کو اس کی آواز سے بہت کراہیت اور وحشت ہوئی۔ جب اس نے گانا بجانا بند کیا تو ہندوستانی گویے نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس ﷺ نے گانا بجانا کیوں حرام قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ آپ نے اس جیسے بدوؤں کا گانا سنا تھا۔ اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو کبھی حرام قرار نہ دیتے۔ (تقریر ترمذی: ۴۵/۱)

ف: حکم حقیقت پر لگتا ہے صورت پر نہیں نیز مذکورہ بالا واقعہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ گانا بجانا یا گانا سن لینا جائز ہے بلکہ ہر صورت میں حرام ہے۔ (مؤلف)

سود اور کرایہ میں فرق

آج کل بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سود اور کرایہ میں فرق ہے؟ مثلاً ایک شخص دوسرے کو قرض دیتا ہے تو اس پر نفع لینے سے منع کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک شخص نے اپنا مکان کرایہ پر دے دیا تو اس کا کرایہ لینا آپ کے نزدیک جائز ہے۔ حالانکہ مکان اور روپیہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، وہ یہ کہ جس شخص نے دوسرے کو روپیہ قرض دیا ہے وہ روپیہ قرض دینے والے کی ضمان سے نکل کر لینے والے کے ضمان میں چلا گیا، چنانچہ اگر قرض لینے والا ایک ہزار روپے لے کر گھر سے نکلا، راستے میں کوئی ڈاکو اس سے چھین کر لے گیا تو اس صورت میں نقصان قرض لینے والے کا ہوگا، دینے والے کا نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ روپیہ قرض دینے والے کے ضمان میں نہیں۔ لہٰذا وہ اس پر نفع نہیں لے سکتا۔ مکان میں یہ بات نہیں، مثلاً میں نے اپنا مکان دوسرے کو کرایہ پر دیا تو وہ مکان میرے ضمان میں ہے، چنانچہ فرض کریں کہ اگر مکان پر ایک بم آ گرے اور مکان تباہ ہو جائے تو اس صورت میں نقصان میرا ہوگا، کرایہ دار کا کوئی نقصان نہیں ہوگا، اس لئے اس مکان کا کرایہ لینا میرے لئے جائز ہے۔ (تقریر ترمذی ۱/۱۱۶)

نکاح اور زنا میں فرق

زندگی کے ہر شعبے میں شریعت نے یہ اصول ''ولا ربح مالم یضمن'' ملحوظ رکھا ہے، یہاں تک کہ نکاح اور زنا کے اندر بھی فرق ہے وہ بھی اسی اصول کی وجہ سے ہے۔ دیکھئے! زنا کے اندر یہ ہوتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت آپس میں زندگی ایک ساتھ گزارتے ہیں، اور ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتے تو یہ زنا ہے اور حرام ہے۔ لیکن اگر ایک مرد اور ایک عورت باقاعدہ ایجاب وقبول کرکے نکاح کریں اور اس کے بعد ایک ساتھ زندگی گزاریں تو جائز اور حلال ہے۔ اب بظاہر تو ان دونوں میں بہت بڑا فرق نظر نہیں آتا، لیکن دونوں میں فرق یہی ہے کہ پہلی صورت میں مرد عورت سے لطف اندوز تو ہو رہا ہے لیکن اس کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کر رہا ہے، اور نکاح کے اندر جب اس نے یہ لفظ کہا ''قبلت'' تو اس صورت میں اس پر وہ تمام ذمہ داریاں آ گئیں جو شوہر کے ذمے واجب ہوتی ہے۔ مثلاً مہر واجب ہوگا، نفقہ واجب ہوگا، بچے اس کے شمار ہوں گے وغیرہ۔ تو ان ذمہ داریوں کے قبول کرنے کی وجہ سے شریعت نے اجازت دے دی کہ اب تم اس سے نفع اٹھا سکتے ہو۔ شریعت نے یہ اصول بہت سی جگہوں پر ملحوظ رکھا ہے کہ ''ربح مالم یضمن'' جائز نہیں۔ یہی وہ اصول ہے جس کو فراموش کرنے کے نتیجے میں بے شمار عقود فاسد ہو رہے ہیں اور ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔ (تقریر ترمذی: ۱/۱۱۶)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، تقویٰ اور فتویٰ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بازار سے گزر رہے تھے کہ کہیں سے آپ کے لباس پر ناخن بھر مٹی آ پڑی۔ آپ اسی وقت دریائے دجلہ کے کنارے گئے اور لباس دھوڈالا...... لوگوں نے کہا: ''امام صاحب! آپ نے نجاست کی ایک متعین مقدار جائز قرار دی ہے پھر آپ اتنی سی مٹی کیوں دھو رہے ہیں؟'' ......انہوں نے کہا: ''وہ فتویٰ ہے اور یہ تقویٰ ہے۔'' (گلدستۂ ظرافت: ۱۳۳)

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور ان کا پرلطف انصاف

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے کسی آدمی نے پوچھا: ''پستے کا حلوہ مزیدار ہوتا ہے یا بادام کا؟''.... قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ''چونکہ معاملہ انصاف کا ہے اس لئے فریقین کی غیر حاضری میں انصاف نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا دونوں کو حاضر کیا جائے۔ (گلدستۂ ظرافت: ۱۳۸)

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کا مشورہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کے قریب ایک سب انسپکٹر پولیس بھی رہتا تھا اور اس کے یہاں کی رنگ رلیوں سے مولانا بہت پریشان تھے..... جب یہ معاملہ بہت بڑھ گیا تو انہوں نے ایک ایجنٹ کے معرفت مکان خریدنے کا ارادہ کیا اور اسے تاکید کی کہ سب انسپکٹر پولیس کو خریدار کے نام کا علم نہ ہو..... ایجنٹ نے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد اس شخص کو مکان بیچنے پر آمادہ کرلیا......

سب انسپکٹر نے مکان بیچنے سے پہلے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ چاہا اور اس سلسلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا..... مولانا کے لئے یہ موقع بہت عجیب وغریب تھا مگر انہوں نے مکان نہ بیچنے کا مشورہ دیا۔ ایجنٹ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت حیران ہوا اور اس نے اس سلسلے میں مولانا سے کہا: ''حضور! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟''..... مولانا نے جواب دیا: ''مسئلہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر اسے غلط مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔'' (گلدستۂ ظرافت: ۱۶۸)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی حاضر جوابی

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ امام وقت تو تھے لیکن ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی بھی مشہور تھی..... ان کے پاس دور، دور سے سائل آیا کرتے تھے اور ان کی خوش گوئی وحاضر جوابی سے مطمئن بھی ہوتے تھے اور محظوظ بھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک کرسچین سائل ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بڑے المیہ انداز میں کربلائے معلی کا تذکرہ کرتے ہوئے پوچھا: ''کربلا کے میدان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں پر اتنے مظالم ڈھائے گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو آپ لوگوں کے مطابق محبوب الٰہی بھی ہیں انہوں نے

خالق کائنات کے دربار میں سفارش نہیں کی''...... امام غزالی نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا سفارش تو بہت کی تھی لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا'' اے نبی'' تمہیں اپنے نواسوں کی پڑی ہے۔ یہاں لوگوں نے میرے بیٹے کو سولی پر چڑھا دیا''...... اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف تھا۔ کرچین سائل لاجواب ہو گیا اور واپس چلا گیا۔ (گلدستہ ظرافت ۱۷۷)

حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور مسجد کا ایک امام

ایک دفعہ حضرت شیخ بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو امام مسجد نے پوچھا کہ'' آپ نہ تو کسی سے کچھ طلب کرتے ہیں اور نہ کچھ کام کرتے ہیں تو پھر آپ کی گزر کس طرح ہوتی ہے؟''۔

شیخ نے فرمایا:'' صبر کر! پہلے میں نماز دوبارہ پڑھ لوں پھر جواب دونگا۔ کیونکہ ایسے شخص کے پیچھے نماز درست نہیں جو رزق دینے والے کو نہیں جانتا''۔ (گلدستہ ظرافت ۱۷۹)

مفتی کو مسئلہ میں تشقیق نہیں کرنا چاہیے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا: کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مفتی کو مسئلہ میں تشقیق نہیں کرنا چاہیے بلکہ مسائل سے ایک شق کی تعیین کرا کر صرف اس کا جواب دیدینا چاہیے۔ تجربہ سے معلوم ہوا، بڑے کام کی وصیت ہے، مفتیوں کے کام کی بات ہے کیونکہ تشقیق میں بعض اوقات اپنے مفید شق کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ (الافاضات الیومیہ:۳۰۴)

مضحکہ خیز بہانہ

چار ٹھگ کہیں جمع ہو گئے انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی بکری کا بچہ اٹھائے جا رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اس آدمی سے یہ بچہ کسی طرح لینا چاہئے تو وہ مشورہ کر کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو گئے جب پہلے ٹھگ کے پاس سے وہ آدمی گزرا تو پہلا ٹھگ سامنے آیا اور بڑے احترام سے ملا اور کہنے لگا: میاں صاحب! کیا حال ہے؟ ماشاء اللہ آپ کے چہرے سے کیا نور برس رہا ہے لیکن آپ نے ہاتھوں میں کتے کا بچہ اٹھایا ہوا ہے، استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس آدمی نے اس ٹھگ کو جھڑک دیا، دفع ہو جا، اندھا ہے تجھے نظر نہیں آتا یہ بکری کا بچہ ہے۔ خیر جب تھوڑی دور آگے گیا تو دوسرا ٹھگ نکل آیا اور یہی بات کہی تو اب اس کے ذہن میں تھوڑا سا کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں یہ صحیح نہ کہہ رہے ہوں حتیٰ کہ جب وہ آخری ٹھگ کے پاس پہنچا تو بکری کے بچے کو پھینک دیا اور یہ کہہ کر چل دیا جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں تو یہ کتے کا بچہ ہی ہوگا۔

ف: یہی حال ہمارا ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنا جائز اس لئے بتلاتے ہیں کہ فلاں مولوی کے گھر میں ہے، فلاں بڑے کے گھر میں ہے اس لئے یہ ہمارے لئے بھی جائز ہے، کیا ہی احمقانہ بات ہے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

تعویذ بمقابلہ تعویذ

ایک بار حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "کہ لوگ عجیب کاموں کے لئے تعویذ مانگتے ہیں، ایک پہلوان نے کشتی میں دوسرے پہلوان پر غالب آنے کے لئے تعویذ مانگا، میں نے کہا اگر وہ پہلوان بھی کسی سے تعویذ مانگ لے تو پھر تو تعویذ (بمقابلہ) تعویذ میں کشتی ہوگی"۔ (اشرف اللطائف)

نیم مُلا خطرہ ایمان

عالمگیر کی عدالت میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوا، جس نے چار نکاح کر رکھے تھے اور ایک خاوند کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی۔ ظالم نے ہر ایک سے یہ شرط کر رکھی ہوگی کہ میں سال میں تین مہینہ تمہارے گھر رہوں گی اور نو مہینہ اپنے گھر رہوں گی۔ تین مہینہ کے بعد وہ دوسرے خاوند کے پاس رہتی، اس سے غالباً یہی شرط تھی، پھر تین مہینہ کے بعد تیسرے خاوند کے پاس رہتی، ان میں سے ہر ایک سمجھتا تھا کہ شرط کے موافق نو مہینے اپنے گھر رہے گی۔ یہ خبر کسی کو نہ تھی کہ یہ اس مدت میں اپنے دوسرے آشناؤں کے پاس جاتی ہے۔

دہلی بڑا شہر ہے۔ وہاں ایسے واقعات کا مخفی رہ جانا کچھ دشوار نہیں، مگر کب تک؟ آخر کو بھانڈا پھوٹا۔ اور عالمگیر کے دربار میں یہ واقعہ پیش ہوا، اور وہ عورت طلب کی گئی۔ ایک طالب علم نے اس عورت سے کچھ رقم قرض لی اور رہائی کی تدبیر بتلائی کہ تو یہ کہدینا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کو وعظ میں یہ کہتے سنا تھا: کہ لوگ فضول حرام کاری کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے چار نکاح کی اجازت دی ہے۔ اور یہ اگر دریافت کیا جائے کہ مولوی صاحب نے یہ اجازت مردوں کے لئے بیان کی تھی یا عورتوں کے لیے؟ تو یہ کہہ دینا کہ بس میں نے اتنا ہی سنا تھا کہ پھر ساگ لینے چلی گئی۔ میں نے تو اس اجازت کو عام ہی سمجھا تھا یہ طالبعلم نیم ملا خطرہ ایمان تھا کہ اس نے چار نکاحوں کی اجازت کو عام کر دیا۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

بادشاہ سمجھ کر آیا ہوں، مفتی سمجھ کر نہیں آیا

ایک شخص ہارون الرشید کے صاحب زادہ مامون الرشید کے پاس آیا۔ اور حج ادا کرنے کے لیے ان سے روپیہ مانگا۔ مامون الرشید نے کہا: اگر تم صاحب مال ہو تو سوال کیوں کرتے ہو اور اگر صاحب مال نہیں ہو تو تم پر حج فرض نہیں۔ اس نے کہا میں آپ کو بادشاہ سمجھ کر آیا ہوں مفتی سمجھ کر نہیں آیا۔ مفتی تو شہر میں آپ سے زیادہ موجود ہیں، آپ مجھے فتویٰ نہ سنائیں جو دے سکتے ہیں دید یجئے، ورنہ انکار کر دیجئے۔ مامون الرشید کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی اور حج کے لیے رقم دیدی۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات)

عشاء کے بعد قصہ کہانیوں سے ممانعت کا سبب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

میں نے گھر میں عشاء کے بعد ایک بات پوچھنے کو کہنے کو منع کر رکھا ہے جس میں سوچنا پڑے، کیونکہ نیند جاتی رہتی ہے اس سے حدیث شریف کا راز معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کے بعد ''سمر'' یعنی قصہ اور باتوں سے منع فرمایا ہے جو ﴿جعلنا الليل سكنا﴾ کے بھی خلاف ہے کسی چیز کی طرف توجہ دلانا جو سکون اور آرام کے خلاف ہو۔ (مقالات حکمت)

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی شادی

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوشخبری دی تھی۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے کپڑوں پر ایک پیلا سا نشان نظر آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے ایک خاتون سے نکاح کیا (مطلب یہ تھا کہ نکاح کے موقع پر کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی، اس کا یہ نشان باقی رہ گیا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برکت کی دعا دی اور فرمایا کہ ''ولیمہ کرنا، چاہے ایک بکری ہی کا ہو''۔ (مشکوٰۃ ۲۷۸/۲)

ف: اندازہ لگائیے! کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریبی صحابی ہیں کہ دس منتخب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن انہوں نے نکاح کیا تو نکاح کی مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی مزید یہ کہ اس سے ولیمہ کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ (مؤلف)

فقہ اور تقویٰ

حضرت مولانا محمد منیر صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ایک مرتبہ مدرسہ کے ڈھائی سو روپے لیکر مدرسہ کی سالانہ روداد طبع کرانے کے لئے دہلی تشریف لے گئے، اتفاق سے روپے چوری ہو گئے۔ مولوی صاحب نے اس چوری کی کسی کو اطلاع نہیں کی اور مکان میں آکر اپنی کوئی زمین وغیرہ بیع (تجارت) کی اور ڈھائی سو روپے لے کر دہلی پہنچے اور کیفیت چھپوا کر لے آئے، کچھ دنوں بعد اس کی اطلاع اہل مدرسہ کو ہوئی۔ انہوں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو واقعہ لکھا اور حکم شرعی دریافت کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ مولوی صاحب امین تھے اور روپیہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے، اس لئے ان پر ضمان نہیں۔ اہل مدرسہ نے مولانا محمد منیر صاحب سے درخواست کی کہ آپ روپیہ لے لیجئے اور مولانا کا فتویٰ دکھلا دیا۔ مولوی صاحب نے فتویٰ دیکھ کر فرمایا: ''میاں رشید صاحب نے فقہ میرے ہی لئے پڑھا تھا اور کیا یہ مسائل میرے ہی لئے ہیں؟ ذرا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے؟ جاؤ، لے جاؤ اس فتوے کو، میں ہرگز دو پیسے بھی نہ لوں گا۔ (بنات عائشہ رضی اللہ عنہا ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ)

جمعہ کی نماز

ایک زمیندار خوش ہو کر اپنے ایک ملازم کو انعام میں کمزور قسم کا گھوڑا دیا۔ ملازم جو بہت شرارتی تھا فوراً

گھوڑے پر بیٹھ کر ایک طرف چلنے لگا، اس زمیندار نے پوچھا بھئی! کہا جا رہے ہو؟ ملازم نے جواب دیا: حضور! میں جمعے کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ زمیندار حیران ہو کر بولا مگر آج تو جمعرات ہے۔ اس پر ملازم نے برجستہ جواب دیا: ''جناب! آپ کا عطا کیا ہوا گھوڑا جمعہ تک مسجد میں پہنچ جائے گا۔

ایک مٹھی مٹی

ایک شخص کا انتقال ہوا تو اسے کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ اس نے کہا کہ جب میری نیکیاں اور برائیاں وزن کی گئیں تو برائیاں نیکیوں سے بڑھ گئیں۔ اچانک ایک تھیلی نیکیوں کے پلڑے میں آکر گری جس کی وجہ سے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا، میں نے جب تھیلی کھولی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں ایک مٹھی مٹی تھی جو میں نے تدفین کے وقت ایک مسلمان کی قبر میں ڈالی تھی، اس طرح میری یہ نیکی کام آ گئی۔ (توضیح السنن: ۶۸۴/۲)

ایسا بھی ہوتا ہے

شیخ عبدالوہاب شعرانی بیان کرتے ہیں: کہ جب مفتی عبدالرحمٰن زین الدین مالکی بیمار ہوئے تو میں عیادت کے لئے ان کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ بیماری نے کام تمام کر دیا ہے، بس اب تھوڑی دیر کے مہمان ہیں اور موت نے حلق بندی کر رکھی ہے کہ ایک گھونٹ پانی بھی نہیں اتر سکتا اس حالت میں ایک شخص استفتاء لے کر آیا، مفتی صاحب نے فرمایا: ''مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو'' چنانچہ لوگوں نے بٹھا دیا، آپ نے غور سے سوال پڑھا اور جواب لکھ دیا، اس شدت مرض اور پریشانی کے عالم میں ابھی ذہن بالکل حاضر تھا، جواب تحریر کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، پھر فرمایا:

''یہ آخری جواب ہے''

اسی رات میں انتقال فرما گئے۔ (شذرات الذھب: ۳۳۰/۵)

رونق درس

امام شمس الائمہ حلوانیؒ کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی ضرورت سے کسی گاؤں میں تشریف لے گئے وہاں جتنے شاگرد تھے وہ استاد کی خبر سن کر زیارت کے لئے حاضر ہوئے مگر قاضی ابوبکر حاضر نہ ہو سکے۔ بعد میں جب ملاقات ہوئی تو استاد نے دریافت کیا۔ انہوں نے والدہ کی کسی ضروری خدمت بجالانے کا عذر کیا۔

شیخ نے فرمایا: ''رزق میں وسعت ہوگی مگر رونق درس حاصل نہ ہوگی۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ویسے بھی عام طور سے مشہور ہے کہ والدین کی خدمت رزق میں زیادتی کا سبب ہوتی ہے اور اساتذہ کی خدمت علم میں ترقی کا۔ (بنات عائشہ رضی اللہ عنہا، صفر ۱۴۲۹ھ)

جوتوں کی قیمت (ترکی بہ ترکی)

جاحظ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ میں ایک بار بصرہ کی ایک مشہور شاہراہ سے گذر رہا

تھا۔ میں نے جوتوں کی ایک شاندار دکان دیکھی، میں اس کے اندر چلا گیا اور ایک خوبصورت جوتا پسند کیا اور صاحب دکان سے اس کی قیمت دریافت کی۔ جواب ملا" دس درہم" یہ بہت زیادہ تھے۔ اس لئے مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا" اگر یہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر جو گائے قربان کی تھی اس کی کھال کا بھی بنا ہوا ہوتا تب بھی میں اس کے لئے ایک درہم سے زیادہ ادا نہ کرتا۔" دکاندار نے یہ سنا اور جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک اٹھا، میری طرف نظریں اٹھائیں اور کہا:" اگر تمہارے پاس اصحاب کہف والے درہم ہوتے تب بھی میں تمہیں یہ جوتا ایک درہم میں نہ دیتا۔"

ف: صدر بش کو جب سے جوتے کھانے کو ملے ہیں تب سے جوتوں کی قدر و قیمت میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے لہذا جوتوں کی غیر ضروری استعمال سے مکمل طور پر گریز کریں ورنہ حفاظتی اقدامات کی بناء پر جوتوں پر پابندی بھی لگ سکتی ہے۔" آؤ جوتا... جوتا کھیلیں" کا دلچسپ کھیل بھی نہ کھیلیں البتہ کفر، "بش، مُش... مسلم کُش اور اس کے ہم پیالہ، ہم نوالہ اور روشن خیال دوستوں پر پاپوش یاری، جفت زنی اور بوٹ زنی امر جائز و مستحسن ہی نہیں بلکہ واجب ہے، اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیجئے۔ (مؤلف)

توپ و تفنگ سے نہ سامان حرب سے ☆ سر سے غرور نکلا ہے جوتے کی ضرب سے
چمڑے سے بنا جوتا تو ہوسکتا ہے ضائع ☆ تاریخ کا جوتا کبھی ضائع نہیں ہوتا
جب وقت زوال آجاتا ہے ☆ تو جگ میں ہنسائی ہوتی ہے
تب قسمت ساتھ نہیں دیتی ☆ جوتوں سے پٹائی ہوتی ہے

جوتا اور فحاشی

جوتے اور فحاشی کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اور زیر نظر مضمون کا ماقبل والے مضمون سے تعلق بھی کچھ کم گہرا نہیں ہے۔ ایڑھی والا جوتا جب ٹک ٹک کرتا ہے تو لوگوں کو متوجہ کرتا ہے۔ جوتے کو زنا کی ایک وجہ کہا گیا ہے۔ جوتے جو بھی ایڑھی والے ہوتے ہیں اس سے کولہے باہر کی طرف نکل جاتے ہیں اور سینہ آگے کی طرف نکل جاتا ہے اور یوں عورت فحاشی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک سادہ جوتا استعمال کیا جاتا تھا تو اس وقت فحاشی بھی کم تھی۔

آج سنت نبوی ﷺ کو پامال کر کے اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کر کے ہماری بچیاں اور بہنیں جب پانچ پانچ انچ کی ایڑھی والا جوتا پہن کر گھر سے نکلتی ہیں تو گلیوں کی نکڑوں پر کھڑے ہوئے ہمارے ہی مسلمان نوجوان ان کو ایذا دیتے ہیں اور آوازیں کستے ہیں۔

آج فحاشی حد سے بڑھ چکی ہے۔ اللہ ہر گناہ سے درگزر کرتا ہے مگر فحاشی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ کا عذاب آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اسلام آباد (مارگلہ ٹاور) والوں کا حال ہمارے سامنے ہے۔ کیسے اللہ کے عذاب نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ استغفر اللہ۔

آج کل تو دوکاندار بھی جوتا پسند کروانے میں پیش پیش ہوتے ہیں، ہنس ہنس کر بتارہے ہوتے ہیں کہ میڈم آپ کے پاؤں میں یہ جوتا بہت اچھا لگتا ہے! کہاں یہ مومن عورت اور کہاں ایک نامحرم شخص کا جوتے اور پاؤں کے متعلق تبصرہ..... تو اللہ عزوجل کو غصہ آئے کہ نہ آئے؟

ف: اونچی ایڑھی والا جوتا جہاں فحاشی کا سبب بنتا ہے وہاں ہمارے لئے مختلف مسائل بھی کھڑے کردیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کمر کا درد ایک عام مسئلہ ہے اور یہ اونچی ایڑھی والے جوتے سے ہوتا ہے۔ آپ اپنا جوتا بدل لیں پریشانی خودبخود دور ہو جائے گی۔

ابلیسی گُر

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا جب ایک انگریز میجر کی بیوہ حضرت مولانا صدیقؒ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئی تھی۔ اس کے آنجہانی شوہر کے کتب خانہ سے ایک کتاب ''خفیہ فوجی ہدایات'' مولانا کے ہاتھ آئی تھی، اس میں ایک نئے مفتوحہ عرب علاقہ کا جذبہ حریت ختم کرکے انہیں ''مرد'' سے ''نامرد'' بنانے کا یہ ''ابلیسی گُر'' لکھا ہوا تھا۔

ترجمہ: ''انہیں غیر مسلح کرکے، عیاش اور زناکار بناکر ناچ رنگ اور ساز وآہنگ میں لگادو اور فیشن کو زیادہ فروغ دو کہ فیشن پرستی میں یہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے باہم رقابت وحسد کرنے لگیں، تم دیکھو گے کہ چند ہی دن میں یہ ''مرد'' سے ''نامرد'' ہو جائیں گے۔

اس ''نسخہ ابلیسی'' کو بار بار پڑھیئے اور انگریز کے عروج اور مسلمانوں کے زوال کی تاریخ دھراتے جایئے یہی ''ابلیسی گُر'' ہر جگہ کارفرما نظر آئے گا۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب فرمایا تھا۔

؎ مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں مغربی رنگ طبیعت کو بدل دیتے ہیں

(محاسن اسلام ملتان۔ اپریل 2009)

موبائل اور بدگمانی

آج کل موبائل فون عام ہے اس کے استعمال میں بدگمانی سے یوں بچیئے کہ دوران گفتگو جب رابطہ ختم ہو جائے تو اسے نیٹ ورک کا مسئلہ یا بیٹری، بیلنس ختم ہونے کی علامت سمجھیں۔ اسی طرح اگر مطلوبہ آدمی آپ کی کال ریسیو (Receive) نہیں کررہا تو ہوسکتا ہے وہ کسی مجبوری میں ہو یا فون اس سے دور ہو یا کسی سواری پر یا بازار میں شور ہونے کی وجہ سے فون گھنٹی نہ سن پارہا ہو اس لئے بدگمانی نہ کریں کیونکہ اچھے گمان کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں جبکہ بدگمانی کے لئے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔

یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا واقعہ مشہور ہے کہ ہارون الرشید نے ان کی خدمت میں ایک درخواست کی تھی کہ حرام خلافت میں قدم رنجہ فرما کر شہزادوں کو علم حدیث پڑھا دیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا: ''کہ علم کے پاس لوگ خود آتے ہیں، وہ دوسروں کے پاس نہیں جاتا'' انہوں نے اس بات سے ہارون کو اور بھی غیرت دلائی کہ ''یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے اگر تم ہی اس کی عزت نہ کرو گے تو وہ کیونکر عزت پا سکتا ہے''۔ اس معقول جواب کو ہارون نے نہایت خوشی سے تسلیم کیا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام موصوف کی درسگاہ عام میں حاضر ہوں۔

ایک آنے کا سود

رچرڈ پرائس برطانیہ کا مشہور عیسائی عالم (Thelogian) اور ماہر معاشیات ہے، اس نے اپنے ایک مضمون میں باقاعدہ حساب لگا کر بتایا تھا کہ اگر سن ۱ء میں ایک پینی (جو تقریباً ایک آنہ کے مساوی ہوتی ہے) سود مرکب پر کسی کو قرض دی گئی ہوتو سرمایہ دارانہ نظام کے شروع ہونے تک اس کا سود اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اس سے سونے کا ایک کرہ تیار ہو سکتا ہے جس کا حجم کرہ زمین سے کئی گنا زائد ہوگا۔

L.Leantyer A Short Course of Political Economy.

Progress Publishers Moscow 1968. (۷۸ ج ۱۳)

نو روٹیاں۔ نو پرچے

حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی صاحب رحمہ اللہ جب دار العلوم کے ناظم تھے تو اس وقت ان کے مدرسے میں ایک لحیم شحیم قد آور پٹھان پڑھتا تھا، وہ دورۂ حدیث کا طالب علم تھا۔ انتہائی محنتی اور قابل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد پیٹو (زیادہ کھانا والا) بھی تھا۔ حسب دستور اس کو باورچی خانے سے دو روٹیاں ملنے لگیں تو اس نے حضرت کو درخواست لکھی:

''میرے لئے دو روٹیاں ناکافی ہیں لہذا میری روٹیاں بڑھائی جائیں۔''

حضرت نے تین روٹیاں جاری کر دیں۔ کچھ دنوں بعد دفتر میں پھر اس کی درخواست آئی: ''تین روٹیوں پر گزارہ نہیں ہوتا۔'' اس پر اسے چار روٹیاں ملنے لگیں۔

چند دن بعد پھر درخواست آئی: ''اب بھی بھوکا رہتا ہوں'' چنانچہ اس کی روٹیوں کی تعداد پانچ کر دی گئیں لیکن اس کا پھر بھی گزارا نہیں ہوتا تھا اور صدائے ''ھل من مزید'' (اور چاہئے) جاری رہی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمہ اللہ منتظم بھی تھے اور نرم دل بھی انتہا درجے کے تھے۔ انہوں نے بلا کر فرمایا: ''آج مطبخ (باورچی خانے) میں بیٹھ کر خوب سیر ہو کر کھا لو جتنی روٹیاں آج کھاؤ گے آئندہ

اتنی روٹیاں جاری ہونگی۔"

اس طالب علم نے نو روٹیاں کھائیں چنانچہ وعدے کے مطابق اب نو روٹیاں اسے مستقل دی جانے لگیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر درخواست آئی کہ روٹیوں میں اضافہ کیا جائے۔ حضرت نے مزید روٹیاں دینے سے انکار کر دیا اور جواب دیا: "اس دن تم نے نو روٹیاں کھائی تھیں لہذا اب نو ہی پر گزارہ کرو۔"

خان صاحب کہنے لگے: "وہ تو اتفاقی امر تھا لازمی تو نہیں تھا کہ ہمیشہ نو ہی کھاؤں گا" لیکن حضرت نے اضافہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر خان صاحب دل ہی دل میں بہت ناراض ہوئے۔

جب دورۂ حدیث شریف کا امتحان ہوا تو دس پرچے تھے۔

۱	بخاری	۲	مسلم	۳	ابوداؤد	٤	ترمذی
۵	سنن ابن ماجہ	٦	نسائی	۷	طحاوی	۸	مؤطاامام مالک
۹	مؤطاامام محمد	۱۰	شمائل ترمذی				

اس طالب علم نے نو پرچے تو خوب اچھی طرح حل کئے لیکن دسواں پرچہ بالکل حل نہیں کیا بلکہ اس پر لکھا:

"چونکہ مجھے نو روٹیاں ملتی ہیں اس لئے میں نے نو پرچے حل کر دیئے اور نہ مدرسہ والوں نے دسویں روٹی دیں اور نہ میں نے دسواں پرچہ حل کیا۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک حکیمانہ قول

علامہ ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک حکیمانہ قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"الانقباض عن الناس مكسبة للعداوة، والانبساط مجلبة لقرناء السوء فكن بين المنقبض والمنبسط"

لوگوں کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنا لوگوں کو دشمن بنالیتا ہے اور بہت زیادہ خندہ پیشانی برے ہم نشینوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، لہذا ترش روئی اور بہت زیادہ خندہ پیشانی کے درمیان معتدل راہ اختیار کرو۔ (تراشے: ۱۳۸ بحوالہ فتاوی ابن الصلاح: ۳۱)

شہادت کیا ہے ؟

☆ شہادت ایک ایسی چاشنی ہے جس کی تمنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔
☆ شہادت ایک ایسا کھیل ہے جس میں جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا چراغ ہے جو صرف خون سے جلتا ہے۔
☆ شہادت ایک ایسی روشنی ہے جو صرف پروانوں کو ملتی ہے۔

☆ شہادت ایک ایسا راستہ ہے جو سیدھا جنت میں جاتا ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا پھول ہے جو مقدر والے انسان کو ملتا ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا مقام ہے جس سے انسان خدا کا محبوب بن جاتا ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا پرندہ ہے جو جہاد کے میدان میں اترتا ہے اس کو پکڑنے کے لئے خون کا جال لگانا پڑتا ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا پودا ہے جسے صرف خون کا پانی دیا جا سکتا ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا نور ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوتی ہے۔
☆ شہادت ایک ایسا مزہ ہے جسے پانے کی انسان جنت میں بھی تمنا کرتا ہے۔

أحد عشر كوكباً

کیسے ملا۔۔۔؟

ابن مدینیؒ کہتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا آپ کو اتنا بہت سا علم کیسے ملا؟ انہوں نے کہا
''چار باتوں کی وجہ سے:
(۱) کسی کتاب کے بھروسے پر کبھی نہیں رہا یعنی کتابوں کو حفظ کر کے سینے میں بٹھا لیا۔ (۲) علم حاصل کرنے کے لئے شہروں شہروں میں گھوما۔ (۳) جمادات (بے جان اشیاء) کی طرح صبر سے کام لیا۔ (٤) کوے کی مانند صبح سویرے اٹھنے کی عادت اپنائی۔
(مشہور ہے کہ کوا صبح صادق سے بھی بہت پہلے بیدار ہو جاتا ہے۔)

لطیف شکایت اور اس کا حکیمانہ ازالہ

امام شعبیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا:
''امیر المومنین! میرے شوہر جیسا نیک آدمی شاید دنیا میں کوئی نہیں، وہ دن بھر روزہ رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کا منشا پوری طرح نہ سمجھ پائے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے اور تمہاری مغفرت کرے۔ نیک عورتیں اپنے شوہر کی ایسی ہی تعریف کرتی ہیں۔''
عورت نے یہ جملہ سنا، کچھ دیر جھجکی رُکی اور پھر واپس جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔
کعب بن سوار رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، انہوں نے عورت کو واپس جاتے دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''امیر المومنین! آپ اس کی بات نہیں سمجھے، وہ اپنے شوہر کی تعریف نہیں، شکایت کرنے آئی تھی، اس کا شوہر جوشِ عبادت میں زوجیت کے پورے حقوق ادا نہیں کرتا۔''
''اچھا یہ بات ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بلاؤ اسے'' وہ عورت پھر واپس آئی، اس سے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ واقعی حضرت کعب بن سوار رضی اللہ عنہ کا خیال صحیح تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ "اب تم ہی اس کا فیصلہ کرو"

"امیر المومنین! آپ کی موجودگی میں کیسے فیصلہ کروں؟" حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"ہاں! تم نے ہی اس کی شکایت کو سمجھا تم ہی ازالہ کرو" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اس پر حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا "امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کو زیادہ سے زیادہ چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، اگر کوئی شخص اس اجازت پر عمل کرتے ہوئے چار شادیاں کرے تو بھی ہر بیوی کے حصے میں چار میں سے ایک دن رات آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چوتھا دن رات ایک بیوی کا حق ہے۔ لہذا آپ فیصلہ دیجئے کہ اس عورت کا شوہر تین دن عبادت کر سکتا ہے، لیکن چوتھا دن لازماً اسے اپنی بیوی کے ساتھ گزارنا چاہیے۔"

یہ فیصلہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھڑک اٹھے اور فرمایا: "یہ فیصلہ تمہاری پہلی فہم اور فراست سے بھی زیادہ عجیب ہے۔" اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا قاضی بنا دیا۔
(تراشے: ۸۴)

خوابوں کی حقیقت

شریک بن عبداللہؒ خلیفہ مہدی کے زمانہ میں قاضی تھے، ایک مرتبہ وہ مہدی کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں قتل کروانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا:

"امیر المومنین کیوں؟"

مہدی نے کہا۔ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم میرا بستر روندرہے ہو اور مجھ سے منہ موڑے ہوئے ہو۔ میں نے یہ خواب ایک معبّر کے سامنے پیش کیا تو اس نے یہ تعبیر دی کہ قاضی شریک ظاہر میں تو آپ کی اطاعت کرتے ہیں لیکن اندر اندر آپ کے نافرمان ہیں۔"

قاضی شریک نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم امیر المومنین، نہ آپ کا خواب ابراہیم علیہ السلام کا خواب ہے اور نہ آپ کا تعبیر دینے والا یوسف علیہ السلام ہے۔ تو کیا آپ جھوٹے خوابوں کے بل پر مسلمانوں کی گردنیں اتارنا چاہتے ہیں؟"

مہدی یہ سن کر جھینپ گیا، اور قتل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ (تراشے: ۱۰۵)

حضرات حسنین رضی اللہ عنہ کا انداز تبلیغ

علامہ کردری رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ دریائے فرات کے کنارے میں ایک بوڑھے دیہاتی کو دیکھا کہ اس نے بڑی جلدی جلدی وضو کیا، اور اسی طرح نماز پڑھی، اور جلد بازی میں وضو اور نماز کے مسنون

طریقوں پر کوتاہی ہوتی۔ حضرات حسنین چاہتے تھے کہ اسے سمجھانا چاہتے تھے لیکن اندیشہ یہ ہوا کہ یہ عمر رسیدہ آدمی ہے اور اپنی غلطی سن کر کہیں مشتعل نہ ہو جائے۔ چنانچہ دونوں حضرات اس کے قریب پہنچے اور کہا کہ ''ہم دونوں جوان ہیں، اور آپ تجربہ کار آدمی ہیں، آپ وضو اور نماز کا طریقہ ہم سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپکو وضو کرکے اور نماز پڑھ کر دکھائیں، اگر ہمارے طریقے میں کوئی غلطی یا کوتاہی ہو تو بتا دیجئے گا۔'' اس کے بعد انہوں نے سنت کے مطابق وضو کرکے نماز پڑھی۔ بوڑھے نے دیکھا تو اپنی کوتاہی سے توبہ کی، اور آئندہ یہ طریقہ چھوڑ دیا۔ (تراشے ۱۱۵ بحوالہ مناقب الامام الاعظم للکردری ۱/۳۹)

اہل علم کی بری عادت کسی کی کتاب لے کر نہ دینا

اہل علم کی یہ حالت ہے کہ کسی کی کتاب لے لی تو واپس دینے کا نام جانتے ہی نہیں۔ کتاب دینے والا اگر کثیر المشاغل ہے تو اس کو یاد بھی نہیں رہتا کہ مجھ سے کتاب کس نے مانگی تھی۔ بس مہینہ بھر کے بعد وہ سمجھ لیتا ہے کہ کتاب چوری ہوگئی اور لینے والا بے فکر ہو گیا کہ وہ تو مانگتا ہی نہیں، اب گویا وہ ان کی ملک ہوگئی۔ (تحفۃ العلماء، ۱/۱۷۳)

علماء کو دعوتوں میں شریک نہ ہونا چاہئے

علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ فقہاء وعلماء کسی کی دعوت نہ کھائیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ آج کل اس میں ذلت ہے۔ واقعی یہ حضرات فقہاء حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ فقہاء وعلماء کو کسی کی شہادت بھی نہ دینی چاہئے۔ اس کا راز یہ ہے کہ ان کو سب مسلمانوں سے یکساں تعلق رکھنا چاہئے اور شہادت میں ایک فریق شمار کیا جائے گا۔ (الافاضات: ۲/ ۱۱۴)

غلط مشورہ

فرمایا ایک اضرار دین یہ ہے کہ جس میں اہل مدارس (خصوصاً مہتممین حضرات) مبتلا ہیں کہ کسی طالب علم نے کسی سے مشورہ لیا کہ میں کونسے مدرسہ میں پڑھوں تو ہر مدرسے والا اپنے ہی مدرسے کا مشورہ دیتا ہے۔ گو جانتے ہیں کہ اس کا نفع دوسرے مدرسے میں زیادہ ہے۔ افسوس آج کل اہل علم بھی غلط مشورہ دینے لگے ہیں اور پہلے زمانہ میں کفار بھی غلط مشورہ نہ دیتے تھے۔ (خیر الارشاد ص ۱۲۹)

مسجد دار العمل ہے اور مدرسہ دار العلم ہے۔ سو جس طرح مساجد متعدد (کئی ایک) ہونے میں کوئی حرج نہیں اسی طرح مدارس کے متعدد ہونے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے مگر حالت یہ ہے کہ مدرسوں کے متعدد (زیادہ) ہونے سے گرانی ہوتی ہے۔ سو ایسا نہیں سوچنا چاہئے بلکہ خوشی ہونی چاہئے کہ کام کرنے والے بہت ہو گئے مگر چونکہ مدارس میں اکثر غلبہ امراض نفسانیہ کو ہوتا ہے اس لئے ان کی تعداد سے گرانی ہوتی ہے۔ (تحفۃ العلماء، ۱/۲۴۸)

احیاء سنت کی تعریف

شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے مولوی محمد یعقوبؒ کی معرفت مولوی محمد اسماعیل کو یہ کہلایا کہ تم رفع یدین چھوڑ دو اس سے خواہ مخواہ فتنہ ہوگا۔ مولوی اسماعیل صاحب نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو پھر اس حدیث کے کیا معنی ہونگے۔ ''من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد'' اس کو سن کر شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم تو سمجھے کہ اسماعیل عالم ہوگیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں سمجھا۔ یہ حکم تو اس وقت ہے جب کہ سنت کے مقابل خلاف سنت ہو اور ''ما نحن فيه'' میں سنت کے مقابل خلاف سنت نہیں بلکہ دوسری سنت ہے کیونکہ جس طرح رفع یدین سنت ہے اسی طرح ارسال (کھلے چھوڑنا) بھی سنت ہے۔ (بوادر النوادر ۲/۴۶۹)

غیر ضروری اور فضول سوال کا جواب۔۔۔؟

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ ایک عورت جارہی تھی اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی تھا اور اس کا بھائی بھی۔ راستہ میں کسی راہزن نے ان دونوں کو قتل کر دیا اتفاقاً اس طرف سے ایک فقیر کا گذر ہوا اس عورت کی التجاء سے فقیر نے کہا کہ ان دونوں کا سر دھڑ سے ملا کر رکھ دے میں دعا کروں گا عورت نے غلطی سے بھائی کا سر شوہر کے دھڑ میں اور شوہر کا سر بھائی کے دھڑ میں جوڑ دیا۔ فقیر نے دعا کی تو دونوں زندہ ہوگئے اس صورت میں عورت کس کو ملے گی۔

میں نے اس کا جواب نہیں دیا اور سوال کرنے والے کو زجر و توبیخ کی کیونکہ ایسے سوال بالکل لغو اور بے ہودہ ہیں ایسے سوالات کا کوئی جواب نہ دینا چاہئے لوگوں کو چاہئے کہ اپنے کام کی باتیں دریافت کیا کریں ایسے فضول سوالات سے تضیع اوقات نہ کیا کریں۔ (دعوات عبدیت ۴/۴۶)

کسی نے لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا انتقال پیشتر ہوا ہے یا حضرت حوا علیہا السلام کا اور دونوں کے بیچ میں انتقال کے کس قدر زمانہ گزرا ہے۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ ''میں نے کہیں نہیں دیکھا۔''

(دعوات عبدیت ۱۹/۸۸)

ایک خط میں آیا تھا کہ معلوم ہوا کہ بھوک کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شکم مبارک پر پتھر باندھا ہے کتب سیر کے حوالے بھی دیئے ہیں پوچھا تھا کیا یہ صحیح ہے؟ میں نے لکھا کہ اگر صحیح ہو تو تم کیا کرو گے مطلب یہ ہے کہ غیر ضروری تحقیق سے کیا فائدہ۔

ایک شخص ان کے پاس آیا اور سوال کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے اس سائل سے دریافت کیا کہ تم سے موت کے وقت یا قبر میں یا حشر میں یا میزان پر یہ سوال ہوگا؟ عرض کیا کہ نہیں۔ پھر کہا کیا تم کو معلوم ہے کہ قیامت میں نماز کی اول پوچھ

ہوئی؟ غرض یہ کہ جب معلوم ہو گیا کہ اچھا بتلاؤ نماز میں فرض، واجبات، سنن، مستحبات کیا کیا ہیں؟ بے چارہ گم ہو گیا فرمایا کہ جاؤ کام کی باتوں میں وقت صرف کیا کرتے ہیں غیر ضروری سوال نہ کرنا چاہئے ہم سے ہم علماء کو تو چاہئے کہ سائل کے تابع نہ بنیں۔

حضرت والا کے پاس ایک سوال آیا کہ اوج بن عنق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کا عصا کتنے لمبے تھے؟ جواب لکھا کہ جیسا یہ سوال غیر ضروری ہے اسی طرح جواب کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی لا یعنی (فضول) سوال کا میں یہی جواب دیا کرتا ہوں کہ مجھے فرصت نہیں کسی کو کہہ دیا کہ اور عالم سے پوچھ لو۔ کسی کا جواب میں نہیں دیتا اور اگر جواب کے لئے ٹکٹ بھیجا ہو تو اس کو واپس کر دیتا ہوں۔ کسی کو لکھ دیتا ہوں کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق منظور نہیں ہے۔ لہذا تضییع وقت سمجھ کر سکوت کیا جاتا ہے کسی سے ایک دفعہ اصل مسئلہ کی تقریر کر کے فرمایا کہ اس سے زیادہ مجھ کو نہیں معلوم! آپ کی تشفی مجھ سے نہیں ہوسکتی۔ (تحفۃ العلماء: ۱۷۶/۲)

چند مفید مثالیں

آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی نہ واسطہ پڑے یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تا کہ مولوی صاحب کا امتحان ہو سکے۔

۱) چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے۔ میں نے کہا آپ امتحان کے لئے پوچھتے ہیں یا عمل کے لئے۔ اگر عمل کے لئے پوچھتے ہیں تو اس کے لئے مسئول سے اعتقاد ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے ہو گئے اور محض نام سننا کافی نہیں نام تو نا معلوم کتنوں کا سنا ہو گا اور اگر امتحان کے لئے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے؟ بس وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کے سوال کا اس کی مرضی کے موافق جواب دیا کروں۔ جہاں میں دیکھتا ہوں کہ سوال سے مقصود عمل نہیں ہے وہاں کبھی جواب نہیں دیتا۔ (التبلیغ اسباب الفتنہ: ۱۲۷)

۲) ایک طالب علم سے کسی متکبر نے کہہ دیا کہ مسجد کا مینڈھا (جیسے آج کل لوگ کہا کرتے ہیں کہ ملا کی دوڑ مسجد تک)۔ اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہیں۔

اس جواب میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ تو دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے مگر دنیا کا کتا یہ ان کا اقراری لقب ہے اور "المرء یوخذ باقرارہ"

ایک صاحب نے لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے۔ میں نے جواب دیا کہ کافر عورت سے زنا کیوں حرام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ علماء سے اختلاط نہیں کرتے (ان کی صحبت میں نہیں رہتے) اگر ایسا کریں تو بہت سے شبہات حل ہو جائیں۔

۳) ایک رئیس کا بچہ عربی پڑھتا تھا اس سے ایک پولیس افسر نے جو تھیا رلگائے ہوئے تھے اور اس کی ہیبت ایسی مہیب تھی کہ اس کے سامنے ایسا ویسا آدمی بات بھی نہ کر سکے، اس نے یہ سوال کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ عربی پڑھنے والے بہت سر منڈواتے ہیں۔ اس بچے نے بے دھڑک جواب دیا کہ یہ کیا بات ہے کہ انگریزی پڑھنے والے داڑھی منڈواتے ہیں۔ پس وہ چپ ہی تو رہ گئے۔ اگر کوئی غریب قوم کا بچہ ہوتا تو یہ جواب ہرگز نہ دیتا۔ (التبلیغ ۱/۱۴۱)

٤) ایک سائنسدان سکول کے طالب علم نے ایک عربی مدرسہ کے طالب علم سے پوچھا کہ بتاؤ آسمان میں کل ستارے کتنے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ تم یہ بتاؤ کہ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں؟ اس نے کہا یہ تو مجھ کو معلوم نہیں۔ طالب علم نے کہا افسوس ہے کہ تم کو زمین کی چیزوں کا بھی پورا علم نہیں جس میں تم رہتے ہو اور مجھ سے آسمان کی چیزوں کی تعداد پوچھتے ہو جو تم سے ہزاروں کوس دور ہے۔ بس وہ چپ ہی تو رہ گئے۔ (التبلیغ ۱۶۸)

٥) کانپور میں ایک مرتبہ عدالت میں جانے کا اتفاق ہوا ایک فتویٰ پر میں نے دستخط کر دیئے تھے۔ دستخط کرنے والے علماء میں سے جس عالم پر ایک فریق راضی ہوتا تو دوسرا راضی نہ ہوتا مجھ پر فریقین نے رضامندی ظاہر کی مجھے جانا پڑا۔ مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ عالم ہیں؟ اس وقت مجھے بے حد خلجان ہوا اگر انکار کروں تو وکلاء اس قسم کے تواضع کو کیا جانیں کہ یہ انکار تواضعا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے تواضعا انکار کیا اور وہ واقعی انکار سمجھ گئے اور یہ کہو کہ عالم ہوں تو اولاً اپنی وضع کے خلاف اور ثانیاً یہ کہ عالم ہوں کہاں۔ دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمان مجھے ایسے ہی سمجھتے ہیں۔ اور چند سوال ایسے ہی پیچیدہ کئے گئے تھے۔ میں نے سب کو جواب میں مصلحت وقت اور اپنی وضع کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔ وکلاء نے باہر آ کر مجھ سے کہا ماشاء اللہ بہت اچھا جواب دیا اس وقت تو ہم بھی چکر میں آ گئے تھے کہ دیکھئے اس کا جواب کیا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ قلت تجربہ کے باوجود ضروری مصالح کے طریقے ذہن میں آ جاتے ہیں۔ (التبلیغ ۸۶)

٦) مکہ میں مجھے ایک جاہل نے امر بالمعروف کیا کہ تم عمامہ کیوں نہیں باندھتے یہ سنت ہے۔ میں نے کہا تم لنگی کیوں نہیں باندھتے یہ بھی سنت ہے۔ سوچ کر کہنے لگا میں بوڑھا ہوں لنگی میرے جسم پر ٹھہرتی نہیں۔ میں نے کہا میں جوان ہوں عمامہ سے گرمی لگتی ہے اس پر بہت جھلائے، کہنے لگے خدا کرے تمہارے دماغ میں اور گرمی بڑھ جائے۔

۷) ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب آگ کا کیوں مقرر کیا یہ تو بہت بڑھ کر ہے اس سے کم بھی تو ہو سکتا تھا۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی تو بہت بڑھ کر ہے اس سے کم بھی تو ہو سکتی تھی۔

۸) آسانی کے لئے میں نے شریعت کا مسئلہ عام مجمع میں ظاہر کر دیا تھا ان ظالموں نے بجائے قدر کرنے کے اعتراض شروع کر دیا کہ میں نے تو کبھی سنا ہی نہ تھا۔ یہ خوب جاہلوں نے سیکھ لیا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا۔ ارے کیا یہ سب مسئلے سننے میں آنا ضروری ہیں؟ اگر سب مسئلے سن لیتے تو تم بھی عالم نہ ہو جاتے۔

۹) بزرجمہر جو نوشیرواں کا وزیر اعظم تھا اس کا قصہ ہے کہ اس سے ایک بڑھیا عورت نے کسی بات کے متعلق سوال کیا۔ بزرجمہر نے کہا کہ مجھ کو اس کی تحقیق نہیں۔ عورت نے حیرت سے کہا کہ تم کو وزیر ہو کر اس بات کی خبر نہیں؟ پھر اتنی بڑی تنخواہ کس بات کی پاتے ہو؟ بزورجمہر نے کہا کہ اتنی تنخواہ تو میں اپنی معلومات کے عوض پاتا ہوں اگر مجہولات کی تنخواہ پاتا تو ہفت اقلیم کے خزانے بھی کافی نہ ہوتے۔

۱۰) مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک صوفی نے سماع کے جواز کی دلیل میں یہ شعر پیش کیا

بشنو از نے چوں حکایت می کنند

اور کہا کہ اس میں بشنو امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہے۔ اس کا حقیقی جواب تو یہ تھا کہ بیشک امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے مگر کس کے امر سے مولانا رومیؒ کے امر سے یا اللہ تعالیٰ کے امر سے؟ مگر جہلاء لوگ تو اس کو کچھ نہ سمجھتے بس ان کو تو اڑتی ہوئی ایک بات ہاتھ لگ گئی کہ امر وجوب کے لئے ہے۔ وہ جہلاء باتوں کو کیا جانیں کہ امر کے کتنے اقسام ہیں۔

اس لئے مولانا یعقوب صاحب نے فرمایا کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس وقت حجت ہو جب کہ پہلے خود ان کا حجت ہونا ثابت کیا جائے۔ سو سب سے پہلے تو تم ان کا مسلمان ہونا ثابت کرو۔ بس اس جواب سے تو ان پر مٹی پڑ گئی اور سارے دلائل گاؤ خورد ہو گئے۔ غرض ہر جگہ جواب کا مختلف طریق ہوتا ہے۔ (تحفۃ العلماء: ۲/ ۳۷۴ تا ۳۷۹)

تعزیہ توڑنے میں توہین ہے یا نہیں؟

فرمایا کسی نے کہا کہ تعزیہ توڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام لگا ہے ایک صاحب نے خوب جواب دیا کہ گوسالہ سامری میں اللہ تعالیٰ کا نام لگا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ﴿فقالوا ھذا الٰھکم والٰہ موسٰی﴾ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کیوں توڑا...؟ (حوالہ مذکورہ بالا)

غیر مجتہدین کے اجتہاد کی مثال

آج کل استنباطات دیکھے جائیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری فہموں میں کس قدر کجی ہے۔ اہل حدیث کے استنباط بعض مسائل میں دیکھئے کس قدر لغو ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے حدیث "حتی یجد ریحا او یستمع صوتا" سے استدلال کیا اگر ریح خارج ہو لیکن بدبو یا آواز نہ ہو تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ علی ہذا ایسے ایسے بے ہودہ مسائل ہیں کہ سن کر ہنسی آتی ہے

ایک غیر مقلد صاحب نماز میں بحالت امامت کھڑے کھڑے جھوما کرتے تھے۔ جب نماز سے فارغ ہو چکے تو ایک صاحب نے جو پڑھے لکھے تھے پوچھا کہ نماز میں یہ حرکت کیسی؟ کہا حدیث شریف میں آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی! ہم نے تو آج تک بھی ایسی حدیث نہیں پڑھی نہ دیکھی نہ سنی جس کا مطلب یہ ہو کہ ہل کے نماز پڑھو۔ لاؤ ہم بھی دیکھیں وہ کونسی حدیث ہے اور کس کتاب میں ہے۔ (امام صاحب نے) ایک حدیث کی مترجم کتاب لا کر دکھائی اس میں حدیث تھی۔ "اذا ام احدکم فلیخفف" اور ترجمہ لکھا تھا کہ جب امامت کرے تو ہلکی نماز پڑھے۔ آپ نے ہلکی بمعنی خفیف کو ہلکے بمعنی حرکت پڑھا اور ہلنا شروع کر دیا۔ یہ حقیقت تھی ان کے اجتہاد کی۔ (الافاضات ۱/۲۱۵)

اجتہاد کا ایک ادنیٰ نمونہ

ایک غیر مقلد نے مجھ سے ریل میں پوچھا کہ اجتہاد کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا تمہیں کیا سمجھاؤں میں تم سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں اس کا جواب دو اس سے پتہ لگ جائے گا۔

دو شخص سفر میں ہیں جو سب اوصاف میں یکساں ہیں شرافت میں، وجاہت میں۔ جتنی صفتیں امامت کے لئے قابل ترجیح ہو سکتی ہے دونوں میں برابر موجود ہیں۔ دونوں سو کر اٹھے تو ان میں سے ایک کو غسل جنابت کی حاجت ہو گئی اور سفر میں ایسے مقام پر تھے جہاں پانی نہ تھا۔ جب نماز کا وقت آیا تو دونوں نے تیمم کیا ایک نے غسل کا ایک نے وضو کا۔ بتاؤ اس صورت میں امامت کے لئے دونوں میں سے کون زیادہ مستحق ہوگا؟

غیر مقلد صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جس نے وضو کا تیمم کیا ہے وہ زیادہ مستحق ہوگا کیونکہ اس کو حدث اصغر تھا اور دوسرے کو حدث اکبر۔ اور پاکی دونوں کو یکساں حاصل ہے۔ مگر ناپاکی ایک کی بڑھی ہوئی تھی۔ حدث اصغر والے کی پاکی زائد اور قوی ہوئی۔

میں نے کہا کہ مگر فقہاء کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس نے غسل کا تیمم کیا ہے اس کو امام بنانا چاہئے کیونکہ یہاں اصل وضو ہے اور تیمم اس کا نائب ہے۔ اسی طرح غسل اصل اور تیمم اس کا نائب ہے اور غسل افضل ہے وضو سے اور افضل کا نائب بھی افضل ہوتا ہے۔ تو غسل کا تیمم بھی افضل ہوگا وضو کے تیمم سے۔ لہذا جس نے غسل کا تیمم کیا وہ "اقوی فی الطھارۃ" ہوگا۔ یہ ایک ادنیٰ نمونہ ہے اجتہاد کا۔ یہ سن کر غیر مقلد صاحب کو حیرت ہوگئی اور کہا کہ واقعی حکم یہی ہونا چاہئے میری رائے غلط تھی۔ (تحفۃ العلماء:۲/۲۴۸)

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کیا غیر مقلد تھے؟

بعد خود غرض لوگ مشہور کرتے کہ ہمارے بعض بزرگ مقلد نہ تھے امام صاحبؒ کے۔ مثلاً یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ امام صاحب کے مقلد نہ تھے گو میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا لیکن

فرض بھی کرلوں تب بھی امام صاحب کی تقلید ترک نہ کروں گا اتنا سمجھ گیا ہوں امام صاحب کی تقلید کی حقیقت کو۔ (القول الجلیل ۷۰)

مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو بعض لوگ غیر مقلد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ مولانا کے غیر مقلد مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا نے بعض جاہل غالی مقلدین کے مقابلہ میں بعض مسائل خاص عنوان سے تعبیر کرائے۔ اور ایک بار آمین زور سے کہہ دی یوں کہ غلو اس وقت ایسا تھا کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے آمین زور سے کہہ دی تھی تو اس کو مسجد کے اونچے فرش پر سے گرادیا تھا، مولانا کو اس پر بہت جوش ہوا۔ اس کتاب میں ہے کہ آپ نے بیس مرتبہ آمین کہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا ان کو سمجھائیے فرمایا وہ خود عالم ہیں اور تیز ہیں کہنے سے ضد بڑھ جائے گی خاموش رہو۔ مولانا نے ایک رسالہ بھی رفع یدین کے اثبات میں لکھا ہے لیکن وہ غیر مقلد ہرگز نہ تھے۔ میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ وہ سید صاحب کے قافلہ کے ایک شخص سے ملے۔ پوچھا کہ مولانا غیر مقلد تھے؟ کہا یہ تو معلوم نہیں لیکن سید صاحب کے تمام قافلہ میں یہ مشہور تھا کہ غیر مقلد چھوٹے رافضی ہوتے ہیں۔ (کیونکہ ائمہ پر سب وشتم کرتے ہیں) اس سے سمجھ لو کہ اس قافلہ میں کوئی غیر مقلد ہوسکتا ہے۔ (تحفۃ العلماء: ۲/۴۷۰)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ، احتیاط اور تواضع

حکومت وہ چیز ہے کہ حضرات سلف تو اس سے بھاگتے تھے، مارے کھاتے تھے اور قبول نہ کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے آپ مقلد کہلاتے ہیں اسی میں شہید کئے گئے۔

خلیفۂ وقت نے کئی دفعہ ان کو عہدۂ قضا پر مامور کیا مگر انکار کر دیا کیونکہ ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من جعل قاضیا فقد ذبح بغیر سکین''

ترجمہ ''یعنی جو شخص قاضی بنادیا گیا وہ بدوں چھری کے ذبح کر دیا گیا''۔

اس لئے امام صاحبؒ عذر کرتے تھے۔ آخر اسی بات پر امام صاحبؒ مقید کئے گئے اور قید خانہ میں زہر دے کر شہید کئے گئے۔ یہ سب کچھ گوارا تھا مگر حکومت منظور نہ تھی۔ (تحفۃ العلماء: ۲/۲۹۲)

ف: آج کل کے سیاست دانوں اور الیکشن امیدواروں کی صورت حال آپ حضرات کے سامنے ہیں کہ انہوں نے دین اسلام اور مسلمانوں کی کتنی خدمت کی۔ اور کیا اس طریق کار سے دین اسلام کا نفاذ ممکن ہے۔ اگر میں عرض کروں گا تو شکایت ہوگی اور ''چھوٹا منہ بڑی بات'' والی بات ہوگی لہٰذا فیصلہ آپ حضرات کریں کہ ان بڑوں کو اسلام چاہیے یا اسلام آباد......؟ (مؤلف)

جمہوریت کیا ہے ؟

جمہوری حکومت کی پہلی بنیاد حاکمیت عوام ہے۔ جمہوریت کی تعریف ہی یہ ہے
Government of the people, by the people for the people.
کی حکومت ،عوام کے ذریعے عوام پر''

یہ جمہوریت کا پہلا اصول ہے کہ کھلا کلمہ کفر ہے ۔ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم نہیں ہے۔ جمہوری نظام کفار کا طرز حکومت وسیاست ہے چنانچہ غیر سبیل المومنین ہے۔ یہ یہود کی ایجاد کردہ انتہائی گھناؤنی سازش ہے۔

جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم اور حقوق انسانی کے نفاذ کا آلہ کار ڈھانچہ ہے۔ جمہوریت ایسا تنظیمی ڈھانچہ ہے جو جبر کا ایک ایسا ماحول وضع کرتا ہے کہ فرد اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشاء کو ترک کر کے صرف اپنی خواہش اور سرمائے کی بندگی کرے۔

جمہوری سسٹم میں فیصلوں کی بنیاد کتاب اللہ، علم وحکمت نہیں بلکہ اکثریت جس چیز کو چاہے اس چاہت اور خواہش کی بنیاد پر فیصلے کئے جاتے ہیں۔ جولوگ کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں درحقیقت یہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرنا ہے کیونکہ قانون فطرت ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ۔ اس قاعدے کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بے وقوفی کا فیصلہ ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''لا یلدغ المؤمن من جحر واحدٍ مرتین......''
کہ مؤمن ایک سوراخ سے دوبارنہیں ڈسا جاتا۔ الیکشن ایسا سوراخ ہے کہ پوری قوم بار بامرتبہ جمہوری سانپ سے ڈسی گئی ہے، متعدد بار کے تجربات سے واضح ہو چکا ہے کہ اب من حیث الامت ہمیں اس تماشے سے اجتناب برتنا ہوگا، ہمیں اس طریق کار کی طرف پلٹنا ہوگا جو رسول کریم ﷺ نے متعین فرمایا۔ جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف امت نے تعامل فرمایا یہ راستہ دعوت وتبلیغ اور جہاد و انقلاب کا راستہ ہے اور یہی سبیل المومنین ہے۔ (اشرف الجواب وماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفر ۱۴۲۹ھ)

ف: کسی نے بطور طنز جمہوریت کی یہ تعریف بھی کی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ جائیں گے۔
Government _off_ the people, _buy_ the people _far_ the people

غیر مقلدین بھی عجیب چیز ہیں

فرمایا غیر مقلد بھی عجیب چیز ہیں۔ بجز دو چار چیزوں کے کسی حدیث کے بھی عامل نہیں۔ مثلاً ''رفع یدین، آمین بالجہر'' بھلا اردو میں خطبہ پڑھنا کبھی سلف میں اس کا معمول رہا ہے؟ کبھی حضور ﷺ نے پڑھا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پڑھا ہے؟ کسی کا تو معمول دکھائیں۔ تو کیا ایسی حالت میں یہ اردو میں خطبہ بدعت نہ ہوگا۔ کچھ نہیں غیر مقلدی نام اسی کا ہے کہ جو اپنے جی میں آئے وہ کرے۔ (الافاضات ۹۳)

ائمہ پر سب وشتم کرنے کا نتیجہ

جولوگ اہل حق وسب وشتم کرتے ہیں ان کے چہروں پر نور علم نہیں پایا جاتا بلکہ خالص کفار تک ممسوخ نہیں پائے جاتے جتنے یہ لوگ ہیں۔ اس کی وجہ میں نے بطور لطیفہ کے کہا تھا کہ ''کفر فعل باطن ہے اس کا اثر چھپا ہوا رہتا ہے اور سب وشتم فعل ظاہر ہے اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔'' (حسن العزیز:۴/۳۹۸)

دو طالب علموں کا قصہ

(غیر محقق) کو اہل باطل سے مناظرہ کبھی نہ کرنا چاہئے کیونکہ مناظرہ میں ان سے تلبس ہوتا ہے اور تلبس سے اثر ہو جاتا ہے۔

میرے یہاں کے دو طالب علم ایک مبتدع (بدعتی) شخص سے مناظرہ کرنے گئے مگر خدا جانے کیا ہوا اس سے بیعت ہو گئے۔ مجھے خبر ہوئی تو میں نے وہ بیعت ان سے علی الاعلان فسخ کرائی اس کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ میں چلہ کھینچتا ہوں دیکھنا ۴۰ دن میں کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہلا بھیجا ۸۰ دن میں بھی کچھ نہ ہوگا۔ بعد میں اس نے کچھ کیا ہوگا مگر پھر یہ ہوا کہ وہ شخص ایسا نرم ہوا کہ کبھی کبھی خط بھی بھیجا۔ اس سے میں نے سمجھ کہ غالباً اس نے کچھ کیا ہوگا۔ جب کچھ نہ ہوا تب وہ ڈھیلا ہوا۔ (تحفۃ العلماء:۲/۳۳۲)

سفر حج میں ایک مالدار اور غریب کا مکالمہ

سفر میں ایک مالدار اور ایک غریب کا عجیب مکالمہ ہوا غریب کو ناداری کی وجہ سے کچھ تکلیف پہنچی، اسے دیکھ کر امیر نے کہا نا تواندہ مہمان کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے اور جب تم کو بلایا نہیں گیا تو آئے کیوں؟ ہمیں دیکھو اللہ تعالیٰ نے بلایا ہے تو کس طرح کا آرام پہنچایا ہے۔

غریب نے کہا کہ تم سمجھتے نہیں ہم تو گھر کے آدمی ہیں تقریبات میں گھر والوں کی رعایت نہیں ہوا کرتی جیسے براتی مہمانوں کی ہوتی ہے کہ وہ اجنبی ہوتا ہے اس لئے اس کی خاطر ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو کہ سب سے زیادہ مقرب ہیں، ظاہری ساز وسامان کم ملتا ہے اس لئے ہماری پوچھ کم ہے اور تمہاری زیادہ ہے۔ (کلام الحسن:۱۰۴)

ایک بزرگ کو گدھے کی سواری پر سوار ہونے کی بادشاہ کی فرمائش

گنگوہ کے ایک بزرگ اہل باطن سنت کے پابند تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ کے بعض حاسد درباریوں نے کہا کہ جہاں پناہ! یہ بہت بزرگ بنتے ہیں ان کا امتحان ہونا چاہئے۔ ان سے یہ کہا جائے کہ گدھے کی سواری سنت ہے آپ سوار ہو کر بازار میں نکلیں۔ بادشاہ نے ان سے جب کہا تو بزرگ نے کیا معقول جواب دیا۔ فرمایا: کہ ہاں سنت تو ہے مگر یہ بھی صاحب شریعت ہی کا حکم ہے کہ اتہام (تہمت) کے موقع سے بچو۔ میں اگر گدھے پر چڑھ کر بازار نکلوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ ان پر شاہی

عتاب ہوا ہے اس لئے دو گدھے منگوائے ایک پر میں سوار ہوں ایک پر آپ تا کہ کوئی شبہ نہ کرے کہ ان پر عتاب ہوا۔ بادشاہ چپ رہ گئے۔ یہ بڑی دلیری اور قوت کی بات ہے۔ (تحفۃ العلما، ۳۷۲/۲)

شاہی خاندان کو داڑھی کی قدر

انفاس عیسیٰ حصہ دوم میں مذکور ہے کہ ثریا بیگم جب لندن پہنچی تو ملکہ جارج پنجم سے بھی بال کٹوانے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ ہمارے شاہی خاندان میں عورتوں کا بال کٹوانا اور مردوں کا داڑھی منڈانا عیب ہے۔

ف: داڑھی کو بڑھانے اور مونچھوں کو کم کرنے کے متعلق احادیث میں حکم وارد ہے۔ داڑھی منڈانا یا ایک مشت سے کم کتروانا حرام ہے۔ ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے۔ داڑھی منڈانا یا ایک مشت کی مقدار سے کم کرنا ایسا گناہ ہے جو چوبیس گھنٹے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ حتیٰ کے حالت نیند میں بھی، مزید براں یہ کہ داڑھی منڈوانا یہ اپنے بالوں کو منڈوانا نہیں ہے بلکہ اپنی حیاء، وشجاعت اور بہادری ورجلیت کو صبح وشام منڈوانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان اس سے محفوظ رکھے۔ (مؤلف)

پشت کی جانب سے خطاب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ راستہ چلتے وقت پشت کی جانب سے کسی قسم کا تخاطب نہایت بدتہذیبی ہے چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تم کو کوئی پشت کی طرف سے خطاب کرے تو اس کا جواب مت دو کیونکہ اس نے تمہاری بڑی اہانت کی اور تم کو اس نے گویا جانور سمجھا۔ جانوروں ہی کو پشت کی طرف سے خطاب کیا جاتا ہے۔ (انفاس عیسیٰ: ۱۴۷/۲)

خرید وفروخت وہ لوگ کرے جو فقیہ ہوں

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا تھا کہ ہمارے بازار میں صرف وہ لوگ خرید وفروخت کریں جو فقیہ ہوں اس سے تمام ملک کو درسگاہ بنادیا تھا۔ اس لئے کہ سب خریداروں کو ان ہی کے ساتھ سابقہ پڑتا تھا۔ عجیب فراست تھی۔ (ایضا)

سوئیاں پکانا، عید کے روز بدعت نہیں

فرمایا کہ ایک بار مجھ کو عید کے روز شیر پکانے کے متعلق بدعت کا شبہ ہوا، میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا، حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ایسے امور میں زیادہ کاوش نہیں کرنا چاہئے لوگ بدنام کرتے ہیں اور عید کے روز سوئیوں کے پکانے کو کوئی عبادت اور دین نہیں سمجھتا جس سے بدعت کا شبہ ہو۔ (انفاس عیسیٰ: ۲۱۲/۲)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر جنات کا رونا

علی بن جعفر فرماتے ہیں کہ جس رات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو جنات بھی روئے۔ ہم نے آواز سنی اور کچھ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ علم فقہ ختم ہو چکا، اب تم کو فقہ نہیں ملے گا، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اچھے بنو نعمان بن ثابت مر چکے ہیں جو راتوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ امام صاحب کا انتقال 150ھ بغداد شہر میں ہوا تھا۔ (آکام المرجان فی غرائب الاخبار واحکام الجان اردو ترجمہ ۲۲۰)

اللہ تعالیٰ کیلئے لفظ ''خدا'' کے استعمال کا حکم

''خدا'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جو کہ لفظ اللہ کے قائم مقام ہے اور شرعاً اللہ تعالیٰ کے لئے کسی بھی زبان کا ہر وہ لفظ استعمال کرنا جائز ہے جو واجب الوجود القدیم کے مترادف ہو۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ خدا کا استعمال جائز ہے اور صدیوں سے اکابرین اس کو استعمال کرتے آئے ہیں اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی جبکہ اکابرین ہم سے زیادہ باادب تھے۔'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور علم کا شوق

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے خبر دی کہ آپ کا بچہ انتقال کر گیا، اس وقت آپ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ میں سبق پڑھ رہے تھے، یہ خیال کر کے کہ اگر میں بچے کی تجہیز و تکفین کے لئے چلا گیا تو میرا یہ سبق چھوٹ جائے گا۔ آپ نے ایک دوسرے شخص کو بچے کے کفن و دفن کا انتظام سونپ دیا اور خود درسگاہ سے نہیں اٹھے اور ایک سبق کا بھی ناغہ نہیں کیا۔ (سنہرے موتی ۱۲۵)

نماز کی چوری اور جرأت واستقامت کی ایک مثال

مشہور ظالم حجاج بن یوسف ثقفی ایک مرتبہ حج کے لئے آیا اور اتفاق سے عالم مدینہ حضرت سعید بن مسیب تابعی رحمۃ اللہ علیہ کے برابر نماز کے لئے کھڑا ہوا اور امام سے پہلے رکوع وسجدہ کرنے لگا، حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے نماز سے فارغ ہوتے ہی اپنا جوتا اٹھا کر فرمایا کہ اے چور! اے خائن! تو اس طرح نماز پڑھتا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ یہی جوتا تیرے منہ پر دے ماروں۔ اس کے بعد حجاج دمشق گیا تو حجاز کا گورنر بن کر مدینہ منورہ آیا اور فوراً ہی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ حدیث میں پہنچا اور کہنے لگا۔ کہ آپ نے ہی حج کے موقع پر جوتا اٹھا کر مجھ کو نماز کا چور اور خائن کہا تھا؟ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت جرأت واستقلال کے ساتھ فرمایا کہ ہاں! میں نے ہی کہا تھا۔ اور بالکل سچ کہا تھا۔ حجاج بن یوسف آپ کے عالمانہ تیور دیکھ کر آپ کی روحانی طاقت سے اس قدر مرعوب ہوا کہ بالکل ہی سہم گیا اور کہنے لگا کہ خداوند کریم آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے مجھے بڑی اچھی تعلیم دی تھی۔ اب میرا یہ حال ہے کہ جب نماز کے لئے

کھڑا ہوتا ہوں تو آپ کا جوتا میری نظروں میں گھوم جاتا ہے اور آپ کے کلمات مجھے یاد آ جاتے ہیں چنانچہ میں بہت ہی سنبھل سنبھل کر خشوع وخضوع کیساتھ نماز پڑھتا ہوں۔ (روح البیان ۸/۲۲۱)

ف: یہ تو اس زمانے کے ظالم وقاہر کا قصہ تھا، اور اب اس زمانے کے ایک ظالم وکافر کا قصہ ملاحظہ کیجئے۔ سابق امریکی صدر بش (جس پر ماضی قریب میں عراق کی ایک الوداعی کانفرنس میں ایک صحافی منتظر الزیدی نے جوتے برسائے تھے) بزبان حال کہتا ہے

اک عجب سا منظر نظر آتا ہے ایک شخص بھی ہجوم نظر آتا ہے
کہاں جا کر کروں پریس کانفرنس ہر اک کے ہاتھ میں جوتا نظر آتا ہے (مؤلف)

جوتے کو دیکھ کر جن بھاگ گیا

بات چونکہ جوتے کی چل پڑی ہے تو تاریخ کے عبرت کدے سے یہ واقعہ نقل کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

ابوالحسن علی بن احمد بن علی عسکری رحمہ اللہ کے دادا کہتے ہیں کہ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مسجد میں بیٹھا تھا ان کے پاس متوکل (بادشاہ) نے اپنا ایک وزیر بھیجا کہ وہ آپ کو اس کی اطلاع کرے کہ شہزادی کو مرگی ہوگئی ہے اور گذارش کرے کہ آپ اس کے لئے صحت کی دعا کریں۔ تو امام احمد بن حنبلؒ نے وضو کرنے کے لئے کھجور کے پتے کے تسمہ کا لکڑی کا جوتا اتارا اور اس وزیر سے فرمایا، امیر المؤمنین کے گھر جاؤ اور اس لڑکی کے سر کے پاس بیٹھو اور اس (جن) کو کہو امام احمد فرما رہے ہیں کہ "تمھیں اس لڑکی سے نکل جانا پسند ہے یا (احمد سے) ستر جوتے کھانا پسند ہے؟" تو وزیر اس جن کے پاس گیا اور اس کو یہ پیغام سنایا تو اس کو اس سرکش جن نے لڑکی کی زبان سے کہا "ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے، اگر امام احمد ہمیں عراق میں نہ رہنے کا حکم فرمائیں تو ہم عراق بھی چھوڑ دیں گے وہ تو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے ساری مخلوق اس کی فرمانبردار ہوتی ہے۔ پھر وہ اس لڑکی سے نکل گیا اور لڑکی تندرست ہوگئی اور اس سے اولاد بھی ہوئی۔ (اچھے بچے: مارچ ۲۰۰۹)

کیا جواب ہوگا؟

شیخ عبدالقدوس ایک روز بیت الخلاء کے پاس دیر تک کھڑے نظر آئے، اللہ تعالیٰ کے ولی تھے، سیدزادے تھے، کسی نے اس طرح دیر تک کھڑے رہنے کا سبب پوچھا تو فرمایا:

"میں پاخانے کی بدبو کو محسوس کر کے یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر انسان سے اس چیز کے بارے میں پوچھ لیا جائے کہ اے انسان! تو نے اچھی، خوشبودار، مزیدار چیز کو بدبودار بنا دیا، ورنہ یہ تو ایسی مٹھائی تھی کہ حلوائی کی دکان پر چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی تھی، تو نے اسے اس قدر گھٹیا چیز بنا دیا کہ لوگ نفرت کرتے ہیں، اس کے پاس ناک پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں، تو انسان کے پاس کیا جواب ہوگا۔

قارئین کرام! آپ اپنے بارے میں غور کر لیں، آپ کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے؟

سب سے بڑا جنازہ

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے اور اہل بدعت کے درمیان فیصلہ ہمارا جنازہ دیکھ کر ہوگا۔ چنانچہ یہ فیصلہ اس طرح ہوا کہ آپ کے مخالفین کے جنازوں میں تو بس گنتی کے چند لوگ شریک ہوئے، کسی نے ان کا غم نہ منایا، جب کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے جنازے کو دیکھ کر مؤرخین دنگ رہ گئے۔ خلیفہ متوکل نے اس جگہ کو ناپنے کا حکم دیا جہاں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی نماز جنازہ پڑھی گئی تو اندازہ لگایا گیا کہ پچیس لاکھ افراد نے ان کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ زمانہ جاہلیت یا تاریخ اسلام میں اس سے بڑے کسی جنازے کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس دن اس عظیم مجمع کو دیکھ کر بیس ہزار کے قریب غیر مسلم دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ (البدایہ والنہایہ)

بیت اللہ شریف

اس وقت خانہ کعبہ کے اردگرد پھیلی مسجد الحرام کا کل رقبہ تین لاکھ چھپن ہزار مربع میٹر ہے اور اس میں مجموعی طور پر دس لاکھ سے زائد افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کے نو مینار ہیں، ہر ایک کی بلندی 89 میٹر ہے۔ اس کے چار مرکزی اور 45 عام دروازے ہیں جب کہ خانہ کعبہ کے دروازوں کی تعداد چھ ہے۔ صرف مسجد الحرام کے دروازوں کی تعداد 41 ہے۔ اور گیارہ برقی سیڑھیاں نصب ہیں۔

اس وقت مسجد الحرام سے ملحقہ حماموں اور وضو خانوں کی تعداد 9 ہزار ہے۔ سعودی عرب کی موجودہ حکومت نے اپنے قیام 1932ء سے لیکر اب تک بیت اللہ شریف کی توسیع و تجدید پر تیس ارب آٹھ کروڑ سعودی ریال (تقریباً ساڑھے گیارہ ارب امریکی ڈالر) خرچ کیے ہیں۔

اندر کی بات

قیام پاکستان سے قبل حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ بستی باگڑ سرگانہ ضلع خانیوال میں تشریف لائے، سہ روزہ ''احرار کانفرنس'' تھی۔ نماز فجر کے بعد ایک دیہاتی آیا اور شاہ جی سے کہا: ''مجھے بیعت کر لیں'' شاہ جی نے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور فرمایا: ''میاں! لاہور چلے جاؤ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے بیعت کر لو۔'' وہ شخص اس وقت تو چلا گیا مگر دوسری صبح پھر آ گیا اور اپنا وہی مطالبہ دہرایا۔ شاہ جی نے پھر ٹالا۔ تیسرے روز پھر حاضر ہوا اور کہا کہ مجھے بیعت کر لو۔ شاہ جی نے جلال میں آ کر کہا۔ ''میرے کندھوں پر سوار ہو جاؤ۔'' بے چارہ سادہ دل دیہاتی سمجھا کہ یہی بیعت کا طریقہ ہے، اس نے جست لگائی اور شاہ جی کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔

شاہ جی پہلے تو حیران رہ گئے، پھر اس کی منت کرتے ہوئے فرمایا: ''میرے پیر و مرشد! میں نے

تجھے بیعت کیا، مہربانی کرو اور نیچے اتر آؤ''۔

بعد میں اس دیہاتی کو دوسروں سے پتہ چلا کہ بیعت کا طریقہ یہ نہیں ہوتا بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر شریعت کی پابندی کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ بے چارہ بڑا شرمندہ ہوا۔ شاہ جی اکثر فرماتے تھے ''میری زندگی میں یہ واحد شخص ہے جب بھی میرے سامنے آتا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں'' مگر اندر کی بات (اللہ تعالیٰ اور) ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔''

کافر ہو جائے گا

ایک شخص نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس نے کہا ''مجھے موقع دیا جائے، میں اپنی نبوت کی علامت پیش کروں'' اس پر امام ابوحنیفہؒ نے اعلان فرمایا: ''جو شخص اس سے اس کی نبوت کی دلیل طلب کرے گا، وہ بھی کافر ہو جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔ (تفسیر روح البیان)

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ایک دفعہ گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکا تھا، چاروں طرف پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے اور آپ مسجد میں اکیلے تشریف فرما ہیں۔ پولیس مسجد میں پہنچ گئی جب اندر داخل ہوئی تو نانوتویؒ کو دیکھا کہ ایک معمولی لنگی اور ایک معمولی کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ تو وہ سمجھے کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے۔ (کیونکہ ان کا تو خیال تھا کہ مولانا صاحب تو بڑے عالم ہیں تو آپ شاندار قسم کے لباس اور جبہ قبہ پہنے ہوں گے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا) تو پولیس نے محمد قاسم نانوتویؒ سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کہاں ہیں؟ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے اور اس کے ذریعے یہ تاثر دیا کہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں لیکن زبان سے یہ جھوٹا کلمہ نہیں نکالا کہ یہاں نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ پولیس واپس چلی گئی۔

ف: اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے وقت میں بھی کہ جب جان پر بنی ہوئی ہو، اس وقت بھی یہ خیال رہتا ہے کہ زبان سے صریح جھوٹ نہ نکلے، اگرچہ بعض اوقات جب جان جانے کا خطرہ ہو یا ناقابل برداشت ظلم کا اندیشہ ہو اور توریہ (گول مول بات) کرنے سے بھی بات نہ بنے تو شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن اس اجازت کے بہانے صاف جھوٹ کا اتنی کثرت سے استعمال کرنا جس طرح آج کل ہو رہا ہے یہ سب حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو جھوٹ بولنے سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

لطیفہ برائے اصلاح

سلام کے لئے بعض جگہ آداب وتسلیمات، بندگی، کورنش وغیرہ کہنے کا رواج ہے یہ غلط اور خلافِ

شریعت ہے۔ ایک شخص نے ایسے موقع پر اصلاح کی خاطر طنز ملیح کے طور پر یہ لطیفہ کیا کہ ایک مجلس میں جا کر کہا کہ میرا بھی سجدہ قبول ہو۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے؟ کہاں کہ حضور ہر آنے والا شخص مختلف الفاظ میں سلام کر رہا ہے۔ کوئی ''آداب قبول ہو'' کہتا ہے، کوئی ''بندگی'' کوئی ''کورنشات'' کوئی اور کچھ، حتیٰ کہ سب صیغے (الفاظ) ختم ہو گئے، میں نے سوچا کہ اب میں کیا کہوں؟ تو میرے لئے سجدہ کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا۔

بعض نے سلام کے بارے میں ایک نہایت سخت غلطی کی کہ ایک طالب علم نے اپنے والد ماجد کو جا کر سلام کیا تو وہ کہنے لگے کہ بیٹا! بدتمیزی ہے'' آداب کہا کرو'' صاحبو! یاد رکھوں کہ سلام کو بدتمیزی کہنا کفر ہے۔ کیونکہ سلام کو بدتمیزی کہنا حضور ﷺ کی سنت کو بے تمیزی کہنا ہے اور حضور ﷺ کی سنت کو بے تمیزی کہنے والا کافر ہے، ''اگر توبہ نہ کرے تو حکومت اسلامیہ کو اس کا قتل کرنا واجب ہے''۔ (تسہیل المواعظ: ۳۲۹/۲)

ف: بعض لوگ السلام علیکم کی بجائے خط میں سلام مسنون لکھ دیتے ہیں سو ''اگر خط میں کوئی یہ لکھے کہ بعد سلام مسنون عرض ہے'' تو چونکہ شریعت میں یہ صیغہ سلام کا نہیں بلکہ ''السلام علیکم'' ہے۔ اس لئے اس صیغہ سلام مسنون کا جواب دینا واجب نہ ہوگا اگرچہ سلام مسنون لکھنا جائز ہے۔ (اغلاط العوام: ۲۴)

قابل رشک نمازی

قابل رشک ہے ایسا نمازی جس نے مسواک کے ساتھ وضو کیا ہو کہ اس سے ستر گنا نماز کا اجر بڑھ جاتا ہے، اور جس کے کندھے پر تلوار لٹکی ہو، پسٹل یا خنجر کمر سے باندھا ہو کیونکہ اسلحہ کے ساتھ نماز کا اجر ستر گنا بڑھ جاتا ہے۔

اور جس کے سر پر عمامہ ہو کیونکہ پگڑی باندھ کر نماز پڑھنے سے نماز کا اجر ستر گنا بڑھ جاتا ہے۔ (ابن اسحاق دیلمی)

اور جس نے جماعت کیساتھ نماز ادا کی ہو کہ اس سے نماز کا ستائیس گنا اجر بڑھ جاتا ہے۔

میری گزارش ہے کہ ذرا کیلکولیٹر نکالیں اور ضربیں دینی شروع کیجئے۔

ستر ضرب ستر ضرب ستر ضرب ستائیس ضرب انچاس کروڑ۔

﴿ ذالک فضل اللہ یؤ تیہ من یشاء ﴾

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے۔

(جہاد فی سبیل اللہ اور اعتراضات کا علمی جائزہ: ۳۴۰)

ویلنٹائن ڈے اور ایک لطیفہ

پچھلے مہینے یعنی ۱۴ فروری ۲۰۰۹ء ہماری قوم نے ویلنٹائن ڈے منایا اور اس مہینے (مارچ) پوری

شان و شوکت کے ساتھ بارہ ربیع الاول منائے گی۔ دیکھیں ہم کتنے اچھے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو بھی ناراض نہیں کرتے اور شیطان کو بھی خفا ہونے نہیں دیتے۔

ویلنٹائن ڈے ایک پادری کے نام منسوب ہے اور اس پادری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے محبت کا اظہار کیا تھا اور اس جرم میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ نہ اس کی محبت جائز محبت تھی نہ اس کا اظہار کوئی شریفانہ تھا، اس لئے انجام تو یہی ہونا تھا مگر اب تو یہ محبت بھی کچی کہاں رہ گئی؟ نری منافقت ہی ہے۔ اسی ویلنٹائن پر ایک صاحب لطیفہ سنا رہے تھے۔

ایک نوجوان خوشبودار پھولوں سے مہکی اور خوبصورت کارڈوں سے بھری دکان میں داخل ہوا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنی محبت کے روایتی اظہار کے لئے کارڈ خریدنا چاہتا تھا۔ وہ استقبالیہ پر گیا اور وہاں بیٹھے پیسے وصول کرنے والے شخص سے پوچھنے لگا۔ جناب! کیا آپ کی دکان پر کوئی ایسا کارڈ ہے جس پر یہ جملہ لکھا ہو کہ

"میں صرف اور صرف تم سے ہی محبت کرتا ہوں"

دوکاندار نے کہا: کیوں نہیں، ہمارے پاس یہ انتہائی خوبصورت کارڈ ہے اور اس پر آپ کا بتایا ہوا جملہ بھی لکھا ہوا ہے۔ نوجوان نے یہ سن کر کہا، اچھا! پھر ایسا کرو کہ یہ کارڈ دو درجن الگ الگ لفافے میں بند کردو کہ میں نے مختلف جگہ بھیجنے ہیں۔

آپ یہ لطیفہ سمجھے بھی یا ابھی تک سر کھجا رہے ہیں اور ہم سے پوچھنے کے لئے پر تول رہے ہیں کہ پھر کیا ہوا؟

ف: بالکل خونق بچوں کی طرح بارہ ربیع الاول کو لاکھوں کی تعداد میں ہم لوگ گھروں سے نکلتے ہیں اور عشق رسول ﷺ کا دعویٰ کرتے ہیں بھلا کوئی پوچھے تو سہی کہ پورے سال کے بقیہ دن ہم لوگ کیا کرتے ہیں؟ کن لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور کن کی بات مانتے ہیں؟ کن کی فیشن اپناتے ہیں اور کن کی بولی بولتے ہیں؟ بس چھوڑ دیں! ان سب باتوں کو کہ پرانے لوگ اسے منافقت کہتے تھے اور اب لوگ اسے عقلمندی سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہمیں اس منافقت سے بچائے اور پورے سال بلکہ پوری عمر کے لئے سچا اور پکا عاشق رسول ﷺ بنائے۔ آمین (اچھے بچے، مارچ ۲۰۰۹)

جہاد

1۔ جہاد کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے چار سو سے زائد آیات نازل فرمائیں۔

2۔ جہاد کے عنوان پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے 241 ابواب قائم فرمائے۔

3۔ جہاد کے عنوان پر امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے 100 ابواب قائم فرمائے۔

4۔ جہاد کے عنوان پر امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے 176 ابواب قائم فرمائے۔
5۔ جہاد کے عنوان پر امام ترمذی رحمہ اللہ نے 115 ابواب قائم فرمائے۔
6۔ جہاد کے عنوان پر امام نسائی رحمہ اللہ نے 48 ابواب قائم فرمائے۔
7۔ جہاد کے عنوان پر امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے 46 ابواب قائم فرمائے۔
8۔ جہاد کے عنوان پر فقہ کی ہر کتاب مسائل جہاد سے مزین ہوئی۔
9۔ جہاد سیاحت بھی ہے اور رہبانیت بھی ہے۔
10۔ جہاد عبادت بھی ہے اور ضرورت بھی ہے۔
11۔ جہاد ایمان کی علامت ہے۔
12۔ جہاد ہی کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک سو بیویاں کیں۔
13۔ جہاد کی وجہ سے تبلیغ دین اور علوم شریعت کی اشاعت کی راہ ہموار ہو رہی ہوتی ہے۔
14۔ جہاد کی وجہ سے علماء، قضاء کے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔
15۔ جہاد کی وجہ سے ایمان، مال، جان اور عزت کا تحفظ ہوتا ہے۔
16۔ جہاد ہمارا محافظ، ہمارا دفاع اور ہمارا قلع ہے۔
17۔ جہاد کی تیاری کرنا واجب ہے۔
18۔ جہاد کی تربیت کافروں سے حاصل کرنا بھی جائز ہے۔
19۔ جہاد بغیر عذر کے چھوڑنے والا فاسق بن جاتا ہے۔
20۔ جہاد میں تاویل کرنے والا مبتدع فی العقیدہ یعنی بداعتقاد ہوتا ہے۔
21۔ جہاد میں تحریف کرنے والا اور انکار کرنے والا کافر ہے۔
22۔ جہاد چھوڑ کر مرنا منافقت کی موت ہے۔ (تلخیص از جہاد فی سبیل اللہ اور اعتراضات کا علمی جائزہ: ۸۶)

مخالف کے پیچھے نماز

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کسی کو کسی کے ساتھ مخالفت ہو تو اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ اس پر ارشاد فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے پوچھا تھا کہ آپ سے جتنے لوگوں نے بغاوت کی ہے وہ لوگ نماز پڑھاتے ہیں کیا ہم ان کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا "نماز اچھی چیز ہے اچھے کام میں شریک رہو، برے کام میں شریک مت ہو۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دلیل کیسی اچھی بیان کی پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برا کہنے والے کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتوے سے تو پھر اور لوگوں کے پیچھے کیوں نہ درست ہوگی۔ (اشرف الاحکام)

شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کی طلباء کو اہم نصیحت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم (جو بندہ مؤلف کتاب ھذا کا استاد مکرم ہیں حضرت مدظلہم سے بخاری شریف مکمل پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔) طلباء کرام کو نصیحت کرتے ہوئے انتہائی دلسوزی سے فرماتے ہیں

''میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ملک ملک پھرا ہوں، ہر ملک اور ہر طبقہ کی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ اصلاح نفس اور اصلاح ظاہر و باطن سے متعلق حضرت تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات سے بڑھ کر میں نے کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ اپنی حد سے زیادہ مصروفیات کے باوجود میں ہر روز سونے سے پہلے انکا تقریبا پانچ منٹ ضرور مطالعہ کرتا ہوں۔ بعض اوقات ان میں دل ایسا لگتا ہے کہ یہ مختصر سا دورانیہ آدھے گھنٹے تک بھی چلا جاتا ہے۔ حضرت کا کوئی نہ کوئی وعظ ہمیشہ میرے سرہانے رکھا رہتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں ان کی افادیت آپ کے دل و دماغ میں کس طرح اتاروں؟

بس! میں آپ سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر طالب علم حضرتؒ کے مواعظ (خطبات، ملفوظات) کو اپنے روزانہ کے معمولات میں شامل کر لے۔ ممکن ہے کہ ابتداء میں آپ کا دل ان میں نہ لگے لیکن آپ جوں جوں آگے بڑھتے جائیں گے، ان شاء اللہ العزیز دل ان میں کھنچتا چلا جائے گا اور پھر ایک ہی مجلس میں آپ انہیں ختم کرنا چاہیں گے۔

ف: ''ملفوظات حکیم الامت'' تیس (۳۰) جلدوں اور'' خطبات حکیم الامت'' بتیس (۳۲) خوبصورت جلدوں میں ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں جو اصلاح اعمال اور اصلاح نفس کے لئے بیش قیمت خزانے ہیں اور حضرت تھانویؒ کی دیگر کتابیں بھی پاکستان کے تمام بڑے کتب خانوں میں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ (مؤلف غفرلہ)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہل علم اور طلبہ کو چند اہم نصیحتیں

۱) اے طلباء مدرسہ تمہارا فخر یہی ہے کہ جس جماعت میں تمہارا شمار ہے تم اس کی اصطلاح اور وضع اور طرز کو اختیار کرو۔

۲) لباس اور وضع سے یا اہل دنیا کے طرز گفتگو سے عزت کا طلب کرنا انسان کا کام نہیں۔ یہ تو نہایت بھدا پن ہے۔

۳) اگر مخلوق سے عزت نہ ہو تو کیا پرواہ ہے خالق کے یہاں تو ضرور عزت ہو گی۔

٤) تم کو تو ایسی تواضع اور پستی اختیار کرنا چاہئے کہ تمام دنیا پستی و تواضع میں تمہارے شاگرد ہو جائیں تمہاری عزت اسی میں ہے۔

۵) تم اپنے کو مٹادو، گمنام کر دو تو پھر تمہاری محبوبیت کی یہ شان ہوگی کہ تم چپ ہو گے اور تمام مخلوق میں تمہارا آوازہ (شہرہ) ہوگا۔ (انفاس عیسیٰ: ۱/ ۳۷۳)

====☆☆☆====

فقہ حنفی کی چند اہم اور بنیادی کتابیں

[...... ایک اجمالی تعارف......]

نوٹ : ''فقہ حنفی کی چند اہم اور بنیادی کتابیں'' کے عنوان سے حضرت مفتی عبدالرشید صاحبؒ (اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس نصیب فرمائیں۔ آمین) سابق استاذ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور، کا ایک اجمالی تعارف جو ماہنامہ ''وفاق المدارس ملتان'' میں قسط وار چھپتا رہا، اُحقر نے اسی کی تلخیص کر کے اپنے اس رسالے میں طلباء کرام خصوصاً متخصصین فی الفقہ حضرات کی دلچسپی کے لئے شامل کر دیا ہے۔ (م۔س۔آ لف غفرلہ)

١...... حاشية الطحطاوی الدر المختار

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار فی شرح تنویر الابصار'' کا یہ حاشیہ، علامہ احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی مصری حنفی کا تحریر کردہ ہے۔

٢...... الدر المختار فی شرح تنویر الابصار

یہ فقہ حنفی کے مشہور متن ''تنویر الابصار'' کی شرح ہے۔ جو علامہ محمد بن علی حصکفی دمشقی کی تالیف ہے۔

٣...... رد المحتار علی الدر المختار

یہ ''درمختار'' کا حاشیہ ہے، جو سید محمد امین عابدین بن سید عمر عابدین شامی نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ دمشق کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کی پیدائش ١١٩٨ھ/١٧٨٤ء میں ہوئی۔

٤...... بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع

یہ کتاب ملک العلماء ابوبکر بن مسعود بن احمد علاؤ الدین کاسانی کی تصنیف لطیف ہے جو علاء الدین ابوبکر محمد بن احمد سمرقندی (المتوفی ٥٤٠ھ/١١٤٦ء) مصنف تحفۃ الفقہاء کے شاگرد ہیں۔

٥...... البحر الرائق فی شرح کنز الدقائق

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''کنز الدقائق'' کی یہ شرح ہے۔ کنز الدقائق امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد حافظ الدین النسفی (المتوفی ربیع الثانی ٧١٠ھ/١٣٤١ء) کی تصنیف لطیف ہے، موصوف نے پہلے ایک جامع متن فقہ حنفی کا تیار کیا جس کا نام ''وافی'' رکھا، پھر اپنے تحریر کردہ متن ''وافی'' کی شرح لکھی اور اسکا نام رکھا ''کافی'' اس کے بعد ''وافی'' کا مزید اختصار کیا، جس میں زیادہ تر پیش آنے والے مسائل کا اندراج کیا، اس متن کو انہوں نے ''کنز الدقائق'' کے نام کیساتھ موسوم کیا۔

٦ الأشباہ والنظائر

فقہ حنفی کی یہ بے نظیر کتاب، ابوحنیفہ ثانی علامہ زین العابدین بن ابراہیم بن محمد بن نجیم حنفی (م ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء) کی تالیف ہے۔ جس کے بارے میں علامہ چلپیؒ فرماتے ہیں۔ "لم یر للحنفیة مثله" یعنی حنفیہ کے ہاں اس جیسی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔

۷ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق

یہ بھی کنز الدقائق کی شرح ہے جو علامہ ابومحمد فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی کی تصنیف ہے موصوف حدیث، فقہ، نحو اور فرائض کے اپنے دور میں امام تھے۔

۸ رمز الحقائق شرح کنز الدقائق

یہ بھی کنز الدقائق کی مختصر شرح ہے جو محدث شہیر علامہ محمود بن احمد بدر الدین العینیؒ کی تصنیف ہے۔ ۷۸۲ھ/۱۳۵۱ھ میں آپ قاہرہ تشریف لائے۔ حلب سے تین منزل کے فاصلے پر ایک عظیم اور خوبصورت شہر "عین تاب" کے چونکہ آپ قاضی رہے ہیں، اس لئے اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ کو "عینی" کہا جاتا ہے۔

۹ ھدایة

شیخ الاسلام برھان الدین بن ابی بکر المرغینانیؒ کی یہ تالیف ہے مصنف نے پہلے ایک متن "بدایة المبتدی" کے نام سے لکھا جو "مختصر القدوری" اور امام محمدؒ کی "جامع صغیر" کو ملا کر تیار کیا تھا اور بوقت ضرورت اس پر اضافہ بھی کیا، پھر اس کی ایک بڑی ضخیم شرح لکھی اور اس کا نام "کفایة المنتہی" رکھا، لیکن بعد میں مصنفؒ نے محسوس کیا کہ اس شرح میں کچھ اطناب ہوگیا ہے اس کی طوالت اور لوگوں کی کم ہمتی کے باعث کہیں یہ کتاب بالکل متروک ہی نہ ہو جائے، اس لئے دوبارہ نسبتاً مختصر شرح "ھدایہ" کے نام سے تحریر فرمائی، چونکہ "متن" "مختصر القدوری اور جامع صغیر" سے مرتب ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ "ہدایہ" درحقیقت ان دونوں کتابوں کی مفصل شرح ہے، علامہ چلپی فرماتے ہیں کہ مصنف نے "ہدایہ" کی تالیف میں ۱۳ سال کے ان پانچ دنوں کے علاوہ جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے، کبھی روزہ کا ناغہ نہیں کیا۔ اور موصوف کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو روزہ کی اطلاع نہ ہو۔ اس کی برکت ہے کہ اس کتاب کو وہ قبولیت حاصل ہوئی جو کسی اور کتاب کو میسر نہ ہوسکی، چنانچہ ہدایہ کے بارے میں کہا گیا ہے۔

ان الھدایة کالقرآن قدنسخت ماصنفوا اقبلھا فی الشرع من کتب
فاحفظ قواعدھا واسلك مسالکھا یسلم مقالك من زیغ ومن کذب

یعنی "ہدایہ" نے قرآن کی طرح پہلے کی تصنیف شدہ کتابوں کو منسوخ کردیا۔ لہذا اس کے قواعد کو یاد کرو اور اس کے راستوں پر چلو، تو تمہاری بات جھوٹ اور کجی سے محفوظ ہو جائے گی۔

۱۰ فتح القدیر للعاجز الفقیر

یہ ہدایہ کی مشہور اور متداول شرح ہے جو علامہ محمد بن عبدالواحد کمال الدین کی تالیف ہے جو ابن الہمام سے مشہور ہے۔ ۷۸۸ھ یا ۷۹۰ھ میں علامہ ابن الہمام کی پیدائش ہوئی موصوف کو تمام دینی علوم بالخصوص تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، نحو، کلام اور منطق میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

۱۱ غنیۃ ذوی الاحکام فی بغیۃ درر الحکام

یہ درر الحکام کا حاشیہ ہے اور درر الحکام علامہ محمد بن فراموز الشہیر بہ ''مولیٰ خسرو'' و ''ملا خسرو'' کی تصنیف ہے جو محمد خان بن مراد خان کے دور خلافت میں فوج کے قاضی تھے بعد میں قسطنطنیہ کے قاضی بنا دیئے گئے تھے، علوم عقلیہ اور نقلیہ کے بحر ذخار تھے۔

''درر الحکام'' کا یہ حاشیہ ''غنیۃ ذوی الاحکام'' ابوالاخلاص حسن عمار مصری شرنبلالی کی تصنیف ہے۔ موصوف ''مصر'' کے قریب ایک شہر ''شرابلولۃ'' کے رہنے والے تھے۔ اسی شہر کی طرف نسبت کرتے ہوئے خلاف قیاس اس کو ''شرنبلالی'' کہا جاتا ہے اپنے زمانے کے بہت بڑے فقیہ تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف، مثلاً ''نورالایضاح'' اور اس کی شرح ''امداد الفتاح'' پھر اس شرح کا اختصار کیا، ''مراقی الفلاح'' کے نام سے۔ اور متفرق مسائل میں چھوٹے چھوٹے ۶۰ رسائل تالیف فرمائے۔

۱۲ ...... فتاویٰ انقرویہ

یہ شیخ الاسلام مولا محمد بن حسن انکوری کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ موصوف ترکی علماء میں مشہور حنفی فقیہ ہیں، ان کی کوریہ (انقرہ) میں پیدائش ہوئی اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے ''انکوری'' یا ''انقروی'' کہا جاتا ہے۔ قسطنطنیہ میں تعلیم حاصل کی۔ مصر، قسطنطنیہ وغیرہ میں قاضی رہے بعد میں انہیں ترکی حکومت میں ''شیخ الاسلام'' بنا دیا گیا، لیکن اس کے بعد جلد ہی ان کی وفات ہوگئی۔ تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ علامہ چلپی فتاویٰ انقرویہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ علماء کرام اور فقہاء عظام کے ہاں مقبول ہے۔ ۲ جلدوں میں مصر سے طبع ہو چکا ہے۔

۱۳ ...... فتاویٰ ظہیریہ

یہ فتاویٰ فقیہ شہیر محمد احمد بن عمر ظہیر الدین بخاری کی تصنیف ہے، جو اپنے زمانے میں علوم دینیہ کے اندر یکتائے روزگار تھے، نیز ''بخاری'' کے محتسب بھی تھے۔ ابتداءً تحصیل علم اپنے والد سے کی، بعد ازاں دیگر اکابر و افاضل عصر سے یہاں تک کہ آخر میں صاحب خلاصۃ الفتاویٰ کے ماموں علامہ ظہیر الدین حسن بن علی بن عبدالعزیز مرغینانی کے پاس پہنچے، جو ان کی صلاحیت کے باعث دیگر طلبا پر انکو فوقیت دیتے اور ان کا خصوصی احترام فرماتے تھے۔ صاحب فتاویٰ ظہیریہ کا انتقال ۶۱۹ھ ۱۶۲۲ء میں ہوا۔ علامہ لکھنوی فرماتے ہیں کہ میں نے ''فتاویٰ ظہیریہ'' کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے اس کو ایک

معتبر کتاب اور فوائد کثیرہ کا حامل پایا ہے۔

۱۴..... فتاویٰ قاضی خان

یہ امام کبیر حسن بن محمود فخر الدین اوز جندی فرغانی معروف بہ ''قاضی خان'' کی تصنیف ہے۔ انہیں علوم دینیہ خصوصاً فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا حتیٰ کہ علامہ احمد بن کمال پاشا نے ان کو ''مجتہدین فی المسائل'' کے طبقے میں شمار کیا ہے اور قاسم بن قطلو بغا نے فرمایا ہے کہ انکی تصحیح دوسروں کی تصحیح پر مقدم ہے، کیونکہ یہ ''فقیہ النفس'' ہیں اور علامہ چلپی ان کی کتاب ''فتاویٰ قاضی خان'' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ مشہور مقبول ہے اور علماء فقہاء کے ہاں متداول ہے اور اس قابل ہے کہ ہر وقت قاضی و مفتی کے پیش نظر رہے۔

موصوف کا انتقال نصف رمضان کی شب کو ۵۹۲ھ ۱۱۹۶ء میں ہوا۔ یہ فتاویٰ چار جلدوں میں کلکتہ سے اور مصر سے فتاویٰ عالمگیری کی پہلی تین جلدوں کے حاشیے پر چھپ چکا ہے۔

۱۵..... الفتاویٰ المهديه فی الوقائع المصريه

یہ شیخ محمد عباسی مہدی مصری کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ انکے والد کا انتقال جب ہوا تو انکی عمر اس وقت تین سال تھی۔ معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی، لیکن بایں ہمہ انہوں نے بڑی محنت سے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ ۲۱ سال کی نوعمری میں انکو منصب افتاء کا اعزاز حاصل ہوا۔ نوعمری کے باعث ان پر بہتوں کو حسد بھی ہوا، لیکن یہ انکے حق میں اس طور سے مزید مفید ثابت ہوا کہ وہ اپنے فتاویٰ انتہائی محنت اور جانفشانی سے لکھتے اور حتی الامکان تحقیق کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش فرماتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دور میں اس منصب کے اہل ترین فرد بن گئے۔

۱۲۸۷ھ میں انکو افتاء کے ساتھ ساتھ ''شیخ الاسلام'' ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء میں موصوف نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ''قرافة المجاورین'' میں دفن ہوئے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس فتاویٰ کی ایک خصوصیت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ حنفیہ کی کتابوں میں سے، جس کتاب نے وقف کے مسائل کو سب سے زیادہ شرح وبسط اور انضباط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ فتاویٰ مہدویہ ہے۔ (البلاغ مفتی اعظم نمبر صفحہ ۴۰۲)

۱۶..... لسان الحكام فی معرفة الاحكام

یہ کتاب امام ابوالولید ابراہیم بن محمد معروف بہ ابن شحنہ حلبی کی تالیف ہے۔ موصوف نے قضا اور اس کے متعلقات کے بیان کے لئے یہ کتاب ترتیب دی تھی اور اس کو تیس فصلوں پر تقسیم کیا تھا، جس کی اجمالی فہرست موصوف نے دیباچہ میں ذکر کی ہے۔ لیکن ابھی اپنی کتاب کی ۲۱ فصلیں ہی لکھ پائے تھے کہ وقت موعود آپہنچا اور آپ کتاب کو اسی نامکمل حالت میں چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ موصوف

کا انتقال ۸۸۲ھ/۱۴۷۸ء کو ہوا۔

۱۷ ۔۔۔ مبسوط

یہ امام ابوبکر محمد بن احمد شمس الائمہ سرخسیؒ کی تصنیف ہے، جسے انہوں نے محض اپنے حافظہ کی مدد سے "اوز جند" کے قید خانہ کے اندر ایک کنویں میں محبوس ہونے کے زمانے میں اپنے شاگردوں کو املا کرایا تھا، جو کنویں کے کنارے پر بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ کتاب ۳۰ جلدوں میں مصر سے طبع ہو چکی ہے۔ اس عظیم کتاب سے امام شمس الائمہ کے رسوخ فی العلم اور تمام مسائل کی مکمل تفصیلات کے استحضار کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ابن کمال پاشا نے انکو "مجتہد فی المسائل" کے طبقے میں شمار کیا ہے۔ امام سرخسیؒ شمس الائمہ حلوانی (المتوفی ۴۴۸ھ ۱۰۵۶ء) کے خصوصی شاگرد تھے۔ قید کی وجہ انکی وہ نصیحت تھی، جو انہوں نے کسی غیر مناسب کام پر بادشاہ وقت کو کی تھی۔ مبسوط میں کسی کسی مقام پر اختتام بحث کے موقع پر اپنے محبوس ہونے کا ذکر بھی کر دیتے ہیں، مثلاً عبدات کے بیان کے آخر میں فرماتے ہیں،

"هذا آخر شرح العبادات باوضح المعاني واوجز العبارات املاء المحبوس عن الجمع والجماعات"

موصوف کے سن وفات میں اختلاف ہے، بقول بعض ۴۹۰ھ/ ۱۰۹۶ء اور بقول بعض ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶ء کے لگ بھگ۔

۱۸ ۔۔۔ فتاویٰ عالمگیریہ

متحدہ ہندوستان میں مشہور مغل فرماں رواں عالمگیر (المتوفی ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء) نے جب باقاعدگی سے شریعت کا نفاذ ہندوستان میں کیا تو اس نے محسوس کیا کہ کئی باتیں ایسی ہیں کہ جن میں اصل شرعی مسئلہ تک پہنچنے میں دقت ہوتی ہے، کیونکہ ایسی کوئی جامع کتاب موجود نہیں ہے، جس میں تمام جزئیات اور نئے پیش آنے والے مسائل کا حل مذکور ہو، اس لیے انہوں نے ملک کے چیدہ چیدہ منتخب علماء کرام کا ایک بورڈ شیخ نظام الدین برہانپوری کی سربراہی میں تشکیل دیا۔ جس نے آٹھ سال کے عرصے میں اس فتاویٰ کی تدوین کا کام مکمل کیا۔ عالمگیرؒ اس کی تدوین میں خود شریک رہے۔ روزانہ کا مرتب کردہ حصہ ملا نظام سے پڑھوا کر روزانہ سنتے تھے اور بوقت ضرورت اس پر جرح بھی فرماتے تھے تاکہ مسئلہ میں کوئی ابہام وغیرہ باقی نہ رہے۔ فتاویٰ عالمگیری کے متعلق "معارف" (اعظم گڑھ) کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں۔ "حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی ترتیب اس محنت اور احتیاط کے ساتھ کی گئی ہے کہ جو مسائل قاضی یا مفتی کو پیش آسکتے ہیں، ان کے متعلق مشہور فقہاء کی رائے بغیر کسی دشواری کے دستیاب ہوسکتی ہے۔" اسی کو "فتاویٰ ہندیہ" بھی کہا جاتا ہے۔

۱۹ فتاوی برازیہ

یہ کتاب شیخ محمد بن محمد کردری خوارزمی کی تالیف ہے۔موصوف اپنے زمانے میں علم اصول وفروع اور دیگر علوم دینیہ میں یکتائے روزگار تھے۔زیادہ تر علم والد ماجد سے ہی حاصل کیا۔یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے۔ہمارے پیش نظر وہ نسخہ ہے..........جو۶ جلدوں میں مصر سے شائع ہونے والے فتاوی عالمگیر یہ کی آخری ۳ جلدوں کے حاشیہ پر چھپا ہوا ہے۔جب کہ پہلی تین جلدوں کے حاشیہ پر فتاویٰ قاضی خان چھپا ہوا ہے۔مؤلف فتاویٰ بزازیہ کا انتقال ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء کو ہوا۔

۲۰ جامع الفصولین

یہ شیخ بدرالدین محمود بن اسماعیل معروف بہ ''ابن قاضی سماوہ'' کی تصنیف ہے۔چونکہ یہ صرف معاملات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے اس لیے ہمیشہ یہ قاضیوں اور مفتیوں کے پیش نظر رہی ہے ۔درحقیقت یہ کتاب کچھ اضافات کے ساتھ دو کتابوں کا مجموعہ ہے۔ایک ''الفصول الاستروشنية'' جو قاضیوں کو کثرت سے پیش آنے والے قضا اور دعوی سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے اور تیس فصلوں پر منقسم ہے۔یہ شیخ مجدالدین محمد بن محمود استروشنی المتوفی ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء کی تصنیف ہے اور دوسری ''الفصول العمادية'' جو مندرجہ بالا موضوع پر شیخ ابوالفتح زین الدین عبدالرحیم بن ابی بکر عماد الدین کی تصنیف ہے۔مصنف اس کی تصنیف سے ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں فارغ ہوئے تھے۔ابن قاضی سماوہ نے ان دونوں کو اس طرح جمع کر دیا کہ مکررات کو حذف کر کے کچھ ضروری مسائل کا اضافہ بھی کر دیا۔مصنف کے والد بلاد روم میں بعہدہ سماوہ کے قاضی تھے۔یہ کتاب چالیس فصلوں پر مشتمل ہے۔جو نسخہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس میں جامع الفصولین کے ساتھ ہی خیر الدین رملی کے حواشی بھی ہیں،جو انہوں نے جامعۃ الفصولین پر لکھے ہیں،نیز حاشیہ پر جامعۃ الصغار چھپی ہوئی ہے اور اسکے ختم ہونے کے بعد حاشیہ پر ہی آداب الاوصیاء چھپی ہے۔

۲۱......السیر الصغیر

یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۵۰ھ/۷۶۷ء کے شاگرد اور فقہ حنفی کے مدون اول امام محمد بن الحسنؒ الشیبانی کی تصنیف ہے۔امام محمد کا خاندان اصلاً دمشق کا رہنے والا ہے۔ان کے والد عراق تشریف لے آئے۔''واسط'' میں ۱۳۲ھ/۹-۷۵۰ء میں امام محمد کی ولادت ہوئی اور ''کوفہ'' ہی میں حدیث کا درس آپ نے امام ابوحنیفہ،مسعر بن کدام اور سفیان ثوری وغیرہ سے لیا،امام مالک،اوزاعی،بکیر بن عمار اور امام ابویوسفؒ سے بھی آپ احادیث روایت کرتے ہیں،پھر بغداد میں سکونت اختیار کر لی،آپ کے شاگردوں میں امام شافعی،ابوسلیمان جوزجانی اور ابوعبید قاسم بن اسلام ایسے اکابر شامل ہیں۔آپ کچھ عرصے کے لیے ''رقہ'' کے قاضی بھی رہے۔خلیفہ ہارون رشید نے جب پہلی بار ''رے'' کا سفر کیا تو امام

محمد کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا، وہیں پر ۵۸ سال کی عمر میں ۱۸۹ھ/۸۰۵ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ موصوف کثیر التصانیف آدمی تھے۔ آپ کی کل تصانیف ۹۹۰ یعنی دس کم ایک ہزار تھیں، جن میں سے بیش تر مرورِ زمانہ کے باعث تلف ہوئیں، جو باقی بچیں، ان میں جو کثرت اور تسلسل کے ساتھ علماء فقہاء کے پڑھنے پڑھانے میں آتے ہیں ان کو ''ظاہر الروایۃ'' کہا جاتا ہے اور بقیہ کو ''نادر الروایۃ'' قرار دیا جاتا ہے۔ فقہ حنفی کا مدار ''ظاہر الروایۃ'' کتابوں پر ہے، جو تعداد میں ۶ ہیں یعنی سیر صغیر، سیر کبیر، جامع صغیر، جامع کبیر، الاصل اور زیادات۔

''سیر صغیر'' کو امام محمدؒ نے چوں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کیا تھا، اس لیے اسے ''سیر أبی حنیفۃ'' بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ''سیر صغیر'' جب امام اوزاعی نے دیکھی تو فرمایا ''ما لاھل العراق والتصنیف فی ھذا الباب'' یعنی ان مسائل کا علم اہل عراق کو نہیں ہے، اس موضوع پر وہ کیا لکھ سکتے ہیں، نیز اس کا رد انہوں نے لکھا: ''الرد علی سیر أبی حنیفۃ'' کے نام سے، جس کا جواب امام ابو یوسفؒ نے دیا اور اس کا نام رکھا ''الرد علی سیر الاوزاعی'' جو طبع بھی ہو چکا ہے۔

۲۲...... السیر الکبیر

یہ بھی امام محمد رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ موصوف کو جب ان کی تصنیف ''سیر صغیر'' پر امام رحمہ اللہ کا تبصرہ معلوم ہوا تو پھر انہوں نے ایک مبسوط اور مفصل کتاب اسی موضوع پر تحریر فرمائی کے بارے میں امام اوزاعی نے فرمایا تھا کہ اہل عراق کو ''سیر'' کے مسائل کا کیا علم؟ یہ کتاب جب امام اوزاعی کو پہنچی تو انہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور متحیر اور ششدر ہو کر فرمایا کہ اگر اس کتاب میں احادیث مبارکہ نہ ہوتیں تو میں کہتا کہ یہ شخص علم خود تیار کر لیتا ہے۔ یہ کتاب امام شمس الائمہ سرخسی کی شرح کے ساتھ ۴ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

۲۳...... کتاب الأصل

یہ امام محمد رحمہ اللہ کی سب سے پہلی تصنیف ہے اور اسی بنا پر اس کا نام ''الاصل'' رکھا گیا ہے۔ یہ درحقیقت امام محمد رحمہ اللہ کی متعدد تصانیف کا مجموعہ ہے۔ امام موصوف نے مختلف ابواب فقہ پر ایک ایک مستقل کتاب تحریر فرمائی تھی، مثلاً کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، وغیرہ اس طرح تقریباً ۶۰ کتاب تالیف فرمائی تھیں۔ ان ہی کا مجموعہ ''کتاب الاصل'' کہلاتا ہے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر اہل کتاب میں سے ایک حکیم یہ کہہ کر مسلمان ہوگیا تھا کہ ''ھذا کتاب محمد کم الاصغر، فکیف کتاب محمد کم الاکبر'' یعنی یہ تمہارے چھوٹے محمد کی کتاب ہے۔ تو تمہارے بڑے محمد ﷺ کی کتاب کا کیا حال ہوگا اور یہی وہ کتاب ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ نے حفظ کیا تھا اور پھر اسی نہج پر اپنی کتاب ''الام'' کو تالیف فرمایا۔ یہ کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں اب پاکستان میں طبع ہوگئی ہے۔ دیگر

کتابوں کی بہ نسبت زیادہ مفصل ہونے کے باعث اس کو ''مبسوط'' بھی کہا جاتا ہے۔

۲۴ الجامع الصغیر

یہ بھی امام محمد رحمہ اللہ کی تالیف ہے اس کا سبب تالیف یہ ہوا کہ امام ابو یوسف (المتوفی ۱۸۲ھ/ ۷۹۸ء) نے امام محمد سے فرمایا کہ جو مسائل امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے، میری روایت سے تم کو پہنچے ہیں ان کو یکجا جمع کر دو۔ امام محمد نے یہ کتاب مرتب فرما کر پیش فرما دی۔ اس میں ۱۵۳۲ مسائل درج ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے دیکھ کر تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ میری روایت کو خوب یاد رکھا، لیکن ۳ مسائل میں تم نے غلطی کی ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا میں نے غلطی نہیں کی۔ بلکہ آپ اپنی روایت بھول رہے ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ باوجود جلالت شان کے اس کتاب کو سفر و حضر میں اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے۔ یہ کتاب بھی پہلی بار ٹائپ پر کراچی سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

۲۵ الجامع الکبیر

یہ بھی امام محمد رحمہ اللہ کی تصنیف ہے، لیکن دیگر کتابوں کی بہ نسبت یہ زیادہ دقیق ہے، بغیر کسی محقق آدمی کی مفصل شرح دیکھے ہوئے، بات کی تہ تک پہنچنا دشوار ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ کہ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی شخص بلندی پر گھر تعمیر کرے اور ساتھ ساتھ سیڑھیاں بناتا جائے۔ جب اس کی تعمیر مکمل ہو جائے تو نیچے اتر کر سب سیڑھیاں توڑ ڈالے اور کہے کہ لیجیے چڑھیے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاید امام محمد رحمہ اللہ نے اس کو اس لیے تالیف فرمایا تھا تا کہ یہ ایک کسوٹی بن جائے۔ فقہاء کی عظمت کو معلوم کرتے اور اس کے ملکۂ استنباط کو دریافت کرنے کے لئے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ اس لیے بڑے بڑے فقہاء نے اس کی شرح لکھی ہے۔ یہ کتاب لاہور سے طبع ہو چکی ہے۔

۲۶ ...... زیادات

یہ بھی امام رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ امام قاضی خان نے یہ ذکر فرمائی ہے۔ کہ ''جامع کبیر'' تصنیف کے بعد کچھ اور مسائل کا ذکر موصوف نے مناسب جانا تو ان کو علیحدہ مستقل صورت میں جمع فرما دیا اور اس کا نام رکھ دیا ''زیادات'' پھر اس کی تکمیل کے بعد مزید کچھ مسائل ''الزیادات'' کے نام سے جمع فرمائے۔ زیادات الزیادات بہت مختصر کتاب ہے۔ کل سات باب ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی شرحیں بھی بہت سے اکابر نے لکھی ہے۔ ''زیادات'' تو تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ لیکن زیادات الزیادات شمس الائمہ سرخسی اور امام ابو نصر احمد بن محمد العتابی البخاری المتوفی (۵۸۶ھ ۱۱۹۰ء) کی شرحوں کے ساتھ لاہور سے طبع ہو چکی ہے۔ چونکہ ''زیادات الزیادات'' دراصل ''زیادات'' ہی کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ اس لئے یہ بھی ''ظاہر الروایۃ'' کتابوں میں شامل ہے۔

۲۷ کتاب الحجة علی اھل المدینة

یہ بھی امام محمد رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ اس کا سبب تالیف یہ ہے کہ جب امام محمد رحمہ اللہ مدینہ منورہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام تشریف لے گئے۔ تاکہ موطا کا سماع امام مالک رحمہ اللہ سے کریں اور اس دوران وہاں کے دیگر محدثین سے بھی احادیث کا سماع کیا، تو وہاں کے علماء کرام سے ان مسائل پر بحث مباحثہ بھی ہوا۔ جو احناف اور ان کے درمیان مختلف فیہ تھے۔ اسلئے امام محمد رحمہ اللہ نے اس وقت اپنے مؤقف پر دلائل کتابی صورت میں جمع فرما دیئے۔ پھر جب آپ مدینہ منورہ سے واپس عراق تشریف لائے تو اس کتاب کو ان کے شاگردوں نے اس سے روایت کیا۔ اس وقت جو نسخہ اس کتاب کا دستیاب ہے۔ وہ امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد عیسیٰ بن ابان (المتوفی ۲۲۱ھ، ۸۳۶ء) کی روایت سے ہے۔ اس کتاب کا مکمل نسخہ تا حال دستیاب نہیں ہے۔ جو حصہ دستیاب ہے اندازہ ہے کہ وہ اصل کتاب کا نصف حصہ ہے۔ بہر حال جو حصہ دستیاب ہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی سید مہدی حسن رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۹۶ھ، ۱۹۷۶ء) کی تعلیقات وحواشی کے ساتھ ۴ جلدوں میں لاہور سے بھی طبع ہو چکا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ کی مندرجہ بالا تمام کتابیں اولاً حیدرآباد دکن کے ادارہ ''دارالمعارف النعمانیہ'' کی طرف سے علامہ ابوالوفاء افغانی رحمہ اللہ کی کوششوں سے طبع ہوئی تھیں۔ بعد میں جہاں کہیں سے طبع ہوئی ہیں۔ اسی سابقہ ایڈیشن کی عکسی طباعت ہے۔

۲۸ تنویر الأبصار

یہ علامہ شمس الدین محمد بن عبداللہ بن احمد الخطیب تمرتاشی الغزی کی تصنیف ہے۔ یہ ایک انتہائی جامع اور مختصر متن ہے۔ یہ فلسطین کے علاقہ ''غزہ'' کے رہنے والے تھے۔ علامہ ابن نجیم مصری صاحب ''البحر الرائق'' کے شاگرد تھے علوم دینیہ بالخصوص فقہ وفتاویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔ متعدد ضخیم کتابیں اور کئی چھوٹے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ''تنویر الابصار'' کو بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور متعدد علماء نے اس کی شروح وحواشی لکھے۔ اس کے شرحوں میں سب سے زیادہ مشہور ''درمختار'' ہے۔ جس کا تعارف اس سے پیشتر ہم کرا چکے ہیں۔ مصنف تنویر الابصار کا انتقال ۱۰۰۴ھ، ۱۵۹۶ء کو ہوا۔

۲۹ ...... مختصر الوقایہ

امام برہان الشریعہ محمود بن صدر الشریعة الاول نے ایک کتاب ''وقایة الروایة فی مسائل الھدایة'' اپنے نواسے صدر الشریعة الثانی عبیداللہ بن مسعود المتوفی ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۵ء کے لئے مرتب فرمائی تھی۔ یہ کتاب علماء وفقہاء کے درمیان بہت مقبول ہوئی۔ متعدد اکابر نے اس کی شرحیں لکھیں۔ خود مصنف کے نواسے صدر الشریعة الثانی عبیداللہ بن مسعود نے بھی اس کی شرح لکھی۔ آج کل جب شرح

وقایہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو انہی کی شرح مراد ہوتی ہے۔ صدر الشریعۃ الثانی نے شرح لکھنے کے علاوہ ''وقایۃ الروایۃ فی مسائل الہدایۃ'' کا ایک اختصار لکھا۔ اس مختصر الوقایہ کا نام انہوں نے ''نقایہ مختصر الوقایہ'' رکھا۔ یہ متن انتہائی مختصر اور عمدہ ہے اور علماء کرام کے ہاں بہت مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شرح متعدد اکابر علماء نے لکھی ہے۔ نقایہ کی شرحوں میں سے ایک بہت اہم اور نفیس شرح ملا علی قاری رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۱۴، ۱۶۰۶ء) کی تصنیف ہے۔ جو حال ہی میں کراچی سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔ اس شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ ملا علی قاری نے اثبات مسائل میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا ہے۔ کہ حتی الوسع احادیث پاک سے پیش فرمائے جائیں۔

۳۰ فتاویٰ تاتار خانیہ

امیر تاتار خان دہلوی، فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں ایک اہم رکن سلطنت تھے۔ وہ بڑے عالم فاضل اور تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول میں بڑا امتیاز مقام رکھتے تھے۔ نیز بڑے اونچے اخلاق و کردار کے حامل تھے۔ شریعت مطہرہ کے تحت پابند، امراء وحکام کا شدید محاسبہ کرانے والے تھے۔ ان کی صحبت میں ہمیشہ علماء وفضلا کا مجمع رہتا اور وہ اس پا کباز طبقہ کا بہت احترام فرماتے تھے۔

انہوں نے اپنے دور کے ایک بہت بڑے علوم عربیہ اور فقہ واصول کے عالم شیخ فرید الدین عالم بن علاء اندر پتی (المتوفی ۷۸۶ھ، ۱۳۸۴ء) کو حکم دیا کہ فقہ حنفی کی ایک جامع کتاب مرتب کریں اور اختلافی مسئلہ میں تمام اقوال مختلفہ نقل کر دیں اور ساتھ ہی اختلاف کرنے والے علماء وفقہاء کی تصریح کر دیں۔ چنانچہ امیر تاتار خان کے حکم کے بعد شیخ عالم بن علاء نے ایک بڑی ضخیم کتاب مرتب کر دی اور اسکا نام ''زاد السفر'' اور ''زاد المسافر فی الفروع'' رکھا گیا۔ لیکن چونکہ اس کی ترتیب وتسوید امیر تاتار خان دہلوی کے حکم سے ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی زیادہ شہرت فتاویٰ تاتارخانیہ کے نام سے ہوئی۔ معلوم ہوا ہے کہ اب دہلی میں اس کی طباعت ہو رہی ہے۔ اور ایک جلد طبع بھی ہوگئی ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۱...... فتاویٰ حمادیۃ

یہ مفتی رکن الدین ناگوری بن حسام الدین ناگوری کی تصنیف ہے۔ جو علاقہ گجرات کاٹھیاوار) کے ایک مشہور شہر نہروالہ میں منصب افتاء پر فائز تھے۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے ہی علاقہ کے قاضی القضاۃ قاضی حماد الدین بن محمد اکرم گجراتی کے حکم پر تالیف فرمائی۔ اس کی تالیف میں ان کے صاحبزادے مفتی داؤد بن مفتی رکن الدین ناگوری بھی اپنے والد کے ساتھ شامل رہے۔ فتاویٰ حمادیہ کے مقدمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ تفسیر حدیث فقہ اور اصول فقہ کی ۲۱۶ کتابوں سے استفادہ کرکے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ قاضی حماد الدین صاحب نے یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ اس کتاب میں صرف وہ مسائل جمع فرمائیں جو جمہور فقہاء کے اجماعی اور مفتی بہ ہوں۔ چونکہ اس کی تالیف اس ہدایت کے

مطابق عمل میں آئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب لائق اخذ اور قابل اعتماد بن گئی ہے۔

۳۲ ـــــ مجموعة الفتاوى

یہ حضرت مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ یہ فتاویٰ ۳ جلدوں میں طبع ہوئے تھے اور اس کا ایک ایڈیشن وہ بھی ہے۔ جو خلاصۃ الفتاویٰ کے حاشیہ پر چھپا تھا۔ اب پاکستان سے ان دونوں ایڈیشنوں کی عکسی طباعت ہوگئی ہے۔ چونکہ مولانا لکھنوی کے اکثر فتاویٰ عربی یا فارسی زبان میں تھے۔ اس لئے عوام الناس اس سے استفادہ نہیں کر پاتے تھے۔ دوسرا اشکال اس سے استفادہ کا، جس سے عوام چھوڑ، خواص بھی پریشان تھے۔ وہ یہ تھا کہ ہر باب کے مسائل تین جلدوں میں بکھرے ہوئے تھے۔

ان دونوں اشکالوں کو رفع کرنے کے لئے مولانا خورشید عالم صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند، مدرس دارالعلوم کراچی نے ایک تو بڑی سہل اردو میں اس کا ترجمہ فرمادیا اور پھر اس کو اس طرح مرتب فرما دیا کہ تین جلدوں میں بکھرے ہوئے مسائل کو یکجا کردیا۔ اس طرح نہ صرف عوام کے استفادہ کا راستہ ہموار ہوا بلکہ وہ پریشانی بھی رفع ہوگئی۔ جو مسائل کے کئی جلدوں میں منتشر ہونے کے باعث پیدا ہوتی تھی۔ یہ ترجمہ بترتیب جدید کراچی سے ایک جلد میں طبع ہوچکا ہے۔ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی کی ولادت ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۶۴ھ، ۱۸۴۸ء کو ہوئی۔ آپ کثیر التصانیف تھے۔ تقریباً ہر علم میں آپ نے کوئی نہ کوئی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ آپ کی کل تصانیف کی تعداد ۹۰ کے لگ بھگ ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں حفظ قرآن سمیت تمام علوم مروجہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ سے فراغت حاصل کرلی۔ مولانا کا انتقال بہت کم عمری میں ہوگیا۔ آپ کا سنہ وفات ۱۳۰۴ھ، ۱۸۸۶ء ہے۔

۳۳ ..... مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر

امام ابراہیم بن محمد حلبی ۹۵۶ھ، ۱۵۴۹ء نے مسائل فقہ پر ایک جامع کتاب مرتب کی، جس میں "مختصر قدوری"، "المختار"، "الکنز" اور "الوقایۃ" کے مسائل کو جمع کردیا، نیز "ہدایہ" اور "مجمع" کے مسائل ضروریہ بھی اس میں شامل کردیئے اور اقاویل مختلفہ میں سب سے مقدم اس قول کو ذکر کیا جو زیادہ راجح تھا اور اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ "متون اربعہ" کا کوئی مسئلہ ذکر ہونے سے رہ نہ جائے، اس کا نام انہوں نے رکھا "ملتقی الابحر"۔ جامعیت اور قابل اعتماد ہونے کے باعث یہ کتاب بڑی مشہور ہوئی اور بڑے بڑے علماء نے اس کی شرحیں لکھیں۔

۳۴ ..... الجوهرة النيرة على مختصر القدورى

شیخ احمد بن محمد ابوالحسین بغدادی قدوری (المتوفی ۴۲۸ھ، ۱۰۳۷ء) نے فقہ حنفی میں ایک متن "مختصر

القدوری" کے نام سے مرتب فرمایا، جو فقہ حنفی کے بہت قابل اعتماد "متون اربعہ" میں شامل ہے۔ اس کی متعدد اکابر نے مختصر و مبسوط شرحیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اہل علم کے ہاں بہت متبرک سمجھی جاتی ہے۔ وباء کے زمانہ میں اس کا پڑھنا، وباء کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے، اس کا حفظ کرنا فقر سے نجات دیتا ہے۔

یہ کتاب بارہ ہزار مسائل پر مشتمل ہے۔ بغداد کے ایک محلہ قدورہ کی طرف انتساب کے باعث یا "قدور" یعنی ہانڈیوں کے بنانے یا بیچنے کے باعث ان کو "قدوری" کہا جاتا ہے۔ "الجوہرۃ النیرۃ" اسی "مختصر القدوری" کی ایک معتمد علیہ شرح ہے، جو شیخ الاسلام ابوبکر بن محمد بن علی الحدادی الیمنی (المتوفی ۸۰۰ھ،۷/۱۳۹۸ء) کی تصنیف ہے۔

۳۵ فتاویٰ خیریہ

یہ علامہ خیر الدین بن احمد فاروق رملی کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ علامہ خیر الدین رملی کی ولادت فلسطین کے شہر "رملہ" میں ۹۹۳ھ،۱۵۸۵ء میں ہوئی۔ موصوف ایک بڑے مفسر، محدث، فقیہ اور منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ علوم عربیہ ادبیہ کے بھی ماہر تھے۔ تحصیل علم کے بعد اپنے شہر اور مصر میں درس دیتے رہے۔ متعدد کتابوں مثلاً "عینی، شرح کنز، الاشباہ والنظائر، البحر الرائق اور جامع الفصولین" وغیرہ پر حواشی لکھے۔ فتاویٰ خیریہ ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جو ان کے شاگرد علامہ ابراہیم بن سلیمان رملی نے جمع کیا ہے۔ اس کا پورا نام "الفتاویٰ الخیریۃ لنفع البریۃ" ہے، مصر سے یہ فتاویٰ "العقود الدریۃ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ" کے حاشیہ پر دو جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ علامہ خیر الدین رملی کا انتقال اپنے شہر "رملہ" میں ۱۰۸۱ھ،۱۶۷۰ء میں ہوا۔

۳۶ العقود الدریۃ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ

یہ علامہ ابن عابدین شامی صاحب "ردالمحتار" کی تصنیف ہے۔ یہ مولانا حامد آفندی مفتی دمشق کے فتاویٰ کی تنقیح ہے۔ جو انہوں نے منصب افتاء پر فائز رہنے کے زمانہ (۱۱۳۷ھ،۴/۱۷۲۵ء تا ۱۱۵۵ھ،۲/۱۷۴۳ء) میں صادر فرمائے تھے اور "فتاویٰ حامدیہ" کے نام سے خود مولانا حامد صاحب نے جمع فرمائے تھے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ نافع اور اس سے زیادہ قابل اعتماد فتاویٰ کا مجموعہ کوئی نہیں دیکھا، نیز مفتی صاحب کے متاخر زمانے میں ہونے کے باعث اس میں بہت سے جدید پیش آمدہ حوادث اور واقعات کا حل بھی مل جاتا ہے، لیکن چونکہ اس کی ترتیب کوئی عمدہ نہ تھی کہ جس سے مسئلہ آسانی سے معلوم کیا جاسکے۔ مشہور اور غیر ضروری مسائل بھی اس میں درج تھے اور بعض مسائل مکرر بھی درج ہو گئے تھے، نیز بعض جگہ ایسے بھی ہوا کہ مسئلہ ایک جگہ ذکر کیا گیا اور دلیل کسی دوسری جگہ نقل کر دی گئی ہے۔ اس لئے میں نے اس کو صحیح ترتیب پر مرتب کرنے اور مہذب و منقح کرنے

نیز بوقت ضرورت اہم اضافے کرنے کا عزم کر کے کام شروع کر دیا تا آنکہ میں نے اس کو مکمل کر ڈالا۔ علامہ شامی نے ''فتاویٰ حامدیہ'' کی تنقیح، اپنی کتاب ''ردالمحتار'' اور ''منحۃ الخالق'' کی تکمیل کے بعد فرمائی ہے۔ ترتیب جدید کے بعد علامہ شامی نے اس کا نام ''العقود الدریہ فی تنقیح الفتاوی الحامدیہ'' رکھا۔ یہ کتاب مصر سے حاشیہ پر، فتاویٰ خیریہ کے ساتھ دو جلدوں میں چھپ چکی ہے اور بیروت سے تنہا بھی دو جلدوں میں طبع ہوگئی ہے۔

۳۷...... کتاب الخراج

یہ امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم کی تصنیف ہے، جو امام اجل، فقیہ اکمل، حافظ الحدیث امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سب سے اونچے درجہ کے حامل اور مجتہد فی المذہب تھے۔ آپ ایک مشہور انصاری صحابی سعد بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں، ۱۱۳ھ میں آپ کی پیدائش کوفہ میں ہوئی۔ ہشام بن عبدالملک مہدی، ہادی اور ہارون رشید کے عہد میں عہدۂ قضاء پر فائز رہے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ ایسے کبار محدثین آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔

کتاب الخراج، آپ نے خلیفہ ہارون رشید کے تقاضے پر تصنیف فرمائی تھی۔ اس میں انہوں نے اسلام کے مالیاتی نظام کے بارے میں بڑی اہم اور مفید معلومات جمع فرمادی ہیں۔ زکوۃ وصدقات، عشر وخراج، فئی اور مال غنیمت کی تقسیم۔ نیز اہل ذمہ اور مرتدین کے احکام وغیرہ، سبھی کچھ اس میں تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا انتقال قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہونے کے زمانے میں ۱۸۲ھ، ۷۹۸ء کو بغداد میں ہوا۔

۳۸...... التحریر المختار لردالمحتار

شیخ عبدالقادر بن مصطفیٰ الرافعی کا یہ حاشیہ ہے، جو انہوں نے ''ردالمحتار'' پر لکھا ہے۔ موصوف کی ولادت ۱۲۴۸ھ، ۱۸۳۳/۲ء میں ہوئی۔ آپ مصر میں منصب افتاء پر فائز ہوئے، لیکن تین دن بعد ہی آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ کی وفات ۱۳۲۳ھ، ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ یہ حاشیہ مصر سے دو جلدوں میں چھپ گیا ہے۔ پہلی جلد کتاب الطلاق پر ختم ہوئی ہے اور دوسری جلد کتاب العتق سے شروع ہوئی، آخر کتاب تک کے حواشی پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو ''تقریرات رافعی'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

۳۹...... اتحاف الأبصار والبصائر بتبویب کتاب الأشباہ والنظائر

یہ کتاب شیخ محمد ابوالفتح حنفی کی تالیف ہے۔ موصوف نے علامہ نجیم کی کتاب ''الاشباہ والنظائر'' کو جدید ترتیب دے کر ابواب پر مرتب کیا ہے اور اس ترتیب جدید کا نام ''اتحاف الابصار والبصائر'' رکھا ہے۔ اس ترتیب جدیدہ کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح کتاب سے استفادہ کرنے میں سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ مصنف اس کی تالیف سے ۱۲۷۵ھ، ۱۸۸۹/۸ء میں فارغ ہوئے۔ یہ کتاب مطبع اسکندریہ سے

۱۴۸۶ھ،۱۸۷۲ء میں ۵۳۸ صفحات پر چھپ چکی ہے۔

۴۰ السراجی

ساتویں صدی ہجری کے مشہور عالم امام سراج الدین ابوطاہر محمد السجاوندی حنفی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا موضوع ''علم الفرائض''،یعنی ''علم وراثت'' ہے۔ اس کتاب میں رشتہ داروں کی قسمیں، ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام وغیرہ کو تفصیل سے بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ کون سا رشتہ دار وراثت میں کس وقت کیا حصہ پائے گا اور کب وہ وراثت سے محروم ہوگا، اس کتاب کی بڑے بڑے اکابر علماء نے شرحیں لکھی ہیں۔ متعدد بار یورپ، مصر، ہندو پاک سے طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو ''سراجیہ''، ''الفرائض السراجیہ'' اور ''فرائض السجاوندی'' بھی کہا جاتا ہے۔

۴۱ الشریفیه

یہ ''سراجی'' کی شرح ہے، جو علامہ علی بن محمد حسینی معروف بہ علامہ سید شریف جرجانی کی تالیف ہے۔ سید شریف جرجانی کی ولادت ''جرجان'' میں ۷۴۰ھ،۹/۱۳۴۰ء میں ہوئی۔ ابتداءً انہوں نے علوم عربیہ کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، جس کے باعث وہ ان علوم عربیہ میں ''امامت'' کے درجہ کو جا پہنچے۔ بعدازاں آپ نے علوم عقلیہ کی طرف رخ کیا۔ آخر کار ''شیراز'' میں سکونت پذیر ہو گئے اور وہیں ۸۱۶ھ،۱۴۱۳ء میں وفات پائی۔

۴۲ ...... رسائل الأركان

یہ کتاب علامہ بحر العلوم عبدالعلی لکھنوی کی تصنیف ہے۔ مولانا نظام الدین انصاری سہالوی (المتوفی ۱۱۶۱ھ، ۱۷۴۸ء) کے فرزند ارجمند ہیں۔ ۱۷ سال ہی کی عمر میں تمام علوم وفنون سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ متعدد کتابوں کے آپ مصنف ہیں۔ بہت سی کتابوں پر شروح وحواشی تحریر فرمائے ہیں۔ یہ کتاب آپ نے ''ارکان اربعہ'' نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے مسائل پر تحریر فرمائی ہے۔ آپ نے نفس مسائل کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ قرآن وسنت کے دلائل نیز عقلی براہین سے ان کو مدلل ومبرہن بھی فرمایا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ لکھنو سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں طبع ہو چکی ہے۔ علامہ بحر العلوم کی وفات ''مدراس'' میں ۱۲۳۵ھ،۱۸۲۰ء میں ہوئی۔

۴۳ ...... السعاية

یہ شرح وقایہ کی مفصل اور مبسوط شرح ہے، جو مولانا عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ حضرت مولانا لکھنوی نے ''شرح وقایہ'' اپنے والد ماجد سے پڑھنے کے زمانے میں ان کے حکم سے اس کی ایک شرح لکھی تھی، جس کا نام ''حسن الولایۃ بحل شرح الوقایہ'' رکھا تھا، جو شرح وقایہ کے نصف اول کے متفرق مشکل مقامات کے حل پر مشتمل تھی۔ بعدازاں مکمل شرح وقایہ پر ایک حاشیہ تحریر فرمایا،

جس کا نام ''عمدۃ الرعایۃ'' ہے جو شرح وقایہ کے ساتھ بارہا طبع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ''شرح وقایہ'' کی ایک مبسوط اور مفصل شرح لکھنی شروع فرمائی جس میں ہر مسئلے میں تمام اختلافات نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک مسلک کے عقلی و نقلی دلائل اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات نیز کسی ایک مسلک کی مدلل ترجیح کا بیان مفصل طور پر کیا گیا ہے۔ اس مفصل شرح کا نام انہوں نے رکھا ''السعایۃ فی کشف مافی شرح الوقایۃ'' لیکن افسوس کہ مصنف اپنی اس عظیم تصنیف کو مکمل نہ فرما سکے۔ اسکی صرف دو جلدیں طبع ہوئی، جلد اول باب المسح علی الخفین کی ابتدائی چند سطروں تک ہی پر مشتمل ہے، جب کہ دوسری جلد ''باب الاذان'' سے ''فصل فی القراۃ'' کے ختم تک کی شرح پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں بھی طبع ہو چکی ہے۔ مصنف کے مختصر حالات ''مجموعۃ الفتاویٰ'' کے تعارف کے ذیل میں لکھے جا چکے ہیں۔

٤٤ ...... التشریع الجنائی الاسلامی

یہ کتاب ''اسلام کے فوجداری قانون'' کے موضوع پر ہے جو ''مصر'' کے ایک عالم جناب عبدالقادر عودہ شہید کی تصنیف ہے۔ موصوف ''مصر'' کی ایک مشہور جماعت ''الاخوان المسلمون'' کے رکن تھے۔ 1954ء میں بغاوت کے الزام میں موصوف کو پھانسی دے دی گئی تھی۔

یہ کتاب دو جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ جلد اول میں پہلے تمہیدی طور پر عام رائج غیر اسلامی قوانین کا اسلامی قوانین کے ساتھ تقابل کر کے اسلامی قوانین کی فوقیت و برتری متعدد وجوہ سے ثابت کی گئی ہے۔ بعد ازاں جلد اول کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کو" کتاب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ''الکتاب الاول'' کی ''قسم اول'' میں ''جرم'' کی ماہیت اور اس کے انواع کا بیان ہے اور قسم ثانی میں ''جرم'' کے ارکان شرعیہ، ارکان مادیہ اور ادبیہ کا بیان ہے۔ اس کے بعد ''الکتاب الثانی'' شروع ہوتی ہے۔ اس میں ''عقوبت'' کے بارے میں مبادی عامہ اور اقسام عقوبت کا بیان ہے۔ جلد دوم میں ''قتل''، ''زنا''، ''شرب خمر''، سرقہ، ''ڈاکہ زنی'' اور ''بغاوت و ارتداد'' ایسے جرائم اور ان کے احکام کا تفصیلی ذکر ہے۔ کتاب کا اردو ترجمہ بھی ''اسلام کا فوجداری قانون'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

٤٥ ...... المدخل الفقهی العام

یہ کتاب علامہ مصطفیٰ احمد الزرقا کی تصنیف ہے جو ''دمشق یونیورسٹی'' کے ''کلیۃ الحقوق'' میں ملکی اور شرعی قانون کے استاد ہیں۔ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک ان ممالک میں جو خلافت عثمانیہ کے ماتحت رہ چکے تھے ''المجلۃ العدلیۃ'' کے مطابق ملکی عدالتیں فیصلے کرتی رہیں۔ ''المجلۃ العدلیۃ'' وہ دستاویز ہے جس میں خلافت عثمانیہ کے زمانے میں فقہاء کی ایک جماعت نے فقہ حنفی کی روشنی میں شریعت اسلامیہ کے ان قوانین کو دفعہ وار مرتب کر دیا تھا، جن کا تعلق ملکی و انتظامی

امور سے تھا۔

علامہ مصطفیٰ احمد الزرقا کا کہنا ہے کہ بعض مسائل باوجود اس کے کہ ان کا تذکرہ فقہ کی کتب میں موجود تھا، لیکن وہ مسائل ''المجلۃ العدلیۃ'' میں درج ہونے سے رہ گئے، نیز ان کا کہنا ہے کہ بہت سے جدید مسائل اب ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کا وجود''المجلۃ'' کی تالیف کے زمانے میں نہ تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا حل بھی ''المجلۃ''میں نہ آسکا۔ علامہ زرقا، یہ بھی فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر ''المجلۃ'' کی تالیف ''فقہ حنفی'' کے مسائل سے ہوئی ہے۔ گو بوقت ضرورت اہل سنت کی دوسری فقہوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، مگر اساس بہرحال فقہ حنفی ہی ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ اس کی تالیف بھی ایسے نہج پر نہیں ہے، جس سے قانون کے طلبا، کی تعلیمی ضرورت پوری ہوسکے۔

بہرحال ان وجوہ سے انہوں نے اسکی ضرورت محسوس کی کہ فقہ کی ترتیب جدید کی جائے، جس میں نہ صرف یہ کہ قدیم ذکر شدہ مسائل تمام کے تمام آجائیں، بلکہ جدید پیش آمدہ مسائل کا حل بھی اس میں موجود ہو، نیز اس ترتیب جدید میں کسی ایک فقہ پر انحصار کرنے کی بجائے چاروں مکاتب فقہ کو مدنظر رکھا جائے اور جس فقہ میں بھی کسی مسئلہ کا زیادہ بہتر حل موجود ہو، اسے قبول کرلیا جائے اور ساتھ ہی اسکی ترتیب بھی ایسی ہو کہ طلباء کی تعلیمی ضرورتوں اور تقاضوں کو بھی وہ پورا کردے۔ نیز مسئلے کو علیحدہ علیحدہ ذکر کرنے کی بجائے مسائل کو اس انداز سے ذکر کیا جائے کہ پہلے ایک اصول وقاعدہ بتا کر پھر اس پر متفرق ہونے والے مسائل کو ذکر کیا جائے، کیونکہ اس طرح مسائل کو یاد رکھنے میں سہولت ہوجاتی ہے۔ بہرحال علامہ مصطفیٰ احمد الزرقا نے ان خطوط پر کام کا آغاز کیا اور ''الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید'' کے عنوان سے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع فرمایا، جس میں پہلی دو جلدیں ''المدخل الفقہی العام'' کے نام سے شائع ہوئیں۔

==== ☆☆☆ ====

چنداصول فقہ

نوٹ: ائمہ احنافؒ نے کتاب وسنت اوراجماع امت کے فقہی احکام، شرعی قوانین اور مجموعہ قضایا وفتاوی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعدان کی روشنی میں کچھ "فقہی اصول" منضبط کئے ہیں، جنہیں وہ ضوابط کلیہ کےطور پر احکام کی تخریج میں استعمال کرتے ہیں، فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الاشباہ والنظائر" سے نمونے کےطور پر چند اصول ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں تا کہ اس کتاب کے قارئین کرام ائمہ احناف کی قانونی بصیرتوں، فکرونظر کی وسعتوں اور تمدن ومعاشرت اورانسانوں کے طبعی حالات وضروریات پران کے گہرے اور وسیع مطالعہ کااندازہ لگاسکیں۔

(م۔س۔آلف غفرلہٗ)

۱......**المشقة تجلب التيسر**

مشقت آسانی کوکھینچتی ہے۔

۲......**الضرورات تبيح المحظورات**

صورتیں ممنوعات کومباح کردیتی ہیں۔

۳......**ماابيح للضرورة يتقدر بقدر ها**

جوچیز ضرورۃً مباح ہو، وہ ضرورت ہی کی حدتک مباح رہے گی یعنی ضرورت کے دائرہ سے باہراسے مباح نہیں سمجھاجائیگا۔

٤......**ماجاز بعذر بطل بزواله**

جوچیز کسی عذر کی وجہ سے جائز قراردیجائے، عذرختم ہوجانے کے بعداسکاجواز بھی ختم ہوجائیگا۔

٥......**الضرر لايزال بالضرر**

ضررکاازالہ ضرر کے ذریعہ نہیں کیاجائیگا۔

٦......**يتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام**

ضررعام کے دفع کے لیےضررخاص کوبرداشت کیاجائے گا۔

٧......**اعظم ضررا يزال بالاخف**

زیادہ ضرروالی چیزکم ضرروالی چیز کے ذریعہ زائل کی جائیگی۔

٨......**من ابتلى ببليتين وهما متساويان ياخذ بايتهما شاء وان اختلفايختار اهونهما...**

جوکسی ایسی دوبلاؤں میں گھرجائے جوقباحت کے لحاظ سے مساوی ہوں تو دونوں میں سے جسے چاہے اختیارکرلےاوراگرایک میں قباحت کم ہےدوسرے میں زیادہ، توکم والی کواختیارکرے۔

۹۔۔۔۔۔۔درء المفاسد اولی من جلب المصالح

حصول نفع کے مقابلے میں نقصان سے بچنا زیادہ بہتر ہے۔

۱۰۔۔۔۔۔۔اذاتعارض المانع والمقتضی یقدم المانع

جب مقتضی اور مانع کے درمیان تعارض پیدا ہو جائے تو مانع کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۱۔۔۔۔۔۔اذااجتمع الحلال والحرام غلب الحرام

جب کسی مسئلے میں حلال وحرام دونوں پہلو جمع ہو جائیں تو حرام کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۲۔۔۔۔۔۔تصرّف الامام علی الرعیة منوط بالمصلحة

عوام کے مسائل وحقوق میں سلطان وقت کے تصرفات مصلحت پر مبنی ہوں گے۔

۱۳۔۔۔۔۔۔الولایة الخاصة اقویٰ من الولایة العامة

ولایت خاصہ، ولایت عامہ کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہوگی۔

۱۴۔۔۔۔۔۔الامور بمقاصدها

امور اپنے مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔

۱۵۔۔۔۔۔۔الیقین لایزول بالشك

یقین شک سے نہیں زائل ہوگا۔

۱۶۔۔۔۔۔۔ماثبت بیقین لایرتفع الاّ بالیقین

جو چیز یقین سے ثابت ہو، وہ یقین ہی کے ذریعہ مرتفع ہوگی۔

۱۷۔۔۔۔۔۔الاصل العدم

نہ ہونا یہی اصل ہے۔

نوٹ: اس ضابطہ کا تعلق ان اوصاف سے ہے جو کسی چیز کو عارض ہوتے ہیں۔

۱۸۔۔۔۔۔۔الاصل الوجود

ہونا ہی اصل ہے۔

نوٹ: اس ضابطہ کا تعلق کسی چیز کی صفاتِ اہلیہ سے ہے۔

۱۹۔۔۔۔۔۔الحدود تندرئ بالشبهات

شبہات حدود کے نفاذ سے مانع ہوتے ہیں۔

۲۰۔۔۔۔۔۔التعزیر یثبت بالشبهة

شبہہ بھی تعزیر کیلیے کافی ہے۔

نوٹ: شبہہ کہتے ہیں جو ثابت نہ ہو لیکن ثابت کے مشابہ ہو (الشبهة ما یشبه بالثابت ولیس بثابت)

۲۱ ...... ما حرم اخذہ حرم اعطائہ

جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے۔

۲۲ ...... ما حرم فعلہ حرم طلبہ

جس کام کا کرنا حرام ہے اس کی طلب بھی حرام ہے

۲۳ ...... لا عبرۃ بالظن البین خطأہ

اس گمان کا کوئی اعتبار نہیں جس کا غلط ہونا ظاہر ہو۔

۲۴ ...... ذکر بعض مالا یتجزی کذکر کلہ

کسی ایسے ٹکڑے کا ذکر، جو کل سے الگ نہ کیا جا سکے، کل کے ذکر کی طرح ہے۔

۲۵ ...... اذا اجتمع المباشر والمسبب اضیف الحکم الی المباشر

جب کسی کام کا مرتکب اور سبب دونوں جمع ہو جائیں، تو حکم کا تعلق مرتکب کے ساتھ ہوگا۔

۲۶ ...... اعمال الکلام اولیٰ من اھمالہ

کسی کلام کو با معنیٰ بنانا اسے مہمل بنانے سے بہتر ہے۔

۲۷ ...... التابع تابع

وجود میں تابع، حکم میں بھی تابع ہوتا ہے۔

۲۸ ...... التابع یسقط بسقوط المتبوع

متبوع کے سقوط سے تابع بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

۲۹ ...... یسقط الفرع اذا سقط الاصل

اصل جب ساقط ہو جائے، تو فرع بھی ساقط ہو جاتی ہے۔

۳۰ ...... الحرب خدعۃ

جنگ دشمن کو دھوکے میں رکھنے کا نام ہے۔

۳۱ ...... الثابت بالعرف کالثابت بالنص

عرف کے ذریعہ جو چیز ثابت ہو، اس کا نفاذ بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی چیز نص کے ذریعہ ثابت ہو۔

۳۲ ...... العادۃ تجعل حکما اذالم یوجد التصریح بخلافہ

عادت و عرف پر وہاں حکم لگایا جائے گا، جہاں نص صریح اس کے مخالف نہ ہو۔

۳۳ ...... البناء علی الظاھر واجب مالم یتبین خلافہ

ظاہر پر حکم کی بنیاد رکھنا واجب ہے جب تک اس کے خلاف ثبوت نہ ہو۔

۳۴ ...... مجرد الخبر لا یصلح حجۃ

خبر محض حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

۳۵ الثابت بالبينة كالثابت بالمعاينه

شہادت سے ثابت شدہ، مشاہدہ سے ثابت شدہ امر کی طرح ہے۔

۳۶ المعلق بالشرط يثبت بوجود الشرط

کسی شرط پر معلق چیز اسی وقت ثابت ہوگی جبکہ شرط پائی جائے۔

۳۷ المعلق بالشرط معدوم قبل الشرط

جو چیز کسی شرط پر معلق ہو، وہ شرط کے وجود سے پہلے معدوم سمجھی جائے گی۔

۳۸ يسقط اعتبار دلالة الحال اذا جاء التصريح بخلافها

دلالتِ حال کا اعتبار ساقط ہو جائے گا جبکہ اس کا مخالف پہلو صراحت کے ساتھ ثابت ہو جائے۔

۳۹ يجب العمل بالمجاز اذا تعذر العمل بالحقيقة

مجاز پر عمل واجب ہے جبکہ حقیقت پر عمل متعذر ہو جائے۔

۴۰ الكتاب الى من نائی كالخطاب بمن دنیٰ

دور والے کے نام خط، حکم کے لحاظ سے بالکل ایسے ہی ہے، جیسے سامنے والے سے خطاب۔

۴۱ الولد يتبع خير الابوين دينا

بچہ اپنے ماں، باپ میں سے اسی کے تابع قرار دیا جائے گا، جو دین کے اعتبار سے دونوں میں بہتر ہو۔

۴۲ من فی دار الحرب فی حق من فی دار الاسلام كالميت

دار الحرب میں رہنے والا اس شخص کے حق میں جو دار الاسلام میں رہتا ہے میت کی طرح ہے۔

۴۳ مال المسلمين لايصير غنيمة للمسلمين بحال

مسلمانوں کا مال مسلمانوں کے لیے کسی حال میں بھی مال غنیمت نہیں ہو سکتا۔

۴۴ شرط صحة الصدقة التمليك

صدقہ واجبہ کے صحیح ہونے کی شرط مالک بنانا ہے۔

۴۵ التبرع فی المرض وصية

مرض الموت میں احسان و حسن سلوک وصیت کے حکم میں ہے۔

۴۶ خير الامور اوساطها

ہر چیز میں بہتر وہی ہے جو درمیانی ہو۔

۴۷ السكران فی الحكم كالصاحی

نشے میں مدہوش حکم کے اعتبار سے باہوش کی طرح ہے۔

۴۸.....عند اجتماع الحقوق يبدأ بالاهم

مختلف حقوق کے اجتماع کے وقت سب سے اہم حق کو اولیت دی جائے گی۔

۴۹.....لا يجوز ترك الواجب للاستحباب

کسی مستحب کی وجہ سے واجب کا ترک جائز نہیں ہے۔

۵۰.....الاجتهاد لا يعارض النص

اجتہاد نص کے معارض نہیں ہوسکتا (یعنی حکم منصوص کے خلاف کوئی اجتہاد قابل قبول نہیں)

۵۱.....ان الافادة خير من الاعادة

اضافی مفید بات، اعادے سے بہتر ہے۔

(الاشباه والنظائر۔ شرح السير الكبير)

سبحٰن ربك رب العزة عما يصفون وسلٰم على المرسلين والحمد لله رب العٰلمين اللهم صل على محمد وعلى اٰل محمد وبارك وسلم تسليما كثيرًا كثيرًا

☆☆
☆

۲۰؍ صفر المعظم ۱۴۳۰ھ
بمطابق: ۱۶؍ فروری ۲۰۰۹ء بروز پیر

☆☆☆☆

پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

علم فقہ کے سلطاں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
ثابت کے بیٹے نعماں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
علم وعمل میں جس نے پوری عمر لگا دی،
جیون لگا کے جس نے خلق خدا جگا دی
ہے اس کا ہم پہ احساں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
کوفہ میں جب کسی نے بکری تھی ایک چرائی
سالوں تلک ولی نے بکری نہ کوئی کھائی
تقوی پہ میں ہوں حیراں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
رب نے انہیں نوازا، عظمت بھی یوں عطا کی
آقا نے دی بشارت اس نامور جواں کی
قسمت پہ تیری قرباں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
جب بادشاہ نے انکو حق گوئی کی سزادی
جیلوں میں جا کے اس نے آواز حق لگائی
زنداں میں دے گئے جاں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
پوری عمر تہجد، جس نے نہیں قضاء کی
کر کے وضو عشاء کو اس سے فجر ادا کی
کیسے تھے نیک انساں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
ہو جائیں راضی، یارب! ان پر کرم بھی کر دیں
انوار سے خدایا، ان کی قبر کو بھر دیں
رحمت کی برسے باراں، پیارے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

حوالہ جات ماٰخذ و مصادر

قرآن مجید۔ تفسیر جلالین۔ تفسیر قرطبی۔ تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر مظہری۔ بیان القرآن۔ معارف القرآن۔ تفسیر روح البیان۔ خلاصۃ التفاسیر۔ بخاری شریف۔ فیض الباری۔ ارشاد الساری شرح بخاری شریف۔ انعام الباری۔ ابن ماجہ۔ نسائی شریف۔ بذل المجہود۔ مشکوۃ شریف۔ مرقاۃ المفاتیح۔ تقریر ترمذی۔ درس ترمذی۔ دار قطنی۔ رحمۃ للعالمین۔ ترجمان السنۃ۔ الاشباہ والنظائر۔ امداد الفتاویٰ۔ آپ کے مسائل اور انکا حل۔ البحر الرائق۔ بدائع الصنائع۔ خلاصۃ الفتاوی۔ درمختار۔ شامی۔ شرح الوقایہ۔ فتاویٰ عالمگیری۔ الھدایہ۔ فتاویٰ دار العلوم دیوبند۔ فتویٰ نویسی کے رہنما اصول۔ فتاویٰ رحیمیہ۔ فقہی جواہر۔ فقہی پہیلیاں۔ القدوری۔ کنز الدقائق۔ نور الانوار۔ نور الایضاح۔ بلوغ الامانی۔ البدایہ والنہایہ۔ صفوۃ الصفوۃ۔ طحطاوی علی مراقی الفلاح۔ طبقات ابن سعد۔ طریق الفلاح لطلاب الصلاح۔ المستطرف فی کل فن مستظرف۔ نوادر الفقہ۔ وفیات الاعیان۔ سوانح ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔ اشرف الہدایہ۔ اسلاف کے حیرت انگیز واقعات۔ احیاء علوم الدین۔ احکام میت۔ اخبار الحمقی والمغفلین۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور انکی ناقدین۔ امثال عبرت۔ احکام المسجد۔ آپ بیتی شیخ الحدیثؒ۔ اکابرین کے پاکیزہ لطائف۔ تبلیغ دین۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جواہر الرشید۔ خطبات حکیم الاسلام۔ صبر و استقامت کے پیکر۔ علماء دیوبند کا تقویٰ۔ عجائب الفقہ۔ فتح الباری۔ گلدستۂ ظرافت۔ مصائب اور ان کا علاج۔ اہل علم کے لیے جواہر پارے۔ اشرف اللطائف۔ احکام اسلام عقل کی نظر میں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حیرت انگیز واقعات۔ اشرف الجواب۔ مقدمہ انوار الباری۔ ائمہ اربعہ کے دلچسپ واقعات۔ اغلاط العوام۔ ناقابل فراموش تاریخ کے سچے واقعات۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا (منشی محبوب عالم)۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی سیاسی زندگی۔ آسان نیکیوں کے حیرت انگیز واقعات۔ اسلامی آداب معاشرہ۔ باتیں انکی یاد رہیں گی۔ بستان المحدثین۔ بکھرے موتی۔ بخاریؒ کی باتیں۔ تعبیر الرؤیا۔ تحفۃ العلماء۔ تجلیات صفدر۔ تراشے۔ تذکرۃ الاولیاءؒ۔ تاریخ علم النحو۔ تذکرہ امام ابو یوسفؒ۔ تاریخ بغداد۔ تاریخ الخلفاء۔ تاریخ ابن خلکان۔ تنبیہ الغافلین۔ تصویر کے شرعی احکام۔ ثمرات الاوراق یعنی کشکول۔ جمال انور سوانح کشمیریؒ۔ جہان دانش۔ جدید تجارت۔ جواہر پارے۔ الجوھرۃ النیرۃ۔ حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم۔ حدائق الحنفیہ۔ حسن العزیز (ملفوظات)۔ حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات۔ حلیۃ الاولیاءؒ۔ حیوۃ الحیوان۔ حیات امام مالکؒ (سید سلیمان ندویؒ)۔ حیلے اور بہانے۔ حیات تابعین کے درخشاں پہلو۔ خطبات حضرت لاہوریؒ۔ خزینہ خیرات الحسان۔ دفاع امام ابوحنیفہؒ۔ دیوان الامام الشافعیؒ۔ روض الفائق۔ روح کی بیماریاں اور ان کا علاج۔ سراغ زندگی۔ سیرۃ النعمان۔ سیر الصحابہ۔ سیر علماء از

عبدالحلیم شرر۔سلام کے فضائل ومسائل۔علمی معرکے اور مجلسی لطیفے۔عقود الجمان۔علمائے احناف کے حیرت انگیز واقعات۔علم وہدایت کے چراغ۔علمائے سلف۔غنیۃ الطالبین۔الکشکول للعاملی۔شاہراہ سنت۔آکام المرجان۔کتابوں کی درسگاہ میں۔کوثر العلوم۔کتاب الاذکیا،(اردو لطائف علمیۃ)۔گلہائے رنگارنگ۔گلستان قناعت۔لطائف ونوادر۔مقدمہ پہیلیاں۔الموفق۔ملفوظات محدث کشمیریؒ۔ملفوظات ابرار۔متاع نور۔ملفوظات حکیم الامت۔مخزن اخلاق۔ملفوظات فقیہ الامتؒ۔معدن الحقائق۔مواعظ مفتی رشید احمد صاحبؒ۔ماہنامہ رضوان لکھنؤ۔ماہنامہ البلاغ کراچی۔ماہنامہ القاسم نوشہرہ۔ماہنامہ وفاق المدارس ملتان۔نایاب تحفہ۔ندائے منبر ومحراب۔نفحۃ العرب۔النحو الیسیر

ختم شد

فقہی مقالات



جلد اول

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

کرنسی کی قوتِ خرید

کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم

قسطوں پر خرید و فروخت

مغربی ممالک کے چند جدید مسائل

حقوقِ مجردہ کی خرید و فروخت

اسلامی بینکنگ کے چند مسائل

شیئرز کی خرید و فروخت

میمن اسلامک پبلشرز

فقہی مقالات

۱

شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ترجمہ و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقالات : حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ترجمہ وترتیب : مولانا عبداللہ میمن صاحب

تاریخ اشاعت : 2011ء

باہتمام : محمد مشہود الحق کلیانوی :0313-9205497

ناشر : میمن اسلامک پبلشرز

جلد : 1

قیمت : /= روپے

حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر:

ملنے کا پتے

☆ میمن اسلامک پبلشرز، کراچی۔ 0322-241 88 20

☆ مکتبہ دارالعلوم، کراچی ۱۴۔ ☆ مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور۔

☆ دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی۔

☆ ادارۃ المعارف، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔

☆ مکتبہ معارف القرآن، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔

☆ کتب خانہ اشرفیہ، قاسم سینٹر، اُردو بازار، کراچی۔

☆ مکتبۃ العلوم، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔

☆ مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، نزد جامعہ فاروقیہ، کراچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

"فقہی مقالات" کی جلد اول آپ کے ہاتھ میں ہے۔ در حقیقت یہ وہ مقالات ہیں جو حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم العالی نے "اسلامی فقہ اکیڈمی" کے لئے عربی زبان میں تحریر فرمائے تھے، ابتداءً یہ مقالات اسلامی فقہ اکیڈمی کے مجلے میں شائع ہوئے اور پھر کتابی شکل میں "مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴" نے "بحوث فی قضایا الفقہیة المعاصرة" کے نام سے شائع کئے۔

چونکہ یہ مقالات ایسے مفید موضوعات پر لکھے گئے ہیں جن پر واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت علماء اور طلباء کے علاوہ عام لوگوں کو بھی پیش آتی رہتی ہے، چنانچہ عوام بھی ان موضوعات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے علماء سے بار بار سوال کرتے رہتے ہیں مگر چونکہ یہ مقالات عربی زبان میں لکھے گئے تھے۔ اس لئے عوام کے لئے ان سے براہ راست استفادہ کرنا مشکل تھا۔ اس لئے احقر نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق سے کئی سال پہلے ان مقالات کا ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ اب الحمد للہ چند مقالات کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے ان میں بعض پر خود حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے اپنا قیمتی وقت نکال کر نظر ثانی فرمائی ہے اور بعض مقالات پر حضرت مولانا محمود اشرف صاحب مد ظلہم نے اپنا قیمتی وقت نکال کر نظر ثانی فرمائی ہے۔ البتہ ایک مقالہ، یعنی "حقوق مجردہ کی خرید و فروخت" اس کا ترجمہ میرا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے ایک عالم مولانا عتیق احمد بستوی صاحب مد ظلہم نے کیا ہے، البتہ میں نے اس کی ترتیب جدید دی ہے۔

اسی طرح "شیئرز کی خرید و فروخت" مقالہ نہیں ہے، بلکہ یہ حضرت مولانا مدظلہم کا ایک خطاب ہے۔ جو آپ نے جامع مسجد بیت المکرّم میں ہونے والے ایک تجارتی سیمینار میں فرمایا تھا اور بعد میں اس کو قلم بند کر لیا گیا، اور اس پر حضرت مولانا مدظلہم نے خود نظر ثانی فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کام میں اخلاص عطا فرمائے اور دنیا و آخرت میں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔ آمین

محمد عبداللہ میمن
دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۵/۵/۴ھ

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان

(۱) کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم

(۲) کرنسی کی قوت خرید اور ادائیگیوں پر اس کے شرعی اثرات

(۳) قسطوں پر خرید و فروخت

(۴) شیئرز کی خرید و فروخت

صفحہ	عنوان

⑤ حقوق مجردہ کی خرید و فروخت

صفحہ	عنوان

(۶) مغربی ممالک کے چند جدید مسائل

صفحہ	عنوان

کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

"لا ایمان لمن لا امانة له"

(مسند احمد)

یعنی جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان بھی نہیں۔

کاغذی نوٹ

اور

کرنسی کا حکم

لحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد خاتم النبیینؐ وعلی آلہ واصحابہ الطاہرین وعلی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین

نوٹوں کی فقہی حیثیت

کاغذی نوٹوں کے احکام کا بیان اس کی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ شروع کرنے سے پہلے ان نوٹوں کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے کہ کیا یہ کسی قرض کے وثیقے ہیں؟ یا عرفی ثمن ہیں؟

جن لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ کاغذی نوٹ مالی دستاویز اور سند ہیں ان کے نزدیک یہ نوٹ اس قرض کی سند ہے جو اس کے جاری کرنے والے (بینک) کے ذمہ واجب ہے، لہٰذا اس رائے اور خیال کے مطابق یہ نوٹ نہ تو ثمن ہیں اور نہ مال، بلکہ نوٹ اور وثیقے سے عبارت ہے جو مدیون نے دائن کو لکھ کر دے دیا ہے تاکہ جب وہ چاہے اس کے ذریعے اپنے دین پر قبضہ کر لے، اس لئے ان حضرات کی رائے میں جو شخص بھی

یہ نوٹ کسی دوسرے کو دے گا، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا اس نے مال دیا ہے، بلکہ یہ اپنے مال کا حوالہ اس مقروض (بینک) پر کر رہا ہے جس نے یہ نوٹ بطور سند جاری کئے ہیں۔ اس لئے اس پر فقہی اعتبار سے وہی احکام جاری ہوں گے، جو "حوالہ" پر جاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا دوسرے کا حق ان نوٹوں کے ذریعے ادا کرنا وہاں جائز ہو گا جہاں حوالہ جائز ہوتا ہے اور اگر یہ نوٹ سونے یا چاندی کی دستاویز اور سند ہیں (یعنی اگر ان کی پشت پر بینک میں سونا یا چاندی ہے) تو اس صورت میں ان نوٹوں کے ذریعہ سونا، چاندی خریدنا جائز نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ سونے کا سونے سے تبادلہ کرنا یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ کرنا "بیع صرف" ہے۔ اور "بیع صرف" میں مبیع اور ثمن دونوں کا مجلس عقد میں قبضہ کرنا شرط ہے۔ لہٰذا اگر نوٹوں کے ذریعہ سونا چاندی خریدی تو صرف ایک طرف سے قبضہ پایا گیا۔ دوسری طرف سے قبضہ نہیں پایا گیا۔ اس لئے کہ خریدار نے تو سونے پر قبضہ کر لیا لیکن دوکاندار نے سونے کے قرض کی سند پر قبضہ کیا، سونے پر قبضہ نہیں کیا۔ لہٰذا جب "بیع صرف" کے جائز ہونے کے لئے مجلس عقد ہی میں دونوں طرف سے قبضہ کرنے کی شرط نہیں پائی گئی تو یہ بیع شرعاً ناجائز ہو گی۔

اسی طرح اگر کوئی مالدار شخص اپنی زکوۃ کی ادائیگی کے لئے یہ کاغذی نوٹ کسی فقیر کو دے، تو جب تک وہ فقیر ان نوٹوں کے بدلے میں اس سونے یا چاندی کو بینک سے وصول نہ کر لے جس کی یہ دستاویز ہے، یا جب تک وہ ان نوٹوں کے ذریعہ کوئی سامان نہ خرید لے، اس وقت تک اس مالدار شخص کی زکوۃ ادا نہ ہو گی۔ اور اگر استعمال کرنے سے پہلے یہ نوٹ فقیر کے پاس سے برباد یا ضائع ہو جائیں، تو وہ مالدار شخص صرف وہ نوٹ فقیر کو دینے سے زکوۃ کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہو گا۔ اب اس کو دوبارہ زکوۃ ادا کرنی پڑے گی۔

اس کے برخلاف دوسرے حضرات فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اب یہ نوٹ بذات خود ثمن عرفی بن گئے ہیں۔ اس لئے جو شخص یہ نوٹ ادا کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے مال اور ثمن ادا کیا ہے۔ ان نوٹوں کی ادائیگی سے دین کا حوالہ نہیں سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اس رائے کے مطابق ان نوٹوں کے ذریعہ زکوۃ فی الفور ادا ہو جائے گی اور ان کے ذریعہ سونا چاندی خریدنا بھی جائز ہو گا۔

لہٰذا کاغذی نوٹ اور مختلف کرنسیوں کے احکام بیان کرنے سے پہلے نوٹوں کے بارے میں مذکورہ بالا دو آراء میں سے کسی ایک رائے کو فقہی نقطہ نظر سے متعین کر لینا ضروری ہے۔

چنانچہ اس موضوع پر کتب فقہ اور معاشیات کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے خیال میں ان نوٹوں کے بارے میں دوسری رائے زیادہ صحیح ہے۔ وہ یہ کہ نوٹ اب عرفی ثمن بن گئے ہیں اور اب یہ حوالے کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔

دنیا کے کرنسی نظام میں انقلابات اور تبدیلیاں

قدیم زمانے میں لوگ اشیاء کا تبادلہ اشیاء (Barter) کے ذریعہ کرتے تھے۔ یعنی ایک چیز دے کر اس کے بدلے دوسری چیز لیتے تھے۔ لیکن اس طرح کے تبادلے میں بہت سے نقائص اور مشکلات تھیں اور ہر جگہ ہر وقت اس طریقہ پر عمل کرنا دشوار ہوتا تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ یہ طریقہ متروک ہو گیا۔ (۱)

اس کے بعد ایک اور نظام جاری ہوا۔ جسے "زر بضاعتی کا نظام" (Commodity money System) کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں لوگوں نے مختلف مخصوص اشیاء کو بطور ثمن کے تبادلے کا ذریعہ بنایا اور عام طور پر ایسی اشیاء کو تبادلے کا ذریعہ بناتے جو کثیر الاستعمال ہوتی تھیں، مثلاً کبھی اناج اور گندم کو تبادلہ کا ذریعہ بنایا، کبھی نمک کو اور کبھی چمڑے کو، کبھی لوہے وغیرہ کو تبادلہ کا ذریعہ بنایا مگر ان اشیاء کو تبادلہ میں استعمال کرنے میں نقل و حمل کی بہت سی مشکلات پیش آتی تھیں۔ اس لئے جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی اور لوگوں کی ضروریات میں اضافہ ہونے لگا اور تبادلہ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہونے لگا تو لوگوں نے سوچا کہ تبادلہ کا جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہوا ہے اس میں تو بہت سی مشکلات ہیں۔ لہٰذا تبادلہ کا کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے جس میں نقل و حمل کم سے کم ہو جائے اور اس پر لوگوں کا اعتماد بھی زیادہ ہو۔

آخر کار تیسرے مرحلہ میں جا کر لوگوں نے سونے چاندی کو تبادلہ کا ذریعہ بنایا، اس لئے کہ یہ دونوں قیمتی دھاتیں ہیں اور چاہے یہ زیور کی شکل میں ہوں، یا برتن کی شکل

میں، بہر حال ان کی اپنی ذاتی قیمت بھی تھی اور اس کی نقل و حمل اور ذخیرہ اندوزی بھی آسان تھی، حتی کہ ان دونوں قیمتی دھاتوں نے اشیاء کی قیمتوں کے لئے ایک پیمانہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور تمام ممالک اور شہروں میں لوگ ان دھاتوں پر اعتماد کرنے لگے اس نظام کو "نظام زر معدنی۔ (Metalic Money System) کہا جاتا ہے۔ اس نظام پر بہت سے تغیرات اور انقلابات گزرے ہیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱...... ابتداء میں لوگ ایسے سونے چاندی کو بطور کرنسی کا استعمال کرتے جو سائز، ضخامت، وزن اور صفائی کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا۔ کوئی سونا ٹکڑے کی شکل میں ہوتا تھا، کوئی ڈھلے ہوئے برتن اور زیور کی شکل میں ہوتا تھا لیکن تبادلے کے وقت صرف وزن کا اعتبار کیا جاتا تھا۔

۲...... اس کے بعد ڈھلے ہوئے سکوں کا رواج شروع ہو گیا۔ بعض شہروں میں سونے کے ڈھلے ہوئے سکے اور بعض شہروں میں چاندی کے ڈھلے ہوئے سکے رواج پاتے گئے جو ضخامت، وزن اور خالص سونے کے اعتبار سے برابر اور مساوی ہوتے تھے، اور جن پر دونوں طرف مہر ثبت ہوتی تھی۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ سکے درست اور تبادلہ کے قابل ہیں اور اس سکے کی ظاہری قیمت (Face Value) جو اس پر لکھی ہوتی تھی وہ اس سونے اور چاندی کی حقیقی قیمت (Gold or Silver Content) کے برابر ہوتی تھی۔ گویا کہ سکے کی شکل میں ڈھلے ہوئے سونے کی قیمت سونے کی اس ڈلی کے برابر ہوتی تھی جو سکے کے ہم وزن ہو۔ اس نظام کو "معیاری قاعدہ زر" (Gold Specie Standard) کہا جاتا ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے چینیوں نے ساتویں صدی عیسوی قبل مسیح میں رائج کیا تھا۔

اس نظام کے اندر لوگوں کو اس بات کی آزادی تھی کہ وہ چاہیں آپس میں لین دین کے لئے سکے استعمال کریں یا سونے کے ٹکڑے یا سونے کے ڈھلے ہوئے زیورات وغیرہ استعمال کریں اور ملک سے باہر بر آمد در آمد کی بھی عام اجازت تھی۔

اور حکومت کی طرف سے یہ عام اجازت تھی جو شخص بھی جس مقدار میں سکے ڈھلوانا چاہے، وہ ڈھال کر دے گی۔ چنانچہ لوگ حکومت کے پاس سونے کے ٹکڑے اور

سونے کی ڈھلی ہوئی دوسری اشیاء لاتے اور حکومت ان کو سکے بنا کر واپس کر دیتی، اور اسی طرح اگر کوئی شخص سکے لا کر اس کو پگھلانے کے لئے کہتا تو حکومت ان سکوں کو پگھلا کر ٹکڑے کی شکل میں اس شخص کو واپس کر دیتی۔

۳...... بعض ممالک نے بجائے ایک دھات کے دو دھات یعنی سونے چاندی دونوں کے سکوں کو کرنسی کے طور پر رائج کیا اور ان دونوں کے آپس کے تبادلے کے لئے ایک خاص قیمت مقرر کر دی اور سونے کو بڑی کرنسی کے طور پر اور چاندی کو چھوٹی کرنسی کی حیثیت سے استعمال کیا جانے لگا۔ اس نظام کو "دو دھاتی نظام" (Bi - Metallisn) کہا جاتا ہے۔

لیکن اس نظام میں دوسری مشکلات پیدا ہو گئیں وہ یہ کہ سونے اور چاندی کے سکوں میں آپس میں تبادلہ کے لئے جو قیمت مقرر کی گئی تھی۔ وہ مختلف شہروں میں مختلف ہو جاتی تھی۔ جس کی بنا پر لوگ کرنسی کی تجارت میں دلچسپی لینے لگے۔ مثلاً امریکہ میں ایک سونے کے سکے کی قیمت پندرہ چاندی کے سکے ہوتی لیکن بعینہ اسی وقت یورپ میں ایک سونے کے سکے کی قیمت چاندی کے ساڑھے پندرہ سکے کے برابر ہوتی اس صورت حال میں تاجر امریکہ سے سونے کے سکے جمع کر کے یورپ میں فروخت کر دیتے تاکہ وہاں سے ان کو زیادہ چاندی حاصل ہو جائے اور پھر وہ چاندی کے سکے امریکہ لا کر ان کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر دیتے اور پھر یہ سونے کے سکے دوبارہ جا کر یورپ میں فروخت کر دیتے اور اس کے بدلے چاندی لے آتے۔ لیکن اس تجارت کے نتیجے میں امریکہ کا سونا مسلسل یورپ منتقل ہوتا رہا۔ گویا کہ چاندی کے سکوں نے سونے کے سکوں کو امریکہ سے باہر نکال دیا۔ پھر جب ۱۸۳۴ء میں امریکہ نے سونے اور چاندی کے سکوں کے درمیان اس تناسب کو بدل دیا اور سونے کے ایک سکے کو چاندی کے سولہ سکوں کے مساوی قرار دے دیا تو معاملہ پہلی صورت کے برعکس ہو گیا اور اب سونے کے سکے امریکہ میں منتقل ہونے شروع ہو گئے اور چاندی کے سکے یورپ منتقل ہونے لگے گویا کہ سونے کے سکوں نے چاندی کے سکوں کو امریکہ سے نکال دیا۔

۴...... سکے چاہے سونے کے ہوں یا چاندی کے، اگرچہ سامان اور اسباب کے مقابلے میں ان کی نقل و حمل آسان ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کو چوری کرنا بھی آسان ہے۔

اس لئے مالداروں کے لئے ان سکوں کی بہت بڑی مقدار کو ذخیرہ کر کے گھر میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ وہ لوگ ان سکوں کی بہت بڑی مقدار کو سناروں اور صرافوں (Money Changer) کے پاس بطور امانت کے رکھوانے لگے، اور وہ سنار اور صراف ان سکوں کو اپنے پاس رکھتے وقت ان امانت رکھنے والوں کو بطور وثیقہ کے ایک کاغذ یا رسید (Receipt) جاری کر دیتے۔ آہستہ آہستہ جب لوگوں کو ان سناروں پر اعتماد زیادہ ہو گیا تو یہی رسیدیں، جو ان سناروں نے امانت قبول کرتے وقت بطور دستاویز جاری کی تھیں بیع و شراء میں بطور ثمن کے استعمال ہونے لگیں۔ لہٰذا ایک خریدار دوکاندار کو خریداری کے وقت بجائے نقد سکے ادا کرنے کے انہی رسیدوں میں سے ایک رسید اس کو دے دیتا اور دوکاندار ان سناروں پر اعتماد کی بنیاد پر اس رسید کو قبول کر لیتا۔

یہ ہے کاغذی نوٹ کی ابتداء لیکن ابتداء میں نہ اس کی کوئی خاص شکل و صورت تھی، اور نہ ان کی کوئی ایسی قانونی حیثیت تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ اس کے قبول اور رد کرنے کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اسے قبول کرنے والا اس کے جاری کرنے والے سنار پر کتنا بھروسہ رکھتا ہے۔

۵ ...... جب ۱۷۰۰ء کے اوائل میں بازاروں میں ان رسیدوں کا رواج زیادہ ہو گیا تو ان رسیدوں نے ترقی کر کے ایک باضابطہ صورت اختیار کر لی جسے "بینک نوٹ" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے سویڈن کے اسٹاک ہوم بینک نے اسے بطور کاغذی نوٹ کے جاری کیا۔

اس وقت جاری کرنے والے بنک کے پاس ان کاغذی نوٹوں کے بدلے میں سو فیصد اتنی مالیت کا سونا موجود ہوتا تھا اور بینک یہ التزام کرتا تھا کہ وہ صرف اتنی مقدار میں نوٹ جاری کرے، جتنی مقدار میں اس کے پاس سونا موجود ہے اور اس کاغذی نوٹ کے حامل کو اختیار تھا کہ وہ جس وقت چاہے بینک جا کر اس کے بدلے میں سونے کی سلاخ حاصل کر لے۔ اسی وجہ سے اس نظام کو "سونے کی سلاخوں کا معیار" (Gold Bullion Standard) کہا جاتا ہے۔

۶ ...... ۱۸۳۳ء میں جب "بینک نوٹ" کا رواج بہت زیادہ ہو گیا تو حکومت نے اس کو "زر قانونی۔ (Legal Tender) قرار دے دیا۔ اور ہر قرض لینے والے پر یہ لازم کر

دیا کہ وہ اپنے قرض کے بدلے میں اس نوٹ کو بھی اسی طرح ضرور قبول کرے گا، جس طرح اس کے لئے سونے چاندی کے سکے قبول کرنا لازم ہے۔ اس کے بعد پھر تجارتی بینکوں کو اس کے جاری کرنے سے روک دیا گیا اور صرف حکومت کے ماتحت چلنے والے مرکزی بینک کو اس کے جاری کرنے کی اجازت دی گئی۔

۷ ..... پھر حکومتوں کو زمانہ جنگ اور امن کے دوران آمدنی کی کمی کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں بہت سی مشکلات پیش آنے لگیں۔ چنانچہ حکومت مجبور ہوئی کہ وہ کاغذی نوٹوں کی بہت بڑی مقدار جاری کر دے جو سونے کی موجودہ مقدار کے تناسب سے زیادہ ہو، تاکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اسے استعمال کرے۔ اس کے نتیجے میں سونے کی وہ مقدار جو ان جاری شدہ کاغذی نوٹوں کی پشت پر تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ حتیٰ کہ ابتدا میں ان نوٹوں اور سونے کے درمیان جو سو فیصد تناسب تھا، وہ گھٹتے گھٹتے معمولی تناسب رہ گیا۔ اس لئے کہ ان نوٹوں کو جاری کرنے والے مرکزی بینک کو اس بات کا یقین تھا کہ ان تمام جاری شدہ نوٹوں کو ایک ہی وقت میں سونے سے تبدیل کرنے کا مطالبہ ہم سے نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے سونے کی مقدار سے زیادہ نوٹ جاری کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ مقدار میں نوٹ جاری کرنے کے نتیجے میں بازار میں ایسے نوٹ رائج ہو گئے جن کو سونے کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی۔ لیکن تجار ایسے نوٹوں کو اس بھروسہ پر قبول کرتے تھے کہ ان نوٹوں کے جاری کرنے والے مرکزی بینک کو اس بات پر قدرت حاصل ہے کہ وہ تبدیلی کے مطالبے کے وقت اس کے پاس موجود سونے کے ذریعہ اس کا مطالبہ پورا کر دے گا۔ اگرچہ اس کے پاس موجود سونا اس کے جاری کردہ نوٹوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ ایسے کرنسی نوٹوں کو "زر اعتباری" (Fiduciary Money) کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف آمدنی کی مذکورہ بالا کمی اور زیادہ روپے کی ضرورت ہی کی بناء پر حکومتیں جو اب تک معدنی سکوں کے ساتھ معاملات کرتی آئی تھیں اس بات پر مجبور ہوئیں کہ وہ یا تو سکوں میں دھات کی جتنی مقدار استعمال ہو رہی ہے اس کو کم کر دے یا ہر سکے میں اصلی دھات کے بجائے ناقص دھات استعمال کریں۔ چنانچہ اس عمل کے نتیجے میں سکے کی ظاہری قیمت (Face Value) جو اس پر درج تھی، اس سکے کی اصلی قیمت

(Intrinsic Vlaue) سے کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ ایسے سکوں کو "علامتی زر" (Token Money) کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس سکے کی معدنی اصلیت اس کی اس ظاہری قیمت کی محض علامت ہوتی ہے جو کبھی اس کی ذاتی قیمت کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی کیا کرتی تھی۔

۸..... رفتہ رفتہ "زر اعتباری۔ (۲) کا رواج بڑھتے بڑھتے اتنا زیادہ ہو گیا کہ ملک میں پھیلے ہوئے نوٹوں کی تعداد ملک میں موجود سونے کی مقدار کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ حکومت کو اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ سونے کی موجود مقدار کے ذریعہ ان نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بعض شہروں میں حقیقۃ یہ واقعہ پیش آیا کہ مرکزی بینک نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ پورا نہ کر سکا۔

اس وقت بہت سے ملکوں نے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرانے والوں پر بہت سی کڑی شرطیں لگا دیں۔ انگلینڈ نے تو ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد اس تبدیلی کو بالکل بند کر دیا۔ البتہ ۱۹۲۵ء میں دوبارہ تبدیلی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ ایک ہزار سات پونڈ سے کم کی مقدار کو کوئی شخص تبدیل کرانے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس شرط کے نتیجے میں عام لوگ تو اپنے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرانے کا مطالبہ کرنے سے محروم ہو گئے (اس لئے کہ اس زمانے میں یہ مقدار اتنی زیادہ تھی کہ بہت کم لوگ اتنی مقدار کے مالک ہوتے تھے) لیکن اس قانون کی لوگوں نے اس لئے کوئی خاص پرواہ نہیں کی کہ یہ کاغذی نوٹ زر قانونی بن گئے تھے، اور ملکی معاملات میں بالکل اسی طرح قبول کئے جاتے تھے جس طرح اصلی کرنسی قبول کی جاتی تھی اور اس کے ذریعہ اندرون ملک تجارت کر کے اس طرح نفع حاصل کیا جا سکتا تھا جس طرح دھاتی کرنسی کے ذریعہ تجارت کر کے نفع حاصل کیا جاتا تھا۔

۹ ..... پھر ۱۹۳۱ء میں برطانوی حکومت نے ان نوٹوں کو سونے سے تبدیل کرانے کی بالکل ممانعت کر دی۔ حتی کہ اس شخص کے لئے بھی جو سترہ سو پونڈ کو سونے میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کرے۔ اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ سونے کے بجائے صرف ان نوٹوں پر اکتفا کریں اور اپنے تمام کاروبار اور معاملات میں اسی کا لین دین کریں۔ لیکن

حکومتوں نے آپس میں ایک دوسرے کے حق کے احترام کو بر قرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کے قانون کو بر قرار رکھا۔ چنانچہ اندرون ملک اگرچہ ان نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرانے کی ممانعت تھی لیکن ہر حکومت نے یہ التزام کیا تھا کہ اگر اس کی کرنسی دوسرے ملک میں چلی گئی اور دوسری حکومت اس کرنسی کے بدلے میں سونے مطالبہ کرے گی تو یہ حکومت اپنے کرنسی نوٹوں کے بدلے میں اس کو سونا فراہم کرے گی۔ مثلاً اگر امریکہ کے پاس برطانیہ کے اسٹرلنگ پونڈ آئے اور وہ اب ان کے بدلے میں برطانیہ سے سونے کا مطالبہ کرے تو برطانیہ پر لازم ہے کہ وہ ان کے بدلے میں امریکہ کو سونا فراہم کرے، اس نظام کو "سونے کی مبادلت کا معیار" (Gold Exchange Standard) کہا جاتا ہے۔

۱۰ ...... اسی اصول پر سالہا سال تک عمل ہوتا رہا حتی کہ جب ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ڈالر کی قیمت میں کمی کے باعث سخت بحران کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۹۷۱ء میں سونے کی بہت قلت ہو گئی تو امریکی حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ دوسری حکومتوں کے لئے بھی ڈالر کو سونے میں تبدیل کرنے کا قانون ختم کر دے۔ چنانچہ ۱۵۔ اگست ۱۹۷۱ء کو اس نے یہ قانون نافذ کر دیا اور اس طرح کاغذی نوٹ کو سونے سے مستحکم رکھنے کی جو آخری شکل تھی وہ بھی اس قانون کے بعد ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء "بین الاقوامی مالی فنڈ" (International Monetary Fund) سونے کے بدل کے طور پر ایک "زر مبادلہ نکلوانے کے حق (Secial Drawing Rights) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کا حاصل یہ تھا کہ "بین الاقوامی مالی فنڈ" کے ممبران کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ مختلف ممالک کی کرنسی کی ایک معین مقدار غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی کے لئے نکلوا سکتے ہیں اور مقدار کی تعین کے لئے ۸۸۸۶۷۱ گرام سونے کو معیار مقرر کیا گیا (کہ اتنی مقدار کا سونا جتنی کرنسی کے ذریعہ خریدا جا سکتا ہو اتنی کرنسی ایک ملک نکلوا سکتا ہے۔ لہٰذا اب صورت حال یہ ہے کہ زر مبادلہ نکلوانے کا یہ حق جسے اختصار کے لئے "ایس۔ ڈی۔ آر" کہا جاتا ہے سونے کی پشت پناہی کا مکمل بدل بن چکا ہے۔

اس طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اب سونے

کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور نوٹوں اور "زر علامتی" (یعنی کم قیمت کے سکوں) نے پوری طرح سونے کی جگہ لے لی ہے۔ اب نوٹ نہ سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، نہ چاندی کی، بلکہ ایک فرضی قوت خرید کی نمائندگی کر رہے ہیں .... لیکن چونکہ کرنسی کے اس نظام میں ایک مستقبل اور ابدی نظام کی طرح اب تک مضبوطی اور جماؤ پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے تقریباً تمام ممالک میں اس بات کی تحریک چل رہی ہے کہ پہلے کی طرح پھر سونے کو مالی نظام کی بنیاد مقرر کی جائے، یہاں تک کہ دوبارہ "سونے کی سلاخوں کے نظام" کی طرف لوٹنے کی آوازیں لگنے لگی ہیں۔ اس لئے دنیا کے تمام ممالک اب بھی اپنے آپ کو سونے سے بے نیاز اور مستغنی نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہر ملک اب بھی احتیاطی تدبیر کے طور پر زیادہ سے زیادہ سونے کے ذخائر جمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور انقلابات میں یہ سونا کام آئے .... لیکن سونے کی بڑی سے بڑی مقدار کا یہ ذخیرہ صرف ایک احتیاطی تدبیر کے طور پر ہے لیکن اس کا موجودہ دور میں رائج کرنسی کے ساتھ کوئی قانونی تعلق نہیں ہے۔ خواہ وہ کرنسی نوٹ کی شکل میں ہو یا دھاتی سکوں کی شکل میں (۳)۔

بہر حال یہ دنیا کے کرنسی نظام کے انقلابات اور تغیرات کا خلاصہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ کرنسی نوٹ ایک حالت اور ایک کیفیت پر قائم نہیں رہے بلکہ مختلف ادوار، مختلف زمانوں میں ان کی حیثیت بدلتی رہی ہے اور ان پر بہت سے انقلاب اور تغیرات گزر چکے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بالکل ابتدائی دور میں یہ نوٹ قرض کی سند اور دستاویز سمجھے جاتے تھے اور اسی بنا پر بہت سے علما نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ یہ نوٹ قرض کی سند ہے۔ اس کی حیثیت مال اور ثمن کی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ سید احمد بیگ الحسینی رحمہ اللہ علیہ اپنی کتاب "بهجة المشتاق فی بیان حکم زکوة الاوراق" میں تحریر فرماتے ہیں۔ :۔

> "جب ہم نے لفظ "بینک نوٹ" کی ماہیت کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ فرانسیسی زبان کی اصطلاح ہے اور "لاروس" جو فرانسیسی زبان کی سب سے بڑی اور مشہور لغت

ہے۔ اس میں بینک نوٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں!"

"بینک نوٹ ایک کرنسی نوٹ ہے جس کے حامل کو مطالبے کے وقت اس نوٹ کی حقیقی قیمت دے دی جائے گی اور ان نوٹوں کے ساتھ بھی اسی طریقے پر لین دین کیا جاتا ہے۔ جس طرح دھات کی کرنسی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ نوٹ مضمون ہوتے ہیں، یعنی اس کے بدل کی ضمانت دی جاتی ہے تاکہ لوگ اس کے لین دین پر اعتماد کریں۔"

لہٰذا اس تعریف میں یہ الفاظ: "اس کے حامل کو مطالبے کے وقت اس نوٹ کی حقیقی قیمت ادا کر دی جائے گی" بغیر کسی شک کے اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ نوٹ قرض کی سند ہے۔ البتہ اس تعریف میں جو دوسرے الفاظ ہیں کہ: "ان نوٹوں کے ساتھ بھی اس طریقہ پر لین دین کیا جاتا ہے جس طرح دھات کی کرنسی کے ذریعہ کیا جاتا ہے" اس عبارت سے کوئی شخص اس کے مال یا ثمن ہونے کا وہم نہ کرے۔ اس لئے کہ اس عبارت کا مطلب صرف اتنا ہے کہ لوگ کرنسی کے بجائے ان نوٹوں کو لین دین میں قبول کر لیتے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ مطالبہ کے وقت اس کی قیمت حامل نوٹ کو وصول ہو جائے گی اور حکومت اس نوٹ کی قیمت کی ادائیگی کی ضامن ہے۔

لہٰذا یہ تعریف صراحۃً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ نوٹ قرض کی سند اور دستاویز ہے (۴)۔

اسی وجہ سے گذشتہ صدی میں ہندوستان کے بہت سے علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ یہ نوٹ قرض کی دستاویز ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعہ اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی جب تک فقیر اس نوٹ کو اپنی ضروریات میں خرچ نہ کرے اور ان نوٹوں کے ذریعے سونا چاندی خریدنا جائز نہیں۔ (۵)

لیکن اسی زمانہ میں علما اور فقہا کی ایک بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو ان کاغذی

نوٹوں کو "ثمن عرفی" کے طور پر مال قرار دیتی تھی، چنانچہ اس مسئلہ پر مسند احمد کے مرتب اور شارح علامہ احمد ساعاتی رحمتہ اللہ علیہ نے سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

فالذی اراه حقا، وادين الله عليه :ان حكم الورق المالى كحكم النقدين فى الزكوٰة سواء بسواء، لانه يتعامل به كالنقدين تماما، ولان مالكه يمكنه صرفه وقضاء مصالحه به فى اى وقت شاء، فمن ملك النصاب من الورق المالى ومكث عنده حولا كاملا وجبت عليه زكوٰته (٦)

میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں یہ ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلہ میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے اس لئے کہ لوگوں میں ان نوٹوں کا لین دین بالکل اسی طرح جاری ہے جس طرح سونے چاندی کا لین دین رائج ہے اور ان نوٹوں کے مالک کو اس کا بالکل اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہیں ان کو خرچ کریں۔ اور ان کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کریں لہٰذا جو شخص نصاب کے بقدر ان نوٹوں کا مالک بن جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

ہندوستان کے بعض دوسرے علماء کی بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا عبد الحیؒ لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ کے خصوصی شاگرد اور "عطر ہدایہ" اور "خلاصۃ التفاسیر" کے مصنف حضرت مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ کی بھی نوٹ کے بارے میں یہی رائے تھی اور ان کے بیٹے مولانا مفتی سعید احمد لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ (سابق مفتی و صدر مدرس مدرسہ تکمیل العلوم کانپور) نے اپنے والد ماجد کی یہ رائے ان کی کتاب "عطر ہدایہ" کے آخر میں نقل کی ہے اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ

علامہ عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مسئلہ میں ان کے موافق تھے۔

ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ: کاغذی نوٹ کی دو حیثیتیں ہیں:۔

ایک یہ کہ خرید و فروخت، اجارات اور تمام مالی معاملات میں ان نوٹوں کا رواج اور لین دین بعینہ حقیقی ثمن اور سکوں کی طرح ہے بلکہ حکومت نے لوگوں پر قرضوں اور حقوق اور ادائیگی میں اس کو قبول کرنے کو لازمی قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا موجودہ قانون میں قرض خواہ کو اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے قرض کے بدلے میں ان نوٹوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے .... اس حیثیت سے یہ کاغذی نوٹ اب "عرفی ثمن" بن چکے ہیں۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ نوٹ حکومت کی طرف سے جاری شدہ ایک دستاویز ہے اور حکومت نے یہ التزام کیا ہے کہ اس کے ہلاک اور ضائع ہونے کی صورت میں یا اس کے حامل کے مطالبے کے وقت اس کا بدل ادا کرے گی...... اس حیثیت سے یہ نوٹ "ثمن عرفی" کی حیثیت نہیں رکھتے، اس لئے کہ "ثمن عرفی" کی ہلاکت کے وقت حکومت اس کا بدل ادا نہیں کرتی ہے۔ دوسری حیثیت کے اعتبار سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوٹ قرض کی سند یا دوسری مالی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن اگر اس دوسری حیثیت پر ذرا تعمق سے غور کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ نوٹ کی یہ دوسری حیثیت اس کی ثمنیت کو باطل نہیں کرتی ہے۔ اس لئے کہ حکومت کا اصل مقصد یہ تھا کہ یہ نوٹ بھی ثمن عرفی کے طور پر لوگوں میں رائج ہو جائیں۔ اسی وجہ سے حکومت نے قرض کی ادائیگی میں اس کے قبول کرنے کو ضروری قرار دیا...... لیکن خلقی ثمن (سونے چاند کے سکے) اور دوسری دھاتوں کے علامتی سکے جو پہلے سے رائج تھے ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کی اپنی حیثیت اور قیمت بھی تھی۔ ان کو قیمتی بنانے کے لئے حکومت کی کسی اعلان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ یہ سکے کبھی سونے چاندی سے بنائے جاتے تھے اور کبھی تانبے، پیتل اور لوہے سے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر چیز مال متقوم ہے حتی کہ اگر حکومت ان سکوں کی ثمنیت کو ختم کرنے کا بھی اعلان کر دے تب بھی مال متقوم ہونے کے اعتبار سے ان کی ذاتی قیمت

باقی رہے گی۔

بخلاف ان کاغذی نوٹوں کے کہ ان کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہے (صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے) البتہ حکومت کے اعلان کے بعد یہ قیمتی بن گئے۔ لہٰذا اگر حکومت ان نوٹوں کی ثمنیت باطل کر دے تو ان کی کوئی قیمت باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کہ لوگوں کو جتنا اعتماد اور بھروسہ دھات کی کرنسی پر ہوتا ہے اتنا ان نوٹوں پر نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے حکومت کو یہ ضمانت لینی پڑی کہ اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں حکومت اس کا بدل ادا کرے گی۔ یہ ضمانت حکومت نے اس لئے نہیں لی کہ حکومت کی نظر میں یہ ثمن عرفی کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان نوٹوں پر لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ضمانت دی تاکہ لوگ بغیر کسی خطرہ کے بلا خوف و خطر اس کا لین دین کر سکیں۔

لہٰذا اس نوٹ کے دستاویز ہونے کی حیثیت ایسی نہیں ہے جس سے اس کی ثمنیت باطل ہو جائے۔ اس لئے اس کا حاصل صرف اتنا ہے کہ حکومت نے اس کا بدل دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر حکومت کے اس وعدہ کا لوگوں کے آپس میں لین دین پر کوئی اثر نہیں ہے۔ اگر حکومت ان نوٹوں کا ثمن عرفی بنانا نہ چاہتی تو لوگوں کو اس کے قبول کرنے پر کبھی مجبور نہ کرتی۔ اور ان نوٹوں کے قابل تبدیلی ہونے کی حیثیت کی وجہ سے لوگوں پر اس کا اعتماد حقیقی کرنسی سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ حقیقی کرنسی کے گم ہو جانے اور ہلاک ہونے کی صورت میں اس کا بدل نہیں ملے گا۔ بخلاف ان کاغذی نوٹوں کے کہ ہلاک ہونے کی صورت میں حکومت اس کا بدل مہیا کرتی ہے۔ (۷)

زیر بحث مسئلے میں ہماری رائے

ہمارے نزدیک کاغذی کرنسی کے بارے میں اوپر جو دو رائیں ذکر کی گئی ہیں ہمارے نزدیک اختلاف زمانہ کے لحاظ سے دونوں درست ہیں جس کی تشریح ہم پیچھے کاغذی کرنسی کی تاریخ اور اس پر گزرے ہوئے مختلف تغیرات کے بیان میں کر چکے ہیں۔

لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں یہ کاغذی نوٹ قرض کی دستاویز شمار ہوتے تھے جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے :-

"دنیا میں بینک نوٹ (موجودہ کاغذی کرنسی) کا رواج بینک چیک کے رواج سے پہلے ہوا تھا۔ اور یہ بینک نوٹ قرض خواہ کے پاس اس قرض کی سند سمجھا جاتا تھا جو قرض اس کا بینک کے ذمہ ہے۔ اور اگر یہ نوٹ دوسرے شخص کو دے دیا جائے تو اس نوٹ کے تمام حقوق خود بخود اس دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ لہٰذا دوسرا شخص جواب اس کا حامل ہے خود بخود بینک کا قرض خواہ بن جائے گا اسی وجہ سے تمام مالی حقوق کو اس کے ذریعہ ادا کرنا حقیقی کرنسی کے ذریعہ ادا کرنے کی طرح ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور چونکہ رقم کی بڑی مقدار کو ڈھلے ہوئے سکوں کے ذریعہ ادا کرنا بہت دشوار کام ہے۔ اس لئے کہ اسے شمار کرنے اور پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے نقل و حمل میں کافی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کاغذی کرنسی کے استعمال نے شمار کرنے کی مشقت کو کم اور دوسری مشکلات کو سرے سے ختم کر دیا ہے۔

(۸)

لیکن جیسا کہ ہم نے پیچھے ان کاغذی نوٹوں پر تغیرات کے بیان میں بتایا کہ بعد کے زمانے میں نوٹوں کی مندرجہ بالا حالت باقی نہیں رہی تھی۔ بالکل ابتدائی دور میں یہ نوٹ سنار اور صراف کی طرف سے کسی خاص شخص کو اس کے جمع کئے ہوئے سونے کی دستاویز کے طور پر جاری ہوتا تھا۔ اس وقت اس کی نہ کوئی خاص شکل و صورت تھی اور نہ اس کو جاری کرنے والا ایک شخص ہوتا تھا۔ اور نہ ہی کسی شخص کو اپنے حق کی وصولیابی میں اس نوٹ کو قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب اس کا رواج زیادہ ہو گیا تو حکومت نے اس کو "قانونی زر" (Legal Tender) قرار دے دیا اور شخصی (غیر سرکاری) بینکوں کو اس کے جاری کرنے سے منع کر دیا۔ چنانچہ

حکومت کی طرف سے اس اعلان کے بعد اس نوٹ کی حیثیت دوسری مالی دستاویزات سے مندرجہ ذیل حیثیتوں سے مختلف ہو گئی :۔

۱ ...... اب یہ نوٹ قانونی زر کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور عرفی ثمن کی طرح لوگوں کو اس کے قبول کرنے پر بھی مجبور کر دیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے مالی دستاویز مثلاً بینک چیک کو اپنے قرض کی وصولیابی میں قبول کرنے پر کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ باوجودیکہ بینک چیک کا رواج بھی عام ہو چکا ہے۔

۲ ...... یہ نوٹ "غیر محدود زر قانونی" (Unlimited Legal Tender) کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، جب کہ دھاتی کرنسی "محدود زر قانونی" (Limited Legal Tendey) ہے۔ اس لئے ان نوٹوں کے ذریعہ قرض کی بڑی سے بڑی مقدار کی ادائیگی ممکن ہے اور قرض خواہ اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا بخلاف دھاتی سکوں کے کہ قرض کی بڑی مقدار کو اگر کوئی شخص اس کے ذریعہ ادا کرنا چاہے تو قرض خواہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کاغذی نوٹ نے لین دین میں رواج کی کثرت، لوگوں کے اس پر زیادہ اعتماد اور اس کی قانونی حیثیت کی وجہ سے دھاتی کرنسی پر بھی برتری حاصل کر لی ہے۔

۳ ...... قرض کی دستاویز ہر شخص جاری کر سکتا ہے۔ اس میں شرعاً اور قانوناً کوئی ممانعت نہیں کہ قرض خواہ یہ سند اپنے دین کی ادائیگی میں دوسرے قرض خواہ کو دے دے اور دوسرا قرض خواہ تیسرے قرض خواہ کو دے دے۔ لیکن یہ نوٹ حکومت کے علاوہ کوئی اور شخص جاری نہیں کر سکتا۔ جیسے دھاتی کرنسی حکومت کے علاوہ کوئی شخص جاری نہیں کر سکتا۔

۴ ...... دنیا کے تمام ممالک میں عرفاً اور قانوناً نوٹوں کے لئے "کیش" "ثمن" اور "کرنسی" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جب کہ دوسری مالی دستاویزات کے لئے یہ الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔

۵ ...... لوگ آپس میں ان نوٹوں کا لین دین اس اعتماد کے ساتھ کرتے ہیں جس اعتماد کے ساتھ دھاتی کرنسی کا لین دین کرتے ہیں۔ اور ان نوٹوں کے لین دین کے وقت لوگوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ قرض کا لین دین کر رہے ہیں۔ آج کوئی

شخص بھی ایسا موجود نہیں ہے جو ان نوٹوں کو اس لئے حاصل کرنا چاہتا ہو کہ ان کے ذریعے سونے، چاندی یا دھات کے سکے حاصل کر لے گا۔

۶..... جیسا کہ اس کاغذی کرنسی کے ارتقاء میں پیچھے ذکر کیا گیا کہ اب ان کاغذی نوٹوں کی پشت پر کوئی سونا چاندی سرے سے موجود نہیں ہے اور نہ اسے سونے میں تبدیل کرنا ممکن ہے، حتی کہ ملکوں کے درمیان آپس کے لین دین میں بھی اس کا امکان باقی نہیں رہا چنانچہ جیو فرے گراؤتھر (Geoffrey Growther) لکھتا ہے۔

The Promise to pay, wich appears on their face is now utterly meaningless. Not even in amounts of pounds 1700 can notes now be converted into gold. The note is no more than a piece of paper, of no intrinsic value whatever and if it were presented for redemption, the Bank of England could honour its promise to pay one Pound' only by giving silver coins or another note but it is accepted as money throughout the British Island.' (9)

کرنسی نوٹوں پر جو یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ:
"حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا" اب اس عبارت کا کوئی مقصد اور کوئی معنی باقی نہیں رہے۔ اس لئے کہ اب موجودہ دور میں کرنسی نوٹوں کی کسی بھی مقدار کو سونے میں تبدیل کرانے کی کوئی صورت نہیں، چاہے ان نوٹوں کی مقدار سترہ سو پونڈ یا اس سے زیادہ بھی کیوں نہ ہو، اب موجودہ دور میں یہ کرنسی نوٹ ایک کاغذ کا پرزہ ہے جس کی ذاتی قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس پونڈ کو برطانیہ کے مرکزی بینک میں لے جاکر اس کے بدلے میں سونے یا کرنسی کا مطالبہ کرے تو وہ بینک یا تو علامتی سکے دے دے گا یا اس کے بجائے دوسرے نوٹ پکڑا دے گا۔ لیکن یہ کاغذی پونڈ برطانیہ کے تمام جزائر میں کیش ہی کی طرح قبول کئے جاتے ہیں (اس لئے اب اس کے بدل کے مطالبہ کی ضرورت بھی

نہیں ہے)۔

خلاصہ یہ کہ نوٹ پر لکھی ہوئی تحریر کا مطلب صرف اشارہ گیا ہے کہ حکومت اس نوٹ کی ظاہری قیمت کی ضامن ہے اور اس کی ظاہری قیمت اس کی قوت خرید ہی کا دوسرا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ بینک اب اس کے بدلے میں سونا، چاندی یا دوسرے دھاتی سکے دینے کا پابند نہیں ہے، چنانچہ بعض اوقات بینک مطالبہ کے وقت اس کے بدلے میں اس کی ظاہری قیمت ہی کے برابر دوسرے نوٹ ادا کر دیتا ہے۔ حالانکہ نوٹ کے بدلے میں نوٹ ادا کرنے کو قرض کی ادائیگی نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے ایک کرنسی کو دوسری کرنسی سے تبدیل کر کے دے دیا۔ اور مرکزی بینک نوٹوں کی یہ تبدیلی بھی صرف اس مقصد کے لئے کرتا ہے تاکہ ان نوٹوں پر لوگوں کا اعتماد برقرار رہے۔ اس تبدیلی کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ یہ نوٹ کرنسی کی تعریف داخل نہیں ہے۔

بہر حال! مندرجہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ فقہی اعتبار سے یہ نوٹ اب قرض کی دستاویز کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں، بلکہ "فلوس نافقہ" (مروجہ سکوں) کی طرح یہ علامتی کرنسی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ جس طرح "فلوس نافقہ" کی ظاہری قیمت ان کی ذاتی قیمت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، اور لوگوں میں ان نوٹوں کے ذریعے لین دین کا رواج "فلوس نافقہ" ہی کی طرح ہو گیا ہے بلکہ موجودہ دور میں دھاتی سکوں کا وجود بھی نادر ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان نوٹوں کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ اس کے ذریعہ زکوۃ فی الفور ادا نہیں ہوتی یا ایک کرنسی نوٹ کو دوسرے کرنسی نوٹ میں تبدیلی کو یہ کہہ کر ناجائز قرار دینا کہ یہ "بیع الکالی بالکالی" کی قبیل سے ہے یا ان نوٹوں کے ذریعے سونے چاندی کی خریداری کو اس لئے ناجائز قرار دینا کہ یہ "بیع صرف" ہے اور "بیع صرف" میں دونوں طرف سے مجلس میں قبضہ کرنا ضروری ہے جو یہاں نہیں پایا گیا۔ ان تمام باتوں میں ناقابل تحمل حرج لازم آتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کے معاملات میں شریعت مروجہ عرف ہم کو معتبر مانتے ہوئے اس میں سہولت اور آسانی پیدا کر دیتی ہے اور ایسے فلسفیانہ ... کی دقیق بحثوں میں نہیں الجھتی، جن کا عملی زندگی پر کوئی اثر موجود نہ ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بہر حال! مندرجہ بالا بحث سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی کہ یہ کاغذی نوٹ کرنسی کے حکم میں ہیں۔ اب ہم اس نوٹ سے متعلق دوسرے فقہی احکام کو بیان کرتے

ہیں۔ واللہ المستعان۔

کرنسی نوٹ اور زکوٰۃ :

جب کرنسی نوٹ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائیں۔ توان پر بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہو جائے گی اور چونکہ اب یہ نوٹ قرض کی دستاویز کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان نوٹوں پر قرض کی زکوٰۃ کے احکام بھی جاری نہیں ہوں گے بلکہ اس پر مروجہ سکوں کے احکام جاری ہوں گے۔ وجوب زکوٰۃ کے مسئلے میں مروجہ سکوں کا حکم سامان تجارت کی طرح ہے۔ یعنی جس طرح سامان تجارت کی مالیت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچ جائے توان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی حکم مروجہ سکوں اور موجودہ کرنسی نوٹوں کا ہے۔

اور جس طرح مروجہ سکے کسی غریب کو بطور زکوٰۃ کے دیئے جائیں تو جس وقت وہ فقیران سکوں کو اپنے قبضہ میں لے گا اسی وقت اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، بعینہ یہی حکم کرنسی نوٹوں کا ہے کہ فقیر کے ان پر قبضہ کرنے سے زکوٰۃ فی الفور ادا ہو جائے گی۔ ان نوٹوں کو استعمال میں لانے پر زکوٰۃ کی ادائیگی موقوف نہ رہے گی۔

نوٹوں کا نوٹوں سے تبادلہ :

نوٹوں کا نوٹوں سے تبادلہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں :۔

ا ...... ایک یہ کہ ایک ہی ملک کے مختلف مقدار کے نوٹوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے۔

۲ ...... دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ملک کے کرنسی نوٹوں کا دوسرے ملک کے کرنسی نوٹوں سے تبادلہ کیا جائے۔

ان دونوں صورتوں کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان کئے جاتے ہیں۔

ملکی کرنسی نوٹوں کا آپس میں تبادلہ :

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا کہ تمام معاملات میں کرنسی نوٹ کا حکم بعینہ سکوں کی

طرح ہے۔ جس طرح سکوں کو آپس میں تبادلہ برابر سرابر کر کے جائز ہے۔ اسی طرح ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کا تبادلہ برابر سرابر کر کے بالاتفاق جائز ہے۔ بشرطیکہ مجلس عقد میں فریقین میں سے کوئی ایک بدلین میں سے ایک پر قبضہ کر لے، لہٰذا اگر تبادلہ کرنے والے دو شخصوں میں سے کسی ایک نے بھی مجلس عقد میں نوٹوں پر قبضہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہ دونوں جدا ہوگئے تو اس صورت میں امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور بعض مالکیہ کے نزدیک یہ عقد فاسد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک فلوس متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے ان کی تعیین صرف قبضے ہی سے ہو سکتی ہے (۱۰) لہٰذا جن فلوس پر عقد ہوا، مگر ان پر قبضہ نہیں ہوا تو وہ متعین نہیں ہو سکے، بلکہ ہر فریق کے ذمہ دین ہو گئے اور یہ دین کی بیع دین سے ہو گئی، جو "بیع الکالی، بالکالی" ہونے کی بنا پر ناجائز ہے۔ (۱۱)

مندرجہ بالا حکم تو اس صورت میں ہے جب نوٹوں کا نوٹوں سے تبادلہ برابر سرابر کر کے کیا جائے اور اگر کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کیا جائے مثلاً ایک روپیہ کا دو روپے سے یا ایک ریال کا دو ریال سے یا ایک ڈالر کا دو ڈالر سے تبادلہ کیا جائے تو اس صورت کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں فقہاء کا وہی مشہور اختلاف پیش آئے گا جو فلوس کے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کے بارے میں معروف ہے وہ یہ کہ:

بعض فقہاء کے نزدیک ایک فلس (پیسے) کا تبادلہ دو فلسوں سے شرعاً سود ہونے کی بنا پر حرام ہے، یہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور حنفیہ میں سے امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک ہے اور حنابلہ کا مشہور مسلک بھی یہی ہے۔ اور اگر دونوں طرف کے فلوس غیر متعین ہوں تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک بھی یہ تبادلہ حرام ہے۔

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک یہ تبادلہ اس لئے حرام ہے کہ ان کے نزدیک کسی معاملے میں ادھار اور کمی زیادتی کے حرام ہونے کی علت "ثمنیت" (کیش، نقدی اور کرنسی ہونا) ہے، چاہے حقیقی ثمنیت ہو جیسے سونے چاندی میں ہوتی ہے، یا عرفی اور اصطلاحی ثمنیت ہو، جیسے سونے چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں کے سکے اور کاغذی نوٹ میں ہوتی ہے، لہٰذا اگر کسی عقد میں دونوں طرف ایک ہی قسم کا ثمن (کرنسی، نقدی، کیش) ہو۔ تو امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس عقد میں نہ تو کمی زیادتی جائز

ہے اور نہ ادھار جائز ہے، چنانچہ "المدونة الکبری" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ولو ان الناس اجاز و بینهم الجلود- حتی یکون لها سکة و عین لکر هتها ان تباع بالذهب والورق نظرة ...... لان مالکا قال : لا یجوز فلس بفلسین- ولا تجوز الفلوس بالذهب ولا بالدنانیر نظرة - (۱۲)

یعنی اگر لوگوں کے درمیان چمڑے کے ذریعے خرید و فروخت کا اس قدر رواج پا جائے کہ وہ چمڑا ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو اس صورت میں میرے نزدیک سونے چاندی کے ذریعے اس چمڑے کو ادھار فروخت کرنا جائز نہیں............ چنانچہ امام مالک فرماتے کہ ایک فلس کی دو فلسوں کے ساتھ بیع اور تبادلہ جائز نہیں، اسی طرح سونا چاندی اور درہم اور دینار کے ذریعہ بھی فلوس کی ادھار بیع جائز نہیں (اس لئے کہ سونا، چاندی، درہم اور دینار میں حقیقی ثمنیت موجود ہے۔ اور سکوں میں اصطلاحی ثمنیت موجود ہے، اور امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک ثمنیت کے ہوتے ہوئے اگر اجناس مختلف ہوں تب بھی ادھار ناجائز ہے)

جہاں تک (۱۳) حنفیہ کا تعلق ہے، ان کے نزدیک حرمت ربا کی علت ثمنیت کے بجائے "وزن" ہے، اور اگرچہ فلوس عددی ہیں اس لئے ان میں یہ علت موجود نہیں، لیکن فقہاء حنفیہ فرماتے ہیں کہ ہم قیمت فلوس بازاری اصطلاح کے مطابق بالکل برابر اور قطعی طور پر مساوی اکائیاں ہوتی ہیں، کیونکہ لوگوں کی اصطلاح نے ان کی جودت ورداءت (عمدگی اور کہنگی) کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔ لہٰذا اگر ایک اکائی کو دو اکائیوں سے فروخت کیا جائے گا، تو دو میں سے ایک اکائی بغیر کسی عوض کے رہ جائے گی، اور یہ عوض سے خالی رہ جانا عقد میں مشروط ہو گا، لہٰذا اس سے ربا لازم آجائے گا۔ لیکن یہ حکم اس وقت تک ہے جب تک کہ ان فلوس کی ثمنیت باقی رہے اور وہ متعین کرنے سے متعین نہ ہوں۔

اب امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تو یہ فرماتے ہیں کہ جب یہ سکے ثمن اصطلاحی بن کر رائج ہو چکے ہیں تو جب تک تمام لوگ اس کی ثمنیت کو باطل قرار نہ دیں، اس وقت تک صرف متعاقدین (بائع اور مشتری) کے باطل کرنے سے اس کی ثمنیت باطل نہ ہوگی۔ جب ثمنیت باطل نہیں ہوئی تو وہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، لہٰذا ایک سکے کا دو سکوں سے تبادلہ جائز نہ ہوگا۔ خواہ متعاقدین (بائع اور مشتری) نے انہیں اپنی حد تک معین ہی کیوں نہ کر لیا ہو۔

لیکن امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ سکے خلقی ثمن نہیں ہیں۔ بلکہ اصطلاحی اثمان ہیں۔ اس لئے متعاقدین کو اختیار ہے کہ وہ اپنے درمیان اس اصطلاح کو ختم کرتے ہوئے ان سکوں کی تعیین کے ذریعے ان کی ثمنیت کو باطل کر دیں۔ اس صورت میں یہ سکے عروض اور سامان کے حکم میں ہو جائیں گے، لہٰذا ان میں کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ جائز ہوگا۔ (۱۴)

رہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سو ان کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں:۔

ایک یہ کہ ایک سکے کا دو سکوں سے تبادلہ جائز ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک حرمت ربا کی علت "وزن" ہے، اور سکوں کے عددی ہونے کی وجہ سے یہ علت ان میں موجود نہیں۔ جب علت موجود نہیں تو حرمت کا حکم بھی نہیں لگے گا۔

دوسرے یہ کہ سکوں کا اس طرح تبادلہ کرنا جائز نہیں، اس لئے یہ سکے فی الحال اگرچہ عددی ہیں۔ لیکن اصل میں دھات ہونے کی بنا پر وزنی ہیں اور دھات کو سکوں میں تبدیل کرنے سے ان کی اصلیت باطل نہیں ہوگی۔ جس طرح روٹی اگرچہ عددی ہے۔ لیکن اصلیت کے اعتبار سے آٹا ہونے کی بنا پر کیلی یا وزنی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:۔

ان اختيار القاضی ان ما كان يقصد وزنه بعد عمله كالا سطال ففيه الربا وما لا فلا (۱۵)

کسی دھات سے کوئی چیز بنانے کے بعد بھی اگر اس میں وزن کا اعتبار کیا جاتا ہو تو اس میں کمی زیادتی سے بیع کرنا سود ہونے کی بنا پر حرام ہے۔ جیسے تانبے، پیتل اور اسٹیل کے برتن (اس لئے کہ یہ

چیزیں بازار میں وزن کر کے بیچی جاتی ہیں) اور اگر وزن کا اعتبار نہ کیا جائے تو سود نہیں۔

اس اصول کا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک کاغذی نوٹ کا تبادلہ کمی زیادتی کے ساتھ جائز ہو۔ اس لئے کہ کاغذی نوٹ اصلاً وزنی نہیں ہیں۔ بخلاف فلوس کے کہ وہ اصلاً وزنی ہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

دوسرے بعض فقہا کے نزدیک ایک سکے کا دو سکوں سے تبادلہ مطلقاً جائز ہے۔ بلکہ سکوں کے تبادلے میں ہر قسم کی کمی زیادتی جائز ہے۔ یہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک حرمت ربا کی علت اصلی اور خلقی ثمنیت ہے۔ جو صرف سونے چاندی میں پائی جاتی ہے اور سکوں میں صرف عرفی ثمنیت موجود ہے۔ خلقی ثمنیت نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک فلوس کا تبادلہ کمی زیادتی کے ساتھ بالکل جائز ہے۔ (۱۶)

اور جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا کہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک بھی اگر متعاقدین ان سکوں کو متعین کر دیں تو متعین کرنے سے ان کی ثمنیت باطل ہو کر وہ عروض اور سامان کے حکم میں ہو جائیں گے۔ اس صورت میں ایک فلس کا تبادلہ دو فلسوں کے ساتھ جائز ہے۔

اس مسئلہ میں راجح اور مفتی بہ قول

مندرجہ بالا اختلاف کا تعلق اس زمانے سے ہے جب سونے چاندی کو تمام اثمان کا معیار قرار دیا ہوا تھا۔ اور سونے چاندی سے تبادلے کا عام رواج تھا، اور تمام معاملات میں پوری آزادی کے ساتھ سونے چاندی کے سکوں کے ذریعے لین دین ہوا کرتا تھا اور دوسری دھات کے سکے معمولی قسم کے تبادلے میں استعمال ہوتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں سونے چاندی کے سکے نایاب ہو چکے ہیں اور اس وقت دنیا میں کوئی ایسا ملک یا ایسا شہر نہیں ہے جس میں سونے چاندی کے سکے رائج ہوں۔ اور تمام معاملات اور لین دین میں سونے چاندی کے سکوں کے بجائے علامتی سکے اور کرنسی نوٹ رائج ہیں جیسا کہ اس مقالے کے آغاز میں ہم نے بتایا ہے۔

لہٰذا میری رائے میں موجودہ دور کی علامتی کرنسی نوٹ کے تبادلے کے مسئلہ میں

امام مالک یا امام محمد کا قول اختیار کرنا مناسب ہے۔ اس لئے کہ امام شافعی یا امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہم کا مسلک اختیار کرنے سے سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا اور ہر سودی کاروبار اور لین دین کو اس مسئلہ کی آڑ بنا کر اسے جائز کر دیا جائے گا چنانچہ اگر قرض دینے والا اپنے قرض کے بدلے سود لینا چاہے گا تو وہ اس طرح سے بآسانی لے سکے گا کہ قرض دار کو اپنے کرنسی نوٹ زیادہ قیمت میں فروخت کرے گا۔ اس طرح وہ اپنے قرض کے بدلے سود حاصل کرے گا۔

غالب گمان یہ ہے کہ اگر وہ فقہاء جنہوں نے ایک سکے کے دو سکوں سے تبادلہ کو جائز قرار دیا ہے۔ ہمارے موجودہ دور میں باحیات ہوتے اور کرنسی کی تبدیلی کا مشاہدہ کرتے، تو وہ ضرور اس معاملے کی حرمت کا فتویٰ دیتے، جس کی تائید بعض متقدمین فقہاء کے قول سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ماوراء النہر کے فقہاء عدالی اور غطارفہ میں کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کو حرام قرار دیتے تھے۔ (۱۷) ایسے سکوں کے بارے میں حنفیہ کا اصل مذہب کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کے جواز کا تھا۔ کیونکہ ان سکوں میں کھوٹ غالب ہونے کی وجہ سے وہاں چاندی اور کھوٹ میں سے ہر ایک کو مخالف جنس کا عوض قرار دینے کی گنجائش موجود تھی۔ (گویا کہ چاندی کا تبادلہ کھوٹ سے اور کھوٹ کا تبادلہ چاندی سے ہوتا تھا اور یہ تبادلہ خلاف جنس سے ہونے کی بنا پر جائز تھا) لیکن ماوراء النہر کے مشائخ حنفیہ نے ان کھوٹے سکوں میں بھی کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کو ناجائز قرار دیا اور اس کی علت یہ بیان کی کہ :-

انها اعزالا موال فی دیار نا فلو ابیح التفاضل فیه یفتح باب الربا - (۱۸)

ہمارے شہر میں ان سکوں کو بھی بہت معزز مال سمجھا جاتا ہے، اس لئے ان میں کمی زیادتی کو جائز قرار دینے سے سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

پھر اگر امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کے قول کا موازنہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے قول سے کیا جائے تو امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کی دلیل بھی بہت مضبوط اور راجح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک

ان سکوں کی ثمنیت ختم کرنے کے بعد ہی کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کے جواز کا حکم دیا جاتا ہے۔ جب کہ سکوں کی ثمنیت ختم کرنے کا کوئی صحیح مقصد سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ اس لئے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص ایسا ہو گا جس کے نزدیک سکوں کے حصول سے مقصد اس کی ثمنیت نہ ہو۔ بلکہ ان سکوں کی اصل دھات تانبا، پیتل اور لوہا مقصود ہو۔ سکوں کے حصول سے ہر شخص کی غرض اس کی ثمنیت ہوتی ہے۔ (تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنی ضروریات خرید سکے، نہ یہ کہ اس سکے کو پگلا کر کوئی دوسری چیز بنائے) لہٰذا اگر متعاقدین (بائع اور مشتری) سکے کی ثمنیت ختم کرنے پر مصالحت کر لیں تو اس مصالحت کو کمی زیادتی کے تبادلے کو جائز کرنے کے لئے ایک من گھڑت اور مصنوعی حیلہ کہا جائے گا۔ جس کو شریعت قبول نہیں کر سکتی۔ خاص کر موجودہ دور میں اس قسم کے حیلوں کی شرعاً کہاں گنجائش ہو سکتی ہے۔ جبکہ سونے چاندی کے حقیقی اور خلقی سکوں کا پوری دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے اور سود صرف ان مروجہ علامتی نوٹوں ہی میں پایا جا رہا ہے۔ کیونکہ سونے چاندی کے نقود نایاب ہوتے ہوتے دنیا بھر سے مفقود ہو چکے ہیں۔

ہاں! امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے قول پر عمل ان فلوس میں متصور ہو سکتا ہے جو بذات خود بحیثیت مادہ کے مقصود ہوں جیسا کہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ مختلف ممالک کے سکے اور کرنسی نوٹ اپنے پاس جمع کرتے ہیں، اس جمع کرنے سے ان کا مقصد تبادلہ یا بیع یا اس کے ذریعہ منافع حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف تاریخی یادگار کے طور پر جمع کرتے ہیں تاکہ آئندہ زمانہ میں جب یہ کرنسی بند ہو جائے تو یہ کرنسی ان کے پاس یادگار کے طور پر باقی رہے بظاہر اس قسم کی کرنسی میں ان دونوں حضرات کے قول پر عمل کرتے ہوئے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کو جائز کہنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ جہاں تک اس کرنسی کا تعلق ہے جس کے حصول کا مقصد تبادلہ اور بیع ہو، اس کی ذات مقصود نہ ہو۔ ایسی کرنسی کے معاملے میں نرمی برتنے سے سود کے حصول کا راستہ کھل جائے گا۔ لہٰذا ایسی کرنسی کے تبادلے میں کمی زیادتی کو جائز قرار دینا درست نہیں واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

بہر حال! موجودہ زمانے میں کاغذی کرنسی کا تبادلہ مساوات اور برابری کے ساتھ کرنا جائز ہے کمی زیادتی کے ساتھ جائز نہیں۔

پھر یہ برابری کرنسی نوٹوں کی تعداد اور گنتی کے لحاظ سے نہیں دیکھی جائے گی بلکہ ان نوٹوں کی ظاہری قیمت کے اعتبار سے دیکھی جائے گی جو اس پر لکھی ہوتی ہے لہٰذا پچاس روپے کے ایک نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے پانچ نوٹوں کے ذریعہ کرنا جائز ہے۔ اس تبادلہ میں اگرچہ ایک طرف صرف ایک نوٹ ہے اور دوسری طرف پانچ نوٹ ہیں۔ لیکن ظاہری قیمت کے لحاظ سے ان پانچ نوٹوں کے مجموعے کی قیمت پچاس روپے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ یہ نوٹ اگرچہ عددی ہیں لیکن ان نوٹوں کے آپس میں تبادلہ اور بیع کرنے سے بذات خود وہ نوٹ یا ان کی تعداد مقصود نہیں ہوتی بلکہ صرف اس کی وہ ظاہری قیمت مقصود ہوتی ہے جس کی وہ نوٹ نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا مساوات اس قیمت میں ہونی چاہئے۔ (۱۹)

نوٹوں کے بارے میں یہ مسئلہ بعینہ فلوس کے سکوں کی طرح ہے سکے اصلاً دھات کے ہونے کی وجہ سے وزنی ہیں۔ لیکن فقہاء نے ان کو عددی قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان فلوس کے حصول سے ان کی ذات یا دھات یا تعداد مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ قیمت مقصود ہوتی ہے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں لہٰذا اگر کوئی بڑا سکہ جس کی قیمت دس فلس ہو اس کا تبادلہ ایسے دس چھوٹے سکوں سے کرنا جائز ہے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک فلس ہے اور اس کے وہ فقہاء بھی جواز کے قائل ہیں جو ایک سکے کا دو سکوں سے تبادلہ کو ناجائز کہتے ہیں اس لئے کہ اس صورت میں ایک سکے کی قیمت بعینہ وہی ہے جو دس سکوں کی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ دس فلس کا سکہ اگرچہ بظاہر ایک ہے لیکن حکماً وہ ایک ایک فلس کے دس سکے ہیں لہٰذا وہ دس واقعی سکوں کے مساوی ہے۔ بعینہ یہی حکم ان کرنسی نوٹوں کا ہے کہ ان میں بھی ظاہری عدد کا اعتبار نہیں۔ اس عدد حکمی کا اعتبار ہے جو ان کی قیمت (Face Value) سے ظاہر ہوتا ہے لہٰذا اسی میں مساوات ضروری ہے۔

مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کا آپس میں تبادلہ

پھر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک ملک کے مختلف سکے اور کرنسی نوٹ ایک ہی جنس ہیں اور مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس ہیں اس لئے کہ

جیسا کہ ہم نے پیچھے عرض کیا تھا موجودہ دور میں سکے اور کرنسی نوٹوں سے ان کی ذات ان کا مادہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ آج کے دور میں کرنسی "قوت خرید کے ایک مخصوص معیار" سے عبارت ہے اور ہر ملک نے چونکہ الگ معیار مقرر کیا ہوا ہے مثلاً پاکستان میں روپیہ، سعودی عرب میں ریال، امریکہ میں ڈالر لہٰذا یہ معیار ملکوں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ہر ملک کی کرنسی کی حیثیت کا تعین اس ملک کی قیمتوں کے اشاریہ اور اس کی درآمدات و برآمدات وغیرہ کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کوئی ایسی مادی چیز موجود نہیں ہے جو ان مختلف معیارات کے درمیان کوئی پائیدار تناسب قائم رکھے بلکہ ہر ملک کے اقتصادی حالات کے تغیر و اختلاف کی وجہ سے اس تناسب میں ہر روز بلکہ ہر گھنٹے تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان مختلف ممالک کی کرنسیوں کے درمیان کوئی ایک پائیدار تعلق نہیں پایا جاتا جو ان سب کو جنس واحد بنا دے۔

اس کے برخلاف ایک ہی ملک کی کرنسی اور سکوں میں یہ بات نہیں اگرچہ مقدار کے لحاظ سے وہ بھی مختلف ہوتے ہیں لیکن اس اختلاف کا تناسب ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اس میں کوئی فرق نہیں۔ مثلاً پاکستانی روپیہ اور پیسہ اگرچہ دونوں مختلف قیمت کے حامل ہیں لیکن دونوں کے درمیان جو ایک اور سو کی نسبت ہے (کہ ایک پیسہ ایک روپیہ کا سوواں حصہ ہوتا ہے) روپیہ کی قیمت بڑھنے اور گھٹنے سے اس نسبت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ بخلاف پاکستانی روپیہ اور سعودی ریال کے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی معین نسبت موجود نہیں جو ہر حال میں برقرار رہے بلکہ ان کے درمیان نسبت ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ (۲۰)

لہٰذا جب ان کے درمیان کوئی ایسی معین نسبت جو جنس ایک کرنے کے لئے ضروری تھی، نہیں پائی گئی تو تمام ممالک کی کرنسیاں آپس میں ایک دوسرے کے لئے مختلف الاجناس ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ ان کے نام، ان کے پیمانے اور ان سے بھنائے جانے والی اکائیاں (ریز گاری وغیرہ) بھی مختلف ہوتی ہیں۔

جب مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس ہو گئیں تو ان کے درمیان کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ بالاتفاق جائز ہے۔ لہٰذا ایک ریال کا تبادلہ ایک روپے سے بھی کرنا جائز ہے، پانچ روپے سے بھی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو اس لئے کہ جب

ان کے نزدیک ایک ہی ملک کے ایک سکے کا تبادلہ دو سکوں سے کرنا جائز ہے، تو مختلف ممالک کے سکوں کے درمیان کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ بطریق اولی جائز ہوگا، اور حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کرنسی اگرچہ اموال ربویہ میں سے ہے لیکن اموال ربویہ میں جب جنس بدل جائے تو ان کے نزدیک بھی کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رحہم اللہ کے نزدیک ایک فلس کا دو فلسوں سے تبادلہ اس لئے ناجائز تھا کہ وہ سکے آپس میں بالکل برابر اور ہم مثل تھے جس کی بنا پر تبادلہ کے وقت ایک سکہ بغیر عوض کے خالی رہ جاتا تھا۔ لیکن مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس ہونے کے بنا پر ہم مثل اور برابر نہ رہیں۔ اس لئے ان کے درمیان کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کے وقت کرنسی کے کسی حصہ کو خالی عن العوض نہیں کہا جائے گا اور جب خالی عن العوض نہیں تو کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ بھی جائز ہے۔

لہذا ایک سعودی ریال کا تبادلہ ایک سے زائد پاکستانی روپوں سے کرنا جائز ہے۔

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ بعض اوقات حکومت مختلف کرنسیوں کی قیمت مقرر کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر حکومت پاکستان ایک ریال کی قیمت چار روپے اور ایک ڈالر کی قیمت پندرہ روپے مقرر کر دے تو کیا اس صورت میں حکومت کی مقرر کردہ قیمت کی مخالفت کرتے ہوئے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً کوئی شخص ایک ڈالر بجائے ۱۵ روپے کے بیس روپے میں بیچ دے تو اس زیادتی کو سود کہا جائے گا یا نہیں؟ میرے نزدیک حکومت کے مقرر کردہ بھاؤ کی مخالفت کرتے ہوئے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کرنے میں سود لازم نہیں آئے گا اس لئے کہ دونوں کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں اور مختلف الاجناس کے تبادلہ میں کمی زیادتی جائز ہے۔ اور اس کمی زیادتی کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں، بلکہ یہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے جس کی تفصیل ہم نے پیچھے عرض کر دی۔ البتہ اس پر تسعیر (۲۱) کے احکام جاری ہوں گے۔ لہذا جن فقہاء کے نزدیک حکومت کی طرف سے اشیاء میں تسعیر جائز ہے کرنسی میں بھی جائز ہوگی اور لوگوں کے لئے حکومت کے اس حکم کی مخالفت دو وجہ سے

درست نہ ہوگی ایک تو اس لئے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جو کام معصیت اور گناہ نہ ہوں ان میں حکومت کی اطاعت واجب ہے۔ (۲۲) دوسرے اس لئے کہ جو شخص جس ملک میں قیام پذیر ہوتا ہے وہ قولاً یا عملاً اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب تک اس ملک کے قوانین کسی گناہ کرنے پر مجبور نہیں کریں گے وہ ان قوانین کی ضرور پابندی کرے گا۔ (۲۳) لہٰذا ان قواعد کے پیش نظر اس کے لئے حکومت کے اس حکم کی مخالفت کرنا تو جائز نہیں، لیکن دوسری طرف اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام کہنا بھی درست نہیں۔

قبضہ کے بغیر کرنسی کا تبادلہ

پھر ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کے درمیان تبادلے کے وقت اگرچہ کمی زیادتی تو جائز نہیں۔ لیکن یہ "بیع صرف" بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کرنسی نوٹ خلقۃ ثمن نہیں ہیں بلکہ یہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہیں اور بیع صرف کے احکام صرف خلقی اثمان (سونے چاندی) میں جاری ہوتے ہیں اس لئے مجلس عقد میں دونوں طرف سے قبضہ شرط نہیں البتہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک کم از کم ایک طرف سے قبضہ پایا جانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ معاملہ درست نہ ہوگا اس لئے کہ ان دونوں اماموں کے نزدیک سکے متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے اور تعیین بغیر قبضے کے نہیں ہو سکتی لہٰذا اگر بغیر قبضہ کے متعاقدین جدا ہو گئے تو ان کی جدائی اس حالت میں ہوگی کہ ہر فریق کے ذمے دوسرے کا دین ہوگا (اور بیع الدین بالدین لازم آجائے گی) جو جائز نہیں ہے۔ (۲۴) البتہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چونکہ اثمان متعین کرنے سے متعین ہو جاتے ہیں۔ ان کی تعیین کے لئے قبضہ کی ضرورت نہیں ہے اس لئے ان حضرات کے نزدیک اگر کسی ایک فریق نے بھی نوٹ متعین کر دیئے کہ (معاملہ خاص انہی نوٹوں پر ہوا ہے) تو پھر قبضہ عقد کی صحت کے لئے شرط نہیں ہوگا۔ (۲۵)

اب سوال یہ ہے کہ کرنسی کا ادھار معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جیسا کہ تاجروں اور عام لوگوں میں اس کا رواج ہے کہ وہ ایک ملک کی کرنسی دوسرے شخص کو اس شرط پر دے دیتے ہیں کہ تم اس کے بدلے میں اتنی مدت کے بعد فلاں ملک کی کرنسی فلاں جگہ پر دینا۔ مثلاً زید، عمر کو سعودی عرب میں ایک ہزار ریال دے اور یہ کہے کہ تم اس کے

بدلے میں مجھے پاکستان میں چار ہزار پاکستانی روپے دے دینا تو یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ معاملہ جائز ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک اثمان کی بیع میں بیع کے وقت ثمن کا عقد کرنے والے کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں۔ لہٰذا جب جنسیں مختلف ہوں تو ادھار کرنا جائز ہے چنانچہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

> واذ اشتری الرجل فلوسا بدراھم و نقد الثمن ولم تکن الفلوس عند البائع- فالبیع جائز لان الفلوس الرائجة ثمن کالنقود- و قد بینا ان حکم العقد ی الثمن وجوبھا و وجودھا معاولا یشترط قیا مھافی ملک بائعھا لصحة العقد کما لا یشترط ذلک ی الدراھم والدنانیر- (۴۶)
>
> اگر کسی شخص نے دراہم کے بدلے فلوس خریدے، اور اس نے دراہم بائع کو دے دیئے لیکن بائع کے پاس اس وقت فلوس موجود نہیں تھے تو یہ بیع درست ہو جائے گی۔ اس لئے کہ مروجہ سکے ثمن کے حکم میں ہوتے ہیں اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ثمن پر عقد کرنے کا حکم یہ ہے کہ وہ ثمن (مشتری کے ذمے) واجب بھی ہو جائے اور موجود بھی ہو لیکن ثمن کا بائع کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں، جس طرح درہم اور دینار کی بیع کے وقت ان کا ملک میں ہونا ضروری نہیں۔

لہٰذا اس صورت میں یہ بیع بثمن موجل ہو جائے گی جو اختلاف جنس کی صورت میں جائز ہے۔

اور اس معاملے کو "بیع سلم" میں بھی داخل کر سکتے ہیں اور اکثر فقہاء فلوس میں "بیع سلم" کو جائز بھی قرار دیتے ہیں اس لئے کہ سکے ایسے غیر متفاوت عددی ہیں جو

وزن اور صفت وغیرہ بیان کرنے سے متعین ہو جاتے ہیں حتی کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو ایک فلس کی بیع دو فلسوں سے ناجائز کہتے ہیں ان کے نزدیک بھی سکوں میں "بیع سلم" جائز ہے (۲۷) اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عددی اشیاء جن میں تفاوت اور نمایاں فرق نہ ہو ان میں بھی "بیع سلم" جائز ہے۔ (۲۸)

البتہ اس عقد کو "بیع سلم" میں داخل کرنے کی صورت میں ان شرائط کا لحاظ ضروری ہو گا جو مختلف فقہاء نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق "بیع سلم" کے جواز کے لئے لگائی ہیں۔ جو کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

سبحانٰ ربک رب العزۃ عمایصفون وسلام علی المرسلین والحمدللہ رب العالمین

حواشی

(۱) مثلاً ایک شخص کو گندم کی ضرورت ہے، اس کے پاس زائد چاول موجود ہیں۔ اب وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرتا ہے جس کو چاول کی ضرورت بھی ہو اور اس کے پاس زائد گندم بھی ہو۔ ایسے شخص کے ملنے کے بعد وہ اس سے گندم کا چاول سے تبادلہ کرتا، تب جاکر اس کو گندم میسر آتی۔ یہ طریقہ اب متروک ہو چکا ہے۔ البتہ اس قسم کے تبادلے اب بھی بعض جگہ نظر آتے ہیں مثلاً آپ نے گلی کوچوں میں بعض ہاکروں کو دیکھا ہوگا کہ وہ پرانے کپڑے، پرانے جوتے اور اخبارات کی ردی لے کر اس کے بدلے میں پیالے برتن وغیرہ دیتے ہیں۔ (مترجم)

(۲) یعنی وہ نوٹ جن کی پشت پر سونا نہیں تھا۔

(۳) یہ کرنسی نوٹ کی تاریخ اور اس پر گزرے ہوئے تغیرات و انقلابات کا خلاصہ ہے۔ جو مندرجہ ذیل کتابوں سے لیا گیا ہے:

(1) An Outline of Money by Geoffrey Growther.
(2) Money and Man, by Elgin Groseclose IVth ed. University of Oklahoma Press. Norman 197.
(3) Modern Economic Theory, by K. K. Dewett New Delhi
(4) Encyclopaedia Britannica. Banking and Credit. Money Currency.
(۵) حکم التعامل فی الذهب والفضة للدکتور محمد ہاشم عوض

(۴) یہ عبارت "بلوغ الامانی" سے نقل کی گئی ہے۔ بلوغ الامانی شرح الفتح الربانی للساعاتی ۲۴۸.۸

(۵) امداد الفتاوی، حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، ج ۲ ص ۵

(۶) شرح الفتح الربانی للساعاتی آخر باب زکاۃ الذهب والفضۃ ۸: ۲۵۱

(۷) عطر ہدایہ، للشیخ اللکنوی، ص ۲۱۸ تا ۲۲۷ طبع دیو بند، انڈیا

(۸) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۹۵۰ء ج ۳ ص ۴۴ "بینکنگ اور کریڈٹ"

(۹) Goffrey Growther An outline of Money P. 16

(۱۰) مطلب یہ کہ اگر عقد کچھ متعین روپوں پر ہوا اور کوئی فریق ان روپوں کے بجائے اتنی ہی مالیت کے دوسرے روپے دے دے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ ہاں جب دوسرا فریق ان پر قبضہ کر لے تو پھر

پہلا فریق اس سے مطالبہ نہیں کر سکتا کہ نوٹ مجھے واپس کر دو، میں ان کے بدلے دوسرے دیتا ہوں (تقی)

(۱۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، ج ۴ ص ۱۸۴۔

(۱۲) المدونۃ الکبری للامام مالک جلد ۷ ص ۱۰۴

(۱۳) حنفیہ کا موقف یہاں فقہی اصطلاحات میں بیان کیا گیا ہے۔ جسے عام فہم عبارت میں لانا مشکل ہے۔ تاہم خلاصہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک دو ہم جنس چیزوں کے تبادلے میں اگر ایک چیز کے مقابل کوئی عوض نہ ہو تو وہ سود ہے۔ عام اشیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف تعداد اور کمیت کی زیادتی ہو تو دوسری طرف کیفیت اور وصف کی زیادتی کو اس کے مقابل کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر ایک برتن دو برتنوں کے عوض بیچا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس ایک برتن میں وصف کی کوئی ایسی خوبی ہے جو دوسری جانب کے ایک برتن کے مقابل رکھی جاسکتی ہے لہٰذا یہاں کوئی برتن عوض کے بغیر نہیں ہے اور صورت حال کچھ یوں ہے:

برتن نمبر ا کے مقابل برتن نمبر ۳ کی اصلیت۔

برتن نمبر ۲ کے مقابل برتن نمبر ۳ کی عمدگی کا وصف

لیکن یہ صورت وہیں ہو سکتی ہے جہاں کسی شے کے اوصاف معتبر ہوں اور ان کی کوئی قیمت لگائی جاسکے۔ اس کے بر خلاف جہاں اوصاف کا کوئی اعتبار ہی نہ ہو بلکہ اعتبار صرف مقدار کا ہو، وہاں اوصاف کو کسی مقدار کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا۔ چنانچہ جو چیز خلقی یا شرعی طور پر یا عرف عام میں ثمن بن گئی، اس میں اوصاف کا اعتبار ختم ہو گیا۔ چنانچہ ایک روپیہ کا سکہ یا نوٹ خواہ کتنا نیا اور چمکدار ہو اس کی قیمت ایک ہی روپیہ رہے گی، اسی طرح وہ سکہ یا نوٹ خواہ کتنا پرانا اور میلا کچیلا ہو جائے اس کی قیمت بھی ایک ہی روپیہ رہے گی۔ اگرچہ دونوں کے اوصاف میں فرق ہے۔ لیکن یہ فرق بازاری اصطلاح کے لحاظ سے کالعدم ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایک میلا کچیلا روپیہ بھی چمکدار اور نئے روپے کے بالکل برابر سمجھا جاتا ہے۔ دونوں کی قیمت میں کوئی فرق نہیں۔

لہٰذا اگر ایک روپے کو دو روپے کے عوض فروخت کیا جائے تو یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک طرف جو روپیہ زائد ہے وہ دوسری طرف کے روپے کے کسی وصف کے مقابل ہے، لہٰذا وہاں پر زائد روپیہ کو لازماً یہی کہنا پڑے گا کہ اس کے مقابل کوئی عوض موجود نہیں ہے۔ لہٰذا وہ سود ہو گا۔

(۱۴) تفصیل کے لئے دیکھئے: العنایہ حاشیہ فتح القدیر۔ جلد ۵ ص ۲۸۷ (تقی)

(۱۵) المغنی لابن قدامہ، مع الشرح الکبیر جلد ۴، ص ۱۲۸، ۱۹۲ و فتاوی ابن تیمیہ ۲۹، ص ۴۶۰

(۱۶) نہایۃ المحتاج للرملی، جلد ۳، ص ۴۱۸۔ و تحفۃ المحتاج لابن حجر مع حاشیۃ للشروانی، جلد ۴ ص ۲۷۹

(۱۷) عدالی اور غطارفہ خاص قسم کے سکے تھے جن میں چاندی بہت معمولی ہوتی تھی اور باقی سب کھوٹ ہوتا تھا۔

(۱۸) فتح القدیر، باب الصرف، جلد ۵ ص ۳۸۲

(۱۹) یہی وجہ ہے کہ انسان کے لئے جتنی کشش ایک ہزار کے صرف ایک نوٹ کی طرف ہوگی۔ ایک ایک روپے کے سو نوٹوں کی طرف نہیں ہوگی۔ اگرچہ ایک ایک روپے کے سو نوٹ عدد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن ظاہر قیمت کے لحاظ سے ان سو نوٹوں کا مجموعہ ایک ہزار کے ایک نوٹ سے بھی دس گنا کم ہے لہذا تبادلہ کے وقت ظاہری قیمت میں برابر کا اعتبار ہوگا۔

(۲۰) کسی زمانہ میں ایک اور تین کی نسبت تھی۔ اس وقت ایک ریال تین روپے کے برابر تھا پھر ریال کی قیمت بڑھ جانے سے ایک اور چار کی نسبت ہو گئی تھی اور اب تقریباً ایک اور سات کی نسبت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کرنسیوں کے درمیان ایسی کوئی معین نسبت موجود نہیں ہے جو ہمیشہ ایک حالت پر برقرار رہے۔ بالکل یہی حال دنیا کے ہر دو ملکوں کی مختلف کرنسیوں کا ہے۔ (مترجم)

(۲۱) "تسعیر" حکومت کی طرف سے کسی چیز کا بھاؤ مقرر کرنے کو کہتے ہیں تاکہ لوگ اس سے زیادہ قیمت پر اشیاء فروخت نہ کریں۔

(۲۲) کئی فقہاء نے اس قاعدہ کی تصریح فرمائی ہے۔ دیکھئے :۔ شرح السیر الکبیر للسرخسی جلد ۱ ص ۹۲۔ ردالمحتار باب العیدین جلد اول ص ۸۷۰ وباب الاستسقاء جلد ۱ ص ۷۹۲ وکتاب الحظر والاباحہ جلد ۵ ص ۴۰۷۔

(۲۳) احکام القرآن : مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ جلد ۵ ص ۴۳۔

(۲۴) الدر المختار مع ردالمحتار، جلد ۴ ص ۱۸۳، ۱۸۴۔

(۲۵) المغنی لابن قدامہ باب الصرف جلد ۴ ص ۱۶۹

(۲۶) المبسوط للسرخسی، جلد ۱۴ ص ۲۴

(۲۷) فتح القدیر، جلد ۵ ص ۳۲۷

(۲۸) المغنی لابن قدامہ جلد ۴ ص ۳۲۷

کرنسی کی قوّت خرید

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

"تعاشروا کالاخوان، تعاملوا کالاجانب"

یعنی بھائیوں کی طرح رہو،
لیکن آپس میں معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔

کرنسی کی قوتِ خرید

اور

ادائیگیوں پر اس کے شرعی اثرات

"کرنسی کی قیمت میں تبدیلی اور قیمتوں کے اشاریے (Price Index) سے اس کے تعلق کا مسئلہ موجود دور کے کرنسی نظام کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جس کی تشریح ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں، گذشتہ زمانے میں کرنسی کا تعلق صرف مخصوص سکوں جیسے سونے اور چاندی کے سکوں کے ساتھ تھا۔ جس کی بناء پر اس کرنسی کی قیمت سونے چاندی کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کی وجہ سے بڑھتی گھٹتی رہتی تھی، لیکن موجودہ کرنسی اور نوٹوں کا تعلق پیدائشی دھات کے سکوں کے ساتھ باقی نہیں رہا بلکہ اس کا تعلق "قوتِ خرید" کے ساتھ ہو گیا ہے۔ لہٰذا پیدائشی دھات کی قیمت میں تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ بازار میں عام اشیاء کے دام بڑھنے اور کم ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت میں فرق آ جاتا ہے۔ لہٰذا جب بازار میں اشیاء مہنگی ہو جاتی ہیں تو قوت خرید کم ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں کرنسی کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور جب اشیاء سستی ہو جاتی ہیں تو "قوت خرید" بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجے میں کرنسی کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ آج کے دور میں کرنسی کی اندرونی قیمت کا مدار ملک میں "افراط زر" اور "تفریط زر" پر ہوتا ہے۔ اگر ملک میں افراط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور جب تفریط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

اب اصل موضوع شروع کرنے سے پہلے ''افراط زر'' اور ''تفریط زر'' کی مختصر تشریح مناسب ہوگی تاکہ اصل موضوع کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

موجودہ معاشی اصطلاح میں ''افراط زر'' اسے کہا جاتا ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اس ملک کی اشیاء اور خدمات کے مقابلے میں زیادہ ہو جائے جس کے نتیجے میں اشیاء اور خدمات کی قیمت بڑھ جانے سے ملک میں مہنگائی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء و خدمات کی طلب کی نمائندگی کرتی ہے اور ملک میں میسر اشیاء و خدمات رسد کی نمائندگی کرتی ہیں اور جب رسد کے مقابلے میں طلب زیادہ ہو جاتی ہے تو مہنگائی پیدا ہو جاتی ہے یہ بات علم معاشیات کے بنیادی اصولوں کے ذریعہ بالکل واضح ہے۔

اور ''تفریط زر'' کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں جاری شدہ کرنسی، اشیاء اور خدمات کے مقابلے میں کم ہو جائے۔ جس کے نتیجے میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہو کر ارزانی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے کہ جب اشیاء، طلب سے زیادہ ہو جاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ''تفریط زر'' کے وقت ہم کرنسی کے ذریع اشیاء صرف کی بڑی مقدار خرید سکتے ہیں مثلاً اس وقت ہم سو روپے میں مندرجہ ذیل اشیاء خرید سکتے ہیں۔

گندم	۲۰ کلو
نمک	۲۰ کلو
کپڑا	۱۰ میٹر

لیکن ''افراط زر'' کے وقت ہم سو روپے میں مندرجہ بالا اشیاء اتنی مقدار میں نہیں خرید سکتے جتنی مقدار میں ''تفریط زر'' کے وقت خریدی تھیں۔ بلکہ اس مقدار سے کم خرید سکیں گے مثلاً ''افراط زر'' کے وقت وہی اشیاء مندرجہ ذیل مقدار میں خرید سکیں گے۔

گندم	۱۰ کلو
نمک	۱۰ کلو
کپڑا	۵ میٹر

اب ان دونوں حالتوں میں سو روپے تو وہی ہیں اس کی مقدار میں تو کمی واقع نہیں

ہوئی۔ لیکن دوسری صورت میں روپے کی قوتِ خرید پہلی کی بہ نسبت کمزور ہو گئی۔ اس لئے موجودہ دور میں کرنسی نوٹوں کی پیائش قوتِ خرید سے کی جاتی ہے کہ اس کی قوت خرید کتنی ہے اور قوت خرید ہی کے ذریعے اس کی حقیقی قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اسی قوت خرید کے فرق کو ماہرین معاشیات "کرنسی کی قیمت میں فرق" سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے گذشتہ مثال میں دیکھا کہ "افراط زر" کے وقت سو روپے کی قوت خرید پچاس فیصد کم ہو گئی، اس لئے کہ افراط زر کے وقت ہم "تفریط زر" کے وقت کے مقابلے میں نصف اشیاء خرید سکے۔ اس کو اس طرح بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ قوت خرید کے اعتبار سے افراطِ زر" کے وقت سو روپے تفریطِ زر کے زمانے کے پچاس روپے کے برابر ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حقوق و واجبات کی ادائیگی میں "افراط زر" کے وقت کے سو روپے "تفریط زر" کے وقت سو روپے کے مساوی قرار دئے جائیں گے؟ یا پچاس روپے کے برابر سمجھے جائیں گے؟ مثلاً اگر کسی شخص نے دوسرے سے "تفریط زر" کے وقت سو روپے قرض لئے تو اب "افراط زر" کے وقت عدد کا اعتبار کرتے ہوئے مقروض سو روپے ہی واپس کرے گا یا اس سو روپے کی قیمت گھٹ جانے اور پچاس فیصد قوت خرید کم ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے وہ اب بجائے سو روپے کے دو سو روپے ادا کرے گا؟

اس صورت میں بعض ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ اب "افراط زر" کے وقت عدد کا اعتبار کرتے ہوئے صرف سو روپے واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے اس لئے کہ اس صورت میں قرض دار قرض خواہ کو اس کی نصف قوتِ خرید واپس کر رہا ہے جو قرض خواہ نے قرض دار کو دی تھی۔

چنانچہ بعض ماہرین معاشیات اس مشکل کے حل کے لئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین کرنے کے لئے قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) کو معیار بنایا جائے، اور تمام حقوق اور واجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد بنایا جائے اور قیمتوں کے اشاریہ میں اہم اشیاء اور اجرتوں کا اندراج کیا جاتا ہے اور مالی سال کے شروع میں ان اشیاء کی جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جاتی ہے اور پھر سال کے آخر میں جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جاتی ہے اب دونوں

نرخوں اور قیمتوں کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس فرق کا تناسب نکالتے ہیں۔ جس نسبت سے فرق ظاہر ہوگا اسی تناسب سے نوٹوں کی قیمت میں تغیر سمجھا جائے گا۔ مثلاً سال کے شروع میں جس چیز کی قیمت سو روپے تھی، سال کے آخر میں اس کی قیمت ایک سو دس روپے ہو گئی یا جس چیز کی قیمت پچاس روپے تھی اب اس کی قیمت ۵۵ روپے ہو گئی۔ جس چیز کی قیمت ۱۰ روپے تھی اب اس قیمت گیارہ روپے ہو گئی تو گویا اشیاء کی قیمتیں دس فیصد کی نسبت سے بڑھ گئیں اب کرنسی کی قیمت میں بھی دس فیصد کی کمی سمجھی جائے گی۔ لہٰذا وہ حقوق اور واجبات جو شروع سال میں واجب الاداء تھے، سال کے آخر میں ان کی ادائیگی دس فیصد زیادتی کے ساتھ کی جائے گی اس لئے اگر کسی نے سال کے شروع میں سو روپے قرض لئے ہیں تو سال کے آخر میں ایک سو دس روپے اس کو واپس کرنے ہوں گے۔

بعض ملکوں میں اجرتوں اور قرضوں کی ادائیگی کے لئے مندرجہ بالا طریقہ رائج بھی ہے لہٰذا ہم پہلے شرعی نقطہ نظر سے اس طریقہ کار کا جائزہ لیتے ہیں۔ واللہ سبحانہ ھو الموفق۔

قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنا

قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض دار قرض خواہ کو صرف قرض کے برابر روپیہ واپس نہ کرے، بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے۔ اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کر کے واپس کرے، مثلاً اگر ایک ہزار روپے کسی نے قرض لئے اور قرض کی واپسی کے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے تو اب قرض دار بھی قرض میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے واپس کرے۔ قرض کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق اور ربط کے جواز میں بعض ماہرین معاشیات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ زیادتی جو قرض دار قرض خواہ کو واپس کر رہا ہے یہ حقیقی زیادتی نہیں ہے بلکہ یہ اسی مالیت کو واپس کر رہا ہے جو قرض دار نے بطور قرض کے قرض خواہ سے لی تھی۔ اس لئے کہ ایک ہزار روپے کی قوتِ خرید قرض لیتے وقت زیادہ تھی، اور قرض کی واپسی کے وقت قوتِ خرید دس فیصد کے تناسب سے کم ہو گئی۔ اگر اس صورت میں قرض دار ایک ہزار ہی واپس کرے تو یہ قرض خواہ پر ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ اس صورت

میں اس نے پوری مالیت واپس نہیں کی جو اس نے بطور قرض لی تھی، بلکہ وہ قرض کی مالیت کم کر کے واپس کر رہا ہے اب اگر ہم قرض دار پر یہ لازم قرار دے دیں کہ وہ بجائے ایک ہزار کے گیارہ سو روپے واپس کرے تو یہ گیارہ سو روپے اس کی پوری مالیت ہوگی۔ جو قرض دار نے بطور قرض کے لی تھی۔ اس لئے کہ گیارہ سو روپے کی مالیت قرض کی واپسی کے وقت بعینہ وہی مالیت ہے جو قرض لیتے وقت ایک ہزار روپے کی تھی۔ لہٰذا یہ سو روپے کی زیادتی اس نقصان کی تلافی کے لئے ہے جو نوٹ کی قیمت میں کمی کی صورت میں واقع ہوئی ہے اور اس سو روپے کی زیادتی سے قرض کی مالیت میں کوئی زیادتی واقع نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس زیادتی کو سود کہہ کر شرعاً حرام قرار دینا درست نہیں۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ اس زیادتی کو جائز قرار دینے والوں کی یہ دلیل شرعی قواعد پر کسی طرح بھی منطبق نہیں ہوتی، اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو اسی مقدار کی مثل (برابر) ادا کرنا واجب ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق کے جواز کے قائل ہیں وہ بھی اس کو مانتے ہیں لہٰذا اب "مثل" کی تعین کرنی ہے کہ "مثل" سے کیا مراد ہے؟ لہٰذا بنیادی سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ یہ برابری اور مثل مقدار (ناپ، وزن، عدد) میں ضروری ہے یا قیمت اور مالیت میں ضروری ہے؟ چنانچہ قرآن وسنت کے دلائل میں غور کرنے اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اگر ایک شخص دوسرے سے ایک کلو گندم بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے تھی اور جب وہ قرض دار اپنا قرض واپس کرنے لگا تو اس وقت ایک کلو گندم کی قیمت دو روپے ہو گئی تھی تو اب بھی وہ صرف ایک کلو گندم واپس کرے گا زیادہ نہیں کرے گا۔ باوجود یہ کہ ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے سے کم ہو کر دو روپے ہو گئی ہے۔ اور اس مسئلہ میں تمام فقہاء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے، فقہاء میں سے کوئی ایک بھی اس مسئلہ میں یہ نہیں کہتا کہ اس صورت میں جبکہ گندم کی مالیت کم ہو گئی ہے صرف ایک کلو گندم واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے اس لئے گندم کی قیمت میں

جتنی کمی واقع ہوئی ہے اسی نسبت سے اضافہ کر کے قرض خواد کو واپس کرے۔ یعنی ایک کلو گندم کے بجائے اب قرض دار ڈھائی کلو گندم واپس کرے اس لئے کہ ڈھائی کلو گندم کی مالیت اب وہی ہے جو قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی مالیت تھی۔

یہ اس بات کی بالکل واضح دلیل ہے کہ قرض میں جس مثلیت اور برابری کا اعتبار شریعت میں ضروری ہے وہ مقدار اور کمیت میں برابری ہے، قیمت اور مالیت میں برابری معتبر نہیں۔

اس دلیل کا بعض حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ گندم تو سامان اور اشیاء کی قبیل سے ہے اور اس کی اپنی ذاتی مالیت اور حیثیت ہے، بخلاف ان کاغذی نوٹوں کے کہ ان کی ذاتی مالیت اور حیثیت کچھ بھی نہیں اس لئے نوٹوں کو گندم پر قیاس کرنا درست نہیں۔

لیکن یہ جواب دراصل خلط مبحث پر مبنی ہے اس لئے کہ یہاں پر اصل مسئلہ یہ ہے کہ قرض کی واپسی میں مثلیت اور برابری کونسی معتبر ہے جب دلیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرض میں مثلیت مطلوبہ مقدار اور کمیت کی مثلیت ہے قیمت اور مالیت میں مثلیت کا اعتبار نہیں، اس لئے اب یہاں گندم اور نوٹ میں ماہیت اور اصلیت کے فرق سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ گندم اور نوٹ دونوں میں مقدار بھی موجود ہے اور قیمت بھی، لہٰذا اگر گندم میں مثلیت مطلوبہ مقدار اور کمیت ہے تو نوٹ میں بھی مثلیت مطلوبہ مقدار اور کمیت ہوگی اسی طرح اگر گندم میں قیمت اور مالیت کے فرق کا اعتبار نہیں، بالکل اسی طرح نوٹ میں بھی قیمت اور مالیت کا فرق معتبر نہیں ہوگا۔

۲۔ تمام لوگوں کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مطلوبہ برابری کو ربا الفضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرما دیا ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کو (بڑھیا کھجور کے) ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو. اور نہ دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو، اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو (جامع الاصول لابن اثیر ج ا ص ۵۴۶)

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائے گی وہ اس کھجور کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس پر راضی نہ ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل (جو زکوٰۃ وغیرہ وصول کرے) بنا کر بھیجا، وہ عامل جب واپس آیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنیب کھجور (عمدہ قسم کی کھجور ہے) پیش کیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجور ایسی ہوتی ہے، انہوں نے جواب دیا: ہم (اس عمدہ کھجور کے) ایک صاع کو (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کے بدلے میں اور دو صاع کھجور کو تین صاع کھجور کے بدلے میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا مت کرو، بلکہ جمع کھجور (مختلف قسم کی ملی جلی کھجوریں) کو پہلے دراہم کے عوض فروخت کر دو پھر ان دراہم سے جنیب کھجور خرید لیا کرو۔

(جامع الاصوال ۱/ ۵۵۰)

یہ روایت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں جو تماثل اور برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں تماثل ہے۔ قیمت میں تماثل اور برابری مطلوب نہیں، اس لئے کہ جنیب کھجور جمع کھجور کے مقابلے میں بہت اعلیٰ درجہ کی قیمتی اور عمدہ کھجور تھی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک قسم کو دوسری قسم سے تبدیل کرنے کی صورت میں عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا بلکہ وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا۔

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سونا سونے کے بدلے میں وزن کر

کے بیچو، ان میں جو شخص زیادتی کرے، یا زیادتی کو طلب کرے، تو وہ زیادتی سود ہے۔
اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے: (دینار دینار کے بدلے اور درہم درہم کے بدلے میں بیچو ان میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے)
(جامع الاصول ۱/ ۵۵۲)

صحیح مسلم میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سونے کو سونے کے بدلے میں چاندی کو چاندی کے بدلے میں گیہوں کو گیہوں کے بدلے میں، جو کو جو کے بدلے میں، کھجور کو کھجور کے بدلے میں اور نمک کو نمک کے بدلے میں ہاتھ در ہاتھ بیچو، ہاں! اگر ان اشیاء کی بیع میں جنس مختلف ہو جائے تو پھر جس طرح چاہو (کمی زیادتی کے ساتھ) بیچو بشرطیکہ ہاتھ در ہاتھ ہو (نقد ہو ادھار نہ ہو) (جامع الاصول ۱/ ۵۵۲)

ابو داؤد میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلے میں (برابر کر کے بیچو) چاہے وہ سونے کا ٹکڑا ہو، یا ڈھلا ہوا سکہ ہو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں (برابر کر کے بیع کرو) چاہے وہ چاندی کا ٹکڑا ہو، یا ڈھلا ہوا سکہ ہو، اور دو مدی (وزن کا ایک پیمانہ ہے) گیہوں کو دو مدی کے بدلے میں (برابر کر کے بیع کرو) اور دو مدی جو کو دو مد جو کے بدلے میں اور دو مدی کھجور کو دو مدی کھجور کے بدلے میں، دو مدی نمک کو دو مدی نمک کے بدلے میں (برابر کر کے بیع کرو) پس جس شخص نے زیادتی کی یا زیادتی کو طلب کیا، اس نے سود لیا۔ (جامع الاصول ۱/ ۵۵۴)

صحیح مسلم میں حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلے میں وزن کر کے (بیع کرو) اور دوسری روایت میں ہے کہ سونے کو سونے کے بدلے میں مت بیچو مگر وزن کر کے۔

مندرجہ بالا تمام احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابری ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو اور اگر معاملہ

قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا ہے اور جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳...... اس مسئلہ میں ایک حدیث اور ہے، جو خاص کر قرض ہی میں مثلیت اور برابری کو واضح کرتی ہے۔ سنن ابو داؤد میں ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں مقام بقیع میں اونٹ بیچا کرتا تھا، تو کبھی میں دیناروں کے ذریعہ بھاؤ کر کے اونٹ بیچتا، اور بجائے دینار کے مشتری سے دراہم لے لیتا، اور کبھی دراہم کے ذریعہ بھاؤ کرتا اور بجائے دراہم کے دینار وصول کرتا یعنی دینار کے بدلے درہم اور درہم کے بدلے دینار وصول کرتا اور ادا کرتے وقت بھی دراہم کے بدلے دینار اور دیناروں کے بدلے دراہم ادا کرتا، ایک مرتبہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھے، میں نے کہا: یا رسول اللہ! ذرا ٹھہریئے، میرا ایک سوال ہے وہ یہ کہ میں مقام بقیع میں اونٹ بیچتا ہوں، کبھی میں دیناروں کے ذریع بیچتا ہوں، اور اس کے بدلے میں دراہم وصول کرتا ہوں، اور کبھی دراہم کے ذریعہ بیع کرتا ہوں اور اس کے بدلے دینار وصول کرتا ہوں، یعنی دراہم کے بدلے میں دینار اور دیناروں کے بدلے دراہم ادا کرتا ہوں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اس طرح معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اسی روز کے بھاؤ کے برابر لو، اور تم دونوں (بائع اور مشتری) کے درمیان اس حالت میں جدائی نہ ہو کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی ہو۔ (سنن ابو داؤد، کتاب البیوع ۳/ ۲۵۰ رقم ۳۳۵۴)

اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لئے اس چیز کو جائز اور مباح قرار دیا کہ جب بیع دینار کے ذریعہ ہو تو ادائیگی کے روز دینار کی جو قیمت ہو، اس قیمت کے برابر دراہم وصول کرلیں، جس روز ذمہ میں واجب ہوئے ہوں، اس روز کی قیمت کا اعتبار نہیں، مثلاً بیع میں ایک دینار طے ہوا، اور بیع کے روز ایک دینار کی قیمت دس درہم تھی اور اس وقت مشتری نے قیمت ادا نہیں کی۔ کچھ روز بعد جب مشتری نے قیمت ادا کرنا چاہا تو اس وقت

اس کے پاس دراہم تو تھے مگر دینار نہیں تھے اور اس روز ایک دینار کی قیمت گیارہ دراہم ہو گئی، تو اب مشتری بائع کو گیارہ دراہم ہی ادا کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت بکر بن عبداللہ مزنی اور حضرت مسروق عجلی رضی اللہ عنہما نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ان کے ایک نوکر کے ان دونوں کے ذمہ کچھ دراہم واجب الادا تھے، لیکن ان کے پاس صرف دینار تھے، دراہم نہیں تھے۔ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: "بازار کے نرخ کے مطابق ادا کر دو" اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ادائیگی کے روز کی قیمت کا اعتبار ہے، جس روز ذمہ میں واجب ہوئی تھی اس دن کی قیمت کا اعتبار نہیں اور اگر قرضوں میں قیمت کے اعتبار سے مثلیت اور برابری معتبر ہوتی تو ان کے ذمہ دینار کی وہ قیمت واجب ہوتی جو قیمت ذمہ میں واجب ہونے کے دن تھی اور یہ بالکل واضح بات ہے۔

۴..... قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بات تمام فقہاء کے نزدیک مسلم ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور برابری شرط ہے، انکل اور اندازہ سے واپس کرنا جائز نہیں حتی کہ اگر ایک شخص نے ایک صاع گندم بطور قرض لئے اور یہ شرط ٹھہرائی کہ قرض دار مجھے بغیر ناپ کے صرف اندازہ اور تخمین سے ایک صاع واپس کرے، تو قرض کا یہ معاملہ جائز نہیں، اس لئے کہ اموال ربویہ میں اندازہ اور تخمین سے ایک صاع واپس کرنا جائز نہیں۔ اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مزابنہ کو حرام قرار دیا ہے۔ بیع مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کو ٹوٹی ہوئی کھجور کے بدلے میں بیچا جائے اور اس کی حرمت کی وجہ یہی ہے کہ جو کھجور ٹوٹی ہوئی ہے، اس کی مقدار وزن کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہے، اور جو کھجور درخت پر لگی ہوئی ہے، اس کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ اندازہ اور تخمین کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے، اس وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو علی الاطلاق حرام قرار دے دیا، حالانکہ بعض اوقات اندازہ بالکل صحیح یا صحیح کے قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا اموال ربویہ میں سے بعض کو بعض سے تبادلہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ دونوں میں تبادلہ عملی طور پر مقدار میں برابری کے ذریعہ ہو، اندازہ اور تخمین کے ذریعہ برابری کافی نہیں ہے۔

دوسری طرف اگر قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کیا جائے تو اس کا

مطلب یہ ہوگا کہ قرض کی ادائیگی میں حقیقی مثلیت کا اعتبار نہیں کیا گیا، بلکہ ایک تخمینی مثلیت پر ادائیگی کی بنیاد رکھی گئی، اس لئے کہ قیمتوں کے اشاریئے میں اشیاء کی قیمتوں میں کمی اور زیادتی کا جو تناسب نکالا جاتا ہے وہ تقریبی اور تخمینی ہوتا ہے، جس کی بنیاد ایک ایسا مخصوص حسابی طریقہ ہے جو اندازہ اور انکل ہی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے قیمتوں کے اشاریہ کو وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت کی تعین میں اس کے استعمال کا طریقہ جاننا ضروری ہے۔

"قیمتوں کا اشاریہ" وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت کی تعیین میں اس کا استعمال

زیر بحث مسئلہ کا شرعی حکم جاننے کے لئے قیمتوں کا اشاریہ وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت کی تعیین میں اس کے استعمال کو جاننا ضروری ہے، لہٰذا قرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق کے سلسلے میں ماہرین معاشیات جو طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کا خلاصہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ کرنسی چاہے دھات کی ہو یا کاغذی کرنسی ہو، وہ بذات خود مقصود نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ کرنسی بذات خود نہ تو بھوک مٹا سکتی ہے اور نہ اس سے جسم ڈھانپا جاسکتا ہے اور نہ اس کے ذریعہ خواہش پوری کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی ذریعہ تکلیف دور کی جاسکتی ہے، بلکہ اس کرنسی کے ذریعہ انسان اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء و خدمات خریدتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر کرنسی کی دو قیمتیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کی ظاہری قیمت (Face Value) یہ وہ قیمت ہے جو اس کرنسی پر لکھی ہوئی ہوتی ہے، دوسری اس کی واقعی قیمت (Real Value) یعنی اس کرنسی کا حقیقی عملی فائدہ جو ایک انسان اپنی ضروریات میں اس کرنسی کو خرچ کر کے حاصل کرتا ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے، جو ایک انسان کے لئے اس کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو۔ آج کل اقتصادیین اشیاء کے اس مجموعہ کا نام "اشیاء کی ٹوکری" (Basket of Goods) رکھتے ہیں۔ لہٰذا کرنسی کی حقیقی قیمت وہ "اشیا کی ٹوکری" ہے۔ جس کو کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن

ہو۔

مثلاً اگر زید کی ماہانہ تنخواہ دس ہزار روپے ہے تو دس ہزار روپے اس کی ماہانہ آمدنی کی ظاہری قیمت ہے پھر وہ یہ دس ہزار روپے مندرجہ ذیل اشیاء و خدمات میں صرف کرتا ہے۔

گندم ۴۰ کلو

کپڑا ۲۰ میٹر

گوشت ۱۲ کلو

چائے ۵ کلو

دو کمروں پر مشتمل مکان کا کرایہ

دو بیٹوں کے تعلیمی اخراجات

مہینہ میں ایک مرتبہ ڈاکٹری معائنہ کی فیس

مذکورہ بالا اشیاء اور خدمات کے مجموعہ کو ماہرین معاشیات "اشیاء کی ٹوکری" کہتے ہیں۔ اگر زید کی تنخواہ ہر ماہ انہی مندرجہ بالا اشیاء و خدمات پر صرف ہوتی ہے تو یہ مخصوص اشیاء و خدمات (اپنی اس مقدار کے ساتھ جو مثال میں ذکر کی گئی ہے) زید کی تنخواہ کی حقیقی قیمت ہے۔

اور دس ہزار روپے کی یہ حقیقی قیمت "اشیاء کی ٹوکری" میں درج شدہ اشیاء و خدمات کی قیمت کے بدلنے سے متغیر ہو جائے گی، اور ان اشیاء و خدمات کی قیمتیں مختلف حالات و اسباب کی بناء پر بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ماہرین معاشیات اشیاء کی قیمتوں میں تغیر کے تناسب کو معلوم کرنے کے لئے (یعنی اشیاء کی قیمتوں میں کس قدر فرق کس تناسب سے ہو چکا ہے) مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط کو بنیاد بناتے ہیں:

پھر "اشیاء کی ٹوکری" میں درجہ شدہ اشیاء و خدمات سب ایک طرح کی اہمیت نہیں رکھتیں، بلکہ بعض چیزیں دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً گندم، کپڑے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے اور کپڑا، چائے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان کی زندگی پر اہم اشیاء کی قیمت میں تبدیلی زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، بہ نسبت ان اشیاء کی قیمت کے جو کم اہمیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا اگر چائے کی قیمت زیادہ ہو جائے تو اتنی مشکلات پیدا نہ ہوں گی جتنی گندم کی قیمت بڑھنے سے پیدا ہوں گی۔ لہٰذا کرنسی کی حقیقی قیمت میں تبدیلی کو اشیاء کی قیمتوں میں اوسط تبدیلی کے

ذریعے معلوم کرنے کے لئے ماہرین معاشیات ہر چیز کی ایک خاص اہمیت فرض کر لیتے ہیں، پھر اس فرض کی ہوئی اہمیت کی بنیاد پر تمام اشیاء کے لئے علیحدہ علیحدہ خاص نمبر مقرر کر دیتے ہیں۔ اس نمبر کو ماہرین معاشیات "چیز کا وزن" (Weight of

کالم ①	کالم ②	کالم ③	کالم ④	کالم ⑤	کالم ⑥
اشیاء	اشیاء کا وزن	۱۹۸۰ء میں اشیاء کی قیمت	۱۹۸۷ء میں اشیاء کی قیمت	۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۷ء کے درمیان قیمت کی تبدیلی	اوسط تبدیلی کو اشیاء کے وزن سے ضرب دینے کا نتیجہ
کھانا	۰٫۵۰	۲ کلو ۵۰ روپے	۲ کلو سو روپے	۲٫۰	۱٫۰
کپڑا	۰٫۲۰	دس روپے فی میٹر	تیس روپے فی میٹر	۳٫۰	۰٫۶
مکان	۰٫۳۰	پانچ سو روپے ایک ماہ کا کرایہ	پندرہ سو روپے ماہانہ کرایہ	۳٫۰	۰٫۹
					۲٫۵

(Commodity) کا نام دیتے ہیں، اور بعض اوقات ان اشیا کو ہر ماہ خریدنے میں تنخواہ کا جو حصہ جس تناسب سے لگتا ہے۔ اس تناسب کو بنیاد بنا کر ہر چیز کا "وزن" مقرر کرتے ہیں۔ مثلاً زید اگر اپنی تنخواہ کا پچاس فیصد اپنے اہل و عیال کے لئے کھانے کی اشیاء خریدنے پر صرف کرتا ہے تو کھانے کا وزن صفر اعشاریہ پچاس ہو گا (.۵۰) ۔ اور اگر وہ اپنی تنخواہ کا بیس فیصد کپڑا خریدنے میں لگاتا ہے تو کپڑے کا وزن صفر اعشاریہ بیس ہو گا (.۲۰) وغیرہ۔

پھر ہر چیز کی قیمتوں میں اوسط تبدیلی کو اس کے وزن سے ضرب دیتے ہیں جو حاصل نکلتا ہے وہ ہر چیز کا اوسط کہلاتا ہے۔

یہ بات ذیل کے نقشے سے اور واضح ہو جائے گی جس میں ہم "اشیاء کی ٹوکری" کو صرف تین اشیاء پر مشتمل فرض کرتے ہیں۔ یعنی غلہ، کپڑا اور مکان۔ سامنے والے نقشے کو ملاحظہ کریں۔

اس نقشہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ "اشیاء کی ٹوکری" کی قیمت ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۷ء کی درمیانی مدت میں ۲٫۵ کے تناسب سے زیادہ ہو گئی۔ اس زیادتی کا اندازہ کرتے ہوئے اس اوسط وزن کو معیار بنایا گیا ہے جس میں ہر چیز کی ایک خاص اہمیت پیش نظر رکھی گئی ہے اور چونکہ "اشیاء کی ٹوکری" ہی کرنسی کی حقیقی قیمت ہے، تو گویا کہ کرنسی کی حقیقی قیمت میں ۲۵ فیصد کے تناسب سے کمی واقع ہو گئی ہے، جس کا مطلب یہ نکلا کہ وہ "اشیاء کی ٹوکری" جس کو ایک شخص ۱۹۸۰ء میں سو روپے میں خرید سکتا تھا، وہ ۱۹۸۷ء میں انہی "اشیاء کی ٹوکری" کو دو سو پچاس روپے میں خرید سکے گا۔

اگر ہم یہ فرض کریں کہ ۱۹۸۰ء میں ایک شخص کی ماہانہ تنخواہ پانچ ہزار روپے تھی اور ۱۹۸۷ء میں اس کی ماہانہ تنخواہ زیادہ ہو کر دس ہزار روپے ہو گئی، تو اس کی ماہانہ تنخواہ کی قیمت اور حیثیت کا حساب مندرجہ ذیل طریقہ سے کیا جائے گا۔

سال	تنخواہ کی ظاہری قیمت	نرخنامہ میں زیادتی کا تناسب	تنخواہ کی حقیقی قیمت
۱۹۸۰ء	=/۵۰۰۰ روپے	۱٫۰	=/۵۰۰۰ روپے
۱۹۸۷ء	=/۱۰۰۰۰ روپے	۲٫۵	=/۴۰۰۰ روپے

مندرجہ بالا مثال میں آپ دیکھیں گے کہ اگرچہ اس شخص کی تنخواہ کی ظاہری قیمت

دس ہزار روپے ہو گئی، لیکن اس کی تنخواہ کی حقیقی قیمت ۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی سطح پر نظر کرتے ہوئے چار ہزار روپے ہو گئی۔ اس لئے کہ کرنسی کی حقیقی قیمت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۷ء کے دس ہزار روپے ۱۹۸۰ء کے چار ہزار روپے کے مساوی ہو گئے۔

لہٰذا اگر ہم قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کر دیں اور یہ فیصلہ کر دیں کہ قرضوں کی واپسی میں اس کی حقیقی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔ اس کی ظاہری قیمت کا اعتبار نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر کسی شخص نے ۱۹۸۰ء میں چار ہزار روپے قرض لئے تھے، تو وہ ۱۹۸۷ء میں بجائے چار ہزار روپے کے دس ہزار روپے واپس کرے۔ اس لئے کہ دونوں کی حقیقی قیمت ایک ہی ہے۔

اگر ہم اس حسابی طریقے پر غور کریں، جس کے ذریعہ کرنسی کی حقیقی قیمت کی تعیین ہوتی ہے، تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پورا حسابی طریقہ تمام مراحل میں انکل اور اندازہ اور تخمینہ پر مبنی ہے، چنانچہ اس حسابی طریقہ میں مندرجہ ذیل مقامات پر انکل اور اندازہ سے کام لیا گیا ہے۔

۱...... اشاریہ میں درج شدہ اشیا کی تعیین

یہ بات معلوم ہی ہے کہ ہر شخص کی اپنی خاص ضروریات ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک شخص کی اشیاء ضرورت بھی دوسرے شخص سے مختلف ہونگی لہٰذا ایک شخص کی "اشیاء کی ٹوکری" دوسرے شخص کی "اشیا کی ٹوکری" سے مختلف ہوگی۔ لیکن "اشاریہ" میں درج شدہ "ٹوکری" صرف ایک ہے۔ جس میں اشیاء کو اس کے استعمال کرنے والوں کی کثرت کی بنیاد پر درج کیا جاتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات اس میں ایسی چیزیں بھی درج ہوتی ہیں جن کی بعض لوگوں کو پوری زندگی میں کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اس لئے ان بعض کے اعتبار سے یہ "اشاریہ" درست نہیں ہو سکتا. لہٰذا معلوم ہوا کہ "اشاریہ" میں بعض اشیاء صرف اندازہ اور تخمین سے درج کی جاتی ہیں۔

۲...... اشیاء کے وزن (اہمیت) کی تعیین

دوسرے یہ کہ اشیاء کے وزن اور صارفین کے اعتبار سے اس کی اہمیت کے تعین

میں بھی اندازہ اور اٹکل سے کام لیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشیاء کی اہمیت ایک اضافی چیز ہے، جو اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک چیز ایک شخص کے نزدیک بہت اہمیت کی حامل ہے اور وہی چیز دوسرے شخص کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اشاریہ اس مفروضہ پر بنایا جاتا ہے کہ ہر چیز کی جو اہمیت ہم نے فرض کی ہے، وہ تمام صارفین کے اعتبار سے ہے اور یہ درمیانی اوسط کی بنیاد پر فرض کی جاتی ہے جو صرف اندازہ اور تخمین ہی سے نکالی جاتی ہے۔

۳...... اشیاء کی قیمت کا تعین

تیسرے یہ کہ مختلف سالوں میں اشیاء کی قیمتوں کا تعین بھی اندازہ اور اٹکل سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ایک ہی چیز کی قیمت مختلف شہروں اور جگہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگی اور "اشاریہ" میں صرف ایک ہی جگہ کی قیمت کا اندراج ممکن ہے۔ اس لئے اگر ایک ملک کا "اشاریہ" بنانا ہو تو وہ صرف تمام جگہوں کی قیمتوں کا درمیانی اوسط نکال کر ہی بنایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اوسط اندازہ اور تخمین ہی کے ذریعہ نکالا جاسکے گا۔

بہر حال! مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ "اشاریہ" اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے اور اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو بھی اس کے نتیجے کو زیادہ سے زیادہ تقریبی تو کہہ سکتے ہیں، یقینی اور واقعی پھر بھی نہیں کہہ سکتے، جبکہ اوپر احادیث کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں۔ لہٰذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دینا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

سکوں کی قیمت کی ادائیگی میں امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک

بعض اقتصادین نے قیمتوں کے اشاریئے کے ساتھ قرضوں کی ادائیگی کو منسلک کرنے کے لئے امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔ جس میں

مروی ہے کہ ان کے نزدیک اگر ادائیگی کے وقت فلوس کے سکوں کی قیمت بدل جائے تو وہ قیمت کا اعتبار کرتے ہیں چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"وفی المنتقی: اذا غلت الفلوس قبل القبض او رخصت، قال ابو یوسف قولی وقول ابی حنیفة فی ذلک سواء ولیس له غیرها، ثم رجع ابو یوسف وقال علیه قیمتها من الدراهم یوم وقع البیع و یوم وقع القبض۔"

منتقی میں ہے کہ (کسی چیز کو بیچنے کے بعد اس کی) قیمت پر قبضہ کرنے سے پہلے اگر فلوس کے سکوں کے دام زیادہ ہو جائیں، یا کم ہو جائیں، تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں میرا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ علیہ کا ایک ہی قول ہے کہ اس بائع کو ان مقررہ فلوس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن پھر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا۔ اس مشتری پر فلوس کی وہ قیمت ادا کرنی ضروری ہے جو قیمت دراہم کی نسبت سے بیع کے دن اور قبضہ کے دن تھی۔

پھر تمرتاشی سے ان کا قول نقل کیا ہے:۔

"وفی البزازیة معزیا الی المنتقی: غلت الفلوس او رخصت، فعند الامام الاول (ای ابی حنیفه) والثانی (ای ابی یوسف) اولا: لیس علیه غیرها، وقال الثانی (ای ابی یوسف) ثانیا: علیه قیمتها من الدراهم یوم البیع والقبض، وعلیه الفتوی۔"

"اور بزازیہ میں منتقی کی طرف نسبت کرتے ہوئے نقل کرتے ہیں: فلوس کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، امام اول (یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) اور امام ثانی (یعنی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ) کا پہلا قول یہ ہے کہ مشتری پر ان مقررہ فلوس کے علاوہ اور کچھ واجب نہیں، اور امام ثانی (یعنی امام ابو یوسف رحمۃ

اللہ علیہ) کا دوسرا قول یہ ہے کہ: مشتری کے ذمہ فلوس کی وہ قیمت واجب الادا ہے، جو بیع اور قبضہ کے دن تھی، اور اسی پر فتویٰ ہے۔"

آگے علامہ ابن عابدین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"ھکذا فی الذخیرہ والخلاصتہ بالعزو الی المنتقی، وقد نقلہ شیخنا فی بحرہ واقرہ، فحیث صرح بان الفتوی علیہ فی کثیر من المعتبرات، فیجب ان یعول علیہ افتاء وقضاء۔"

"ذخیرہ" اور "خلاصہ" میں بھی اس طرح "منتقی" کی طرف منسوب ہے اور اسی بات کو ہمارے شیخ نے "بحر" میں بھی اسی طرح نقل کر کے اس کی توثیق کی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ بہت سے اہم معاملات میں اسی پر فتویٰ ہے۔ لہذا فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے میں اس قول پر اعتماد اور بھروسہ ضروری ہے۔"

مندرجہ بالا عبارات سے بعض اقتصادیین یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب قرض کی ادائیگی سکوں کی صورت میں واجب ہو، تو سکوں کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کی صورت میں اس قرض کو سکوں کی قیمت کے لحاظ سے واپس کرنا ضروری ہو گا اور امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مسلک "قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط" کے نظریہ کے بہت قریب ہے۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے اس مسلک کا "قیمتوں کے اشاریہ" کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ "افراط زر" اور "تفریط زر" اور "اشاریہ" اور اس اشاریہ کی بنیاد پر کرنسی کی قیمت متعین کرنا، وغیرہ جیسے تمام معاشی مسائل بالکل جدید مسائل ہیں۔ جن کا امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں تصور بھی نہیں تھا۔ لہذا جس وقت امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ "سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری

ہے" ان کے اس قول سے یہ مطلب لینے کا کوئی امکان ہی نہیں کہ ان کی مراد اس قیمت سے وہ مفروضہ قیمت ہے جو "اشاریہ" کی بنیاد پر نکالی گئی ہو، یا ان کی مراد وہ قیمت ہے جسے معاشی اصطلاح میں "حقیقی قیمت" (Real Value) کہا جاتا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ میں فلوس کے سکے سونے چاندی کی کرنسی کے ساتھ وابستہ تھے، اور سونے چاندی کی بنیاد پر ہی ان کی قیمت مقرر ہوتی تھی (۲۹)۔ اور یہ سکے سونے چاندی کی کرنسی کے لئے بطور ریزگاری اور چینج کے استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً دس فلوس کے سکے ایک درہم کے مساوی تصور کئے جاتے تھے۔ اس لئے ایک سکہ درہم کے دسویں حصے کے برابر حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ایک سکے کی یہ قیمت اس کی ذاتی قیمت کی بنیاد پر مقرر نہیں کی جاتی تھی بلکہ یہ ایک ایسی علامتی قیمت ہوتی تھی جس کو لوگوں نے ایک اصطلاح بنالیا تھا۔ اس لئے یہ ممکن تھا کہ لوگ اس اصطلاح کو تبدیل کر دیں اور دوبارہ یہ اصطلاح مقرر کر دیں کہ آئندہ ایک سکہ درہم کے بیسویں حصہ کے برابر سمجھا جائے گا۔ جب کہ پہلے درہم کے دسویں حصہ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح سکے کی قیمت کم ہو جائے گی اور اس کا بھی امکان ہے کہ لوگ آئندہ یہ اصطلاح مقرر کر دیں کہ اب ایک سکہ درہم کے پانچویں حصہ کے مساوی تصور کیا جائے گا تو سکے کی قیمت بڑھ جائے گی۔

لہٰذا اگر سکہ کی قیمت مندرجہ بالا اصول کے مطابق بڑھ جائے یا کم ہو جائے تو کیا مقروض اتنی مقدار کے سکے گنتی کر کے قرض خواہ کو واپس کرے گا جو عقد کے روز اس پر واجب ہوئے تھے؟ یا ادائیگی کے روز اس مقدار کے سکوں کی قیمت واپس کرے گا؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وہ مقروض سکوں کی اس مقدار کو واپس کرے گا، جو عقد کے روز اس کے ذمہ واجب ہوئی تھی اور ان سکوں کی قیمت کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا بھی مشہور مسلک یہی ہے (۳۰)۔

لہٰذا اگر ایک شخص نے سو سکے اس وقت قرض لئے جب ایک سکہ ایک درہم کے دسویں حصہ کے برابر سمجھا جاتا تھا، تو گویا کہ اس نے دس دراہم کی قیمت کے برابر سکے قرض لئے پھر اصطلاح بدل گئی، حتیٰ کہ ایک سکہ ایک درہم کے بیسویں حصہ کے برابر ہو

گیاتواس مسئلے میں جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ قرض دار صرف سو سکے ہی واپس کرے گا، اگرچہ یہ سو سکے دس درہم کے بجائے پانچ درہم کے مساوی ہو گئے ہیں۔

لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں جمہور فقہاء سے اختلاف کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: کہ اس صورت میں قرض دار ان سکوں کی قیمت واپس کرے گا جو سکے دراہم کی بنیاد پر قرض لئے گئے تھے لہٰذا مندرجہ بالا مثال میں اگر کسی شخص نے سو سکے قرض لئے تھے تو اب وہ دو سو سکے واپس کرے گا۔ اس لئے کہ سکے درہم کی ریز گاری ہے تو جس شخص نے سو سکے قرض لئے تھے، گویا کہ اس نے دس درہم کی ریز گاری قرض لی تھی اور اب ادائیگی کے روز دس درہم کی ریز گاری دو سو سکے ہو گئی اس لئے قرض دار پر دو سو سکے ادا کرنا واجب ہے۔

اور جہاں تک میں سمجھا ہوں، واللہ اعلم، جمہور فقہاء اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان اس اختلاف کی بنیاد ان سکوں کی حیثیت کے اختلاف پر مبنی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جمہور فقہاء فلوس کو مستقل اصطلاحی ثمن قرار دیتے ہیں، جس کا دراہم دنانیر سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا اگر کسی شخص نے فلوس کی کچھ مقدار بطور قرض لی، تو اب وہ اسی مقدار ہی کو واپس کرے گا، ادائیگی کے وقت ان فلوس کی قیمت دراہم کی نسبت سے نہیں دیکھی جائے گی، مگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فلوس کو دراہم کے اصطلاحی اجزاء اور ریز گاری قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک فلوس کو قرض لیتے وقت اس کی مقدار مقصود نہیں ہوتی، بلکہ وہ فلوس درہم کے اجزاء کے طور پر قرض لئے جاتے ہیں اور ان اجزاء کی مقدار کو فلوس کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا قرض کی واپسی کے وقت بھی درہم کے ان اجزاء کو فلوس کی صورت میں ادا کرنا ضروری ہے، اگرچہ ان فلوس کی مقدار قرض کی مقدار سے مختلف ہو جائے۔

سکے کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کے بارے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا مسلک سے جو نتیجہ نکلتا ہے، اس کی ایک نظیر ہے، وہ یہ کہ پاکستانی روپیہ ابتدائی پانچ سالوں میں چونسٹھ پیسوں پر منقسم ہوتا تھا جب حکومت نے اعشاری نظام قائم کیا تو روپیہ کے بارے میں یہ اعلان کر دیا کہ اب وہ سو پیسوں پر منقسم ہو گا۔ لہٰذا اس اعلان سے پہلے ایک پیسہ ایک روپیہ کا چونسٹھواں حصہ تھا، اور اس اعلان کے بعد ایک پیسہ ایک

روپیہ کا سوواں حصہ بن گیا۔ گویا کہ اس کی قیمت میں اس مقدار سے کمی واقع ہو گئی اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اس اعلان سے پہلے چونسٹھ پیسے قرض لئے تھے کیا وہ اعلان کے بعد بھی چونسٹھ پیسے ہی ادا کرے گا؟ یا سو پیسے ادا کرے گا؟ (۳۱) ظاہر ہے کہ وہ اب سو پیسے ادا کرے گا۔ اس لئے کہ اس نے ایک روپے کی ریزگاری بطور قرض لی تھی، لہٰذا اب وہ ایک روپے کی ریزگاری ہی واپس کرے گا اور اب وہ ریزگاری سو پیسے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا مذکورہ بالا قول ایسے فلوس کے بارے میں ہے جس کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ دائمی ربط اور تعلق ہو، کہ وہ فلوس اس ثمن کے لئے بطور اجزاء اور ریزگاری کے استعمال ہوتے ہوں۔ لیکن جہاں تک موجودہ کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے، ان کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ ربط اور تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ کرنسی کسی ثمن کے لئے بطور ریزگاری اور اجزاء کے استعمال ہوتے ہیں، بلکہ وہ خود مستقل اصطلاحی ثمن ہیں۔

اس کے علاوہ فلوس کی صحیح قیمت معلوم کرنا امام ابو یوسف کے قول کے مطابق ممکن ہے۔ اس لئے کہ فلوس ثمن کے ایک معین معیار یعنی درہم کے ساتھ مربوط ہیں، بخلاف موجودہ کرنسی نوٹوں کے کہ موجودہ معاشی اصطلاح کے لحاظ سے ان کی "حقیقی قیمت" ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا ممکن نہیں، بلکہ حقیقی قیمت اندازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر فرض کی جائے گی، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا۔ اس لئے موجودہ کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا درست نہیں۔

کرنسی کی مثلیت اور برابری میں عرف کا اعتبار

بعض معاشیین قرضوں کے انڈیکسیشن کے جواز میں اس سے استدلال کرتے ہیں کہ قرض کی واپسی میں مثل اور برابری ضروری ہے۔ لیکن مثلیت اور برابری کے تعین میں عرف کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اس لئے جس مثلیت کا عرف میں اعتبار ہے۔ شریعت کو بھی اسی مثلیت کا اعتبار کرنا چاہئے۔ کیونکہ کرنسی کی وہ قیمت جو اشاریہ کی بنیاد پر نکالی گئی ہو، موجودہ معاشیات کے عرف میں اس کی ادائیگی قرض لی ہوئی رقم کے مثل سمجھی جاتی ہے تو قرضوں کی ادائیگی میں شریعت کو بھی اس عرف کا لحاظ رکھنا

چاہئے۔

لیکن یہ استدلال بھی باطل ہے اولاً تو اس لئے کہ کسی مسئلہ میں عرف کا اس وقت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جب اس مسئلہ میں نص موجود نہ ہو اور ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ وہ تمام نصوص جو سود کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، ان سے مثلیت کے معنی بالکل صراحت اور وضاحت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے۔ قیمت میں مثلیت اور برابری کا اعتبار نہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں مثلیت کی تعیین میں عرف کو داخل کرنے کی گنجائش نہیں۔

دوسرے یہ کہ "حقیقی قیمت" کو قرضوں کے "مثل" قرار دینے کا تصور اب تک بھی ایسا عرف نہیں بن سکا جسے معاشی ماہرین کا بھی عرف غالب کہا جا سکے۔ چنانچہ دنیا کے اکثر ممالک قرضوں کو نرخوں کے ساتھ مربوط کرنے کے نظریہ سے متفق نہیں ہیں۔ اور یہ نظریہ صرف چند ممالک ہی میں رائج ہو سکا ہے۔ مثلاً برازیل، آسٹریلیا اور اسرائیل وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کے مقابلے میں ان ممالک کی نسبت بہت معمولی ہے۔

پھر ان معدودے چند ممالک نے بھی اس نظریہ کو نہ تو پورے طور پر اپنایا اور نہ ہی تمام مالی معاملات میں اس کو اختیار کیا، بلکہ اس نظریہ کو معاشیات کے صرف خاص شعبوں میں اختیار کیا۔ اس لئے کہ اس نظریہ کو ایک عام اصول کے طور پر تمام معاشی مسائل میں جاری کرنا ممکن بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ خود اقتصادیین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ بین ہورم اور ایچ لیوی کہتے ہیں:

> "قیمتوں کے اشاریہ" کو تمام مالی معاملات میں پورے طور پر
> کام میں لانا ایک ایسا فعل ہے جس کا حصول عملاً ناممکن ہے۔"

اور ایک بالکل واضح بات یہ ہے کہ آپ روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں پائیں گے جس نے بنکوں میں کرنٹ اکاؤنٹس کو "اشاریہ" کے ساتھ وابستہ کیا ہو۔ چاہے اس ملک میں "افراط زر" زیادہ کیوں نہ ہو۔ "برازیل" نمایاں ترین ملک ہے، جس نے قیمتوں کے اشاریہ کو بہت سے مالی معاملات میں استعمال کیا ہے۔ یہ شاید دنیا کا واحد ملک ہے، جس نے قیمتوں کے اشاریہ کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس ملک نے بھی بنکوں کے کرنٹ اکاؤنٹس میں اس نظریہ کو نہیں اپنایا۔ اس لئے کہ اگر کسی شخص نے

بطور امانت ایک معین رقم بنک میں رکھوائی، تو بنک اس امانت کی واپس ادائیگی کے وقت اسی قدر رقم واپس کرے گا، جتنی امانت رکھوائی گئی تھی، چاہے "اشاریہ" میں قیمتیں دوگنی یا اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہوں۔

یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ عرف عام میں بھی "حقیقی قیمت" کو مثلیت اور برابری کے قیام میں معتبر نہیں مانا جاتا، حتی کہ ان ممالک میں بھی جو "افراط زر" کے نقصان سے بچنے کے لئے "حقیقی قیمت" کو بطور ہتھیار کے استعمال کر رہے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے بہت سے معاشیین جو قرضوں کی ادائیگی میں "حقیقی قیمت" کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں وہ اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ ہم اس نظریہ کو ان "صرفی قرضوں" کی ادائیگی میں جاری نہیں کرتے، جو قرضے ایک انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے حاصل کرتا ہے۔ جیسے کوئی شخص ایک ہزار روپے اس لئے قرض لیتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے کھانے، پینے اوڑھنے کی ذاتی ضروریات پوری کر سکے، توان معاشیین کے نزدیک بھی اس قسم کے قرض کو "قیمتوں کے اشاریہ" کے ساتھ جوڑ دینا مناسب نہیں۔ بلکہ وہ اس "حقیقی قیمت" کے نظریہ کو صرف "سرمایہ کاری کے قرضے" میں جاری کرتے ہیں۔

کیا یہ خود ان معاشیین کی طرف سے اس بات کا اعتراف نہیں ہے کہ "صرفی قرضوں" میں "حقیقی قیمت" معتبر نہیں ہے؟ تو اگر "صرفی قرضوں" میں اس کا اعتبار نہیں تو پھر "سرمایہ کاری کے قرضوں" میں کیوں اعتبار کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ "مثلیت اور برابری" تو ایک حقیقت ہے جو قرضوں کی اقسام کے اختلاف سے مختلف نہیں ہونی چاہئے؟

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ معاشیین "حقیقی قیمت" کے نظریہ کی "افراط زر" کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں، لیکن "تفریط زر" کی صورت میں کوئی بھی اس نظریہ کو نہیں اپناتا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ نام نہاد "حقیقی قیمت" کو اگر قرض دینے کے بعد اشیاء کی قیمتوں میں کمی واقع ہو جائے۔ تو قرض دار کو اس صورت میں اسی قدر رقم واپس کرنی ضروری ہوگی جو اس نے بطور قرض لی تھی۔ اس لئے کہ اگر کسی شخص نے ایک ہزار روپے قرض دیئے ہیں، تو اشیاء کی قیمتوں میں کمی کو دیکھتے ہوئے وہ ہرگز اس بات پر راضی

نہ ہوگا کہ ایک ہزار روپے کے بدلے میں اب وہ آٹھ سو روپے قبول کر لے اور اگر اشیاء کی قیمتوں میں کمی کی صورت میں بھی "حقیقی قیمت" کے نظریہ کو جاری کریں تو "تفریط زر" کے سبب جو نقصان لاحق ہوگا، اس نقصان کے خوف سے کوئی شخص بھی اپنا پیسہ بنک میں نہیں رکھوائے گا۔

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ "حقیقی قیمت" کا نظریہ ایسا علمی نظریہ نہیں ہے جو پختہ بنیادوں پر قائم ہو، بلکہ اس نظریہ کو اس کے منطقی لوازم اور اس کے دوسرے نتائج کی طرف دیکھے بغیر صرف "افراط زر" کے نقصان کے مقابلے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اس قسم کے نظریہ کی ایسے مالی نظام میں تو گنجائش ہو سکتی ہے جو سود کی بنیاد پر قائم ہو، لیکن "قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط" کا نظریہ ایسے مالی نظام میں جس میں سود سے دور رہنے کا ارادہ ہو، ایسا بے حقیقت نظریہ ہے، جو شرعی اور عقلی دلائل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔

جب یہ مسئلہ پاکستان کی "اسلامی نظریاتی کونسل" کے سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء و معاشیین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ "قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط" کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے۔

اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سیمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بنک، جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد نے مشترکہ طور پر شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی۔ وہ قرار داد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

قرار داد

(۱) "کرنسی نوٹ" تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں۔ اور امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول کہ اگر

سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، تو اس صورت میں قرض کی واپسی ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے۔ ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

(۲) سیمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے۔ وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں۔ اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں اور اسی پر امت کا اجماع ہے، اور اسی پر عمل جاری ہے۔

(۳) ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں۔ بایں طور پر کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا۔

بہر حال! جو کچھ ہم نے اس مختصر بحث میں ذکر کیا ہے، وہ اس مسئلہ کا شرعی پہلو تھا۔ جہاں تک اس مسئلہ کے اقتصادی پہلو کا تعلق ہے، میں نے اس بحث میں اس سے تعرض نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ میرے موضوع سے باہر کی چیز ہے۔ البتہ اتنا ذکر کر دیتا ہوں کہ "قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط" کا نظریہ اب متزلزل ہو رہا ہے، اور خود اقتصادیین کی طرف سے مسلسل اس پر سخت تنقید کی جا رہی ہے اور اقتصادیین کی ایک بہت بڑی تعداد اس نظریہ کو "افراط زر" کا علاج بھی نہیں سمجھتی۔ بلکہ

اس کو ایک بے ہوش اور سن کرنے والی دوا خیال کرتے ہیں، جو بیماری کو چھپا تو دیتی ہے لیکن اس کو زائل نہیں کرتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ نظریہ "افراط زر" کی بیماری کا علاج تو کیا کرتا، بلکہ اس کو اور زیادہ مضبوط کرتا ہے اور اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اور خود اس بے ہوش کرنے والی دوائی کے معاشی زندگی پر مستقل نقصانات علیحدہ ہیں، اور انہیں نقصانات کی وجہ سے بعض ممالک مثلاً فرانس نے اس کو بالکل ترک کر دیا ہے۔

چونکہ یہ پہلو موضوع کے دائرہ سے خارج ہے۔ اس لئے میں اس کو یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ معاشیات کی ان کتابوں کا مطالعہ کرے جو خاص اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط و تعلق

جہاں تک اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کا مسئلہ ہے، تو جب تک اجرت قرض نہ بن جائے، اس وقت تک اس کا حکم "قرضوں کے ربط" سے مختلف ہوگا۔ البتہ اجرت اگر قرض بن جائے تو اس صورت میں اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو "قرضوں کے ربط" کا حکم ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ "اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط" کی تین صورتیں ممکن ہیں :۔

ا ...... پہلی صورت یہ ہے کہ اجرتیں اور تنخواہیں نوٹوں کے ذریعہ طے ہو جائیں کہ اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی۔ اور متعاقدین یعنی مالک اور مزدور کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ تنخواہ ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کے زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، مثلاً حکومت ایک شخص کو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملازم رکھے اور یہ معاہدہ کرے کہ یہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی۔ اس صورت میں اس ملازم کو ہر سال کے آخر تک ہر ماہ تین ہزار روپے ہی قبول کرنے پڑیں گے، اور درمیان سال میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب کو نہیں دیکھا جائیگا۔ البتہ جب نیا سال شروع ہوگا تو اس وقت قیمتوں کے اشاریہ کو دیکھا جائے گا کہ ایک سال کے اندر اس میں کس تناسب سے زیادتی ہوئی، مثلاً قیمتوں کے اشاریہ میں

پانچ فیصد کے تناسب سے زیادتی ہوئی تھی تو اس ملازم کی تنخواہ میں بھی اسی تناسب سے زیادتی کرنی ہوگی۔ لہٰذا اب نئے سال سے اس کی تنخواہ تین ہزار ایک سو پچاس روپے ہو جائے گی۔

یہ طریقہ بہت سے ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ میں رائج ہے۔ اور اس قسم کے ربط کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت کا حاصل یہ ہے کہ دونوں فریق اجرتوں اور تنخواہوں میں ہر سال یا ہر چھ ماہ بعد ایک معین تناسب سے زیادتی پر متفق ہو گئے ہیں۔ اور یہ زیادتی کا تناسب اگرچہ عقد کے وقت تو فریقین کے علم میں نہیں ہوتا، مگر وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہوگا۔ اس لئے زیادتی کی مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نئے سال کے شروع میں جس تناسب سے قیمتوں میں زیادتی ہوئی ہوگی، اسی تناسب سے اضافہ شدہ اجرت پر اس عقد اجارہ کی تجدید کی جائے گی۔ اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔

۲..... اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعین نوٹوں کی ایک معلوم مقدار پر ہو جائے لیکن عقد میں شرط کر لیں کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اشاریہ کی رو سے مہینہ کے آخر میں اس مقدار معلوم کے مساوی اور برابر ہوگی۔

مثلاً زید نے عمر کو ایک ماہ کے لئے ملازم رکھا اور یہ طے پایا کہ زید عمر کو مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا جو موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوگی۔ چنانچہ قیمتوں کے اشاریہ میں ایک ماہ کے اندر دو فیصد (۲ ٪) کے تناسب سے قیمتیں بڑھ گئیں۔ تو اب زید مہینہ کے آخر میں عمر کو ایک ہزار بیس روپے۔ =/۱۰۲۰ روپے ادا کرے گا۔ اس لئے کہ یہ ایک ہزار اور بیس روپے شروع مہینے کے ایک ہزار روپے کے مساوی ہیں۔

لیکن جب مہینے کے آخر میں یہ طے ہو گیا کہ تنخواہ ایک ہزار اور بیس روپے ہے۔ تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے ہی رہے گی زیادہ نہ ہوگی۔ لہٰذا اگر مالک مہینے کے آخر میں یہ تنخواہ ادا نہیں کر سکا حتیٰ کہ ایک مہینہ اور گزر گیا، یا ایک سال گزر گیا اور اس نے تنخواہ ادا نہیں کی، تب بھی مالک کے ذمہ ایک ہزار اور بیس روپے واجب

ہوں گے، قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی سے اس میں زیادتی نہیں آئے گی۔ مثلاً اگر اس عرصہ میں قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد ۱۰٪ کے تناسب سے اضافہ ہو گیا تو وہ ملازم یہ مطالبہ نہیں کر سکے گا کہ چونکہ قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اب مجھے ایک ہزار بیس روپے پر دس فیصد کے حساب سے اضافہ کر کے اجرت دی جائے۔ اس لئے کہ عقد کے وقت ہی آپس کے اتفاق سے اجرت کے بارے میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے مساوی ہوں گے وہ دیئے جائیں گے۔ اور صرف اس کی تعیین کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو مدنظر رکھا جائے گا، لیکن جب مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کی بنیاد پر ایک مرتبہ اجرت طے ہو گئی تو اب قیمتوں کے اشاریہ کا کام مکمل ہو چکا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ معین اجرت مالک کے ذمہ قرض ہو گئی، جس میں آئندہ نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ قیمتوں کے اشاریہ میں چاہے کتنے بھی تغیرات واقع ہو جائیں۔

جہاں تک اس صورت کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے میری رائے میں یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ قیمتوں کا اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھی طرح معلوم ہو، تاکہ بعد میں لاعلمی کی بناء پر آپس میں جھگڑا نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ یہاں دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ طے شدہ اجرت ایک ہزار روپے نہیں بلکہ قیمتوں کے اشاریہ کے اعتبار سے مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوں گے وہ مالک پر دینے واجب ہوں گے، جس کو حساب کے ذریعہ نکالنے کا طریقہ دونوں فریق کو معلوم بھی ہے۔ لہٰذا اجرت کی مقدار میں اتنی جہالت جھگڑے کا سبب نہیں بنے گی اور یہ صورت بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت یہ طے کی کہ مہینے کے آخر میں دس گرام سونے کی جو قیمت ہو گی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہو گی۔ جب مہینے کے آخر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی تو خود بخود یہ طے ہو گیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہو گی اور نہ کمی ہو گی، چاہے سونے کی قیمت اس کے بعد زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، اس سے اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۳ ...... اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اجرت تو روپے کی معین مقدار کے ذریعہ طے ہو جائے اور فریقین کے درمیان یہ شرط ہو جائے کہ وہ اجرت مالک کے ذمہ واجب ہوگی جو عقد اجارہ میں طے ہوئی ہے۔ لیکن مالک جس دن یہ اجرت ادا کرے گا اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہو گا، اسی تناسب سے وہ اجرت میں بھی اضافہ کر کے ادا کرے گا۔

مثلاً ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار روپے پر ملازم رکھا اور دونوں کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے۔ لیکن مالک پر یہ ضروری ہو گا جس دن وہ یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہو گا، اسی تناسب سے وہ بھی ایک ہزار روپے میں اضافہ کر دے گا۔ لہٰذا مالک نے اگر یہ اجرت مہینے کے آخری دن میں ادا کی اور اس روز قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا تھا، تو اب مالک بھی دو فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے ایک ہزار اور بیس روپے ادا کرے گا۔ اور اگر مالک نے یہ اجرت ایک سال کے بعد ادا کی اور اس وقت تک قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا تھا تو اب مالک بھی دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے ادا کرے گا۔

میری رائے میں اس کا شرعی حکم "قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط" کی طرح ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ ہم تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں۔

تیسری صورت اور دوسری صورت کے درمیان فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں اشاریہ سے صرف متفقہ اجرت کی تعیین کا کام لیا گیا۔ اور اشاریہ کی بنیاد پر جب ایک مرتبہ اجرت متعین ہو گئی تو اشاریہ کا کام ختم ہو چکا۔ اب ہمیشہ کے لئے یہی متعین اجرت مالک کے ذمہ واجب رہے گی۔ اس پر زیادتی نہ ہو گی، چاہے مالک جب بھی ادا کرے۔

بخلاف اس تیسری صورت کے کہ اس صورت میں اجرت ایک ہزار روپے متعین تھی جو ادا نہ کرنے کی بنا پر مالک کے ذمہ قرض بن گئی تھی اور پھر اس قرض کو اشاریہ

کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس تیسری صورت کا بھی وہی عدم جواز کا حکم ہو گیا جو قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا حکم ہے۔

اس تیسری صورت کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اجرت کی تعیین میں اشاریہ لینا فرض پورا کر رہا ہے کہ جس وقت آپ چاہیں نرخ نامہ کے ذریعہ اجرت متعین کر کے ادا کر دیں۔ اس لئے کہ اجرت کی تعیین عقد اجارہ کے وقت ہی طے ہو جانا ضروری ہے۔ یا دوسرے کسی خاص وقت کے اندر اندر اس کی اس طرح تعیین ضروری ہے کہ اس تعیین کے بعد اجرت میں نہ تو زیادتی ہو سکے اور نہ کمی ہو سکے۔ لہٰذا اگر اجرت کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح ہمیشہ کے لئے معلق کر دیا جائے کہ اس دوسری چیز کی زیادتی سے اس اجرت میں بھی زیادتی ہو جائے اور اس چیز میں کمی سے اجرت میں بھی کمی واقع ہو جائے۔ اس صورت میں تو اجرت مجہول ہی رہے گی اور کسی معلوم مقدار پر اس کی تعیین کسی وقت بھی نہ ہو سکے گی۔ اور ایسی جہالت عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بروز اتوار، مورخہ ۲۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

حواشی

(۲۹) علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے مسئلہ میں فرماتے ہیں۔

"ویدل علیہ ایضا تعبیرہم بالغلاء والرخص فانہ انما یظہر لذا کانت غالبۃ الغش تقوم بغیرھا"۔

(۳۰) دیکھئے: تنبیہ الرقود ۲/ ۶۰، زرقانی علی الخلیل ۵/ ۶۰ا امام سیوطی کی "الحاوی للفتاوی ۱/ ۹۷، ۹۹، الشرح الکبیر علی المقنع ۴/ ۳۵۸

(۳۱) حقیقت میں حکومت نے اس اعلان کے بعد نئے پیسے جاری کئے اور وہ نئے سو پیسے ایک روپیہ کے مساوی قرار دیئے، اور پرانے پیسے بھی اپنی پرانی قیمت کے مطابق ہی جاری رہے۔ لہٰذا یہ مثال ہمارے زیر بحث مسئلہ پر منطبق نہیں ہوتی۔ لیکن ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ حکومت نے نئے پیسے جاری نہیں کئے، بلکہ انہیں پرانے پیسوں کی قیمت میں تبدیلی کا اعلان کر دیا کہ اب وہی پرانے سو پیسے ایک روپیہ کے مساوی تصور کئے جائیں گے۔ تو اس صورت میں یہ مثال ہمارے زیر بحث مسئلہ پر منطبق ہو جائے گی۔

قسطوں پر خرید و فروخت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"ان الذین یکسبون الاثم سیجزون ما کانو ایقترفون"
(سورۃ الانعام: ۱۲۰)

یعنی جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، قیامت کے روز
ان کے ان اعمال کی سزا دی جائے گی جو وہ لوگ یہاں پر کیا کرتے تھے۔

قسطوں پر خرید و فروخت

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی رسوله الکریم، وعلی آله واصحابه اجمعین، وعلی کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین، وبعد:

موجودہ دور میں قسطوں پر بیچنے کا رواج تمام اسلامی ممالک میں عام ہو چکا ہے۔ اور بہت سے لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء خریدنے اور مکانات کی تعمیر اور جدید قسم کے مہنگے آلات صرف قسطوں پر خرید سکتے ہیں۔ اور نقد خریدنا ان کی طاقت اور استطاعت سے باہر ہوتا ہے، اس لئے اس بیع کا شرعی حکم اور اس پر متفرع ہونے والے مختلف مسائل کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، انشاء اللہ یہ مختصر مقالہ اس بیع کے بارے میں ضروری احکام و مسائل کے لئے کافی ہوگا، اللہ تعالیٰ صحیح بات لکھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور وہ اپنی مرضیات کے مطابق اس کی تکمیل کرا دے۔ آمین۔

قسطوں پر بیع کی حقیقت

قسطوں پر بیع کا مطلب وہ بیع ہے جس میں بیچنے والا اپنا سامان خریدار کو اسی وقت دیدے، لیکن خریدار اس چیز کی قیمت فی الحال ادا نہ کرے۔ بلکہ وہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کی قیمت ادا کرے۔ لہٰذا جس بیع میں مذکورہ بالا صورت پائی جائے اس کو "بیع بالتقسیط" کہیں گے، چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو۔ یا کم یا زیادہ۔ لیکن "بیع بالتقسیط" میں عام معمول یہ ہے کہ اس میں چیز کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے، لہٰذا اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہے تو وہ اس چیز کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے، لیکن اگر خریدار اس چیز کو ادھار خریدنا چاہے گا تو بیچنے والا اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہوگا جب اس کو نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت وصول ہو۔ اس لئے عام طور پر "بیع بالتقسیط" میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

مدت کے مقابلے پر قیمت زیادہ کرنا

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد فروخت کے مقابلے میں قیمت زیادہ مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر قدیم اور جدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے، چنانچہ بعض علماء اس زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں، اس لئے کہ ثمن کی یہ زیادتی "مدت" کے عوض میں ہے، اور جو ثمن "مدت" کے عوض میں دیا جائے، وہ سود ہے، یا کم از کم سود کے مشابہہ ضرور ہے۔ یہ زین العابدین علی بن الحسین، اور الناصر، المنصور باللہ اور ھادویہ کا مسلک ہے۔ اور علامہ شوکانی رحمتہ علیہ نے ان فقہاء کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے (نیل الاوطار، ۵: ۱۷۲)

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع موجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں، اور اس کے بعد کسی ایک

بھاؤ پر اتفاق کئے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے، لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کر لیں تو یہ بیع جائز ہو جائے گی۔

چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث "نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃ" کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔

وقد فسر بعض اهل العلم، قالوا بيعتين فى بيعة ان يقول ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة، وبنسيئة بعشرين، ولا يفارقه احد البيعين فان فارقه على احد ہما فلا باس اذا كانت العقدة على احد منهما

(ترمذی، کتاب البیوع، باب نمبر ۱۸، حدیث نمبر ۱۲۳۱)

"بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح بیان کی ہے کہ "بیعتین فی بیعۃ" سے مراد یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ "میں یہ کپڑا تم کو نقد دس درھم میں بیچتا ہوں، اور ادھار بیس درہم میں بیچتا ہوں۔ اور پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کر کے جدائی نہیں ہوئی۔ لیکن اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدائی ہوئی تو اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی بیع جائز ہے) کیونکہ معاملہ ایک پر طے ہو گیا ہے"۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بیع کے ناجائز ہونے کی علت یہ ہے کہ عقد کے وقت کسی ایک صورت کی عدم تعیین سے ثمن دو حالتوں میں متردد ہو جائے گا۔ اور یہ تردد جہالت ثمن کو مستلزم ہے، جس کی بناء پر بیع ناجائز ہوئی، مگر مدت کے مقابلے میں ثمن کی زیادتی ممانعت کا سبب نہیں، لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین کر کے جہالت ثمن کی خرابی دور کر دی جائے تو پھر اس بیع کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں رہے گی۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا بھی وہی مسلک ہے جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے (دیکھئے: المغنی لابن قدامۃ، ۴: ۱۷۷۔ المبسوط للسرخسی، ۱۳: ۸۔ الدسوقی علی الشرح الکبیر، ۳: ۵۸۔ مغنی المحتاج للشربینی، ۲: ۳۱۔) اور دلائل

سے یہی راجح ہے۔ اس لئے کہ قرآن و حدیث میں اس بیع کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں، اور اس بیع میں ثمن کی جو زیادتی پائی جارہی ہے، اس پر ربا کی تعریف بھی صادق نہیں آرہی ہے۔ کیونکہ وہ قرض نہیں ہے اور نہ ہی یہ اموال ربویہ کی بیع ہو رہی ہے، بلکہ یہ ایک عام بیع ہے۔ اور عام بیع میں بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے، فروخت کرے، اور بائع کیلئے شرعاً یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چیز بازاری دام پر ہی فروخت کرے۔ اور قیمت کی تعیین میں ہر تاجر کا علیحدہ اصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کی قیمت حالات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں ایک مقرر کرے اور دوسری حالت میں دوسری مقرر کرے تو شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی چیز نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچ رہا ہو، اس شخص کے لئے بالاتفاق اسی چیز کو نقد دس روپے میں فروخت کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس میں دھوکہ فریب نہ ہو۔ اور جب نقد دس روپے میں بیچنا جائز ہے تو ادھار دس روپے میں بیچنا کیوں ناجائز ہوگا؟

چونکہ یہ مسئلہ ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے، اور اکثر فقہاء اور محدثین نے اس کو بیان کیا ہے، اس لئے قرآن سنت سے اس بیع کے جواز پر دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس بیع کے جواز کے بعد اس سے متفرع ہونے والے مختلف مسائل پر انشاء اللہ تفصیلی بحث کریں گے۔

دو قیمتوں میں سے کسی ایک کی تعیین شرط ہے

جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ بائع کے لئے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ بھاؤ تاؤ کے وقت مختلف قیمتیں بیان کرے، مثلاً یہ کہے کہ نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچوں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لئے یہ جائز ہے کہ مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں متعین کرے؟ مثلاً وہ کہے کہ ایک ماہ کے ادھار پر دس روپے میں اور دو ماہ کے ادھار پر بارہ روپے میں (اور تین ماہ کے ادھار پر چودہ روپے

میں) بیچتا ہوں؟ اس بارے میں فقہاء کی کوئی عبارت تو نظر سے نہیں گزری، البتہ فقہاء کے سابقہ اقوال پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی جائز ہے، اس لئے کہ جب نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

البتہ مختلف قیمتوں کا تذکرہ صرف بھاؤ تاؤ کے وقت ہی جائز ہے۔ لیکن عقد بیع صرف اس وقت جائز ہے جب عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعین پر اتفاق ہو چکا ہو۔ لہٰذا بھاؤ تاؤ میں ذکر کردہ مختلف قیمتوں اور مدتوں میں سے کسی ایک کی تعیین بیع کے وقت ہی ضروری ہے۔ ورنہ بیع جائز نہ ہوگی۔

اور اگر بھاؤ تاؤ کے وقت بائع مشتری سے کہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرو گے تو اس کی قیمت دس روپے ہے اور اگر دو ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت بارہ روپے ہے۔ اور تین ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت چودہ روپے ہے، اور پھر مجلس عقد میں کسی ایک شق کی تعیین کے بغیر عاقدین اس خیال سے جدا ہو گئے کہ مشتری ان تین شقوں میں سے ایک شق کو بعد میں اپنے حالات کے مطابق اختیار کر لے گا۔ تو یہ بیع بلا جماع حرام ہے، اور عاقدین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کریں۔ اور دوبارہ از سر نو جدید عقد کریں۔ جس میں کسی ایک شق کو وضاحت کے ساتھ معین کریں۔

ثمن میں زیادتی جائز ہے، منافع کا مطالبہ جائز نہیں

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اوپر اس بیع کے جواز کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس وقت ہے جب نفس ثمن میں زیادتی کر دی جائے، لیکن اگر یہ بیع اس طرح کی جائے جس طرح بعض لوگ کرتے ہیں کہ نقد بیچنے کی بنیاد پر اس چیز کی ایک قیمت مقرر کر لیتے ہیں اور پھر اس قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس کی اصل قیمت پر اضافہ کرتے ہیں، یہ صورت سود میں داخل ہے۔ مثلاً بائع یہ کہے میں فلاں چیز تم کو آٹھ روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں، لیکن اگر تم نے ایک ماہ تک قیمت ادا نہ کی تو تمہیں دو روپے مزید ادا

کرنے ہوں گے۔ اب اس دو روپے کو "منافع" کا نام دیا جائے یا کچھ اور، لیکن اس کے سود ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ اس چیز کی اصل قیمت اٹھ روپے مقرر کر دی۔ اور یہ آٹھ روپے بیع کے نتیجے میں مشتری کے ذمہ دین ہو گئے۔ اب اس آٹھ روپے سے زیادہ مطالبہ کرنا یقیناً سود ہی ہے۔

دونوں صورتوں میں عملی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت اس لئے جائز ہے کہ اس میں فریقین کے درمیان جن مختلف قیمتوں پر بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا، ان میں سے ایک قیمت یقینی طور پر فریقین کے اتفاق سے طے ہو جاتی ہے۔ اور بیع مکمل ہونے کے بعد اس قیمت میں اضافہ یا کمی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور مشتری کی طرف سے قیمت کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، مثلاً اگر مشتری نے وہ چیز دس روپے میں اس شرط پر خریدی کہ ایک ماہ بعد قیمت ادا کرے گا، لیکن کسی وجہ سے وہ ایک ماہ کے بجائے دو ماہ میں قیمت ادا کرے، تب بھی وہ دس روپے ہی ادا کرے گا، اب مدت کی زیادتی کی بنیاد پر قیمت میں زیادتی نہیں ہوگی۔ اور دوسری صورت اس لئے ناجائز ہے کہ اس میں قیمت تو آٹھ روپے متعین ہوگئی، اور پھر ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس میں نفع کا اضافہ کیا گیا، اور اس کے بعد پھر ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوتی جائے گی، نفع میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا، مثلاً اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے متعین ہوگئی، اور پھر ادائیگی میں ایک ماہ کی تاخیر کی بنیاد پر دو روپے نفع کا اضافہ ہو جائے گا، اور اگر مشتری نے دو ماہ بعد قیمت ادا کی تو اب چار روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور تین ماہ کی تاخیر پر چھ روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح ہر تاخیر پر قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا بیع کی پہلی صورت شرعاً جائز اور حلال ہے۔ اور دوسری صورت ربا میں داخل ہے۔ اور شرعاً ناجائز ہے۔

دین کی توثیق اور اس کی قسمیں

چونکہ بیع موجل میں بیع کے مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ دین ہو جاتا ہے۔ اس لئے بائع کو مشتری سے اس دین پر کسی توثیق کا مطالبہ کرنا، یا مقرر وقت پر دین ادا کرنے پر کسی گارنٹی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

رہن کا مطالبہ کرنا

دین کی ادائیگی پر گارنٹی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک رہن رکھنا، دوسرے یہ کہ تیسرے شخص کا ضمانت دینا۔ پہلی صورت میں مشتری اپنی کوئی مملوکہ چیز بائع کے پاس بطور رہن رکھوائے، اور بائع گارنٹی کے طور پر اس چیز کو اپنے پاس رکھ لے، لیکن اس شئی مرہون سے منتفع ہونا اس کے لئے کسی صورت میں جائز نہیں، اس لئے کہ اس شئی مرہون سے منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے، البتہ وہ چیز بائع کے پاس اس لئے رکھی رہے گی تاکہ مشتری اس رہن کے دباؤ کی وجہ سے وقت مقررہ پر دین ادا کرنے کا اہتمام کرے، ہاں اگر مشتری وقت مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو پھر بائع اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کرلے۔ لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی، اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔ لہٰذا اگر اس شئی مرہون کے بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوئی ہو کہ بائع اپنا دین وصول کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جائے، تو وہ بچی ہوئی رقم مشتری کو واپس لوٹانا ضروری ہے۔ اور جس طرح مشتری کے لئے اپنی مملوکہ اشیاء کو رہن رکھوانا جائز ہے۔ اسی طرح ان اشیاء کی صرف دستاویزات اور کاغذات کو رہن رکھوانا بھی جائز ہے۔

ادائیگی کی گارنٹی کے حصول کے لئے بائع کا مبیع کو محبوس کرلینا

آج کل لوگوں کے درمیان معاملات کی جو صورتیں اور طریقے رائج ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیع موجل (ادھار بیع) میں بائع مبیع کو اپنے پاس اس وقت تک محبوس رکھتا ہے جب تک مشتری اس چیز کی قیمت ادا نہ کر دے، یا جب تک مشتری اس کی کچھ قسطیں ادا نہ کر دے۔

بیع موجل میں بائع کے لئے مبیع کو محبوس کرنے کی مذکورہ بالا صورت دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ ثمن کی وصولیابی کے لئے مبیع کو روک لیا جائے

دوسرے یہ کہ بطور رہن کے مبیع کو روک لیا جائے

دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جب ثمن کی وصولی کے لئے مبیع کو محبوس کیا جائے گا۔ اس وقت مبیع مضمون بالثمن ہوگی، مضمون بالقیمۃ نہیں ہوگی. لہٰذا اگر حالت حبس میں وہ مبیع ہلاک ہوگئی تو اس صورت میں بیع فسخ ہو جائے گی اور بازاری قیمت کا ضمان اس پر نہیں آئے گا۔

دوسری یعنی رہن کی صورت میں اگر وہ مبیع بائع کے پاس تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ نہیں ہوگی، بلکہ وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، اور اگر بائع کی تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہو تو مرتہن (بائع) اس چیز کی بازاری قیمت کا ضامن ہوگا۔ ثمن کا ضامن نہ ہوگا۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے۔ یعنی ثمن کی وصولیابی کے لئے مبیع کو روکنا۔ بیع بالتقسیط میں یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بیع بالتقسیط بیع موجل ہے۔ اور بائع کو ثمن کے استیفاء کے لئے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے۔ ادھار بیع میں یہ حق بائع کو نہیں ملتا، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ:

قال اصحابنا رحمهم الله تعالى للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن اذا كان حالا، كذا فى المحيط، وان كان موجلاً، فليس للبائع ان يحبس المبيع قبل حلول الاجل ولا بعده، كذا فى المبسوط ـ

(فتاویٰ ہندیہ، ۳: ۱۵، باب نمبر۴، کتاب البیوع)

ہمارے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نقد بیع میں ثمن کی وصولیابی کے لئے بائع کو حبس مبیع کا حق حاصل ہے، لیکن بیع موجل میں بائع کو حبس مبیع کا حق حاصل نہیں، نہ ادائیگی کے وقت سے پہلے، اور نہ ادائیگی کے وقت کے بعد۔ مبسوط للسرخسی ـ

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ اس مبیع کا جو ثمن واجب ہو چکا ہے اس کے عوض میں بائع وہی مبیع بطور رہن کے اپنے قبضے میں رکھے۔ یہ صورت دو طریقوں سے ممکن ہے۔

اول یہ کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع کے پاس بطور رہن

چھوڑ دے۔ یہ صورت تو جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ وہی صورت بن جاتی ہے کہ بائع حصول ثمن کے لئے مبیع کو اپنے پاس روک لے۔ اور حصول ثمن کے لئے حبس مبیع بیع موجل میں جائز نہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشتری اس مبیع کو پہلے اپنے قبضے میں لے۔ اور پھر بطور رہن کےوہی مبیع بائع کے پاس واپس رکھ دے، یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ:

ومن اشتری ثوبا بدراهم، فقال البائع: امسک
هذا الثوب، حتی اعطیک الثمن، فالثوب رهن

اگر کسی شخص نے چند درہم کا کوئی کپڑا خریدا، اور پھر مشتری نے بائع سے کہا کہ اس کپڑے کو اپنے پاس ہی رکھو، جب تک میں تمہیں اس کی قیمت ادا نہ کروں۔ اس صورت میں یہ کپڑا بائع کے پاس رہن سمجھا جائے گا۔

اسی عبارت کو صاحب هدایہ نے بھی نقل کیا ہے، اور پھر صاحب کفایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

"لان الثوب لما اشتراه وقبضه کان ہو و سائر
الاعیان المملوکة سواء فی صحة الرهن"

اس کے کہ جب مشتری نے کپڑا خرید کر اس پر قبضہ بھی کر لیا تو پھر اس کپڑے کو بطور رہن رکھوانا جائز ہے، جیسے دوسری مملوک اشیاء کا رہن جائز ہوتا ہے۔

(الکفایة شرح الهدایة، برحاشیه فتح القدیر، ج ۹ ص ۹۹)

اور پھر علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ در مختار میں اور وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

ولو کان ذلک الشیئی الذی قال له المشتری:
امسکه ہو المبیع الذی اشتراه بعینه، لو بعد
قبضه، لانه حینئذ یصلح ان یکون رهنا بثمنه،
ولو قبله لایکون رہنا، لانه محبوس بالثمن -

وہ چیز جس کے بارے میں مشتری نے بائع سے یہ کہا کہ: تم اس کو اپنے پاس روک لو، اگر وہ

چیز مبیع ہی تھی جس کو اس نے بائع سے خریدا تھا، اس صورت یہ دیکھا جائے گا کہ اگر مشتری نے اس چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔ تب تو وہ چیز ثمن کے مقابلے میں رہن بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور اگر مشتری نے اس پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ قبضہ کرنے سے پہلے ہی مشتری نے بائع کے پاس مبیع بطور رھن کے رکھوا دی تو اس صورت میں یہ مبیع رہن نہیں بنے گی۔ اس لئے کہ اب وہ مبیع حصول ثمن کے لئے محبوس ہے۔

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

قوله: "لانه حينئذ يصلح الخ" اى لتعين ملكه فيه، حتى لوهلك يهلك على المشترى ولا ينفسخ العقد، قوله: "لانه محبوس بالثمن" اى و ضمانه يخالف ضمان الرهن، فلايكون مضموناً بضمانين مختلفين، لاستحالة اجتما عهما، حتى لو قال: امسك المبيع حتى اعطيك الثمن قبل القبض فهلك انفسخ البيع - زيلعى

(ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الرھن، ج ٦ ص ٤٩٧)

قولہ: "لانه حينئذ يصلح الخ" اس لئے کہ اس میں مشتری کی ملکیت متعین ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ اگر اس کے بعد وہ چیز ہلاک بھی ہو جائے تو مشتری کی طرف سے ہلاک ہو گئی، اور ہلاکت کی بنیاد پر بیع فسخ نہیں ہوگی۔

قولہ: لانہ محبوس بالثمن "اس لئے کہ محبوس بالثمن کا ضمان رہن کے ضمان سے مختلف ہے۔ اور ایک ہی چیز دو مختلف ضمانوں کی طرف سے مضمون نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ دو مختلف ضمانوں کا ایک چیز میں جمع ہونا محال ہے۔ حتیٰ کہ اگر مشتری مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع سے یہ کہہ دے کہ: جب تک میں تم کو ثمن ادا نہ کروں اس وقت تک مبیع اپنے پاس رکھنا، اس صورت میں اگر مبیع بائع کے پاس ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ ہو جائے گی۔

بہر حال مندرجہ بالا عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے رہن کے جواز میں بعد کے فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ صلب عقد میں یہ رہن مشروط نہ ہو۔

لیکن اگر صلب عقد ہی میں یہ رہن مشروط ہو تو پھر اس صورت کے جواز میں علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختلاف نقل کیا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک صحیح اور قابل اعتماد مسلک جواز ہی کا ہے۔ چنانچہ المغنی میں فرماتے ہیں کہ:

واذا تبایعا بشرط ان یکون المبیع رہنا علی ثمنہ لم یصح ، قالہ ابن حامد رحمہ اللہ وھو قول الشافعی لان المبیع حین شرط رہنہ لم یکن ملکا لہ وسواء شرط انہ یقبضہ ثم یرھنہ اوشرط رھنہ قبل قبضہ ...... وظاہر الروایۃ صحۃ رہنہ ...... فاما ان لم یشترط ذلک فی البیع لکن رھنہ عندہ بعد البیع فان کان بعد لزوم البیع فالاولی صحتہ، لانہ یصح رھنہ عند غیرہ، فصح عندہ کغیرہ، ولانہ یصح رھنہ علی غیر ثمنہ فصح رھنہ علی ثمنہ، وان کان قبل لزوم البیع انبنی علی جواز التصرف فی المبیع، ففی کل موضع جاز التصرف فیہ جاز رھنہ، و مالا فلا، لانہ نوع تصرف، فاشبہ بیعہ"

(المغنی لابن قدامۃ، ج ۴ ص ۴۲۷، کتاب الرھن)

اگر بائع اور مشتری اس شرط پر بیع کا معاملہ کریں کہ مبیع بائع کے پاس ہی ثمن کے مقابلے میں بطور رہن کے رکھی جائے گی تو یہ بیع صحیح نہیں، علامہ ابن حامد رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی فرمایا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے، اس لئے کہ جب مبیع کو بائع کے پاس بطور رہن رکھنے کی شرط لگائی گئی اس وقت وہ مبیع مشتری کی ملکیت میں نہیں تھی، چاہے یہ شرط ہو کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد رہن کے طور پر رکھوائے گا۔ یا قبضہ سے پہلے رکھن رکھوانے کی شرط ہو...... مگر ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ رھن درست ہے...... لیکن اگر بیع کے اندر رہن کی شرط نہیں لگائی، مگر بیع مکمل ہونے کے بعد اسی بائع کے پاس مبیع کو رکھوایا۔ تو اس صورت میں اگر بیع لازم ہونے کے بعد وہ مبیع بطور رہن

رکھوائی ہے تو یہ صورت بطریق اولی درست ہے۔ اس لئے (کہ لزوم بیع کے بعد) جب مشتری یہ مبیع غیر بائع کے پاس رہن رکھوا سکتا ہے تو پھر بائع کے پاس رکھوانا بھی جائز ہے۔ اور جب غیر ثمن کی بدلہ میں اس مبیع کو رہن رکھوا سکتا ہے تو ثمن کے بدلہ میں بھی رہن رکھوانا صحیح ہے۔ اور اگر لزوم بیع سے پہلے مشتری نے وہ مبیع رہن رکھوائی ہے تو اس صورت میں یہ مسئلہ اس امر پر متفرع ہو گا کہ مشتری کے لئے مبیع میں تصرف جائز ہو گیا تھا یا نہیں؟ لہٰذا بیع کی جس صورت میں مشتری کو مبیع کے اندر تصرف کرنا جائز ہو گا، اس صورت میں اس مبیع کو رہن رکھوانا بھی جائز ہے اور جہاں مبیع میں تصرف جائز نہیں، وہاں رہن رکھوانا بھی جائز نہیں، کیونکہ رہن رکھوانا درحقیقت ایک قسم کا تصرف ہے، تو یہ رہن حکم میں بیع کے مشابہ ہو گا۔

الرھن السائل (Floating Mortgage)

اسلامی ممالک کے بہت سے قوانین میں رہن کی ایک اور صورت بھی ملتی ہے جس میں مرتھن شئی مرہون پر قبضہ نہیں کرتا، بلکہ وہ چیز راہن کے پاس ہی رہتی ہے۔ لیکن راھن مدیون جب اداء دین سے قاصر رہے تو پھر مرہون دائن راہن سے مطالبہ کر سکتا ہے۔ کہ وہ شئی مرہون کو بیچ کر دین ادا کرے، اس قسم کے رہن کو کبھی "الرھن السلوج" (Simple Mortgage) سادہ رہن کہا جاتا ہے۔ اور کبھی "الذمۃ السائلۃ" (Floating Charge) کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر مدیون اپنی گاڑی دائن کے پاس بطور رہن رکھوائے، لیکن گاڑی بدستور مدیون راہن کے قبضے میں رہے، اور وہ اس کو اپنی ضروریات میں استعمال بھی کرتا رہے۔ لیکن جب تک وہ راہن مرتھن دائن کا دین ادا نہیں کرے گا اس وقت تک وہ اس گاڑی کو آگے فروخت نہیں کر سکتا، اور اگر وہ راھن مرتھن کا دین ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو پھر مرتھن کو اس چیز کے بیچنے کا حق بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس بیچنے کے حق کو "الذمۃ السائلۃ" (Floating Charge) کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا دین پر تصدیق اور اعتماد کے حصول کے لئے اس قسم کا رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

فقہی اعتبار سے اس کے جواز میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر فقہاء نے رہن کے صحیح اور پورا ہونے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مرتھن اس شیئی مرہون پر قبضہ کرے اور اس شرط کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

"فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ"

(سورۃ البقرۃ: ۲۸۳)

جبکہ رہن کی مذکورہ صورت میں مرتھن شئی مرہون پر قبضہ نہیں کرتا۔ اس لئے یہ رہن درست نہ ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہاء نے اگرچہ شئی مرہون پر مرتھن کے قبضہ کی شرط لگائی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی ہے کہ راھن اس چیز کو بطور عاریت کے اس سے واپس لے سکتا ہے۔ اور اس سے منتفع ہو سکتا ہے، اور اس عاریت کی وجہ سے یہ رھن فاسد نہ ہوگا۔ بلکہ مرتھن کو بھی یہ حق حاصل رہے گا کہ جب چاہے شئی مرھون واپس راھن سے طلب کر لے، اور اگر وہ چیز راہن کے قبضہ میں ہلاک ہوگئی تو اسی کی چیز ہلاک ہو جائے گی، اور مرتھن کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ دین کی ادائیگی کی مدت گزرنے کے بعد اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے۔ اور اگر راہن مفلس ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے تو بھی شئی مرہون میں دین کی حد تک مرتھن کا حق ہوگا، دوسرے مدیون اس چیز میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"واذا اعار المرتهن الرهن الراهن ليخدمه او ليعمل له عملاً، فقبضه، خرج من ضمان المرتهن، لمنافاة بين يد العارية ويد الرهن، فان هلک فی يد الراهن، هلک بغير شئی، لفوات القبض المضمون، وللمرتهن ان يسترجعه الى يده، لان عقد الرهن باق، لا فی حكم الضمان فی الحال، الاترى انه لوهلک الراهن قبل ان يرده على المرتهن، كان

المرتهن احق به من سائر الغرماء، وهذا لان يد العارية ليست بلازمة، و الضمان ليس من لوازم الرهن علی کل حال "

اگر مرتھن وہ چیز خدمت اور استعمال کے لئے واپس راھن کو عاریت پر دے دے، اور راھن اس پر قبضہ بھی کر لے تو وہ چیز مرتھن کے ضمان سے نکل جائے گی، اس لئے کہ ید رھن اور ید عاریۃ، ان دونوں میں منافات ہے، اب اگر راھن کے پاس وہ چیز ہلاک ہو گئی تو بغیر کسی ضمان کے ہلاک ہوگی۔ اس لئے کہ اس چیز پر راھن کا قبضہ، مضمون قبضہ نہیں ہے۔ اور مرتھن کے لئے اس چیز کو دوبارہ اپنے قبضے میں لینا بھی جائز ہے، اس لئے کہ معاملہ رھن ابھی باقی ہے۔ البتہ فی الحال وہ رھن مضمون نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوبارہ اس چیز کے مرتھن کے قبضہ میں آنے سے پہلے اگر راھن کا انتقال ہو جائے تو مرتھن دوسرے غرماء کے مقابلے میں اس چیز کا زیادہ حق دار ہو گا۔ اور ضمان ہر حال میں رھن کے لوازم میں سے نہیں ہے۔"

(ہدایہ مع فتح القدیر، ۹: ۱۱۶- ورد المحتار، ٦: ٥١٠)

لیکن مندرجہ بالا صورت اس وقت ہے جب عقد رھن ایک مرتبہ مرتھن کے قبضہ کے بعد مکمل ہو چکا ہو، اور پھر مرتھن نے راھن کو وہ چیز عاریت پر دے دی ہو، لیکن اگر مرتھن نے اس چیز پر سرے سے قبضہ ہی نہیں کیا تھا۔ کیا اس صورت پر عاریت کا حکم درست ہو گا یا نہیں؟ فقہاء کی عبارات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس پر عاریت کا حکم لگانا درست نہیں، اس لئے کہ رھن کی صحت کے لئے قبضہ شرط ہے۔ اور یہاں قبضہ نہیں پایا گیا۔ لیکن میں موجودہ دور کے فقہاء کی خدمت میں غور و تامل کے لئے چند قابل غور امور پیش کرتا ہوں:

(۱) ـــ "رھن سائل" میں اگرچہ مرتھن شئی مرہون پر قبضہ تو نہیں کرتا۔ لیکن عام حالات میں وہ اس چیز کی ملکیتی دستاویزات پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس لئے اس بات

کا احتمال ہے کہ صرف ان دستاویزات پر قبضہ کرنے سے رھن تام ہو جائے گا۔ اور پھر وہ چیز بطور عاریت کے راھن کے قبضہ میں رہے گی۔

(۲) ـــــ جیسا کہ فقہاء نے ذکر فرمایا ہے کہ رھن پر مرتھن کے قبضہ کو شرط قرار دینے کی علت یہ ہے کہ مرتھن ضرورت کے وقت اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے، اور مذکورہ "رھن سائل" میں قانوناً ایگریمنٹ میں مذکور شرائط کی بنیاد پر مرتھن کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اس کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے۔ لہٰذا یہ بات محتمل ہے کہ رھن کی مذکورہ صورت میں حسی قبضہ شرط قرار نہ دیا جائے، اس لئے کہ ان شرائط کی بنیاد پر قبضہ کا جو مقصود ہے، وہ حاصل ہے۔

(۳) ـــــ رھن کا مقصد دین کی توثیق ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ دائن مدیون کی ملک کو اپنے قبضہ میں لے لے، اور اس کو اس کے اندر تصرف کرنے سے روک دے۔ جب تک کہ دین وصول نہ جائے۔ لیکن اگر دائن خود اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس سے کم پر راضی ہو جائے، اس طرح کہ عین مرھون راھن کے قبضہ میں رہنے دے۔ اور مرتھن کو صرف اس شئی مرھون کے ذریعہ اپنا دین وصول کرنے کا حق باقی رہ جائے تو بظاہر شرعاً اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔

(۴) ـــــ "رھن سائل" میں فریقین (راھن اور مرتھن) کو مصلحت اور فائدہ حاصل ہے۔ راھن کو جو مصلحت اور فائدہ حاصل ہے وہ تو ظاہر ہے کہ اس کو اپنی چیز کے انتفاع سے محروم نہیں ہونا پڑے گا۔ اور مرتھن کو یہ مصلحت اور فائدہ ہے کہ کسی ضمان کے لزوم کے بغیر اس کے پاس اپنا دین وصول کرنے کا حق محفوظ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے رھن کی مذکورہ صورت میں اگر راھن مفلس ہو جائے تو دوسرے غرماء کو ضرر اور نقصان پہنچے گا۔ اس لئے کہ مرتھن دوسرے غرماء کے مقابلے میں اس چیز کا زیادہ حق دار ہو گا۔ لیکن دوسرے غرماء کو پہنچنے والا یہ ضرر نہ تو اس وقت شرعاً معتبر ہے جب رھن پر مرتھن کا قبضہ ہو، اور نہ اس وقت معتبر ہے جب مرتھن نے رھن پر قبضہ کرنے کے بعد راھن کو بطور عاریت دیدیا ہو۔ جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مجرد اس ضرر سے رھن فاسد نہیں ہوتا۔

(۵) ـــــ موجودہ دور کی عالمی تجارات میں جبکہ بائع ایک شہر میں مقیم ہو، اور مشتری دوسرے شہر میں، اس وقت شئی مرھون پر قبضہ کرنا متعذر ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ شئی مرھون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بڑے اخراجات ہوتے ہیں، ایسی صورت میں دین کی توثیق کی "رھن سائل" کے علاوہ کوئی دوسری صورت میں نظر نہیں آتی۔

بہر حال! مندرجہ بالا پانچ ملاحظات کی بنیاد پر میری رائے کا رجحان "رھن سائل" کے جواز کی طرف ہوتا ہے، لیکن قطعی فیصلہ کے لئے علماء حضرات ان پر غور فرمالیں۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

تیسرے شخص کی طرف سے ضمانت اور گارنٹی

حصول قرض پر ضمانت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کوئی تیسرا شخص اداء دین کی ضمانت لے لے، اور یہ ذمہ داری قبول کرے کہ مدیون اصیل اگر دین ادا کرنے سے قاصر رہا تو میں دین ادا کروں گا۔ اس قسم کی ضمانت کو "کفالۃ" کہا جاتا ہے کتب فقہاء میں اس کے مفصل احکام مذکور ہیں۔ جنہیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کفالت کا ایک مسئلہ ہم یہاں بیان کریں گے۔ وہ یہ کہ آیا ضمانت اور گارنٹی پر کسی اجرت اور حق محنت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ موجودہ دور میں بینک اس وقت تک دین کی ادائیگی کی گارنٹی نہیں دیتا، جب تک (مکفول لہ) وہ شخص جس کی طرف سے بینک گارنٹی دے رہا ہے، بینک کو متعین اجرت ادا نہ کرے، اور یہ اجرت کبھی دین کی مقدار کے لحاظ سے متعین کی جاتی ہے۔ مثلاً تین فیصد یا چار فیصد اور کبھی کسی اور طرح سے متعین کی جاتی ہے۔

اسلامی فقہ میں یہ بات معروف ہے کہ قرض کی طرح گارنٹی بھی ایک عقد تبرع ہے، اور اس پر کسی طرح کی اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ لیکن دور حاضر کے بعض حضرات نے اجرت لینے کے جواز پر اس سے استدلال کیا ہے کہ چونکہ گارنٹی موجودہ دور کی تجارت کا ایک لازمی جز بن گیا ہے، یہی وجہ ہے اس کام کے لئے مستقل ادارے قائم ہو چکے ہیں، اور ان خدمات کی فراہمی کے لئے وہ ادارے بڑی بڑی رقمیں صرف کر رہے

ہیں، اس لئے اب یہ محض عقد تبرع نہیں رہا، بلکہ یہ ایک تجارتی معاملہ بن چکا ہے، جس کی تاجروں کو ضرورت رہتی ہے۔ خاص کر بین الاقوامی تجارت میں اس کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اور اجرت کے بغیر گارنٹی دینے والا کوئی میسر نہیں آتا۔ اس لئے گارنٹی پر اجرت دینا جائز ہے۔

لیکن یہ دلیل درست نہیں۔ اس لئے کہ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو پھر قرض پر بھی منافع کا مطالبہ جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ دلیل قرض پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے کیونکہ قرض بھی اصلاً محض ایک عقد تبرع ہے۔ لیکن موجودہ دور کی تجارت کی ایک ضرورت بن چکا ہے، اور قرض فراہم کرنے کے لئے مستقل ادارے اور بینک قائم ہیں، اور مطلوبہ مقدار میں تبرعاً قرض دینے والا کوئی شخص نہیں ملے گا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرض پر منافع لینا جائز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عقد تبرع ہونے کے اعتبار سے گارنٹی اور قرض میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح قرض پر نفع لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح گارنٹی پر اجرت لینا بھی جائز نہیں ہے، بلکہ گارنٹی پر اجرت کا مطالبہ کرنا قرض پر منافع کے مقابلے میں بطریق اولی جائز نہیں۔ اس لئے کہ کفالت (گارنٹی) میں مکفول لہ کی طرف سے دین کی ادائیگی کا محض التزام ہوتا ہے۔ اور جب وہ کفیل اس کی طرف سے دین ادا کر دیتا ہے اس وقت اصیل کے ذمہ کفیل کا قرض ہو جاتا ہے، گویا کہ کفیل صرف قرض دینے کا اپنے اوپر التزام کر رہا ہے۔ اور جب قرض دینے پر کسی منافع کا مطالبہ جائز نہیں ہے تو پھر صرف قرض دینے کے التزام پر منافع یا اجرت کا مطالبہ بطریق اولی جائز نہیں ہونا چاہئے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ زید نے عمرو سے سو ڈالر قرض طلب کئے۔ اب عمرو نے زید سے ضمانت کا مطالبہ کیا کہ کوئی ضامن لاؤ، اب خالد زید سے کہتا ہے کہ میں تمہارا قرض ابھی ادا کر دیتا ہوں۔ بشرطیکہ بعد میں تم مجھے ایک سو دس ڈالر ادا کرو گے۔ اور یہ دس ڈالر زائد اس خدمت کے عوض میں ہیں جو میں نے تمہاری طرف سے دین ادا کر کے کی ہے۔

پھر بکر زید کے پاس آتا ہے کہ میں عمرو کے لئے تمہاری طرف سے دین کا ضامن بنتا ہوں، بشرطیکہ تم مجھے دس ڈالر اس ضمانت کی اجرت کے طور پر ادا کرو، اور

جب تم دین ادا کرنے سے عاجز ہو جاؤ گے تو میں تمہاری طرف سے دین ادا کروں گا۔ اور تمہارے ذمے یہ سوڈالر قرض ہو جائے گا۔

اب جو لوگ کفالت پر اجرت لینے کے جواز کے قائل میں ان کے نزدیک بکر نے جس اجرت کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ جائز ہے، اور خلد نے جس اجرت کا مطالبہ کیا ہے وہ ناجائز ہے، جبکہ خلد بالفعل اپنا مال بھی لگا رہا ہے۔ دوسری طرف بکر نے اپنا کوئی مال نہیں لگایا۔ وہ تو صرف وقت مقررہ پر ادائیگی کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنا مال لگا رہا ہے، اس کے لئے اجرت کا مطالبہ کرنا حرام ہے، تو وہ شخص جو ادائیگی کی صرف ذمہ داری لے رہا ہے۔ اس کے لئے اجرت کا مطالبہ بطریق اولیٰ حرام ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کفیل اصیل کی طرف سے اداء دین پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں وہ اصیل سے صرف اتنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے جتنی رقم اس نے ادا کی ہے۔ اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ شرعاً سود ہونے کی بنا پر حرام ہے، تو پھر اس کفیل کے لئے کسی مال کا مطالبہ کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے جس نے کوئی ادائیگی نہیں کی۔ بلکہ اس نے صرف ادائیگی کی ذمہ داری لی ہے۔

بہر حال! اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ضمانت پر اجرت لینا کسی حال میں جائز نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کو بین الاقوامی تجارات اور لین دین میں اور کریڈٹ لیٹر (Letter of credit) جاری کرنے میں اس کی ضرورت رہتی ہے، تو پھر اس کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ بینک کے لئے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

(۱) لیٹر آف کریڈٹ (Letter of credit) جاری کرنے کے عمل میں بینک کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں۔ ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

(۲) امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلہ میں بینک جو خدمات بجا لاتا ہے اس پر بحیثیت وکیل، یا بحیثیت دلال، یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کیلئے جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لئے جائز نہیں۔

"بل آف ایکسچینج" کے ذریعہ دین کی توثیق

بعض اوقات دین کی توثیق اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک دستاویز لکھی جاتی ہے جس پر یہ تحریر ہوتا ہے کہ وہ (مشتری) بائع کی اتنی رقم کا اتنی مدت کے لئے مدیون ہے۔ اور وہ یہ رقم فلاں تاریخ پر بائع کو ادا کر دے گا۔ اور پھر اس پر مشتری اپنے دستخط کر دیتا ہے۔ آج کل اس دستاویز کو "بل آف ایکسچینج" (Bill of Exchange) کہا جاتا ہے اور جس تاریخ پر مشتری دین ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اس کو- MATURITY DATE کہا جاتا ہے۔ اور شرعاً کسی دستاویز کے ذریعہ دین کی توثیق جائز، بلکہ مندوب ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُم بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ (البقرة: ۲۸۲)

اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل کے لین دین میں یہ دستاویز قابل انتقال آلہ (Negotiable Instrument) بن چکا ہے۔ اور بائع جو اصل دائن اور حامل دستاویز ہے، وہ بعض اوقات یہ دستاویز تیسرے شخص کو اس پر تحریر شدہ دین کی مقدار سے کم پر بیچ دیتا ہے۔ تاکہ معین تاریخ سے پہلے اس کو رقم وصول ہو جائے، اس بیع کو بل کی کٹوتی (Discounting of the bill) کہا جاتا ہے، لہٰذا حامل دستاویز جب رقم وصول کرنا چاہتا ہے تو وہ تیسرے شخص کے پاس چلا جاتا ہے۔ اور وہ تیسرا شخص اکثر حالات میں بینک ہوتا ہے، اور وہاں جاکر وہ دستاویز اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور بینک اس کے انڈورس مینٹ (Endorsment) کے بعد وہ دستاویز قبول کر لیتا ہے۔ اور بینک دستاویز پر تحریر شدہ رقم میں سے فیصد کے اعتبار سے کٹوتی کر کے باقی رقم حامل کے حوالے کر دیتا ہے۔ ("انڈورس منٹ" کا طریقہ یہ ہے کہ حامل دستاویز اس دستاویز کی پشت پر دستخط کر دیتا ہے، جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ دستاویز کا حامل بنک کے حق میں اس رقم سے دست بردار ہو رہا ہے)

اور بل آف ایکسچینج کی کٹوتی مندرجہ بالا طریقہ پر کرنا شرعاً ناجائز ہے، اس لئے کہ یا

تو یہ دین کی بیع اس شخص کے ساتھ کی جارہی ہے جس پر دین نہیں۔ جس کو فقہاء کی اصطلاح میں "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" کہا جاتا ہے، یا یہ کرنسی کی بیع کرنسی سے ہو رہی ہے، جس میں کمی زیادتی اور ادھار دونوں ممنوعات پائی جارہی ہیں۔ اور احادیث ربا میں اس قسم کی بیع کا ناجائز ہونا منصوص ہے۔

لیکن مندرجہ بالا معاملے کو تھوڑی سی تبدیلی کے ذریعہ درست کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اولاً حامل دستاویز بینک کو مشتری (دستاویز جاری کرنے والا) سے دین وصول کرنے کا وکیل بنادے، اور اس وکالت پر یہ شخص بینک کو کچھ اجرت بھی دیدے، اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعہ یہ شخص (حامل دستاویز) دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بنک سے قرض لیلے، اور بینک کو اس کا اختیار دیدے کہ جب مشتری سے اس دستاویز کے عوض رقم وصول ہو جائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کرلے، اس طرح یہ دو معاملات علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے۔ پہلا معاملہ یہ کہ یہ شخص بینک کو قرض وصول کرنے کے لئے کسی معین اجرت پر اپنا وکیل بنا دے، اور دوسرا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود بینک سے قرض لے لے۔ اور بینک کو دستاویز کے بدلے وصول ہونی والی رقم سے اپنا قرض وصول کرنے کا اختیار دے دے۔ لہٰذا شرعی لحاظ سے یہ دونوں معاملات درست ہو جائیں گے، پہلا معاملہ تو اس لئے درست ہے کہ اس میں اجرت پر وکیل بنتا ہے۔ اور شرعاً اجرت پر وکیل بنانا جائز ہے اور دوسرا معاملہ اس لئے درست ہے کہ اس میں کسی زیادتی کی شرط کے بغیر قرض کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور شرعاً یہ بھی جائز ہے۔

تعجیل کے مقابلے میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا

آج کل بعض تجار "دیون موجلہ" (وہ دین جس کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی) میں یہ معاملہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کے کچھ حصے کو اس شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون باقی دین فی الحال ادا کر دے، مثلاً عمرو پر زید کے ایک ہزار روپیہ دین تھا۔ اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں سو روپے دین کے چھوڑ دیتا ہوں، بشرطیکہ تم نو سو روپے فی الحال ادا کر دو۔ فقہ کی اصطلاح میں اس معاملے کو "ضع و تعجل" (کچھ ساقط کرو اور جلدی حاصل کرلو) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کے حکم میں فقہا کا اختلاف ہے۔ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، تابعین میں سے حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ، احناف میں سے امام زفر بن ھذیل" اور شوافع میں سے شیخ ابو ثور" اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اور صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور تابعین میں سے امام محمد بن سیرین، اور حضرت حسن بصری، حضرت ابن مسیب، حضرت حکم بن عتیبہ اور امام شعبی رحمھم اللہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(دیکھئے: موطا امام ملک، ۱: ۶۰۶۔ مصنف عبدالرزاق، ۸: ۷۱ تا ۷۴)

اس سلسلے میں دو مرفوع حدیثیں آپس میں متعارض ہیں، اور سند کے اعتبار سے دونوں ضعیف ہیں۔

پہلی حدیث وہ ہے جو امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ:

" لما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم با خراج بنی النضیر من المدینۃ جاء ہ ناس منھم، فقا لوا : یا رسول اللہ! انک امرت با خرا جھم، ولھم علی الناس دیون لم تحل، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ضعوا و تعجلوا "

(السنن الکبری للبیہقی، ۶: ۲۸، کتاب البیوع ، باب من عجل لہ ادنی من حقہ)

"جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو مدینہ طیبہ سے نکل جانے کا حکم فرمایا تو کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا ہے، حالانکہ لوگوں پر ان کے دیون باقی ہیں، جن کی ادائیگی کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کچھ ساقط کر دو اور جلدی ادا کر دو

اس حدیث سے اس معاملہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث جو

امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے اس سے اگلے باب میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

" اسلفت رجلا مائة دینار، ثم خرج سهمی فی بعث بعثه رسول الله صلی الله علیه وسلم- فقلت له: عجل لی تسعین دیناراً، واحط عشرة دنانیر، فقال: نعم، فذکر ذلک لرسول الله صلی الله علیه وسلم، فقال: اکلت رباً یا مقداد و اطعمته۔"

میں نے ایک شخص کو ایک سو دینا بطور قرض دیئے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو وفد بھیج رہے تھے اس میں میرا نام بھی آگیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً دے دو، میں تمہیں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں، اس نے منظور کر لیا (اور میں نے اس سے نوے دینار لے لئے) پھر بعد میں کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔ (حوالہ بالا)

امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ سند کے اعتبار سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ فقہاء نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے۔ اس لئے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے، اسی طرح دین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اس میں داخل ہے۔

جہاں تک بنی نضیر کے واقعے کا تعلق ہے، تو وہ حجت نہیں بن سکتا۔ اولاً تو اس لئے کہ اس کی سند ضعیف ہے، ثانیاً اس لئے کہ اگر سنداً اس واقعہ کو درست بھی تسلیم کر لی جائے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ بنی نضیر کی جلاوطنی کا یہ واقعہ سن ۲ھ میں پیش آیا ہو، اس طرح یہ واقعہ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے کا ہو جائے گا۔

علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ذکر کرکے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"ولما اجلی بنی النضیر قالوا: ان لنا دیونا علی الناس، فقال: ضعوا و تعجلوا، و معلوم ان مثل هذه المعاملة لا یجوز بین المسلمین، فان من کان له علی غیره دین الی اجل، فوضع عنه بعضه بشرط ان یعجل بعضه، لم یجز- کره ذلک عمر، وزید بن ثابت و ابن عمر رضی الله عنهم"

(شرح السیر الکبیر للسرخسی، ۴: ۱۴۱۲- فقرہ نمبر ۲۷۳۸، پھر دوبارہ یہی مسئلہ صلاح الدین المنجد کی تحقیق کے ساتھ ج ۴: ۴۱۹۴ فقرہ نمبر ۲۹۲۱ پر ذکر کیا گیا ہے)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا تو وہ لوگ حضور کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: دین کا کچھ ساقط کر دو اور بقیہ دین فوراً لے لو، اور یہ بات طے ہے کہ مسلمان کے درمیان آپس میں یہ معاملہ ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادائیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو وہ دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ حصہ چھوڑ دے کہ مدیون دین فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اس معاملہ کو مکروہ کہا ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مسلمان بنی نضیر کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور اس وقت ان کے لئے بنی نضیر کے پورے مال پر قبضہ کر لینا بھی جائز تھا۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا بعض حصہ کم کر دیا تو یہ بطریق اولیٰ جائز ہو گا۔

بنی نضیر کے قصہ سے استدلال درست نہ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہود دوسرے لوگوں سے سود پر لین دین کا معاملہ کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس سے مراد وہ سود ہے جو راس المال سے زائد ہو، راس المال میں کمی کرنے کا حکم نہیں دیا، اس بات کی تائید واقدی کی عبارت سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس واقعہ کے بیان میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

" فا جلا هم (ای بنی النضیر) رسول الله صلی الله علیه وسلم من المدینه، و ولی اخرا جهم محمد بن مسلمة، فقالوا: ان لنا دیوناً علی الناس الی آجال، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: تعجلو او ضعوا - فکان لا بی رافع سلام بن الحقیق علی اسید بن حضیر عشرون و مائة دینار الی سنة فصالحه علی اخذ رأس ماله ثمانین دیناراً و ابطل ما فضل "!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا، اور حضرت محمد بن مسلمہ کو اس کا نگران مقرر فرمایا، اس وقت وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور آکر کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین واجب ہیں، جن کی ادائیگی مختلف مدتوں پر ہونی ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جلدی لے لو اور ساقط کر دو۔ اور ابی رافع سلام بن الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر کے ذمہ ایک سو بیس دینار دین تھے۔ جن کی واپسی سال گزر نے پر ہونی تھی۔ چنانچہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اصل راس المال جو اسی دینار تھے اس پر اس سے صلح کر لی اور جو زائد (سود کے) کے چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا۔ "

(مغازی الواقدی، ج ۱ ص ۳۷۴- علامہ واقدی لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی قینقاع کی جلا وطنی کے وقت بھی بعینہ یہی قصہ پیش آیا تھا- دیکھئے ص ۱۷۹ ج ۱)

یہ روایت اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط کیا گیا تھا، وہ سود ہی تھا۔ اصل راس المال کا حصہ نہیں تھا۔

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک "ضع و تعجل" (کچھ ساقط کرو اور فوراً دے دو) کا معاملہ حرام ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

" قال مالک: والامر المکر وہ الذی لا اختلاف فیه عندنا ان یکون للرجل علی الرجل الدین الی اجل، فیضع عنه الطالب ویعجله المطلوب ...... قال مالک: وذلک عند نا بمنزلة الذی یوخر دینه بعد محله عن غریمه ویزید الغریم فی حقه قال: فهذ الربا بعینه لا شک فیه "!

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ دائن (طالب) دین کا کچھ حصہ ساقط کر کے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے۔ امام مالک" فرماتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے نزدیک اس صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو اداء دین کی تاریخ کے بعد اور مہلت دے دے اور وہ مدیون اس مہلت کے بدلے دین میں کچھ اضافہ کر دے۔ فرماتے ہیں کہ یہ صریح ربا ہے، جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ "

(مؤطا امام محمد، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الربا فی الدین، ج ا ص ٦٠٦)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ موطا امام محمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

" قال محمد: وبهذا نا خذ- من وجب له دین

على انسان الى اجل، فسال ان يضع عنه ويعجل له مابقى، لم ينبغ ذلک، لا نه يعجل قليلاً بكثير دينا، فكانه يبيع قليلاً نقداً بكثير دينا- و ہو قول عمر بن الخطاب و زيد بن ثابت- و عبدالله بن عمر، وهو قول ابی حنيفة "

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس سے استدلال کرتے ہیں، اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ اس سے کہے کہ وہ اس کا کچھ دین ساقط کر دے گا، بشرطیکہ وہ بقیہ دین فوراً ادا کر دے تو یہ صورت درست نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں وہ دین کثیر کے بدلے میں دین قلیل کو جلد طلب کر رہا ہے، گویا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر رہا ہے، یہی قول حضرت عمر بن خطاب، حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ "

(موطا امام محمد، ج ا ص ۳۳۲، باب الرجل يبيع المتاع اوغيره نسيئة ثم يقول: انقدنى واضع عنک)

اور علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ "المغنی" میں فرماتے ہیں:

" اذا كان عليه دين موجل، فقال لغريمه: ضع عنى بعضه واعجل لک بقيته، لم يجز، كرهه زيد بن ثابت وابن عمر، والمقداد وسعيد بن المسيب، وسالم والحسن و حماد و الحكم و الشا فعی و مالک و الثوری و هشيم و ابن علية و اسحق و ابو حنيفه- و قال المقداد لرجلين فعلا ذالک: کلا كم قد آذن بحرب من الله و رسوله- وروی عن ابن عباس انه

لم يربه باساً- وروى ذلك عن النخعى و ابى ثور، لانه آخذ بعض حقه، تارك لبعضه، فجاز- كمالو كان الدين حالا، وقال الخرقى: لا باس ان يعجل المكاتب لسيده، و يضع عنه بعض كتابته، ولنا انه بيع الحلول فلم يجز، كمالو زاده الذى له الدين فقال: اعطيك عشرة دراهم و تعجل لى المائة التى عليك، فاما المكاتب فان معاملته مع سيده، و هو يبيع بعض ماله ببعض، فد خلت المسامحة فيه، ولا نه سبب العتق، فسومح فيه، بخلاف غيره-

اگر ایک شخص کا دوسرے پر دین موجل ہو، اب وہ شخص اپنے غریم (قرض خواہ) سے کہے کہ مجھ سے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دو، بقیہ دین میں فوراً ادا کر دوں گا، یہ صورت جائز نہیں، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر، حضرت مقداد، حضرت سعید بن المسیب، اور حضرت سالم، حضرت حسن، حضرت حماد، حضرت حکم، امام شافعی، امام مالک، امام ثوری اور حضرت ھشیم، حضرت ابن علیة، امام اسحاق اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس صورت کو ناپسند قرار دیا ہے، اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے ایسے دو شخصوں کو جنہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا، خطاب کرتے ہوئے فرمایا: تم دونوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس معاملے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور امام نخعی" امام ابو ثور سے بھی یہی منقول ہے، اس لئے کہ اس صورت میں قرض خواہ اپنے حق کا کچھ حصہ وصول کر رہا ہے، اور کچھ حصہ

معاف کر رہا ہے، لہٰذا یہ صورت جائز ہے، جیسا کہ دین حال (نقد) میں یہ صورت جائز ہوتی ہے۔ امام خرقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مکاتب غلام اپنے آقا کو بدل کتابت جلد ادا کر دے، اور اسکے بدلے میں آقا کچھ بدل کتابت معاف کر دے تو اس میں کوحرج نہیں۔ ہمارے نزدیک چونکہ مذکورہ صورت میں مدت کی بیع ہو رہی ہے، اسلئے جائز نہیں ہے، جیسے کہ اگر قرض خواہ دَین میں اضافہ کرتے ہوئے مقروض سے کہے کہ تم میرا سو درہم کا قرض فوراً ادا کر دو، میں تمہیں دس درہم دونگا (ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں) جہاں تک مکاتب غلام کا تعلق ہے، چونکہ اس کا معاملہ اپنے مولیٰ کے ساتھ ہو رہا ہے، اور گویا کہ مولیٰ اپنے ایک مال کو دوسرے مال کے عوض فروخت کر رہا ہے، اسلئے اسکے جواز میں مسامحت سے کام لیا گیا ہے، دوسرے اسلئے کہ یہ صورت اس غلام کی فوری آزادی کا سبب بھی بن رہی ہے، اسلئے بھی اس میں تسامح سے کام لیا گیا ہے، بخلاف مذکورہ صورت کے (اس میں یہ بات نہیں پائی جا رہی ہے)

(مغنی لابن قدامۃ مع الشرح الکبیر، ۴: ۱۷۴، ۱۷۵)

چنانچہ مندرجہ بالا نصوص فقہیہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے میں دَین کے کچھ حصے کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

فوری ادائیگی والے دَین میں ''ضع وتعجل'' کا اصول نافذ کرنا

لیکن ''ضع و تعجل'' کی ممانعت صرف دیون مؤجلہ میں ہے، جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے، جن کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا گیا ہے، بلکہ مدیون انکی ادائیگی میں کسی بھی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے تو ایسے دیون میں دَین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مدیون باقی دَین فوراً ادا کر دے، علماء حنفیہ نے اسکے جواز کی صراحت کی ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ ''وَمَنْ لهٗ علىٰ آخر الف درهم ، فقال اَدِّ الَيَّ غدًا مِنْها خمس ماة علىٰ اَنَّكَ برِئٌ مِن الفضلِ، فهُو برِیٌ'' یعنی ایک شخص کے دوسرے کے ذمے ایک ہزار درہم تھے، اس شخص نے مدیون سے کہا کہ کل تم مجھے پانچ سو درہم ادا کر دو، اور بقیہ دراہم سے تم بری ہو، تو اس کے نتیجے میں وہ مدیون پانچ سو درہم سے بری ہو جائے گا، یہی مذہب علماء مالکیہ کا ہے، چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ :

" قلت: ارایت لو ان لی علی رجل الف درهم قد حلت، فقلت: اشهدواان اعطانی مائة درهم عندرأس الشهر فالتسع مائة درهم له، و ان لم یعطنی فالالف کلها علیه، قال مالک: لا باس بهذا، وان اعطاه راس الهلال فهو کما قال، وتوضع عنه التسع مائة، فان لم یعطه راس الهلال فالمال کله علیه "

(المدونة الکبری۔ ج ۱۱ ص ۲۷، آخر کتاب الصلح)

میں نے ان سے کہا: اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ میرے ایک ہزار روپے دین ہوں، اور اس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اور میں اس سے کہوں کہ اگر تم نے مہینہ شروع ہونے پر سو درھم ادا کر دئے تو نو سو درھم تمہارے ہیں، اور اگر تم نے ادا نہیں کئے تو پھر پورے ایک ہزار درھم ادا کرنے پڑیں گے؟ اس کے جواب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگر وہ مہینے کے شروع میں سو درھم ادا کر دے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا، اور نو سو درھم اس سے ساقط ہو جائیں گے، اور اگر مہینے کے شروع میں اس نے سو درھم ادا نہیں کئے تو پھر پورا دین اس کے ذمہ رہے گا۔ "

پھر اس کے بعد اسی قسم کا ایک اور مسئلہ ذکر فرمایا کہ:

" قلت: ارایت لو ان لی علی رجل مائة دینار ومائة درهم حالة، فصالحته من ذالک علی مائة دینارودرهم نقداً، قال: لاباس بذلک "۔

(المدونة الکبری ج ۱۱، ص ۲۷، آخر کتاب الصلح)

میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کسی کے ذمہ میرے ایک سو دینار اور ایک سو درھم فی الحال واجب

ہوں، اور میں اس سے سو دینار اور ایک درہم نقد پر صلح کر لوں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام مالک نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" وما ذکرہ عن عیسٰی ھو فی نوازلہ من کتاب المدیان و التفلیس و نصہ: وسئل عن الرجل یقول لغریمہ وقد حل حقہ: ان عجلت لی کذا و کذا من حقی فبقیتہ عنک موضوع، ان عجلتہ لی نقداً الساعة، او الی اجل یسمیہ، فعجل لہ نقداً، او الی الا جل، الا الدرہم او النصف او اکثر من ذلک: ھل تکون الوضیعة لازمة؟ فقال: ما اری الوضیعہ تلزمہ، اذا لم یعجل لہ جمیع ذلک۔ واری الذی لہ الحق علی شرطہ، قال محمد بن رشد: ھذہ مسالة یتحصل فیھا اربعة اقوال : احدھما قولہ فی ھذہ الروایة، وھوقول اصبغ فی الواضحة ومثلہ فی آخر کتاب الصلح من المدونة ان الوضیعة لا تلزمہ، الا ان یعجل لہ جمیع ما شرط الی الاجل الذی سمی، وھو اصح الا قوال ۔ "

نوازل کی کتاب المدیان والتفلیس میں عیسٰی سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص اپنے ایسے غریم (مدیون) سے کہے جس کے دین کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو: اگر تم نے میرا اتنا حق ادا کر دیا تو بقیہ دین معاف ہے، یا تو تم ابھی نقد ادا کرو، یا فلاں وقت تک ادا کر دو، لہٰذا اگر مدیون فوراً ادا کر دے، یا اس کی مقرر کردہ مدت پر ادا کر دے مگر صرف ایک

درہم یا نصف درہم یا کچھ زیادہ باقی رہ جائے تو کیا اس صورت میں بھی دائن کے لئے اسقاط دین لازم ہوگا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ جواب میں فرمایا کہ میری رائے میں اگر مدیون نے پوری رقم ادا نہیں کی تو اس صورت میں اسقاط دین دائن پر لازم نہیں ہوگا، اور میری رائے میں اسقاط دین شرط ادا پر موقوف تھا۔ محمد بن رشد فرماتے ہیں کہ اس میں چار اقوال ہیں، اور ایک قول وہی ہے جو اس روایت میں ہے اور یہی اصبغ اور واضحہ کا قول ہے اور مدونۃ اکبریٰ کی کتاب الصلح کے آخر میں بھی یہی قول مذکور ہے، وہ یہ کہ دائن پر دین کی کمی کرنا اس وقت تک لازم نہیں ہوگا جب تک مدیون مقررہ مدت پر پورا دین ادا نہ کردے، اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے"

(تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطاب، ص:۲۳۱، دیکھئے فتح العلی المالک، ج:۱، ص:۲۸۹)

یہ عبارات اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ علماء حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں "ضع وتعجل" کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں، اس لئے کہ دوسرے علماء نے جہاں کہیں "ضع وتعجل" کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے، وہاں "دیون مؤجلہ" کی قید بھی لگائی ہے، جیسا کہ علامہ ابن قدامہؒ نے بھی اس مسئلہ کو "دین مؤجل" کے ساتھ مقید کیا ہے (دونوں کی عبارات پیچھے گزر چکی ہیں) اور یہ بات بداہت کے ساتھ ثابت ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں "ضع وتعجل" جائز ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نصف دین ساقط کرنے کے بارے میں حضرت کعب اور حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

" فقال اهل العلم فی التطبیق بینه و بین هذه الاثار ، ان الاثار فی المؤجل ، و هذا فی الحال ،

و فی کتاب الرحمة: اتفقوا علی ان من کان له دین علی انسان الی اجل، فلا یحل له ان یضع عنه بعض الدین قبل الاجل، لیعجل له الباقی .... علی انه لا باس اذا حل الا جل ان یاخذ البعض و یسقط البعض (المسوی علی المصفی، ۲: ۳۸۲)

اہل علم اس واقعہ کے درمیان اور ان آثار کے درمیان جو "ضع وتعجل" کے بارے میں مروی ہیں، اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار اور روایات کا تعلق دین موجل سے ہے، اور یہ واقعہ دین حال سے متعلق ہے، اور کتاب الرحمة میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت کے لئے دین واجب ہو تو دائن کو مدت کے آنے سے پہلے یہ کرنا جائز نہیں کہ دین کا کچھ حصہ معاف کر دے، تاکہ بقیہ دین فوراً وصول کر لے .... ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کر لے، اور باقی معاف کر دے۔"

دیون موجلہ اور دیون حالہ میں فرق اس لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی، اور "تاخیر" مدیون کا حق نہیں ہوتا، لہذا چونکہ اس میں "مدت" منتفی ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دین کا جو حصہ معاف کر دیا ہے، وہ "مدت" کے عوض معاف کیا ہے، لہٰذا اس میں ربا کے معنی نہیں پائے جاتے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرض حسن، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک موجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا (یعنی قرض میں مدت ذکر کرنے سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی) مالکیہ کے نزدیک قرض موجل ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وان اجل القرض لم یتاجل، وکان حالا، وکل دین حل اجله، لم یصر موجلاً بتاجیله، و بهذا قال الحارث العکلی و الاوزاعی و ابن المنذر

والشافعی، وقال مالک و اللیث: یتا جل الجمیع بالتا جیل ...... وقال ابو حنیفة ی القرض و بدل المتلف کقولنا"

قرض مؤجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا، بلکہ ادائیگی فوری واجب رہے گی، اور ہروہ دین جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اب وہ دین موجل کرنے سے موجل نہیں ہوگا، امام حارث العکلی، امام اوزاعی، ابن منذر اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اور امام ملک اور امام لیث فرماتے ہیں کہ ہر قرض موجل کرنے سے موجل ہو جاتا ہے، ...... قرض اور ہلاک شدہ چیز کے بدل کے بارے میں امام ابو حنیفہ" کا بھی وہی قول ہے جو ہمارا ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اختلف العلماء ی تاخیر الدین الی اجل، فقال ابو حنفة و اصحابه: سواء کان القرض الی اجل او غیر اجل، له ان یا خذه متی احب، و کذلک العارية و غیرها، لا نه عندهم من باب العدة و الهبة غیر مقبوضة، وهو قول الحارث العکلی و اصحابه و ابراهیم الحعی- و قال ابن ابی شیبة: وبه ناخذ وقال مالک و اصحابه: اذا اقرضه الی اجل ثم اراد ان یاخذ قبل الأجل لم یکن له ذلک"

(عمدۃ القاری للعینی، ٦: ٣٠، کتاب الاستقراض باب اذا اقرضه، الی اجل مسمی، مزید دیکھئے: احکام القرآن للجصاص - ج ۱ ص ۴۸۳، - آیۃ مداینہ کے تحت، فتح الباری ج ۵ ص ٦۱، مسوی مع المصفی، ج ۲ ص ۳۸۲- تنقیح الحامدیۃ، ج ۱ ص ۲۷۷- شرح المجلۃ للاتاسی، ج ۱ ص ۴۳۹)

کسی مدت تک دین کو موخر کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ" اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ قرض چاہے موجل ہو یا غیر موجل، دونوں صورتوں میں

دائن اپنا قرض جب چاہے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، اور عاریت وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ یہ مدت ان کے نزدیک وعدہ اور ھبہ غیر مقبوض کی طرح ہے۔ حارث عکلی اور ان کے اصحاب اور امام ابراہیم نخعی کا بھی یہی قول ہے، اور ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں۔ امام مالکؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ جب کسی مدت تک کے لئے قرض دے دیا تو پھر دائن اس مدت سے پہلے قرض واپس لینا چاہے تو واپس نہیں لے سکتا۔"

لہٰذا جو فقہاء اور علماء یہ کہتے ہیں کہ "قرض موجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا" ان کے نزدیک "ضع و تعجل" کا اصول قرض میں جائز ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک قرض دیون حالہ میں سے ہے، اور "دیون حالہ" میں ضع و تعجل" کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور اس کی اصل حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا حضرت عبداللہ بن ابی حداد اسلمی رضی اللہ عنہ پر دین تھا۔ جب حضرت کعبؓ کی حضرت عبداللہؓ سے ملاقات ہوئی تو ان کو پکڑ لیا، اور دونوں قرض پر زور زور سے گفتگو کرنے لگے۔ اتنے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ یہ دونوں قرض پر جھگڑ رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے کعب! اور پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ فرمایا گویا کہ آپؐ فرمارہے ہیں کہ نصف قرض لے لو، اور نصف چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے نصف لے لیا، اور نصف چھوڑ دیا۔

(امام بخاری نے صحیح بخاری میں اس کو کئی جگہ روایت کیا ہے، اور یہ الفاظ "کتاب الخصومات، باب فی الملازمۃ، حدیث نمبر ۲۴۲۴" میں مذکور ہیں)

تعجیل کی صورت میں بلا شرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا

دین موجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ "چھوڑنا" تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کر دے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو، تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں۔ چنانچہ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے "ضع و تعجل" کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں، ان کو اسی پر محمول کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ومن اجاز من السلف اذا قال: عجل لی
اوضع عنک، فجائز ان یکون اجازوہ اذالم یجعلہ
شرطافیہ، و ذلک بان یضع عنہ بغیر شرط، و
یعجل الاخر الباقی بغیر شرط "

(احکام القرآن للجصاص - ج ا ص ۴۶۷، آیت ربا)

جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ "تم میرا دین جلد ادا کر دو، میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا" بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے، اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کر دے۔

مرابحہ موجلہ میں "ضع و تعجل" کا اصول

دین موجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا "بیع مساومہ" میں تو ناجائز ہے، یعنی ان بیوع کے اندر تو ناجائز ہے جس میں بائع اپنا منافع بیان کئے بغیر اپنی چیز مشتری کے ہاتھ بھاؤ تاؤ کے ذریعہ فروخت کرتا ہے، ہاں! اگر "بیع مرابحہ" ہو، جس میں بائع مدت کے مقابلے میں ثمن میں جو زیادتی کر رہا ہے، اس کو صراحۃً بیان کر دے، اس کے بارے میں متاخرین احناف کا فتوی یہ ہے کہ اس صورت میں اگر مدیون مدت مقررہ سے پہلے اپنا دین ادا کر دے، یا مدت مقررہ آنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے، تو اس صورت میں بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا، اور مقررہ مدت تک جتنے ایام باقی ہیں، اس کے مقابل کا ثمن چھوڑنا ہوگا، چنانچہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ درمختار میں فرماتے ہیں:

" قضی المدیون الدین الموجل قبل
الحلول اومات، فحل بموتہ، فاخذ من
ترکتہ لا یاخذ من المرابحۃ التی جرت
بینھما الا بقدر ما مضی من الایام،
و ھو جواب المتاخرین، قنیۃ، وبہ افتی

المرحوم ابو السعود آفندی مفتی الروم ، وعلله بالرفق للجانبین"۔

اگر مدیون نے اپنا دین موجل وقت سے پہلے ادا کر دیا، یا ادائیگی کا وقت آنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی موت کی وجہ سے دین کی فوری ادائیگی ہونے لگے، اب دائن جب اپنا دین اسکے ترکہ سے وصول کرے گا تو اس صورت میں دائن مرابحۃ صرف اتنا دین وصول کر سکتا ہے جتنا گزشتہ ایام کے مقابل میں ہو، اور یہ متاخرین (حنفیہ) کا مسلک ہے۔ قنیہ۔ مفتی روم علامہ ابو السعود آفندی رحمۃ اللہ نے بھی اس پر فتویٰ دیا، اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس میں جانبین کی رعایت موجود ہے۔

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

" قوله لا یاخذ من المرابحة" صورته: اشتری شیئاً بعشرة نقداً، وباعه لآخر بعشرین الی اجل، هو عشرة اشهر، فاذا قضاه بعد تمام خمسة (اشهر) اومات بعد ها، یاخذ خمسة، ویترک خمسة -"

علامہ حصکفیؒ کا یہ قول "لا یاخذ من المرابحۃ" اس کی صورت یہ ہو گی کہ ایک شخص نے ایک چیز دس درھم کی نقد خریدی، اور پھر وہی چیز دوسرے کو دس ماہ ادھار پر بیس روپے میں بیچ دی، اب اگر مشتری ثانی پانچ ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرے، یا مشتری کا پانچ ماہ بعد انتقال ہو جائے تو بائع صرف پانچ روپے منافع کے لے گا، اور پانچ روپے چھوڑ دے گا۔"

(ردالمحتار، لابن عابدین، ۶:۷۵۷۔ آخر الحظر والاباحۃ، قبیل کتاب الفرائض، یہی مسئلہ کتاب البیوع میں "فصل فی القرض" سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ حانوتی، علامہ نجم الدین اور علامہ ابو السعود نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ دیکھئے شامی ۵ :۱۶۰ اور یہی مسئلہ "حاشیۃ الطحاطاوی علی الدر" میں بھی مذکور ہے۔ دیکھئے ۳ :۱۰۴ و ۴ :۳۶۳)

بعینہ یہی مسئلہ "تنقیح الفتاوی الحامدیۃ" میں بھی مذکور ہے، البتہ اس میں مندرجہ ذیل اضافہ بھی ہے:

" سئل فیما اذا کان لزید بذمة عمرو مبلغ دین معلوم، فرابحه علیه الی سنة، ثم بعد ذلک بعشرین یوماً مات عمرو المدیون، فحل الدین، و دفعه الورثة لزید، فهل یوخذ من المرابحة شئی اولا ؟

الجواب: جواب المتاخرین انه لا یوخذ من المرابحة التی جرت المبایعة علیها بینهما الا بقدر ما مضی من الایام، قیل للعلامة نجم الدین : اتفتی به؟ قال: نعم کذا فی الانقروی و التنویر، و افتی به علامة الروم مولانا ابو السعود "

اس مسئلے کے بارے میں سوال کیا گیا کہ زید کا عمرو کے ذمہ دین معلوم تھا، اب زید نے عمرو کے ساتھ ایک سال کے لئے مرابحہ کر لیا، اور پھر بیس روز کے بعد عمرو مدیون کا انتقال ہو گیا (اور انتقال کی وجہ سے) دین کی فوری ادائیگی کی گئی، اور عمرو کے ورثاء نے زید کا دین ادا کر دیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا زید کے لئے مرابحۃ نفع وصول کرنا جائز ہے؟

متاخرین علماء کا جواب یہ ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان ایک سال کے لئے جو مرابحہ کا معاملہ ہوا تھا، اس میں سے صرف بیس روز کے بقدر نفع لے سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ علامہ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا کہ کیا آپ اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ کذا فی الانقروی والتنویر اور روم کے علامہ ابو السعود رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ، ۱: ۲۹۳، شرح المجلۃ للاتاسی، ۲: ۴۵۰)

متاخرین حنفیہ کے اس فتویٰ نے "بیع مساومہ" اور اس "بیع مرابحہ" کے درمیان فرق کر دیا ہے جس میں بائع مدت کے سبب سے زیادتی ثمن کی صراحت کر دے، لہٰذا "ضع و تعجل" کا قانون بیوع مساومہ میں تو جاری کرنا جائز نہیں، البتہ بیوع مرابحہ میں جائز ہے۔ شاید متاخرین حنیفہ کے اس فتوے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگرچہ مدت مستقل طور پر قابل عوض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، لیکن ضمناً اور تبعاً اس کے مقابلے میں کچھ ثمن مقرر کرنا جائز ہے، جیسے گائے کے حمل کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں، لیکن اس حمل کی وجہ سے اس گائے کی قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے، چنانچہ کئی چیزوں کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات تبعاً ان کا عوض لینا جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا جب "مرابحہ" کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس میں نفع کی مقدار بیان کر دی جائے، تو پھر اس میں مدت کے مقابلے میں نفع کی زیادتی کرنا بھی جائز ہے۔ اور اس صورت میں "مدت" بمنزلہ "وصف مبیع" کے ہو جائے گی، لہٰذا اگر اداء دین کا وقت آنے سے پہلے دین ادا کر دیا جائے، یا مدیون کی موت واقع ہونے کی وجہ سے ادائیگی فوری ہو جائے تو ان دونوں صورتوں میں چونکہ وہ وصف ناقص ہو جائے گا، اس لئے اس کے بقدر ثمن میں بھی کمی ہو جائے گی۔ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی علت بیان کرتے ہوئے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

> " ووجه ان الربح فی مقابلة الاجل، لأن الاجل و ان لم یکن مالاً، و لا یقابله شئی من الثمن، لکن اعتبروه مالاً فی المرابحة، اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن، فلو اخذ کل الثمن قبل الحلول کان اخذه بلا عوض "۔
>
> "اور اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی کہ نفع "مدت" کے مقابلے ہے، اس لئے کہ "مدت" اگرچہ مال نہیں ہے، اور اس کے مقابلے میں ثمن نہیں ہوتا ہے، لیکن بیع مرابحہ میں جب زیادتی ثمن کے مقابلے میں "مدت" ذکر کی جائے تو اس صورت میں اس

"مدت" کو مال کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وقت ادائیگی سے
پہلے اگر کسی نے سارا ثمن لے لیا تو یہ منافع بلا عوض ہو گا۔"

(ردالمحتار ۶: ۷۵۷۔ قبیل کتاب الفرائض)

اگر چہ مندرجہ بالا توجیہ اور علت کچھ وزن رکھتی ہے، لیکن "ضع و تعجل" کے قانون کے عدم جواز پر جو دلائل ہم نے پیچھے ذکر کئے ہیں، وہ ہر دین موجل پر ثابت ہوتے ہیں، ان میں "بیع مساومہ" اور بیع مرابحہ" کا کوئی فرق نہیں، اور اگر مندرجہ بالا فتوے پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں "بیع مرابحۃ" اور "قسطوں پر بیع" کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہو جائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہو گی یا زیادہ۔ لہٰذا میری رائے میں "بیع بالتقسیط" اور "بیع مرابحہ" کے وہ معاملات جو اسلامی بنکوں میں رائج ہیں، ان میں مندرجہ بالا فتوے پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔

کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے سے مہلت ختم کر دینا

"قسطوں پر بیع" کے بعض ایگریمنٹ میں اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ اگر مشتری مقررہ وقت پر کوئی قسط ادا نہ کر سکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی اقساط بھی فوراً ادا کرنا ضروری ہو گا، اور بائع کے لئے فی الحال تمام اقساط کا مطالبہ کرنا جائز ہو گا، سوال یہ ہے کہ "بیع بالتقسیط" میں ایسی شرط لگانا جائز ہے؟

یہ مسئلہ بعض کتب حنفیہ میں مذکور ہے، چنانچہ خلاصہ الفتاوی میں ہے کہ:

" ولو قال: کلما دخل نجم ولم تود، فالمال حال صح و یصیر المال حالاً

اور اگر (بائع نے) کہا کہ اگر قسط ادا کرنے کا وقت آیا، اور تم نے قسط ادا نہیں کی تو اس صورت میں وہ مال فوراً واجب الاداء ہو گا، یہ شرط صحیح ہے۔ اور وہ مال فی الفور واجب الاداء ہو گا۔"

(خلاصہ الفتاوی ۳/۵۴ کتاب البیوع)

یہ مسئلہ فتاوی بزازیہ میں بھی غلط تعبیر کے ساتھ مذکور ہے، جس کا مفہوم درست نہیں، اسی لئے علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع الفصولین کے حاشیے میں اس پر

تنبیہ فرمائی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فی البزازية :وابطال الاجل يبطل بالشرط الفاسد، بان قال :كلما حل نجم ولم تود، فالمال حال، صح، وصار حالا اھ و عبارة الخلاصة :وابطال الاجل يبطل بالشرط الفاسد، ولو قال :كلما دخل نجم ولم تود فالمال حال، صح، والمال يصير حالاً۔ فجعلها مسئلتين، وهو الصواب والله اعلم۔ ذكره الغذی،

بزازیہ میں ہے کہ مدت کا ابطال شرط فاسد سے باطل ہو جاتا ہے، مثلاً بائع یہ کہے کہ :اگر قسط ادا کرنے کا وقت آیا، اور تم نے اس وقت قسط ادا نہیں کی، تو اس صورت میں تمام دین فی الفور واجب الادا ہو گا، تو یہ معاملہ درست ہے، اور دین فی الفور واجب الادا ہو گا۔ اور خلاصہ الفتاویٰ کی عبارت یہ ہے کہ "مدت کا ابطال شرط فاسد سے باطل ہو جاتا ہے، اور بائع یہ کہے کہ اگر قسط کی ادائیگی کے وقت تم نے قسط ادا نہ کی تو اس صورت میں تمام دین فی الفور واجب الاداء ہو گا، تو یہ شرط درست ہے، لہٰذا وقت پر قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں دین فی الفور واجب الاداء ہو گا، پس انہوں نے یہ دو مسئلے الگ الگ کر دیئے، اور یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ الفوائد الخیریہ علی جامع الفصولین، جلد ۲ صفحہ ۴، طبع مصر

مندرجہ بالا فقہی نصوص اس شرط کے جواز پر دلالت کرتی ہیں، لہٰذا اس صورت میں اگر مشتری نے اداء قسط کے مقررہ وقت پر قسط ادا نہ کی تو بائع کے لئے یہ جائز ہو گا کہ وہ بقیہ اقساط کا فی الفور مطالبہ کرے، لیکن جیسا کہ ہم نے بعض متاخرین حنفیہ کا مسلک مرابحہ کے بارے میں ذکر کر چکے ہیں۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر بیع مرابحہ میں یہ صورت پیش آئے تو بائع صرف ماضی کے بقدر نفع کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس سے زیادہ نفع کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جو شخص اس فتوے پر عمل کرے، اس کو چاہئے کہ

اس بیع بالتقسیط کے مسئلہ میں بھی اسی پر عمل کرے۔ البتہ جو شخص اس فتوے پر عمل نہ کرے، جیسا کہ ہمارے نزدیک بھی مناسب یہی ہے۔ اس کے لئے پورے ثمن کی فی الفور ادائیگی ہی کا فتویٰ دیا جائے گا۔

اداء دین میں ٹال مٹول کے نقصان کا عوض مقرر کرنا

"بیع موجل" سے متعلق ایک مسئلہ اور بھی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض اوقات مدیون مشتری وقت مقررہ پر دین کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، یا دین کی کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، اس وقت یہ دیکھا جائے گا کہ مشتری کس وجہ سے دین کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے؟ اگر تنگ دستی کی وجہ سے وقت پر دین ادا نہیں کر رہا ہے تو اس کا حکم تو قرآن کریم کے اندر واضح ہے کہ:

"وَاِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ"

(سورۃ البقرۃ: ۲۸۰)

"یعنی اگر مدیون تنگ دست ہو تو اس کو فراخی ہونے تک مہلت دو" لہٰذا اس صورت میں دائن پر واجب ہے کہ وہ مدیون کو مہلت دے، تاوقتیکہ اس کی تنگی دور نہ ہو جائے، اور اس کے لئے دین کی ادائیگی ممکن ہو، اور دوسری طرف دائن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ (مدیون کے وقت پر ادا نہ کرنے پر) اپنے دین میں اضافہ کر دے۔ اس لئے کہ اس اضافے کے سود میں ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

البتہ بعض اوقات مدیون دین کی ادائیگی میں تاخیر تنگ دستی کی وجہ سے نہیں کرتا، بلکہ اس کا اصل مقصد دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ہوتا ہے، اور پھر آج کل جب کہ لوگوں میں دینی اور اخلاقی اقدار کی اہمیت بھی کم ہو گئی ہے، اور دیانتداری اور امانت داری کا معیار بھی گر چکا ہے، اس لئے اکثر لوگ وقت پر دین کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دائن کو بعض اوقات ضرر عظیم لاحق ہو جاتا ہے، اور آج ہر دائن دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی پریشانی کا شکار ہے، اور اس ٹال مٹول کے نتیجے میں اسلامی بنکوں کو جو نقصان لاحق ہو رہا ہے، وہ تو بیان سے باہر ہے، کیونکہ دوسری طرف سودی نظام میں تو سود کے اضافے کا خوف مدیون کو وقت پر دین کی ادائیگی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس لئے کہ اگر مدیون وقت پر دین کرنے میں کوتاہی کرے گا تو خود بخود اس دین پر

دگنا سود ہو جائے گا...... لیکن اسلامی بنک وقت پر دین کی ادائیگی نہ کرنے یا اس میں ٹال مٹول کی وجہ سے شرعاً اس دین میں نہ تو اضافہ کر سکتے ہیں، اور نہ اس پر سود لگا سکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دائن اس طریقے سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور وہ جب تک چاہتا ہے دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہتا ہے، جب کہ آج کے تجارتی نظام میں اور خاص کر موجود بینکنگ نظام میں وقت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا دائنین کو اور خاص کر اسلامی بنکوں کو دین کی ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول کے نقصان سے بچانے کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں اگر تمام اسلامی بنک ایک شرعی طریقے کو اختیار کرنے پر اتفاق کریں تو اس صورت میں اس مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ دین کی ادائیگی میں تاخیر کرنے والے کو آئندہ مستقبل میں بنک کی سہولتوں سے محروم کر دیا جائے، اور اس کا نام بلیک لسٹ میں شامل کر دیا جائے۔ اور کوئی بنک اس کے ساتھ کسی قسم کے لین دین کا معاملہ نہ کرے۔ یہ سزا دینا شرعاً جائز ہے۔ اور حقیقت میں یہ طریقہ وقت پر دین کی ادائیگی کرنے کے لئے بہت اچھا دباؤ ہے، جو سود کے مقابلے میں زیادہ موثر ہے، اسی طرح ایسے ٹال مٹول کرنے والے پر شرعاً تعزیر کی سزا بھی جاری کی جا سکتی ہے، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مطل الغنی ظلم"

مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے

(صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، حدیث نمبر ۲۴۰۰)

اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ:

"لی الواجد یحل عقوبته وعرضه"

مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور اس کی آبرو کو حلال کر دیتا ہے۔

(ذکره البخاری فی الاستقراض تعلیقاً واخرجه ابو داؤد والنسائی واحمد واسحاق فی مسندیهما عن عمرو بن الشرید رضی الله عنه واسناده حسن، کما صرح به الحافظ ابن حجر فی فتح الباری ۵:۶۲)

لیکن پہلا طریقہ یعنی اس کا نام بلیک لسٹ کرنا اس وقت کارگر اور موثر ہو سکتا ہے جب تمام بنک یہ طریقہ اختیار کرنے پر اتفاق کر لیں۔ اور جہاں تک دوسرے طریقے کا

تعلق ہے، یعنی اس پر کوئی سزا یا تعزیر جاری کرنا، اس کے لئے ایسی عدالتوں کی ضرورت ہے جو تیزی سے فوری فیصلے نمٹائیں۔

اور چونکہ آج تمام اسلامی ممالک میں یہ دونوں صورتیں عملاً موجود نہیں ہیں، اس لئے فی الوقت اس مشکل کا یہ بنیادی حل اسلامی بنکوں کے اختیار سے باہر ہے۔

اسی وجہ سے موجودہ دور کے بعض علماء نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ دین کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جو واقعی نقصان لاحق ہو، اس نقصان کی تلافی کے لئے مدیون پر کوئی جرمانہ لازم کر دیا جائے، چنانچہ بعض اسلامی بنکوں نے یہ صورت اختیار کی ہے کہ اس مدت کے دوران اتنی مقدار کی رقم پر جتنا منافع بنک نے اپنے اکاونٹ ہولڈروں کے درمیان تقسیم کیا ہے، اس کے بقدر مالی معاوضہ اس ٹال مٹول کرنے والے مدیون سے وصول کیا جائے، اور اگر اس مدت کے دوران بنک کو سرمایہ کاری کے ذریعہ کوئی منافع حاصل نہ ہو، تو اس صورت میں بنک بھی اپنے مدیون سے دین کی ادائیگی میں تاخیر کرنے کا کوئی مالی معاوضہ وصول نہیں کرے گا، ہاں، اگر اس مدت کے دوران سرمایہ کے ذریعہ نفع حاصل ہوا ہے تو وہ بنک بھی اسی حساب سے مدیون سے مالی معاوضہ وصول کرے گا۔

مالی معاوضہ کو جائز قرار دینے والے علماء نے "مالی معاوضہ" اور "سود" کے درمیان مندرجہ ذیل فرق بیان کئے ہیں:

۱ ...... "سود" ہر حال میں مدیون پر لازم ہوتا ہے، چاہے وہ تنگ دست ہو یا مالدار ہو۔ جب کہ "مالی معاوضہ" صرف اس صورت میں لازم ہوگا، جب مدیون مالدار ہو۔ لیکن مدیون اگر تنگ دست ہو، تو اس صورت میں کوئی مالی معاوضہ اس پر لازم نہیں ہوگا۔

۲ ...... "سود" دین کی ادائیگی میں تاخیر کے بعد فوراً لازم ہو جاتا ہے، چاہے وہ ایک دن کی تاخیر کیوں نہ ہو، جب کہ "مالی معاوضہ" اس وقت لازم کیا جاتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ واقعتہً ٹال مٹول کر رہا ہے، چنانچہ بعض اسلامی بنکوں کا یہ اصول ہے کہ وہ ایسے مدیون کو دین ادا کرنے کی مدت گزر جانے کے بعد اور مالی معاوضہ لازم کرنے سے پہلے چار نوٹس بھیجتے ہیں، اور ہر نوٹس کے درمیان ایک ہفتے کا وقفہ ہوتا ہے، اس طرح "مالی معاوضہ" ادا دین کی مدت گزرنے کے ایک ماہ بعد لازم کیا جاتا ہے۔

۳ ...... "سود" مدیون پر ہر حال میں لازم ہو جاتا ہے۔ جب کہ "مالی معاوضہ" اس وقت لازم کیا جاتا ہے جب اس مدت تاخیر کے دوران بنک کی سرمایہ کاری میں منافع حاصل ہوا ہو، لیکن اگر اس مدت کے دوران بنک کو اپنی سرمایہ کاری کے اندر منافع نہیں ہوا، تو اس صورت میں بنک مدیون سے بھی کوئی "مالی معاوضہ" وصول نہیں کرے گا۔

۴ ...... دین کے معاہدے کے وقت سے ہی طرفین کو "سود" کی شرح کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس دین پر اتنی شرح سود ہوگی، لیکن مرابحہ یا اجارہ کے اگریمنٹ کرتے وقت طرفین کو "مالی معاوضہ" کی شرح معلوم نہیں ہوتی، بلکہ اداء دین میں تاخیر کی مدت کے دوران بنک کو سرمایہ کاری کے ذریعہ جو منافع حاصل ہوگا۔ اس منافع کی بنیاد پر "مالی معاوضہ" کی شرح متعین ہوگی۔

چنانچہ "سود" اور "مالی معاوضہ" کے درمیان مندرجہ بالا چار فرق کی بنیاد پر ان علماء معاصرین کا یہ کہنا ہے کہ اس "مالی معاوضہ" کا "سود" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ "مالی معاوضہ" کے جواز پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا ضرر ولا ضرار"

نہ نقصان اٹھاؤ، نہ نقصان پہنچاؤ

(المقاصد الحسنۃ للسخاوی، ص ۴۶۸، وحسنہ النووی، والمناوی فی فیض القدیر ۶: ۴۳۲، لتعدد طرقہ)

دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"لی الواجد یحل عقوبتہ وعرضہ"

مالدار شخص کی ٹال مٹول اس کی سزا اور اس کی آبرو کو حلال کر دیتی ہے۔

چنانچہ "مالی معاوضہ" کے جواز کے قائلین مندرجہ بالا احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ "مالی معاوضہ" ایک طرح کا مالی جرمانہ ہے، جو دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے کے ذمہ ڈالا جاتا ہے۔

لیکن "مالی معاوضہ" کے جواز کے بارے میں علماء معاصرین کے رائے فکری اور عملی دونوں لحاظ سے محل نظر ہے، فکری کے لحاظ سے تو اس طرح کہ دین کی ادائیگی میں ٹال

مٹول کا مسئلہ یہ آج کے دور کا کوئی نیا پیدا ہونے والا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ہر زمانے اور ہر شہر میں تاجر اس مشکل سے دوچار ہوتے چلے آرہے ہیں۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور بعد کے زمانوں میں بھی یہ مسئلہ درپیش رہا۔ لیکن احادیث اور آثار میں کہیں یہ بات ثابت نہیں ہے کہ اس مشکل کے حل کے لئے ٹال مٹول کرنے والے پر کوئی مالی معاوضہ لازم کیا گیا ہو۔ اور پوری چودہ سو سال کی تاریخ میں مجھے یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ کسی مفتی یا قاضی نے ٹال مٹول کرنے والے پر "مالی معاوضہ" کا حکم دیا ہو، بلکہ مجھے فقہاء کی کتابوں میں "مالی معاوضہ" کے خلاف ہی حکم نظر آیا، جیسا کہ انشاء اللہ میں آگے ذکر کروں گا۔

جہاں تک حدیث "لاضرر ولاضرار" سے استدلال کا تعلق ہے تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس حدیث سے اتنی تو بات ثابت ہے کہ دوسرے کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔ اور اس نقصان کو جائز طریقے سے دفعہ کرنا بھی جائز ہے، لیکن ہر نقصان "مالی معاوضہ" کے ذریعہ ہی دور کیا جائے؟ یہ اس حدیث سے ثابت نہیں، اور نہ صراحتاً اور نہ اشارۃً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ٹال مٹول کے نقصان کو مالی معاوضہ کے ذریعہ دور کیا جائے۔ اگر اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی کہ ٹال مٹول کے نقصان کو "مالی معاوضہ" لازم کر کے دور کیا جائے تو اس صورت میں "مالی معاوضہ" لازم کر دینا واجب اور ضروری ہو جاتا۔ اور پھر قاضی کے ذمہ یہ ضروری ہوتا کہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے، اور ہر مفتی اس کے مطابق فتویٰ دے، لیکن پوری تاریخ میں کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ کسی قاضی نے "مالی معاوضہ" لازم کر دینے کا فیصلہ دیا ہو، یا کسی مفتی نے فتویٰ جاری کیا ہو۔ جب کہ ہر دور اور ہر جگہ دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کے واقعات بکثرت پیش آتے رہے ہیں۔

پھر دائن کا وہ نقصان جو شرعاً تسلیم شدہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس کو وقت مقرر پر دین کی رقم ادا نہ کی جائے، اور اس نقصان کے ازالے کا طریقہ یہ ہے کہ دین کی رقم جو اس کا حق ہے، اس کو ادا کر دی جائے۔ اور دین سے زائد رقم میں اس کا کوئی حق نہیں ہے، اس لئے کہ وہ تو سود ہے، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ دین سے زائد رقم میں دائن کا کوئی حق نہیں ہے، تو پھر اس زائد رقم کے نہ ملنے سے اس کا کوئی ایسا نقصان نہیں ہو رہا

ہے، جو شرعاً بھی معتبر ہو، لہٰذا دین کی رقم وصول ہو جانے سے اس کا نقصان ختم ہو جائے گا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اگر دائن کو یہ رقم مقررہ وقت پر مل جاتی تو وہ اس رقم کو تجارت میں لگا کر نفع حاصل کرتا، چونکہ وقت پر یہ رقم اس کو نہیں ملی۔ جس کی وجہ سے وہ نفع حاصل نہ کر سکا۔ اور اب اس نفع کے عدم حصول کا جو شخص سبب بنا ہے، یعنی مدیون، وہ اس نقصان کی تلافی کرے۔

یہ بات ان دو اصولوں پر مبنی ہے کہ ایک متوقع نفع کو حقیقی نفع شمار کیا جائے، اور یہ کہ نوٹ بذات خود روزانہ کچھ نہ کچھ نفع لانے والے ہیں، ان دونوں اصولوں کی سودی نظام میں تو گنجائش ہے، لیکن اسلامی فقہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور اگر یہ اصول اسلام میں بھی معتبر ہوتے تو ان کو غاصب اور چور پر ضرور منطبق کیا جاتا، لیکن اسلامی فقہ کی پوری تاریخ میں اس کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی نے کرنسی نوٹ چوری کرنے والے یا ان کو غصب کرنے والے پر اس بنیاد پر "مالی معاوضہ" لازم کر دیا ہو کہ غاصب نے مدت غصب کے دوران شئی مغصوب سے جو نفع متوقع تھا، اس نے اس کو ضائع کر دیا، شریعت اسلامیہ نے چور پر قطع ید کی سزا تو لازم کی ہے، لیکن مسروقہ کرنسی کی بنیاد پر اس پر "مالی معاوضہ" لازم نہیں کیا۔ لہٰذا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شریعت اسلامیہ نے "مالی معاوضہ" کسی بھی صورت میں لازم قرار نہیں دیا۔

اور "مدیون مماطل" چور، اور غاصب سے زیادہ تعدی نہیں کر رہا ہے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ اس پر چوری اور غصب کے احکام جاری کر دیئے جائیں۔ اور شریعت اسلامیہ نے چور اور غاصب پر محض نوٹوں کی بناء پر کوئی مالی معاوضہ لازم نہیں کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ چور اور غاصب نے مالک کا نقصان کیا ہے، اور ان دونوں نے مالک کو اصل مال سے ہی محروم نہیں کیا، بلکہ اس متوقع منافع سے بھی محروم کر دیا جو مالک اس مدت کے دوران حاصل کرتا، لیکن شریعت اسلامیہ نے اس نقصان کے ازالے کے لئے صرف مالک کو اس کا مال واپس کرنے اور نقصان کرنے والے پر جسمانی سزا اور اس کو بے عزت کرنے کی سزا جاری کرنے کا حکم دیا، اس سے معلوم ہوا کہ متوقع منافع کا فوت ہو جانا کوئی ایسا نقصان نہیں ہے، جس پر شرعاً کوئی معاوضہ لازم ہو جائے۔

"مالی معاوضہ" کے جواز پر بعض علماء معاصرین نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اکثر فقہاء کے نزدیک منافع مغصوبہ غاصب کے ذمہ مضمون ہوتے ہیں، اور حنفیہ کے نزدیک بھی جو اشیاء کرایہ پر دینے کے لئے تیار کی گئی ہوں، ان کے غصب کی صورت میں ان کا ضمان واجب ہوتا ہے۔

لیکن علماء معاصرین کا یہ استدلال "نقود مغصوبہ" میں درست نہیں، اس لئے کہ جو فقہاء منافع مغصوبہ کے ضمان کے قائل ہیں، ان کے نزدیک بھی اعیان مغصوبہ کے منافع کا ضمان واجب ہوتا ہے "نقود مغصوبہ" کے منافع کا ضمان واجب نہیں، حتی کہ اگر غاصب "نقود مغصوبہ" سے تجارت کر کے نفع اٹھائے تو شوافع کے صحیح قول کے مطابق وہ نفع مغصوب منہ کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

(دیکھیے: المہذب للشیرازی جلد ۱، صفحہ ۳۷)

اور یہ تو اس نفع کی بات ہو رہی ہے جو حقیقتاً وجود میں آچکا ہے، لیکن جو منافع ابھی سرے سے وجود ہی میں نہیں آیا، بلکہ صرف وجود میں آنے کی توقع تھی۔ اس کو واپس کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "مدیون مماطل" کے بارے میں یہ تو فرمادیا کہ " لی الواجد یحل عقوبتہ وعرضہ

کہ مالدار شخص کی ٹال مٹول اس کی سزا اور آبرو کو حلال کر دیتی ہے۔

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ " یحل مالہ " یعنی اس کا مال حلال ہے۔ اس کے علاوہ فقہاء کے درمیان "تعزیر بالمال" کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں تو اختلاف رہا ہے۔ لیکن فقہاء اور محدثین میں سے کسی نے لفظ "عقوبت" کی تفسیر "مالی معاوضہ" سے نہیں کی۔ اور اگر کوئی فقیہ "عقوبت" کی تفسیر "مالی معاوضہ" سے کرتا بھی تو یہ مالی معاوضہ لازم کرنے کا اختیار عدالت کو ہوتا۔ خود دائن کو یہ اختیار نہ ملتا، لہٰذا آج دائن جس مالی معاوضہ کا مطالبہ عدالت کے کسی فیصلے کے بغیر خود کر رہا ہے، یہ سزا اس پر کیسے منطبق ہو سکتی ہے؟ اور اگر شرعی سزاؤں کے نفاذ کا اختیار عدالت کے بجائے لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو اس سے لاقانونیت اور بدنظمی پیدا ہوگی، جس کا نہ عقلاً کوئی جواز ہے اور نہ شرعاً۔

بہر حال! مندرجہ بالا تفصیل تو "مالی معاوضہ" کے فکری پہلو کے اعتبار سے تھی۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے۔ اوپر ہم نے "مالی معاوضہ" کے جواز کے قائلین کی طرف سے "سود" اور "مالی معاوضہ" میں جو فرق ذکر کئے ہیں، ان میں عملی تطبیق کے لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو یہ محض نظریاتی فرق معلوم ہوتا ہے۔ عملی تطبیق کے وقت ان دونوں کے اندر کوئی فرق ظاہر نہیں ہوگا، البتہ صرف ایسی نادر عملی صورتوں میں شاید فرق نکلے جنہیں شرعی حکم کا مدار نہیں بنایا جاسکتا۔

جواز کے قائلین نے پہلا فرق یہ بیان کیا تھا کہ اگر مدیون تنگ دستی کی وجہ سے وقت پر دین ادا نہیں کر رہا ہے تو اس سے "مالی معاوضہ" کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن مدیون کی تنگ دستی اور مالداری ایسی چیز ہے، جس پر بنک کو ہر معاملے میں علیحدہ علیحدہ تحقیق کرنا دشوار ہے، اس لئے کہ ہر مدیون یہی دعویٰ کرے گا کہ وہ تنگ دست ہے، اور بینک کے پاس اس کے دعویٰ کے خلاف اس کو مالدار ثابت کرنے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہوگی کہ وہ اس مدیون کا مقدمہ عدالت میں پیش کرے، اور جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان مقدمہ بازی چلے گی ...... اور دوسری طرف اسلامی بینکوں میں آج کل عملی طور پر جو طریقہ رائج ہے۔ اور جس کو مالی معاوضہ کے اصول میں بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ دین کے اگریمنٹ میں اس بات کی تصریح ہوتی ہے کہ مدیون اس وقت تک مالدار ہی تصور کیا جائے گا جب تک قانوناً اس پر افلاس کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ اور یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ قانوناً کسی شخص کے بارے میں افلاس کا حکم لگانا بالکل آخری حد ہے، جو نادر الوجود ہے، جب کہ دوسری طرف یہ بات بالکل یقینی ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن پر قانوناً افلاس کا حکم تو نہیں لگا ہوگا۔ لیکن حقیقتاً وہ تنگ دست ہوں گے۔

ان حالات میں یہ کہنا کیسے ممکن ہوگا کہ یہ اسلامی بنک مدیون کی تنگ دستی کی صورت میں مالی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرینگے؟

اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو سود پر قرض دے، اور پھر قرض لینے والا مفلس ہو جائے تو اس صورت میں قرض دینے والا صرف اس قدر رقم اس سے وصول کریگا جتنی رقم وہ اس کے پاس پائیگا۔ لہٰذا افلاس والی صورت میں

سود کے مطالبے اور مالی معاوضہ کے مطالبے میں کوئی فرق نہیں رہیگا۔

جواز کے قائلین نے جو دوسرا فرق بیان کیا تھا کہ اداء دین کی مدت گزرنے کے ایک ماہ بعد مالی معاوضہ واجب کیا جاتا ہے، اگر بنکوں میں یہ صورت عملاً نافذ اور جاری ہو تب تو یہ فرق درست ہے۔ لیکن عام طور پر بنکوں میں عملاً ایک ماہ کی مدت مقرر نہیں ہے۔

جہاں تک جواز کے قائلین کے بیان کردہ تیسرے اور چوتھے فرق کا تعلق ہے۔ وہ یہ کہ دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی مدت کے دوران حاصل ہونے والے منافع کے تناسب سے مالی معاوضہ لازم کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ مالی معاوضہ کی مقدار معلوم اور متعین نہیں ہوتی۔ کیونکہ حاصل ہونے والے منافع پر اس کا دارومدار ہوتا ہے۔ "سود" اور "مالی معاوضہ" کے درمیان بیان کردہ یہ دونوں فرق نظریاتی اعتبار سے تو درست ہیں۔ لیکن جب عملی اعتبار سے ان دونوں فرق میں غور کرینگے تو یہ نظر آئیگا کہ اسلامی بنکوں کی زیادہ تر کارروائیاں "مرابحہ مؤجلہ" کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں، اور ان کارروائیوں کے نتیجے میں ہونے والے نفع اور اس کی مقدار بنک اور ایجنٹ دونوں کو پہلے سے معلوم ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ عملاً "مالی معاوضہ" کی مقدار فریقین کو پہلے سے معلوم ہوتی ہے۔

پھر اکثر اسلامی بنک ہر چھ ماہ بعد اپنے منافع کا حساب لگاتے ہیں، اس لئے یقینی طور پر منافع کی مقدار چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد معلوم ہوگی۔ لہٰذا اگر "ٹال مٹول" کی مدت اس چھ ماہ کی عرصہ کے درمیان میں ہوگی تو اس صورت میں اس عرصہ کا یقینی منافع کیسے معلوم ہوگا؟ اور جو ڈیپازیٹرز چھ ماہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے بنک سے اپنی رقم نکلوا لیتے ہیں۔ ان کو جو منافع دیا جاتا ہے، وہ علی الحساب دیا جاتا ہے، اور پھر مدت پوری ہونے کے بعد علی الحساب دیے ہوئے منافع کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ "مماطل" سے جس مالی معاوضہ کا مطالبہ مدت کے دوران کیا جائیگا، کیا اس کا تصفیہ بھی مدت پوری ہونے پر موقوف رہیگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوگا، تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے یہ "مالی معاوضہ" مماطلت کی مدت کے دوران ہونے والے واقعی منافع کے موافق ہوگا؟

اس کے علاوہ اس مسئلہ میں ایک دوسری بات بھی قابل تامل ہے، وہ یہ کہ سرمایہ کاری کے اکاؤنٹ میں نفع کا تناسب مرابحہ اور اجارہ کے معاملات کے مقابلے میں ہمیشہ کم ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر مدیون خیانت کرنا چاہے تو اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ دین کی رقم ہمیشہ ایسی تجارتی اسکیموں میں لگائے، جس میں بنک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ کے مقابلے میں زیادہ منافع حاصل ہوتا ہو، اور اب وہ مدیون مالی معاوضہ کی معمولی رقم تو بنک کو ادا کر دیگا، اور باقی منافع خود رکھ لیگا اور اس طرح جب تک چلیگا، دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہیگا، اور مالی معاوضہ بھی ادا کرتا رہیگا۔ لہٰذا پھر وہی خرابی واپس لوٹ آئیگی، جس کی وجہ سے بنک مالی معاوضہ لازم کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

لہٰذا میرے نزدیک مماطلین پر مالی معاوضہ لازم کرنے کی تجویز نہ تو شرعی اعتبار سے مماطلت کی پریشانی کا حل پیش کرتی ہے، اور نہ عملی اعتبار سے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مشکل اور پریشانی کا کیا حل ہونا چاہئے؟

اس مشکل کا صحیح حل وہی ہے جو ہم نے اس بحث کے شروع میں ذکر کر دیا، لیکن یہ اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب تمام بنک شرعی بنیادوں پر عمل شروع کر دیں۔ لیکن موجود حالات میں جبکہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے سودی بنکوں کے مقابلے میں اسلامی بنکوں کی تعداد بہت معمولی ہے۔ اس حل پر عمل مفید نہیں ہو سکتا، البتہ وقتی اور عارضی طور پر اسلامی بنک ایک دوسرے حل کو اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ حل یہ ہے کہ مرابحہ اور اجارہ کے اگریمنٹ پر مدیون سے دستخط لیتے وقت اس پر یہ لازم کر دیا جائے کہ مالی واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی اور تاخیر کرنے کی صورت میں وہ دین کے تناسب سے ایک معین رقم خیراتی کاموں میں بطور تبرع صرف کریگا، اور یہ رقم وہ پہلے بنک کو ادا کریگا، اور پھر بنک اس کی طرف سے نیابتاً خیراتی کاموں میں لگا دیگا۔ لہٰذا دین کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں مدیون وہ رقم بنک کو ادا کریگا، البتہ یہ رقم نہ تو بنک کی ملکیت میں ہوگی، اور نہ ہی اس کی آمدنی اور منافع کا حصہ ہوگی، بلکہ خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لئے بطور امانت اس کے پاس محفوظ رہے گی۔

مندرجہ بالا تجویز مدیون کو وقت پر اداء دین کرنے کے لئے بہترین دباؤ ہے، اور امید ہے کہ یہ تجویز مماطلت کے سدباب کے لئے مالی معاوضہ کی تجویز کے مقابلے میں

زیادہ موثر ہوگی، اس لئے کہ بطور تبرع جو رقم مدیون پر لازم کی جائے گی، اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بنک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں مدت مماطلت کے دوران حاصل ہونے والے منافع کے برابر ہو۔ بلکہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ رقم دین کے متناسب حصے کی بنیاد پر لازم کر دی جائے، تاکہ مدیون وقت پر دین ادا کرنے کا پابند ہو جائے، اور بطور تبرع مدیون سے لی جانے والی اس رقم کو سود نہیں کہا جائے گا، کیونکہ وہ رقم بنک کی ملکیت نہیں ہوگی، بلکہ اس کو خیراتی کاموں میں صرف کیا جائے گا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی رقم کے لئے خاص فنڈ قائم کر دیا جائے، جو بنک کی ملکیت نہ ہو، بلکہ خیراتی کاموں کے لئے وقف ہو، اور بنک اس فنڈ کی سرپرستی کرے، اور اس فنڈ کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ اس میں سے ضرورت مند لوگوں کو قرض حسنہ کے طور پر رقم دی جائے۔

مماطل بذریعہ معاہدہ اپنے ذمہ اس تبرع کا جو التزام کرے گا، جہاں تک اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو شرعی اعتبار سے یہ التزام تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے، اور بعض فقہاء مالکیہ کے نزدیک اس تبرع کی ادائیگی قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، مالکیہ کے نزدیک اس مسئلہ کی اصل یہ ہے کہ اگر یہ التزام علی وجہ القربۃ ہو تو بالاتفاق اس کی ادائیگی ملتزم پر قضاء لازم ہو جاتی ہے، اور اگر یہ التزام علی وجہ القربۃ نہ ہو، بلکہ علی وجہ الیمین ہو، اور ایسے امر پر اسے معلق کیا جائے جس سے ملتزم کو خود رکنا مقصود ہو تو اس صورت میں قضاءً اس کے لازم ہونے میں اختلاف ہے، بعض فقہا کے نزدیک قضاءً لازم نہیں ہوگی، جبکہ دوسرے فقہانے اس سے اختلاف کیا ہے، ان کے نزدیک قضاءً لازم ہے، چنانچہ علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تحریر الکلام فی مسائل الالتزام میں تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"اما اذا التزم المدعی علیه للمدعی، انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا، فله علیه کذا و کذا، فهذا لا یختلف فی بطلانه، لا نه صریح الربا، و سواء کان الشی الملتزم به من جنس الدین او غیره، وسواء کان شیئاً معیناً او منفعة ......

واما اذا التزم انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا، فعلیه کذا و کذا لفلان، او صدقة لمساکین، فهذا ہو محل الخلاف المعقود له هذا الباب، فالمشهور انه لا یقضی به، کما تقدم، وقال ابن دینار: یقضی به" (تحریر الکلام للحطاب: ۱۷۶)

اگر مدعی علیہ نے مدعی کے لئے یہ التزام کر لیا کہ اگر اس نے اس کا دین فلاں وقت تک ادا نہیں کیا تو اس کے ذمے فلاں چیز مدعی کے لئے لازم ہو جائے گی، صریح ربا ہونے کی وجہ سے یہ صورت باطل اور ناجائز ہے، جو چیز اپنے اوپر لازم کی ہے، چاہے وہ دین کی جنس میں سے ہو، یا نہ ہو، اور چاہے وہ کوئی معین چیز ہو، یا منفعت ہو.....

اور اگر مدعی علیہ نے یہ التزام کر لیا کہ اگر فلاں وقت پر تمہارا دین ادا نہیں کیا تو اس صورت میں فلاں چیز فلاں شخص کو دینی لازم ہوگی، یا فلاں چیز مساکین کو صدقہ دوں گا، یہ صورت فقہاء کے نزدیک محل اختلاف ہے، اور مشہور قول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی قضاء لازم نہیں ہوگی، البتہ علامہ ابن دینار فرماتے ہیں کہ یہ قضاء بھی لازم ہے۔

اس سے پہلے ایک جگہ علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرما چکے ہیں:

وحکایة الباجی الاتفاق علی عدم اللزوم فیما اذا کان علی وجه الیمین غیر مسلمة، لوجود الخلاف فی ذلک، کما تقدم، و کما سیاتی

(حوالہ سابقہ ص ۱۶۹)

علامہ باجیؒ نے اگرچہ اتفاق نقل کیا کہ علی وجہ الیمین التزام کی صورت میں قضاء لزوم نہیں ہوتا، مگر یہ نقل قابل تسلیم نہیں، کیوں کہ قضاء لازم ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف موجود ہے۔ جیسا کہ پیچھے گزر چکا، اور آئندہ آنے والا ہے۔

علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ قضاء عدم لزوم کی قول کو ترجیح دی ہے، لیکن اس بحث کے آخر میں وہ خود فرماتے ہیں کہ:

" اذا قلنا ان الالتزام المعلق علی فعل الملتزم الذی علی وجہ الیمین، لا یقضی بہ علی المشھور، فاعلم ان ھذا مالم یحکم بصحتہ الالتزام المذکور حاکم، و اما اذا حکم حاکم بصحتہ، اوبلزومہ، فقد تعین الحکم بہ، لان الحاکم اذا حکم بقول، لزم العمل بہ، وارتفع الخلاف "

(حوالہ سابقہ ص ۱۸۵)

اگر چہ ہم نے یہ کہا کہ ملتزم جب اپنے کسی فعل پر علی وجہ الیمین التزام کر لے، تو قضاءً وہ لازم نہیں، جیسا کہ مشہور مذہب یہی ہے، مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اس وقت تک ہے جب تک کسی حاکم نے التزام مذکورہ کے بارے میں فیصلہ جاری نہ کیا ہو، لیکن اگر کسی حاکم نے اس التزام کی صحیح ہونے، یا اس کے لازم ہونے پر فیصلہ دے دیا ہو، تو اس صورت میں وہ التزام درست ہو جائے گا، اس لئے کہ جب حاکم کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس پر عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے، اور اختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال: یہ حکم بعض فقہاء مالکیہ کے قول کے مطابق ہے، جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے ان کے نزدیک "وعدہ" قضاء لازم نہیں ہوتا، لیکن فقہاء حنفیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ بعض وعدے ایسے ہیں، جو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہو جاتے ہیں (دیکھئے: ردالمحتار۔ بحث البیع بالوفاء) للذا اس قول کی بنیاد پر میرے خیال میں ٹال مٹول کے سدباب کے لئے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مجوزہ تبرع کو لازم قرار دینے کی گنجائش ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم:

مدیون کی موت سے قرض کی ادائیگی کی مہلت کا خاتمہ

اس بحث کا سب سے آخری مسئلہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی کی مدت کے

دوران مدیون کاانتقال ہو جائے، توکیاوہ دین پہلے کی طرح موجل ہی رہے گا، یا وہ دین فی الفور واجب الاداء ہو گا؟ اور دائن کو مدیون کے ورثاء سے اس دین کی ادائیگی کا فی الفور مطالبے کا حق حاصل ہو جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دین موجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے، اور امام احمد بن حنبل ؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے، لیکن حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں، اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلا دیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الادا نہیں ہو گا، بلکہ وہ پہلے کی طرح موجل ہی رہے گا، چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فاما ان مات، و علیه دیون موجلة، فهل تحل بالموت؟ فیه روایتان: احد اهما، لا تحل اذا وثق الورثة، وهو قول ابن سیرین و عبید الله بن الحسن و اسحاق و ابی عبید- وقال طاؤس و ابو بکر بن محمد و الزهری و سعید بن ابراهیم: الدین الی اجله- و حکی ذلک عن الحسن و الروایة الاخری: انه یحل بالموت، و به قال الشعبی النخعی و سوار و مالک و الثوری و الشافعی و اصحاب الرأی- لانه لا یخلو اما ان یبقی ی ذمة المیت، او الورثة، او یتعلق بالمال، لایجوز بقاء ه فی ذمة المیت، لخرابها و تعذر مطالبته بها، و لاذمة الورثه لانـهم لم یلتزمـوها، ولا رضی صاحب الدین بذممم، وهی مختلفة متباینة، ولا یجوز تعلیقه علی الاعیان و تاجلیه،

لا نه ضرر بالميت، وصاحب الدين ولا نفع للورثة فيه، اما الميت فلان النبی صلی الله عليه وسلم قال: "الميت مرتهن بدينه حتی يقضی عنه" و اما صاحبه فيتا خر حقه، و قد تتلف العين فيسقط حقه، و اما الورثة فانهم لا ينتفعون بالاعيان و لا يتصرفون فيها، و ان حصلت لهم منفعة فلا يسقط حظ الميت وصاحب الدين لمنفعة لهم-

(المغنی لابن قدامة، ۴:۴۸٦، کتاب المفلس)

اگر کسی کا انتقال ہو جائے، اور اس پر دین موجل ہو تو کیا موت کی وجہ سے وہ دین فوری واجب الاداء ہو جائے گا؟ اس بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ اگر ورثہ اس دین کی توثیق کر دیں تو پھر فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، یہ قول علامہ ابن سیرین، عبید اللہ بن حسن، اسحاق، اور ابو عبید کا ہے، البتہ علامہ طاؤس، ابو بکر بن محمد، علامہ زھری، سعید بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ وہ دین اپنی مدت تک موجل ہی رہے گا، اور امام حسن سے بھی یہی قول منقول ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہو جائے گا، یہ قول امام شافعی، امام نخعی، سوار، امام مالک، امام ثوری، امام شافعی، اور اصحاب الرای سے منقول ہے، اس لئے کہ اس دین کے بارے میں تین صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہوگی، یا تو وہ دین میت کے ذمے باقی رہے گا، یا ورثاء کے ذمہ ہوگا، یا میت کے مال سے معلق ہوگا، جہاں تک میت کے ذمہ کا تعلق ہے تو میت کے ذمے دین کا باقی رہنا جائز نہیں، اس لئے کہ موت کی وجہ سے اس کا ذمہ فاسد ہو چکا

ہے، اور اس سے مطالبہ کرنا بھی متعذر ہے، اور جہاں تک ورثاء کے ذمہ داری کا تعلق ہے تو ورثا کی ذمہ داری بھی درست نہیں، اس لئے کہ نہ تو ورثاء نے اس دین کی ذمہ داری قبول کی ہے، اور نہ ہی دائن ان ورثاء کی ذمہ داری پر رضامند ہے، جب کہ ان ورثاء کی ذمہ داریاں مختلف اور متفاوت بھی ہیں، جہاں تک میت کے مال سے معلق کرنے کا تعلق ہے، تو میت کے مال سے معلق کر کے اس کو موجل کرنا بھی جائز نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں میت کا بھی ضرر ہے، اور صاحب دین کا بھی ضرر ہے، اور ورثاء کا کوئی نفع اس میں نہیں ہے، میت کا ضرر تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "المیت مرتھن بدینہ حتی یقضی عنہ" یعنی میت اپنے دین کی وجہ سے معلق رہتا ہے، جب تک اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے، اور صاحب قرض کا ضرر یہ ہے کہ اس کا حق اور زیادہ موخر ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات وہ مال ضائع ہو جاتا ہے، اس صورت میں صاحب حق کا حق بالکل ساقط ہو جائے گا۔ جہاں تک ورثاء کے نفع کا تعلق ہے تو ورثا عام طور پر میت کے اشیاء سے براہ راست منتفع نہیں ہوتے، اور نہ ان میں تصرف کرتے ہیں، اور اگر ان ورثا کو نفع حاصل بھی ہو جائے تب بھی ان کی وجہ سے میت کا حق اور صاحب دین کا حق اس مال سے ساقط نہ ہو گا۔

اس عبارت کے بعد علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کے قول کو ترجیح دی ہے جن کے نزدیک وہ دین موجل ہی رہے گا، بشرطیکہ ورثاء کسی ضامن یا رہن کے ذریعہ اس دین کی توثیق کر دیں، اور اس کے دلائل بھی ذکر فرمائے ہیں۔

جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے، اگرچہ جمہور فقہاء کے مذہب کے مطابق ان کا اصل مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہو گا، لیکن متاخرین حنفیہ نے اس قول پر فتویٰ نہیں دیا ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر

چکے ہیں کہ مرابحہ موجلہ میں ثمن کا کچھ حصہ "مدت" کے مقابلے میں ہوتا ہے، لہٰذا اگر مشتری (میت) کے ترکہ میں سے پورا ثمن فی الفور اداء کرنے کا حکم لگا دیں تو اس صورت میں ثمن کا جتنا حصہ مدت کے مقابلے میں تھا، وہ بلا عوض ہونا لازم آ جائے گا، اور اس میں مشتری کا نقصان ہے، کیونکہ مشتری اس ثمن پر اس شرط پر راضی ہوا تھا کہ وہ ثمن فی الفور اداء نہیں کرے گا، بلکہ ایک متفقہ مدت گزرنے کے بعد ادا کریگا، اسی وجہ سے متاخرین حنفیہ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر یہ صورت پیش آ جائے تو اس صورت میں مشتری ثمن مرابحہ میں سے صرف اسی قدر ادا کرے گا، جو گزشتہ مدت کے مقابل ہوگا، اور پیچھے ہم "مرابحہ موجلہ" کی بحث میں درمختار کی یہ عبارت نقل کر چکے ہیں کہ:

قضی المدیون الدین الموجل قبل الحلول اومات، فحل بموته، فاخذ من ترکته، لا یاخذ من المرابحة التی جرت بینهما الا بقدر مامضی من الایام، و هو جواب المتاخرین - قنیة- و به افتی المرحوم ابو السعود افندی مفتی الروم، و علله بالرفق للجانبین"

یعنی اگر مدیون نے اپنا دین موجل وقت سے پہلے ادا کر دیا، یا مشتری کا انتقال ہو گیا، اور اس کے انتقال کی وجہ سے وہ دین فی الحال واجب الاداء ہو گیا، چنانچہ وہ اس کے ترکہ سے وصول کیا گیا، تو ان دونوں صورتوں میں بائع اور مشتری کے درمیان جو ثمن طے ہوا تھا، اس میں سے صرف اسی قدر لے گا، جو گزشتہ مدت کے مقابلے میں ہو گا، یہی متاخرین حنفیہ کا جواب ہے۔ قنیة۔ روم کے مفتی ابو السعود آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس قول میں جانبین (بائع اور مشتری) کی رعایت موجود ہے۔

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"صورته اشتری شیئاً بعشرة نقداً، وباعه

لا خر بعشرین الی اجل، ھو عشرہ اشھر، فاذا
قضاہ بعد تمام خمسة، او مات بعد ھا،
یاخذ خمسة و یترک خمسة "

اس مسئلے کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک چیز دس روپے میں نقد پر خریدی، اور پھر وہ چیز تیسرے شخص کو دس ماہ کے ادھار پر بیس روپے میں بیچ دی، لہٰذا اس صورت میں اگر مشتری دس ماہ کے بجائے ۵ ماہ بعد قیمت ادا کرے، یا پانچ ماہ بعد اس مشتری کا انتقال ہو جائے، تو اس صورت میں بائع نفع کے پانچ روپے وصول کرے گا، اور پانچ روپے چھوڑ دے گا (یعنی کل پندرہ روپے وصول کرے گا)

(رد المختار جلد ۶ ص ۷۵۶)

میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگرچہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دین فی الفور واجب للاداء ہو جائے گا، لیکن "بیع بالتقسیط" اور "مرابحہ موجلہ" جن میں ثمن کا کچھ حصہ "مدت" کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے، اگر ان میں ہم "فوری واجب الادء" والا قول لے لیں، تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ دو قولوں میں سے ایک قول کو اختیار کر لیا جائے: یا تو متاخرین حنفیہ کا یہ قول لے لیا جائے کہ اداء دین کی جو مدت متفق علیہ تھی، اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے، اس وقت کے مقابلے میں جتنا ثمن آتا ہو، وہ ساقط کر دیا جائے، لہٰذا مدیون کے ترکہ میں سے صرف ایام گذشتہ کے مقابل جو ثمن ہو، وہ وصول کر لیا جائے، یا پھر حنابلہ کا قول اختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دین موجل تھا، اب بھی اسی طرح موجل رہنے دیا جائے، البتہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کر دیں، شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی ہے، اور جس کی وجہ سے صورۃً سودی معاملات سے مشابہت ہو جاتی ہے، وہ تذبذب اس صورت میں نہیں پایا جاتا ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالی اعلم،

شیئرز کی خرید و فروخت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مایلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید
(سورة ق:۱۸)

یعنی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے۔
وہ تمہارے نامہ اعمال میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیئرز کی خرید و فروخت

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی رسوله الکریم۔
وعلی آله و اصحابه اجمعین

موجودہ دور کی تجارت میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوا ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں "شیئر" (Share) کہتے ہیں، چونکہ شیئرز کا کاروبار آخری صدیوں میں پیدا ہوا۔ اس لئے قدیم فقہاء کی کتابوں میں اس کا حکم اور اس کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں، اس لئے اس وقت "شیئرز" اور اسٹاک ایکسچینج میں ہونے والے دوسرے جدید معاملات کے بارے میں مختصراً عرض کرنا ہے۔

شیئرز کی ابتداء

پہلے زمانہ میں جو "شرکت" ہوتی تھی۔ وہ چند افراد کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ جس کو آجکل کی اصطلاح میں پارٹنرشپ (Partnership) کہتے ہیں۔ لیکن پچھلی دو، تین صدیوں سے شرکت کی ایک نئی قسم وجود میں آئی. جس کو جائنٹ اسٹاک کمپنی (Joint Stock Company) کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے کاروبار میں نئی صورت حال پیدا ہوئی، اور اس کے حصص (شیئرز Shares) کی خرید و فروخت کا نیا مسئلہ وجود میں آیا، اس کی بنیاد پر دنیا بھر میں اسٹاک مارکیٹس (Stock Markets) کام کر رہی ہیں۔ اور ان اسٹاک مارکیٹس میں کروڑوں، بلکہ اربوں روپوں کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

شیئرز کی حقیقت کیا ہے؟

لیکن پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شیئرز (Shares) کیا چیز ہیں؟ کمپنی کے شیئرز کو اردو میں "حصے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور عربی میں اس کو "سھم" کہتے ہیں، یہ شیئرز در حقیقت کسی کمپنی کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈر (Share holder) کی ملکیت کے ایک متناسب حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثلاً اگر میں کسی کمپنی کا شیئر خریدتا ہوں۔ تو وہ شیئر سرٹیفکیٹ جو ایک کاغذ ہے۔ وہ اس کمپنی میں میری ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہذا کمپنی کے جو اثاثے اور املاک ہیں۔ شیئرز خریدنے کے نتیجے میں میں ان کے متناسب حصے کا مالک بن گیا۔

پہلے زمانے میں تجارت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی کہ دو چار آدمیوں نے مل کر سرمایہ لگا کر شرکت کی، اور کاروبار کر لیا، لیکن بڑے پیمانے پر تجارت اور صنعت کے لئے جتنے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بسا اوقات چند افراد مل کر اتنا سرمایہ مہیا نہیں کر پاتے، اس واسطے کمپنی کو وجود میں لانا پڑا، اور اس کے لئے جو طریق کار عام طور پر معروف ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کوئی کمپنی وجود میں آتی ہے تو پہلے وہ اپنا لائحہ عمل اور خاکہ (Prospectus) شائع کرتی ہے۔ اور اپنے شیئرز جاری (Issue) کرتی ہے۔ اور شیئرز جاری کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کمپنی لوگوں کو اس کمپنی میں حصہ دار بننے کی دعوت دے رہی ہے۔

جب کمپنی ابتداء وجود میں آتی ہے، تو اس وقت وہ کمپنی بازار میں اپنے شیئرز فلوٹ (Float) کرتی ہے اور لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ یہ شیئرز خریدیں اب اس وقت جو شخص بھی ان شیئرز کو خریدتا ہے، وہ شخص در حقیقت اس کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن رہا ہے۔ اور اس کمپنی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔ اگرچہ عرف عام میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے شیئرز خریدے۔ لیکن شرعی اعتبار سے وہ خرید و فروخت نہیں ہے۔ بلکہ جب میں نے پیسے دے کر وہ شیئرز حاصل (Subscribe) کئے، تو اس کے نتیجے میں مجھے کوئی سامان نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے کہ کمپنی نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا، اور نہ ہی اب تک کمپنی کے املاک اور اثاثے وجود میں آئے ہیں۔ بلکہ کمپنی تو اب بن رہی ہے۔ لہٰذا جس طرح ابتداء میں دو چار آدمی مل

کر پیسے جمع کر کے کاروبار شروع کرتے ہیں، اسی طرح کمپنی ابتداء لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ تم اس کاروبار میں ہمارے ساتھ شریک بن جاؤ، لہٰذا جو شخص اس وقت میں شیئرز حاصل کر رہا ہے۔ وہ گویا کہ شرکت کا معاملہ کر رہا ہے۔

اب شرکت کا معاملہ کرنے کے نتیجے میں اس کو جو "شیئرز سرٹیفکیٹس" حاصل ہو ــ وہ "شیئرز سرٹیفکیٹس" در حقیقت اس شخص کی اس کمپنی میں متناسب (Proportionate) حصے کی ملکیت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یہ ہے شیئرز کی حقیقت۔

نئی کمپنی کے شیئرز کا حکم

لہٰذا جب کسی کمپنی کے "شیئرز" ابتداء میں جاری (Issue) ہو رہے ہوں۔ اس وقت ان شیئرز کو ایک شرط کے ساتھ لینا جائز ہے، وہ یہ کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں وہ کوئی حرام کاروبار شروع نہ کر رہی ہو، لہٰذا اگر کسی حرام کاروبار کے لئے وہ کمپنی قائم کی جا رہی ہے، مثلاً شراب بنانے کی فیکٹری قائم کی جا رہی ہے یا مثلاً سود پر چلانے کے لئے ایک بنک قائم کیا جا رہا ہے۔ یا انشورنس کمپنی قائم کی جا رہی ہے، تو اس قسم کی کمپنی کے شیئرز لینا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ لیکن اگر بنیادی طور پر حرام کاروبار نہیں ہے بلکہ کسی حلال کاروبار کے لئے کمپنی قائم کرنے کے لئے شیئرز جاری (Float) کئے گئے ہیں، مثلاً کوئی ٹیکسٹائل کمپنی ہے، یا آٹو موبائل کمپنی ہے۔ تو اس صورت میں اس کمپنی کے شیئرز خریدنے میں کوئی قباحت نہیں۔ جائز ہے۔

خرید و فروخت کی حقیقت

جب ایک آدمی نے وہ شیئرز خرید لئے تو اب وہ آدمی اس کمپنی میں حصہ دار بن گیا، لیکن عام طریق کار یہ ہے کہ وہ شیئرز ہولڈر وقتاً فوقتاً اپنے شیئرز اسٹاک مارکیٹ میں بیچتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب کمپنی قائم ہو گئی، اور ایک مرتبہ اس کمپنی کے تمام شیئرز سبسکرائب (Subscribe) ہو گئے، اس کے بعد جب اس کمپنی کے شیئرز کا اسٹاک مارکیٹ میں لین دین ہو گا۔ وہ شرعاً حقیقت میں "شیئرز کی خرید و فروخت" ہے، مثلاً

جب ابتداء ایک کمپنی قائم ہوئی۔ اس وقت میں نے اس کے دس شیئرز حاصل کئے، اب میں ان شیئرز کو اسٹاک مارکیٹ میں فروخت کرتا ہوں، اب جو شخص وہ دس شیئرز مجھ سے خرید رہا ہے، حقیقت میں وہ میری ملکیت کے اس متناسب حصے کو خرید رہا ہے جو میرا کمپنی کے اندر ہے، لہٰذا اس خرید و فروخت کے نتیجے میں وہ شخص میری جگہ اس حصے کا مالک بن جائے گا، شیئرز کے خرید و فروخت کی حقیقت بس یہی ہے۔

چار شرطوں کے ساتھ خرید و فروخت جائز ہے

لہٰذا اگر کسی شخص کو "اسٹاک مارکیٹ" سے شیئرز خریدنے ہوں، تو اس کو ان شیئرز کی خریداری کے لئے چار شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

پہلی شرط

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کمپنی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو، مثلاً وہ سودی بنک نہ ہو، سود اور قمار پر مبنی انشورنس کمپنی نہ ہو، شراب کاروبار کرنے والی کمپنی نہ ہو، یا ان کے علاوہ دوسرے حرام کام کرنے والی کمپنی نہ ہو، ایسی کمپنی کے شیئرز لینا کسی حال میں جائز نہیں، نہ ابتداء جاری (Float) ہونے کے وقت لینا جائز ہے۔ اور نہ ہی بعد میں اسٹاک مارکیٹ سے لینا جائز ہے۔

دوسری شرط

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک سیال اثاثوں (Liquid Assets) یعنی نقد رقم کی شکل میں نہ ہو، بلکہ اس کمپنی نے کچھ فکسڈ اثاثے (Fixd Assets) حاصل کر لئے ہوں مثلاً اس نے بلڈنگ بنالی ہو، یا زمین خرید لی ہو۔ لہٰذا اگر اس کمپنی کا کوئی فکسڈ اثاثہ (Fixd Assets) وجود میں نہیں آیا، بلکہ اس کے تمام اثاثے ابھی سیال (Liquid) یعنی نقد رقم کی شکل میں ہیں۔ تو اس صورت میں اس کمپنی کے شیئرز کو فیس ویلو (Face Value) سے کم یا زیادہ

میں فروخت کرنا جائز نہیں، بلکہ برابر سرابر (Above Par or Below Par) خریدنا ضروری ہے۔

یہ سود ہو جائے گا

اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے لوگوں نے اس کمپنی میں اپنی رقم سبسکرائب (Subscribe) کی ہے۔ اس رقم سے ابھی تک کوئی سامان نہیں خریدا گیا، اور نہ اس سے کوئی بلڈنگ بنائی گئی، نہ کوئی مشین خریدی گئی، اور نہ ہی کوئی اور اثاثہ وجود میں آیا، بلکہ ابھی وہ تمام پیسے نقد کی شکل میں ہیں، تو اس صورت میں دس روپے کا شیر دس روپے ہی کی نمائندگی (Represent) کر رہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دس روپے کا بانڈ (Bond) دس روپے ہی کی نمائندگی کرتا ہے، یا جیسے دس روپے کا نوٹ دس روپے کی نمائندگی کرتا ہے، لہٰذا جب دس روپے کا شیر دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے تو اس صورت میں اس شیر کو گیارہ روپے میں، یا نو روپے میں خریدنا یا فروخت کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ تو دس روپے کے نوٹ کو گیارہ روپے میں فروخت کرنا یا نو روپے میں فروخت کرنا ہو جائے گا، جو سود ہونے کی وجہ سے قطعاً جائز نہیں۔

لیکن اگر کمپنی کے کچھ اثاثے منجمد (Fixed Assats) کی شکل میں ہیں۔ مثلاً اس رقم سے کمپنی نے خام مال (Raw Material) خرید لیا۔ یا کوئی تیار مال (Produced Good) خرید لیا، یا کوئی بلڈنگ بنا لی، یا مشینری خرید لی۔ تو اس صورت میں دس روپے کے اس شیر کو کمی یا زیادتی پر فروخت کرنا جائز ہے۔

اس کے جائز ہونے کی وجہ ایک فقہی اصول ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب سونے کو سونے سے فروخت کیا جائے، یا پیسے کا پیسے سے تبادلہ کیا جائے تو برابر سرابر ہونا ضروری ہے۔ لیکن بعض چیزیں مرکب ہوتی ہیں، مثلاً سونے کا ایک ہار ہے، اور اس میں موتی بھی جڑے ہوئے ہیں، تو اب سونے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وہ بالکل برابر سرابر کر کے خریدنا اور فروخت کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ حکم موتیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ اس لئے دس موتی کے بدلے بارہ موتی لینا جائز ہے، لہٰذا اگر ایک ایسا ہار خریدنا ہو، جو سونے اور موتی سے مرکب ہے، تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس ہار میں جتنا سونا ہے۔ اس سے تھوڑا سا زیادہ سونا دے کر اس کو خریدنا درست ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ اس ہار میں ایک

تولہ سونا ہے، اور کچھ موتی لگے ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس ہار کو ایک تولہ اور ایک رتی سونے کے عوض خریدنا چاہے تو اس کے لئے خریدنا جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ کہا جائے گا کہ ایک تولہ سونا تو ایک تولہ سونے کے عوض میں آگیا۔ اور ایک رتی سونا موتیوں کے مقابلے میں آگیا۔ اس طرح معاملہ درست ہو گیا۔

اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کمپنی کے کچھ اثاثے نقد روپے کی شکل میں ہوں، اور کچھ اثاثے فکسڈ اسسٹس (Fixd Assets) یا خام مال کی شکل میں ہوں تو وہاں بھی فقہ کا یہی اصول جاری ہوتا ہے۔

اس بات کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے فرض کریں کہ ایک کمپنی نے سو روپے کے شیئرز جاری کئے، اور دس آدمیوں نے وہ شیئرز خرید لئے، ایک شیئر دس روپے کا تھا۔ ہر شخص نے دس دس روپے کمپنی کو دے کر وہ شیئرز حاصل کر لئے۔ اس کے بعد کمپنی نے ابھی تک اس رقم سے کوئی سامان نہیں خریدا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دس شیئرز جو سو روپے کے ہیں۔ وہ سو روپے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ لہٰذا اگر فرض کریں کہ ایک شخص "A" کے پاس ایک شیئر ہے، اب وہ اس شیئر کو دس کے بجائے گیارہ میں فروخت کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دس روپے دے کر گیارہ روپے لے لئے، کیونکہ کمپنی نے ابھی تک اس رقم سے کوئی چیز نہیں خریدی ہے۔ بلکہ ابھی تک وہ رقم نقد کی شکل ہی میں اس کے پاس موجود ہے۔

لیکن اگر کمپنی نے یہ کیا کہ جب اس کے پاس سو روپے آئے تو اس نے چالیس روپے کی مثلاً بلڈنگ خرید لی۔ اور بیس روپے کی مشینری خرید لی، اور بیس روپے کا خام مال خرید لیا، اور دس روپے اس کے پاس نقد موجود ہیں اور دس روپے لوگوں کے ذمے مال فروخت کرنے کی وجہ سے واجب الاداء ہو گئے، اسی بات کو نقشے سے سمجھ لیں:

کمپنی کی کل رقم = /۱۰۰ روپے

نقد	مال	مشینری	بلڈنگ	واجب الوصول قرضے
=/۱۰ روپے	=/۲۰ روپے	=/۲۰ روپے	=/۴۰ روپے	=/۱۰ روپے

اب اس صورت میں کمپنی کے اثاثے پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اب "A" کے پاس جو دس روپے کا شیئر ہے، وہ اسی تناسب سے تقسیم ہو جائے گا، اس کا

مطلب یہ ہے کہ "A" کے پاس جو دس روپے کا شیر ہے اس میں سے ایک روپے واجب الوصول قرض کے مقابل ہے، ایک روپیہ نقد کے مقابل ہے چار روپے بلڈنگ کے ہیں۔ دو روپے مشینری کے ہیں۔ اور دو روپے خام مال کے ہیں۔ اب اگر "A" دس روپے کا شیر =/۱۲ روپے میں فروخت کرنا چاہے تو اس کے لئے جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کو فروخت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ "A" نے ایک روپیہ میں ایک روپے کا قرض فروخت کیا، ایک روپیہ نقد ایک روپیہ کے عوض فروخت کیا، اور باقی دس روپے کے عوض دوسری چیزیں فروخت کیں، اور اس طرح "A" کا یہ سودا درست ہو گیا، اس لئے "A" جو دو روپے نفع لے رہا ہے، وہ نقد اور قرض کے مقابلے میں نہیں لے رہا ہے۔ بلکہ دوسری اشیاء پر نفع لے رہا ہے اور ان پر نفع لینا جائز ہے۔

لیکن اگر کسی وقت نقد رقم اور واجب الوصول قرضہ دس روپے سے زیادہ ہو جائے تو اس صورت میں "A" کے لئے دس روپے کا شیر دس سے کم یعنی =/۹ روپے میں فروخت کرنا جائز نہیں ہو گا، مثلاً فرض کیجئے کہ جب کمپنی کا کاروبار آگے بڑھا، اور کمپنی نے ترقی کی، تو اس کے نتیجے میں واجب الوصول قرضہ سو روپے ہو گیا، اور سو روپے نقد ہو گئے، اور چالیس روپے کی بلڈنگ، بیس روپے کا مال، بیس روپے کی مشینری۔ اس طرح کمپنی کے کل اثاثوں کی مالیت =/۲۸۰ روپے ہو گئی۔ اور ایک شیئر کی بریک اپ ویلو (Break up Value) اب =/۲۸ روپے ہو گئی۔

مندرجہ ذیل نقشے سے سمجھ لیجئے:

کمپنی کی موجودہ کل مالیت =/۲۸۰ روپے
ایک شیر کی موجودہ قیمت =/۲۸ روپے

بلڈنگ	مشینری	خام مال	نقد	قرضے واجب الوصول
=/۴۰	=/۲۰	=/۲۰	=/۱۰۰	=/۱۰۰
روپے	روپے	روپے	روپے	روپے

اس صورت میں اگر "A" اپنا شیر فروخت کرنا چاہتا ہے تو =/۲۱ روپے سے کم میں اس کے لئے فروخت کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ اب دس روپے ان قرضوں کے

مقابلے میں ہوں گے۔ جو لوگوں کے ذمے واجب الاداء ہیں۔ اور دس روپے، نقد دس روپے کے مقابلے میں ہو جائیں گے، اور ایک روپیہ دوسرے اثاثوں کے مقابلے میں ہو جائے گا۔ اس طرح یہ معاملہ درست ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر "A" نے اس شیر کو =/۲۱ روپے کے بجائے =/۱۹ روپے میں فروخت کر دیا تو یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ تو ایسا ہو جائے گا۔ جیسے =/۲۰ روپے کے عوض =/۱۹ روپے وصول کر لئے۔ جو جائز نہیں۔

لہٰذا جب تک کمپنی نے اثاثے نہیں خریدے، بلکہ تمام رقم ابھی تک نقد (Liquid) کی شکل میں ہے۔ یا واجب الوصول قرض (Receiveable) کی شکل میں ہے، اس وقت تک اس کمپنی کے شیر کو کمی زیادتی (Above Par or Below Par) کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں۔ بلکہ فیس ویلو (Face Value) پر خریدنا اور بیچنا ضروری ہے۔

لہٰذا جس کمپنی کا ابھی تک کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن اسٹاک مارکیٹ میں اس کے شیرز کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے جیسے پرویژنل لسٹڈ کمپنی (Provisional Listed Company) ہوتی ہے، اور عام طور پر اس کمپنی کا ابھی تک وجود نہیں ہوتا۔ ایسی کمپنی کے شیرز کو بھی کمی زیادتی پر فروخت کرنا جائز نہیں۔ مثلاً ابھی کچھ عرصہ پہلے اسٹاک مارکیٹ میں بہت تیزی آگئی تھی۔ اور بہت سی کمپنیاں فلوٹ (Float) ہو رہی تھیں اور زبردست سودے ہو رہے تھے۔ اس وقت ایک کمپنی نے اپنے شیرز دس روپے میں جاری کئے، اور ابھی تک اس کمپنی کی کوئی چیز وجود میں نہیں آئی تھی۔ مگر اسٹاک مارکیٹ میں اس کا شیر =/۱۸۰ روپے میں فروخت ہو رہا تھا۔ بہرحال! دوسری شرط کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کسی کمپنی کے منجمد اثاثے (فکسڈ ایسٹ (Fixd Assets) وجود میں نہ آجائیں۔ اس وقت تک اس کے شیرز کو کمی زیادتی پر فروخت کرنا جائز نہیں۔

تیسری شرط

تیسری شرط سمجھنے سے پہلے اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ آج جتنی کمپنیاں اس وقت قائم ہیں، ان میں سے اکثر کمپنیاں ایسی ہیں کہ ان کا بنیادی کاروبار تو حرام نہیں ہے،

مثلاً ٹیکسٹائل کمپنیاں ہیں۔ آٹو موبائل (Automobile) کمپنیاں ہیں وغیرہ۔ لیکن شاید ہی کوئی کمپنی ایسی ہوگی جو کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو، یہ کمپنیاں دو طریقے سے سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ یہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کے لئے بنک سے سود پر قرض لیتی ہیں، اور اس قرض سے اپنا کام چلاتی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے پاس جو زائد اور فاضل (سرپلس Surplus) رقم ہوتی ہے، وہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہیں۔ اور اس پر وہ بنک سے سود حاصل کرتی ہیں، وہ سود بھی ان کی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں ایسی کمپنی کے شیرز خریدوں جو کسی بھی طریقے سے کسی سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو تو یہ بہت مشکل ہے اب سوال یہ ہے کہ پھر تو کسی کمپنی کے شیرز کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہونی چاہئے؟

ایسی کمپنیوں کے بارے میں موجودہ دور کے علماء کرام کی رائیں مختلف ہیں۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ یہ کمپنیاں حرام کاموں میں ملوث ہیں۔ اب چاہے تناسب کے لحاظ سے وہ حرام کام تھوڑا ہے لیکن چونکہ حرام کام کر رہی ہیں لہٰذا ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کمپنی کے ساتھ حرام کام میں حصہ دار بنے، اس لئے کہ جب اس نے شیر خرید لیا تو وہ اس کے کاروبار میں شریک ہو گیا۔ اور کاروبار کا ایک شریک دوسرے شریک کا وکیل اور ایجنٹ ہے، اب گویا کہ شیر ہولڈر ان کو اس کام کے لئے ایجنٹ بنا رہا ہے کہ تم سودی قرضے لو، اور سودی آمدنی بھی حاصل کرو، اس لئے ان علماء کے نزدیک کسی کمپنی کے شیرز اس وقت تک خریدنا جائز نہیں۔ جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ کمپنی نہ سود لیتی ہے، اور نہ سود دیتی ہے۔

علماء کرام کی دوسری جماعت کا یہ کہنا ہے کہ اگرچہ ان کمپنیوں میں یہ خرابی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے۔ تو پھر دو شرطوں کے ساتھ اس کمپنی کے شیرز لینے کی گنجائش ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہی موقف ہے، اور ان دونوں حضرات کی اتباع میں، میں بھی اسی موقف کو درست سمجھتا ہوں، وہ دو شرطیں یہ ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شیر ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اٹھائے، اگرچہ اس کی آواز مسترد (Overrule) ہو جائے، اور میرے نزدیک آواز اٹھانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کی جو سالانہ میٹنگ (Annaual General Meeting) A.G.M ہوتی ہے، اس میں یہ آواز اٹھائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے، سودی لین دین پر راضی نہیں ہیں، اس لئے اس کو بند کیا جائے، اب ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہوگی، اور یقیناً اس کی یہ آواز مسترد (Ouerrule) ہوگی، لیکن جب وہ یہ آواز اٹھائے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ایسی صورت میں وہ انسان اپنی ذمہ داری پوری ادا کر دیتا ہے۔

چوتھی شرط

چوتھی شرط، جو حقیقت میں تیسری شرط کا ایک حصہ ہے، وہ یہ ہے کہ جب منافع (ڈیویڈنڈ Dividend) تقسیم ہو، تو وہ شخص انکم اسٹیٹ منٹ (Income Statment) کے ذریعے یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس کمپنی کو کل آمدنی کا ۵ فیصد حصہ سودی ڈپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے، تو اب وہ شخص اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کر دے۔

لہٰذا کمپنی کا اصل کاروبار اگر حلال ہے۔ لیکن ساتھ میں وہ کمپنی بنک سے سودی قرضے لیتی ہے یا اپنی زائد رقم سودی اکاؤنٹ میں رکھ کر اس پر سود وصول کرتی ہے تو اس صورت میں اگر ان مذکورہ بالا دو شرطوں پر عمل کر لیا جائے تو پھر ایسی کمپنیوں کے شیرز کی خرید و فروخت کی گنجائش ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ جواز کا موقف معتدل اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہے، لوگوں کے لئے سہولت کا راستہ فراہم کرتا ہے۔

اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ شیرز کی خرید و فروخت کے جواز کے لئے کل چار شرطیں ہو گئیں:

(۱) اصل کاروبار حلال ہو۔

(۲) اس کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے (فکسڈ ایسٹس) وجود میں آچکے ہوں۔ رقم صرف نقد کی شکل میں نہ ہو۔

(۳) اگر کمپنی سودی لین دین کرتی ہے تو اس کی سالانہ میٹنگ میں آواز اٹھائی جائے۔

(۴) جب منافع تقسیم ہو۔ اس وقت جتنا نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو۔ اس کو صدقہ کر دے۔

ان چار شرطوں کے ساتھ شیرز کی خرید و فروخت جائز ہے۔

شیرز خریدنے کے دو مقصد

آجکل اسٹاک مارکیٹ میں شیرز کے جو سودے ہوتے ہیں۔ وہ دو مقصد کے تحت ہوتے ہیں، نمبر ایک، بعض لوگ انویسٹمنٹ کی غرض سے شیرز خریدتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم شیرز خرید کر کسی کمپنی کے حصہ دار بن جائیں۔ اور پھر گھر بیٹھے اس کا سالانہ منافع ملتا رہے۔ اس کی تفصیل تو میں نے اوپر بیان کر دی کہ ایسے لوگوں کے لئے چار شرطوں کے ساتھ شیرز خریدنا جائز ہے۔

شیرز اور کیپیٹل گین

دوسری طرف بعض لوگ شیرز کی خرید و فروخت انویسٹمنٹ کی غرض سے نہیں کرتے، بلکہ ان کا مقصد کیپیٹل گین (Capital Gain) ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس کا اندازہ کرتے ہیں کہ کس کمپنی کے شیرز کی قیمت میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ چنانچہ اس کمپنی کے شیرز خرید لیتے ہیں اور پھر چند روز بعد جب قیمت بڑھ جاتی ہے تو ان کو فروخت کر کے نفع حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یا کسی کمپنی کے شیرز کی قیمت گھٹ جاتی ہے تو اس کے شیرز خرید لیتے ہیں اور بعد میں فروخت کر دیتے ہیں اس طرح خرید و فروخت کے ذریعے نفع حاصل کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے، اس کمپنی میں حصہ دار بننا اور اس کا سالانہ منافع حاصل کرنا ان کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ خود شیرز ہی کو ایک سامان تجارت بنا کر اس کا

لین دین کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے شرعاً اس طریقہ کار کی کہاں تک گنجائش ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح شیرز خریدنا جائز ہے۔ اسی طرح ان کو فروخت کرنا بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ ان شرائط کو پورا کر لیا جائے جو ابھی اوپر ذکر کی گئیں ہیں، اور جس طرح یہ جائز ہے کہ ایک چیز آپ آج خرید کر کل فروخت کر دیں، اور کل خرید کر پرسوں فروخت کر دیں بالکل اسی طرح شیرز کی بھی خرید و فروخت جائز ہے۔

ڈیفرنس برابر کرنا سٹہ بازی ہے

لیکن اس خرید و فروخت کو درست کہنے کی دشواری اس سٹہ بازی کے وقت پیش آتی ہے جو اسٹاک ایکسچینج کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے، جس میں بسا اوقات شیرز کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا، بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (ڈیفرنس Difference) برابر کر لیا جاتا ہے، اور شیرز پر نہ تو قبضہ (Delivery) ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل نہ ہو۔ اور شیرز کا نہ لینا مقصود ہو اور نہ دینا مقصود ہو، بلکہ اصل مقصد یہ ہو کہ اس طرح سٹہ بازی کر کے آپس کے ڈیفرنس کو برابر کر لینا مقصود ہو تو یہ صورت بالکل حرام ہے، اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں۔

شیرز کی ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت کرنا

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک شخص شیرز خرید لیتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس شیرز پر قبضہ اور ڈیلیوری (Delivery) نہیں ہوتی، اس سے پہلے وہ ان شیرز کو آگے فروخت کر دیتا ہے، مثلاً ایک کمپنی کے شیرز آج بازار میں جاری (Subscribe) ہوئے، لیکن ابھی اس کے شیرز کے اجراء کا عمل مکمل نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے ہی ان شیرز پر دسیوں سودے ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ عام طور پر شیرز کی خریداری کے بعد حاضر سودوں میں بھی ڈیلیوری ملنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور لگ جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح قبضہ اور ڈیلیوری ملنے سے پہلے ان کو آگے فروخت

کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں پہلے ایک اصول سمجھ لیں، اس کے بعد صورت واقعہ کا جائزہ لینا آسان ہو گا، وہ اصول یہ ہے کہ جس چیز کو آپ نے خریدا ہے۔ اس چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں، لیکن قبضہ کے اندر ہمیشہ حسی قبضہ (Physical Possession) ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ حکمی قبضہ (Constructive Possession) بھی اگر ہو جائے، یعنی وہ چیز ہمارے ضمان (رسک Risk) میں آجائے تو اس کے بعد بھی اس چیز کو آگے فروخت کرنا جائز ہے۔

شیرز کا قبضہ

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ شیرز کا قبضہ کیا ہے؟ اس پر قبضہ کس طرح ہوتا ہے؟ یہ کاغذ جس کو ہم شیرز سرٹیفکیٹ کہتے ہیں۔ اس سرٹیفکیٹ کا نام "شیئر" نہیں، بلکہ "شیئر" اس ملکیت کا نام ہے جو اس کمپنی کے اندر ہے۔ اور یہ سرٹیفکیٹ اس ملکیت کی علامت اور اس کا ثبوت اور اس کی شہادت ہے۔ لہٰذا اگر فرض کریں کہ ایک شخص کی ملکیت تو اس کمپنی میں ثابت ہو گئی۔ لیکن اس کو ابھی تک سرٹیفکیٹ نہیں ملا، تب بھی شرعی اعتبار سے یہ کہا جائے گا کہ وہ شخص اس کا مالک ہو گیا۔

اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھے مثلاً آپ نے ایک کار خریدی۔ وہ کار آپ کے پاس آگئی، لیکن جس شخص سے آپ نے خریدی ہے، وہ کار اب تک اسی کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ رجسٹریشن تبدیلی نہیں کرائی۔ اب چونکہ آپ کا قبضہ اس کار پر ہو چکا ہے، اس لئے صرف آپ کے نام پر رجسٹرڈ نہ ہونے کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ کا قبضہ مکمل نہیں ہوا۔

رسک کی منتقلی کافی ہے

اس طرح شیرز سرٹیفکیٹ ایسے ہی ہیں، جیسے رجسٹرڈ کار، اب سوال یہ ہے کہ کمپنی کا وہ اصل حصہ جس کی یہ شیر نمائندگی کر رہا ہے وہ اس کی ملکیت میں آگیا یا نہیں؟ اب ظاہر ہے کہ وہ حصہ ایسا نہیں ہے کہ وہ شخص کمپنی میں جاکر اپنا حصہ وصول کر لے۔

اور اس پر قبضہ کرلے، ایسا کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اصل حصے کے مالک بننے کا مطلب یہ ہے کہ اس حصے کے فوائد اور نقصانات، اس حصے کی ذمہ داریاں (Liabilities) اور اس کے منافع (Profits) کا حق دار بن گیا یا نہیں؟

مثلاً آج میں نے اسٹاک مارکیٹ سے ایک شیر خریدا، اور ابھی تک شیر سرٹیفکیٹ کی وصولیابی یا ڈلیوری نہیں ہوئی، اس دوران وہ کمپنی بم گرنے سے تباہ ہو گئی، اور اس کا کوئی اثاثہ باقی نہیں بچا، اب سوال یہ ہے کہ یہ نقصان کس کا ہوا؟ اگر نقصان میرا ہوا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شیر کا رسک میں نے لے لیا، اس صورت میں اس کو آگے فروخت کر سکتا ہوں، اور اگر نقصان میرا نہیں ہوا بلکہ بیچنے والے کا نقصان ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شیر کا رسک میری طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ اس صورت میں میرے لئے اس شیر کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں۔ جب تک شیر سرٹیفکیٹ پر قبضہ نہ کر لوں۔

اب سوال یہ ہے کہ حقیقی صورت حال کیا ہے؟ واقعتہً شیرز کے خریدنے کے فوراً بعد اس کا رسک (Risk) منتقل (ٹرانسفر) ہو جاتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کے جواب میں مجھے ابھی تک قطعی صورت حال معلوم نہیں ہو سکی۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی حتمی بات اب تک نہیں کہتا۔ اور اصول میں نے بتا دیا کہ رسک (Risk) منتقل ہونے کی صورت میں آگے بیچنا جائز ہے، البتہ احتیاط کا تقاضہ بہرصورت یہی ہے کہ جب تک ڈلیوری نہ مل جائے اس وقت تک آگے فروخت نہ کیا جائے۔

"بدلہ" کا سودا جائز نہیں

اسٹاک ایکسچینج میں شیرز کی خرید و فروخت کا ایک اور طریقہ بھی رائج ہے، جس کو "بدلہ" کہا جاتا ہے، یہ بھی فینانسنگ کا ایک طریقہ ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو پیسوں کی ضرورت ہے اور اس کے پاس شیرز موجود ہیں۔ وہ شخص دوسرے کے پاس وہ شیرز لے کر جاتا ہے، اور اس سے کہتا ہے کہ میں یہ شیرز آج آپ کو اتنی قیمت پر فروخت کرتا ہوں، اور ایک ہفتہ کے بعد میں قیمت بڑھا کر اتنے میں خرید

لوں گا۔ گویا کہ فروخت کرتے وقت یہ شرط ہوتی ہے کہ یہ شیرز قیمت بڑھا کر واپس کرنے ہوں گے۔ دوسرے شخص کو آپ فروخت نہیں کر سکتے۔ سوال یہ ہے کہ یہ "بدلہ" کی صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں۔ اس لئے کہ فقہ کا اصول ہے کہ کسی بھی بیع کے اندر ایسی شرط لگانا جو مقتضاء عقد کے خلاف ہو۔ جائز نہیں۔ اور خاص طور پر قیمت بڑھا کر واپس لینے کی شرط لگانا حرام ہے، اور یہ شرط فاسد ہے۔ لہٰذا "بدلہ" کی یہ صورت خالصۃً سود ہی کا ایک دوسرا عنوان ہے، شرعاً اس کی اجازت نہیں۔

شیرز پر زکوٰۃ کا مسئلہ

ایک مسئلہ شیرز پر زکوٰۃ کا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ان شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر زکوٰۃ واجب ہے تو پھر کس طرح اس کا حساب (Culculat) کیا جائے؟ اور کس طرح ادا کی جائے؟ جیسا کہ میں نے ابتداء عرض کیا تھا کہ شیرز اس حصے کی نمائندگی کرتا ہے جو کمپنی کے اندر ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے شیرز صرف اس مقصد کے تحت خریدے ہیں کہ میں اس کو آگے فروخت کر کے اس سے نفع حاصل کروں گا۔ گویا کہ "کیپیٹل گین" (Capital gain) مقصود ہے۔ ان شیئرز کا سالانہ منافع وصول کرنا مقصود نہیں۔ تو اس صورت میں ان شیرز کی مارکیٹ قیمت کے حساب سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

لیکن اگر خریدتے وقت اس کا مقصد کیپیٹل گین نہیں تھا، بلکہ اصل مقصد سالانہ منافع (Dividend) حاصل کرنا تھا۔ لیکن ساتھ میں یہ خیال بھی تھا کہ اگر اچھا منافع ملا، تو بیچ بھی دیں گے، تو ایسی صورت میں زکوٰۃ اس شیرز کی مارکیٹ قیمت کے اس حصے پر واجب ہوگی جو قابل زکوٰۃ اثاثوں کے مقابل میں ہوگی، اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھ لیجئے:

مثلاً شیرز کی مارکیٹ ویلو سو روپے ہے؟ جس میں سے =/۶۰ روپے بلڈنگ اور مشینری وغیرہ کے مقابل میں ہیں، اور =/۴۰ روپے خام مال، تیار مال اور نقد روپے کے

مقابلے میں ہے، تو اس صورت میں چونکہ ان شیرز کے =/۴۰ روپے قابل زکوۃ حصوں کے مقابلے میں ہیں۔ اس لئے =/۴۰ روپے کی زکوۃ ڈھائی فیصد کے حساب سے واجب ہوگی۔ =/۶۰ روپے کی زکوۃ واجب نہ ہوگی۔ نقشے سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی:

شیرز کی مارکیٹ قیمت =/۱۰۰ روپے

ناقابل زکوۃ		قابل زکوۃ			
بلڈنگ	مشینری	تیار مال	خام مال	نقد	کل اثاثے
=/۳۰	=/۳۰	=/۱۵	=/۱۵	=/۱۰	=/۱۰۰ روپے

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ صرف ایسی کمپنیوں کے شیرز کی خرید و فروخت جائز ہے۔ جن کا بنیادی کاروبار جائز اور حلال ہو۔ اور ان شرائط کے ساتھ جائز ہے جو اوپر ذکر کی گئیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو شریعت کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حقوق مجردہ کی خرید وفروخت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"لیلۃ القدر خیر من الف شہر"

(سورۃ القدر: ۳۰ پ)

شبِ قدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقوق مجردہ کی خرید و فروخت

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین، ورحمة للعالمین، وعلی آلہ واصحابہ الذین رفعوا معالم الدین، وعلی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

دور حاضر میں شخصی حقوق کی مختلف قسمیں وجود پذیر ہو گئی ہیں جو حقیقت میں "اعیان" نہیں ہیں۔ لیکن بازاروں میں خرید و فروخت کے ذریعے ان کا لین دین رائج ہے۔ وضعی قوانین نے ان میں سے بعض حقوق کی فروختگی کی اجازت دی ہے اور بعض کی فروخت ممنوع قرار دی ہے لیکن بازار اس طرح کے معاملات سے بھرے ہوئے ہیں، مثلاً مکانات اور دکانوں کی پگڑی، مخصوص تجارتی نام یا ٹریڈ مارک (TRADE MARK) یا تجارتی لائسنس کا استعمال، اور وہ حقوق جن کو آج کی زبان میں ذہنی، ادبی فنی ملکیت کے حقوق کہا جاتا ہے مثلاً حق تصنیف واشاعت، حق ایجاد، آرٹسٹ کا اپنے ایجاد کردہ آرٹوں میں حق۔

یہ تمام حقوق موجودہ تجارتی عرف میں مالیت قرار دیئے جاتے ہیں، جن پر شخصی اموال واملاک کے احکام جاری ہوتے ہیں، بالکل اعیان اور مادی اموال کی طرح ان کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے، انہیں کرایہ پر دیا جاتا ہے، ہدیہ کیا جاتا ہے، ان میں میراث جاری ہوتی ہے۔

ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کیا اسلامی شریعت میں ان حقوق کو اموال قرار دے کر ان کی خرید و فروخت کرنا یا کسی جائز طریقے سے ان کا عوض لینا جائز ہے یا نہیں؟۔

یہ مسئلہ اس وسیع اور ہمہ گیر شکل میں قدیم فقہاء کے عہد میں موجود نہیں تھا اس لئے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ فقہ کی قدیم کتابوں میں ہمارے زمانے کی ان جزئیات کا حکم تو نہیں ملے گا البتہ فقہاء قدیم نے بہت سے ان حقوق اور ان کا عوض لینے کے مسئلہ پر کلام کیا ہے، جو اس دور میں موجود اور متصور تھے چنانچہ بعض فقہاء نے "حقوق مجردہ" کا عوض لینے کو ناجائز کہا ہے اور بعض فقہاء نے حقوق مجردہ کی بعض اقسام کا عوض لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ حقوق کے سلسلے میں فقہاء کی بحثوں کا استقصاء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق کے انواع بہ کثرت ہیں اور ان کے بارے میں فقہاء کی عبارتیں باہم مختلف ہیں، مجھے ابھی تک کوئی ایسی عبارت نہیں ملی جو حقوق کی تمام قسموں پر حاوی ہو اور جو ایسا ضابطہ واضح کرے جس پر مسئلہ حقوق کی تمام جزئیات مبنی ہوں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن وسنت کے دلائل سے مسئلہ حقوق کے ضوابط مستنبط کئے جائیں اور کتب فقہ میں بکھری ہوئی وہ جزئیات بھی یکجا کی جائیں جو حقوق کے مسئلے میں نظائر بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے قدموں کو جادہ حق پر قائم رکھے اور اس مسئلہ میں حق و صواب کے لئے ہمارے سینوں کو کھول دے-آمین۔

حقوق مجردہ کی قسمیں

جن حقوق کا عوض لینے پر فقہاء نے بحث کی ہے ان کا استقراء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حقوق کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) شرعی حقوق یعنی وہ حقوق جو شارع کی طرف سے ثابت ہیں، ان کے ثبوت میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

(۲) عرفی حقوق یعنی وہ حقوق جو عرف کی بنا پر ثابت ہیں اور شریعت نے بھی ان حقوق کو تسلیم کیا ہے۔ پھر ان دونوں کی دو دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

اول: وہ حقوق جن کی مشروعیت اصحاب حقوق سے ضرر دفع کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

دوم: وہ حقوق جو اصالۃً مشروع ہوتے ہیں۔

پھر وہ حقوق جو اصالۃً مشروع ہوئے ہیں، ان کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) وہ حقوق جو اشیاء میں دائمی منافع سے عبارت ہیں، مثلاً حق مرور (راستہ چلنے کا حق) حق شرب (پانی لینے کا حق) حق تسییل (پانی بہانے کا حق) وغیرہ
(۲) وہ حقوق جو کسی مباح الاصل چیز پر کسی شخص کا پہلے قبضہ کرنے کی وجہ سے سے حاصل ہوتے ہیں اسے "حق اسبقیت" یا "حق اختصاص" کہتے ہیں۔
(۳) وہ حقوق جو کسی شخص کے ساتھ کوئی عقد کرنے یا کسی موجود عقد کو باقی رکھنے کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں مثلاً زمین، مکان یا دکان کو کرایہ پر دینے کا حق، یا وقف کے وظائف میں سے کسی وظیفہ کو باقی رکھنے کا حق۔

پھر ان حقوق کا عوض لینا دو طریقوں سے ممکن ہے:۔
(۱) ایک یہ کہ فروختگی کے ذریعہ عوض لینا جس کی صورت یہ ہوگی کہ بائع اپنی مملوکہ چیز کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ مشتری کی طرف منتقل کر دے گا۔
(۲) دوسرے یہ کہ صلح اور دست برداری کے طور پر عوض لینا۔ اس صورت میں دست بردار ہونے والے کا حق تو ختم ہو جاتا ہے لیکن محض اس کے دست بردار ہونے سے اس شخص کی طرف حق منتقل نہیں ہوتا۔ جس کے حق میں وہ دست بردار ہوا لیکن جس شخص کے حق میں دست برداری ہوئی ہے اس کے مقابلہ میں دست بردار ہونے والے کی مزاحمت ختم ہو جاتی ہے۔

امام قرافی ان دونوں طریقوں کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اعلم ان الحقوق والاملاک ینقسم التصرف فیھا الی نقل واسقاط، فالنقل ینقسم الی ما ھو بعوض فی الاعیان، کالبیع والقرض .....والی ما ھو بغیر عوض، کالھدایا والوصایا...... فان ذلک کله نقل ملکی اعیان بغیر عوض، واما الاسقاط فھوا ما بعوض کالخلع، والعفو علی مال...... فجمیع ھذہ الصور یسقط فیھا الثابت، والا ینتقل الی الباذل ما کان یملکه المبزول له من العصمة وبیع العبد ونحوھما۔
(الفروق للقرافی ۳/ ۱۱۰ الفرق التاسع والسبعون)

" حقوق واملاک میں تصرف کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ مالک اپنا حق یا اپنی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اور کبھی تصرف کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مالک اپنا حق اور ملکیت ساقط کر دیتا ہے، حق اور ملکیت کی منتقلی کبھی بالعوض ہوتی ہے مثلاً بیع وقرض کی صورت میں اور کبھی بلاعوض ہوتی ہے مثلاً ہدیہ اور وصیت کی صورت میں، ان دونوں صورتوں میں بلاعوض اشیاء میں ملکیت کی منتقلی ہوتی ہے حق اور ملکیت کا ساقط کرنا بھی کبھی بالعوض ہوتا ہے مثلاً خلع اور مال لے کر معاف کر دینا...... ان تمام صورتوں میں ثابت شدہ حق ساقط ہو جاتا ہے اور دینے والے کی طرف وہ چیز منتقل نہیں ہوتی جس کا دیا ہوا شخص مالک ہو جاتا ہے یعنی حفاظت، غلام کی بیع اور اس طرح کی چیزیں۔

ہم پہلے فقہاء کی ذکر کردہ حقوق کی قسموں کو ذکر کر کے ہر ایک قسم پر علیحدہ گفتگو کریں گے، پھر فقہاء کی بحثوں سے دور حاضر میں رائج حقوق کا حکم شرعی اور ان کا عوض لینے کا حکم جاننے کی کوشش کریں گے۔

حقوق شرعیہ

" حقوق شرعیہ " سے ہماری مراد وہ حقوق ہیں جن کا ثبوت شارع کی طرف سے ہوا ہے، قیاس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، یعنی ان کا ثبوت اصحاب حقوق کے لئے شارع کی طرف سے " نص جلی " یا " نص خفی " کی بنا پر ہوا ہے، اگر نص نہ ہوتی تو وہ حق ثابت نہ ہوتا مثلاً حق شفعہ، حق ولاء، حق وراثت، حق نسب، حق قصاص، بیوی سے متمتع ہونے کا حق، طلاق، حضانت اور ولایت کا حق، شوہر کی باری میں بیوی کا حق (حق قسم)

ان حقوق کی دو قسمیں ہیں۔

اول۔ وہ حقوق جو اصالۃً ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ اصحاب حقوق سے ضرر دور کرنے کے لئے ان کی مشروعیت ہوئی ہے۔ انہیں ہم " حقوق ضروریہ " کا نام دے سکتے

ہیں۔

دوم: وہ حقوق جو اصحاب حقوق کے لئے اصالۃً ثابت ہوئے ہیں، دفع ضرر کے لئے مشروع نہیں ہوئے، انہیں ہم "حقوق اصلیہ" کہہ سکتے ہیں۔

حقوق ضروریہ

"حقوق ضروریہ" کی ایک مثال حق شفعہ ہے، یہ اصالۃً ثابت ہونے والا حق نہیں ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ بائع اور مشتری نے باہمی رضامندی سے جب کوئی بیع کی تو کسی تیسرے شخص کو ان دونوں کے درمیان مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے لیکن شریعت نے شریک جائداد، شریک حقوق جائداد اور پڑوسی کو دفع ضرر کے لئے حق شفعہ دیا ہے، اسی طرح شوہر کی باری میں بیوی کا حق بھی بیوی سے دفع ضرر کے لئے ہے۔ ورنہ شوہر کو اختیار ہے کہ اپنی بیوی سے جب چاہے متمتع ہو اور اس کے ساتھ رات گزارے، بچے کی پرورش کا حق، یتیم کی ولایت کا حق اور اختیار دی ہوئی بیوی کا اختیار طلاق کا حق بھی حقوق ضروریہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

حقوق ضروریہ کا حکم یہ ہے کہ کسی طریقے سے ان کا عوض لینا جائز نہیں نہ تو فروختگی کے ذریعہ، نہ صلح اور دستبرداری کے ذریعہ عوض لینا جائز ہے۔

اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ حقوق اصحاب حقوق کے لئے اصالۃً ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ دفع ضرر کے لئے مشروع ہوئے ہیں، جب صاحب حق اپنا حق کسی دوسرے کو دینے یا دوسرے کے لئے دستبردار ہوتے پر راضی ہو گیا تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس حق کے نہ ہونے سے اسے کوئی ضرر لاحق نہیں ہو گا، لہٰذا یہ معاملہ اصل کی طرف لوٹ جائے گا اور یہاں اصل اس کے لئے حق ثابت نہ ہونا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے عوض کا مطالبہ جائز نہیں ہے مثلاً حق شفعہ میں شفیع اگر عوض لے کر حق شفعہ سے دستبردار ہو گیا تو یہ بات منکشف ہوئی کہ جو بیع اس کے لئے حق شفعہ کے ثبوت کا سبب بنی اس میں اس کا کوئی ضرر نہیں ہے، لہٰذا اس بیع کو ختم کرنے کے سلسلے میں اس کا حق ختم ہو گیا، اب اس پر مال لینا اس کے لئے جائز نہیں ہو گا۔

اسی طرح بیوی کا باری کا حق اس سے دفع ضرر کے لئے ہے، جب وہ بیوی اس

سے دستبردار ہو گئی تو معلوم ہوا کہ باری ترک کرنے سے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچتا، لہذا اس کے لئے اس دستبرداری پر عوض لینا جائز نہیں ہے "مخیرہ" کا مسئلہ بھی اسی کے مثل ہے، شوہر نے اسے دفع ضرر کے لئے نکاح فسخ کرنے کا اختیار دیا تو اگر اس عورت نے مال کے عوض میں اپنا اختیار طلاق ختم کر دیا تو معلوم ہوا کہ شوہر کے ساتھ رہنے میں اسے کوئی ضرر نہیں تھا، لہذا وہ عورت اس پر عوض لینے کی حقدار نہیں۔ اسی طرح نامرد شخص کی بیوی کو دفع ضرر کے لئے اپنے نامرد شوہر سے نکاح فسخ کرانے کا حق ہے۔ اگر وہ عورت مال لے کر اس نامرد شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئی تو معلوم ہوا کہ نکاح باقی رہنے سے اسے ضرر نہیں تھا لہذا اس کے لئے عوض لینا جائز نہیں ہو گا۔

حقوق اصلیہ

حقوق شرعیہ کی دوسری قسم وہ حقوق ہیں جو صاحب حقوق کے لئے اصالۃً ثابت ہوئے ہیں، دفع ضرر کے طور پر ان کی مشروعیت نہیں ہوئی ہے مثلاً حق قصاص، نکاح کو باقی رکھ کر شوہر کا بیوی سے متمتع ہونے کا حق، حق میراث، وغیرہ۔

اس قسم کے حقوق کا حکم یہ ہے کہ بیع کے طریقہ پر تو ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے، یعنی اس کی گنجائش نہیں کہ خریدار کی طرف وہ حق منتقل ہو جائے اور بائع کو جو استحقاق تھا وہی خریدار کی طرف منتقل ہو جائے، لہذا مقتول کے ولی کے لئے جائز نہیں کہ قصاص لینے کا حق کسی کے ہاتھ بیچ دے اور ولی کے بدلے اس دوسرے شخص کو قصاص لینے کا حق حاصل ہو جائے، اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ شوہر اپنا حق تمتع کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دے اور دوسرا شخص اس کی بیوی سے متمتع ہو، اور کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنا حق میراث دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے کہ وارث حقیقی کے بدلے میں وہ دوسرا شخص میراث کا حق دار ہو جائے۔ اس لئے کہ شارع نے یہ حقوق مخصوص شخص کے لئے مخصوص صفت کے ساتھ ثابت کئے ہیں۔ اس طور پر کہ اس صفت کے معدوم ہونے سے حقوق معدوم ہو جاتے ہیں مثلاً شارع نے مقتول کے ولی کے لئے حق قصاص ولی ہونے کی بنا پر ثابت کیا ہے، لہذا ولایت ختم ہوتے ہی حق قصاص

ختم ہو جائے گا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ حقوق شرعاً قابل انتقال نہیں ہوتے لہٰذا نہ ان کی بیع ہو سکتی ہے نہ ہبہ ہو سکتا ہے، نہ میراث جاری ہوتی ہے، حق قصاص کی وراثت جو جاری ہوتی ہے وہ حقیقی وراثت نہیں ہے بلکہ یہ ایسا حق ہے جو قریب ترین ولی کی عدم موجودگی میں دوسرے عزیز کے لئے اصالۃً ثابت ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ قریب ترین ولی سے یہ حق دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو گیا ہو۔

لہٰذا شریعت چونکہ ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف ان حقوق کی منتقلی کی اجازت نہیں دیتی، اس لئے فروختگی اور مبادلہ کے طور پر ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے، اس حکم کا ماخذ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الولاء وھبتہ"
کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء کی فروختگی اور ہبہ کرنے سے منع فرمایا

(اخرجہ البخاری فی العتق، باب بیع الولاء وھبتہ)

البتہ صلح اور دستبرداری کے ذریعہ ان حقوق کا معاوضہ لینا جائز ہے اس کی صورت یہ ہوگی کہ صاحب حق اپنا حق استعمال کرنے سے باز آجائے اور اس شخص سے مال لے لے جسے اس حق کے استعمال سے نقصان پہنچتا، مثلاً مقتول کے جس ولی کو حق قصاص حاصل ہے اس کے لئے جائز ہے کہ قاتل سے مال لے کر صلح کر لے، یہ مال صاحب حق کے اپنا حق استعمال کرنے سے رکنے کا بدلہ ہے، اور قاتل یہ مال اپنے کو موت کے ضرر سے بچانے کے لئے صرف کر رہا ہے، یہ صلح قرآن وسنت کے نصوص اور اہل علم کے اجماع کی بنا پر جائز ہے۔

اسی طرح شوہر کو یہ حق ہے کہ بیوی کے ساتھ رشتہ نکاح باقی رکھ کر اس سے متمتع ہو لیکن شوہر عورت کی طرف سے دیئے جانے والے مال کے بدلے میں اپنے حق کو استعمال سے باز آجاتا ہے جس طرح خلع کرنے اور مال کی شرط کے ساتھ طلاق دینے میں ہوتا ہے، ایسا کرنا نص قرآنی اور اجماع امت سے جائز ہے۔

حقوق ضروریہ اور حقوق اصلیہ کے درمیان یہ فرق فقہاء احناف میں سے

بیری نے شرح الشباہ والنظائر میں ذکر کیا ہے (مخطوط ص ۶۲، ۶۳) ابن عابدین نے بیری کی بحث کا خلاصہ اس طرح نقل کیا ہے۔

"وحاصله ان ثبوت حق الشفعة للشفيع، وحق القسم للزوجة، وكذا حق الخيار في النكاح للمخيرة انما هو لدفع الضرر عن الشفيع والمراة، وماثبت لذلک لا يصح الصلح عنه، لان صاحب الحق لما رضي علم انه لا يتضرر بذلک، فلا يستحق شيئاً، اما حق الموصى له بالخدمة فليس كذلک، بل ثبت له على وجه البر والصلة، فيكون ثابتاً له اصالة، فيصح الصلح عنه اذا نزل عنه لغيره، ومثله مامر عن الاشباه من حق القصاص والنكاح والرق، حيث صح الاعتياض عنه، لانه ثابت لصاحبه اصالة، لا على وجه دفع الضرر عن صاحبه" (رد المحتار لابن عابدین ۴: ۱۶)

اس کا حاصل یہ ہے کہ شفیع کے لئے حق شفعہ کا ثبوت، بیوی کے لئے قسم (باری) کا حق، مخیرہ کا حق خیار یہ سب حقوق شفیع اور عورت کے اور مخیرہ سے ضرر دور کرنے کے لئے ہیں۔ اور جن حقوق کا ثبوت دفع ضرر کے لئے ہو، ان میں (مال لے کر) صلح صحیح نہیں ہوتی، اس لئے کہ جب صاحب حق صلح پر راضی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسے کوئی ضرر نہیں ہے لہٰذا وہ کسی مال کا حقدار نہیں ہے، اس کے بر خلاف جس شخص کے لئے خدمت کی وصیت کی گئی تھی اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے لئے حق خدمت کا ثبوت حسن سلوک اور صلہ رحمی کے طور پر ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا یہ حق اصالۃً ثابت ہے (نہ کہ دفع ضرر کے لئے) اس بنا پر دوسرے کے لئے حق خدمت سے دستبردار ہو کر صلح کرنا درست ہو گا۔ اس کے مثل حق قصاص، حق نکاح اور حق رق کا حکم ہے کہ ان کا عوض لینا درست ہے کیونکہ یہ حقوق اصحاب حقوق کے لئے

اصالۃً ثابت ہیں دفع ضرر کے طور پر ثابت نہیں ہیں۔

لیکن صلح کے ذریعہ یہ عوض لینا اسی صورت میں جائز ہو گا جب وہ حق فی الحال موجود اور قائم ہو جیسا کہ حق قصاص، حق بقاء نکاح، حق رق، لیکن اگر کوئی حق مستقبل میں متوقع ہے فی الحال ثابت نہیں تو اس کا عوض لینا نہ بیع کے ذریعہ جائز ہے، اور نہ صلح کے ذریعے سے، مثلاً مورث کی زندگی میں مال کے بدلے میں حق وراثت سے دستبردار ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ مورث کی زندگی میں حق وراثت ثابت و موجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک متوقع حق ہے جس کے ثبوت عدم ثبوت دونوں کا امکان ہے حق وراثت تو مورث کی وفات سے ثابت ہوتا ہے اسی طرح حق ولاء مولی کے زندگی میں غیر ثابت حق ہے، مولی کی وفات سے یہ حق موکد ہوتا ہے لہٰذا اس سے دستبردار ہونا درست نہیں ہے۔

مورث اور مولی (آزاد کردہ غلام) کی وفات کے بعد حق میراث اور حق ولاء دونوں ترکے میں مادی ملکیت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لہٰذا مورث اور مولی کی وفات کے بعد شرائط معروفہ کے ساتھ تخارج کے طریقے پر اس حق کو فروخت کرنا یا اس سے دستبردار ہونا درست ہے جس کا طریقہ علم فرائض میں بیان کر دیا گیا ہے۔

حقوق عرفیہ

حقوق کی دوسری قسم کو ہم حقوق عرفیہ کہہ سکتے ہیں، حقوق عرفیہ سے مراد وہ شرعی حقوق ہیں جن کا ثبوت اصحاب حقوق کے لئے عرف و عادت کی بنا پر ثابت ہوتے ہیں۔ یہ حقوق اس اعتبار سے شرعی ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے عرف و تعامل کی بنا پر انہیں تسلیم کیا ہے، لیکن ان حقوق کا ماخذ عرف ہے، نہ کہ شریعت مثلاً راستہ میں چلنے کا حق، پانی لینے کا حق، پانی بہانے کا حق وغیرہ۔

ان عرفی حقوق کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ اشیاء سے انتفاع کا حق

اس سے مراد مادی اشیاء کے منافع سے استفادہ کا حق ہے، اگر یہ انتفاع متعین

مدت کے لئے ہو تو اجارہ کے طور پر اس کا عوض لینا جائز ہے، اور اس پر اجارہ کے احکام جاری ہوں گے مثلاً معین مدت کے لئے مکان میں سکونت سے استفادہ کرنا لہٰذا مالک کے لئے اس انتفاع کا عوض اس طرح لینا جائز ہے کہ وہ اپنا مکان معین مدت کے لئے طے شدہ کرائے پر کسی کو دے دے۔

لیکن اگر مالک یہ منفعت دوسرے شخص کی طرف ہمیشہ کے لئے منتقل کرے تو یہ اس منفعت کی فروختگی ہے فقہائے احناف نے بھی اسے "بیع الحقوق المجردہ" کے نام سے ذکر کیا ہے، اس بیع کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں فقہاء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں، بعض فقہاء نے حقوق مجردہ کی بیع کو مطلقاً جائز کہا ہے، بعض حضرات فقہاء نے اسے مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے بعض فقہاء نے بعض حقوق مجردہ کی بیع جائز قرار دی ہے اور بعض حقوق مجردہ کی فروختگی ناجائز قرار دی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ پہلے فقہاء کی ذکر کردہ حقوق کی صورتوں اور ان کے بارے میں فقہاء کے بیان کئے ہوئے احکام یکے بعد دیگرے ذکر کر دیئے جائیں۔ پھر اس باب میں فیصلہ کن بات بیان کر دی جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالی ھوالموفق للصواب

مختلف حقوق

فقہاء نے اس قسم کے جو حقوق ذکر کئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) حق مرور (۲) حق تعلی (۳) حق تسییل (۴) حق شرب (۵) دیوار پر لکڑی رکھنے کا حق (۶) دروازہ کھولنے کا حق۔

فقہائے احناف کے مشہور قول کے مطابق یہ سارے حقوق، حقوق مجردہ ہیں جن کی بیع جائز نہیں ہے فقہاء مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ کی کتابوں میں معروف یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حقوق کا عوض لینا جائز ہے۔

بیع کی تعریف

حقیقت میں اس اختلاف کی بنیاد بیع کی تعریف ہے، جن لوگوں نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے، "مال کا تبادلہ مال سے کرنا" اور مال کو عین (مادی محسوس چیز) کے

ساتھ خاص کیا انہوں نے حقوق مجردہ کی بیع کو نا جائز کہا ہے کیونکہ حقوق مجردہ اعیان نہیں ہیں اور جن لوگوں نے بیع کی تعریف کو عام کر کے منافع کو بھی اس میں شامل کیا ہے انہوں نے حقوق مجردہ کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

شوافع کا مذھب

فقہاء شافعیہ کے یہاں بیع کی تعریف میں منفعت کی دائمی بیع بھی شامل ہے، چنانچہ علامہ ابن حجرؒ ہیثمی نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"عقد یتضمن مقابلة مال بمال بشرطه الاٰتی لاستفادة ملک عین او منفعة موبدة"

بیع ایسا عقد ہے جس میں مال کا تبادلہ مال سے ہو آنے والی شرطوں کے ساتھ تاکہ متعین مادی چیز کی ملکیت یا اس سے ابدی منفعت حاصل ہو جائے"

شروانی نے ابن حجر ہیثمی کی مذکورہ بالا عبارت کی تشریح کرتے ہوئے "مؤبدہ" کے تحت لکھا ہے:

قوله "مؤبدة" كحق الممر اذا عقد عليه بلفظ البيع"

(حواشی الشروانی علی تحفة المحتاج، ص ۲۱۵ ج ۴)

مثلاً گزرنے کا حق جب کہ "بیع" کے لفظ کے ذریعہ اس کا معاملہ کیا جائے

علامہ شربینی خطیب فرماتے ہیں:۔

وحده بعضهم بانه عقد معاوضة مالية يفيد ملک عين او منفعة على التابيد، فدخل بيع حق الممر ونحوه وخرجت الاجارة بقيد التاقيت فانها ليست بيعاً"

(مغنی المحتاج للشربینی ص ۳ ج ۲)

"بعض فقہاء نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے: بیع مالی معاوضہ کا

عقد ہے جس سے کسی چیز یا منفعت پر ہمیشہ کے لئے ملکیت حاصل ہوتی ہے، اس تعریف میں حق مرور وغیرہ کی بیع داخل ہو گئی اور وہ اجارہ جو محدود مدت کے لئے ہو اس تعریف سے خارج ہو گیا لہٰذا اجارہ بیع نہیں ہے

ابن القاسم غزی نے متن ابی شجاع کی شرح میں لکھا ہے:

"فاحسن ماقيل في تعريفه انه تمليک عين مالية بمعاوضة باذن شرعي، اوتمليک منفعة مباحة على التابيد بثمن مالي ...... ودخل في منفعة تمليک حق البناء"

بیع کی سب سے اچھی تعریف یہ ہے کہ بیع شرعی اجازت سے بالعوض مالی چیز کا مالک بنانا ہے یا مالی قیمت کے بدلے دائمی طور پر مباح منفعت کا مالک بنانا ہے...... منفعت میں حق تعمیر کا مالک بنانا بھی داخل ہو گیا۔

باجوری ابن القاسم غزی کی مذکورہ بالا عبارت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"انما قال "ودخل في منفعة" لان المنفعة تشمل حق الممر، ووضع الاخشاب على الجدار...... ولا بد من تقدير مضاف في كلامه بان يقال: ودخل في تمليک منفعة، ليناسب قوله "تمليک حق البناء" وصورة ذلک ان يقول له: بعتک حق البناء على هذا السطح مثلاً بكذا، والمراد بالحلق الاستحقاق (حاشیۃ الباجوری علی شرح الغزی، ص ۳۴۰ ج ۱)

غزی نے "دخل فی منفعۃ" اس لئے کہا کہ منفعت میں راستے میں گزرنے کا حق اور دیوار پر لکڑی رکھنے کے حق کو شامل ہے...... ان کے کلام میں مضاف مقدر ماننا ضروری ہے یعنی تقدیر عبارت اس طرح سے ہے

ودخل فی تملیک منفعۃ، تاکہ آگے جو "تملیک حق البناء" کہا ہے وہ درست ہو جائے "حق تعمیر" کا مالک بنانے کی صورت یہ

ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے: میں نے تمہارے ہاتھ اس سطح پر عمارت تعمیر کرنے کا حق اتنی قیمت کے بدلے میں فروخت کیا اور حق سے مراد استحقاق ہے۔

علامہ شاطری نے "الیاقوت النفیس" میں اس کی تلخیص اس طرح کی ہے:

"البیع لغة: مقابلة شئی بشئی، وشرعاً: عقد معاوضة مالية تفيد ملك عين، اومنفعة على التابيد، كما في بيع حق الممر، ووضع الاخشاب على الجدار، وحق البناء على السطح"

(الياقوت النفيس في مذهب ابن ادريس، ص ۷۴)

لغت میں بیع ایک چیز کا دوسری چیز سے تبادلہ کا نام ہے لیکن اصطلاح شرع میں بیع کی تعریف یہ ہے: مالی معاوضہ کا عقد جس کے ذریعہ کسی چیز یا کسی منفعت پر دائمی ملکیت حاصل ہو جیسا کہ حق مرور اور دیوار پر لکڑیاں رکھنے کا حق اور سطح پر عمارت تعمیر کرنے کے حق کی بیع"۔

ان فقہی عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ دائمی منفعت کا حق فقہاء شافعیہ کے نزدیک مال ہے جس کی خرید و فروخت جائز ہے

حنابلہ کا مذھب

فقہاء حنابلہ کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے بہوتی کے بیان کے مطابق حنابلہ کے یہاں بیع کی تعریف یہ ہے:

مبادلة عين مالية ...... او منفعة مباحة مطلقاً، بان لا تختص اباحتها بحال دون آخر كممر دار اوبقعة تحفر بئراً، باحدهما، اى عين مالية اومنفعة مباحة مطلقاً...... فيشمل نحوبيع كتاب بكتاب اوبممر فى دار، اوبيع نحوممر فى دار بكتاب، او بممر فى دار اخرى" (شرح منتهى الارادات ص ۱۴۰ ج ۲)

"بیع ایک مالیت رکھنے والی چیز کا تبادلہ ہے یا مطلق مباح منفعت کا تبادلہ ہے جس کی اباحت کسی ایک حال کے ساتھ مخصوص نہ ہو، (دوسری مالیت رکھنے والی چیز یا مطلق مباح منفعت سے) جیسے گھر کی گزر گاہ یا زمین کا وہ حصہ جس میں کنواں کھودا جائے۔ ان میں سے ایک کا دوسرے سے تبادلہ، یعنی ایک طرف عین مالیت اور دوسری طرف منفعت مباحہ، ...... لہٰذا یہ تعریف ان تمام صورتوں کو شامل ہوگی۔ کتاب کا کتاب سے تبادلہ، کتاب کا حق مرور سے تبادلہ، حق مرور کا کتاب سے تبادلہ، ایک گھر کے حق مرور کا دوسرے گھر کے حق مرور سے تبادلہ"

مرداوی رحمۃ اللہ علیہ نے "الانصاف" میں بیع کی متعدد تعریفات ذکر کرنے اور اکثر پر اعتراضات کرنے کے بعد لکھا ہے

وقال فی الوجیز: "هو عبارة عن تمليك عين مالية، او منفعة مباحة على التابيد، بعوض مالی" ویرد علیه ایضا: الربا والقرض، وبالجملة، قل ان یسلم حد قلت، لوقيل: هو مبادلة عين او منفعة مباحة مطلقاً، باحدهما كذلك على التابيد فيهما، بغير ربا ولا قرض، لسلم"

(الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف، للمرداوی ص ٢٦٠ ج ٤)

"الوجیز میں لکھا ہے کہ: "بیع" مالیت رکھنے والی چیز یا مباح منفعت کا دائمی طور پر مالی عوض کے بدلے میں مالک بنا دینے کا نام ہے" اس تعریف پر ربوا اور قرض کے ذریعہ اعتراض وارد ہوتا ہے: خلاصہ کلام یہ ہے کہ کوئی تعریف اعتراض سے خالی نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر اس طرح تعریف کی جائے کہ: بیع کسی چیز یا مطلق مباح منفعت کا ربا اور قرض کے بغیر کسی دوسری چیز یا مطلق مباح منفعت کے بدلے دائمی طور پر مالک بنا دینا ہے، "تو اعتراض وارد نہ ہوگا" بہوتی نے کشاف القناع میں لکھا ہے:

"(ویصح ان یشتری ممرا فی ملک غیره) دارا کان او غیرها (و) ان یشتری (موضعا فی حائط یفتحه بابا و) ان یشتری (بقعة فی ارض یحفرها بئرا) بشرط کون ذلک معلوما، لان ذلک نفع مقصود، فجاز بیعه کالدور ویصح ایضا ان یشتری (علوبیت یبنی علیه بنیانا موصوفًا) او لیضع علیه خشبا موصوفا، لانه ملک للبائع، فجاز بیعه کالارض، ومعنی "موصوفا" ای معلوما..... (وکذالو کان البیت) الذی اشتری علوه (غیر مبنی اذا وصف العلو والسفل) لیکون معلوما، وانما صح لانه ملک للبائع، فکان له الاعتیاض عنه (ویصح فعل ذلک) ای ماذکر من اتخاذ ممرفی ملک غیره، اوموضع فی حائطه یفتحه بابا، اوبقعةفی ارضه یحفرها بئرا، اوعلوبیت یبنی علیه بنیانا، اویضع علیه خشبا معلومین (صلحا ابدا) ای موبدا، وهوفی معنی البیع ...... (ومتی زال) البنیان اوالخشب (فله اعادته) لانه استحق ابقاوه بعوض (سواء زال لسقوطه) ای سقوط البنیان اوالخشب اوزال (لسقوط الحائط) الذی استاجره لذلک (او) زال (لغیرذلک) کهدمه ایاه...... (وله) ای لرب البیت (الصلح علی زواله) ای ازالة العلوعن بیته (او) الصلح بعد انهدامه علی (عدم عوده) سواء کان ما صالحه به مثل العوض للذی صولح به علی وضعه اواقل اواکثر، لان هذا عوض عن المنفعة المستحقة له، فیصح بما اتفقا علیه"

(کشاف القناع للبہوتی، ص ۳۹۱، ۳۹۲ ج ۳)

کسی دوسرے کی ملکیت میں گزر گاہ خریدنا جائز ہے، چاہے وہ مکان ہو یا کچھ اور ہو۔اسی طرح کسی دوسرے کی دیوار میں دروازہ

کھولنے کے لئے مخصوص حصہ خریدنا اور دوسری کی زمین میں کنواں کھودنے کی جگہ خریدنا جائز ہے بشرطیکہ جگہ متعین و معلوم ہو، کیونکہ یہ بھی منفعت مقصودہ ہے لہٰذا مکانات کی طرح ان کی بیع بھی جائز ہوگی، اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ کسی مکان یا کمرہ کا علو خرید لے تاکہ اس پر باہم طے شدہ انداز کی عمارت بنائے یا اس پر طے شدہ لکڑیاں رکھے کیونکہ علو بھی بائع کی ملکیت ہے لہٰذا اس کی بیع بھی زمین کی طرح جائز ہے لفظ "موصوف" سے مراد معلوم ہے......

اسی طرح اس مکان کا علو خریدنا بھی جائز ہے جو مکان ابھی تعمیر نہیں ہوا ہے بشرطیکہ علو اور سفل کے اوصاف بیان کر دیئے ہوں تاکہ مبیع معلوم ہو جائے علو وغیرہ کی بیع درست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی بائع کی ملکیت ہے لہٰذا اسے اس کا معاوضہ لینے کا حق ہے اسی طرح دائمی صلح کے طور پر بھی مذکورہ بالا معاملات کرنا جائز ہے یعنی دوسرے کی ملکیت میں راستہ بنانا دروازہ کھولنے کے لئے دیوار کی مخصوص جگہ لینا، یا کسی کی زمین میں کنواں کھودنے کا حق لینا یا عمارت بنانے کے لئے کسی مکان یا کمرے کا علو لینا یا متعین لکڑیاں رکھنے کے لئے علو حاصل کرنا، یہ صلح بھی بیع کے حکم میں ہے، اور جب علو کی عمارت یا لکڑی گر جائے تو اسے دوبارہ علو پر عمارت بنوانے یا لکڑی رکھنے کا حق ہے کیونکہ مشتری عوض کے بدلے اسے باقی رکھنے کا حقدار ہے، خواہ اوپر کا مکان یا لکڑی خود بخود گر گئی ہو یا اس دیوار کے منہدم ہونے کی وجہ سے گر گئی ہو جسے اس نے کرایہ پر لیا تھا یا کسی اور وجہ سے گر گئی ہو۔ مثلاً اسے منہدم کرنیکی وجہ سے...... مالک مکان کے لئے جائز ہے کہ خریدار سے اس کا حق علو ختم کرنے کے لئے صلح کر لے، یا علو کے منہدم ہونے کے بعد صاحب علو سے اس بات پر صلح کر لے کہ دوبارہ علو پر عمارت تعمیر نہ کرے، خواہ ان دونوں کی صلح اتنے معاوضے پر

ہوئی ہو جتنا معاوضہ دے کر صاحب علو نے مالک سے علو خریدا تھا یا اس سے کم پر صلح ہوئی یا اس سے زیادہ پر، کیوں کہ یہ اس منفعت کا عوض ہے جس پر استحقاق ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا جتنے پر دونوں راضی ہو جائیں اتنے پر صلح جائز ہے۔ "

ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں:

"ولا یجوز ان یبنی دکانا، ولا یخرج روشنا ولا سباطاً علی درب غیر نافذ الا باذن اھلہ، ...... وان صالح اھل الدرب من ذلک علی عوض معلوم جاز، وقال القاضی واصحاب الشافعی: لا یجوز، لانہ بیع للھواء دون القرار، ولنا انہ یبنی فیہ باذنھم، فجاز، کما لو اذنوا لہ بغیر عوض، ولانہ ملک لھم، فجاز لھم اخذ عوضہ کالقرار،

اذا ثبت ھذا، فانما یجوز بشرط کون ما یخرجہ معلوم المقدار فی الخروج والعلو، وھکذا الحکم فیما اذا اخرجہ الی ملک انسان معین لا یجوز بغیر اذنہ، ویجوز باذنہ بعوض، وبغیرہ اذا کان معلوم المقدار" (المغنی لابن قدامۃ، ص ۳۵ ج ۵)

جو راستہ (گلی) دوسری جانب نہ نکلتا ہو اس میں چبوترہ بنانا، روشن دان نکالنا، چھجہ بنانا اس گلی میں رہنے والوں کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے .... اگر گلی والوں نے کچھ متعین عوض لے کر اس بارے میں صلح کر لی تو جائز ہے، قاضی اور فقہاء شافعیہ فرماتے ہیں کہ جائز نہیں ہے کیونکہ یہ فضا کی بیع ہے قرار کی نہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جس طرح اگر گلی والے کسی معاوضہ کے بغیر اسے اجازت دیں تو جائز ہے اسی طرح معاوضہ لے کر اجازت دینے کی صورت میں بھی جائز ہو گا کیوں کہ وہ گلی ان لوگوں کی ملکیت ہے اس لئے ان کے لئے اس کا عوض لینا جائز ہے جس طرح قرار کا عوض لینا جائز ہوتا ہے۔

جب اتنی بات ثابت ہو گئی تو یہ بات بھی جانی چاہئے کہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ گلی میں جو چیز بڑھائے گا اس کی مقدار اور بلندی معلوم ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی متعین آدمی کی ملکیت کی جانب روشندان وغیرہ بڑھانا اور نکالنا چاہتا ہے تو بھی یہی حکم ہو گا کہ اس کی اجازت کے بغیر جائز نہ ہو گا، اس کی اجازت سے جائز ہو گا خواہ وہ اجازت بالعوض ہو یا بلا عوض بشرطیکہ اس کی مقدار معلوم ہو۔ "

ابن قدامہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"ولا یجوز ان یفتح فی الحائط المشترک طاقا ولا بابا الا باذن شریکه، لان ذلک انتفاع بملک غیره، وتصرف فیه بما یضره به، ولا یجوز ان یغرز فیه وتدا، ولا یحدث علیه حائطا، ولا یستره، ولا یتصرف فیه نوع تصرف، لانه تصرف فی الحائط بما یضربه، فلم یجز کنقضه ولا یجوز له فعل شیئ من ذلک فی حائط جاره بطریق الاولی، لانه اذا لم یجز فیما له فیه حق، ففیما لا حق له فیه اولی، وان صالحه عن ذلک بعوض جاز"

(المغنی لابن قدامۃ، ص ۳۶ ج ۵ کتاب الصلح)

"مشترک دیوار میں شریک کی اجازت کے بغیر محراب یا دروازہ کھولنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ دوسرے کی ملکیت سے انتفاع ہے، اور دیوار میں ایسا تصرف ہے جو دیوار کے لئے نقصان دہ ہے، یہ بھی جائز نہیں کہ مشترک دیوار میں میخ گاڑے اور اس پر کوئی اور دیوار کھڑی کرے اور نہ ہی اس دیوار کو ڈھکنا جائز ہے۔ غرض یہ کہ مشترک دیوار میں شریک کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا تصرف نہ کرے، کیوں کہ یہ دیوار میں ایسا تصرف ہے جو دیوار کے لئے ضرر رساں ہے لہٰذا اس کا جواز نہیں ہو گا جس طرح مشترک دیوار توڑنا جائز نہیں، اپنے پڑوسی کی دیوار میں اس طرح کا کوئی کام کرنا

بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہو گا کیونکہ جب یہ تصرفات اس دیوار میں جائز نہیں جس میں اس کا حق ہے تو جس میں اس کا حق ہی نہیں اس میں تو عدم جواز بدرجہ اولیٰ ہو گا اور اگر عوض دے کر مذکورہ بالا کسی تصرف کے لئے شریک یا پڑوسی سے صلح کر لی تو تصرف جائز ہو گا۔

ابن قدامہ یہ بھی فرماتے ہیں:

"ولا یجوزان یحفرفی الطریق النافذة بئرالنفسه، سواء جعلها لماء المطر، اولسیتخرج منها ما ینتفع به ولا غیر ذلک...... ولوصالح اهل الدرب عن ذلک بعوض جاز

(حوالہ سابقہ ص ۳۵ ج ۵)

جو راستہ آر پار ہو اس میں اپنے لئے کنواں کھودنا جائز نہیں ہے چاہے یہ کنواں بارش کے پانی کے لئے کھودا ہو، یا پانی حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے کھودا ہو...... البتہ اگر گلی والوں سے کنواں کھودنے پر معاوضہ دے کر صلح کر لی ہے تو جائز ہے

مالکیہ کا مذہب

فقہائے مالکیہ کے یہاں بیع کی مشہور تعریف وہ ہے جو ابن عرفہ کی طرف منسوب ہے وہ یہ ہے:

"عقد معاوضة علی غیر منافع، ولا متعة لذة"

(مواہب الجلیل للحطاب ص ۲۲۵ ج ۴)

"بیع ایسا عقد معاوضہ ہے جو منافع پر نہ کیا جائے اور نہ ہی لذت حاصل کرنے کے لئے کیا جائے

اس تعریف سے اجارہ اور کرایہ داری نکل جائے گی، کیوں کہ ان دونوں میں منافع پر عقد ہوتا ہے، نکاح بھی اس تعریف سے خارج ہے، کیونکہ نکاح لذت حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، اس تعریف کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مالکیہ کے نزدیک بیع مادی اشیاء ہی کی ہو سکتی ہے، منافع اور حقوق کی نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس تعریف کے بر خلاف فقہاء مالکیہ کے یہاں بعض ایسی بیوع کا جواز ملتا ہے جو حقوق اور منافع کی بیع پر منتہی ہوتی ہیں چنانچہ مالکیہ کے یہاں حق تعلی کی بیع جائز ہے اسی طرح دیوار میں لکڑی گاڑنے کے حق کی بیع بھی جائز ہے، چنانچہ علامہ در دیر" الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں:۔

" (وجاز) بیع (ھواء) بالمد، ای فضاء (فوق ہواء) بان یقول شخص لصاحب ارض بعنی عشرۃ اذرع مثلا فوق ماتبنیه بارضک (ان وصف النباء) الاسفل و الاعلی لفظا او عادۃ للخروج من الجھالة والغرر ویملک الا علی جمیع الھواء الذی فوق بناء الاسفل ولکن لیس له ان یبنی مادخل علیه الا برضا الاسفل ...... (و) جاز عقد علی (غرزجذع) ای جنسه، فیشمل المتعدد (فی حائط) لآخر بیعا او اجارۃ- وخرق موضع الجذع علی المشتری اوالمکتری-

(الدسوقی علی الشرح الکبیر ص ۱۳ ج ۳)

" فضا کے اوپر فضا کی بیع جائز ہے مثلاً کوئی شخص زمین کے مالک سے کہے کہ اپنی زمین پر تم جو عمارت تعمیر کرو گے اس کے اوپر دس ذراع فضا میرے ہاتھ بیچ دو لیکن اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ لفظوں میں یا عرف وعادت کی بنیاد پر نیچے اور اوپر والے مکانوں کے اوصاف طے کر لئے جائیں تاکہ یہ بیع جہالت اور غرر سے نکل جائے، اوپر کی منزل والا نیچے کی عمارت کے اوپر کی پوری فضا کا مالک ہو جائے گا۔ البتہ اوپر والے کے لئے جائز نہیں کہ وہ نیچے والے کی رضامندی کے بغیر اس کی حد میں تعمیر کرے۔

اور دوسرے کی دیوار پر لکڑیاں رکھنے کی بیع کرنا یا اجارہ پر لینا جائز ہے اور دیوار پر جس جگہ لکڑیاں رکھی جائیں ان جگہوں کا کاٹنا یا توڑنا خریدار یا کرایہ دار کے لئے جائز ہو گا۔

علامہ خطاب یہ مسئلہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

ولا یجوز لمبتاع الهواء بیع ماعلی سقفه الا باذن البائع، لان الثقل علی حائطه ...... و یفهم منه انه ملک مافوق بناء من الهواء الا انه لایتصرف فیه لحق البائع فی الثقل"

(مواهب الجلیل ص۲۷٦ ج ۴)

"فضا خریدنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنی چھت کے اوپر کی فضا بائع کی اجازت کے بغیر کسی اور کے ہاتھ بیچ دے اس لئے کہ اوپر والے مکان کا بوجھ بھی اصل بائع کی دیوار پر پڑے گا ...... اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فضا خریدنے والا اپنے مکان کے اوپر کی فضا کا مالک تو ہو گیا لیکن دیوار پر بوجھ ڈالنے کا جو حق بائع کا ہے اس کی وجہ سے وہ اوپر کی فضا میں تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

علامہ مواق نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے :۔

"یجوز فی قول مالک شراء طریق فی دار رجل، وموضع جذوع من حائط یحملها علیه اذا وصفها"

(التاج والاکلیل للمواق بہامش الحطاب ص ۲۷۵ ج ۴)

"امام مالک کے قول کے مطابق کسی شخص کے احاطہ میں راستہ خریدنا اور کسی کی دیوار پر لکڑیاں رکھنے کی جگہ خریدنا جائز ہے بشرطیکہ دونوں کی حد بندی کر دی گئی ہو۔

امام مالک کی المدونۃ الکبریٰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں حق شرب کی بیع بھی جائز ہے، چنانچہ المدونہ الکبریٰ میں آیا ہے۔

"قلت :۔ ارئیت ان بعت شرب یوم، ایجوز هذا ام لا؟ قال: قال مالک: هو جائز قلت: فان بعت حظی، بعت اصله من الشرب، واتمالی فیه یوم من اثنی عشر یوماً، ایجوز فی قول مالک؟ قال: نعم قلت! فان لم ابع اصله، ولکن

جعلت ابیع منه السقی، اذا جاء یومی بعت ماصارلی من الماء
ممن یسقی به، ایجوزھذا فی قول مالک، قال: نعم"
(المدونۃ الکبریٰ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ ج ۱۰)

"میں نے عرض کیا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں ایک دن کا حق شرب بیچوں تو یہ جائز ہو گا یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا کہ جائز ہے، میں نے عرض کیا کہ اگر میں نے اپنا حصہ بیچا تو اصل حق شرب بیچ دیا حالانکہ میرے لئے بارہ دنوں میں ایک دن ہے کیا پھر بھی اس کی بیع امام مالک کے قول کے اعتبار سے جائز ہوگی؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! میں نے عرض کیا کہ اگر میں اصل حق نہ بیچوں بلکہ ایک دن کا پانی بیچوں مثلاً جب میرا دن آئے تو اس دن جتنا پانی ہو وہ بیچ دوں تو کیا یہ امام مالک کے قول کے اعتبار سے جائز ہو گا؟ انہوں نے فرمایا ہاں!

ان عبارتوں سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ فقہاء مالکیہ کے نزدیک ان حقوق کی بیع جائز ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ان عبارات کو اعیان کی بیع پر محمول کریں جن کے ساتھ یہ حقوق متعلق ہیں اس لئے کہ حق شرب کی بیع کو اس مسئلہ میں پانی کی بیع سے الگ ذکر کیا گیا ہے اور دونوں کو الگ الگ عبارتوں میں جائز کہا گیا ہے حالانکہ حق شرب کا حصہ حق مجرد ہی ہے اور اس لئے بھی کہ مجرد فضا کی بیع مالکیہ کے یہاں جائز نہیں ہے الا یہ کہ تعمیر کی غرض سے ہو چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں آیا ہے۔

"قلت: ارئیت ان باع عشرۃ اذرع من فوق عشرۃ اذرع من ھواء ھوله، ایجوز ھذا فی قول مالک؟ قال: لا یجوز ھذا عندی، ولم اسمع من مالک فیه شیئا، الا ان یشترط له بناء یبنیه، لان یبنی ھذا فوقه، فلا باس بذلک
(المدونۃ الکبریٰ ص ۱۵۱ ج ۱۰)

"میں نے عرض کیا آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک آدمی اپنی فضا میں سے دس ذراع کے اوپر کی دس ذراع فضا بیچ دے تو کیا

ایسا کرنا امام مالک کے قول کے اعتبار سے جائز ہو گا؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور میں نے اس بارے میں امام مالک سے کوئی بات نہیں سنی ہے، الایہ کہ اس بات کی شرط لگا دی جائے کہ فضا کا مالک اس جگہ عمارت تعمیر کرے تاکہ خریدار اس کے اوپر عمارت تعمیر کر سکے تو پھر اس بیع میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"علامہ زرقانی" نے منفعت کی بیع کو بھی بیع کے اقسام میں ذکر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"البیوع جمع بیع وجمع لاختلاف انواعه، کبیع العین، و بیع الدین، و بیع المنفعة

(شرح الزرقانی علی الموطاص ۲۵۰ ج ۳)

"بیوع بیع کی جمع ہے جمع اس واسطے لایا گیا کہ اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً عین کی بیع، دین کی بیع، منفعت کی بیع

"ان تمام عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن منافع کو ابن عرفہ نے بیع کی تعریف سے خارج کیا ہے وہ موقت منافع ہیں جن کو اجارہ یا کرایہ داری کہا جاتا ہے جہاں تک منافع موبدۃ (دائمی منافع) کا تعلق ہے تو اس کی بیع مالکیہ کے یہاں بھی جائز ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

احناف کا مذہب

فقہائے احناف کے یہاں بیع کی مشہور تعریف یہ ہے "مال کا مال سے مبادلہ کرنا" (البحرالرائق ص ۲۵۲ ج ۵) بعض فقہاء نے یہ تعریف کی ہے "ایک مرغوب چیز کا دوسری مرغوب چیز سے تبادلہ کرنا" (بدائع الصنائع ص ۱۳۳ ج ۵) لیکن مرغوب چیز سے مراد احناف کے یہاں مال ہی ہے کیونکہ علامہ کاسانی جنہوں نے بیع کی یہ تعریف کی ہے انہوں نے دوسرے مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ "بیع مال سے مال کے تبادلہ کا نام

ہے" (بدائع الصنائع ص ۱۴۰ ج ۵) اسی طرح صاحب الدر المختار نے شرح ملتقی الابحر میں صراحت کی ہے کہ مرغوب چیز سے مال ہی مراد ہے۔

مال کی تعریف

مال کی تعریف میں فقہاء احناف کی عبارتیں مختلف ہیں، ابن عابدین لکھتے ہیں۔

"المراد بالمال مایمیل الیه الطبع، ویمکن ادخاره لوقت الحاجة، والمالیه تثبت بتمول الناس کافة، او بعضهم، والتقوم یثبت به و باباحة الانتفاع به شرعاً"

(ردالمحتار ص ۳ ج ۴)

"مال سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور وقت ضرورت کے لئے اس کو ذخیرہ کرنا ممکن ہو اور مالیت تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور "تقوم" مالیت بنانے کے ذریعہ بھی ثابت ہوتا ہے اور شرعاً اس سے انتفاع جائز ہونے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے"

اس کے بعد ابن عابدین نے الحاوی القدسی سے نقل کیا ہے :۔

"المال اسم بغیر الآدمی خلق لمصالح الآدمی، وامکن احرازه و التصرف فیه علی وجه الاختیار"

(ردالمحتار ص ۳ ج ۴)

"مال اس غیر انسان کا نام ہے جو انسان کے مصالح کے لئے پیدا کیا گیا ہو اور اسے اپنی حفاظت میں لے لینا اور اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا ممکن ہو"

ان دونوں تعریفوں میں سے کوئی تعریف ایسی نہیں ہے جو بیع کو اعیان میں منحصر کرتی ہو اور حقوق یا دائمی منافع کو صراحتاً بیع کی تعریف سے نکال دیتی ہو لیکن الدر المختار کے مصنف علاء الدین حصکفی ؒ نے ملتقی الابحر کی شرح میں ایسی تعریف کی ہے جو بیع

کو اعیان میں محدود کر دیتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"والمراد بالمال عین یجری فیه التنافس والا بتذال"

(الدر المنتقی، بهامش مجمع الانهر ص ۳ ج ۲)

مال سے مراد وہ عین (مادی اور محسوس چیز) ہے جس کے بارے میں لوگوں کے درمیان رغبت اور حرص پائی جائے اور اس کا استعمال کیا جاتا ہو۔

مال کی تعریف میں اس بات کی صراحت کہ وہ اعیان میں سے ہونی چاہئے، اگرچہ حصفکی کے علاوہ کسی اور حنفی فقیہ کے یہاں اتنی وضاحت سے نہیں ملتی لیکن متاخرین فقہائے احناف کے کلام اور ان کی تعریفات سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ مال کی تعریف میں عینیت ان کے یہاں ملحوظ ہے اسی لئے شیخ مصطفےٰ زرقاء نے ان تعریفات پر تنقید کرتے ہوئے مال کی ایک دوسری تعریف کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"المال: هو كل عين ذات قيمة مادية بين الناس"

(الفقه الاسلامی وادلته لوهبة الزحيلی ص ۳۳۵ ج ۴)

"مال ہر وہ عین ہے جو لوگوں کے درمیان مادی قیمت رکھتا ہو"

ان دونوں تعریفوں کا تقاضا یہ ہے کہ مال مادی چیزوں میں محدود ہو، منافع اور حقوق مجردہ کو شامل نہ ہو اسی لئے فقہائے احناف نے منافع اور حقوق مجردہ کی بیع جائز نہ ہونے کی صراحت کی ہے فقہائے احناف نے صراحتاً لکھا ہے کہ حق تعلی کی بیع جائز نہیں ہے علامہ کاسانی لکھتے ہیں۔

"سفل وعلو بين رجلين انهدما، فباع صاحب العلو علوه لم يجز، لان الهواء ليس بمال" (بدائع الصنائع ص ۱۴۵ ج ۵)

اگر ایک آدمی کی نیچے کی منزل ہے اور دوسرے آدمی کی اوپر کی منزل اور دونوں منزلیں منہدم ہو گئیں اس کے بعد اوپر کی منزل کے مالک نے اپنا حق علو بیچ دیا تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ فضا مال نہیں ہے۔

صاحب هدايه لکھتے ہیں "لان حق التعلی ليس بمال، لان المال ما يمكن احرازه" (فتح القدير ص ۲۰۴ ج ۵)

کیونکہ حق تعلی مال نہیں ہے اس لئے کہ مال وہ ہے جس کی
احراز ممکن ہو"

اسی طرح حق تسییل کے عدم جواز کی بھی فقہائے احناف نے صراحت کی ہے میں نے کسی حنفی فقیہ کے یہاں حق تعلی اور حق تسییل کے جواز کا حکم نہیں دیکھا۔ (ردالمحتار ص ۱۳۲ ج ۴)

لیکن بعض فقہائے احناف نے حق مرور اور حق شرب کی بیع کو جائز کہا ہے اس سلسلہ میں فقہائے احناف نے جو کچھ لکھا ہے اسے ہم بیان کرتے ہیں۔

احناف کے نزدیک حق مرور کی بیع

حق مرور کی بیع کے سلسلے میں فقہائے احناف کے یہاں دو روایتیں ہیں پہلی روایت زیادات کی ہے جس میں اس کو ناجائز کہا گیا ہے، دوسری روایت کتاب القسمة کی ہے جس میں حق مرور کی بیع جائز قرار دی گئی ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

"(وبیع الطریق وهبته جائز، وبیع مسیل الماء وهبته باطل) والمسئلة تحتمل وجهین! بیع رقبة الطریق والمسیل، وبیع حق المرور والتسییل فان کان الاول فوجه الغرق بین المسئلتین ان الطریق معلوم، لان له طولا وعرضا معلوما واما المسیل فمجهول، لانه لا یدری قدر ما یشغله من الماء، وان کان الثانی ففی بیع حق المرور روایتان، ووجه الفرق علی احدا هما بینه وبین حق التسییل ان حق المرور معلوم، لتعلقه بمحل معلوم، وهو الطریق، اما المسیل علی السطح فهو نظیر حق التعلی، وعلی الارض مجهولة لجهالة محله، ووجه الفرق بین حق المرور و حق التعلی علی احد الروایتین ان حق التعلی یتعلق بعین لا تبقی، وهو البناء، فاشبه المنافع - اما حق یتعلق بعین تبقی
وهو الارض، فاشبه الاعیان"

(فتح القدیر ص ۲۰۵ ج ۵)

"راستہ کی بیع اور اس کا ہبہ جائز ہے اور پرنالے کی بیع اور ہبہ باطل ہے اس مسئلہ میں دو صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔۔۔ اصل راستہ اور پرنالہ کی بیع۔
۲۔۔۔ راستہ چلنے کے حق اور پانی بہانے کے حق کی بیع۔

اگر پہلی صورت مراد ہے تو دونوں مسئلوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ راستہ معلوم ہے اس لئے کہ اس کی لمبائی اور چوڑائی معلوم ہے اور پانی بہنے کی جگہ غیر متعین ہونے کی وجہ سے مجہول ہے۔ اس لئے کہ یہ نہیں معلوم ہے کہ پانی کتنی زمین کو مشغول کرے گا۔ اگر دوسری صورت ہے تو حق مرور کی بیع کے بارے میں دو روایتیں ہیں جس روایت میں حق مرور کی بیع کو جائز کہا ہے اس کی بناپر حق مرور کی بیع اور حق مسیل کی بیع کے درمیان فرق یہ ہے کہ حق مرور معین و معلوم ہے کیونکہ اس کا تعلق معین جگہ سے ہے یعنی راستہ۔ جہاں تک چھت کے پرنالہ کا تعلق ہے تو وہ بالکل حق تعلی کے مثل ہے اور زمین کا حق مسیل مجہول ہے کیونکہ اس کا محل مجہول ہے اور ایک روایت کی بنیاد پر حق مرور اور حق تعلی میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ حق تعلی ایسی چیز سے متعلق ہے جو باقی رہنے والی نہیں یعنی عمارت، لہٰذا حق تعلی منافع کے مشابہ ہو گیا اور حق مرور باقی رہنے والی چیز سے متعلق ہے یعنی زمین سے لہٰذا حق مرور اعیان کے مشابہ ہو گیا۔ "

علامہ ابن ہمام نے اس فرق پر یہ اعتراض کیا ہے کہ بیع جس طرح باقی رہنے والی چیز کی ہوتی ہے اسی طرح باقی نہ رہنے والی چیزوں کی بھی ہوتی ہے اس لئے باقی رہنے والے اعیان اور باقی نہ رہنے والے اعیان میں فرق کرنا درست نہیں، پھر ابن ہمام نے ایک اور فرق بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔

> ان حق المرور يتعلق برقبة الا رض، وهی مال هو عين، فما يتعلق به يكون له حكم العين، اما حق التعلی فحق يتعلق بالهواء، و هوليس بعين مال"
>
> (فتح القدیر ص ۲۰۶ ج ۵)
>
> کہ حق مرور زمین سے متعلق ہوتا ہے اور زمین ایک ایسا مال ہے جو مادی اور محسوس ہے لہٰذا اس سے متعلق حق کو بھی عین کا حکم حاصل ہو گا۔ اس کے برخلاف حق تعلی فضا سے تعلق رکھنے والا حق ہے اور فضا عین مال نہیں ہے"

فقیہ ابو اللیث نے زیادات کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے جس میں حق مرور کی بیع کو ناجائز کہا گیا ہے، اس لئے کہ حقوق مجردہ کی بیع جائز نہیں ہوتی۔ لیکن "الدر المختار" میں ذکر کیا گیا ہے کہ اکثر مشائخ نے جواز کی روایت کو اختیار کیا ہے۔ "ابن عابدین" اس کے تحت لکھتے ہیں:۔

"قوله" وبه اخذ عامة المشايخ" قال السائحانی: وهوالصحيح، وعليه الفتوى، مضمرات والفرق بينه وبين حق التعلى حيث لا يجوز، هوان حق المرور حق يتعلق برقبة الارض، وهی مال هوعين، فما يتعلق به له حكم العين، اما حق التعلى فمتعلق بالهواء، وهوليس بعين مال

(درالمختار ص ۱۳۲ ج ۴)

صاحب "الدر المختار" کا قول "وبہ اخذ عامۃ المشائخ" کے بارے میں "سائحانی" لکھتے ہیں کہ یہی صحیح ہے اور اسی پر فتوٰی ہے، حق مرور اور حق تعلّی جو ناجائز ہے ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ حق مرور ایسا حق ہے جو زمین سے متعلق ہے اور زمین عینی مال ہے، لہٰذا اس سے تعلق رکھنے والے حق کو بھی عین کا حکم حاصل ہوگا اس کے بر خلاف حق تعلّی فضا سے متعلق ہے اور فضا عین مال نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ متاخرین فقہاء احناف کے نزدیک راجح یہ ہے کہ حق مرور کی بیع جائز ہے۔ کیونکہ حق مرور عین سے تعلق رکھنے والا حق ہے لہٰذا بیع کے جائز ہونے میں اسے بھی عین کا حکم حاصل ہو گیا، اس اصل کی بنیاد پر مناسب یہ تھا کہ زمین پر پانی بہانے کے حق کی بیع جائز ہو کیونکہ یہ بھی ایسا حق ہے جو عین سے متعلق ہے یعنی زمین سے لیکن فقہا نے حق تسییل کی بیع کو منع کیا ہے۔ کیونکہ پانی بہانے کا محل مجہول ہے اس لئے منع نہیں کیا کہ وہ حق مجرد کی بیع ہے جیسا کہ صاحب "ہدایہ" کی بیان کی ہوئی علت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس علت کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر پانی بہانے کا محل متعین کر دینے سے جہالت دور ہو جائے اور پانی اس متعین محل سے تجاوز نہ کرے تو حق

تسبیل کی بیع بھی جائز ہوگی

حق شرب کی بیع

حق شرب کی بیع کے بارے میں بھی فقہائے احناف کے اقوال مختلف ہیں چنانچہ حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حق شرب کی بیع جائز نہیں ہے۔ پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ "ردالمحتار" وغیرہ میں عدم جواز پر فتویٰ ہے۔ لیکن نظر غائر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جن فقہاء نے حق شرب کی بیع کا عرف قائم ہونے کی باوجود اس کے جواز سے منع کیا ہے ان حضرات نے غرر اور جہالت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ حق شرب مال نہیں۔

چنانچہ امام سرخسی" لکھتے ہیں:

"بیع الشرب فاسد، فانه من حقوق المبیع بمنزلة الاوصاف، فلا یفرد بالبیع ثم هو مجهول فی نفسه غیر مقدور التسلیم، لان البائع لا یدری ایجری الماء ام لا؟ ولیس فی وسعه اجراوه قال: "وکان شیخنا الامام یحکی عن استاذه انه کان یفتی بجواز بیع الشرب بدون الارض، ویقول: فیه عرف ظاهر فی دیارنا بنسف، فانهم یبیعون الماء" فللعرف الظاهر کان یفتی بجوازه، ولکن العرف انما یعتبر فیما لا نص بخلافه، والنهی عن بیع الغرر نص بخلاف هذا العرف فلا یعتبر"۔

(مبسوط السرخسی ص ۱۳۵ ج ۱۴)

"حق شرب کی بیع فاسد ہے، کیوں کہ یہ مبیع کے حقوق میں سے ہے اور مبیع کے حقوق مبیع کے اوصاف کے درجہ میں ہیں لہٰذا علیحدہ اس کی بیع نہیں کی جاسکتی پھر حق شرب فی نفسہ مجہول ہے اس کے حوالہ کرنے پر قدرت نہیں کیوں کہ بائع جانتا ہی نہیں کہ پانی جاری ہوگا یا نہیں؟ اور پانی جاری کرنا اس کے اختیار میں نہیں۔ اور ہمارے شیخ الامام اپنے استاد سے نقل کرتے تھے کہ "وہ

زمین کے بغیر حق شرب کی بیع کے جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کے بارے میں ہمارے دیار "نسف" میں واضح عرف موجود ہے کہ لوگ پانی بیچتے ہیں۔" غرض یہ کہ واضح عرف کی بنیاد پر وہ حق شرب کی بیع کے جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے لیکن عرف کا اعتبار ان جگہوں پر ہوتا ہے جہاں عرف کے خلاف نص موجود نہ ہو اور بیع غرر سے ممانعت والی حدیث اس عرف کے خلاف صحیح و صریح نص ہے لہٰذا یہ عرف قابل اعتبار نہیں ہے۔"

امام سرخسی ؒ نے عدم جواز کے دو اسباب بیان کئے ہیں، پہلا سبب یہ ہے کہ شرب مبیع کے حقوق میں سے ہے لہٰذا مستقلاً اس کی بیع نہیں ہو سکتی اور دوسرا سبب یہ ہے کہ شرب کی بیع میں دھوکہ اور جہالت ہے اور جب جائز کہنے والوں نے عرف ظاہر سے استدلال کیا تو امام سرخسی ؒ نے ان کے رد میں صرف غرر و جہالت کی بات ذکر کی۔ اور لکھا کہ عرف میں اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اس غرر کو جائز کہا جائے۔ جس کی نص میں ممانعت آئی ہے، یہ نہیں فرمایا کہ عرف اس قابل نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے حقوق کی بیع جائز ہو۔

ابن ہمام ؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ثم بتقدیر انه حظ من الماء فهو مجهول المقدار فلا یجوز بیعه وهذا وجه منع مشایخ بخاری بیعه مفرداً"

(فتح القدیر ص ۲۰۵ ج ۵)

"پھر اس تقدیر پر کہ "شرب" پانی کے ایک حصے کا نام ہے جس کی مقدار مجہول ہے لہٰذا اس کی بیع جائز نہیں ہوگی اس وجہ سے مشائخ بخارا نے مستقلاً اس کی بیع کو منع کیا ہے۔"

"بابرتی" کی عبارت ابن ہمام ؒ سے بھی زیادہ صریح ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"وانما لم یجز بیع الشرب وحده فی ظاهر الروایة للجهالة، لا باعتبار انه لیس بمال" (العنایة بهامش الفتح ص ۲۰۴ ج ۵)

"ظاہر الروایت میں تنہا "شرب" کی بیع کو جہالت کی وجہ سے ناجائز کہا گیا ہے اس وجہ سے نہیں کہ "شرب" مال نہیں ہے۔"

امام سرخسی ؒ نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزارعۃ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اخیر میں بیع شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متاخرین کا قول ذکر کیا ہے اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ویعض المتاخرین من مشایخنا رحمھم اللہ افتی ان بیع الشرب وان لم یکن لہ ارض للعادۃ الظاھرۃ فیہ فی بعض البلدان، و ھذہ عادۃ معروفۃ بنسف، قالوا: انما جوز الاستصناع للتعامل، وان کان القیاس یاباہ، فکذلک بیع الشرب بدون الارض"

(مبسوط السرخسی ص ۱۷۱ ج ۲۳)

"مشائخ متاخرین میں سے بعض نے شرب کی بیع کی جواز کا فتوی دیا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ زمین کی بیع نہ کی جائے، ان حضرات نے ایسا بعض شہروں کے عرف کی بنیاد پر کہا ہے چنانچہ صرف شرب کی بیع "نسف" کی معروف عادت ہے، ان حضرات نے فرمایا ہے کہ استصناع کو تعامل کی وجہ سے جائز کہا گیا ہے اگرچہ قیاس کا تقاضہ اس کے خلاف تھا۔ اسی طرح زمین کے بغیر شرب کی بیع بھی عرف کی وجہ سے جائز ہوگئی۔"

فقہاء احناف ؒ نے بیع شرب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقوق کے مسئلہ میں بعینہ وہی باتیں معلوم ہوئیں جو حق مرور اور حق تسییل کی بیع کے مسئلہ میں ان کی بحثوں سے معلوم ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "حق اگر کسی عین مال سے متعلق ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی بشرطیکہ وہاں کوئی مانع مثلاً غرر اور جہالت وغیرہ نہ پایا جائے۔

بعض متاخرین احناف نے لکھا ہے جن حقوق کی بیع جائز نہیں ہے مثلاً حق تعلی، حق تسئیل، حق شرب ان کا عوض لینا بطریق بیع تو جائز نہیں، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔ علامہ خالد اتاسی "مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کا مسئلہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اقول" وعلی ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال لان ھذہ الحقوق لم تثبت لاصحابھا لاجل دفع الضرر عنھم بل ثبتت لھم ابتداء بحق شرعی فصاحب حق العلو اذا انھدم علوہ، قالوا: ان لہ حق اعادتہ کما کان جبرا عن صاحب السفل، فاذا نزل عنہ لغیرہ بمال معلوم ینبغی ان یجوز ذلک علی وجہ الفراغ و الصلح، لا علی وجہ البیع، کما جاز النزول عن الوظائف و نحوھا۔ لاسیما اذا کان صاحب حق العلو فقیرا قد عجز عن اعادة علوہ، فلو لم یجز ذلک لہ علی الوجہ الذی ذکرناہ، یتضرر فلیتامل و لیحرر۔ واللہ سبحانہ اعلم

"میں کہتا ہوں کہ حقوق مجردہ کا مال کی صورت میں عوض لینے کا جواز جو فقہاء نے ذکر کیا ہے اس کی بنیاد پر مناسب ہے کہ حق تعلی حق شرب اور حق مسئیل کا عوض مالی لینا بھی جائز ہو، کیونکہ یہ حقوق اصحاب حقوق کے لئے دفع ضرر کے لئے ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ اصحاب حقوق کے لئے ان حقوق کا ثبوت ابتداء حق شرعی کی بنا پر ہوا ہے لہٰذا جس شخص کو حق علو حاصل ہے اگر اس کا علو منہدم ہو جائے تو اسے دوبارہ علو کی تعمیر کا حق ہے جس طرح پہلے اس کا علو تھا لہٰذا جب وہ شخص متعین مال کے بدلے میں دوسرے شخص کے لئے علو سے دستبردار ہو گیا تو مناسب یہ ہے کہ صلح کے طور پر یہ بھی جائز ہو بیع کے طور جائز نہ ہو، جس

طریقے سے وظائف وغیرہ
کے حق سے دستبرداری جائز ہوتی ہے خصوصاً اس وقت جب
کہ حق علو والا شخص ایسا تنگ دست ہو کر علو کی دوبارہ تعمیر سے عاجز
ہو، کیونکہ اگر مذکورہ بالا طریقے پر اس کے لئے حق علو کا عوض لینا
جائز نہ ہوگا تو اسے ضرر پہنچے گا۔ واللہ سبحانہ اعلم"

یہ ان بحثوں کا حاصل ہے جو میں نے منافع کی بیع اور اعیان سے تعلق رکھنے والے حقوق کے مسئلہ میں فقہاء احناف کے یہاں پائی ہے۔

اس نوع کے حقوق کے احکام کا خلاصہ

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو فقہی عبارتیں اوپر ذکر کی گئیں ان کا خلاصہ یہاں درج کر دیں۔

(۱) ـــــ بیع کی تعریف کے بارے میں فقہا میں اختلاف ہے فقہاء شافعیہ اور حنابلہ مبیع کے عین ہونے کی شرط نہیں لگاتے بلکہ منافع "موبدہ" (دائمی منافع) کی بیع کو بھی جائز قرار دیتے ہیں فقہاء مالکیہ کی بعض فروع سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) ـــــ فقہاء احناف نے اگرچہ بیع میں مبیع کے عین ہونے کی شرط لگائی ہے لیکن ان لوگوں نے حق مرور کی بیع جائز قرار دی ہے اور جواز کی علت یہ بیان کی ہے یہ ایسا حق ہے جو عین سے متعلق ہے لہٰذا جواز بیع میں اسے عین کا حکم حاصل ہوگیا۔

(۳) ـــــ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اعیان سے تعلق رکھنے والے حقوق کا احناف کے یہاں وہی حکم ہے جو اعیان کا ہے یعنی حقوق کی بیع جائز ہے بشرطیکہ اس میں بیع سے کوئی اور مانع موجود نہ ہو مثلاً دھوکہ اور جہالت

(۴) ـــــ جو حقوق اعیان سے تعلق نہیں رکھتے مثلاً حق تعلی ان کی بیع احناف کے نزدیک جائز نہیں۔ لیکن ازراہ صلح ان کا عوض لینا جائز ہے جیسا کہ بعض فقہاء متاخرین نے ذکر کیا ہے۔

ان چاروں نکات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو حقوق عرفیہ اعیان سے تعلق رکھتے ہیں ان کی بیع ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے۔ احناف کے نزدیک جائز نہیں، فقہاء احناف نے کہا کہ حقوق مجردہ کا عوض لینا جائز نہیں لیکن یہ حکم احناف کے نزدیک

اس عموم کے ساتھ نہیں ہے جس کا الفاظ سے وہم ہوتا ہے، بلکہ فقہاء احناف ؒ نے اس حکم سے اعیان سے تعلق رکھنے والے بعض حقوق کا استثناء کیا ہے اور بعض اشیاء کو اموال میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے اس لئے کہ جیسا کہ ابن عابدین ؒ نے کہا ہے کہ مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہو جاتی ہے لہٰذا " حقوق " جب عرف میں قیمت رکھنے والے مال مان لئے گئے ہیں اور لوگ ان کے ساتھ اموال والا معاملہ کرتے ہیں تو ان کی بیع بھی درج ذیل شرطوں کے ساتھ جائز ہونی چاہئے۔

(۱) ـــــ وہ حق فی الحال ثابت ہو مستقبل میں متوقع نہ ہو۔

(۲) ـــــ وہ حق صاحب حق کے لئے اصالۃً ثابت ہو، محض دفع ضرر کے لئے ثابت نہ ہو۔

(۳) ـــــ وہ حق ایسا ہو جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو سکے۔

(۴) ـــــ تحدید کرنے سے اس حق کی تحدید ہو جاتی ہو اور غرر یا جہالت کو مستلزم نہ ہو۔

(۵) ـــــ تاجروں کے عرف میں لین دین کے سلسلہ میں اس حق کو اموال واعیان کی حیثیت حاصل ہو۔

حق اسبقیت

حقوق عرفیہ کی دوسری قسم کو ہم " حق اسبقیت " کا نام دے سکتے ہیں " حق اسبقیت " سے مراد یہ ہے کہ مباح الاصل چیز پر سب سے پہلے قابض ہونے کی وجہ سے انسان کو مالک بننے کا جو حق یا اس مال کے ساتھ جو خصوصیت حاصل ہوتی ہے اسی کو حق اسبقیت ـہے، مثلاً افتادہ زمین کو قابل استعمال بنانے سے مالک بننے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

بعض فقہاء شافعیہ اور حنابلہ نے اس حق کی بیع کا مسئلہ بھی ذکر کیا ہے اور اس بات پر تو تمام فقہاء کا اجماع ہے کہ انسان بنجر اور افتادہ زمین کو قابل استعمال بنانے سے اس کا مالک بن جاتا ہے صرف افتادہ زمین میں پتھر گاڑنے سے انسان کو ملکیت حاصل نہیں ہوتی، البتہ حق تملک حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ جس شخص نے کسی زمین میں پتھر وغیرہ گاڑ کر نشان لگایا وہ اس زمین کو قابل کاشت بنانے کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حقدار

ہے فقہاء شافعیہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ پتھر گاڑنے سے قابل کاشت بنانے کا جو حق انسان کو حاصل ہوتا ہے اس حق کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ علامہ رملیؒ "نہایۃ المحتاج" میں تحریر فرماتے ہیں:

"من شرع فی عمل احیاء ولم یتمه، کحفر الاساس، اوعلم علی بقعة بنصب احجار، اوغرز خشبا، اوجمع ترابا، و خط خطوطا، فمحجر علیه ای مانع لغیره منه بما فعله، بشرط کونه بقدر کفایته وقادرا علی عمارته حالا، وحینئذ هو احق به من غیره اختصاصا لاملکا ...... لکن الاصح انه لا یصح بیعه ولا هبته، کما قاله الماوردی، خلافا للدارمی، لمامر من انه غیر مالک، حق التملک لا یباع کحق الشفعة والثانی یصح بیعه و کانه باع حق الاختصاص"

(نہایہ المحتاج للرملی: ۳۳۶ ج ۵)

"جس شخص نے قابل استعمال بنانے کا عمل شروع کیا لیکن اسے مکمل نہیں کیا مثلاً نیو کھودی یا پتھر نصب کر کے یا لکڑیاں گاڑ کر یا مینڈھ بنا کر یا خط کھینچ کر کسی زمین پر نشان لگایا تو دوسرے کے لئے وہ زمین ممنوع ہو جاتی ہے یعنی اس کے اس عمل کے نتیجہ میں دوسرے کے لئے اس میں تصرف کرنا ممنوع ہے لیکن اس ممانعت کی شرط یہ ہے کہ اس نے اتنی ہی زمین پر نشان لگایا ہو جو اس کی ضرورت کے بقدر ہے اور جسے قابل استعمال بنانے پر وہ فی الحال قادر ہے اس صورت میں وہ شخص دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہوگا لیکن وہ زمین اس کی ملکیت نہیں کہلائے گی۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس شخص کے لئے اس حق اور اختصاص کا بیچنا اور ہبہ کرنا صحیح نہ ہوگا جیسا کہ ماوردی نے لکھا ہے (دارمی کے برخلاف) کیوں کہ یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ وہ شخص مالک نہیں ہے (بلکہ حق تملک صرف حاصل ہوا ہے) اور حق شفعہ کی طرح حق

تملیک کی بیع صحیح نہیں ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی بیع درست ہے

المجموع شرح المہذب میں ہے کہ:

"وان تحجر رجل مواتا وهوان يشرع فى احياء ولم يتمم، صار احق به من غيره...... وان نقله الى غيره صار الثانى احق به...... وان مات انتقل ذلك الى وارثه لانه حق تملك ثبت له فانتقل الى وارثه كالشفعة وان باعه ففيه وجهان احدهما وهوقول ابى اسحاق، انه يصح لانه صار احق به فملك بيعه والثانى انه لا يصح، وهوالمذهب، لانه لم يملكه بعد، فلم يملك بيعه كالشفيع قبل الاخذ

(تکملة المجموع شرح المہذب ص ۱۷۴ ج ۱۴)

"اگر کسی شخص نے افتادہ زمین پر پتھر کے نشانات لگائے یعنی اس نے زمین کو قابل استعمال بنانے کا عمل شروع کیا لیکن ابھی مکمل نہیں کیا تو وہ دوسروں کے مقابلہ میں اس زمین کا زیادہ حقدار ہے ...... اور اگر اس نے اپنا یہ حق دوسرے شخص کی طرف منتقل کیا تو دوسرا شخص اس کا زیادہ حقدار ہو جائے گا...... اور اگر اس شخص کا انتقال ہو گیا تو یہ حق اس کے وارث کی طرف منتقل ہو گا کیونکہ اس شخص کے لئے حق تملیک ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے مرنے کے بعد یہ حق وارث کی طرف منتقل ہو جائے گا جس طرح حق شفعہ منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس نے یہ حق بیچ دیا تو اس کے بارے میں دو قول ہے، پہلا قول جو ابو اسحٰق کا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہو جائے گی کیونکہ جب وہ شخص اس زمین کا حقدار ہو گیا تو اس کی فروختگی کا مالک بھی ہو گیا، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح نہ ہو گی یہی اصل مذہب ہے اس لئے کہ ابھی وہ شخص اس زمین کا مالک ہوا ہی نہیں ہے لہٰذا اس کی فروختگی کا بھی مالک نہیں ہو گا جس طرح شفیع

مکان کا مالک ہونے سے پہلے اس کے بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

خطیب شربینی نے لکھا ہے کہ ابو اسحٰق نے اس حق کی بیع کو جائز کرتے وقت علت یہ بیان کی ہے کہ یہ حق اختصاص کی بیع ہے جس طرح تعمیر اور رہائش کے لئے گھر کی علو کی بیع نیچے والے مکان کی بیع کے بغیر جائز ہوتی ہے۔ (مغنی المحتاج ص ۳۶۷ ج ۲)

اسی طرح فقہاء حنابلہ نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کئے ہیں، ایک قول جواز کا ہے اور دوسرا عدم جواز کا، موفق ابن قدامہ ؒ لکھتے ہیں:

"ومن تحجر مواتا وشرع فی احیائه ولم یتم، فهو احق به، لقول النبی صلی الله علیه وسلم: من سبق الی مالم یسبق الیه مسلم فهو احق به، رواه ابو داود فان نقله الی غیره صار الثانی احق به، لان صاحب الحق آثره به، فان مات انتقل الی وارثه، لقول رسول الله صلی الله علیه وسلم: من ترک حقا او مالا فهو لورثته، وان باعه لم یصح، لانه لم یملکه، فلم یصح بیعه کحق الشفعة، ویحتمل جواز بیعه، لانه صار احق به"

(الکافی لابن قدامۃ ص ۴۳۹ ج ۲)

"جس شخص نے افتادہ زمین پر نشانات لگائے اور اسے قابل استعمال بنانا شروع کیا، لیکن ابھی مکمل نہیں کیا وہ شخص اس زمین کا دوسروں سے زیادہ حقدار ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس شخص نے اس چیز کی طرف سبقت کی جس چیز کی طرف کسی دوسرے مسلمان نے سبقت نہیں کی، وہ اس چیز کا زیادہ حقدار ہے (ابو داؤد) اب اگر اس شخص نے کسی دوسرے کی طرف وہ زمین منتقل کی تو دوسرا شخص اس زمین کا زیادہ حقدار ہو گا، کیونکہ صاحب حق نے اسے اپنے اوپر ترجیح دی ہے اگر افتادہ زمین پر نشانات لگانے والے شخص کا انتقال ہو گیا تو وہ زمین اس کے وارث کی طرف منتقل ہو جائے گی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جس شخص نے کوئی حق یا مال چھوڑا، وہ اس کے ورثاء کا ہو گا اگر وہ شخص اس زمین کو بیچ دے تو یہ بیچنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ابھی وہ اس زمین کا مالک نہیں ہے لہٰذا اس کی بیع صحیح نہیں ہوگی جس طرح حق شفعہ کی بیع صحیح نہیں ہوتی۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس کی بیع کو جائز کہا جائے، کیونکہ وہ اس زمین کا سب سے زیادہ حقدار ہو گیا ہے ا

مرداوی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ومن تحجر مواتا لم یملکه ...... و هو احق به، و وارثه بعده و من ینقله الیه بلانزاع، ولیس له بیعه، هوالمذهب، وعلیه الاصحاب، وجزم به فی الوجیز وغیره، و قدمه فی المغنی، والشرح، وشرح الحارثی، و ابن منجا، والفروع، و الفائق وغیرهم

وقیل، یجوز له بیعه، و هو احتمال لابی الخطاب، و اطلقهما فی المحرر، والرعایتین والحاوی الصغیر"

(الانصاف للمرداوی ص ۳۷۳ ج ٦)

جس شخص نے کسی افتادہ زمین کو گھیر کر اس پر نشانات لگائے وہ اس زمین کا مالک نہیں ہوا...... لیکن وہ شخص اس زمین کا سب سے زیادہ حقدار ہے اور اس کے بعد اس کا وارث حقدار ہے، اسی طرح وہ شخص بھی حق دار ہے جس کی طرف یہ شخص اس زمین کو نزاع کے بغیر منتقل کرے۔ لیکن نشان لگانے والے شخص کے لئے اس زمین کی بیع جائز نہیں ہے، یہی مذہب درست ہے اور اسی مذہب پر امام ابن حنبل" کے تلامذہ ہیں "الوجیز" وغیرہ میں اس کو جزم کے ساتھ بیان کیا ہے، المغنی، شرح الکبیر، شرح الحارثی، شرح ابن منجا، الفروق، الفائق وغیرہ میں اسی قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس شخص کے لئے زمین کی بیع جائز ہوگی، ابو

الخطاب کا ایک قول یہی ہے، المحرر، الرعایتین اور الحاوی الصغیر میں دونوں اقوال کو کسی ایک کی ترجیح کے بغیر ذکر کیا ہے۔

مسلک شافعی اور مسلک حنبلی دونوں میں راجح یہی ہے کہ حق تملک کی بیع جائز نہیں ہے لیکن حنابلہ میں سے "بہوتی" نے ذکر کیا ہے کہ عدم جواز صرف بیع کے سلسلہ مین ہے لیکن دست برداری اور صلح کے طور پر حق تملک کا عوض لینا جائز ہے۔

علامہ بہوتی لکھتے ہیں:

(ولیس له) ای لمن قلنا انه احق بشئی من ذلک السابق (بیعه) لانه لم یملکه کحق الشفعة قبل الاخذ، و کمن سبق الی مباح لکن النزول عنه بعوض لا علی وجه البیع جائز، کما ذکره ابن نصر الله قیاسا علی الخلع"

(شرح منتہی الارادات للبہوتی ص ۴۶۴ ج ۲)

"جو شخص سبقت کی وجہ سے کسی چیز کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہو چکا ہو۔ اس کے لئے اس چیز کو بیچنا جائز نہیں ہے کیونکہ ابھی وہ اس چیز کا مالک نہیں ہوا ہے جیسے کہ حق شفعہ کو بیچنا جائز نہیں جب تک زمین پر قبضہ نہ کر لے یا جس شخص کا قبضہ کسی مباح چیز پر پہلے ہو وہ مالک ہونے سے پہلے اس کو بیچ نہیں سکتا۔ لیکن فروختگی کے بغیر اگر وہ شخص عوض لے کر کسی کے حق میں دست بردار ہو جاتا ہے تو یہ جائز ہے جیسا کہ ابن نصر اللہ نے خلع پر قیاس کرتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

حق اسبقیت کی ایک صورت وہ ہے جس کو فقہاء نے ذکر کیا ہے مثلاً جو شخص مسجد میں کسی خاص جگہ سب سے پہلے پہنچ گیا وہ اس جگہ کا سب سے زیادہ حقدار ہے اور اسے یہ اختیار ہے وہ کسی دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دیکر وہ جگہ دیدے، لیکن اس حق کا بیچنا اس کے لئے جائز نہیں، البتہ علامہ بہوتی نے ذکر کیا ہے کہ عوض لے کر اس حق سے

دست بردار ہونا جائز ہے۔

فقہاء احناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کسی فقیہ نے حق اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہو، فقہا احناف اور مالکیہ نے یہ تو ذکر کیا ہے کہ افتادہ زمین پر نشان لگانے سے وہ شخص زمین کے استعمال کرنے اور زمین کا مالک بننے کا زیادہ حقدار ہو جاتا ہے، لیکن مجھے اس حق کی بیع کی بحث ان فقہاء کے یہاں نہیں ملی، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی نزدیک بھی حق اسبقیت کی بیع جائز نہ ہو، الا یہ کہ دست برداری کے طور پر ہو۔

حق اسبقیت کی بیع کے سلسلہ میں حکم شرعی کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض فقہاء اس بیع کو جائز کہتے ہیں لیکن فقہاء کی بڑی جماعت کی رائے اس کے عدم جواز کی ہے البتہ حق اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہو جانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے واللہ سبحانہ اعلم

حق عقد

حقوق کی تیسری قسم کو ہم "حق عقد" کا نام دے سکتے ہیں "حق عقد" سے ہماری مراد کسی دوسرے کے ساتھ عقد کو وجود میں لانے یا عقد کو باقی رکھنے کا حق ہے مثلاً مکانات اور دکانوں کو خالی کرنے کا حق، لہٰذا یا مالک مکان یہ مالک دکان کے ساتھ عقد اجارہ کو وجود میں لانے یا اس کو باقی رکھنے کا حق ہے، اسی طرح شاہی وظائف یا اوقاف کے وظائف کا حق، یہ حکومت یا وقف کے متولی کے ساتھ عقد اجارہ کو باقی رکھنے کا حق ہے، ان دونوں حقوق کا عوض لینے کے مسئلہ پر فقہا نے کلام کیا ہے، اس سلسلہ میں فقہاء نے جو بحثیں کی ہیں، اس کا خلاصہ ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کا مسئلہ

اگر کسی آدمی کی اوقاف میں کوئی مستقل ملازمت ہو جس کی اسے تنخواہ ملتی ہو مثلاً مسجد کا امام یا موذن یا کوئی ملازم ہو اور شرائط اوقاف کی بنیاد پر یہ ملازمت دائمی ہو، لہٰذا وہ ملازم اس ملازمت پر باقی رہنے کا اور زندگی بھر عقد جارہ باقی رکھنے کے حق کا مالک ہے اب اس حق کا عوض لینے کے سلسلے میں فقہاء نے کلام کیا ہے فروختگی کے ذریعہ اس حق کا

عوض لینے کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا ہے، لیکن دست برداری اور صلح کے ذریعہ اس کا عوض لینے کے سلسلے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں بعض فقہاء نے اس کے عوض لینے کو منع کیا ہے کیونکہ یہ مجرد حق ہے جس کا عوض لینا جائز نہیں ہے اور بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔

متاخرین فقہاء احناف کی ایک جماعت نے مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کی صراحت کی ہے، الدر المختار میں ہے:

"وفی الاشباہ: " لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة کحق الشفعة وعلی هذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف" وفیها فی آخر بحث "تعارض العرف مع اللغة" "المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتباره، وعلیه فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال"

(ردالمحتار ص ۵۲۰ ج ۴)

"الاشباہ میں ہے کہ حقوق مجردہ کا عوض لینا جائز نہیں ہے، مثلاً حق شفعہ، اسی بنیاد پر اوقاف کی ملازمتوں کا عوض لینا بھی جائز نہیں ہوگا اور "اشباہ" میں "تعارض العرف مع اللغة" کی بحث کے آخر میں ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ عرف خاص کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، لیکن بہت سے فقہاء نے عرف خاص کے معتبر ہونے کا فتویٰ دیا ہے اور اس کی بناپر مال کے بدلے وظائف سے دستبرداری کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔"

ابن عابدین ؒ نے "الدر المختار کی مذکورہ بالا عبارت کے ذیل میں اس مسئلہ کی طویل تحقیق کی ہے اور یہ بات ثابت کی ہے کہ نزول عن الوظائف کا جواز عرف خاص پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے فقہی نظائر پر مبنی ہے جہاں تک اس حق کو حق شفعہ پر قیاس کرنے کا تعلق ہے تو یہ قیاس مع الفارق ہے، جیسا کہ ہم نے بحث کے آغاز میں علامہ بیری وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حق شفعہ دفع ضرر کے لئے مشروع ہوا ہے، اور جو حقوق دفع ضرر کے واسطے مشروع ہوتے ہیں ان کا عوض لینا جائز نہیں ہوتا لیکن "حق وظیفہ"

ایسا حق ہے جو صاحب حق کے لئے اصالتاً ثابت ہوا ہے لہٰذا اس کا عوض لینا حرام نہیں ہوگا جیسا کہ حق قصاص وغیرہ میں ہوتا ہے اسی بناپر علامہ ابن عابدین ؒ نے ذکر کیا ہے کہ حق کا عوض لینے کا عدم جواز مطلق نہیں ہے پھر انہوں نے اپنی گفتگو اس عبارت پر ختم کی ہے:

"ورائیت بخط بعض العلماء عن المفتی ابی السعود انه افتی بجواز اخذ العوض فی حق القرار والتصرف وعدم الرجوع، و بالجلة فالمسألة ظنية، والنظائر المتشابهة للبحث فيها مجال- وان كان الاظهر فيه ما قلنا، فالاولی ما قاله فی البحر من انه ينبغی الابراء العام بعده"

(ردالمحتار ص ۵۲۰ ج ۴)

"میں نے مفتی ابو السعود کی نقل کردہ بعض علماء کی تحریر دیکھی ہے کہ انہوں نے حق قرار اور حق تصرف اور حق عدم رجوع کے بارے میں عوض لینے کے جواز کا فتویٰ دیا، خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ مسئلہ ظنی ہے اور نظائر متشابہ ہیں اور اس مسئلہ میں بحث کی گنجائش ہے اگرچہ زیادہ ظاہر وہی ہے جو ہم نے کہا لیکن اولیٰ وہ ہے جسے صاحب بحر نے لکھا ہے کہ اس کے بعد ابراء عام مناسب ہے" (یعنی دوسرے کو تمام واجبات سے بری کر دے)

متاخرین فقہاء شافعیہ نے بھی مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا ہے چنانچہ علامہ رملی ؒ لکھتے ہیں:

"وافتی الوالد رحمه الله تعالی بحل النزول عن الوظائف بالمال، ای لانه من اقسام الجعالة، فيستحقه النازل و يسقط حقه" (نہایۃ المحتاج ۴۷۸ ج ۵)

"والد رحمۃ اللہ علیہ نے مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا تھا کیونکہ یہ بھی جعالۃ کی ایک قسم ہے، لہٰذا دست بردار ہونے والا شخص مال کا مستحق ہوگا اور اس کا حق

ساقط ہو جائے گا۔ "

شبراملسی نے بھی اپنے حاشیہ میں اسے تسلیم کیا ہے بلکہ انہوں نے مال کے بدلہ میں "جوامک" سے دست بردار ہونے کا جواز بھی اسی پر متفرع کیا ہے

"جوامک" جامکیہ کی جمع ہے، جامکیہ متعینہ رقم ہے جو کسی شخص کو بیت المال سے بطور عطیہ ملا کرتی ہے، احناف کے یہاں اس کی بیع جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ ایسے شخص کے ہاتھ دین کی بیع ہے جس کے ذمہ وہ دین لازم نہیں ہے، ملاحظہ ہو ردالمختار)

لیکن انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حکم اوقاف کی دائمی ملازمتوں میں جاری ہوگا، حکومت کی ملازمتیں جن میں دوام نہیں ہوتا، ان کا عوض لینا جائز نہیں ہوگا۔ چنانچہ علامہ شبراملسی" لکھتے ہیں :۔

"واما المناصب الديوانية، كالكتبة الذين يقررون من جهة الباشا فيها، فالظاهر انهم انما يتصرفون فها بالنيابة عن صاحب الدولة فيما ضبط ما يتعلق به من المصالح، فهو مخير بين ابقاء هم وعزلهم ولو بلا حجة فليس لهم يد حقيقة على شئى ينزلون عنه، بل متى عزلوا انفسهم انعزلوا واذا اسقطوا حقهم عن شئى لغيرهم فليس لهم العود الا بتولية جديدة ممن له الولاية ولا يجوزلهم اخذ عوض على نزولهم"

(حاشية الشبراملسى على نهاية المحتاج ص ٤٧٨ ج ٦)

"جہاں تک حکومت کے عہدوں کا تعلق ہے مثلاً وہ محررین جو بادشاہ کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں ان کے بارے میں ظاہر یہ ہے کہ وہ لوگ سلطان کی طرف سے نیابۃً تصرف کرتے ہیں جیسا مصالح کا تقاضہ ہوتا ہے اور پاشا کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ انہیں ملازمت میں باقی رکھے یا بلا وجہ بھی معزول کر سکتا ہے لہٰذا محرروں کو اس چیز پر حقیقی قبضہ و تصرف حاصل نہیں ہے جس سے وہ دست

بردار ہو رہے ہیں بلکہ جب بھی وہ اپنے کو معزول کر لیں تو معزول
ہو جائیں گے اور جب ان لوگوں نے کسی دوسرے کے لئے اپنا حق ختم
کر لیا اب دوبارہ معاہدے کے بغیر انہیں دوبارہ نیا حق حاصل نہیں
ہو گا، اور ان کے لئے دست برداری پر عوض لینا جائز نہیں۔"

اسی طرح کا حکم مذہب حنبلی میں بھی معلوم ہوتا ہے، حنابلہ نے لکھا ہے کہ جس شخص نے وقف میں کوئی ملازمت حاصل کی وہ اس کا زیادہ حق دار ہو گیا اور اس کے لئے یہ جائز ہے کہ دوسرے کے لئے اس حق سے دست بردار ہو جائے البتہ اس کے لئے اس حق کی بیع جائز نہیں (الانصاف للمرداوی ص ۷۶ س ج ٦)

لیکن بہوتی نے ذکر کیا ہے کہ بیع کے بغیر صرف عوض لے کر اس ملازمت سے دست برداری اس کے لئے جائز ہے، اس طرح کے چند مسائل ذکر کرنے کے بعد بہوتی لکھتے ہیں:

"(ولیس له) ای لمن قلنا انه احق بشئی من ذلک السابق (بیعه) لانه لم یملکه کحق الشفعة قبل الاخذ، وکمن سبق الی مباح، لکن النزول عنه بعوض لا علی وجه البیع جائز، کما ذکره ابن نصر الله قیاسا علی الخلع"
(شرح منتہی الارادات ص ۴۶۴ ص ۲)

"جو شخص کسی چیز کا زیادہ حق دار ہو اس کے لئے اس چیز کی بیع جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اس کا مالک نہیں ہے مثلاً مکان یا دکان ملنے سے پہلے حق شفعہ کی بیع اور مثلاً جس شخص نے کسی مباح چیز کی طرف سبقت کی اس کا اس مباح چیز کو بیچنا جائز نہیں لیکن سبقت کرنے والے شخص کا بیع کے بغیر عوض لے کر اس سے دست بردار ہونا جائز ہے جیسا کہ ابن نصر اللہ نے خلع پر قیاس کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔"

مجھے اپنی ناقص تتبع و تلاش کے بعد مالکیہ کے یہاں وظائف سے دست برداری کے بارے میں کوئی چیز نہیں ملی لیکن وہ لوگ جامکیہ کی بیع کو جائز کہتے ہیں۔

(دیکھئے: مواہب الجلیل للحطاب ص ۲۲۴ ج ۴) ہو سکتا ہے کہ شاید نزول عن الوظائف کے مسئلہ کو اسی پر قیاس کرتے ہوں۔ واللہ سبحانہ اعلم

بسا اوقات مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کے جواز پر اس واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ خلافت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہوئے اور مال کے بدلہ میں ان سے صلح کی، علامہ بدر الدین عینیؒ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"وفیه جواز خلع الخلیفة نفسه اذا رای فی ذلک صلاحاً للمسلمین، وجواز اخذ المال علی ذلک واعطائه بعد استیفاء شرائطه بان یکون المنزول له اولی من النازل، وان یکون المبذول من مال الباذل"

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ص ۲۰۸ ج ۲۴)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اگر مسلمانوں کے لئے بہتر سمجھے تو اپنے کو برطرف کر سکتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ خلافت سے دست برداری پر مال لینا اور شرائط پوری ہونے کے بعد خلافت دینا جائز ہے، اس طور سے کہ جس کے حق میں دستبرداری ہو رہی ہے وہ دست بردار ہونے والے سے زیادہ بہتر ہو اور خرچ کیا ہوا مال خرچ کرنے والے کی ملکیت ہو۔"

بہرحال اس باب میں فقہاء کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک حق ملازمت کی بیع جائز نہیں ہے لیکن جمہور فقہاء متاخرین اس بات کو جائز کہتے ہیں کہ صاحب ملازمت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور اس شخص سے مال لے لے جس کے حق میں دست بردار ہوا ہے۔

پھر فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ شخص جس کے حق میں دست برداری ہوئی ہے وہ اس ملازمت کے لئے دست برداری ہی کی بنا پر متعین ہو جائے گا یا نہیں؟ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ جس کے حق میں دست برداری ہوئی ہے وہ ملازمت کے لئے متعین نہیں ہو گا بلکہ متولی اوقاف کو اختیار ہو گا کہ اسے متعین کرے یا

کسی اور کو متعین کرے البتہ اگر متولی او قاف اسے متعین نہ کرے تو اس صورت میں اس شخص نے دست بردار ہونے والے کو جو کچھ دیا تھا وہ اس سے واپس لینے کا حق دار نہیں ہوگا کیونکہ دست بردار ہونے والے کے بس میں جو کچھ تھا اس نے کیا یعنی وہ دست بردار ہو گیا لہٰذا وہ مال کا مستحق ہو گیا، اسی کی صراحت شافعیہ میں سے رملی اور شبراملسی نے کی ہے (نہایۃ المحتاج ص ۴۷۸ ج ۶) اور احناف میں سے حموی اور مفتی ابو السعود نے کی ہے۔ (شرح الاشباہ والنظائر للحموی ص ۱۳۹ ج ۱)

لیکن ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

"ثم اذا فرغ عنه لغيره ولم يوجهه السلطان للمفروغ له بل ابقاه على الفارغ اووجهه لغيرهما، فينبغي ان يثبت الرجوع للمفروغ له على الفارغ ببدل الفراغ لانه لم يرض بدفعه الا بمقابلة ثبوت ذلك الحق له لا بمجرد الفراغ وان حصل لغيره، وبهذا افتى في الاسماعيلية والحامدية وغيرهما، خلافا لما افتى به بعضهم من عدم الرجوع لان الفارغ فعل ما في وسعه وقدرته اذلا يخفى انه غير مقصود من الطرفين ولا سيما اذا ابقى السلطان والقاضي التيمار او الوظيفة على الفارغ، فانه يلزم اجتماع العوضين في تصرفه وهو خلاف قواعد الشرع فافهم" (رد المحتار لابن عابدين ص ۵۲۰ ج ۴)

"پھر جب صاحب وظیفہ دوسرے کے لئے دست بردار ہو گیا اور سلطان نے وہ عہدہ اس شخص کو نہیں دیا جس کے حق میں دست برداری ہوئی تھی بلکہ دست بردار ہونے والے کو ہی اس پر باقی رکھا یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور شخص کو وہ وظیفہ سونپا تو مناسب یہ ہے کہ جس شخص کے لئے دستبرداری ہوئی تھی اسے دستبرداری ہونے والے شخص سے دستبرداری کا معاوضہ واپس لینے کا اختیار ہو کیونکہ جس شخص کے حق میں دست برداری ہوئی تھی اس نے معاوضہ اسی لئے دیا تھا کہ حق وظیفہ اسے حاصل ہو جائے،

محض دستبرداری کی بناء پر (خواہ وہ وظیفہ دوسرے کو مل جائے) معاوضہ دینے پر راضی نہیں ہوا تھا، اسمعیلیہ اور حامدیہ وغیرہ میں اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے اور یہ فتویٰ ان لوگوں کے بر خلاف ہے جنہوں نے کہا ہے کہ اسے دستبرداری کا معاوضہ کسی صورت میں واپس لینے کا اختیار نہیں، کیونکہ دستبردار ہونے والے کے اختیار میں جو تھا وہ اس نے کیا یعنی دست بردار ہو گیا۔ یہ بات مخفی نہیں کہ فریقین کے درمیان محض دست برداری مقصود نہیں تھی۔ خصوصاً جب کہ سلطان یا قاضی نے اس وظیفہ اور تیمار پر دست بردار ہونے والے کو ہی باقی رکھا، اس صورت میں تو اسی کے تصرف میں دونوں عوضوں کا جمع ہونا لازم آئے گا اور یہ بات قواعد شرع کے خلاف ہے۔

اس سلسلے میں احقر کی رائے یہ ہے کہ جب سلطان و قاضی نے تیمار اور وظیفہ پر دست بردار ہونے والے ہی کو باقی رکھا تب تو دست برداری کے معاوضہ کو واپس لینے کا جواز ظاہر ہے اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا ذکر علامہ ابن عابدینؒ نے کیا ہے کہ دونوں عوضوں کا اسی کے تصرف میں جمع ہونا لازم آئیگا، ثانیاً اس لئے کہ صاحب وظیفہ دست برداری پر عوض کا مستحق ہوا تھا اور جب اسے دستبرداری مل نہ سکی تو وہ مال کا مستحق بھی نہیں ہوا، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ وہ عوض کو واپس کرے۔

اگر قاضی یا متولی اوقاف نے اس کی دست برداری کو نافذ کر کے اسے ملازمت سے فارغ کر دیا لیکن قاضی یا متولی وقف نے اس کی جگہ اس شخص کو مقرر نہیں کیا جس کے حق میں وہ دستبردار ہوا تھا بلکہ کسی تیسرے شخص کو نامزد کر دیا تو قواعد شرع کا تقاضہ یہ ہے کہ جس شخص کے حق میں دست برداری ہوئی تھی اسے دست بردار ہونے والے شخص سے دست برداری کا معاوضہ واپس لینے کا اختیار نہ ہو کیونکہ فقہاء نے بیع کے طور پر حق وظیفہ کا عوض لینے کو جائز نہیں کہا ہے بلکہ صلح اور دستبرداری کے طور پر معاوضہ لینے کی اجازت دی ہے حق کی بیع اور مال کے بدلے میں حق سے دست برداری میں فرق یہی ہے کہ "بیع" خریدار کی طرف اس چیز کو منتقل کر دیتی ہے جس کا بائع مالک تھا اور

دست برداری "ملکیت" اس شخص کی طرف منتقل نہیں کرتی۔ جس کے حق میں دستبرداری ہوئی ہے صرف اتنا ہوتا ہے کہ دست بردار ہونے والا اپنا حق ختم کر دیتا ہے، جس شخص کے حق میں دست برداری ہوئی ہے اسے صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ دست بردار ہونے والے کی طرف سے مزاحمت ختم ہو جاتی ہے۔

امام قرافی نے نقل اور اسقاط کے قاعدوں کے فرق پر پوری وضاحت سے گفتگو کی ہے وہ فرماتے ہیں:

"اعلم ان الحقوق و الا ملاک ینقسم التصرف فیھا الی قل و اسقاط فالنقل ینقسم الی ما ھو بعوض ی الاعیان، کالبیع و القرض، و الی ما ھو المنافع، کالا جارۃ و المساقاۃ و المزارعۃ و القراض و الجعالۃ، و الی ما ھو بغیر عوض، کالھدا یا و الوصایا و العمری، و الوقف و الھبات و الصدقات، و الکفارات، و الزکاۃ و المسروق من اموال الکفار و الغنیمۃ ی الجھاد، فان ذلک کلہ نقل ملک ی اعیان بغیر عرض۔

واما الاسقاط فھو اما بعوض کالخلع، و العفو علی مال و الکتابۃ و بیع العبد من نفسہ و الصلح علی الدین و التعزیر، فجمیع ھذہ الصور یسقط فیھا الثابت و لا ینتقل الی الباذل ما کان یملکہ المبذول لہ من العصمۃ و بیع العبد و نحوھما" (الفروق للقرافی ص ۱۱۰ ج ۲)

"حقوق و املاک میں تصرف کی دو صورتیں ہیں ایک منتقل کرنا، دوسرے ساقط کرنا پھر منتقل کرنے کی مختلف قسمیں ہیں (۱) اعیان میں بالعوض منتقل کرنا مثلاً بیع اور قرض (۲) منافع میں بالعوض منتقل کرنا مثلاً اجارہ، مساقاۃ اور مزارعت (۳) بلا عوض منتقل کرنا مثلاً ہدیہ، وصیت، عمری، وقف، ہبہ، صدقہ، کفارہ، زکوۃ، کفار کے اموال میں سے سرقہ کیا ہوا، جہاد کا مال غنیمت، ان سب میں اعیان کی ملکیت بغیر عوض منتقل ہوتی ہے۔

اور اسقاط یا تو بالعوض ہو گا جس طرح خلع میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مال کے بدلے میں معاف کرنے، غلام کو مکاتب بنانے، غلام کو اسی کے ہاتھ بیچنے، دین اور تعزیر پر صلح کرنے میں ہوتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں ثابت شدہ حق اور ملکیت ساقط ہو جاتی ہے لیکن باذل کی طرف وہ چیزیں منتقل نہیں ہوتیں جس کا مبذول مالک تھا یعنی عصمت، غلام کی بیع وغیرہ۔

جب فقہاء کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ ان حضرات نے حق وظیفہ کا عوض لینا، دستبرداری اور اسقاط کے طور پر جائز قرار دیا ہے نہ کہ بیع اور نقل ملکیت کے طور پر (جیسا کہ بہوتی کی شرح منتہی الارادات کے حوالہ میں گزر چکا) تو یہ ضروری ہے کہ بیع اور اسقاط کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے اور اس کی صورت یہ ہے جو میں نے بیان کی کہ دستبردار ہونے والا محض دستبرداری سے عوض کا مستحق ہو جائے گا اور محض اس کی دستبرداری سے اس شخص کی طرف حق منتقل نہ ہو گا جس کے حق میں وہ دستبردار ہوا ہے۔

مکانوں اور دکانوں کی پگڑی

اسی نوع کا ایک حق وہ ہے جس کا رواج بہت سے شہروں میں ہے یعنی مکانوں اور دکانوں کی پگڑی کی بیع "پگڑی" کسی مکان یا دکان میں حق قرار کا نام ہے، بسا اوقات مالک مکان یا مالک دکان اپنا مکان یا دکان طویل مدت کے لئے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یک مشت لیتا ہے۔ کرایہ دار یک مشت رقم دے کر اس بات کا حق دار ہو جاتا ہے کہ کرایہ داری طویل ...... مدت تک یا تاحیات باقی رکھے، پھر بسا اوقات کرایہ دار اپنا یہ حق دوسرے کرایہ دار کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور اس سے یہ رقم لیتا ہے جس کی بنا پر یہ دوسرا شخص مالک مکان و دکان سے عقد اجارہ کا حقدار ہو جاتا ہے۔ اگر مکان یا دکان کا مالک کرایہ دار سے مکان یا دکان واپس لینا چاہے تو اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ کرایہ دار کو اتنی رقم ادا کرے جس

پر دونوں راضی ہوں اس یک مشت لئے جانے والی رقم کو مختلف بلاد عربیہ میں "خلو"[1] اور "جلسہ" کہا جاتا ہے اور ہندو پاک میں "پگڑی" اور "سلامی" کہتے ہیں۔

اس پگڑی کے بارے میں اصل حکم عدم جواز کا ہے کیونکہ یہ یا تو "رشوت" ہے یا "حق مجرد" کا عوض ہے۔ لیکن بعض فقہاء سے منقول ہے کہ انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے سب سے پہلے وہ فقیہ جن کی طرف بدل خلو (پگڑی) کے جواز کی بات منسوب ہے دسویں صدی ہجری کے مالکی فقیہہ علامہ ناصر الدین لقانی ہیں، اس کے بعد ایک بڑی جماعت نے اس مسئلہ میں ان کی اتباع کی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وقد اشتهر نسبة مسألة الخلو الى مذهب الامام مالك، والحال انه ليس فيه نص عنه، ولا عن احد من اصحابه، حتى قال البدر القرافى من المالكية: انه لم يقع فى كلام الفقهاء التعرض لهذه المسئلة وانما فيها فتيا للعلامة ناصر الدين اللقانى المالكى، بنا ها على العرف وخرجها عليه، وهو من اهل الترجيح فيعتبر تخريجه، وان نوزع فيه، وقد انتشر فتياه فى المشارق والمغارب وتلقا ها علماء عصره بالقبول"

(رد المحتار ص ۵۲۱ ج ۴)

مسئلہ: خلو کو عموماً امام مالکؒ کے مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ اس بارے میں نہ تو امام مالک کی کوئی نص ہے نہ ان کے کسی شاگرد کی، حتیٰ کہ علامہ قرافی مالکیؒ نے لکھا ہے کہ فقہاء کے کلام میں اس مسئلہ سے تعرض نہیں کیا گیا ہے، البتہ اس مسئلے میں علامہ ناصر الدین لقانی کا ایک فتویٰ ہے جس کی بنیاد عرف پر انہوں

---

[1] "خلو" کا لفظ مجھے اس مفہوم میں مشہور کتب لغت میں نہیں ملا۔ حتیٰ کہ وہ نئی لغتیں جو پرانے الفاظ کے نئے استعمالات کو بیان کرتی ہیں ان میں بھی یہ لفظ اس مفہوم میں نہیں ملا۔ مجھے اس لفظ کے حروف کا صحیح اعراب نہیں مل سکا لیکن مشہور "خلو" ہے "خا" اور "لام کے پیش" اور "واو" کی تشدید کے ساتھ، یہ بھی ممکن ہے کہ "خلو" "خا" کے کسرہ "لام" کے سکون اور "واو" کی تخفیف کے ساتھ۔ واللہ اعلم

نے عرف کی بنا پر اس مسئلہ کی تخریج کی ہے اور وہ اصحاب ترجیح میں سے ہیں، لہٰذا ان کی تخریج کا اعتبار کیا جائے گا، اگرچہ اس بارے میں ان سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ لیکن ان کا فتویٰ مشرق و مغرب میں مشہور ہو گیا اور علماء عصر نے اس فتویٰ کو قبول کیا ہے۔

بعض فقہاء احناف نے خلو کے جواز پر فتاویٰ خانیہ کے ایک مسئلہ سے استدلال کیا ہے، وہ مسئلہ یہ ہے:

"رجل باع سکنی له فی الحانوت لغیرہ، فاخبر المشتری ان اجرة الحانوت کذا، فظهر انها اکثر من ذلک قالوا لیس له ان یرد السکنی بهذا العیب"

ایک شخص نے دوسرے کی دوکان میں اپنا سکنی فروخت کیا، اس نے خریدار کو خبر دی کہ دوکان کا کرایہ اتنا ہے لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ کرایہ مکان اس سے زیادہ ہے تو خریدار کو اس عیب کی بنا پر بیع رد کرنے کا اختیار نہ ہو گا۔

اس عبارت سے خلو کے جواز پر استدلال کرنے والوں نے سمجھا کہ اس میں سکنی سے مراد "خلو" "پگڑی" ہی ہے لیکن علامہ شرنبلالیؒ نے تحقیق فرمائی ہے کہ سکنی سے مراد دکان میں اضافہ کی گئی کوئی مادی چیز ہے، جو "خلو" کے علاوہ کوئی اور چیز ہے لہٰذا اس سے احناف کے یہاں خلو کے جواز پر استدلال کرنا درست نہیں ہے کیوں کہ سکنی کی خریداری عین (متعین مادی چیز) کی خریداری ہے نہ کہ خلو کی خریداری ہے پھر ابن عابدینؒ نے فتاویٰ خیریہ سے نقل کیا ہے، کہ اگر کسی مالکی قاضی نے خلو کے لازم ہونے کا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ صحیح اور لازم ہو گا، اس بحث کے آخر میں علامہ ابن عابدینؒ نے لکھا ہے:

"و ممن افتی بلزوم الخلو الذی یکون بمقابلة دراهم یدفعها للمتولی او المالک العلامة المحقق عبد الرحمن آفندی العمادی صاحب هدیة ابن العماد، وقال فلا

یملک صاحب الحانوت اخراجه والا اجارتها لغیره، مالم یدفع له المبلغ المرقوم، فیفتی بجواز ذلک للضرورة"

"ان لوگوں میں سے جنہوں نے اس "خلو" کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا ہے جو "خلو" متولی یا مالک کو دیئے ہوئے دراہم کے بدلے میں حاصل ہوتا ہے ان میں سے علامہ محقق عبدالرحمٰن آفندی عمادی مصنف ہدیۃ ابن العماد ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ دکان کا مالک نہ اسے نکال سکتا ہے نہ دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے جب تک اتنی رقم کرایہ دار کو واپس نہ کر دے جتنی کرایہ پر دیتے وقت اس سے لی تھی، لہٰذا ضرورت کی بناپر "خلو" کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کی بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مروجہ پگڑی کے جواز کی طرف مائل ہیں لیکن مالکیہ کی ان کتابوں کی طرف مراجعت کے بعد، جن کی طرف خلو کا جواز منسوب ہے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے جس خلو کے جواز کا فتویٰ دیا ہے وہ ہمارے دور کی مروجہ پگڑی نہیں ہے اس لئے کہ مروجہ پگڑی کی شکل تو یہ ہے کہ پگڑی مجرد حق کرایہ داری کا نام ہے چاہے مکان یا دکان میں کوئی پائدار عین زائد موجود ہو یا نہ ہو مجھے فقہاء مالکیہ کے یہاں مروجہ پگڑی کا جواز نہیں ملا بلکہ اس کے خلاف ہی ملا جس خلو کا عوض لینا مالکیہ نے جائز قرار دیا ہے اس کی دوسری صورتیں ہیں، ان تمام صورتوں میں مستاجر کے لئے مکان یا دکان میں کرایہ دار کے لئے کوئی مستقل اور پائیدار عین ہونا ضروری ہے یہاں میں فقہاء مالکیہ کی دو عبارتیں نقل کرتا ہوں جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

چنانچہ عدوی نے الخرشی کی شرح میں لکھا ہے۔

"اعلم أن الخلو یصور بصور، منها ان یکون الوقف آئلا للخراب، فیکریه ناظر الوقف لمن یعمره بحیث یصیر الحانوت مثلاً یکری بثلاثین نصف فضة و یجعل علیه لجهة الوقف خمسة عشر، فصارت المنفعة مشترکة

بینهما، فما قابل الدراہم المصروفة من المنفعة هوالخلو، فیتعلق به البیع والوقف والارث والهبة وغیر ذلک، ویقضی منه الدین وغیر ذلک، ولایسوغ للناظر اخراجه من الحانوت ولو وقع عقد الایجار علی سنین معینة کتسعین سنة، ولکن شرط ذلک ان لا یکون ریع یعمربه۔

الثانیة: ان یکون لمسجد مثلا حوانیت موقوفة علیه واحتاج المسجد للتکمیل اوعمارة، ویکون الدکان یکری، مثلاً لشهر بثلاثین نصفا، ولا یکون هناک ریع یکمل به المسجد اویعمربه، فیعمد الناظر الی الساکن فی الحوانیت فیاخذمنه قدرامن المال یعمر به المسجد، و یجعل علیه خمسة عشر مثلافی کل شهر والحاصل ان منفعة الحانوت المذکورة شرکة بین صاحب الخلو والوقف بحسب ما یتفق علیه صاحب الخلو والناظر علی وجه المصلحة، کما یوخذ مما افتی به الناصر کما افاده عج

الثالثة: ان تکون ارض محبلسة، فیستاجرها من الناظر و یبنی فیها دارا مثلا علی ان علیه فی کل شهر لجهة الوقف ثلاثین نصف فضة، ولکن الدار تکری بستین نصف فضة مثلا، فالمنفعة التی تقابل الثلاثین الاخری یقال لها خلو (حاشیة العدوی علی الخرشی ص ۷۹ ج ۷)

"خلو کی چند صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ وقف کی جائداد ویران ہورہی ہو، وقف کا متولی کسی ایسے شخص کو وہ جائداد کرائے پر دیدے جو اس کو آباد کرکے اس میں دوکان تعمیر کرے پھر یہ دکان تیس درہم کرایہ پر دی جائے، جس میں سے پندرہ درہم وقف کے ہوں، (اور پندرہ تعمیر کرنے والے کے) اس

طرح دکان کی منفعت وقف اور اصل کرایہ دار میں مشترک ہو جائے جو دراہم اصل کرایہ دار نے خرچ کئے اس کے بدلے میں جو حق منفعت اس شخص کو حاصل ہوا، اسے "خلو" کہا جاتا ہے لہٰذا اس "خلو" سے تمام تصرفات مثلاً بیع، وقف، میراث، ہبہ وغیرہ متعلق ہوں گے، دین وغیرہ کی ادائیگی بھی اس سے کی جاسکتی ہے، وقف کے متولی کے لئے اسے دکان سے نکالنا جائز نہ ہوگا، اگرچہ عقد اجارہ متعین مدت کے لئے مثلاً نوے سال کے لئے کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ وقف کے سرمایہ کے ذریعہ اس کی تعمیر نہ کی جا سکتی ہو۔

"خلو" کی دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد پر چند دکانیں وقف ہیں، مسجد کی تکمیل یا نئی تعمیر کے لئے سرمایہ کی ضرورت پڑی، ایک دکان کا ماہانہ کرایہ تیس درہم ہے، کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے، جس سے مسجد کی تکمیل یا تعمیر نو کی جاسکے لہٰذا مسجد کی متولی دکانوں کے کرایہ داروں سے خاص مقدار کی رقم مسجد تعمیر کرنے کے لئے ان سے وصول کرے، اور ماہانہ کرایہ تیس درہم کے بجائے پندرہ درہم کر دے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دکان کی منفعت صاحب "خلو" کرایہ دار اور وقف کے درمیان اس مقدار پر مشترک ہو جائے گی جتنے پر صاحب خلو اور متولی وقف از روئے مصلحت راضی ہو جائیں جیسا کہ الناصر کے فتوٰی سے معلوم ہوتا ہے "عج" نے یہ بات لکھی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی زمین ہے جسے کوئی شخص وقف کے متولی سے کرایہ پر لے کر اس طور سے اس میں عمارت تعمیر کر دے کہ اس عمارت کا کرایہ ساٹھ درہم ہوگا، جس میں سے تیس درہم وقف کو ملیں گے اور مزید تیس درہم کی منفعت عمارت بنانے والے کو حاصل ہوگی اسی کو خلو کہا جاتا ہے۔

شیخ محمد احمد علیش رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ناصر لقانی کا فتویٰ نقل کیا ہے، پھر خلو کی مختلف صورتیں ذکر کی ہیں یہ صورتیں وہی ہیں جو ہم نے عدوی کے حوالے سے اوپر نقل کی ہیں، پھر انھوں نے ایک فصل قائم کر کے خلو کی صحت کی شرطیں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فصل فی شروط صحة الخلو،منها ان تکون الدراھم المرفوعة عائدة علی جھة الوقف یصرفھا فی مصالحه، فما یفعل الآن من صرف الناظر الدراھم فی مصالح نفسه بحیث لا یعود علی الوقف منھا شیئی فھو غیر صحیح، ویرجع دافع الدراھم بھا علی الناظر۔

ومنھا ان لا یکون للوقف ریع یعمر منه، فان کان له ریع یفی بعمارته مثل اوقاف الملوک، فلا یصح فیه خلو، ویرجع دافع الدراھم بھا علی الناظر ومنھا ثبوت الصرف فی منافع الوقف بالوجه الشرعی...... وفائدة الخلوانه یصیر کالملک ویجری علیه البیع والاجارة والھبة والرھن ووفاء الدین والارث کما یوخذ من فتوی الناصر اللقانی"

(فتح العلی المالک محمد علیش ص ۲۰۱ ج ۲)

یہ فصل خلو کے صحت کی شرطوں کے بیان میں ہے، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جو دراہم وقف کو ملیں انہیں وقف کے مصالح میں میں خرچ کیا جائے، آج کل یہ جو ہو رہا ہے کہ وقف کا متولی ان دراہم کو اپنے ذاتی مصالح میں خرچ کر لیتا ہے اور وقف کو اس میں سے کچھ نہیں ملتا یہ درست نہیں ہے، دراہم دینے والا ان دراہم کو متولی وقف سے واپس لے سکتا ہے۔

ایک شرط یہ ہے کہ وقف کی کوئی ایسی آمدنی نہ ہو جس سے تعمیر کرائی جاسکے، اگر وقف کے پاس ایسی آمدنی ہے جس سے اس کی تعمیر ہو سکتی ہے مثلاً سلاطین کے اوقاف ہیں تو پھر اس وقف میں

خلو کا معاملہ صحیح نہیں ہو گا اور دراہم دینے والا وقف کے متولی سے
وہ دراہم واپس لے لے گا، ایک شرط یہ ہے کہ وقف کے منافع کو
شرعی طور پر اس کے مصارف میں خرچ کیا جاتا ہو...... خلو کا فائدہ
یہ ہے کہ وہ ملک کی طرح ہو جاتا ہے، اسے بیچنا، کرایہ پر دینا، ہبہ
کرنا رہن رکھنا، دین کی ادائیگی کرنا اور میراث جاری ہونا سب صحیح
ہوتا ہے جیسا کہ ناصر لقانی کے فتوے سے معلوم ہوتا ہے۔

فقہائے مالکیہ کی ان عبارتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس "خلو" کے جواز کا علامہ لقانی نے فتویٰ دیا اور بہت سے فقہائے مالکیہ نے اسے تسلیم کیا اس خلو کا دور حاضر کے مروجہ خلو (پگڑی) سے دور کا بھی تعلق نہیں، کیوں کہ علامہ لقانی نے جس خلو کو جائز کہا ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وقف کا کرایہ دار وقف کی زمین میں عمارت تعمیر کرتا ہے اس کی وجہ سے جتنا اس نے خرچ کیا ہے اس کے بقدر دوکان کی منفعت میں شریک ہو جاتا ہے لہٰذا اسی کے بقدر اس کے لئے دوکان کا کرایہ کم کر دیا جاتا ہے اور اسے اس دوکان میں حق قرار حاصل ہو جاتا ہے، اس کرایہ دار نے اگر دوسرے آدمی کے ہاتھ یہ حق قرار بیچا تو یہ حق مجرد کی بیع نہیں ہوئی بلکہ ایسی منفعت کی بیع ہوئی جو دوکان میں اضافہ کئے گئے اعیان سے متعلق ہے اور یہ منفعت اس کی ملکیت ہے، فقہاء مالکیہ نے تعمیر وقف کی ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت دی ہے اسی واسطے ان حضرات نے یہ شرط لگائی ہے کہ وقف کی کوئی ایسی آمدنی نہ ہو جس سے اس کی تعمیر کی جاسکے اگر آمدنی ہے تو یہ عقد جائز نہیں ہو گا۔

بلاشبہ بعض فقہاء مالکیہ نے ان زمینوں میں بھی جو وقف نہیں بلکہ ذاتی ملکیت ہیں اس طرح کے خلو کو جائز کہا ہے، لیکن اس کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ کرایہ دار نے اس میں کوئی عمارت تعمیر کی ہو یا اس میں کوئی دوسرا مستقل اضافہ کیا ہو اسی کو ان کی اصطلاح میں "جدک" کہا جاتا ہے، چنانچہ شیخ محمد علیش لکھتے ہیں۔

"ثم ان الخلور بما يقاس عليه الجدك المتعارف فی
حوانيت مصرفان قال قائل: الخلو انما هو فی الوقف
لمصلحة وهكذا يكون فی الملك، قيل له: اذاصح فی وقف

فالملک اولی لان المالک یفعل فی ملکه ما یشاء نعم! بعض الجدکات بناء او اصلاح اخشاب فی الحانوت مثلاً باذن، وھذا قیاسه علی الخلو ظاھر...... و بعض الجدکات وضع امور مستقلة فی المکان غیر مستمرة فیه، کما یقع فی الحمامات و حوانیت القھوة بمصر، فھذه بعیدة عن الخلوات، فالظاھر ان للمالک اخراجھا" (حوالہ سابقہ ص ۲۵۲)

پھر بسا اوقات خلو پر مصر کی دو کانوں میں متعارف "جدک" کو قیاس کیا جاتا ہے اگر کوئی آدمی یہ سوال کرے کہ وقف میں تو خلو کی اجازت مصلحت کی بنا پر دی گئی ہے اور جدک ذاتی ملکیت میں ہوتا ہے وقف میں نہیں ہوتا تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ جب وقف میں صحیح ہے تو ملک میں بدرجہ اولیٰ صحیح ہو گا اس لئے کہ مالک اپنے ملک میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے، ہاں بعض جدک تعمیر کی صورت میں ہوتے ہیں اور بعض مالک کی اجازت سے دو کان میں چند لکڑیوں کی مرمت کرانے کی صورت میں ہوتے ہیں ایسے جدک کا خلو پر قیاس کرنا تو ظاہر ہے بعض جدک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ گھر میں کچھ مستقل چیزیں بنالی جاتی ہیں جو مستمر نہیں ہوتیں جیسا کہ مصر کے غسل خانوں اور قہوے کی دو کانوں میں ہوتا ہے اس طرح کے جدک کا خلو سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کے بارے میں ظاہر یہ ہے کہ مالک کو ان کے نکالنے کا اختیار ہو گا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مالکیہ ہمارے دور میں مروج پگڑی کے جواز کے قائل نہیں ہیں جس کے ساتھ نہ کوئی تعمیر ہوتی ہے نہ مکان یا دو کان میں ثابت و پائیدار اضافے کئے جاتے ہیں، پھر بات وہیں لوٹتی ہے جو ہم نے شرنبلالی کے حوالے سے بحث کے شروع میں نقل کی تھی کہ محض خلو کی بیع جائز نہیں ہے۔ خلو کی بیع اس وقت جائز ہو گی جبکہ اس کے ساتھ دو کان میں کوئی تعمیری یا مستقل اضافہ کر دیا گیا ہو۔ جسے کبھی "سکنی" کہا جاتا ہے، کبھی "جدک" حاصل بحث وہ ہے جس کو علامہ ابن عابدین

علیہ الرحمہ نے تنقیح الحادیہ میں ذکر کیا ہے چنانچہ موصوف "سکنی" کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"وهو غير الخلو الذى هو عبارة عن القدمية ووضع اليد، خلا فالمن زعمهو، واستدل بذلك على جوازبيع الخلو، فانه استدلال فاسد، لماعلمت من ان السكنى اعيان قائمة مملوكة، كما اوضحه العلامة الشرنبلالى فى رسالة خاصة لكن اذا كان هذا الجدك المسمى بالسكنى قائما فى ارض وقف فهومن قبيل مسألة البناء اوالغرس فى الارض المحتكرة، لصاحبه الاستبقاء باجرة مثل الارض، حيث لاضررعلى الوقف، وان ابى الناظر، نظراًللجانبين على ماشى عليه فى متن التنوير.......... ولا ينافيه مافى التجنيس من ان لصاحب الحانوت ان يكلفه رفعه، لان ذاك فى الحانوت الملك، بقرينة مافى الفصولين: والفرق ان الملك قديمتنع صاحبه عن ايجاره، ويريدان يسكنه بنفسه اويبيعه اويعطله، بخلاف الموقوف المعدلا يجار، فانه ليس للناظر الا ان يوجره، فايجاره من ذى اليد باجرة مثله اولى من ايجاره من اجنبى لمافيه من النظر للوقف ولذى اليد"

(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ لابن عابدین ص ۲۰۰ ج ۲)

"سکنی" اس خلو کے علاوہ ہے جو محض پرانا کرایہ دار ہونے اور قابض ہونے کا نام ہے ان لوگوں کے بر خلاف جن کا یہ گمان ہے کہ "سکنی" ہی "خلو" ہے اور اس سے "خلو" کی بیع کے جواز پر استدلال کیا ہے یہ استدلال فاسد ہے کیونکہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ "سکنی" پائیدار اور مملوک اعیان کا نام ہے جیسا کہ علامہ شرنبلالی نے ایک مستقل رسالہ میں اس کی وضاحت کی ہے، لیکن اگر یہ "جدک" جس کو "سکنی" کہا جاتا ہے وقف کی زمین میں

قائم ہو تو یہ اسی طرح کی چیز ہوگی جیسا کہ محتکرہ زمین میں عمارت تعمیر کرنے یا درخت لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اس صورت میں صاحب جدک کو کرایہ مثل دے کر اسے اپنے قبضے میں باقی رکھنے کا اختیار ہے کرایہ مثل کی شرط اس واسطے ہے تاکہ وقف کا نقصان نہ ہو، اگرچہ وقف کا متولی اس پر راضی نہ ہو۔ دونوں فریقوں کی رعایت کرتے ہوئے یہی قول متن التنویر میں اختیار کیا گیا ہے...... التجنیس میں یہ جو لکھا ہوا ہے کہ دوکان کے مالک کو اختیار ہے کہ کرایہ دار کو جدک ہٹانے پر مجبور کرے یہ بات ہماری مذکورہ بالا بات کے منافی نہیں ہے کیوں کہ التجنیس میں جو بات لکھی ہوئی ہے وہ اس دوکان کے بارے میں ہے جو شخصی ملکیت ہے اس کا قرینہ جامع الفصولین کی یہ عبارت ہے. ملکیت اور وقف میں فرق یہ ہے کہ جو مکان شخصی ملکیت ہو اس کا مالک مکان کبھی اس کو کرایہ پر دینے سے باز آجاتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خود اس میں رہائش اختیار کر لے یا اسے فروخت کر دے یا معطل چھوڑ دے لیکن جو مکان وقف کی ملکیت ہے اور کرایہ پر دینے کے لئے بنایا گیا ہے اس کے بارے میں وقف کے متولی کو کرایہ پر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، لہٰذا اس مکان پر جس شخص کا قبضہ ہے اسی کو اجرت مثل پر کرایہ پر دینا کسی اجنبی شخص کو کرایہ پر دینے سے زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ اس میں وقف اور صاحب قبضہ دونوں کی مصلحت کی رعایت ہے"

مروجہ پگڑی کا متبادل

ہم نے اوپر جو بحثیں کی ہیں ان سے یہ بات محقق ہو گئی کہ ہمارے زمانے کی موجودہ پگڑی جو مالک مکان کرایہ دار سے لیتا ہے جائز نہیں ہے اور پگڑی کے نام پر لی جانے والی یہ رقم شریعت کے کسی قاعدے پر منطبق نہیں ہوتی، لہٰذا یہ رقم رشوت اور حرام

ہے۔

البتہ پگڑی کے مروجہ نظام میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ممکن ہے:

(۱) ۔ مالک مکان و دکان کے لئے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یک مشت رقم لے لے جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے یہ یک مشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس یک مشت لی ہوئی رقم پر اجارہ کے سارے احکام جاری ہوں گے، اگر اجارہ کسی وجہ سے طے شدہ مدت سے پہلے فسخ ہو جائے تو مالک کے ذمے واجب ہو گا کہ اجارہ کی باقی ماندہ مدت کے مقابل میں یک مشت رقم کا جتنا حصہ آرہا ہے اسے واپس کر دے۔

(۲) ۔ اگر اجارہ متعینہ مدت کے لئے ہوا ہے تو کرایہ دار کو اس مدت تک کرایہ داری باقی رکھنے کا حق ہے لہٰذا اگر کوئی دوسرا شخص یہ چاہے کہ کرایہ دار اپنے حق سے دستبردار ہو جائے اور یہ دوسرا شخص اس کی جگہ کرایہ دار ہو جائے تو پہلے کرایہ دار کے لئے یہ جائز ہے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کرے اور پہلے کرایہ دار کا یہ عمل بالعوض حق کرایہ داری سے دستبرداری کا عمل ہو گا اور مال کے بدلے میں وظائف سے دستبرادری پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہو گا۔ لیکن اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ اصل کرایہ داری کا معاملہ معینہ مدت کے لئے کیا گیا ہو مثلاً دس سال کے لئے اور دس سال پورے ہونے سے پہلے پہلا کرایہ دار دستبردار ہو رہا ہو۔

(۳) ۔ اگر اجارہ متعین مدت کے لئے ہو تو مالک مکان و دکان کے لئے جائز نہیں کہ شرعی عذر کے بغیر اجارہ کو فسخ کر دے اگر مالک عذر شرعی کے بغیر دوران مدت اجارہ فسخ کرنا چاہے تو کرایہ دار کے لئے جائز ہے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کرے اور اس کا یہ اقدام بالعوض اپنے حق سے دستبرداری ہوگی، یہ عوض اس کے علاوہ ہو گا جس کا کرایہ دار اپنی یکمشت دی ہوئی رقم میں سے اجارہ کی باقی مدت کے حساب سے حق دار ہو گا۔ مجمع الفقہ السلامی جدہ نے اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۴۰۸ھ میں یہی فیصلہ کیا ہے۔

حقوق کا عوض لینے کے بارے میں احکام شرعیہ کا خلاصہ

یہاں تک میں نے حقوق کی وہ مختلف قسمیں ذکر کی ہیں جن کو فقہاء نے بیان فرمایا ہے اور جن کا عوض لینے کے بارے میں فقہاء نے بحث کی ہے، فقہاء کی مذکورہ بالا

بحثوں سے ذرج ذیل اصول نکلتے ہیں:

۱۔ جو حقوق اصالۃً مشروع نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کی مشروعیت دفع ضرر کے لئے ہے ان کا عوض لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے نہ تو بیع کے طریقے پر نہ صلح اور دستبرداری کے طریقے پر مثلاً حق شفعہ، عورت کا حق تقسیم، مخیرہ کا خیار۔

۲۔ جو حقوق فی الحال ثابت نہیں ہیں بلکہ مستقبل میں متوقع ہیں ان کا عوض لینا بھی کسی صورت میں جائز نہیں مثلاً مورث کی زندگی میں حق وراثت کا عوض لینا، آزاد کردہ غلام کی زندگی میں حق ولاء کا عوض لینا۔

۳۔ جو حقوق شرعیہ اصحاب حقوق کے لئے اصالۃً ثابت ہوئے ہیں لیکن وہ حقوق ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونے کے لائق نہیں ہیں ایسے حقوق کا بیع کے طریقے پر تو عوض لینا جائز نہیں ہے۔ لیکن ان پر مال کے بدلے میں صلح کرنا یا دستبردار ہونا جائز ہے مثلاً حق قصاص، شوہر کا بیوی کے ساتھ نکاح باقی رکھنے کا حق (چنانچہ شوہر سے اس حق کے سلسلے میں خلع یا مال کے عوض طلاق دینے پر صلح کرنا جائز ہے)

۴۔ وہ حقوق عرفیہ جو اعیان کے ساتھ وابستہ ہیں اور دائمی منافع سے عبارت ہیں مثلاً راستے میں چلنے کا حق، پانی لینے اور بہانے کا حق، ان کی بیع شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے فقہاء مالکیہ کی بعض عبارات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور متاخرین فقہائے احناف کے نزدیک قول مختار یہ ہے کہ ان حقوق میں سے جو حقوق اعیان ثابتہ سے متعلق ہیں۔ وہ بھی حکماً مال ہیں، ان کی خرید و فروخت جائز ہے مثلاً حق مرور، حق شرب حق تسییل بشرطیکہ اس میں جواز سے کوئی اور مانع مثلاً غرر اور جہالت موجود نہ ہو، متاخرین فقہائے احناف کے نزدیک حق تعلی کی بیع جائز نہیں ہے اس لئے کہ حق تعلی کسی پائیدار مادی چیز سے متعلق نہیں، لیکن بطور صلح حق تعلی سے مال کے عوض دستبرداری جائز ہے جیسا کہ "علامہ خالد اتاسی" نے صراحت کی ہے۔

۵۔ بعض حقوق کو اموال میں شامل کرنے میں عرف کا بڑا دخل ہے اس لئے کہ مالیت لوگوں کے مال بنا لینے سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ علامہ عابدین نے لکھا ہے۔

۶۔ حق اسبقیت کی بیع شوافع اور حنابلہ کے مختار قول کے مطابق جائز نہیں ہے لیکن مال کے بدلے میں حق اسبقیت سے دستبرداری جائز ہے مثلاً افتاد بنجر زمین میں نشانات

لگانے کے بعد اسے استعمال کے قابل بنانے کا حق ہے۔
۷۔ احناف کے یہاں راجح یہ ہے کہ حق وظیفہ کے بیع اگرچہ جائز نہیں ہے لیکن مال کے بدلے میں اس سے دستبرداری جائز ہے اسی طرح مکان یا دوکان کے حق کرایہ داری کی بیع جائز نہیں ہے۔ لیکن مالی معاوضہ لے کر اس سے دستبردار ہونا جائز ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہم عصر حاضر کے ان حقوق کی طرف آتے ہیں جن کے لین دین کا آج کل رواج ہے۔ اس بحث سے ہمارا مقصود یہی ہے کہ عصر حاضر میں رائج حقوق کے احکام معلوم کئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہی حق و صواب کی توفیق دینے والا ہے۔

تجارتی نام اور تجارتی علامت (TRADE MARK) کی بیع

تجارتوں کی ترقی کے ساتھ تجارتی نام اور تجارتی علامت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ایک تاجر یا ایک تجارتی کمپنی مال تیار کرتی ہے اور اپنے تیار کردہ مال بہت سے لوگوں کو فراہم کرتی ہے، اور بہت سے ممالک کو ایکسپورٹ کرتی ہے ایک ہی قسم کی مصنوعات اوصاف کے اختلاف کی بنیاد پر بہت مختلف ہو گئی ہیں اور یہ اوصاف مال تیار کرنے والی کمپنیوں یا افراد کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جب صارفین دیکھتے ہیں کہ منڈی میں فلاں کمپنی کے تیار کئے ہوئے مال کی اچھی شہرت ہے تو کمپنی کا نام سنتے ہی یا سامان پر اس کا ٹریڈ مارک دیکھتے ہیں ہی اسے خرید لیتے ہیں۔

اس طرح مصنوعات پر تجارتی نام اور ٹریڈ مارک گاہکوں کی زیادہ رغبت یا بے رغبتی کا سبب بن گیا ہے، اس لئے تاجروں کی نظر میں تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کی قیمت ہو گئی، ہر وہ تجارتی نام جس نے لوگوں میں اچھی شہرت حاصل کر لی اس کے نام سے منڈی میں آئے ہوئے مال کی طرف خریداروں کا جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جو تاجر اس نام سے منڈی میں مال لاتا ہے اس کا نفع بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

جب سے یہ بات شروع ہوئی کہ لوگ ان کمپنیوں کے نام کو استعمال کرنے لگے جنہیں صارفین میں اچھی شہرت حاصل ہے تاکہ اس نام سے ان کی مصنوعات بازار میں کھپ جائیں اور اس کی وجہ سے عامۃ الناس کے دھوکہ کھانے کا مسئلہ پیدا ہوا اس وقت سے حکومت کی طرف سے تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کا رجسٹریشن ہونے لگا اور تاجروں کو

دوسروں کے رجسٹر کرائے ہوئے ناموں اور ٹریڈ مارکوں کو استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا۔

تاجروں کے عرف میں رجسٹریشن کے بعد ان تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کی مادی قیمت ہوگئی اور تاجران ناموں کو مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے کیوں کہ انہیں ان تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں سے یہ امید ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے لوگ ان کی مصنوعات کی خریداری کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع جائز ہے؟ ظاہر ہے کہ نام یا علامت مادی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اس نام یا علامت کے استعمال کا حق ہے اور یہ حق اصالۃً صاحب حق کے لئے اسبقیت اور حکومتی رجسٹریشن کی وجہ سے ثابت ہوا ہے یہ حق فی الحال ثابت ہے مستقبل میں متوقع نہیں ہے نیز یہ ایک ایسا حق ہے جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو سکتا ہے لیکن یہ ایسا حق نہیں ہے جو پائیدار مادی چیز کے ساتھ متعلق ہو، لہٰذا فقہاء کے کلام سے ہم نے جو قواعد نکالے ہیں ان کی روشنی میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دست برداری کے طور پر اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہئے، فروختگی کے ذریعہ جائز نہ ہونا چاہئے، کیوں کہ یہ حق ثابت اور مادی چیز میں استقرار پانے والی منفعت نہیں ہے،

ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ نے یہی فتویٰ دیا ہے، اور انہوں نے اس مسئلہ کو مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کے مسئلہ پر قیاس کیا ہے اور اس سلسلہ میں ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کے وہ عبارت نقل کی ہے، جس کو ہم نزول عن الوظائف کے مسئلہ میں پیچھے نقل کر چکے ہیں پھر انہوں نے فرمایا:

> اور کارخانے کا نام بھی مشابہ حق وظائف کے ہے کہ ثابت علی وجہ الاصالۃ ہے نہ کہ دفع ضرر کے لئے، اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے، پس اس بنا پر اس عوض کے دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، گو لینے والے کے لئے خلاف تقویٰ ہے، مگر ضرورت میں اس کی بھی اجازت ہو جائے گی (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۸۷)

احقر کا خیال یہ ہے کہ تجارتی نام کا حق اور ٹریڈ مارکوں کا حق اگرچہ اصل میں حق مجرد ہے جو کسی مادی محسوس چیز میں ثابت نہیں ہے لیکن حکومتی رجسٹریشن جس کے لئے بڑی دوڑ بھاگ کرنی پڑتی ہے اور بے تحاشا مال خرچ کرنا پڑتا ہے اور جس کے بعد اس نام پر ٹریڈ مارک کی قانونی حیثیت ہو جاتی ہے جس کا اظہار اس تحریری سرٹیفکیٹ کے ذریعہ ہوتا ہے جو رجسٹریشن کرانے والے کو حکومت کے کاغذات میں اندارج کے بعد حاصل ہوتا ہے ان تمام مراحل کے بعد تجارتی نام اور ٹریڈک مارک کا حق اس حق کے مثل ہو گیا جو کسی مادی چیز میں مستقر ہو، اور تاجروں کے عرف میں یہ حق اعیان (مادی اشیاء) کے حکم میں ہو گیا لہٰذا بیع کے ذریعہ اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہئے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بعض اشیاء کو اعیان میں داخل کرنے میں عرف کا بڑا دخل ہے کیوں کہ علامہ ابن عابدین کے بیان کے مطابق مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اس کی مثال بجلی اور گیس ہے جو گزشتہ زمانوں میں اموال و اعیان میں شمار نہیں ہوتی تھیں کیونکہ یہ دونوں ایسی مادی چیز نہیں ہیں جو قائم بالذات ہوں اور ان کا قبضہ میں کرنا بھی انسان کی طاقت میں نہیں تھا لیکن اب یہ دونوں چیزیں ان اہم قیمتی اموال میں سے ہیں جن کی خرید و فروخت کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کیوں کہ ان دونوں چیزوں میں حد درجہ نفع ہے اور ان کا احراز بھی ممکن ہے لوگوں کے عرف میں بھی یہ دونوں چیزیں مال اور قیمتی چیز مانی جاتی ہیں۔

اسی طرح تجارتی نام یا ٹریڈ مارک رجسٹریشن کے بعد تاجروں کے عرف میں بڑی قیمتی چیزیں ہو جاتی ہیں اور ان پر یہ بات بھی صادق آتی ہے کہ حکومت کی طرف سے تحریری سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے ان پر قبضہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہر چیز کا قبضہ اس کے حسب حال ہوتا ہے اور ان پر یہ بات بھی صادق ہے کہ وقت ضرورت کے لئے ان کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے غرض یہ کہ کسی چیز میں مالیت پیدا کرنے کے لئے جو عناصر لازمی ہیں وہ سب تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں میں موجود ہیں صرف اتنی بات ہے کہ ایسی مادی چیز نہیں جو قائم بالذات ہو اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں شرعاً کوئی مانع موجود نہیں ہے کہ ان کی خرید و فروخت کے جائز ہونے میں ان پر اموال کا حکم لگایا جائے لیکن اس جواز کی دو شرطیں ہیں:۔

۱۔۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک حکومت کے یہاں قانونی طور پر رجسٹرڈ ہو کیونکہ جو نام ٹریڈ مارک رجسٹر نہیں ہوتا اسے تاجروں کے عرف میں مال نہیں شمار کیا جاتا۔

۲۔۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع سے صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ لازم نہ آئے مثلاً اس کی صورت یہ ہو کہ خریدار کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب اس سامان کو بنانے والا وہ فرد یا وہ ادارہ نہیں ہے جو پہلے اس نام سے سامان تیار کرتا تھا اور اس نام یا ٹریڈ مارک کو خریدنے والا اس نیت سے اس کو خریدے کہ وہ حتی الامکان اس کی کوشش کرے گا کہ اس کی مصنوعات سابقہ مصنوعات کے معیار کے برابر ہوں گی یا اس سے بہتر ہوں گی۔

لہٰذا اس اعلان کے بغیر تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کا دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا چونکہ صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ کا باعث ہو گا۔ اور التباس اور دھوکا حرام ہے، جو کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

تجارتی لائسنس ۔۔۔ ہم نے تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کا جو حکم اوپر بیان کیا ہے کہ ان دونوں کا عوض لینا جائز ہے بالکل یہی حکم تجارتی لائسنس پر بھی جاری ہو گا اس لائسنس کی حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں اکثر ممالک اس کی بات اجازت نہیں دیتے کہ حکومتی لائسنس کے بغیر ایکسپورٹ یا امپورٹ کیا جائے بظاہر یہ چیز تاجروں پر ایک طرح کی پابندی ہے جسے اسلامی شریعت شدید ضرورت کے بغیر پسند نہیں کرتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر ملکوں میں یہی ہو رہا ہے لہٰذا موجودہ حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس شخص کے پاس امپورٹ یا ایکسپورٹ کا لائسنس ہو وہ دوسرے تاجر کے ہاتھ اس لائسنس کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ لائسنس کوئی مادی چیز نہیں ہے بلکہ دوسرے ملک میں سامان بیچنے یا دوسرے ملک سے سامان خریدنے کے حق کا نام ہے لہٰذا یہاں بھی یہی بات آئے گی جو ہم نے تجارتی نام کے بارے میں ذکر کی ہے کہ یہ حق اصالۃً ثابت ہے لہٰذا مال کے بدلے میں اس دست برداری جائز ہو گی نیز حکومت کی طرف سے یہ لائسنس حاصل کرنے میں بڑی کوشش وقت اور مال صرف کرنا پڑتا ہے اور اس لائسنس کے حامل کو ایک قانونی پوزیشن حاصل ہو جاتی ہے جس کا اظہار تحریری سرٹیفکیٹ میں ہوتا ہے اور اس کی

وجہ سے حکومت یہ لائسنس رکھنے والے کو بہت سی سہولتیں مہیا کرتی ہے اور تاجروں کے عرف میں یہ لائسنس بڑی قیمت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ اموال والا معاملہ کیا جاتا ہے لہٰذا یہ بات بعید نہیں ہے کہ خرید و فروخت کے جائز ہونے میں اسے مادی اشیاء کے ساتھ شامل کر دیا جائے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب کہ حکومت یہ لائسنس دوسرے آدمی کے نام منتقل کرنے کی اجازت دیتی ہو اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کے نام ہو، اور قانون دوسری کمپنی کی طرف اس کی منتقلی کی اجازت نہ دیتا ہو تو اس لائسنس کی بیع جائز نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیوں کہ اس صورت میں لائسنس کی فروختگی سے جھوٹ اور دھوکہ لازم آئے گا اس لئے کہ لائسنس خریدنے والا بیچنے والے ہی کے نام سے استعمال کرے گا، نہ کہ اپنے نام سے، لہٰذا ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔ البتہ اگر لائسنس یافتہ شخص کسی کو اپنی طرف سے بیچنے اور خریدنے کا وکیل بنا دے تو اس صورت میں اس وکیل کے لئے اس لائسنس کے ذریعہ خرید و فروخت جائز ہوگی۔

حق ایجاد اور حق اشاعت

حق ایجاد ایک ایسا حق ہے جو عرف اور قانون کی بنیاد پر اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی ہو یا کسی چیز کی نئی شکل ایجاد کی ہو، حق ایجاد کا مطلب یہ ہے کہ تنہاء اسی شخص کو اپنی ایجاد کردہ چیز بنانے اور منڈی میں پیش کرنے کا حق ہے پھر بسا اوقات ایجاد کرنے والا یہ حق دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو اس حق کو خریدنے والا ایجاد کرنے والے کی طرح تجارت کے لئے وہ چیز تیار کرتا ہے اسی طرح جس شخص نے کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی ہے اسے اس کتاب کی نشر و اشاعت اور تجارتی نفع حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے بسا اوقات کتاب لکھنے والا یہ حق دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو اس حق کا خریدار نشر و اشاعت کے بارے میں ان حقوق کا مالک ہو جاتا ہے، جو مصنف کتاب کو حاصل تھا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حق ایجاد اور حق تصنیف و حق اشاعت کی فروختگی جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہائے معاصرین کی دو رائیں ہیں، کچھ علماء نے اسے جائز کہا ہے اور کچھ علماء نے ناجائز کہا ہے۔

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا حق ایجاد یا حق اشاعت شریعت اسلامیہ کی طرف سے تسلیم شدہ حق ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے کوئی نئی چیز ایجاد کی، خواہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی چیز، بلاشبہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اسے اپنے انتفاع کے لئے تیار کرنے اور نفع کمانے کے لئے بازار میں لانے کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ ابو داؤد میں حضرت اسمر بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر بیعت کی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اس چیز کی طرف سبقت کی جس کی طرف کسی مسلمان نے سبقت نہیں کی تو وہ چیز اس کی ہے۔

(ابو داؤد فی الخراج قبیل احیاء الموات ص ۲۶۴ ج ۴، حدیث نمبر ۲۹۴۷)

علامہ مناوی ؒ نے اگرچہ اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ یہ حدیث افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے کے بارے میں آئی ہے۔ لیکن انہوں نے بعض علماء سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ہر چشمہ، کنواں اور معدن کو شامل ہے اور جس شخص نے ان میں کسی چیز کی طرف سبقت کی تو وہ اسی کا حق ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خاص ہونے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ (فیض القدیر ص ۱۳۸ ج ۶)

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ حق ایجاد ایک ایسا حق ہے جسے اسلامی شریعت اس بنیاد پر تسلیم کرتی ہے کہ اس شخص نے اس چیز کے ایجاد کرنے میں سبقت کی ہے تو حق ایجاد پر وہی سارے احکام منطبق ہوں گے جو ہم نے حق اسبقیت کے بارے میں ذکر کئے ہیں وہاں ہم نے ثابت کیا تھا کہ بعض شافعیہ اور حنابلہ نے اس حق کی بیع کو جائز کہا ہے لیکن ان حضرات کے یہاں بھی راجح یہی ہے کہ حق اسبقیت کی بیع جائز نہیں ہے لیکن مال کے بدلہ میں اس حق سے دست بردار ہونا جائز ہے۔ وہاں ہم نے شرح منتہی الارادات سے بہوتی کی وہ عبارت بھی نقل کی ہے جو حق تحجیر اور حق جلوس فی المسجد سے دست برداری کے جواز کے بارے میں ہے اور اس کے علاوہ حق اسبقیت اور حق اختصاص کے دوسرے احکام بھی بیان کئے ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ حق ایجاد یا اشاعت سے عوض لے کر دوسرے شخص کے حق میں دست بردار ہونا جائز ہے لیکن یہ حکم اصل حق ایجاد اور حق اشاعت کے سلسلہ میں ہے لیکن اگر اس حق کا حکومتی رجسٹریشن بھی کرالیا گیا ہو جس کے لئے موجد اور مصنف کو محنت کرنی پڑتی ہے مال اور وقت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہ حق ایک قانونی حق ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے ایک

سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جاتا ہے اور تاجروں کے عرف میں اسے قیمتی مال شمار کیا جاتا ہے تو یہ بات بعید نہیں ہوگی کہ اس رجسٹرڈ حق کو مروجہ عرف کی بنیاد پر اعیان و اموال کے حکم میں کر دیا جائے اور ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ بعض اشیاء کو اموال و اعیان کے حکم میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے اس لئے کہ مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور رجسٹریشن کے بعد اعیان کی طرح اس حق کا احراز بھی ہوتا ہے اور وقت ضرورت کے لئے اس کا ذخیرہ بھی کیا جاتا ہے تو اس عرف کا اعتبار کرنے میں کتاب و سنت کے کسی نص کی ممانعت نہیں ہے بہت سے بہت قیاس کی مخالفت ہے اور قیاس کو عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے جیسا کہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہو چکی ہے۔

انہی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے علماء معاصرین کی ایک جماعت نے اس حق کی بیع کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے ان میں سے برصغیر کے علماء سے مولانا فتح محمد لکھنوی (مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد) مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حق ایجاد اور حق تصنیف کی بیع کو ناجائز کہنے والوں نے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حق ایجاد مجرد حق ہے عین نہیں ہے اور حقوق مجردہ کا عوض لینا جائز نہیں۔ لیکن فقہاء کا جو کلام پیچھے تفصیل سے آچکا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقوق کا عوض لینے کا عدم جواز ہر حال میں نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے جو ہم نے حقوق کی مختلف قسموں پر بحث کرتے ہوئے بیان کی ہے۔

مانعین جواز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جس شخص نے کوئی کتاب دوسرے کے ہاتھ فروخت کی اس نے خریدار کو اس کتاب کا اس کے پورے اجزاء کے ساتھ مالک بنا دیا۔ لہٰذا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس کتاب میں جس طرح چاہے، تصرف کرے لہٰذا اس کے لئے اس کتاب کی اشاعت بھی جائز ہونی چاہئے، اور بیچنے والے کو خریدار پر اس سلسلے میں پابندی لگانے کا اختیار نہ ہونا چاہئے۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ کسی چیز میں تصرف کرنا الگ چیز ہے اور اس کی مثل دوسری چیز بنانا دوسری چیز ہے، کتاب خرید کردہ پہلی قسم کے تصرف کا تو مالک

ہو گیا کہ اسے پڑھ کر نفع اٹھائے یا بیچے یا عاریت پر دے یا ہبہ کر دے اور اس طرح کے دوسرے تصرفات کرے لیکن اس جیسی دوسری کتاب کی اشاعت خریداری کے منافع میں شامل نہیں کہ کتاب کا مالک بننے سے اس کی حق اشاعت کا بھی مالک ہو جائے، اس کی مثال حکومت کے ڈھالے ہوئے سکے ہیں۔ ان سکوں کو اگر کسی نے خریدا تو وہ ان سکوں میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے لیکن اس خریداری کی وجہ سے اس کے لئے اس طرح کے دوسرے سکے ڈھالنا جائز نہیں ہو گا اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کسی چیز کی ملکیت اس بات کو مستلزم نہیں کہ مالک کو اس جیسی دوسری چیز بنانے کا حق ہو۔

مانعین جواز کی تیسری دلیل ہے کہ اس ایجاد کردہ چیز کو تیار کرنے اور تصنیف کردہ کتاب کو طبع کرنے سے موجد اور مصنف کا خسارہ نہیں ہوتا بہت سے بہت یہ ہوتا ہے کہ موجد اور مصنف کا نفع کم ہو جاتا ہے نفع کم ہونا الگ چیز ہے اور خسارہ ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ نفع کم ہونا اگرچہ خسارہ نہ ہو لیکن ضرر ضرور ہے، خسارہ اور ضرر میں واضح فرق ہے یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ جس شخص نے کوئی چیز ایجاد کرنے یا کتاب تصنیف کرنے کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقتیں جھیلیں، بے پناہ مال اور وقت صرف کیا۔ اس کے لئے راتوں کو جاگا۔ راحت و آرام قربان کیا وہ اس ایجاد اور کتاب سے نفع حاصل کرنے کا اس شخص سے زیادہ حقدار ہے جس نے معمولی سی رقم خرچ کر کے ایک منٹ میں وہ ایجاد شدہ چیز یا کتاب خرید لی پھر موجد اور مصنف کے لئے مارکیٹ تنگ کرنے لگا۔

مانعین جواز کی طرف سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ فرد واحد کے لئے حق اشاعت تسلیم کر لینا کتمان علم کا سبب بنتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کتمان علم تو اس صورت میں ہوتا۔ جب مصنف لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے اور دوسروں تک پہنچانے سے روکتا، لیکن جو شخص حق اشاعت محفوظ کرتا ہے وہ کسی کو کتاب پڑھنے، پڑھانے اور اس کے مضامین کی تبلیغ و اشاعت سے نہیں روکتا بلکہ وہ اس کی فروخت اور تجارت سے بھی نہیں روکتا وہ تو صرف اس بات سے روکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر کتب طبع کر کے نفع اٹھائے، یہ بات ہرگز کتمان علم کے

دائرے میں نہیں آتی۔

مانعین جواز کی آخری دلیل یہ ہے کہ حق طباعت محفوظ کرنے سے کتاب کی اشاعت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اگر ہر شخص کو کتاب کی طباعت کا حق ہو تو اس کی نشرو اشاعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے گا، اور اس کی افادیت زیادہ عام اور ہمہ گیر ہو جائے گی۔

یہ بات بلاشبہ امر واقعہ ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اگر ہم دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ دلیل ان کے خلاف پلٹ جاتی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ اگر ایجاد کرنے والوں کو اپنی ایجادات سے نفع حاصل کرنے میں اسبقیت کے حق سے محروم کر دیا جائے گا تو نئی ایجادات کے لئے بڑے منصوبوں کا خطرہ مول لینے سے ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی کیوں کہ ان کو احساس یہ ہو گا کہ انہیں معمولی نفع ہی ملے گا اور اسی طرح کے امور جن میں دو پہلو ہوں فقہی مسائل کا فیصلہ نہیں کرتے، جب تک کہ کسی چیز میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اس لئے کہ تمام مباح چیزوں میں ضرر و نفع دونوں کے پہلو ہوتے ہیں۔

خاتمہ:

یہاں یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ حقوق طبع و اشاعت کی بیع کے عدم جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے، چنانچہ اس مسئلہ پر انہوں نے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا، جو "جواھر الفقہ" کا جز بن کر شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس رسالے کو لکھنے کے بعد انہوں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ اس مسئلہ پر دوبارہ تحقیق اور غور و خوض کر کے اس کو اور زیادہ منقح کیا جائے اور اس غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد جو رائے بھی سامنے آئے، اس کو قبول کر لیا جائے، مگر حضرت والد ماجدؒ کو اس کی تحقیق کی فرصت نہ ملی تو انہوں نے دو مرتبہ یہ مسئلہ میرے سپرد فرمایا کہ میں اس کی مکمل تحقیق کروں، چنانچہ میں نے اس مسئلے کا مواد اسی وقت سے جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی حیات میں اس کی تکمیل مقدر نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے انتقال کے کافی عرصہ بعد اس مسئلہ کی تحقیق مکمل کرنے کی توفیق ہوئی ـــــ اس طرح یہ بحث حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے حکم کی بجا آوری میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ جس نتیجے پر میں

پہنچا ہوں۔ وہ بظاہر ان کی رائے کے خلاف ہے۔ مگر وہ خود بھی اس مسئلے پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ــ اور آج یہ بات معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ ان کی رائے کے موافق ہے یا مخالف ــ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

صلی اللہ علیہ وسلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"واقیموا الصلاۃ واتوا الزکاۃ"

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

مغربی ممالک کے چند مسائل

اور انکا حل

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

"تعاشروا کالاخوان، تعاملوا کالاجانب"

یعنی بھائیوں کی طرح رہو، لیکن آپس میں معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مغربی ممالک کے چند

جدید فقہی مسائل

اور ان کا حل

غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرنا

سوال: کسی غیر مسلم ملک مثلاً امریکہ یا یورپ کی شہریت اور نیشنلٹی اختیار کرنا کیسا ہے؟ اس لئے کہ جو مسلمان ان ممالک کی شہریت اختیار کر چکے ہیں یا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان میں سے بعض حضرات کا تو یہ کہنا ہے کہ انہیں ان کے مسلم ممالک میں بغیر کسی جرم کے سزائیں دی گئیں، انہیں ظلماً جیل میں قید کر دیا گیا، یا ان کی جائیدادوں کو ضبط کر لیا گیا وغیرہ جس کی بنا پر وہ اپنا مسلم ملک چھوڑ کر ایک غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

اور دوسرے بعض مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ جب ہمارے اپنے اسلامی ملک میں اسلامی قانون اور اسلامی حدود نافذ نہیں ہیں تو پھر اس میں اور ایک غیر مسلم ریاست میں کیا فرق ہے؟

اسلامی احکام کے عدم نفاذ میں تو دونوں برابر ہیں۔ جبکہ جس غیر اسلامی ملک کی شہریت ہم نے اختیار کی ہے۔ اس میں ہمارے شخصی حقوق یعنی جان و مال، عزت و

آبرو، اسلامی ملک کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہیں اور ان غیر مسلم ممالک میں ہمیں بلا جرم کے جیل کی قید و بند اور سزا کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ جبکہ ایک اسلامی ملک میں قانون کی خلاف ورزی کئے بغیر بھی قید و بند کی سزا کا خوف سوار رہتا ہے۔

جواب: کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنا لینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کر لیا جائے یا اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو۔ ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلک ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کر لے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کار بند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات و فواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دو چار ہو جائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتیٰ کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہو جائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلک ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بناء پر وہ وہاں رہائش اختیار کر لے تو مذکورہ بالا دو شرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گزرا) اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے۔

هو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبها و کلوا من رزقه
و الیه النشور ○

وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا۔ اب
تم اس کے راستوں میں چلو، اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی
کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ (سورہ ملک ۱۵)

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلک ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا، یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شریعہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے بلکہ موجب اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی۔ اور جو بعد میں ان کے فضائل و مناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

(۴) اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات و منکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش و عشرت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ ابو داؤد میں حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من جامع المشرک و سکن معه، فانه مثله
جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے۔ (ابو داؤد کتاب الضحایا)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انا بریئی من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین، قالوا یا رسول الله! لم؟ قال لا تری ای نارا هما
"میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا۔ "اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ تم یہ امتیاز نہیں کر سکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے۔"

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے۔ چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے یہ بھی انہیں میں سے ہے۔ علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو

اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے۔

(معالم السنن للخطابی ص ۴۳۷ ج ۳)

اور مراسیل ابو داؤد عن المکحول میں روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو۔"

(تہذیب السنن لابن قیم ص ۴۳۷ ج ۳)

اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمانوں کا دارالحرب میں رہائش اختیار کرنا، اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہو جاتی ہے۔

(دیکھئے تکملہ رد المختار ج ۱ ص ۱۰۱)

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دارالکفر کی شہریت اور قومیت کو دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے۔ ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے۔ جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں۔

غیر مسلم ملک میں اولاد کی تربیت؟

جو مسلمان امریکہ اور یورپ وغیرہ جیسے غیر اسلامی ممالک میں رہائش پزیر ہیں ان کی اولاد کا اس ماحول میں پرورش پانے میں اگرچہ کچھ فوائد بھی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں بہت سی خرابیاں اور خطرات بھی ہیں خاص کر وہاں کے غیر مسلم یہود و نصاریٰ کی اولاد کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں ان کی عادات و اخلاق اختیار کرنے کا قوی احتمال موجود ہے اور یہ احتمال اس وقت اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے جب ان بچوں کے والدین ان کی اخلاقی

نگرانی سے بے اعتنائی اور لاپروائی برتیں یا ان بچوں کے والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا انتقال ہو چکا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا خرابی کی وجہ سے ان غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت اور ان کی قومیت اختیار کرنے کے مسئلہ پر کچھ فرق واقع ہو گا؟ جبکہ دوسری طرف وہاں پر رہائش پذیر مسلمانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہماری اولاد کو ان مسلم ممالک میں رہائش باقی رکھنے میں وہاں پر موجود کیمونسٹ اور لادینی جماعتوں کے ساتھ میل جول سے ان کے کافر ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق ہے خاص کر اگر ان لادینی جماعتوں اور ان کے ملحدانہ افکار اور خیالات کی سرپرستی خود اسلامی حکومت کر رہی ہو۔ اور ان خیالات و افکار کو نصاب تعلیم میں داخل کر کے عوام کے ذہنوں کو خراب کر رہی ہو اور جو شخص ان خیالات کو قبول کرنے سے انکار کرے اس کو قید و بند کی سزا دے رہی ہو۔ ایسی صورت میں ایک اسلامی ملک میں رہائش اختیار کرنے سے ہماری اولاد کے عقائد خراب ہونے اور دین اسلام سے گمراہ ہونے کا احتمال اور قوی ہو جاتا ہے، ان حالات کی وجہ سے مذکورہ بالا مسئلہ میں کوئی فرق واقع ہو گا یا نہیں؟

جواب: ایک غیر مسلم ملک میں مسلمان اولاد کی اصلاح و تربیت کا مسئلہ بہرحال ایک سنگین اور نازک مسئلہ ہے جن صورتوں میں وہاں رہائش اختیار کرنا مکروہ یا حرام ہے، (جس کی تفصیل ہم نے سوال نمبر ایک کے جواب میں تفصیل سے بیان کی) ان صورتوں میں تو وہاں رہائش اختیار کرنے سے بالکل پرہیز کرنا چاہئے۔

البتہ جن صورتوں میں وہاں رہائش اختیار کرنا بلا کراہت جائز ہے ان میں چونکہ وہاں رہائش اختیار کرنے پر ایک واقعی ضرورت داعی ہے۔ اس لئے اس صورت میں اس شخص کو چاہئے کہ اپنی اولاد کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دے اور جو مسلمان وہاں پر مقیم ہیں ان کو چاہئے کہ وہ وہاں ایسی تربیتی فضا اور ایک پاکیزہ ماحول قائم کریں جس میں آنے والے نئے مسلمان اپنے اور اپنی اولاد کے عقائد اور اعمال و اخلاق کی بہتر طور پر نگہداشت اور حفاظت کر سکیں۔

مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح

کسی مسلمان عورت کا کسی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا کیسا ہے؟ اگر اس عورت کو یہ امید ہو کہ اس شادی کے نتیجے میں وہ مرد مسلمان ہو جائے گا تو کیا اس شخص کے مسلمان ہو جانے کی امید اور لالچ میں اس سے نکاح کرنا درست ہے؟ جبکہ دوسری طرف اس مسلمان عورت کو مسلمانوں میں کوئی برابری کا رشتہ نہ مل رہا ہو اور معاشی تنگی کی وجہ سے خود اس عورت کے دین سے منحرف ہونے کا امکان بھی ہو تو کیا ایسی صورت میں نکاح کے جواز میں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے؟

اگر کوئی عورت مسلمان ہو جائے اور اس کا شوہر کافر ہو تو کیا اس عورت کو اپنے شوہر سے علاقہ زوجیت برقرار رکھنے کی گنجائش ہے؟ جبکہ اس عورت کو یہ امید ہے کہ علاقہ زوجیت باقی رکھنے کی صورت میں وہ اپنے شوہر کو اسلام کی دعوت دے کر مسلمان کر لے گی جبکہ دوسری طرف اس عورت کی اپنے شوہر سے اولاد بھی ہے اور علاقہ زوجیت ختم کرنے کی صورت میں ان کے خراب ہو جانے اور دین سے منحرف ہو جانے کا قوی احتمال موجود ہے کیا ان حالات میں اس عورت کے لئے اپنے شوہر سے رشتہ زوجیت برقرار رکھنے کی کچھ گنجائش ہے؟

اور اگر اس عورت کو اپنے شوہر کے اسلام لانے کی امید تو نہیں ہے۔ لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ اچھے اخلاق اور بہترین معاشرت کے ساتھ حق زوجیت ادا کر رہا ہے اور اس عورت کو یہ بھی ڈر ہے کہ اگر اس نے اپنے شوہر سے جدائی اختیار کر لی تو کوئی مسلمان مرد اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہوگا کیا اس صورت میں مسئلہ کے جواز و عدم جواز پر کوئی فرق واقع ہوگا؟

الجواب

کسی مسلمان عورت کے لئے کسی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں، قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے:

ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا ولعبد مومن خیر من

مشرک و لوا عجبکم۔

اور مشرکین سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور البتہ مسلمان غلام بہتر ہے مشرک سے، اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے۔

(بقرہ : ۱۰)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

لا هن حل لهم و لا هم يحلون لهن

نہ وہ عورتیں ان کافروں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کافر ان عورتوں کے لئے حلال ہیں۔

(الممتحنہ : ۱۰)

اور کسی کافر کے مسلمان ہو جانے کی صرف امید اور لالچ کسی مسلمان عورت کے لئے اس سے نکاح کرنے کی وجہ جواز نہیں بن سکتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی خیالی امید اور لالچ کسی حرام کام کو حلال کر سکتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت مسلمان ہو جائے تو جمہور علماء کے نزدیک اس کے صرف اسلام لانے سے ہی نکاح ختم ہو جائے گا۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اسلام لانے سے نکاح نہیں ٹوٹے گا۔ بلکہ عورت کے اسلام لانے کے بعد مرد کو اسلام کی دعوت دی جائے گی، اگر وہ بھی اسلام قبول کر لے تب تو نکاح باقی رہے گا۔ اور اگر اسلام لانے سے انکار کر دے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اور اگر شوہر کچھ عرصہ بعد مسلمان ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ اس عورت کی عدت گزر چکی ہے یا نہیں؟ اگر وہ عورت ابھی عدت میں ہے تو شوہر کے اسلام لانے سے پہلا نکاح دوبارہ لوٹ آئے گا اور اگر اس کی عدت گزر چکی تھی تو اس صورت میں دونوں کے درمیان نکاح جدید کرنا ضروری ہو گا نکاح کے بعد وہ دونوں بحیثیت میاں بیوی کے رہ سکتے ہیں۔ اس مسئلہ میں تمام فقہاء متفق ہیں۔ لہٰذا شوہر کے اسلام لانے کی موہوم امید اور لالچ کی بنیاد پر شریعت کا قطعی حکم نہیں بدلا جا سکتا۔

مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا

امریکہ اور یورپ کے تمام ممالک میں مسلمانوں کے لئے کوئی ایسا مخصوص قبرستان نہیں ہوتا۔ جس میں وہ اپنے مردوں کو دفن کر سکیں، اور جو عام قبرستان ہوتے ہیں ان میں عیسائی اور یہودی وغیرہ سب اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں اور مسلمانوں کو ان قبرستان سے باہر کسی دوسری جگہ بھی دفن کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان حالات میں کیا مسلمان اپنے مردوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ان کے قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں؟

الجواب: عام حالات میں تو مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں، البتہ ان مخصوص حالات میں جو سوال میں مذکور ہیں کہ مسلمانوں کے لئے نہ تو مخصوص قبرستان ہے اور نہ ہی قبرستان سے باہر کسی اور جگہ دفن کرنے کی اجازت ہے۔ ان حالات میں ضرورت کے پیش نظر مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے۔

مسجد کو بیچنے کا حکم

اگر امریکہ اور یورپ کے کسی علاقے کے مسلمان اپنے علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائیں اور پہلے علاقے میں جو مسجد ہو، اس کے ویران ہو جانے یا اس پر غیر مسلموں کا تسلط اور قبضہ ہو جانے کا خطرہ ہو تو کیا اس صورت میں اس مسجد کو بیچنا جائز ہے؟ اس لئے کہ عام طور پر مسلمان مسجد کے لئے کوئی مکان خرید کر اس کو مسجد بنا لیتے ہیں اور پھر حالات کے پیش نظر اکثر مسلمان جب اس علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور مسجد کو یونہی اور بیکار چھوڑ دیتے ہیں تو دوسرے غیر مسلم اس مسجد پر قبضہ کر کے اس کو اپنے تصرف میں لے آتے ہیں جب کہ یہ ممکن ہے کہ اس مسجد کو بیچ کر دوسرے علاقے میں جہاں مسلمان آباد ہوں اسی رقم سے کوئی مکان خرید کر مسجد بنائی جائے، کیا اس طرح مسجد کو دوسری مسجد میں تبدیل کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب : مغربی ممالک میں جن جگہوں پر مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔
وہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔
۱ :۔ بعض جگہیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کو مسلمان نماز پڑھنے اور دینی اجتماعات کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔ لیکن ان جگہوں کو شرعی طور پر دوسری مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد نہیں بناتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان جگہوں کا نام بھی مسجد کی بجائے دوسرے نام مثلاً "اسلامی مرکز" یا "دارالصلوۃ" یا "دارالجماعت" رکھ دیتے ہیں۔

اس قسم کے مکانات کا معاملہ تو بہت آسان ہے، اس لئے کہ ان مکانات کو اگرچہ نماز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب ان کے مالکوں نے ان کو مسجد نہیں بنایا اور نہ ان کو وقف کیا ہے تو وہ شرعاً مسجد ہی نہیں۔ لہٰذا ان مکانات کے مالک مسلمانوں کے مصالح کے پیش نظر ان کو بیچنا چاہیں تو شرعاً بالکل اجازت ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

۲ :۔ دوسرے بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جن کو مسلمان عام مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد بنالیتے ہیں۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اس قسم کی جگہوں کا حکم یہ ہے کہ وہ مکان اب قیامت تک کے لئے مسجد بن گیا۔ اس کو کسی صورت میں بھی بیچنا جائز نہیں اور نہ وہ مکان اب وقف کرنے والے کی ملکیت میں داخل ہو سکتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔
چنانچہ مسلک شافعی کے امام خطیب شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

ولو انهدم مسجد، وتعذرت اعادته، اوتعطل بخراب البلد مثلاً، لم يعد ملكا ولم يبع بحال، كالعبد اذا عتق، ثم زمن ولم ينقض ان لم يخف عليه لا مكان الصلاة فيه، ولا مكان عوده كما كان..... فان خيف عليه نقض، وبنى الحاكم بنقضه مسجدا آخران راى ذالك والا حفظه، وبنا بقربه اولى،
"اگر مسجد منہدم ہو جائے، اور اس کو دوبارہ درست کرنا ممکن نہ ہو، یا اس بستی کے اجڑ جانے سے وہ مسجد بھی ویران ہو جائے

تب بھی وہ مسجد مالک کی ملکیت میں نہیں آئے گی اور نہ اس کو بیچنا جائز ہو گا۔ جیسا کہ غلام کو آزاد کر دینے کے بعد اس کی بیع حرام ہو جاتی ہے پھر اگر اس مسجد پر غیر مسلموں کے قبضے کا خوف نہ ہو تو اس کو منہدم نہ کیا جائے، بلکہ اس کو اپنی حالت پر بر قرار رکھا جائے، اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسلمان دوبارہ یہاں آکر آباد ہو جائیں، اور اس مسجد کو دوبارہ زندہ کر دیں...... البتہ اگر غیر مسلموں کے تسلط اور قبضہ کا خوف ہو تو اس صورت میں حاکم وقت مناسب سمجھے تو اس مسجد کو ختم کر دے اور اس کے بدلے میں دوسری جگہ مسجد بنا دے، اور یہ دوسری مسجد پہلی مسجد کے قریب ہونا زیادہ بہتر ہے اور اگر حاکم وقت اس مسجد کو توڑنا اور مسمار کرنا مناسب نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت کرے۔

(مغنی المحتاج: ص ۳۹۲ ج ۲)

اور فقہاء مالکیہ میں سے علامہ مواق رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"ابن عرفة من المدونة وغيرها، يمنع بيع ما خرب من ربع الجس مطلقا، ...... وعبارة الرسالة، ولا يباع الحبس وان خرب...... وفی الطرر عن ابن عبد الغفور: لا يجوز بيع مواضع المساجد الخربة، لانها وقف، ولا باس ببيع نقضها"

ابن عرفہ مدونہ وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ وقف مکان کی بیع مطلقاً جائز نہیں، اگرچہ وہ ویران ہو جائے ...... اور رسالہ میں یہ عبارت درج ہے کہ وقف کی بیع جائز نہیں اگرچہ وہ ویران ہو جائے ...... طرر میں ابن عبد الغفور سے یہ عبارت منقول ہے کہ ویران مساجد کی جگہوں کو بیچنا وقف ہونے کی بناء پر جائز نہیں۔ البتہ ان کا ملبہ بیچنا جائز ہے۔"

(التاج والاکلیل للمواق، حاشیہ حطاب، ص ۴۲ ج ۶)

اور فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب ہدایہ میں ہے:

ومن اتخذا رضه مسجد الم يكن له ان يرجع فيه، ولا يبيعه، ولا يورث عنه، لانه تجرد عن حق العباد، وصار خالصاً لله، وهذ الان الاشياء كلها لله تعالى، واذااسقط العبد ماثبت له من الحق رجع الى اصله فانقطع تصرف عنه، كمافى الاعتاق، ولو خرب ماحول المسجد، واستغنى عنه يبقى مسجدا عند ابى يوسف، لانه اسقاط منه، فلا يعود الى ملكه"

اگر کسی شخص نے اپنے زمین مسجد کے لئے وقف کر دی تواب وہ شخص نہ تو اس وقف سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور نہ اس کو بیچ سکتا ہے۔ اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اس لئے کہ وہ جگہ بندہ کی ملکیت سے نکل کر خالص اللہ کے لئے ہوگی وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چیز حقیقتاً اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے بندہ کو تصرف کا حق عطا فرمایا ہے۔ جب بندہ نے اپنا حق تصرف ساقط کر دیا تو وہ چیز ملکیت اصلی یعنی اللہ کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی لہٰذا اب بندہ کا اس میں تصرف کرنے کا حق ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ آزاد کردہ غلام میں (بندہ کا حق تصرف ختم ہو جاتا ہے)

اور اگر مسجد کے اطراف کا علاقہ ویران ہو جائے اور مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تب بھی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد ہی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کو مسجد بنانا اپنا حق ساقط کرنا ہے۔ لہٰذا بندہ کا اپنا حق ساقط کرنے کے بعد دوبارہ وہ حق اس کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گا۔

(ہدایہ مع فتح القدیر ص ۴۴۶ ج ۵)

البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مسجد کے اطراف کی آبادی ختم ہو جائے اور مسجد کی ضرورت بالکلیہ ختم ہو جائے تو اس صورت میں مسجد کو بیچنا جائز ہے، چنانچہ المغنی لابن قدامہ میں یہ عبارت منقول ہے:

ان الوقف اذا خرب، وتعطلت منافعه، كدار انهدمت،

اوارض خربت، وعادت مواتاً، ولم تكن عمارتها، اومسجد انتقل اهل القرية عنه، وصار فی موضع لا یصلی فیه، اوضاق باهله، ولم یمکن توسیعه فی موضعه، اوتشعب جمیعه، فلم یمکن عمارته، ولا عمارة بعضه الا ببیع بعضه، جاز بیع بعضه لتعمر به بقیته، وان لم یمکن الا نتفاع بشیئی منه بیع جمیعه۔

اگر وقف کی زمین ویران ہو جائے اور اس کے منافع ختم ہو جائیں۔ مثلاً کوئی مکان تھا وہ منہدم ہو گیا، یا کوئی زمین تھی جو ویران ہو کر ارض موات بن جائے۔ یا کسی مسجد کے اطراف میں جو آبادی تھی وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے اور اب اس مسجد میں کوئی نماز پڑھنے والا بھی نہ رہے، یا وہ مسجد آبادی کی کثرت کی وجہ سے نمازیوں سے تنگ ہو جائے اور مسجد میں توسیع کی بھی گنجائش نہ ہو۔ یا اس مسجد کے اطراف میں رہنے والے لوگ منتشر ہو جائیں اور جو لوگ وہاں آباد ہوں وہ اتنی قلیل تعداد میں ہوں کہ ان کے لئے اس مسجد کی تعمیر اور درست کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مسجد کے کچھ حصے کو فروخت کر کے اس کی رقم سے دوسرے حصے کی تعمیر کرنا جائز ہے اور اگر مسجد کے کسی بھی حصے میں انتفاع کا کوئی راستہ نہ ہو تو اس صورت میں پوری مسجد کو بیچنا بھی جائز ہے۔

(المغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ص ۲۲۵ ج ٦)

امام احمدؒ کے علاوہ امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ بھی جواز بیع کے قائل ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر وقف زمین کی ضرورت بالکیہ ختم ہو جائے تو وہ زمین دوبارہ واقف کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی۔ اور اگر واقف کا انتقال ہو چکا ہو تو پھر اس کے ورثاء کی طرف ہو جائے گی چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

"وعند محمد یعود دالی ملک الباقی اوالی وارثه بعد موته، لا نه

عینه لنوع قربة، وقد انقطعت، فصار کحصید المسجد و حشیشه اذا استغنی عنه،

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ زمین دوبارہ مالک کی ملکیت میں چلی جائے گی اور اگر اس کا انتقال ہو چکا ہے تو اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی، اس لئے کہ اس کے مالک نے اس زمین کو ایک مخصوص عبادت کے لئے معین کر دیا تھا اب جب کہ اس جگہ پر وہ مخصوص عبادت کی ادائیگی منقطع ہو گئی تو پھر اس کی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے وہ مالک کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی۔ جیسے کہ مسجد کی دری، چٹائی یا گھاس وغیرہ کی ضرورت ختم ہونے کے بعد وہ مالک کی ملکیت میں واپس لوٹ آتی ہے۔

(ہدایہ مع فتح القدیر: ص ۴۴۶ ج ۵)

لہٰذا جب وہ مالک کی ملکیت میں واپس آگئی تو اس کے لئے اس کو بیچنا بھی جائز ہو گا۔

جمہور فقہاء نے وقف مسجد کی زمین کی بیع ناجائز ہونے اور مالک کی ملکیت میں دوبارہ نہ لوٹنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف کے واقعہ سے استدلال کیا ہے وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے خیبر کی زمین وقف کی تو وقف نامہ میں یہ شرائط درج کیں کہ:

"انه لا یباع اصلها، ولا تبتاع، ولا تورث ولا توهب"

آئندہ وہ زمین نہ تو بیچی جائے گی، نہ خریدی جائے گی نہ اس میں وراثت جاری ہوگی، اور نہ کسی کو ہبہ کی جاسکے گی۔"

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے البتہ مندرجہ بالا الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بیت اللہ کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فترۃ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا عرصہ) کے زمانے میں بیت اللہ کے اندر اور اس کی اطراف میں بت ہی بت تھے اور بیت اللہ کے اطراف میں ان کفار اور مشرکین کا صرف شور مچانے چیخنے اور

سیٹیاں بجانے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اس کے باوجود بیت اللہ مقام قربت اور مقام طاعت وعبادت ہونے سے خارج نہیں ہوا۔ لہٰذا یہی حکم تمام مساجد کا ہوگا۔ (کہ اگر کسی مسجد کے قریب ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے۔ جو اس میں عبادت کرے تب بھی وہ مسجد محل عبادت ہونے سے خارج نہیں ہوگی)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ بالا استدلال پر علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ فترۃ کے زمانے میں بیت اللہ کا طواف تو کفار و مشرکین بھی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اس زمانے میں عبادت مقصودہ بالکلیہ ختم ہوگئی تھیں۔

اس اعتراض کے جواب میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کے قیام کا مقصد صرف اس کا طواف کرنا نہیں ہے بلکہ بیت اللہ کے قیام کا بڑا مقصد اس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا ہے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے جوار میں اپنی اولاد کے قیام کا ذکر فرمایا تو اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ

"ربنا لیقیموا الصلاۃ"

اے میرے رب! (میں نے ان کو یہاں اس لئے ٹھہرایا ہے) تاکہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔"

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز کا تو ذکر فرمایا۔ طواف کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ خود اللہ جل شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"طھر بیتی للطائفین والعاکفین"

"میرے گھر کو مسافروں اور مقیمین کے لئے پاک کردو۔"

یہ استدلال اس وقت درست ہے جب "طائفین" اور "عاکفین" کی تفسیر مسافر اور مقیم سے کی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت: سواء العاکف فیہ والباد" میں لفظ "عاکف" مقیم کے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔

(اعلاء السنن ص ۲۱۲ ج ۱۳)

اس کے علاوہ جمہور کی سب سے مضبوط دلیل قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

"وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً"
اور تمام مسجدیں اللہ کا حق ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو

(سورۃ جن: ۱۸)

چنانچہ اس آیت کے تحت علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

"اذا تعینت لله اصلاً وعینت له عقد، فصارت عتیقه عن التملک، مشترکة بین الخلیقة فی العبادة"
کہ جب وہ مسجدیں خالص اللہ کے لئے ہو گئیں، تو بندہ کی ملکیت سے آزاد ہو گئیں، اور صرف عبادت ادا کرنے کی حد تک تمام مخلوق کے درمیان مشترکہ ہو گئیں۔

(احکام القرآن لابن عربی ص ۸۶۹، ج ۴)

اور علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عکرمہ کا قول نقل کرتے ہیں:

وان المساجد لله، قال: المساجد کلها"
بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں حضرت عکرمہ فرماتے ہیں:
کہ تمام مسجدیں اس میں داخل ہیں، کسی کی تفریق نہیں ہے۔

(تفسیر ابن جریر: ص ۷۳۔ پارہ ۲۹)

علامہ ابن قدامہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب پیش کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا واقعہ یہ ہوا کہ کوفہ کے بیت المال میں چوری ہو گئی، جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو ہوئی تو آپ نے لکھا کہ موضوع تمارین کی مسجد منتقل کر کے بیت المال کے قریب اس طرح بناؤ کہ بیت المال مسجد کے قبلہ کی سمت میں ہو جائے، اس لئے کہ مسجد میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نمازی موجود ہی ہوتا ہے۔ (اس طرح بیت المال کی بھی حفاظت ہو جائے گی)

(المغنی لابن قدامہ، ۶: ۲۲۶)

اس استدلال کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا مقصد مسجد کو منتقل کرنا نہ ہو۔ بلکہ بیت المال کو منتقل کر کے مسجد کے سامنے بنانے کا حکم دیا ہو۔

(فتح القدیر، ج ۵۔ ۴۴۶)

بہر حال! مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس سلسلے میں جمہور کا مسلک راجح ہے۔ لہٰذا کسی مسجد کے شرعی مسجد بن جانے کے بعد اس کو بیچنا جائز نہیں اگر مسجد کو بیچنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر لوگ مسجدوں کو بھی گر جا گھر کی طرح جب چاہیں گے بیچ دیں گے اور مسجدیں ایک تجارتی سامان کی حیثیت اختیار کر لیں گی۔

لیکن فقہاء کے مندرجہ بالا اختلاف کی وجہ سے چونکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اور دونوں طرف قرآن و سنت کے دلائل موجود ہیں؟ لہٰذا اگر کسی غیر مسلم ملک میں مسجد کے اطراف سے تمام مسلمان ہجرت کر کے جا چکے ہوں اور اس مسجد پر کفار کے قبضہ اور تسلط کے بعد اس کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کرنے کا اندیشہ ہو اور مسلمانوں کے دوبارہ وہاں آکر آباد ہونے کا کوئی امکان نہ ہو تو اس ضرورت شدیدہ کے وقت امام احمد یا امام محمد بن حسن رحمہما اللہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے اس مسجد کو بیچنے اور اس کی قیمت سے کسی دوسری جگہ مسجد بنانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس کو مسجد کے سوا کسی اور مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں۔ اس پر فقہاء حنابلہ کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"ولو جاز جعل اسفل المسجد سقايه وحوانيت لهذه الحاجة، لجاز تخريب المسجد وجعله سقاية وحوانيت، ويجعل بدله مسجداً في موضع آخر۔"

(المغنی لابن قدامہ ص ۲۶۸ ج ۶)

بہر حال! امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے جہاں مسجد کی بیع کی اجازت دی گئی ہے وہ اس وقت ہے جب تمام مسلمان اس مسجد کے پاس سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں اور دوبارہ ان کے واپس آنے کا بھی کوئی امکان نہ ہو۔

لیکن اگر تمام مسلمان تو وہاں سے منتقل نہ ہوئے ہوں بلکہ مسلمانوں کی اکثریت وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو گئی ہو، لیکن بعض مسلمان اب بھی وہاں رہائش پذیر ہوں اس صورت میں اس مسجد کی بیع کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ فقہاء حنابلہ بھی عدم جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

"وان لم تتعطل مصلحة الوقف بالكية، لكن قلت، وكان غير انفع منه، واكثر رداعلي اهل الوقف لم يجز بيعه، لان الاصل تحريم البيع، وانما ابيح للضرورة صيانة لمقصود الوقف عن الضياع مع امكان تحصيله ومع الانتفاع وان قل ما يضيع المقصود"

اگر وقف کی مصلحت اور منفعت بالکلیہ ختم نہ ہوئی ہو، لیکن اس میں کمی آگئی ہو، اور دوسری صورت میں اہل وقف کے لئے زیادہ نفع بخش اور بہتر ہے، تب بھی اس وقف کی بیع جائز نہیں، اس لئے کہ وقف میں اصل بیع کی حرمت ہی ہے لیکن وقف کی مصلحت کے لئے اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ضرورت کے تحت بیع اس وقت جائز ہے جب کہ بیع کا مقصد بھی تحصیل مقصود ہو، لیکن اگر موجودہ حالت میں وقف کی بیع کے بغیر ہی اس سے نفع اٹھانا ممکن ہو اگرچہ وہ نفع قلیل مقدار میں ہو، تو اس صورت میں مقصود وقف بالکلیہ ختم ہونے کی وجہ سے اس وقف کی بیع جائز نہیں ہوگی۔"

(المغنی لابن قدامہ ص ۲۲۷ ج ۶)

شرعی محرم کے بغیر سفر کرنا

سوال: بہت سی مسلمان عورتیں کسب معاش کے لئے یا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تنہا دور دراز کے ممالک کا سفر کرتی ہیں۔ سفر میں نہ تو شرعی محرم ان کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ ان کے ساتھ جان پہچان والی عورتیں ہوتی ہیں اس صورت میں ان کے لئے

شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا ان کے لئے اس طرح تنہا سفر کرنا جائز ہے؟
جواب :۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"کوئی عورت تین روز (یعنی شرعی مسافت ۴۸ میل) سے زیادہ سفر نہ کرے الا یہ کہ اس کے ساتھ اس کا شوہر یا اس کا محرم ہو۔"

مندرجہ بالا حدیث میں صراحت کے ساتھ عورت کو تنہا سفر کرنے سے ممانعت فرمادی گئی ہے اور جمہور فقہاء نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرض حج کے لئے بھی شرعی محرم کے بغیر سفر کرنے کو ناجائز کہا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں تعلیم اور کسب معاش تو بہت کم درجہ کی چیزیں ہیں جن کی مسلمان عورتوں کو ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ خود شریعت اسلامیہ نے اس کی کفالت کی ذمہ داری شادی سے پہلے اس کے باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر ڈالی ہے اور عورت کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلے۔ لہٰذا کسب معاش اور حصول تعلیم کے لئے اس طرح بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں۔

ہاں :اگر کوئی عورت ایسی ہے جس کا نہ تو شوہر ہے، اور نہ باپ ہے۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا ایسا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ اس صورت میں اس عورت کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلنا جائز ہے اور جب یہ مقصد اپنے وطن اور اپنے شہر میں رہ کر بھی بآسانی پورا ہو سکتا ہے۔ تو اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی طرف سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔

(دیکھئے :مغنی لابن قدامہ، ص ۱۹۰ ج ۳)

غیر مسلم ملک میں عورت کا تنہا قیام کرنا

سوال :بعض مسلمان عورتیں اور نوجوان لڑکیاں جدید تعلیم کے حصول کے لئے یا کسب معاش کے لئے غیر مسلم ممالک میں بعض اوقات تنہا اور بعض اوقات غیر مسلم عورتوں

کے ساتھ رہائش اختیار کرلیتی ہیں ان عورتوں کا اس طرح تنہاء یا غیر مسلم عورتوں کے ساتھ رہائش اختیار کرنا کیسا ہے؟ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جیسا کہ ہم نے اوپر ساتویں سوال کے جواب میں عرض کیا کہ ایک مسلمان عورت کے لئے حصول معاش کے لئے یا حصول تعلیم کے لئے محرم کے بغیر تنہاء غیر مسلم ممالک کا سفر کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح قیام کرنا بھی جائز نہیں۔ ہاں! اگر کسی عورت نے محرم کے ساتھ کسی غیر مسلم ملک کا سفر کیا تھا اور وہاں رہائش پذیر ہو کر اس کو اپنا وطن بنا لیا تھا پھر یا تو اس عورت کے محرم کا وہاں انتقال ہو گیا۔ یا کسی وجہ سے وہ محرم وہاں سے سفر کر کے کسی اور جگہ چلا گیا۔ اور وہ عورت وہاں تنہا رہ گئی۔ اس صورت میں اس عورت کیلئے وہاں تنہا قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ وہ عورت وہاں رہ کر شرعی پردہ کی پابندی کرے۔

جن ہوٹلوں میں شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت ہوتی ہو۔ ان میں ملازمت کرنے کا حکم

سوال: وہ مسلمان طلبہ جو حصول تعلیم کے لئے غیر مسلم ممالک کا سفر کر کے وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے معاشی اخراجات اور تعلیمی اخراجات کے لئے وہ رقوم ناکافی ہوتی ہیں۔ جو ان کے والدین وغیرہ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ طلبہ مجبوراً معاشی اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وہاں ملازمت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان طلبہ کو وہاں پر ایسے ہوٹلوں میں ملازمت ملتی ہے جن میں شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ کیا ان طلبہ کے لئے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے؟

سوال: بعض مسلمان غیر مسلم ممالک میں شراب بنا کر بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا اس طرح غیر مسلموں کے لئے شراب بنا کر بیچنا یا خنزیر بیچنا جائز ہے؟

جواب: ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے

پیش کرنے کا عمل نہ کرے اس لئے کہ شراب پلانا یا اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا حرام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لعن الله الخمر وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه۔

اللہ جل شانہ نے شراب پر اس کے پینے والے اس کے پلانے والے، اس کے بیچنے والے، اس کے خریدنے والے، اس کو نچوڑنے والے اور جس کے لئے وہ نچوڑی جائے اور اسکے اٹھانے والے اور جس کی طرف اٹھا کر لیجائے، ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔

(ابو داؤد، کتب الاشربہ، باب العنب یعصر للخمر، حدیث نمبر ۳۶۷۴۔ ص ۳۲۶۔ ج ۳)

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الخمر عشرة: عاصرها و معتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة اليه وساقيها وبايعها وآكل ثمنها والمشترى لها والمشتراة له۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق دس اشخاص پر لعنت فرمائی ہے شراب نچوڑنے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، اس کو پینے والا، اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے، پلانے والا، بیچنے والا، شراب بیچ کر اس کی قیمت کھانے والا، خریدنے والا، جس کے لئے خریدی جائے۔

(ترمذی شریف، کتاب البیوع۔ باب ماجاء فی بیع الخمر۔ حدیث نمبر ۱۳۱۳ ص ۳۸۰ ج ۲)

ابن ماجہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ

اسی طرح ہیں:

عاصرها، ومعتصرها والمعصورة له وحاملها والمحوله له وبائعها والمبيوعة له وساقيها والمستقاة له۔

شراب نچوڑنے والا، نچڑوانے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، اس کو اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے۔ اس کو فروخت کرنے والا، جس کو فروخت کی جائے، پلانے والا، جس کو پلائی جائے۔

(ابن ماجہ، ص ۱۱۲۲ ج ۲، کتاب الاشربۃ، باب لعنت الخمر علی عشرۃ اوجہ، حدیث نمبر ۳۳۸۱)

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث روایت کی ہے۔

قالت: لما نزلت الا يات من آخر سورة البقرة خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فأقرأهن على الناس، ثم نهى عن التجارة فى الخمر۔

فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے اور وہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی تجارت اور خرید و فروخت کی ممانعت فرما دی"

(بخاری شریف، کتاب البیوع، کتاب المساجد و کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرہ، مسلم شریف کتاب البیوع، باب تحریم بیع الخمر)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول مرفوعاً نقل کیا ہے کہ:

ان الذى حرم شربها حرم بيعها۔

جس ذات نے شراب پینے کو حرام قرار دیا ہے، اسی ذات نے اس کی خرید و فروخت بھی حرام قرار دی ہے۔

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:

عن عبد الرحمٰن بن وعلة، قال: سالت ابن عباس فقلت: انا بارض لنا بها الكروم، وان اكثر غلاتها الخمر، فذ كر ابن عباس ان رجلا اهدى الی النبی صلی الله علیه وسلم راویة خمر، فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الذی حرم شربها حرم بیعها

عبد الرحمٰن بن وعلة سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں ہمارے پاس انگور کے باغات ہیں۔ اور ہماری آمدنی کا بڑا ذریعہ شراب ہی ہے اس کے جواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شراب کی ایک مشک بطور ہدیہ کے پیش کی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا: جس ذات نے اسکے پینے کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کی خرید و فروخت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ "

(مسند احمد" ۔ ج ۱ ص ۲۴۴)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شراب کی تجارت بھی حرام ہے اور اجرت پر اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جانا، یا پلانا سب حرام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوی سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگر کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید و فروخت کا عام رواج ہو۔ وہاں بھی کسی مسلمان کے لئے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں۔

اور میرے علم کے مطابق فقہاء میں سے کسی فقیہ نے بھی اس کی اجازت نہیں دی۔

"الکحل" ملی ہوئی دواؤں کا حکم

سوال: یہاں مغربی ممالک میں اکثر دواؤں میں ایک فیصد سے لے کر ۲۵ فی صد تک

"الکحل" شامل ہوتا ہے۔ اس قسم کی دوائیاں عموماً، نزلہ، کھانسی گلے کی خراش جیسی معمولی بیماریوں میں استعمال ہوتی ہیں اور تقریباً ۹۵ فی صد دواؤں میں "الکحل" ضرور شامل ہوتا ہے اب موجودہ دور میں "الکحل" سے پاک دواؤں کو تلاش کرنا مشکل، بلکہ ناممکن ہو چکا ہے، ان حالات میں ایسی دواؤں کے استعمال کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: الکحل ملی ہوئی دواؤں کا مسئلہ اب صرف مغربی ممالک تک محدود نہیں رہا، بلکہ اسلامی ممالک سمیت دنیا کے تمام ممالک میں آج یہ مسئلہ پیش آرہا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو اس مسئلہ کا حل آسان ہے۔ اس لئے کہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء سے بنائی ہوئی شراب کو بطور دواء کے یا حصول طاقت کے لئے اتنی مقدار میں استعمال کرنا جائز ہے۔ جس مقدار سے نشہ پیدا نہ ہوتا ہو۔

(فتح القدیر ج ۸ ص ۱۶۰)

دوسری طرف دواؤں میں جو "الکحل" ملایا جاتا ہے۔ اس کی بڑی مقدار انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء مثلاً چمڑا، گندھک، شہد، شیرہ، دانہ، جو وغیرہ سے حاصل کی جاتی ہے۔

(انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، ج ۱ ص ۵۴۴)

لہٰذا دواؤں میں استعمال ہونے والا "الکحل" اگر انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء سے حاصل کیا گیا ہے، تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اس دواء کا استعمال جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ حد سکر تک نہ پہنچے اور علاج کی ضرورت کے لئے ان دونوں اماموں کے مسلک پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

اور اگر وہ "الکحل" انگور اور کھجور ہی سے حاصل کیا گیا ہے تو پھر اس دواء کا استعمال ناجائز ہے۔ البتہ اگر ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ اس مرض کی اس کے علاوہ کوئی اور دوا نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔ اس لئے کہ اس حالت میں حنفیہ کے نزدیک تداوی بالمحرم جائز ہے۔

(البحر الرائق ج ۱ ص ۱۱۶)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خالص اشربہ محرمہ کو بطور دوا استعمال کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ لیکن اگر شراب کو کسی دوا میں اس طرح حل کر دیا جائے کہ اس کے ذریعے شراب کا ذاتی وجود ختم ہو جائے اور اس دوا سے ایسا نفع حاصل کرنا مقصود ہو جو دوسری پاک دوا سے حاصل نہ ہو سکتا ہو تو اس صورت میں بطور علاج ایسی دوا کا استعمال جائز ہے۔ جیسا کہ علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ "نہایۃ المحتاج" میں فرماتے ہیں۔

اما مستهلكة مع دواء آخر فيجوز التداوى بها، كصرف بقية النجاسات ان عرف اواخبره طبيب عدل بنفعها وتعينيها بان لا يغنى عنها طاہر۔

ایسی شراب جو دوسری دوا میں حل ہو کر اس کا ذاتی وجود ختم ہو جائے، اس کے ذریعے علاج کرنا جائز ہے، جیسا کہ دوسری نجس اشیاء کا بھی یہی حکم ہے۔ بشرطیکہ کہ علم طب کے ذریعہ اس کا مفید ہونا ثابت ہو، یا کوئی عادل طبیب اس کے نافع اور مفید ہونے کی خبر دے اور اسکے مقابلے میں کوئی ایسی پاک چیز بھی موجود نہ ہو جو اس سے بے نیاز کر دے۔

(نہایۃ المحتاج للرملی ج ۸ ص ۱۲)

اور خالص "الکحل" کا استعمال بطور دوا کے نہیں کیا جاتا، بلکہ ہمیشہ دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی "الکحل" ملی ہوئی دواؤں کو بطور علاج استعمال کرنا جائز ہے۔"

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک میرے علم کے مطابق تداوی بالمحرم حالت اضطرار کے علاوہ کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

بہر حال موجود دور میں چونکہ ان دواؤں کا استعمال بہت عام ہو چکا ہے اس لئے اس مسئلہ میں احناف یا شوافع کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے ان کے مسلک کے مطابق گنجائش دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

پھر اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت اور بھی ہے جس کے بارے میں دواؤں

کے ماہرین سے پوچھ کر اس کو حل کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ جب "الکحل" کو دواؤں میں ملایا جاتا ہے تو کیا اس عمل کے بعد "الکحل" کی حقیقت اور ماہیت باقی رہتی ہے؟ یا اس کیمیاوی عمل کے بعد اس کی ذاتی حقیقت اور ماہیت ختم ہو جاتی ہے؟ اگر "الکحل" کی حقیقت اور ماہیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کیمیاوی عمل کے بعد وہ "الکحل" نہیں رہتا بلکہ دوسری شئی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس صورت میں تمام ائمہ کے نزدیک بالاتفاق اس کا استعمال جائز ہے، اس لئے کہ شراب جب سرکہ میں تبدیل ہو جائے، اس وقت تمام ائمہ کے نزدیک حقیقت اور ماہیت کی تبدیلی کی وجہ سے اس کا استعمال جائز ہے۔ واللہ اعلم

جیلیٹین استعمال کرنے کا حکم

سوال: یہاں مغربی ممالک میں ایسے خمیرے اور جیلیٹین ملتی ہیں، جن میں خنزیر سے حاصل کردہ مادہ تھوڑی یا زیادہ مقدار میں ضرور شامل ہوتا ہے، کیا ایسے خمیرے اور جیلیٹین کا استعمال شرعاً جائز ہے؟

الجواب: اگر خنزیر سے حاصل شدہ عنصر کی حقیقت اور ماہیت کیمیاوی عمل کے ذریعے بالکل بدل چکی ہو تو اس صورت میں اس کی نجاست اور حرمت کا حکم بھی ختم ہو جائے گا اور اگر اس کی حقیقت اور ماہیت نہیں بدلی تو پھر وہ عنصر نجس اور حرام ہے (اور جس چیز میں وہ عنصر شامل ہوگا، وہ بھی حرام ہوگی) واللہ اعلم۔

مسجد میں شادی بیاہ کی تقریبات

سوال: مغربی ممالک میں مسلمانوں کو کشادہ اور وسیع ہال میسر نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کی تقریبات مساجد ہی میں منعقد کرتے ہیں، جب کہ ان تقریبات میں رقص و سرور اور گانے بجانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ کیا اس قسم کی تقریبات مساجد میں منعقد کرنا جائز ہے؟

الجواب: جہاں تک عقد نکاح کا تعلق ہے۔ احادیث نبویہ کی رو سے مساجد میں منعقد کرنا مستحب اور مندوب ہے، لیکن رقص و سرور اور گانا بجانا کسی حال میں جائز نہیں۔ لہٰذا

شادی کی وہ تقریبات جن میں ایسے منکرات اور فواحش شامل ہوں، مساجد میں منعقد کرنا جائز نہیں۔ واللہ اعلم

عیسائیوں کے نام رکھنا

سوال: بعض عیسائی حکومتوں نے خصوصاً جنوبی امریکہ کی حکومت نے عوام پر لازم قرار دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے عیسائی نام کے علاوہ دوسرے نام نہ رکھیں اس کے لئے حکومت نے ناموں کی لسٹیں تیار کی ہیں اور یہ لازم قرار دیا ہے کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے نام اسی لسٹ سے منتخب کر کے رکھیں اور کوئی شخص بھی اس لسٹ کے علاوہ کوئی دوسرا نام حکومت کے پاس رجسٹرڈ نہیں کرا سکتا۔ کیا مسلمانوں کو ایسے نام رکھنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو پھر اس مشکل کے حل کی کیا صورت ہے؟

الجواب: اگر حکومت کی طرف سے عیسائی نام رکھنا لازم اور ضروری ہو تو اس صورت میں ایسے نام رکھے جاسکتے ہیں۔ جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مشترک ہیں مثلاً اسحاق، داؤد، سلیمان مریم، لبنیٰ، راحیل، صفورا وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سرکاری محکمے میں بچے کا نام حکومت کی طرف سے لازم کردہ لسٹ میں منتخب کر کے درج کرایا جائے اور گھر پر اس کو دوسرے اسلامی نام ہی سے پکارا جائے۔ واللہ اعلم

کچھ عرصے کے لئے نکاح کرنا

سوال: جو مسلمان طلباء و طالبات حصول تعلیم کے لئے مغربی ممالک میں آتے ہیں وہ یہاں آکر شادی کر لیتے ہیں اور شادی کرتے وقت یہ نیت ہوتی ہے کہ جب تک ہمیں یہاں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ بس اس وقت تک اس نکاح کو برقرار رکھیں گے اور پھر جب حصول تعلیم کے بعد اپنے ملک اور اپنے وطن واپس جائیں گے تو اس نکاح کو ختم کر دیں گے اور مستقل یہاں رہنے کی کوئی نیت نہیں ہوتی البتہ یہ نکاح بھی عام نکاح کے طریقہ پر اور انہیں الفاظ سے کیا جاتا ہے، ایسے نکاح کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: اگر انعقاد نکاح کی تمام شرائط موجود ہوں، اور عقد نکاح میں کوئی ایسا لفظ

استعمال نہ کیا گیا ہو جس سے وہ نکاح موقت سمجھا جائے۔ اس صورت میں وہ نکاح منعقد ہو جائے گا اور اس نکاح کے بعد تمتع جائز ہے اور نکاح کرنے والے مرد یا عورت کا یہ نیت کرنا کہ تعلیم کی مدت کے بعد ہم اس نکاح کو ختم کر دیں گے اس نیت سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر واقع نہیں ہوگا۔ البتہ نکاح شریعت کے نزدیک چونکہ ایک دائمی عقد ہے۔ اس لئے زوجین سے بھی یہ مطالبہ ہے کہ وہ اس عقد کو ہمیشہ باقی رکھیں اور شدید ضرورت کے علاوہ کبھی اس کو ختم نہ کریں اور عقد کرتے وقت ہی زوجین کا جدائی اور فرقت کی نیت کرنا نکاح کے اس مقصد کے خلاف ہے۔ اس لئے ایسی نیت رکھنا دیانۃً کراہت سے خالی نہیں۔ واللہ اعلم۔

اس سوال و جواب کے بارے میں بعض حضرات نے متوجہ کیا ہے کہ اس سے متعدد غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں، لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ فقہاء کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق یہاں تین چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں، جن کو وضاحت کے ساتھ الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔

(۱) متعہ: اس کی حقیقت یہ ہے دو مرد و عورت ایک معین مدت تک ایک ساتھ رہنے اور ایک دوسرے سے نفع اٹھانے کا معاہدہ کرتے ہیں اس میں عموماً نہ تو نکاح کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور نہ معاہدہ کے وقت دو گواہوں کی موجودگی شرط ہے، یہ صورت بالکل حرام ہے اور حرمت کے لحاظ سے زنا کے حکم میں ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین

(۲) **نکاح موقت**: اس میں مرد و عورت باقاعدہ دو گواہوں کے سامنے نکاح [illegible] کے ساتھ ایجاب و قبول کرتے ہیں لیکن وہ ساتھ ہی یہ بھی صراحت کر دیتے ہیں کہ یہ نکاح ایک مخصوص مدت کے لئے ہے اس کے بعد یہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ یہ صورت [illegible] شرعاً بالکل حرام ہے اور اس طرح نہ نکاح منعقد ہوتا ہے اور نہ وظائف زوجیت کی ادائیگی [illegible] اثر [illegible] ہوتی ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ مرد عورت باقاعدہ دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کے ذریعے نکاح کریں اور نکاح میں اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا کہ یہ نکاح مخصوص مدت کے لئے کیا جا رہا ہے لیکن فریقین میں سے کسی ایک یا دونوں کے

دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ ایک مخصوص مدت گزرنے کے بعد طلاق کے ذریعے ہم نکاح ختم کر دیں گے۔ فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق اس طرح کیا ہوا نکاح درست ہو جاتا ہے اور مرد و عورت باقاعدہ میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ دائمی اور ابدی طور پر قائم ہو جاتا ہے اور ان پر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ارادے کے مطابق معین مدت پر طلاق ضرور دیں، بلکہ ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بغیر کسی عذر کے طلاق کا اقدام نہ کریں اور چونکہ شریعت میں نکاح کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس لئے ان کا یہ دلی ارادہ کہ کچھ عرصے کے بعد طلاق دے دیں گے۔ شرعاً ایک مکروہ ارادہ ہے، لہٰذا اس ارادے کے ساتھ نکاح کرنا بھی مکروہ ہے۔

مذکورہ صورت میں نکاح کے صحت کی تصریح تمام فقہاء حنفیہ نے فرمائی ہے چند عبارتیں مندرجہ ذیل ہیں

ولو تزوجها مطلقاً، وفی نیته ان یعقد معهامدة نواها، فالنکاح صحیح

(عالمگیریہ ص ۱۸۳ ج ۱)

ولیس منه (ای من المتعة والنکاح الموقت) مالونکحها علی ان یطلقها بعد شهرا و نوی مکثا معها مدة معینة

(الدر المختار مع ردالمحتار ص ۳۱۹ ج ۲)

اما لو تزوج وفی نیته ان یطلقها بعد مدة نواها صح

(فتح القدیر ص ۱۵۲ ج ۳)

والله اعلم بالصواب

عورت کا بناؤ سنگھار کے ساتھ ملازمت پر جانا

سوال : ایک مسلمان خاتون کے لئے کاجل لگا کر اور بھوؤں کے بال صاف کر کے تعلیم گاہ یا دفتر میں حصول معاش کے جانا کیسا ہے؟

الجواب : جیسا کہ ہم نے اوپر ایک سوال کے جواب میں عرض کیا تھا کہ ایک مسلمان خاتون کے لئے کسب معاش کے لئے نکلنا جائز نہیں۔ البتہ جس ضرورت کے موقع پر شریعت نے مسلمان خاتون کے لئے گھر سے باہر نکلنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس موقع پر بھی اس خاتون پر یہ لازم ہے کہ وہ زیب و زینت کے بغیر حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے گھر سے نکلے۔

عورت کا اجنبی مردوں سے مصافحہ کرنا

سوال : مغربی ممالک کی مسلمان عورتوں کو بعض اوقات ان کے دفاتر یا تعلیم گاہ میں آنے والے اجنبی مردوں سے مصافحہ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح مسمان مردوں کو بعض اوقات اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنے کی نوبت آجاتی ہے اور مصافحہ سے انکار کی صورت میں ان سے ضرر اور نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کیا شرعاً اس صورت میں اس طرح مصافحہ کرنا جائز ہے؟

جواب : عورتوں کے لئے اجنبی مردوں سے مصافحہ کرنا اور مرددوں کے لئے اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں، اس بارے میں احادیث مبارکہ میں واضح ارشادات موجود ہیں اور تمام فقہاء بھی اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

نماز کی ادائیگی کے لئے گرجوں کو کرایہ پر حاصل کرنا

سوال : مغربی ممالک کے مسلمان بعض اوقات پنج وقتہ نماز اور نماز جمعہ اور نماز عیدین کی ادائیگی کے لئے عیسائیوں کے گرجے کرایہ پر حاصل کر لیتے ہیں۔ جب کہ ان مجسمے تصاویر اور دوسری داہیات چیزیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ گرجے دوسرے ہالوں کے بنسبت کم کرایہ پر حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات تعلیمی اور خیراتی

ادارے اپنا گرجا مسلمانوں کو مفت بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ کیا اس قسم کے گرجوں کو کرایہ پر حاصل کر کے اس میں نماز ادا کرنا جائز ہے؟

جواب: نماز کی ادائیگی کے لئے گرجوں کو کرایہ پر لینا جائز ہے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جعلت لی الارض کلها مسجداً

میرے لئے پوری زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔

البتہ نماز کے ادائیگی کے وقت بتوں اور مجسموں کو وہاں سے ہٹا دینا چاہئے اس لئے کہ جس گھر میں مجسمے ہوں اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجسموں ہی کی وجہ سے گرجوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر کا یہ قول کتاب "الصلاۃ، باب الصلاۃ فی البیعۃ" میں تعلیقاً ذکر کیا ہے اور اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ان ابن عباس کان یصلی فی البیعۃ الا بیعۃ فیها تماثیل"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ گرجے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، البتہ جس گرجے میں مجسمے ہوں (اس میں نماز نہیں پڑھتے تھے)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مسنداً ذکر کیا ہے اور مزید یہ بھی لکھا ہے:

"فان کان فیها تماثیل خرج، فصلی فی المطر"

اگر اس گرجے میں مجسمے ہوتے تو آپ باہر نکل آتے اور بارش میں ہی نماز پڑھ لیتے۔"

(فتح الباری ص ۵۳۲ ج ۱۔ نمبر ۴۳۵)

اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم

سوال: اہل کتاب (یہود و نصاری) کے ذبائح اور ان کے ہوٹلوں میں جو کھانا پیش کیا جاتا ہے، ان کی حلت اور حرمت کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ اس لئے کہ اس بات کا یقینی علم حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی کہ انہوں نے ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھی تھی یا نہیں؟

جواب: اس مسئلہ میں میری رائے جس کو میں فیما بینی و بین اللہ حق سمجھتا ہوں یہ ہے کہ صرف ذبح کرنے والے کا اہل کتاب میں سے ہونا ذبیحہ کے حلال ہونے کے لئے کافی نہیں جب تک وہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ نہ پڑھے اور شرعی طریقہ پر رگوں کو نہ کاٹ دے جیسا کہ ذبح کرنے والے کا صرف مسلمان ہونا بھی ذبیحہ جانور کے حلال ہونے کے لئے کافی نہیں ہوتا، جب تک کہ ذبیحہ حلال ہونے کی تمام شرائط نہ پائی جائیں اور اسلام نے اہل کتاب کے ذبیحہ کو جو حلال قرار دیا ہے اور دوسرے مشرکین کے ذبیحہ کو حرام قرار دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اہل کتاب ذبح کے وقت ان شرائط کا لحاظ رکھتے تھے، جو اسلام نے شرعی ذبح پر عائد کی ہیں۔

لہٰذا اس اصول کے پیش نظر اہل کتاب کا ذبیحہ اس وقت تک حلال نہیں ہوگا۔ جب تک وہ ان شرعی شرائط کو پورا نہ کریں اور چونکہ آج کل یہود و نصاری کی بڑی تعداد ذبیحہ کی ان شرائط کا لحاظ نہیں رکھتی ہے جو ان کے اصلی مذہب میں ان پر واجب تھیں۔ اس لئے ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے حلال نہ گا۔ البتہ اگر وہ ان شرائط کو پورا کر لیں تو پھر وہ ذبیحہ حلال ہو جائے گا۔

شرعی منکرات پر مشتمل تقریبات میں شرکت

سوال: مغربی ممالک میں ایسی عام تقریبات اور اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے ان تقریبات میں مخلوط اجتماع ہوتا ہے اور شراب پینے پلانے کا دور بھی چلتا ہے۔ اگر ان تقریبات میں مسلمان شرکت نہ کریں تو وہ ایک طرف پورے معاشرے سے کٹ کر تنہا رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف بہت سے

فوائد سے بھی محروم ہو جاتے ہیں کیا ان حالات میں مسلمانوں کے لئے ان تقریبات میں شرکت کرنا جائز ہے؟

جواب: جو تقریبات شراب اور خنزیر کے کھانے پینے اور مردوں اور عورتوں کے رقص و سرور پر مشتمل ہوں ان میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز نہیں جب کہ اس شرکت کے لئے شہرت اور جاہ کے حصول کے علاوہ کوئی اور چیز داعی بھی نہیں ہے مسلمانوں کے لئے ان فسق و فجور کے اسباب اور محرمات دین کے سامنے جھکنا مناسب نہیں جو ان کو پیش آرہے ہیں بلکہ ایسے موقع پر توان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے دین پر جمے رہیں۔ اور اگر غیر مسلم ممالک میں رہائش پزیر مسلمان ــ جن کی تعداد کم نہیں ہے ــ ان تقریبات میں شرکت نہ کرنے پر اتفاق کرلیں۔ تو غیر مسلم خود اس بات پر مجبور ہوں گے کہ وہ ان تقریبات کو ان منکرات سے خالی کرلیں۔ واللہ اعلم

مسلمان کے لئے غیر مسلم حکومت کے اداروں میں ملازمت کرنا

سوال: کسی مسلمان کے لئے امریکہ یا کسی بھی غیر مسلم حکومت کے سرکاری محکمے میں ملازمت کرنا جائز ہے؟ جس میں ایٹمی توانائی کا محکمہ اور جنگی حکمت عملی کے تحقیقی ادارے بھی شامل ہیں؟

جواب: امریکی حکومت یا دوسری غیر مسلم حکومتوں کے سرکاری محکموں میں ملازمت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح ایٹمی توانائی کے محکمے میں اور جنگی حکمت عملی کے تحقیقی ادارے میں بھی کام کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر اس کے ذمہ کوئی ایسا عمل سپرد کیا جائے جس میں کسی بھی ملک یا شہر کے عام مسلمانوں کو ضرر لاحق ہوتا ہو، تو اس عمل سے اجتناب کرنا اور اس معاملے میں ان کے ساتھ تعاون نہ کرنا واجب ہے، چاہے اس اجتناب کے لئے اس کو اپنی ملازمت سے استعفاء ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ واللہ اعلم

مسلمان انجینئر کے لئے عیسائیوں کے عبادت خانے کا ڈیزائن اور نقشہ تیار کرنا:

سوال: اگر کوئی مسلمان انجینئر کسی کمپنی میں ملازم ہو، جہاں اس کو مختلف عمارتوں کی تعمیر کے لئے نقشے تیار کرنے کا کام سپرد ہو جس میں نصاریٰ کے چرچ اور عبادت گاہ کے لئے نقشے تیار کرنے کا کام بھی شامل ہے۔ اور چرچ وغیرہ کے نقشے بنانے سے انکار کی صورت میں اسے ملازمت چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو کیا اس مسلمان انجینئر کے لئے نصاریٰ کی عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے نقشے تیار کرنا جائز ہے؟

جواب: مسلمانوں انجینئر کے لئے کافروں کی عبادت گاہوں کے نقشے اور ڈیزائن تیار کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"
"اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو، اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔"

(سورہ المائدہ: ۲)

چرچ کے لئے چندہ دینا:

سوال: کیا کسی مسلمان کے لئے یا کسی مسلم بورڈ کے لئے عیسائیوں کے تعلیمی ادارے مشنری ادارے یا چرچ میں چندہ دینا جائز ہے؟

جواب: کسی مسلمان کے لئے چاہے وہ کوئی فرد ہو یا جماعت، عیسائی اداروں یا چرچ میں چندہ دینا یا تعاون کرنا ہرگز جائز نہیں۔

شوہر کی حرام آمدنی کی صورت میں بیوی بچوں کے لئے حکم

سوال: بہت سے مسلمان خاندان ایسے ہیں جن کے مرد شراب اور خنزیر وغیرہ جیسی

حرام چیزوں کا کاروبار کرتے ہیں، ان کے بیوی بچے اگرچہ ان کے اس کاروبار کو ناپسند کرتے ہیں، لیکن انکی پرورش بھی اسی آمدنی سے ہو رہی ہے۔ کیا اس صورت میں ان کے بیوی بچے گناہ گار ہونگے؟

جواب: ایسی صورت میں ان شوہروں کی بیویوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے شوہروں سے شراب اور خنزیر کے کاروبار کو چھڑانے کی پوری سعی اور کوشش کریں، لیکن اس کوشش کے باوجود اگر وہ اس کاروبار کو نہ چھوڑیں تو پھر اگر ان بیویوں کے لئے جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لئے اپنے شوہروں کے مال میں سے کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر ان کے لئے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں ان کے لئے اپنے شوہروں کے مال سے کھانا جائز ہے۔ اور حرام کھانے کا گناہ ان کے شوہروں پر ہو گا۔ نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ اور حرام کھلانے کا گناہ باپ پر ہو گا۔ البتہ بالغ اور بڑی اولاد خود کما کر کھائیں۔ باپ کے مال سے نہ کھائیں۔

اور ان حالات میں بیوی کے لئے حرام مال کھانے کے جواز کی بعض فقہاء نے تصریح بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

> "اشتری الزوج طعاماً او کسوۃ من مال خبیث جاز للمراۃ اکلہ ولبسھا، والا ثم علی الزوج"
>
> "اگر شوہر کھانا یا لباس مال حرام سے خرید کر لے آئے۔ تو عورت کے لئے اس کا کھانا اور پہننا جائز ہے۔ اور اس فعل کا گناہ شوہر کو ہو گا۔"

(شامی: ج ٦ ص ١٩١۔ ایچ۔ ایم سعید)

بینک کے توسط سے جائیداد وغیرہ خریدنا:

سوال: رہائشی مکان، گاڑی اور گھر کا دوسرا سازو سامان بینکوں اور مالیاتی اداروں کے توسط سے خریدنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ بینک اور مالیاتی ادارے ان چیزوں کو رہن رکھ

کر قرض دیتے ہیں۔ اور اس قرض پر معین شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکوہ معاملے کے بدل کے طور پر جو صورت ممکن ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماہانہ کرایوں پر ان چیزوں کو حاصل کرلیا جائے۔ لیکن ماہانہ کرایہ عموماً بیع کی ان قسطوں سے زیادہ ہوتا ہے جو مندرجہ بالا پہلی صورت میں بینک وصول کرتے ہیں :

جواب : مندرجہ بالا معاملہ سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔ البتہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس سودی معاملہ کے مقابلے میں شریعت اسلامیہ کے موافق دوسرے جائز طریقے اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً یہ کہ بینک اس معاملے میں بذات خود قسطوں پر فروخت کرے، یعنی بینک اصل بائع سے پہلے خود خرید لے۔ اور پھر مناسب نفع کا اضافہ کر کے گاہک کو فروخت کر دے اور پھر قسطوں میں اس کی قیمت وصول کرے۔

(واللہ اعلم)

اسلامی بینکنگ کے چند مسائل

اور انکا حل

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

"واذا وعد اخلف"

(صحیح بخاری)

کہ جب وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے

اسلامی بینکنگ کے چند مسائل اور ان کا حل

بینک کا قرض کی فراہمی پر آنے والے اخراجات کو ”سروس چارج“ کے نام سے ایک متعین رقم وصول کرنا۔

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک اپنے رکن ممالک کو بنیادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے غیر سودی قرضے فراہم کرتا ہے، اور قرض جاری کرنے پر جو دفتری مصارف آتے ہیں۔ بینک ”سروس چارج“ کے نام سے ایک متعین رقم بطور مصارف کے وصول کرتا ہے۔

تفصیل اس کی یہ کہ ”اسلامی ترقیاتی بینک“ اپنے ممبر ممالک کو ان کے بنیادی منصوبوں کی تکمیل کے لئے جو قرضے فراہم کرتا ہے، وہ طویل المعیاد ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی ۱۵ سال سے ۳۰ سال کے دوران کرنی ہوتی ہے، قرض کے اس معاملے میں شریعت اسلامیہ کے احکام کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ بینک ان قرضوں پر کوئی سود وصول نہیں کرتا، البتہ اس قرض کے جاری کرنے پر بینک کے جو ادارتی مصارف آتے ہیں، ان مصارف کو بینک اپنے بنیادی دستور العمل کے مطابق بطور ”سروس چارج“ وصول کرتا ہے۔

اب بینک یہ چاہتا ہے کہ جن منصوبوں کی تکمیل کے لئے وہ ممبر ممالک کو سرمایہ فراہم کرے گا، ان کی پلاننگ اور نگرانی پر جو ادارتی مصارف آئیں گے، ان مصارف کو سامنے رکھتے ہوئے بینک ”سروس چارج“ کی تحدید کر دے ــ لیکن چونکہ بینک جن

منصوبوں کی تکمیل کے لئے سرمایہ فراہم کرے گا۔ ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ جو واقعی ادارتی مصارف آرہے ہیں، ان کی تحدید کرنا مشکل ہے، اس مشکل کے حل کے لئے بینک نے یہ کیا کہ تمام قرضے جاری کرنے پر جو ادارتی مصارف آتے ہیں، ان کا حساب لگایا، اور پھر ان مصارف کو جاری کئے جانے والے قرضوں پر تقسیم کیا تو وہ مصارف اصل قرض کی نسبت سے ڈھائی سے تین فیصد بنے۔ لہٰذا اب بینک یہ چاہتا ہے کہ ہر قرض پر دفتری اخراجات کا علیحدہ حساب کرنے کے **بجائے** قرض کی رقم کی نسبت سے جو تقریبی مصارف آتے ہیں۔ ان کو متعین کر کے "سروس چارج" کے نام سے وصول کرلے۔ کیا بینک کے لئے اس طرح "سروس چارج" متعین کر کے وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:

قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں. بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور "سروس چارج" کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئے ہیں۔ البتہ اگر پوری احتیاط کے ساتھ ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی: اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہو گا۔

اور اگر ہر منصوبہ کے علیحدہ علیحدہ اخراجات کی تحدید ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بینک کے لئے ان سے واقعی اخراجات طلب کرنے کے بجائے قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی دفتری کاروائی کی اجرت وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو۔ اس لئے کہ قرض دینے کا عمل بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس پر نفع کا مطالبہ کرنا یا اجرت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں۔ لہٰذا قرض جاری کرنے پر آنے والے مصارف کو اندازے سے کم کم وصول کرنا جائز نہیں۔ لیکن اس قرض کے اجراء پر پیش آنے والے حقیقی دفتری اخراجات کا بلا معاوضہ ہونا شرعاً کوئی ضروری نہیں۔

البتہ بینک کے لئے قرض لینے والوں سے قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے

اجرت وصول کرنے کی گنجائش ہے جو قرض جاری کرنے پر آنے والے دفتری اخراجات کو پورا کر سکے۔ بشرطیکہ اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے، ایک یہ کہ یہ اجرت اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل کے برابر ہو، دوسرے یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے۔

اس مسئلہ کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت طلب کرنا جائز نہیں۔ لیکن مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اور بشرطیکہ اس کو نفس فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر اجرت لینے کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنایا جائے۔

البتہ قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے "سروس چارج" وصول کرنے پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ قرض کی مقدار کی کمی اور زیادتی پر دفتری امور میں یا اس قرض کے اندراجات میں کوئی کمی یا زیادتی واقع نہیں ہوتی۔ (چنانچہ ایک ہزار کے اندراج کے مقابلے میں دو ہزار کے اندراج میں کوئی زیادتی واقع نہیں ہوتی) اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ "سروچ چارج" کی رقم ہر قرض لینے والے سے برابر وصول کی جانی چاہئے، قرض کی مقدار کی کمی اور زیادتی سے اس پر کوئی فرق واقع نہ ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اجرت مثل ہمیشہ کام کرنے کی اس مشقت کے بقدر ہونا ضروری نہیں ہے، جو عامل نے برداشت کی ہے بلکہ بعض اوقات اس میں کام کی نوعیت اور اس کی معنوی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات مستاجر کو حاصل ہونے والے نفع کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، اسی لئے بعض اوقات معمولی مشقت کے کام پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے۔ اور بعض اوقات زیادہ مشقت کے کام پر تھوڑی اجرت دی جاتی ہے۔

چنانچہ درمختار میں علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

یستحق القاضی الاجر علی کتب الوثائق والمحاضر، والسجلات قدر ما یجوز لغیرہ کالمفتی، فانہ یستحق

اجر المثل علی کتابة الفتویٰ، لان الواجب علیه الجواب باللسان، دون الکتابة بالبنان، ومع هذا الکف اولی، احترازاً عن القیل والقال، وصیانة لماء الوجه عن الابتذال

قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے پر اس قدر اجرت وصول کرنا جائز ہے، جس قدر دوسرے شخص کو ایسے عمل پر اجرت لینا جائز ہے، جس طرح مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے کی اجرت مثل وصول کرنا جائز ہے، اس لئے کہ مفتی کے ذمے صرف زبان سے جواب دینا واجب ہے، لکھ کر جواب دینا واجب نہیں، لیکن جائز ہونے کے باوجود عوام کے قیل وقال اور اپنے کو حقارت اور ذلت سے دور رکھنے کے لئے اجرت نہ لینا ہی افضل ہے۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں:

قال فی الجامع الفصولین: للقاضی ان یاخذ ما یجوز لغیره، وما قیل فی کل الف خمسة دراهم، لا نقول به، ولا یلیق ذلک بالفقه، وای مشقة للکاتب فی کثرة الثمن؟ وانما اجد مثله بقدر مشقته او بقدر عمله فی صنعته ایضاً، کحکاک وثقاب یستاجر باجر کثیر فی مشقة قلیلة قال بعض الفضلاء: افهم ذلک جواز اخذ الاجرة الزائدة وان کان العمل مشقته قلیلة، ونظرهم لمنفعة المکتوب له- اھ قلت: ولا یخرج ذلک عن اجرة مثله، فان من تفرغ لهذا العمل، کثقاب اللآلی مثلاً، لا یاخذ الاجر علی قدر مشقته فانه لا یقوم بمؤونته، ولو الزمناه ذلک لزم ضیاع هذه الصنعة فکان ذلک اجر مثله

(ردالمحتار: ۵/ ۹۲، کتاب الاجارة، مسائل شتی)

جامع الفصولین میں ہے کہ قاضی کو (دستاویزات لکھنے اور

اندراجات کرنے پر) اس قدر اجرت لینا جائز ہے جس قدر کہ دوسرا شخص اتنی مقدار پر لکھنے پر تیار ہو، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ایک ہزار پر پانچ درہم وصول کرے، ہم اس کو جائز نہیں کہتے، اور فقہی اعتبار سے بھی یہ مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ بڑی مقدار کی رقم لکھنے میں کاتب کی مشقت میں کونسا اضافہ ہو جاتا ہے؟ اور کسی کام کی اجرت مثل یا تو کام کی مشقت کے اعتبار سے ہوتی ہے یا کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہوتی ہے، مثلاً سونے کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے والے اور (موتیوں میں) سوراخ کرنے والے کو معمولی مشقت پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے۔

چنانچہ بعض فقہاء اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگرچہ کسی عمل میں مشقت کم ہو، تب بھی اس پر (عمل کی نوعیت کی وجہ سے) زیادہ اجرت لینا جائز ہے، (لہٰذا قاضی اور مفتی کو بھی زیادہ اجرت لینا جائز ہے) اس لئے کہ ان فقہاء کی نظر اس تحریر میں مکتوب لہ کو حاصل ہونے والے نفع کی طرف مبذول ہوئی ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ (سونا پرکھنے والا اور موتیوں میں سوراخ کرنے والا جو اجرت لیتا ہے) وہ اجرت مثل سے خارج نہیں ہے۔ اس لئے جس شخص نے اپنے آپ کو صرف اسی کام کے لئے مثلاً موتیوں میں سوراخ کرنے کے لئے فارغ کر لیا ہے، وہ مشقت کے بقدر اجرت وصول نہیں کرتا ہے، اور اگر ہم اس پر یہ لازم کر دیں کہ وہ صرف مشقت کے بقدر اجرت وصول کیا کرے تو وہ کام چھوڑ بیٹھے گا، اور اس طرح اس صنعت کو بند کرنا لازم آجائے گا پس یہی اس کے لئے اجر مثل ہے

(در مختار ۵/ ۹۲ کتاب الاجارۃ مسائل شتی)

اور یہ بات تو مشہور ہے کہ بہت سے فقہاء نے دلال کے کمیشن کو مبیع کی قیمت میں فیصد کے تناسب سے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ

علیہ بخاری شریف کی شرح میں لکھتے ہیں:

وھذا الباب فیه اختلاف العلماء، فقال مالک: یجوز ان یستاجره علی بیع سلعته اذا بین لذلک اجرًا قال: وکذلک اذا قال له: بع ھذا الثوب، ولک درھم انه جائز، وان لم یوقت له ثمناً، وکذلک ان جعل له فی کل مائة دینار شیئاً، وھو جعل، وقال احمد: لا باس ان یعطیه من الالف شیئاً معلوماً، وذکر ابن المنذر عن حماد والثوری انھما کرھا اجره، قال ابو حنیفة: ان دفع له الف درھم یشتری بھا بزا باجر عشرة دراھم فھو فاسد، وکذلک لو قال: اشتر مائة ثوب فھو فاسد، فان اشتری فله اجر مثله، ولا یجاوز ما سمی من الاجر"

(عمدۃ القاری، کتاب الاجارہ، باب اجر السمسرۃ)

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سامان فروخت کرنے کے لئے دلال کو اجرت پر رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی اجرت بیان کر دے، مزید فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے دلال سے کہا: یہ کپڑا بیچ دو، تمہیں ایک درہم دیا جائے گا، تو یہ جائز ہے، اگرچہ اس کپڑے کا ثمن متعین نہ کرے، اور دلال کے لئے ہر سو دینار پر بطور کمیشن کے کچھ رقم مقرر کر دینا بھی جائز ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دلال کے لئے ہر ہزار پر کچھ کمیشن مقرر کرنا جائز ہے، اور علامہ ابن المنذر حمادؒ اور ثوریؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک دلال کی اجرت مکروہ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے دلال کو کپڑا خریدنے کے لئے ایک ہزار روپے دیئے۔ اور دس درہم اجرت مقرر کر دی تو یہ اجارہ فاسد ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے دلال سے کہا کہ میرے لئے سو کپڑے

خرید لو (دس درہم اجرت دیں گے) یہ اجارہ بھی فاسد ہے، اور اس صورت میں اگر دلال نے کپڑے خرید لئے تو اسے اجرت مثل دی جائے گی، بشرطیکہ اجرت مثل اجرت مسمّٰی سے زیادہ نہ ہو۔

علامہ ابن قدامۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ویجوز ان یستاجر سمساراً یشتری له ثیاباً، ورخص فیه ابن سیرین، وعطاء، والنخعی، وکرهه الثوری، وحماد، ولنا انها منفعة مباحة تجوز النیابة فیها، فجاز الاستئجار علیها، کالبناء، ...... فان عین العمل دون الزمان، فجعل له من کل الف درهم شیئاً معلوماً صح ایضا

کپڑے کی خریداری کے لئے دلال کو اجرت پر رکھنا جائز ہے، امام ابن سیرین، امام عطاء، امام نخعی رحمہم اللہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں، البتہ امام ثوری امام حماد رحمہما اللہ نے اس کو مکروہ کہا ہے، ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ ایک مباح منفعت ہے، جس میں نیابت جائز ہے، لہٰذا استئجار بھی جائز ہے، جیسا کہ تعمیر میں جائز ہے...... اور اگر مستاجر نے دلال کے لئے کام تو معین کر دیا، لیکن وقت معین نہیں کیا اور بطور اجرت کے ہر ہزار درہم پر کوئی متعین کمیشن مقرر کر دیا تب بھی یہ معاملہ درست ہے

(المغنی لابن قدامۃ، ۵/۳۶۲)

بہر حال: اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک فیصد کے حساب سے دلال کی اجرت مقرر کرنا جائز ہے، اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو مسلک نقل کیا ہے، متاخرین حنفیہ نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قال فی التاترخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل، وما تواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا، فذاک حرام علیهم، وفی الحاوی: سئل محمد بن مسلمة عن اجرة

السمسار، فقال: ارجوانه لا باس به، وان كان فى الاصل فاسدا، لكثرة التعامل و كثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس اليه، كدخول الحمام

تاتر خانیہ میں ہے کہ دلالی میں اجرت مثل واجب ہوتی ہے اور اگر عاقدین اس پر اتفاق کریں کہ ہر دس دینار پر اتنا کمیشن ہو گا، تو یہ صورت ان کے لئے حرام ہے۔ اور حاوی میں ہے کہ محمد بن مسلمہ سے دلالی کے کمیشن کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: میرا خیال یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ اصلاً یہ معاملہ فاسد تھا۔ لیکن کثرت تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس کی بہت سی صورتیں ناجائز بھی ہیں، لیکن فقہاء نے ضرورۃً اس کو جائز قرار دیا ہے، جیسے کہ دخول حمام کے مسئلہ میں ضرورۃً جائز کہا ہے

(درالمختار ۶/ ۶۳)

چنانچہ بہت سے متاخرین فقہاء حنفیہ نے دلالی کے کمیشن کو فیصد کے لحاظ سے متعین کرنے پر جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ جیسا کہ برصغیر کے مشہور بزرگ اور حنفی فقیہ حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے جو ہندوستان کے فقہاء حنفیہ میں سر فہرست شمار ہوتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو: امداد الفتاوی ج ۳ ص ۳۶۳ تا ۳۶۶ سوال نمبر ۳۴۳)

اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ثمن کی کمی اور زیادتی سے اکثر اوقات دلالی میں محنت اور مشقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن اس کے باوجود ان فقہاء متاخرین کے نزدیک فیصد کے اعتبار سے دلالی کا کمیشن مقرر کرنا جائز ہے ۔۔۔ لہٰذا دلالی کے کمیشن پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلے میں قرض کے اجراء پر آنے والے دفتری اخراجات کو قرض کی مقدار پر فیصد کے لحاظ سے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا جائے گا۔ اس لئے کہ دونوں کے درمیان مابہ الفرق کوئی چیز نہیں ہے۔

البتہ فیصد کے اعتبار سے وصول کئے جانے والے اخراجات کی مقدار بہت معمولی

ہونی چاہئے، تاکہ واقعتہً اس کے "سروس چارج" ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو اور یہ "سروس چارج" اجرت مثل سے زیادہ وصول کرنا کسی حال میں جائز نہیں، ورنہ "کل قرض جر نفعاً" کے تحت داخل ہو کر یقینی طور پر حرام ہو جائے گی۔

فیصد کے اعتبار سے اتنا "سروس چارج" وصول کرنا جائز تو ہے جو اجرت مثل سے تجاوز نہ کرے، لیکن اجرت مثل سے زیادہ ہونے کا احتمال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اور اس کا بھی احتمال موجود ہے کہ کہیں "سروس چارج" کو سود وصول کرنے کے لئے ایک آلہ کار نہ بنالیا جائے، اس لئے اسلامی بینک کو چاہئے کہ وہ یہ طریقہ اختیار کریں کہ پہلے ایک سال میں قرضوں کے اجراء پر جتنے دفتری اخراجات آئیں۔ ان کا مجموعہ نکال لیں، اور اس کو ایک سال میں جاری کئے گئے تمام قرضوں پر تقسیم کر دیں، اس طرح ان قرضوں کے اجراء پر آنے اخراجات کا فیصد کے حساب سے تعین ہو جائے گا، اور پھر وہ اخراجات تمام قرض داروں سے ان کے قرض کی مقدار کے لحاظ سے بطور "سروس چارج" کے وصول کر لے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے ہر ہر قرض پر آنے والے اخراجات کا علیحدہ حساب نہیں کرنا پڑے گا۔

واللہ اعلم

۲۔ بینک کا اپنے گاہک کو اولاً سامان کی خریداری۔ کا وکیل بنانا، اور پھر اس کے ساتھ کرایہ داری کا معاملہ کرنا، اور پھر اسی گاہک کے ہاتھ وہ چیز فروخت کرنا۔

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک کرایہ پر دینے کا جو معاملہ کرتا ہے، وہ اس طرح کرتا ہے کہ مثلاً ذرائع نقل و حمل جیسے آئل ٹینکر، جہاز وغیرہ کی خریداری اور پھر ان کو آگے کرایہ پر دینے کے لئے سرمایہ کاری کرتا ہے، یا بعض اوقات ممبر ممالک کے لئے ان کے صنعتی منصوبوں کے اسباب اور سامان کی خریداری اور پھر ان کو کرایہ پر دینے کے لئے سرمایہ کرتا ہے۔

چنانچہ اسلامی ترقیاتی بینک مندرجہ ذیل بنیادوں پر کرایہ کا معاملہ کرتا ہے:

(الف) جس پروجیکٹ میں بینک "کرایہ داری" کے طریقے پر سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے، جب اس پروجیکٹ میں بینک کو مالی یا فنی فائدے کے حصول کا یقین ہو جاتا ہے، اس وقت وہ بینک اس پروجیکٹ کو چلانے والی کمپنی (مستاجر) کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیتا ہے۔ اور بینک اس کمپنی کو اپنے نام پر مطلوبہ سامان خریدنے کی اجازت دے دیتا ہے (جس کی تعیین اور تخمین مصارف کی تحدید ایگریمنٹ میں طے شدہ ہوتی ہے) اور معاہدہ کے مطابق بینک سپلائرز کو سامان کی قیمت ایگریمنٹ میں طے شدہ مدتوں کے مطابق براہ راست ادا کر دیتا ہے۔

(ب) اس کے بعد کمپنی (مستاجر) بینک کی طرف سے نائب بن کر اس سامان پر قبضہ کرتی ہے، اور ایگریمنٹ میں بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں یقین حاصل کر لیتی ہے، اور پھر اگر اس مشینری کو نصب کی ضرورت ہو تو اس کی تنصیب کی نگرانی کرتی ہے، تاکہ ایگریمنٹ کے مطابق پورا کام صحیح طور پر انجام پائے۔

(ج) پروجیکٹ پر کام کرنے والی کمپنی کی معلومات کے مطابق اور کمپنی اور بینک کے فنی ماہرین کے اندازوں کے مطابق سامان کی خریداری اور اس کی تنصیب کی عملی تنفیذ جس کے بعد اس مشینری سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکے، ان دونوں کاموں کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کی تحدید "ایگریمنٹ" کرے گا۔ تاکہ اس کی بنیاد پر جو وقت مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "کرایہ داری" کی ابتداء ہو سکے، اور اس کے بعد سامان کرایہ پر دینے کے قابل ہو سکے، اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

(د) مدت کرایہ داری کے دوران کرایہ دار عقد کرایہ داری میں طے شدہ قسطیں ادا کرتا رہے گا، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کمپنی بینک کی مفاد کی خاطر سامان کی حفاظت اور اس کی انشورنس کی ذمہ داری بھی لے گی۔

(ہ) ایگریمنٹ کے مطابق بینک اس بات کا پابند ہوگا کہ مدت کرایہ داری پوری ہونے کے بعد بینک اس سامان کو معمولی قیمت پر کرایہ دار کمپنی کو فروخت کر دے گا، اور کرایہ دار طے شدہ تمام قسطیں اور دوسرے تمام التزامات ایگریمنٹ کے مطابق

ادا کرے گا۔

کیا بینک کے لئے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کرایہ داری کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

کسی چیز کو کرایہ پر دینے کا معاملہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بنک اشیاء اور سامان خود خریدے، اور پھر بطور مالک کے اس پر قبضہ بھی کرے، اور پھر بنک وہ چیز مدت معلومہ اور اجرت معلومہ پر اپنے گاہک کو کرایہ پر دے دے۔ اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اشیا اور سامان دوبارہ بنک کے قبضہ میں آجائے گا۔ اور پھر فریقین کو اختیار ہوگا۔ چاہیں تو دوبارہ جدید عقد اجارہ کرلیں، یا فریقین آپس میں اس وقت کوئی ثمن طے کر کے عقد بیع کرلیں، اور بنک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اشیا اور سامان کو دوسرے گاہک کو کرایہ پر دے دے، اور یا دوسرے گاہک کے ہاتھ فروخت کر دے۔

مذکورہ بالا طریقہ شرعاً بالکل جائز ہے۔ اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں

۲۔ دوسری صورت جس کے بارے میں سوال بھی کیا گیا ہے، وہ یہ کہ بنک ایسی اشیا اور سامان کرایہ پر دے جو عقد اجارہ کے وقت اس کی ملکیت میں نہیں ہے بلکہ عقد اجارہ کرنے کے بعد بنک وہ سامان سپلائر سے اپنے گاہک کے نام ہی پر خریدے، اور پھر بنک اپنے گاہک کو اس سامان پر قبضہ کرنے اور اس کو وصول کر کے اپنے یہاں نصب کرنے کا وکیل بنا دے، اور بنک ایک تاریخ مقرر کر دے گا کہ فلاں تاریخ پر عقد بیع مکمل ہو کر عقدہ اجارہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مقرر تاریخ کے بعد بنک اس چیز کا کرایہ گاہک سے وصول کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ عقد اجارہ کی مدت معاہدہ کے مطابق پوری ہو جائے اور بنک اپنے تمام واجبات گاہک سے وصول کرلے تو پھر بنک وہ سامان معمولی ثمن پر اسی گاہک کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔

اس دوسری صورت میں فقہی اعتبار سے چند امور قابل غور ہیں:

۱۔ جس وقت بنک عقد اجارہ کرتا ہے، وہ اس چیز کا مالک بھی نہیں ہوتا، اس پر قبضہ ہونا تو دور کی بات ہے، اور جس چیز کا انسان مالک نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے۔ اسی

طرح جو چیز انسان کے قبضے میں نہ ہو۔ اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اس لئے کہ یہ "ربح مالم یضمن" کی قبیل سے ہے، جو حدیث کی رو سے منہی عنہ ہے۔
علامہ ابن قدامہ کی الشرح الکبیر میں ہے:

وکذلک لا یصح ھبته ولا رھنه، ولا دفعه اجرة، وما اشبه ذلک، ولا التصرفات المنعقده الی القبض، لانه غیر مقبوض، فلا سبیل الی اقباضه

(الشرح الکبیر لابن قدامۃ ۴: ۱۱۹)

اسی طرح ھبہ رہن اور اجارہ اور دوسرے معاملات جو قبضہ کے ساتھ تام ہوتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ چیز قبضہ میں نہیں ہے لہٰذا آگے دوسرے کو اس پر قبضہ کرانا بھی ممکن نہیں ہے۔
فتاوی ہندیہ میں ہے:

"ومنها (ای من شرائط صحة الاجارة) ان یکون مقبوض المؤجر اذا کان منقولاً، فان لم یکن فی قبضه فلا تصح اجارته"

(الفتاوی الهندیہ ۴: ۴۱۱)

"اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اگر وہ چیز منقول ہے تو موجر کے قبضے میں ہو، اگر وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے تو پھر عقد اجارہ درست نہیں"
شوافع کا بھی صحیح قول یہی ہے

(دیکھئے: مغنی المحتاج ۲: ۶۸ و ۶۹)

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جس وقت بنک اور گاہک کے درمیان معاہدہ ہو۔ اس وقت عقد اجارہ کو منعقد نہ مانا جائے۔ بلکہ اس معاہدہ کو عقد اجارہ کے لئے محض ایک وعدہ تصور کیا جائے، پھر جب گاہک سپلائر سے سامان وصول کر کے اپنے قبضے میں لے آئے۔ اور اپنے یہاں نصب کرنے کا کام مکمل ہو جائے اس کے بعد بنک اپنے گاہک

کے ساتھ اس تاریخ پر بالمشافہہ یا تحریری مراسلت کے ذریعہ عقد اجارہ کرے، اور عقد اجارہ کی اس تاریخ سے پہلے وہ سامان بنک کی ضمان میں رہے گا۔ لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان تباہ ہو جائے تو بنک کا نقصان ہو گا۔ اور اس تاریخ تک سامان پر گاہک کا قبضہ، قبضہ امانت شمار ہو گا، لہٰذا اگر وہ سامان بلاتعدی کے ہلاک اور ضائع ہو جائے تو گاہک ضامن نہیں ہو گا۔

۲۔ اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ کی چیز پر آفات سماویہ آجائے تو اس صورت میں مستاجر ضامن نہ ہو گا۔ جب تک مستاجر اس چیز کی حفاظت میں تعدی سے کام نہ لے، اس اصول کے پیش نظر مدۃ اجارہ کے دوران حوادث اور آفات سے حفاظت کے لئے اس سامان کا انشورنس کرانا مستاجر کے ذمے واجب نہیں ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اگر انشورنس کرنا ضروری ہو تو بنک بحیثیت مالک کے اس کا انشورنس کرائے۔

یہ انشورنس بھی اس وقت جائز ہے جب وہ تعارفی اور جائز انشورنس ہو۔ اگر وہ انشورنس دھوکہ، سود، قمار وغیرہ پر مشتمل ہو تو ایسا انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں۔

۳۔ سوال میں جو عقد اجارہ مذکور ہے، اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد موجر وہ سامان معمولی قیمت پر مستاجر کو فروخت کر دے گا:۔

فقہی اعتبار سے اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:۔

ا۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس سامان کی بیع اجارہ کے ختم کے ساتھ معلق کر دی جائے، اس صورت میں بیع دو چیزوں کے ساتھ مشروع ہوگی ایک یہ کہ مدت اجارہ پوری ہو جائے اور دوسرے یہ کہ مستاجر کا ذمہ تمام واجبات سے فارغ ہو جائے یہ صورت شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے، اور مستقبل کے کسی زمانے کی طرف عقد بیع کی اضافت کرنا بھی درست نہیں ہے"

علامہ خالد الاتاسی شرح المجلہ میں فرماتے ہیں:۔

"واما الذی لا یصح تعلیقه بالشرط شرعاً فضا بطه کل ما کان من التملیکات .... کالبیع والاجارة"

(شرح المجلة العدلية ۱: ۲۳۴)

شرعاً جن عقود کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں

ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ہر وہ عقد جن کا تعلق تملیکات سے ہو............ مثلاً عقد بیع اور عقد اجارہ"

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس وقت بیع نہ کی جائے، بلکہ وعدہ بیع کر لیا جائے جو عقد اجارہ کے اندر مشروط ہو۔

اس صورت میں یہ ایسی شرط ہوگی جو مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اور اس جیسی شرط حنفیہ اور شوافع کے نزدیک عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے، جہاں تک مالکیہ اور حنابلہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک بہت سی شرطیں جو اگرچہ مقتضاء عقد کے تو خلاف ہوں۔ لیکن وہ شرطیں عقد کو فاسد نہیں کرتیں۔ ان سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی صفقہ میں اجارہ کے اندر بیع کی شرط لگانا جائز ہوگا۔

چنانچہ شرح الخرشی علی مختصر الخلیل میں ہے:۔

"ان الاجارة اذا وقعت مع الجعل فی صفقة واحدة فانها تکون فاسدة لتنافر الاحکام بینهما، لان الاجارة لا یجوز فیها الغرر، وتلزم بالعقد، ویجوز فیها الاجل، ولا یجوز شئي من ذلک فی الجعل — بخلاف اجتماع الاجارة مع البیع فی صفقة واحدة، فیجوز سواء کانت الاجارة فی نفس المبیع، کمالو باع له جلوداً علی ان یخرزها البائع للمشتری نعالاً، او کانت الاجارة فی غیر المبیع، کمالو باع له ثوباً بدراهم معلومة علی ان ینسج له ثوباً آخر"

(الخرشی علی مختصر خلیل ۷: ۴)

"اگر عقد اجارہ اور عقد جعل ایک ہی صفقہ میں کیا جائے تو یہ صورت فاسد ہے اس لئے کہ "اجارہ" اور "جعل" کے درمیان تنافر ہے۔ اس لئے کہ عقد اجارہ کے اندر "غرر" جائز نہیں، معاملہ کرنے سے اجارہ لازم ہو جاتا ہے۔ اور اجارہ کے اندر مدت کی تعیین جائز ہے۔ جبکہ "جعل" میں ان میں سے کوئی بھی چیز جائز نہیں بخلاف اس کے کہ اجارہ کو بیع کے ساتھ ایک صفقہ

میں جمع کر دیا جائے۔ یہ صورت جائز ہے۔ چاہے وہ اجارہ اسی مبیع میں ہو۔ جس کی بیع ہوئی ہے، مثلاً کوئی شخص کھال اس شرط پر فروخت کرے کہ بائع مشتری کے لئے اس کھال کے جوتے کاٹ بنا کر دے گا ــ یا یہ صورت ہو کہ عقد اجارہ مبیع کے علاوہ کسی دوسری چیز میں ہو۔ مثلاً کوئی شخص معین دراہم میں اس شرط پر کپڑا فروخت کرے کہ وہ اس کے لئے دوسرا کپڑا بن کر دے گا (تو یہ صورت شرعاً جائز ہیں)

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ جواز اس وقت ہے جب بیع بھی حالا ہو۔ موجل نہ ہو، اور اس بیع کے اندر جو اجارہ مشروط ہو وہ بھی حالا ہو، لیکن زیر بحث مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اس میں اجارہ تو حالا ہے، لیکن اسی اجارہ کے اندر جو بیع مشروط ہے۔ وہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد منعقد ہو گی، اس مسئلہ کا صریح حکم اگرچہ مالکیہ کی کتابوں میں تو مجھے نہیں ملا، لیکن ان کتابوں کی عبارات سے یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک عقد کے اندر شرط لگانا بنیادی طور پر جائز ہے، اور صرف دو صورتوں کے علاوہ کوئی شرط بھی عقد کو فاسد نہیں کرتی۔ ایک یہ کہ وہ شرط اس عقد کے منافی ہو، مثلاً بائع اپنی چیز فروخت کرتے وقت یہ شرط لگا دے کہ مشتری اس چیز میں کوئی تصرف نہیں کرے گا۔ یا موجر اس شرط پر ایک چیز کرایہ پر دے کہ مستاجر اس سے نفع نہیں اٹھائے گا۔ چونکہ یہ دونوں شرطیں مقتضاء عقد کے خلاف ہیں۔ اس لئے یہ عقد فاسد ہو جائے گا ــ دوسرے یہ کہ وہ شرط ایسی ہو جس کی وجہ سے ثمن مجہول ہو جائے۔ یا تو ثمن میں زیادتی ہو جائے یا کمی ہو جائے، اس قسم کی شرط سے عقد فاسد ہو جائے گا۔

(دیکھئے: مواھب الجلیل للحطاب جلد ۴ ص ۳۷۳ و ۳۷۵ الخرشی ج ۵ ص ۸۰ و ۸۱ بدایۃ المجتھد ج ۲ ص ۳۳ و ۱۳۴)

ظاہر یہ ہے کہ موجر کا مدت اجارہ کے ختم کے ساتھ بیع کی شرط لگانا مندرجہ بالا دو صورتوں میں داخل نہیں ہے، اس لئے یہ صورت مالکیہ کے نزدیک جائز معلوم ہوتی ہے، واللہ سبحانہ اعلم

بہرحال! مندرجہ بالا تفصیل کے بعد مالکیہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے اس

مسئلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک وعدہ بیع ہے جو اجارہ کے ساتھ مشروط ہے، لیکن اس صورت میں مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد بیع منعقد ہوگی، لہٰذا جب مدت اجارہ ختم ہو جائے اس وقت فریقین مستقل ایجاب وقبول کے ذریعہ بیع کا معاملہ کریں، اب چاہے وہ ایجاب وقبول بالمشافہہ ہو۔ یا خط و کتابت کے ذریعہ ہو۔

زیر بحث مسئلہ کے جواز کی ایک تیسری شکل اور بھی ہو سکتی ہے۔ جو میرے خیال میں چاروں ائمہ کے مسلک کے مطابق درست ہوگی، وہ یہ کہ وعدہ بیع کو اجارہ کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے، بلکہ وہ وعدہ مستقل علیحدہ کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ فریقین کے درمیان ایک وعدہ ایگریمنٹ میں ہو جائے، جس میں اسی بات کا وعدہ ہو کہ فریقین پہلے عقد اجارہ کرینگے، اور پھر بیع کرینگے، پھر وعدہ کے مطابق وقت مقرر پر فریقین کے درمیان اجارہ ہو جائے، جس میں بیع کا کوئی ذکر نہ ہو، اس کے بعد جب اجارہ کی مدت ختم ہو جائے تو مستقل بیع کر لی جائے، جس میں کوئی شرط وغیرہ نہ ہو، اس طرح دونوں عقد مستقل اور غیر مشروط ہو جائینگے، اور اس طرح فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہو گا۔ وہ تین باتوں پر مشتمل ہو گا۔

۱۔ بنک گاہک کو سامان خریدنے کا وکیل بنائے گا

۲۔ گاہک یہ وعدہ کرے گا کہ وہ سامان وصول کرنے اور اس کو اپنے قبضے میں لانے اور نصب کرنے کے بعد اس کو کرایہ پر لے لے گا۔

۳۔ بنک یہ وعدہ کرے گا کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ سامان اس گاہک کو فروخت کر دے گا۔ اس معاہدہ کے مکمل ہو جانے کے بعد گاہک صرف سامان خریدنے کے سلسلے میں بنک کا وکیل ہو جائے گا۔ پھر وکالت کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد وعدہ کے مطابق عقد اجارہ مستقل طور پر اپنے وقت پر منعقد ہو گا، اور پھر وعدہ کے مطابق اجارہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان مستقل طور پر بیع منعقد ہو جائے گی۔

اور گاہک کی طرف سے اجارہ پر لینے کا وعدہ اور بنک کی طرف سے فروخت کرنے کا وعدہ کو دیانۃً تو پورا کرنا فریقین کے ذمے بالا جماع واجب ہے، جہاں تک قضاءً اس وعدہ کے ایفاء کا تعلق ہے۔ تو مالکیہ کے مذہب کے مطابق اگر وعدہ کرنے والے

نے وعدہ کر کے موعود لہ کو کسی ایسے معاملے میں داخل کر دیا ہے جو اس وعدہ کی وجہ سے اس پر لازم ہوا ہے تو اس صورت میں قضاءً اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے، اور اگر وعدہ کرنے والا وعدہ خلافی کرے، اور اس وعدہ خلافی کی وجہ سے موعود کو کوئی مالی نقصان ہو جائے تو وعدہ کرنے والا اس مالی نقصان کا ضامن ہو گا۔

چنانچہ علامہ قرافی مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الفروق" میں فرماتے ہیں:

قال سحنون: الذی یلزم من الوعد بقوله: اهدم دارک، وانا اسلفک ماتبنی به واخرج الی الحج وانا اسلفک او اشتر سلعة اوتزوج امراة، وانا اسلفک، لانک ادخلته بوعدک فی ذلک اما مجرد الوعد فلا یلزم الوفاء به، بل الوفاء به من مکارم الاخلاق"

(کتاب الفروق للقرافی، ج ۴ ص ۲۴ و ۲۵)

امام سحنون فرماتے ہیں کہ وہ وعدہ جو لازم ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص دوسرے سے یہ وعدہ کرے کہ تم اپنے گھر کو منہدم کر دو، میں اس کو دوبارہ بنانے کے لئے قرض فراہم کروں گا۔ یا یہ کہے کہ تم حج کے لئے چلو، میں تمہیں خرچ کے لئے قرضہ دونگا، یا یہ کہے کہ تم یہ سامان خرید لو، یا فلاں عورت سے شادی کر لو، میں خرچ کے لئے قرضہ دونگا (اس قسم کے وعدہ کو پورا کرنا قضاءً لازم ہے) اس لئے کہ اس وعدہ کے ذریعہ تم نے اس کو اس معاملے میں داخل کیا ہے، البتہ اگر محض وعدہ ہو، جس کے ذریعہ موعود لہ کو کسی معاملے کے اندر داخل نہ کرے تو اس وعدہ کو پو[را] کرنا قضاءً تو لازم نہیں۔ البتہ اس وعدہ کو پورا کرنا مکارم اخلاق [میں] سے ہے۔"

شیخ علیش مالکی رحمتہ اللہ علیہ اپنے فتاوی میں وعدہ کے لازم ہونے کے بارے میں تین اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

" والرابع: یقضي بها ان کانت علی سبب، ودخل الموعود بسبب العدة في شئی، وهذا هوالمشهور من الا قوال ...... قال اسبغ سمعت اشهب سئل عن رجل اشتری من رجل کرما، فخاف الوضیعة فاتی لیستوضعه فقال له: بع وانا ارضیک قال: ان باع براس ماله اوبربح فلاشی علیه وان باع بالوضیعة کان علیه ان یرضیه .... وهذا القول الذی شهره ابن رشد فی القضاء بالعدة اذا دخل بسببها فی شئی قال الشیخ ابوالحسن فی اول کتاب الاول انه مذهب المدونة، لقولها فی آخر کتاب الغرر، وان قال: اشتر عبد فلان وانا اعینک بالف درهم فاشتراه لزمه ذلک الوعد اھ وهوقول ابن القاسم فی سماعه من کتاب العاریة وقول سحنون فی کتاب العدة "

(فتح العلی المالک ج ۱ ص ۲۵۵)

"چوتھے یہ کہ اس وعدہ کو قضاء لازم ہونے کا حکم دیا جائے گا۔ اگر یہ وعدہ کسی معاملے پر مبنی ہو، اور اس وعدہ کی وجہ سے موعود لہ اس معاملے کو اختیار کر لے یہی قول زیادہ مشہور ہے .... اسبغ فرماتے ہیں کہ میں نے اشہب سے یہ مسئلہ سنا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے انگور خریدے، لیکن خریدنے کے بعد مشتری کو نقصان کا اندیشہ ہوا۔ چنانچہ وہ اس کی قیمت کم کرانے کے لئے بائع کے پاس آیا، تو بائع نے اس سے کہا کہ تم یہ انگور آگے فروخت کر دو، اگر تمہارا نقصان ہوا تو میں اس کی تلافی کر کے تمہیں راضی کر دوں گا ــ اس صورت میں اگر وہ مشتری وہ انگور اسی قیمت پر آگے فروخت کر دے جس قیمت پر اس نے خریدے تھے، یا منافع پر فروخت کر دے تو اس صورت میں بائع کے ذمے کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔ لیکن اگر مشتری نقصان کے ساتھ فروخت کرے

تواس صورت میں بائع کے ذمے لازم ہے کہ وہ نقصان کی تلافی کر کے مشتری کو راضی کرے ..... علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو لیا ہے کہ قضاء ایسا وعدہ پورا کرنا لازم ہے جس وعدہ کے ذریعہ موعود لہ کسی معاملے میں مبتلا ہو جائے، شیخ ابوالحسن رحمتہ اللہ علیہ کتاب اول کے ابتداء میں فرماتے ہیں کہ "مدونہ" کا بھی یہی مسلک ہے اس لئے کہ کتاب الغرر کے آخر میں ہے کہ اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ تم فلاں شخص کا غلام خرید لو، میں ایک ہزار دراہم کے ذریعہ تمہارے ساتھ (ثمن کی ادائیگی میں) تعاون کروں گا، اگر اس نے وہ غلام خرید لیا تو اس صورت میں اس وعدہ کرنے والے کے ذمے ایک ہزار درہم لازم ہو جائیں گے۔ کتاب العاریۃ میں ابن القاسم کا یہی قول مذکور ہے، امام سحنون کا بھی کتاب العدۃ میں یہی قول مذکور ہے"

حنفیہ کے اصل مسلک میں وعدہ اگرچہ قضاء لازم نہیں ہوتا۔ لیکن متاخرین فقہاء حنفیہ نے کئی مقامات پر وعدہ کو لازم قرار دیا ہے۔

چنانچہ ردالمحتار میں "شرط فاسد" کے بیان میں ہے کہ :۔

"وفی جامع المفصولین ایضا: لو ذکر البیع بلاشرط ثم ذکر الشرط علی وجه العدة جاز البیع و لزم الوفاء بالوعد، اذا المواعید قد تکون لازمة فیجعل لازماً لحاجة الناس"

جامع الفصولین میں بھی ہے کہ اگر بیع بلا شرط کی جائے۔ اور پھر شرط کا ذکر بطور وعدہ کے کیا جائے۔ تو اس صورت میں وہ بیع جائز ہو جائے گی۔ اور اس وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ وعدے کبھی لازم بھی ہوتے ہیں۔ لہذا لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس وعدہ کو بھی لازم کیا جائے گا۔

اس کے بعد علامہ رملیؒ کے فتاوی خیریہ سے نقل کیا ہے کہ :۔

"فقد صرح علماءنا بانهما لو ذکرا البیع بلاشرط ثم ذکرا الشرط

علی وجه العدة جاز البیع و لزم الوفاء بالوعد"

ہمارے علماء نے اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر عاقدین بلاشرط کے بیع کر لیں۔ اور پھر بطور وعدہ کے کوئی شرط لگالیں تو اس صورت میں بیع درست ہو جائیگی۔ اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہو گا"

پھر اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"وقد سئل الخیر الرملی عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقده وعقد البیع خالیاً عن الشرط فاجاب بانه صرح فی الخلاصة والفیض والتتارخانیة وغیرها بانه یکون علی ماتواضعا"

علامہ خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر دو آدمی عقد سے پہلے بیع الوفا کے انعقاد پر معاہدہ کر لیں۔ اور پھر عقد بیع غیر مشروط طور پر کر لیں (تو یہ جائز ہے یا نہیں؟) علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ خلاصہ فیض اور تتارخانیہ وغیرہ میں صراحت کے ساتھ یہ موجود ہے کہ اگر عاقدین اس طرح عقد کر لیں تو یہ عقد اسی طرح منعقد ہو جائے گا جس طرح عاقدین نے معاہدہ کیا تھا"

(ردالمحتار ج ۴ ص ۱۳۵، باب البیع الفاسد مطلب فی الشرط الفاسد لو ذکر بعد العقد او قبلہ)

چنانچہ علماء حنفیہ نے ان عبارات فقہیہ میں اسی بات کی تصریح کی ہے کہ "وعدہ" بعض اوقات لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علامہ خالد الاتاسی نے "بیع الوفاء" کی بحث میں فتاوی خانیہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ۔

"وان ذکر البیع من غیر شرط ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة فالبیع جائز، ویلزم الوفاء بالوعد لان المواعید قد تکون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس"

(شرح المجلۃ لخالد الاتاسی ج ۲ ص ۴۱۵)

اگر بیع غیر مشروط طور پر کی جائے، اور پھر بطور وعدہ کے شرط کا ذکر کیا جائے تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی، اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہو گا۔ اس لئے کہ وعدے کبھی لازم ہوتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کی ضرورت کے لئے اس وعدہ کو لازم کیا جائے گا۔"

لہٰذا فقہاء کے مندرجہ بالا اقوال کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہو گا کہ مستقبل میں ہونے والے اجارۃ اور بیع کے ایگریمنٹ میں فریقین آپس میں جو وعدہ فی الحال کر لیں تو وہ وعدہ قضاءً بھی لازم ہو گا۔

جواب کا خلاصہ

اوپر ہم نے جو تفصیلی جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنک کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس تفصیلی جواب کے بالکل ابتداء میں ہم نے جو پہلا طریقہ بیان کیا تھا۔ اس کے مطابق بنک گاہک کے ساتھ اجرہ کا معاملہ کرے، اس لئے کہ اس طریقے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے۔ اور اختلاف اور شبہات سے دور رہنا زیادہ بہتر ہے۔

البتہ اگر کسی وجہ سے اس طریقہ پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو پھر بنک نے جو صورت پیش کی ہے۔ اس کو شرعی طور پر جائز کرنے کے لئے اس میں مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہے:۔

(۱) بنک اور گاہک کے درمیان جو ایگریمنٹ لکھا جائے۔ اس میں گاہک کو سامان خریدنے کے لئے وکیل بنانے کا معاملہ تو قطعی اور یقینی ہو، لیکن اس ایگریمنٹ میں اجارہ اور بیع کا تذکرہ صرف بطور وعدہ کے ہو، قطعی اور فیصلہ کن طریقہ پر ان کا عقد نہ کیا جائے۔

۲۔ جب گاہک سامان خرید کر اس پر قبضہ کر لے، اور اس کو اپنے یہاں نصب کر لے۔ اس کے بعد عقد اجارہ بالمشافھہ یا مراسلت کے ذریعہ کیا جائے۔ اور اس عقد اجارہ کے وقت بیع کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

۳۔ سامان کی خریداری کے بعد اور عقد اجارہ ہونے سے پہلے وہ سامان بنک کی ضمان میں رہے گا۔

۴۔ مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد پھر بیع قطعی طور پر کی جائے۔

۵ ایگریمنٹ میں فریقین کی طرف سے اجارہ اور بیع کا جو وعدہ ہوگا، قضاءً اور دیانۃً اس وعدہ کو پورا کرنا فریقین پر لازم ہوگا۔

۶ اگر فریقین میں کوئی ایک وعدہ اجارہ یا وعدہ بیع کی خلاف ورزی کرے گا تو اس وعدہ خلافی کے نتیجے میں فریق ثانی کو جو مالی نقصان ہوگا فریق اول اس نقصان کی تلافی کرے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اسلامی ترقیاتی بینک کا ممبر ممالک کے ساتھ ادھار بیع کا معاملہ کرنا

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک اپنے ممبر ممالک کی ترقی اور مصلحت کی خاطر صنعتی پروجیکٹس اور دوسرے سامان کی خرید و فروخت کے لئے کرایہ داری کے معاملات کے علاوہ "ادھار بیع" کا معاملہ بھی کرتا ہے، اور ممبر ممالک کو پروجیکٹس میں جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو بازار سے خرید کر پھر ممبر ممالک کو فروخت کرنے کے لئے بینک "ادھار بیع" کے معاملے کو اضافی وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ بینک اس ممبر ملک کو اپنی طرف سے اس سامان کی خریداری کا وکیل بنا دیتا ہے، اور بینک خریدے ہوئے سامان کی قیمت براہ راست سپلائر کو ادا کر دیتا ہے، اور اس سپلائر کے ساتھ بینک یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ براہ راست وہ سامان اس ممبر ملک کو بھیج دے، پھر جب وہ ممبر ملک بینک کی طرف سے وکیل بن کر اس سامان پر اس کے تمام اوصاف کے مطابق قبضہ کر لیتا ہے، تو اس کے بعد بینک وہ سامان ممبر ملک کو خریداری کی قیمت سے کچھ زائد قیمت پر اس شرط پر فروخت کر دیتا ہے کہ وہ ممبر ملک اس سامان کی قیمت طے شدہ قسطوں کے مطابق ادا کر دے گا۔ جو قسطیں تین سال سے دس سال کے درمیان ہونگی۔

کیا اس طریقے پر ادھار معاملہ کر کے قسطوں پر قیمت وصول کرنا بینک کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

اس معاملے میں فقہی اعتبار سے صرف ایک بات قابل غور ہے، وہ یہ کہ بیع کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ مبیع بائع یا اس کے وکیل کے قبضے میں ہو۔ پھر حنابلہ نے اس شرط کو طعام کی بیع کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک طعام کے علاوہ دوسری اشیاء کی بیع قبل القبض جائز ہے۔ اور مالکیہ نے قبضہ میں ہونے کی شرط کو کیلی اور وزنی چیزوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک کیلی اور وزنی چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی بیع میں قبضہ شرط نہیں ہے۔ امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک مبیع کا بائع کے قبضہ میں ہونا تمام مبیعات میں ضروری ہے۔ چاہے وہ طعام ہو۔ یا کیلی وزنی چیز ہو۔ یا زمین ہو، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک زمین کے علاوہ باقی اشیاء میں آگے فروخت کرنے کے لئے بائع کا قبضہ ضروری ہے۔

(فتح القدیر لابن الہمام ج ۵ ص ۲۶۶ ۔ المغنی لابن قدامۃ ج ۴ ص ۱۱۳)

قبضہ سے پہلے مبیع کو آگے بیچنے کی ممانعت میں بہت سی احادیث مروی ہیں، صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه" قال ابن عباس: واحسب كل شئی مثله"

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فرمایا کہ جو شخص غلہ بیچنے کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ قبضہ میں لانے سے پہلے فروخت نہ کرے" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حکم غلہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام چیزوں میں عام ہے"

ابو داؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قصے میں حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے:

"فان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی ان تباع السلع حیث تبتاع حتی یحوز التجار الی رحالهم"

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ جو چیز جہاں خریدی ہے، وہیں فروخت کر دی جائے، جب تک کہ اس چیز کو تجار اپنے کجاؤوں میں نہ لے آئیں"

(ابو داؤد، حدیث نمبر ۳۳۵۶، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۴۰)

امام بیہقیؒ نے حکیم بن حزام سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"قلت یا رسول الله! انی ابتاع هذه البیوع فما یحل لی منها؟ وما یحرم علی؟ قال: یا ابن اخی لا تبیعن شیئاً حتی تقبضه"

فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ، میں خرید و فروخت کرتا رہتا ہوں، میرے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اے بھتیجے قبضہ کرنے سے پہلے کسی چیز کو آگے فروخت مت کرنا" (سنن بیہقی ج ۵ ص ۳۱۳)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند حسن اور متصل ہے، اور ابن القیم تہذیب السنن میں فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند شیخین کی شرائط پر ہے، سوائے ایک راوی عبداللہ بن عصمۃ کے، مگر ان کو ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ اور امام نسائی نے ان کو قابل استدلال سمجھا ہے

(تہذیب السنن، ج ۵ ص ۱۳۱)

سنن ترمذی میں ہے کہ:

عن عبد الله بن عمرو ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال!

"لا یحل سلف و بیع ولا شرطان فی بیع، ولا ربح مالم یضمن"

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرضہ اور بیع (کو جمع کرنا) حلال نہیں۔ اور نہ بیع میں دو شرطیں لگانا، اور نہ ایسی چیز کا نفع حاصل کرنا حلال ہے جو ابھی ضمان میں نہیں آئی۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے ــــ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربح مالم یضمن" یعنی ایسی چیز کا نفع لینے سے منع فرمایا جو چیز نفع لینے والے کے ضمان میں نہیں آئی اور قبضہ سے پہلے آگے فروخت کرنا اس میں داخل ہے، اس لئے کہ جب تک مشتری مبیع پر قبضہ نہ کر لے، اس وقت تک وہ مبیع اس کے ضمان میں نہیں آتی، لہٰذا اگر مشتری مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے آگے نفع پر فروخت کر دے تو یہ "ربح مالم یضمن" ہو جائے گا۔ جو جائز نہیں۔

لہٰذا اگر وہ سامان کیلی اور وزنی نہ ہو تو اس صورت میں حنابلہ اور شوافع کے نزدیک اگرچہ بیع جائز ہے، مگر مندرجہ بالا احادیث عام ہیں اور ہر قسم کی مبیع کو شامل ہیں۔ لہٰذا ان احادیث کے عموم کی طرف نظر کرتے ہوئے، اور اختلاف سے بچتے ہوئے مناسب یہ ہے کہ بنک اس سامان کو گاہک کے ہاتھ فروخت کرنے سے پہلے یا تو بذات خود اس پر قبضہ کر لے، یا اپنے وکیل کے ذریعے اس پر قبضہ کرائے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بنک اس گاہک کے شہر ہی میں اپنا کوئی نمائندہ یا ایجنٹ مقرر کر دے۔ جو بنک کی طرف سے وکیل بن کر اس سامان پر قبضہ کرے، اور پھر مشتری کو فروخت کر دے۔ اور یہ صورت بھی ممکن ہے کہ بنک جہاز راں کمپنی کو اس سامان پر قبضہ کرنے کا وکیل بنا دے، اس صورت میں اس سامان کو جہاز پر سوار کرنے کے بعد مشتری کی بندر گاہ تک پہنچنے سے پہلے بھی بنک عقد بیع کر سکتا ہے۔

اور اگر بنک اسی گاہک کو جو اس سامان کو خریدنا چاہتا ہے، اس بات کا وکیل بنا دے کہ وہ اپنے شہر کی بندر گاہ پر بنک کے وکیل کے طور پر اس سامان پر قبضہ کر لے، تو اس صورت میں بنک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے گاہک سے بیع کا معاملہ فون پر یا خط و کتابت کے ذریعہ اس وقت کرے جب وہ اس سامان پر قبضہ کر لے، اور اس عقد بیع سے پہلے صرف وعدہ بیع کا معاملہ ہو گا۔ البتہ اس وعدہ کو پورا کرنا گاہک کے ذمے قضاء لازم ہو گا۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے مسئلے میں تفصیل سے بیان کیا ــــ اور بیع کے انعقاد سے پہلے

اور وکیل کے قبضے کے بعدوہ سامان بینک ہی کے ضمان میں رہے گا، چاہے اس سامان پر بحیثیت وکیل کے قبضہ کرنے والا وہی گاہک ہو۔ جو اسی مال کو خریدنے والا ہے، یا کوئی اور ہو۔ لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان تباہ ہو گیا تو وہ بینک کا نقصان ہو گا، بشرطیکہ اس وکیل نے (جو بعد میں وہ سامان خریدنے والا ہے) اس کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی ہو۔

بینک کا اپنے ممبر ممالک کے ساتھ ادھار اور قسطوں پر بیع مرابحہ کا معاملہ کرنا

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک خارجی تجارت میں سرمایہ کاری کے لئے ممبر ممالک کے ساتھ ادھار اور قسطوں پر بیع مرابحہ کا معاملہ کرتا ہے، اور یہ معاملہ ممبر ممالک کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انجام دیتا ہے۔

خارجی تجارت کے معاملات میں اصل یہ ہے کہ بینک کا کوئی ممبر ملک جب ترقیاتی نوعیت کا کوئی سامان خریدنا چاہتا ہے تو اسلامی ترقیاتی بینک اس ملک کی طلب دیکھنے اور اس سے آرڈر حاصل کرنے کے بعد وہ سامان بازار سے خریدتا ہے، اور پھر اس ممبر ملک کو فروخت کر دیتا ہے ــــــ اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ بینک اس مقصد کے لئے ایک معاہدہ کرتا ہے، اس معاہدے کے فریق بینک کے علاوہ ممبر ملک (خریدار پارٹی) اور اسی ممبر ملک میں بینک کی طرف سے مقرر کردہ ایک وکیل بھی ہوتا ہے، جس کو بینک مطلوبہ سامان خریدنے اور پھر بینک کی طرف سے وکیل بن کر اس پر قبضہ کرنے اور ممبر ملک کو فروخت کرنے کے لئے متعین کرتا ہے۔ چنانچہ وہ وکیل اس ممبر ملک کو وہ سامان اس قیمت پر بینک کی طرف سے فروخت کر دیتا ہے جو قیمت بینک مقرر کرتا ہے ــــــ اور عام طور پر یہ اس قیمت خرید میں بینک اپنا متعین نفع بھی شامل کر لیتا ہے، جو قیمت اس نے اپنے وکیل کے ذریعے معاہدے کے مطابق سپلائر کو ادا کی ہے ــــــ اور عام طور پر خارجی تجارت کے معاہدوں میں بینک کی طرف سے معین کردہ وکیل ہی ثمن کی ادائیگی کا ضامن ہوتا ہے۔

کیا بینک کے لئے اس طریقے سے بیع مرابحہ کا معاملہ کرنا جائز ہے؟

جواب :

بیع مرابحہ کا جو طریقہ سوال میں مذکور ہے۔ یہ طریقہ شرعاً جائز ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں بیع بعد القبض ہوگی، اور مبیع پر قبضہ بنک کا وکیل کرے گا۔ جس کو بنک نے مشتری کے شہر ہی میں اپنا وکیل مقرر کیا ہے ــ اور اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے کہ بنک کا وکیل مشتری کی طرف سے بھی اداء ثمن کا کفیل بن جائے ــ اور اگریمنٹ میں یہ بات طے شدہ ہوگی کہ عقد بیع کے انعقاد سے پہلے وہ بیع نہیں ہوگی، بلکہ وعدہ بیع ہوگی، اور فریقین کے لئے اس وعدہ کو قضاءً پورا کرنا لازم ہوگا، جیسا کہ دوسرے سوال کے جواب میں ہم نے تفصیل سے ذکر کیا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بنک نے جس ریٹ پر اس سامان کو خریدا ہے، اس پر معین نفع کی زیادتی کے ساتھ مشتری کو فروخت کرے گا، اور ثمن ایک معین مدت کے بعد وصول کرے گا۔ تو شرعاً اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اکثر فقہاء کے نزدیک اس قسم کا عقد جائز ہے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

وقد فسر بعض اهل العلم- قالوا! بيعتين فى بيعة ان يقول!
ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة، و بنسية بعشرين،
ولا يفارقه احد البيعين فاذا فارقه على احدهما فلاباس اذا كانت
العقدة على احد منهما

بعض فقہاء "بيعتين فى بيعة" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مثلاً بائع یہ کہے کہ میں یہ کپڑا نقد دس درہم میں اور ادھار بیس درہم میں فروخت کرتا ہوں، لیکن پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کرتے ہوئے فریقین کے درمیان جدائی نہ ہوئی (تو یہ صورت ناجائز ہے، اور بیعتین فی بیعۃ میں داخل ہے) البتہ اگر فریقین ایک بیع پر یعنی نقد یا ادھار پر اتفاق کرتے ہوئے جدا ہو گئے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں"

(جامع ترمذی ج ۴ ص ۵۳۳، باب ماجاء فی النھی عن بیعتین فی بیعۃ حدیث نمبر ۱۲۳۱)

امام عبدالرزاق نے مصنف عبدالرزاق میں امام زہری، طاؤس، اور سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے یہ حضرات فرماتے ہیں :۔

"لا باس بان یقول: ابیعک هذا الثوب بعشرة الی شهر، اوبعشرین الی شهرین، فباعه علی احدهما قبل ان یفارقه فلا باس به، و هکذا عن قتادة"

(مصنف عبدالرزاق، ج ۸ ص ۱۳۶)

"اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ بائع یہ کہے کہ میں یہ کپڑا ایک ماہ کے ادھار پر دس درہم میں اور دو ماہ کے ادھار پر بیس درہم میں فروخت کرتا ہوں۔ اور پھر جدائی سے پہلے ایک صورت پر اتفاق کر کے کپڑا بیچ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، امام قتادہ سے بھی یہی منقول ہے"

امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

قال ابوحنیفة فی الرجل یکون له علی الرجل مائة دینار الی اجل، فاذا حلت قال له الذی علیه الدین، بعنی سلعة یکون ثمنها مائة دینار نقداً، بمائة وخمسین الی اجل، ان هذا جائز، لانهما لم یشترطا شیئاً ولم یذکرا امراً یفسد به الشراء"

(کتاب الحجة علی اهل المدینة، ج ۲ ص ۶۹۴ باب ما یجوز فی الدین ومالا یجوز فیه)

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کے دوسرے کے ذمے سو دینار دین تھے، جو معین تاریخ پر ادا کرنے تھے۔ جب وہ معین تاریخ آئی تو اس شخص نے دوسرے شخص سے جس پر دین تھا۔ یہ کہا کہ فلاں سامان جس کی قیمت نقد کے اعتبار سے سو دینار ہے، مجھے ادھار ایک سو پچاس دینار میں فروخت کر دو ۔۔ یہ صورت جائز ہے، اس لئے کہ اس عقد کے اندر فریقین نے کوئی شرط نہیں لگائی۔ اور نہ ہی فریقین نے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا ہے، جو اس معاملے کو فاسد کر دے"

غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں سے حاصل ہونے والے سود کو استعمال میں لانا

علماء اور بینک کے ماہرین کی رپورٹ میں غور و خوض

سوال:

اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ کی نگراں بورڈ کا اجلاس مؤرخہ ۱۰/ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا مقصد اسلامی ترقیاتی بینک کو غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں میں رکھی ہوئی رقم پر حاصل ہونے والے سود کو استعمال میں لانے کے بارے میں شرعی نقطہ نظر سے غور و خوض کرنا تھا۔

چنانچہ فاضل علماء کی رپورٹ میں پیش کردہ تجاویز کی روشنی میں بینک کی نگران بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عالمی بینک سے حاصل ہونے والے سود کا پچاس فیصد "اسپیشل فنڈ" کے طور پر رکھا جائے، یہ اسپیشل فنڈ عالمی مارکیٹ میں کام کرنے والے بینکوں کی شاخوں میں رکھی ہوئی امانتوں کا پچاس فیصد ہوگا، اور اس "اسپیشل فنڈ" کا مقصد یہ ہے کہ بینک میں امانت کے طور پر رکھی ہوئی کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کے نتیجے میں بینک کے سرمائے کی قیمت میں جو خسارہ اور نقصان ہوگا۔ اس کی تلافی کے لئے یہ "اسپیشل فنڈ" مختص ہوگا۔

اور دوسرے پچاس فیصد سود کو "معونۃ خاصہ" کے لئے مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا۔

نگراں بورڈ کے فیصلے کے نتیجے میں اس "معونۃ خاصہ" کو مندرجہ ذیل اغراض میں صرف کیا جائے گا:۔

(الف) ممبر ممالک کی معاشی، مالی، اور بینکاری کی سرگرمیوں کو اعتدال میں رکھنے کے سلسلے میں تربیت و تحقیقات میں شریعت کے احکام کے مطابق اس کو صرف کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۱ء) میں جدہ "المعهد

للاسلامی للبحوث والتدریب" کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس وقت یہ ادارہ تحقیقات اور تربیت کے میدانوں میں اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

(ب) ناگہانی حوادث اور آفات کی صورت میں ممبر ممالک اور اسلامی سوسائٹیں کو سامان اور مناسب خدمات کی شکل میں بطور اعانت اس "معونۃ خاصہ" میں سے رقم ادا کی جائیگی۔

(ج) اسلامی مسائل کی تائید اور ان کو انجام دینے کے لئے ممبر ممالک کو مالی امداد کی فراہمی اس "معونۃ خاصہ" سے کی جائے گی۔

(د) ممبر ممالک کو فنی امداد کی فراہمی بھی اس "معونۃ خاصہ" سے کی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں سے حاصل ہونے والے سود کو مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق "اسپشل فنڈ" یا "معونۃ خاصہ" میں رکھ کر اس سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

اس سلسلے میں علماء شریعت کا جو اجتماع مورخہ ۱۱/۳/۱۳۹۹ھ کو ہوا تھا۔ اس میں ان علماء نے جو متفقہ سفارشات پیش کی تھیں۔ ہم بھی ان سفارشات کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ان بنکوں کا سود بھی حقیقت میں عین ربا ہی ہے، اور جمہور فقہاء کا صحیح اور مختار قول یہی ہے کہ سود حرام ہے۔ اگرچہ وہ کسی حربی سے لیا جائے۔ لہٰذا مسلمان کے لئے اس سود کو وصول کر کے اپنے ذاتی کاموں میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

لیکن دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ موجودہ حالات کے لحاظ سے غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں سود کی بھاری رقم کو چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لئے ان علماء نے اس سے بچنے کے لئے یہ صورت نکالی کہ اولاً تو بنک اس بات کی پوری کوشش کرے کہ جتنا جلد ممکن ہو اپنی رقوم سودی بنکوں میں رکھوانے سے کسی طرح خلاصی حاصل کریں۔ لیکن جب تک یہ عمل مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک بینک کو جو سود اس رقم پر ملے وہ اس کو علیحدہ اکاؤنٹ میں رکھے، اور پھر اس کو فقراء اور غریبوں پر خرچ

کرے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سودی بنکوں سے حاصل ہونے والی سود کی نصف رقم اسپیشل فنڈ میں رکھ دی جائے تو میرے نزدیک یہ صورت شرعاً جائز نہیں، اس لئے کہ اسپیشل فنڈ بینک کے تمام اثاثوں ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ہنگامی طور پر سرمایہ کی قیمت میں کمی کی وجہ سے بنک کو جو نقصان ہوتا ہے۔ اس کی تلافی اس اسپیشل فنڈ سے کی جاتی ہے۔ اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ بنک کے سود سے انتفاع کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

لہٰذا اسلامی بنک کو چاہئے کہ وہ غیر اسلامی بینک سے حاصل ہونے والے سود کو صرف معونۃ خاصہ کے مقصد کے لئے مختص کر دے۔

لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کا اجرت یا کمیشن لینا

سوال:

جو لوگ باہر سے مال منگواتے ہیں، ان کو کسی بنک میں ایل سی کھلوانی پڑتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بینک اس کے لئے "لیٹر آف کریڈٹ" جاری کرتا ہے۔ اور جس میں بنک اس شخص کی ضمانت لیتا ہے۔ اور پھر بنک اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بنک کے لئے اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:

اس موضوع پر میں نے ڈاکٹر رفیق مصری کی تجاویز کا جائزہ لیا۔ لیکن اس مسئلے میں میرا وہی جواب ہے جو "سروس چارج" کے مسئلے میں عرض کیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ کفالت یا ضمانت پر اجرت لینا شرعاً حرام ہے، میرے علم کے مطابق کسی ایک فقیہ نے بھی اس کو جائز نہیں کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی اجرت ہے جو کسی مال یا عمل کے عوض میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں کفالت کو عقد تبرع میں شمار کیا جاتا ہے۔ عقود معاوضہ میں شمار نہیں ہوتا اور یہ ایسی واضح بات ہے۔ جس کے لئے دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ "کفیل" کے لئے نفس کفالت پر تو اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر کفیل کو اس کفالت پر کچھ عمل بھی کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اس کے بارے میں اس کو لکھنا پڑھنا پڑتا ہے۔ اور دوسرے دفتری امور بھی انجام دینے پڑتے ہیں، یا مثلاً کفالت کے سلسلے میں اس کو "مضمون لہ" (جس کے لئے ضمانت لی گئی ہے اور "مضمون عنہ" جس کی طرف سے ضمانت لی ہے) سے ذاتی طور پر یا خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ کرنا پڑتا ہے" اس قسم کے دفتری امور کو تبرعاً انجام دینا ضروری نہیں، بلکہ کفیل کے لئے مکفول لہ سے یا مکفول عنہ سے ان تمام امور کے انجام دینے پر اجرت مثل کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

آج کل جو بینک کسی کی ضمانت لیتے ہیں تو وہ صرف زبانی ضمانت نہیں لیتے۔ بلکہ اس ضمانت پر بہت سے دفتری امور بھی انجام دیتے ہیں۔ مثلاً خط و کتابت کرنا کاغذات وصول کرنا، پھر ان کو سپرد کرنا، رقم وصول کرنا، پھر اس کو بھیجنا وغیرہ۔ اور ان کاموں کے لئے اسے ملازمین، عملہ، دفتر، عمارت اور دوسری ضروری اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب بنک جو یہ تمام امور انجام دے رہا ہے۔ یہ فری فنڈ میں مفت انجام دینا اس کے لئے واجب نہیں ہے۔ چنانچہ ان مور کی انجام دہی کے لئے بنک کے لئے اپنی گاہکوں سے مناسب اجرت لینا جائز ہے، البتہ نفس ضمانت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اور پھر بینک بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بھی بنتا ہے۔ اور بحیثیت دلال یا وکیل کے بہت سے امور انجام دیتا ہے، اور شرعاً دلالی اور وکالت پر اجرت لینا جائز ہے۔ لہٰذا ان امور کی ادائیگی میں بھی بنک کے لئے اپنے گاہک سے اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

چنانچہ اب بنک کے لئے گاہک سے دو قسم کی اجرتوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

۱۔ لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بنک کو جو دفتری امور انجام دینے پڑتے ہیں ان امور پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

۲۔ وکالت یا دلالی پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

البتہ بینک اپنے گاہک سے یہ دو قسم کی جو اجرتیں وصول کرے گا، اس میں یہ

ضروری ہے کہ وہ اجرت ان کاموں کی اجرت مثل سے زائد نہ ہو اس لئے کہ اگر یہ اجرت مثل سے زائد ہوگی تو پھر یہ تو نفس ضمان پر اجرت وصول کرنے کا ایک حیلہ بن جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے سوال نمبر ایک کے جواب میں تفصیل سے عرض کر دیا ہے۔

بہر حال، جب بنک کو یہ دو قسم کی اجرتیں حاصل ہو گئیں تو اب نفس ضمان پر اجرت لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جہاں تک ڈاکٹر رفیق مصری کی اس تجویز کا تعلق ہے کہ چونکہ پہلے زمانے میں ایک شخص محض تبرعاً و احساناً دوسرے شخص کی ضمانت دیتا تھا۔ مگر چونکہ اب ضمانت دینا ایک منظم پیشہ اختیار کر گیا ہے اس لئے نفس ضمانت پر اجرت لینا ان حالات میں جائز ہونا چاہئے ہم قابل احترام ڈاکٹر رفیق صاحب کی اس تجویز سے کسی طرح بھی اتفاق نہیں کر سکتے۔ اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم ابتداءً ہی اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اگر کوئی شخص انفراداً کوئی ایسا عمل کرے جس پر اسکو اجرت لینا جائز نہ ہو لیکن اگر وہی عمل منظم پیشے کی شکل میں اختیار کر لے تو اس پر اجرت لینا جائز ہو جائے گا، اگر ہم اس دلیل کو درست تسلیم کر لیں تو پھر اس دلیل کی بنیاد پر یہ بھی کہا جائے گا کہ چونکہ پہلے زمانے میں قرض دینے کا معاملہ صرف قرض دینے والے متبرعین تک منحصر تھا، اس لئے کسی شخص کو بطور قرض کے بہت بڑی رقم کی ضرورت تو ہوتی نہیں تھی، اس کے علاوہ اس زمانے میں تبرعاً قرض دینے والے افراد بہت ہوتے تھے۔ مگر چونکہ آج کے دور میں لوگوں کو بطور قرض بڑی بڑی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تبرعاً قرض دینے والے لوگ بھی اب موجود نہ رہے، اس لئے اب قرض دینے کا معاملہ ایک پیشہ اختیار کر گیا ہے جس کے لئے بنک قائم کئے گئے ہیں۔ لہٰذا اب نفس قرض پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہونا چاہئے۔

اب ظاہر ہے کہ قرض کے معاملے میں اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ قرض پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے، اسی طرح "ضمانت" کے معاملے میں بھی اس دلیل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

جہاں تک امام، موذن اور معلم وغیرہ کی اجرت کا تعلق ہے، تو یہ ایک

مجتہد فیہ مسئلہ تھا، بہت سے فقہاء مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس اجرت کو شروع سے جائز کہا ہے، اور اس کے جواز پر بعض احادیث سے استدلال کیا ہے، چنانچہ جب ضرورت زیادہ ہوئی، اور ان خدمات کے لئے متبرعین کا فقدان ہو گیا تو ضرورۃً فقہاء حنفیہ نے اس اجرت کو جائز قرار دیا۔ لیکن جہاں تک "ضمانت" پر اجرت کا تعلق ہے تو یہ کوئی مجتہد فیہ مسئلہ نہیں ہے، (بلکہ متفقہ مسئلہ ہے) اس لئے "ضمانت" پر اجرت لینے کے مسئلے کو طاعات پر اجرت لینے پر قیاس کرنا درست نہیں۔

جہاں تک لکڑیاں کاٹنے کے لئے یا شکار کرنے کے لئے کسی کو اجرت پر لینے کا تعلق ہے تو یہ اصلاً جائز ہے، اور لکڑیاں اور شکار کئے ہوئے جانور اجرت پر لینے والے کی ملکیت ہوں گے، اجیر (مزدور) کے نہیں ہوں گے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ اجرت پر لینے والا کوئی فرد ہو یا تجارتی کمپنی ہو۔

۲۔ بہرحال، جب اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ بینک کے لئے اپنے گاہک سے دو قسم کی اجرت لینا جائز ہے، ایک دفتری امور کی انجام دہی پر اجرت لینا، دوسرے وکالت پر اجرت لینا، لہٰذا اب "عمل ضمانت" پر اجرت لینے کو جائز کرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ ان دونوں قسم کی اجرت کی مقدار کی تعیین کو بینک پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہٰذا بنک کو اس کی گنجائش ہے کہ ان دونوں کاموں کی اتنی اجرت مقرر کر دے جو موجودہ دور کے عرف مطابق ان خدمات کے لئے کافی ہو جو خدمات بینک نے انجام دی ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

فقہی مقالات



جلد ۲

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ہاؤس فائینانسنگ کے جائز طریقے

پی ایل ایس اکاؤنٹ کی حقیقت

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکٹس

ووٹ کی اسلامی حیثیت

قانون میعاد سماعت کی شرعی حیثیت

کوے کی حلت پر تحقیق

مروجہ موزوں پر مسح کا حکم

تاخیر رکن کی وہ مقدار جس سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے۔

رمضان میں نفل کی جماعت

بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ

اسلام میں خلع کی حقیقت

مستقبل کی تاریخ پر خرید فروخت

میمن اسلامک پبلشرز

فقہی مقالات

۲

شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ترجمہ وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقالات	:	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ترجمہ وترتیب	:	مولانا عبداللہ میمن صاحب
تاریخ اشاعت	:	2011ء
باہتمام	:	محمد مشہود الحق کلیانوی :0313-9205497
ناشر	:	میمن اسلامک پبلشرز
جلد	:	**2**
قیمت	:	=/ روپے

حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر:

ملنے کا پتے

- ☆ میمن اسلامک پبلشرز، کراچی۔:20 88 241-0322
- ☆ مکتبہ دارالعلوم، کراچی ۱۴۔ ☆ مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور۔
- ☆ دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی۔
- ☆ ادارۃ المعارف، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔
- ☆ مکتبہ معارف القرآن، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔
- ☆ کتب خانہ اشرفیہ، قاسم سینٹر، اُردو بازار، کراچی۔
- ☆ مکتبۃ العلوم، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔
- ☆ مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، نزد جامعہ فاروقیہ، کراچی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے استاد مکرم و مربی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کو ہر میدان میں اور خاص طور پر فقہی میدان میں جو بلند مقام عطا فرمایا ہے وہ محتاج بیان نہیں، آپ نے جس دقیق فقہی موضوع پر بھی قلم اٹھایا، الحمدللہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث فرمائی، اور اب تک آپ نے جو فقہی مقالات تحریر فرمائے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر عربی زبان میں ہیں۔ چنانچہ فقہی مقالات میں صرف وہی مقالات شامل کئے گئے تھے جو اصلاً عربی میں لکھے گئے تھے۔ بعد میں احقر نے ان کا اردو ترجمہ کیا۔

لیکن جب جلد اوّل حضرات علماء کرام کے پاس پہنچی تو بعض حضرات علماء نے اس طرف توجہ دلائی کہ حضرت مولانا مدظلہم کے وہ فقہی مضامین جو حضرت مولانا مدظلہم نے جدید فقہی موضوعات پر براہ راست اردو میں تحریر فرمائے ہیں، اگر اُن کو بھی اِن کے ساتھ شامل کر کے شائع کر دیا جائے تو اس

پیش قیمت علمی ذخیرہ سے استفادہ کرنا آسان ہوجائے گا۔ چنانچہ احقر نے حضرت مولانا مدظلہم کے فقہی مضامین کی تلاش شروع کی تو الحمدللہ کچھ کامیابی ہوئی اور چند مضامین جمع ہوگئے۔ جن کا مجموعہ فقہی مقالات جلد ثانی کی شکل میں آپ کے سامنے پیش ہے۔

البتہ اس مجموعے میں دو مقالات ایسے شامل ہیں جو آپ نے عربی میں تحریر فرمائے تھے اور احقر نے ان کا ترجمہ کردیا ہے۔ ان مقالات کے نام یہ ہیں۔

۱۔ مستقبل کی تاریخ پر خرید وفروخت

۲۔ ہاؤس فائینانسنگ کے جائز طریقے

اللہ تعالیٰ اس کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے اور حضرت استاذ مکرم مدظلہم کے علم، عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے علمی جواہر سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ میمن

دارالعلوم کراچی

۱۹؍رمضان ۱۴۱۷ھ

اجمالی فہرست فقہی مقالات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"ان الذین یکسبون الاثم سیجزون ما کانو ایقتر فون"
(سورۃ الانعام: ۱۲۰)

یعنی جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، قیامت کے روز
ان کے ان اعمال کی سزا دی جائے گی جو وہ لوگ یہاں پر کیا کرتے تھے۔

مروّجہ موزوں پر مسح کا حکم

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں تمام حضرات علماء کا اتفاق ہے۔ لیکن موجودہ دور کے ایک مشہور مفکر کا خیال ہے کہ اونی، سوتی، اور نائیلون کے موزوں پر بھی مسح کرنا درست ہے، چنانچہ اس بارے میں ایک صاحب نے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے پاس سوال بھیجا، حضرت مولانا مدظلہم نے اس کا تفصیلی جواب تحریر فرمایا، جو ماہنامہ البلاغ کے شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ میں شائع ہو چکا ہے، اب ہم اس کو دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے، اور ہم سب کو اس پر اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

محمد مشہود الحق کلیانوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مروجہ موزوں پر مسح کا مسئلہ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن موزوں پر مسح کرنا درست ہے؟

الف ـــــ جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کا تعلق ہے اس کے جواز پر تقریباً تمام ہی علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

البتہ اونی "سوتی" اور نائیلون وغیرہ کے موزوں پر مسح کے جائز ہونے کے بارہ میں کچھ اختلاف ہے، بیشتر فقہاء اونی اور سوتی موزوں پر مسح جائز ہونے کے بارہ میں کچھ شرائط رکھتے ہیں۔

لیکن دور حاضر کے ایک مشہور صاحب فکر و بصیرت فرماتے ہیں کہ ہر قسم کے موزوں پر کسی قید کے بغیر مسح کرنا درست ہے۔

ب ـــــ فقہائے کرام نے جو شرائط موزوں پر مسح کے جائز ہونے کی رکھی ہیں، انکے بارہ میں مشہور مفکر فرماتے ہیں کہ۔

"میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے؟ مگر سنت میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی"۔

"سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔" نسائی کے سوا کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ ابن شعبہؓ کی روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور (مسح علی الجوربین والنعلین) اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔ ابو داؤدؒ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، براء ابن عازبؓ، انس ابن مالکؓ ابوامامہؓ، سہیل بن سعدؓ اور عمر بن حریثؓ نے جرابوں پر مسح کیا نیز حضرت عمرؓ اور

حضرت عباسؓ سے بھی یہ فعل مروی ہے، بلکہ بیہقی نے ابن عباسؓ اور انس بن مالکؓ سے طحاوی نے اویس ابن اوسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا۔ اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے، اور یہ ہی عمل حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے، ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر بھی مسح کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا درست ہے۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام نے مسح فرمایا وہ کس چیز کی تھیں۔

اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں اور فقہاء چونکہ شارع نہیں اس لئے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کے موزوں پر اطمینان کے ساتھ مسح کیا جاسکتا ہے چاہے وہ اونی ہوں یا سوتی، نائلون کے ہوں یا کسی اور ریشے کے، چمڑے کے ہوں یا آئل کلاتھ کے اور ریگزین کے حدیہ کہ اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کر لیا جائے تو اس پر بھی جائز ہے۔ ”

ان مفکر کے علاوہ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنے فتویٰ کی کتاب جلد دوم میں بھی یہ فتوی دیا ہے۔ اور حافظ ابن قیم اور علامہ ابن حزم کا بھی یہ ہی مسلک ہے، کہ کسی قید کے بغیر ہر قسم کے موزے پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں مستدعی ہوں کہ اپنے مصروف اوقات میں سے اس دینی مسئلہ کو حل فرماکر مرسل فرمادیں گے۔ فتوی مدلل اور مفصل درکار ہے۔

آپ کے فتوی کا منتظر رہوں گا تاکہ اس الجھن سے نکل کر راہ راست پاسکوں۔

المنتظر الجواب

محمد طاہر غوری معرفت مدرسہ تعلیم النساء چشتیاں، ضلع بہاولنگر

الجواب باللہ التوفیق

جس قسم کے سوتی، اونی یا نائیلون کے موزے آجکل رائج ہیں، ان پر مسح کرنا ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں، آپ کا خیال غلط ہے کہ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے باریک موزوں کے بارے میں تمام ائمہ مجتہدین اس پر متفق ہیں کہ ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے چنانچہ ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

فان کانا رقیقین یشفان الماء لا یجوز المسح علیهما بالاجماع

پس اگر موزے اتنے باریک ہوں کہ ان میں سے پانی چھن سکتا ہو تو ان پر بہ اجماع مسح جائز نہیں ہے۔

(بدائع الصنائع ص ۱۰ ج ۱)

اور علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

ولا یجوز المسح علی الجورب الرقیق من غزل اوشعر بلا خلاف، ولو کان ثخینا یمشی معه فرسخا فصاعدا فعلی الخلاف

(البحرالرائق ص ۱۹۲ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جن موزوں میں "ثخین" کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، یعنی ان میں پانی چھن جاتا ہو، یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر محض اپنی موٹائی کی بناء پر کھڑے نہ رہ سکتے ہوں، یا ان میں ایک کوس تک بغیر جوتے کے چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح کرنا کسی بھی مجتہد کے مذہب میں جائز نہیں، ہاں جن موزوں

میں یہ تینوں شرائط پائی جاتی ہوں، ان پر مسح کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہے۔

جہاں تک جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا تعلق ہے، انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور امت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جس میں انہوں نے جمہور فقہاء کی مخالفت کر کے سخت غلطی کی ہے، آپ نے ان کے جو دلائل ذکر کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے مسئلے کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ آپ کے اطمینان کے لئے مسئلے کی حقیقت مختصراً عرض کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے سورہ مائدہ میں وضو کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں پوری وضاحت کے ساتھ پاؤں کو دھونے کا حکم دیا ہے، نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔ لہٰذا قرآن کریم کی اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وضو میں ہمیشہ پاؤں دھوئے جائیں، اور ان پر مسح کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو یہاں تک کہ جب کسی شخص نے چمڑے کے موزے پہنے ہوئے ہوں اس وقت بھی مسح کی اجازت نہ ہو، لیکن چمڑے کے موزوں پر مسح کی جو اجازت باجماع امت دی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موزوں پر مسح کرنا اور اسکی اجازت دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ اگر مسح علی الخفین کے جواز پر دو تین ہی حدیثیں ہوتیں تب بھی ان کی بناء پر قرآن کریم کے مذکورہ صریح حکم میں کوئی تقیید درست نہ ہوتی، کیونکہ اخبار احاد سے قرآن کریم پر زیادتی یا اسکا نسخ یا اس کی تقیید جائز نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ مسح علی الخفین کی احادیث معنیً متواتر ہیں، اس لئے ان متواتر احادیث کی روشنی میں تمام امت کا اس پر اجماع منعقد ہو گیا کہ قرآن کریم کی آیت میں پاؤں دھونے کا حکم اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب انسان نے "خفین" (یعنی چمڑے کے موزے) نہ پہن رکھے ہوں، چنانچہ:۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں:۔

ماقلت بالمسح حتی جاء فی فیه
ضوء النهار (البحر الرائق ص ۱۷۳ ج ۱)

میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہیں ہوا جب تک میرے پاس روز روشن کی طرح اس کے دلائل نہیں پہنچ گئے۔

چنانچہ "مسح علی الخفین" کا حکم اسی (۸۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں:۔

وقد صرح جمع من الحفاظ بان المسح
علی الخفین متواتر وجمع بعضهم رواته
فجاوزوا لثمانین منهم العشرة

(نیل الاوطار ص ۱۷۶ ج ۱)

حفاظ کی ایک بڑی جماعت نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین کا حکم متواتر ہے، اور بعض حضرات نے اس کے روایت کرنیوالے صحابہ کو جمع کیا تو وہ اسی (۸۰) سے متجاوز تھے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:۔

ادرکت سبعین بدریا من الصحابة
کلهم کانوا یرون المسح علی الخفین۔
(تلخیص الحبیر ص ۱۵۸ ج ۱ وبدائع ص ۷ ج ۱)

اگر مسح علی لخفین کا حکم ایسے تواتر یا استفاضے کے ساتھ ثابت نہ ہوتا تو قرآن کریم نے پاؤں دھونے کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی تخصیص یا تقیید کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:۔

انما یجوز نسخ القران بالسنة اذاوردت
کورودالمسح علی الخفین فی الا ستفاضة
(احکام القرآن للجصاص ص ۴۲۵ ج ۲)

"سنت نبویہ سے قرآن کریم کے کسی حکم کو منسوخ (بمعنی مقید) کرنا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب وہ سنت ایسے تواتر سے ثابت ہو جیسے مسح علی الخفین ثابت ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کا قرآنی حکم ایسی چیز نہیں ہے جسے دو تین روایتوں کی بنیاد پر کسی خاص حالت کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے، بلکہ اس کے لئے ایسا تواتر درکار ہے جیسا مسح علی الخفین کی احادیث کو حاصل ہے۔ اب "خفین" (چمڑے کے موزوں) کے بارے میں تو یہ تواتر موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح خود بھی فرمایا اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت دی، لیکن "خفین" کے سوا کسی چیز پر مسح کرنے کے بارے میں ایسا تواتر موجود نہیں ہے۔ اور "خفین" چونکہ عربی زبان میں صرف چمڑے کے موزوں کو کہتے ہیں، کپڑے کے موزوں کو "خف" نہیں کہا جاتا، اس لئے یہ اجازت صرف چمڑے ہی کے موزوں کے ساتھ مخصوص رہے گی، دوسرے موزوں کے بارے میں قرآن کریم کے اصلی حکم یعنی پاؤں دھونے پر ہی عمل ہوگا۔ ہاں اگر کپڑے کے موزے اتنے ثخین (موٹے) ہوں کہ وہ اپنی خصوصیات اور اوصاف میں چمڑے کے ہم پایہ ہو گئے ہوں، یعنی نہ تو ان میں پانی چھنتا ہو، نہ انہیں کھڑا رکھنے کے لئے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت ہو اور انکو پہن کر میل دو میل چل سکتے ہوں تو ایسے موزوں کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہو گیا، بعض فقہاء نے فرمایا کہ چونکہ ایسے موزے چمڑے ہی کے معنی میں آگئے ہیں اس لئے ان پر بھی مسح جائز ہونا چاہئے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ "چونکہ مسح کرنا تواتر کے ساتھ صرف خفین (چمڑے کے موزوں) پر ہی ثابت ہے، اس لئے ان پر مسح کرنا درست نہیں، گویا موزے تین قسم کے ہو گئے۔

(۱) چمڑے کے موزے جنہیں خفین کہا جاتا ہے، ان پر مسح باجماع جائز ہے۔

(۲) وہ باریک موزے جو نہ چمڑے کے ہوں، اور نہ ان میں چمڑے کے اوصاف پائے جاتے ہوں، جیسے آجکل کے سوتی، اونی یا نائیلون کے موزے، ان کے بارے میں اجماع ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں کیونکہ ایسے موزوں پر مسح کرنا ایسے دلائل سے ثابت نہیں جن کی بناء پر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑا جاسکے۔

(۳) وہ موزے جو چمڑے کے تو نہیں ہیں، لیکن ان میں موٹے ہونے کی بناء پر اوصاف چمڑے ہی کے پائے جاتے ہیں۔ ان پر مسح کے جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو موزے چمڑے جیسے نہ ہوں، ان پر مسح کے عدم جواز میں مجتہدین امت کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جاسکتا جب تک کہ مسح کا حکم ایسے تواتر سے ثابت نہ ہو جائے جس تواتر سے مسح علی الخفین کا جواز ثابت ہے۔ لہذا فقہاء کرام نے کپڑے کے موزوں پر مسح کے لئے جو شرطیں لگائی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لگائیں، بلکہ ان موزوں میں چمڑے کے اوصاف کے تحقق کے لئے لگائی ہیں۔ اور اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ ان شرائط کے تحقق کے بعد بھی ان پر مسح جائز ہے یا نہیں۔

حقیقت مسئلہ کی اس وضاحت کے بعد اب ان روایات کو دیکھئے جن میں جوربین (جورابوں) پر مسح کا ذکر آیا ہے، سارے ذخیرہ حدیث میں یہ کل تین حدیثیں ہیں ایک حضرت بلال؄ سے مروی ہے، ایک حضرت ابو موسیٰ اشعری؄ سے، اور ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہم) سے۔ حضرت بلال؄ کی حدیث معجم صغیر طبرانی میں ہے، اور حضرت ابو موسیٰ؄ کی ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے روایت کی ہے، لیکن حافظ زیلعیؒ نے ان دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں سنداً ضعیف ہیں۔

(نصب الرایہ ص ۱۸۳ ص ۱۸۴ ج ۱)
اور حضرت ابو موسیٰؒ کی حدیث کے بارے میں تو امام ابو داؤدؒ نے بھی لکھا ہے کہ لیس بالمتصل ولا بالقوی (بذل المجہو ص ۹۶ ج ۱) لہٰذا یہ دونوں روایتیں تو خارج از بحث ہیں۔

اب صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث رہ جاتی ہے، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اس کو "حسن صحیح" کہا ہے، لیکن دوسرے جلیل القدر محدثین نے امام ترمذیؒ کے اس قول پر سخت تنقید کی ہے، امام ابو داؤدؒ اس حدیث کو روایت کر کے لکھتے ہیں:۔

وکان عبدالرحمٰن بن مهدی لا یحدث بهذه الحدیث لان المعروف عن المغیره ان النبی صلی الله علیه وسلم مسح علی الخفین۔

(بذل المجہود ص ۹۶ ج ۱)

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ یہ حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہؓ سے جو معروف روایتیں ہیں وہ مسح علی الخفین کی ہیں، (نہ کہ جوربین پر مسح کی)

امام نسائیؒ سنن کبریٰ میں لکھتے ہیں:۔

لا نعلم احداتابع انه ابا قیس علی هذه الروایة، والصحیح عن المغیرد انه علیه السلام مسح علی الخفین

(نصب الرایہ ص ۱۸۳ ج ۱)

یہ روایت ابو قیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی، اور ہمارے علم میں کوئی اور راوی اسکی تائید نہیں کرتا، البتہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت مسح علی الخفین ہی کی

ہے۔
اسکے علاوہ امام مسلمؒ امام بیہقیؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ یحییٰ بن معینؒ، علی بن المدینیؒ، اور دوسرے محدثین نے اس روایت کو ابو قیس اور ھزیل بن شرجیل دونوں کے ضعف کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے، اور علامہ نوویؒ شارح صحیح مسلم لکھتے ہیں:-

> کل واحد من هولاء لوانفرد قدم على الترمذى، مع ان الجرح مقدم على التعديل، واتفق الحفاظ على تضعيفه، ولا يقبل قول الترمذى انه حسن صحيح -
>
> (نصب الرایہ بحوالہ بالا)

جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اگر ان میں سے ہر ایک تنہا ہوتا تب بھی وہ امام ترمذیؒ پر مقدم ہوتا، اس کے علاوہ یہ قاعدہ ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اور حفاظ حدیث اسکی تضعیف پر متفق ہیں، لہٰذا ترمذی کا یہ قول کہ، یہ "حسن صحیح ہے" قابل قبول نہیں۔

یہ ہے اس حدیث کی اسنادی حیثیت جسے مودودی صاحب نے اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ اول تو اکثر حفاظ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ضعیف اور نا قابل استدلال ہے۔

دوسرے اگر بالفرض امام ترمذیؒ کے قول کے مطابق اسے صحیح مان لیا جائے تو

پورے ذخیرہ حدیث میں تنہا یہ ایک روایت ہوگی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوربین پر مسح کرنا مذکور ہے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے پاؤں دھونے کا جو صریح حکم دیا ہے اسے صرف اس ایک روایت کی بنا پر کیسے چھوڑ دیا جائے، جب کہ ائمہ

حدیث نے اسپر شدید تنقید بھی کی ہے؟ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ مسح علی الخفین کا حکم اس وقت ثابت ہوا جب اسکی احادیث تواتر کی حد تک پہنچ گئیں، اور امام ابو یوسف" فرماتے ہیں کہ اگر مسح علی الخفین کی احادیث اتنی کثرت کے ساتھ نہ ہوتیں تو پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑنے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن مسح علی الجوربین کی احادیث متواتر تو کیا ہوتیں، پورے ذخیرہ حدیث میں اسکی صرف تین روایتیں ہیں، ان میں سے دو تو بالاتفاق ضعیف ہیں اور ایک کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، صرف امام ترمذی" اسے صحیح کہتے ہیں۔ ایسی روایات کی بناء پر قرآن کریم کے کسی حکم میں کوئی تخصیص یا قید پیدا نہیں کی جاسکتی، چنانچہ امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"والا صل فیه انه قدثبت ان مراد الایة الغسل علی ماقد منا، فلو لم ترد الاثار المتواترة علی النبی صلی الله علیه وسلم ى المسح علی الخفین لما اجزنا المسح ...... ولمالم تردالا ثارى جواز المسح علی الجوربین ى وزن ورودهاى المسح علی الخفین ابقینا حکم الغسل علی مراد الایة"۔

(احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۴۲۸)

مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ آیت کی اصلی مراد پاؤں دھونا ہے جیسے کہ پیچھے گزر چکا، لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح علی الخفین کی متواتر احادیث ثابت نہ ہوتیں تو ہم کبھی مسح علی الخفین کو جائز قرار نہ دیتے............ اور چونکہ جوربین (کپڑے کے موزوں) پر مسح کی احادیث اس وزنی طریقے سے مروی نہیں ہیں جس وزنی طریقے سے مسح علی الخفین کی احادیث مروی ہیں۔ اس لئے ہم نے وہاں آیت قرآنی کی اصل مراد یعنی پاؤں دھونے کے حکم کو برقرار رکھا

ہے۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے جوربین پر مسح کیا یا اسکی اجازت دی توان کے اس عمل کی کیا وجہ تھی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے، اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہل حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔

ان الجورب یتخذمن الادیم وکذامن الصوف و کذامن القطن ویقال لکل من هذه انه جورب، ومن المعلوم ان هذه الرخصه بهذا العموم لا تثبت الا بعدان یثبت ان الجوربین الذین مسح علیهما النبی صلی الله علیه وسلم کانا من صوف الخ

(عون المعبود ص ٦٢ ج ١)

"یعنی جوربین کھال کے بھی ہوتے ہیں، اون کے بھی اور روئی کے بھی، اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے، اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اون کے جوربین پر مسح فرمایا۔" بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ

ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ یا تو چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے، اور ان میں چمڑے کے موزوں کی صفات پائی جاتی تھیں، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے:۔

حدثنا هشیم قال اخبر نایونس عن الحسن وشعبه عن قتادة عن سعید بن المسیب والحسن

انهما قالا: يمسح على الجوربين اذا كانا صفيقين (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۸۸ ج ۱)

حضرت سعید بن مسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح جائز ہے، بشرطیکہ وہ خوب موٹی ہوں۔ واضح رہے کہ ثوب صفیق اس کپڑے کو کہتے ہیں جو خوب مضبوط اور دبیز ہو ملاحظہ ہو قاموس اور مختار الصحاح وغیرہ۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت سعید بن المسیبؒ دونوں جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور انھوں نے صحابہ کرامؓ کا عمل دیکھ کر ہی یہ فتویٰ دیا ہے۔

لہٰذا ان حضرات کے عمل اور فتویٰ سے جو بات ثابت ہوئی وہ اس سے زائد نہیں کہ جو موزے بہت موٹے ہونے کی بنا پر چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوں، ان پر مسح جائز ہے، اور اس موٹائی کی وضاحت کے لئے میں نے وہ تین شرائط ذکر کی ہیں کہ ایک تو ان میں پانی نہ چھنے دوسرے وہ کسی چیز سے باندھے بغیر اپنی موٹائی کی وجہ سے خود کھڑے رہیں، اور تیسرے یہ کہ ان کو پہن کر میل دو میل چلنا ممکن ہو، ایسے موزے چونکہ چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی اکثر فقہا نے "مسح علی الخفین" کی احادیث کی دلالت النص اور مذکورہ آثار صحابہؓ کی بناء پر "خفین" کے حکم میں داخل کر لیا، چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

لا شك ان المسح على الخف على خلاف القياس، فلا يصلح الحاق غيره به، الا اذا كان بطريق الدلالة، وهوان يكون ى معناه، ومعناه الساتر لمحل الفرض الذى هو بعد د متابعة المشى فيه ى السفر وغيره۔

(فتح القدیر ص ۱۰۹ ج ۱)

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مسح علی الخفین کی مشروعیت خلاف قیاس ہوئی ہے لہٰذا کسی دوسری چیز کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، الایہ کہ وہ دلالۃ النص کے طریقے پر خفین کے معنی میں داخل ہو، اور خفین کے معنی ایک ایسے موزے کے ہیں جنہوں نے پاؤں کو بالکل ڈھانپ رکھا ہو اور ان میں سفر وغیرہ کے دوران مسلسل چلنا ممکن ہو"۔

لہٰذا فقہاء نے جوربین پر مسح کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں، ان کی یہ تعبیر بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ حدیث میں مسح علی الجوربین کی اجازت مطلق تھی، اور انہوں نے اپنی طرف سے شرائط عائد کر کے اسے مقید کر دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے پاؤں دھونے کے فریضے کو چھوڑ کر مسح کرنے کا حکم اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر احادیث متواترہ موجود نہ ہوں، خفین میں چونکہ ایسی احادیث موجود تھیں، اس لئے وہاں مسح کی اجازت دیدی گئی، لیکن جوربین پر مسح کسی ایسی حدیث سے بھی ثابت نہیں جو متفق علیہ طور پر صحیح ہو، لہٰذا ان پر مسح کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی، الایہ کہ وہ جوربین خفین کی صفات کے حامل ہو کر خفین کے حکم میں بدلالۃ النص داخل ہو جائیں، اور چونکہ صحابہؓ و تابعین سے ایسے ہی موزوں پر مسح ثابت تھا، اس لئے بیشتر فقہاء نے اسکی اجازت دی۔ اور "خفین" کی بنیادی صفات کو مذکورہ تین شرائط کے ذریعہ بیان کر دیا۔ اور اسپر تمام ائمہ مجتہدین کا اجماع منعقد ہو گیا۔

جہاں تک علامہ ابن حزمؒ یا علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کا تعلق ہے، ان کا مقام بلند اپنی جگہ ہے لیکن انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور امت سے الگ راہ اختیار کی ہے جسے امت نے بحیثیت مجموعی قبول نہیں کیا، بالخصوص اس مسئلے میں تو انہوں نے اپنے مسلک پر کوئی دلیل بھی نہیں دی۔ لہٰذا پوری امت کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین کے مقابلے میں صرف ان تین حضرات کی

رائے پر عمل کر کے پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کر دینا ایک سنگین جسارت ہے اور اس "اجتہاد" کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے کہ "اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کر لیا جائے تو اس پر بھی مسح جائز ہے۔" ساری امت کے تمام فقہاء، تمام محدثین اور تمام مجتہدین کے بارے میں تو یہ الزام ہے کہ ان کے اس قول کا کوئی ماخذ نہیں، حالانکہ ان کے ناقابل انکار دلائل آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں اور دوسری طرف اپنا خود "اجتہاد" یہ ہے کہ بلاوجہ پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر اس پر بھی مسح کیا جا سکتا ہے۔ کیا اس لایعنی حرکت کی خاطر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کرنے کا بھی کوئی ماخذ ہے؟

آپ نے جناب سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی جو عبارت نقل فرمائی ہے اس میں چونکہ جوتوں پر مسح کرنے کا بھی ذکر ہے، اس لئے اسکی حقیقت بھی آخر میں مختصراً عرض ہے۔

جوربین اگر موٹے ہوں تو ان پر مسح کرنے کے تو بعض فقہاء قائل بھی ہیں، لیکن جوتوں پر مسح کرنا تو کسی بھی امام کے مذہب میں جائز نہیں:۔

"لم يذهب احد من الائمة الى جواز المسح على النعلين

(معارف السنن ص ۳۴۷ ج ۱)

ائمہ میں سے کوئی بھی جوتوں پر مسح کرنے کا قائل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں پر مسح کرنا اس وقت ثابت ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے باوضو ہوتے تھے، لیکن نئی نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے تھے، ایسی حالت میں چونکہ وضو پہلے سے ہوتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں دھونے کے بجائے اپنے جوتوں پر ہاتھ پھیر لیتے تھے، چنانچہ "صحیح ابن خزیمہ" میں روایت ہے:۔

عن علی انه دعا بکوز من ماء ثم توضا
وضوء خفیفا ومسح علی نعلیه،
ثم قال هکذا وضوء رسول الله صلی الله
علیه وسلم للطاهر مالم یحدث۔

(صحیح ابن خزیمہؒ ص ۱۰۰ ج ۱ باب ۱۵۴ حد ۲۰۰)

"حضرت علیؓ نے پانی کا ایک گلاس منگوایا، اور بہت مختصر وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا، پھر فرمایا: طہارت کی حالت میں جب تک وضو نہ ٹوٹا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔

اس وضاحت کے بعد "جوتوں پر مسح" ثابت کرنے والی روایات سے بے وضو آدمی کے لئے جوتوں پر مسح کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہٰذا

امت کے تمام مستند فقہاء و مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ باریک موزے جن سے پانی چھن جاتا ہو، یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر پنڈلی پر کھڑے نہ رہتے ہوں، یا ان میں میل دو میل مسلسل چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح جائز نہیں ہے اور نہ جوتوں پر مسح درست ہے۔ اور چونکہ ہمارے زمانے میں جو سوتی، اونی، نائیلون کے موزے رائج ہیں وہ باریک ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لئے ان پر مسح کسی حال میں جائز نہیں ہے، اور جو شخص ایسا کرے

گا تو امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ بلکہ کسی بھی مجتہد کے مسلک میں اسکا وضو صحیح نہیں ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(بشکریہ ماہنامہ البلاغ، جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ)

الحمد لله رب العالمين

تاخیر رکن کی وہ مقدار کیا ہے؟

جس سے سجدہ سہو واجب ہو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یاایھاالذین آمنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذااھتدیتم
الی اللہ مرجعکم جمیعاًفینبئکم بماکنتم تعملون "
(سورۃ المائدۃ، آیت نمبر ۱۰۵)

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کی خبر لو، اگر تم سیدھے راستے پر آ گئے
(تم نے ہدایت حاصل کر لی۔ صحیح راستہ اختیار کر لیا) تو جو لوگ گمراہ ہیں۔
ان کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے
وہاں پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتائیں گے کہ تم دنیا کے اندر کیا کرتے رہے ہو۔

تاخیر رکن کی وہ مقدار کیا ہے جس سے سجدہ سہو واجب ہو؟

سوال:

منیۃ المصلی میں لکھا ہے کہ پہلی رکعت اور تیسری رکعت میں محض بیٹھنے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے اور یہ عبارت ہے ویجب سجدۃ السھو بمجرد الجلوس اور صاحب مفتاح الصلواۃ نے ایک تسبیح کی مقدار بیٹھنے کی قید لگائی ہے۔ اور شامی نے لکھا ہے کہ مجرد جلوس موجب سہو نہیں ہے یعنی بقدر جلسہ استراحت اگر سہواً کوئی شخص جلسہ کرے تو سجدہ سہو واجب نہیں کیونکہ یہ جلسہ استراحت کا اختلاف بین الشافعیۃ والحنفیۃ اختلاف فی السنیۃ وعدم السنیۃ ہے پس جس نے جلسہ استراحت کی مقدار جلسہ کیا اس نے سہواً ترک سنت کیا اور سجدہ سہو ترک واجب سے ہوتا ہے نہ ترک سنت سے۔ خود مجھے ایسا اتفاق ایک مرتبہ ہو گیا تو میں نے شامی کی رائے کو راجح سمجھ کر اس

پر عمل کر لیا تھا مگر پھر بھی اپنے جی کو اس مسئلہ میں پورا اطمینان نہیں ہے اسلئے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس مسئلہ میں حضور کی کیا تحقیق ہے۔

جواب از مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

الجواب مجھ کو بھی مدت سے تردد ہے مگر عمل اس پر ہے کہ بمجرد جلوس سجدہ سہو کرتا ہوں لا لانہ ترک السنۃ بل لان فیہ التاخیر فی القیام۔ اور ایک تسبیح کی مقدار تو عادۃً جلوس ہو ہی جاتا ہے اس میں ذرا غور کیجئے ۲۰ ر ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ (امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۵۱)

تحقیق! از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم

اقول و باللہ آستعین :۔ عبارات ذیل زیر بحث مسئلے میں قابل غور ہیں:۔

(۱) قال فی ملتقی الا بحر ویجب ان قرای رکوع اوقعود اوقدم رکنا اواخره اوکرره او غیرو اجبا او ترکه کرکوع قبل القرائۃ و تاخیر القیام الی الثالثۃ بزیادۃ علی التشهد، وقال شارمہ العلامہ شیخ زاده واختلفوای مقدار الزیادۃ فقال بعضهم بزیادۃ حرف وکلام المصنف یشیرالی هذا وقال بعضهم بقدر رکن وهوالصحیح کما فی اکثر الکتب (مجمع الانہر ص ۱۴۸ ج ۱)

(۲) وقال تحته شارحه العلامة ابن عابدین بقدر رکن (بالحوالۃ المسطورۃ)

(۳) قال الا مام ظهیر الدین المرغینانی لا یجب بقوله اللهم صل علی محمد وانما المعتبر مقدار مایودی فیه رکنا کذافی الظهیریة (برجندی شرح وقایہ ص ۱۴۹ ج ۱)

(۴) قال ابن البزاز الکردری سهافی صلوته انها الظهر اوالعصر اوغیر ذلک ان تفکر قدر مایودی فیه رکن کالرکوع لزم ان قلیلا فان شک فی صلواة صلاها الخ

(الجامع الوجیز علی ہامش الہندیہ ص ۷۰ ج ۴)

ان تمام عبارات سے مشترکہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاخیر واجب کی مقدار اکثر فقہاء نے یہ قرار دی ہے کہ اتنی دیر تاخیر ہو جائے جس میں کوئی رکن نماز مثلاً رکوع یا سجدہ وغیرہ ادا ہو سکے، اور وہ تین مرتبہ سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیم کہنے کے وقفے میں ہوتا ہے، به صرح الطحطاوی فی حاشیته علی المراقی حیث قال ولم یبینوا قدر الرکن وعلی قیاس ماتقدم ان یعتبر الرکن مع سنته وهو مقدر بثلاث تسبیحات

(طحطاوی ص ۲۵۸ ج ۱)

اس قول کے علاوہ بھی بہت سے اقوال ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے یا تو مرجوح ہیں یا وہ ہیں کہ جن کا مال یہی نکلتا ہے۔

صاحب تنویر الابصار نے اس مسئلہ کو دو جگہ ذکر کیا ہے۔ اور بظاہر دونوں [illegible] معلوم ہوتا ہے، باب [illegible] الصلواۃ میں ان کی [illegible] ہے (فان زاد عامدا کره) فتجب الاعادة (اوساهیا وجب علیه سجود السهواذاقال اللهم صل علی محمد) فقط (علی المذهب) المفتی به لا الخصوص الصلواة بل لتاخیر القیام (شامی ص ۴۷۷ ج ۱) اس کے تحت علامہ شامی نے کئی اقوال نقل کر کے بحر، زیلعی، شرح منیہ کبیری، وغیرہ سے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، اور علامہ رملی اور شرح منیہ صغیری سے وعلی ال محمد کی

زیادتی کا مرجح ہونا ذکر کیا ہے۔

اورباب سجود السہو میں صاحب تنویر فرماتے ہیں (وتاخیر قیام الی الثالثة بزیادة علی التشهد بقدر رکن) اور صاحب درمختار نے لکھا ہے و قیل بحرف وفی الزیلعی الاصح وجوبه باللهم صل علی محمد۔ علامہ ابن عابدین" نے اس تعارض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا (قوله و الزیلعی الخ) جزم به المصنف فی متنه فی فصل اذا اراد الشروع وقال انه المذهب واختاره فی البحر تبعا للخلاصة والخانية والظاهرانه لاینا فی قول المصنف هنا بقدر رکن تامل (شامی ص ۶۹۴ ج ۱) جس سے معلوم ہوا کہ اللهم صل علی محمد اور بقدر رکن دونوں اقوال کا حاصل اور مال ایک ہی نکلتا ہے، تو گویا جس جس نے اللهم صل علی محمد کو مقدار تاخیر قرار دیا ہے اس نے بقدر رکن کے قول کے منافی کوئی بات نہیں کہی، وبالعکس۔

رہی وہ عبارت جو منیة المصلی میں ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی یا تیسری رکعت کے آخر میں بیٹھ جائے تو مطلق بیٹھ جانے ہی سے سجدہ سہو واجب ہو جائے گا، خواہ مقدار رکن بیٹھا ہو یا نہیں۔ اسی طرح اس میں یہ بھی ہے کہ جلسہ استراحت سے سجدہ سہو لازم آجائیگا، (کبیری ص ۴۳۲) سو اس بارہ میں تحقیق وہ ہے جو درمختار اور ردالمحتار میں لکھی گئی وھوہذا:

(۱) قال العلامة الحصکفی فی واجبات الصلواة و ترک قعود قبل ثانية او رابعة وکل زيادة تتخلل بين الفرضين۔ وقال الشامی تحته وکذا القعدة فی اخر رکعة الاولی اوالثالثة فیجب ترکها ویلزم من فعلها ایضا

تاخیر القیام الی الثانیة اوالرابعة عن محله وھذا اذا کانت القعدة طویلة اما الجلسة الخفیفة التی استحبھا الشافعی" فترکھا غیر واجب عند نابل ھوالا فضل۔ (شامی ص ۳۳۸ ج ۱)

(۲) قال فی الدرالمختار و یکبر للنھوض علی صدور قد میه بلا اعتماد و قعود استراحة ولو فعل لا باس، وقال الشامی" تحته قال شمس الائمة الحلوانی الخلاف فی الا فضل حتی لو فعل کما ھو مذ ھبنا لا باس به عند الشافعی ولو فعل کما ھو مذھبه لا باس به عندنا کذافی المحیط اھ قال فی الحلیة والا شبه انه سنة اومستحب عند عدم العذر ویکرہ فعله تنزیھا لمن لیس به عذرا ھ وتبعه فی البحر —— اقول ولا بنا فی ھذا ماقدمه الشارح فی الواجبات حیث ذکر منھا ترک قعود قبل ثانیة ورابعة لا ن ذاک محمول علی القعود الطویل (ردالمحتار ص ۴۷۲ ج ۱)

اسلئے ان عبارات سے معلوم ہوا کہ دو رکعتوں کے درمیان جلسہ خفیفہ عمداً جائز ہے اور شامی" کی تصریح کے مطابق ترک قعود جو واجب ہے، وہ قعود طویل ہے، قصیر نہیں۔ اور درایت کا مقتضی بھی یہی ہے کیونکہ یہ فعل عمداً جائز ہے تو سہواً بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہئے، نیز چونکہ یہ قول "بقدر رکن" کی تقدیر کے مطابق ہے اس لئے اسی کو ترجیح ہونا چاہئے —— اور جب اس درایت کے ساتھ شامی" کی یہ روایت بھی مل گئی تو اس دعوے میں مزید قوت پیدا ہو گئی اور خود علامہ ابراہیم حلبی" کی تصریح علامہ شامی" نے نقل فرمائی ہے کہ عن شرح المنیۃ انه لا ینبغی ان یعدل عن الدرایة ای الدلیل اذاوافقتھا روایة۔

خلاصہ یہ کہ جو مقدار جلسہ استراحت کی شوافعؒ کے یہاں مسنون ہے اس مقدار تک بیٹھنے سے سجدہ سہو لازم نہ آنا چاہئے۔

ھذا ما بدالی واللہ سبحانہ و تعالی اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی غفر اللہ لہٗ
یکم محرم الحرام ۱۳۸۰ھ

الجواب صحیح
بندہ رشید احمد

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

رمضان میں نفل کی جماعت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

۱۹۵۹ء میں ایک صاحب ''محمود حسن'' نے رمضان المبارک میں نفل کی جماعت سے متعلق ایک استفتاء حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اور استفتاء کے ساتھ اسی مسئلہ سے متعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ جواب بھی ارسال کیا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استفتاء جواب کے لئے اپنے فائق اور لائق صاحبزادے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد کیا۔ جو اس وقت دورۂ حدیث میں داخلہ لینے والے تھے۔ گویا کہ اس وقت ان کا ضابطے کا طالب علمانہ دور بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ حضرت مولانا مدظلہم نے اپنے والد محترم کے ایماء پر اس استفتاء کا تحقیقی جواب تحریر فرمایا۔ جو پیش خدمت ہے۔

میمن اسلامک پبلشرز

رمضان میں نفل کی جماعت

الاستفتاء

در خدمت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

س: حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ "الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر" میں شائع ہوا ہے، جس میں رمضان میں تہجد کی نماز تداعی کے ساتھ بھی افضل ہونا درج ہے، اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ نے فتاویٰ رشیدیہ میں رمضان میں تہجد کی جماعت کو اگر بالتداعی ہو، مکروہ تحریمی بتلایا ہے۔ اس کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے قول مرجوح پر مبنی قرار دیا ہے، میں نے بہت سارے حضرات کو لکھا، کسی کے یہاں سے فیصلہ کن جواب موصول نہیں ہوا، بجز حضرت والا کے اس وقت اس کے متعلق کہیں سے مجھے اس کی توقع بھی نہیں ہے، بڑے بڑے کام کے مفتی حضرات چل بسے، مسئلہ زیر بحث بہت اہم ہے۔ اس کی وجہ سے ایک نیا باب بدعت کا کھل جانے کا اندیشہ ہے، خود مجھے بھی تردد پیدا ہو گیا، یہاں گزشتہ رمضان میں پچاس ساٹھ کبھی کبھی سو سے زائد آدمی تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرنے لگے، اس کا اہتمام ہونے لگا، میں نہ شریک ہوا، نہ کسی کو شریک ہونے کو کہا، نہ کسی کو منع کیا۔ البتہ اپنے احباب خود ہی دریافت کرتے تو ان سے کہہ دیتا تھا کہ فقہاء تو مطلق طور پر تداعی کو نوافل میں مکروہ ہی لکھتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں سے کسی کا عمل بھی مجھے اس کے متعلق سننے میں نہیں

حضرت والا ذرا مفصل طور پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کے متعلق کچھ تحریر فرما دیں۔ اگرچہ حضرت والا کو تکلیف ہوگی، لیکن کیا کیا جائے، کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب منسلک ہے۔

کمترین بندہ محمود حسن عفی عنہ

کراچی۔

جواب از حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ

منقول از "شیخ الاسلام نمبر" صفحہ ۵۴ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی

جواب سوال از جماعت نوافل در رمضان غیر تراویح۔ (منقول از مکتوبات مخطوطہ)

"فتح القدیر ج اول، باب الاستسقاء ص ۴۳۸ میں ہے۔

وقد صرح الحاکم ایضا فی باب صلوٰۃ الکسوف من الکافی بقولہ "ویکرہ صلوۃ التطوع جماعۃ ماخلا قیام رمضان وصلوۃ الکسوف، وھذا خلاف ماذکر شیخ الاسلام"

اور ردالمحتار ج ا صفحہ ۵۲۳ پر ہے: "قلت ویؤیدہ ایضا ما فی البدائع من قولہ ان الجماعۃ فی التطوع لیست بسنۃ الا فی قیام رمضان اہ، وفیہ و النفل بالجماعۃ غیر مستحب، لانہ لم یفعلہ الصحابۃ فی غیر رمضان" اہ۔

مذکورہ بالانصوص میں قیام رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے، اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیسری شب تک اور صحابہ کرام سے آخری شب تک نوافل با جماعت پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ موطاامام مالک میں بکثرت مروی ہے، اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھے جائیں، خواہ تراویح ہوں، یا تہجد، اوائل شب میں ہوں، یا اواخر شب میں، جماعت کی اجازت ہوگی۔

موطاامام مالک صفحہ ۱۱۱ میں ہے:

> "قال محمد :وبهذا ناخذ، لاباس بالصلاۃ فی شہر رمضان ان یصلی الناس بامام تطوعا، لان المسلمین قد اجمعوا علی ذلک اہ".

فتح الباری ج رابع صفحہ ۲۱۵ باب "فضل من قام رمضان" میں ہے

"ای قیام لیالیه مصلیا، و المراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، کما قد مناه ی التهجد سواء کان قلیلا اوکثیرا، وذکر النووی ان المراد بقام رمضان صلوة التراویح، یعنی انه یحصل بها المطلوب من القیام، لان قیام رمضان لا یکون الا بها، واغرب الکرمانی فقال :اتفقوا علی ان المراد بقیام رمضان صلوة التراویح اه- قلت :قال انووی المراد بقیام رمضان صلوة التراویح، ولکن اتفاق من این اخذه بل المراد من قیام اللیل مایحصل به یطلق القیام، سواء کان قلیلا او کثیرا،اه، وقال العینی حح ی الجزء الاول صفحه ۲۸۱ من کتاب الایمان من عمدة القاری مانصه، و معنی من قام رمضان من قام بالطاعة ی لیال رمضان ویقال یرید صلوة التراویح، وقال بعضهم، لا یختص ذلک بصلوة التراویح، بل ی ای وقت صلی تطوعا حصل له ذلک الفضل" اه-

نصوص مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوتے ہیں :

(۱) ہر نفل نماز کی جماعت مطلقاً مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

(۲) مستثنیات میں لفظ قیام رمضان اور کسوف کو ذکر کیا ہے۔
(۳) امام محمد، اور حاکم اور صاحب بدائع وغیرہ متقدمین نے (رحمہم اللہ تعالیٰ) لفظ قیام رمضان ذکر فرمایا ہے، جو کہ مخصوص بالتراویح نہیں ہے۔
(۴) قیام رمضان کو مخصوص بالتراویح کرنا قول مرجوح ہے۔ جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اس کے خلاف حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام عینی رحمہما اللہ تعالیٰ قیام رمضان سے تمام نوافل مراد لے رہے ہیں خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو، یا دیگر نوافل۔ اور امام نووی کے قول کو مول قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش فرما دیتے ہیں۔ اور یہی امر مدلول مطابقی بھی ہے۔

بنابریں فتاوی رشیدیہ کی تصریح جلد ثانی صفحہ ۵۹ اور جلد اول صفحہ ۴۹ جس میں مستثنیات کو منحصر تراویح کے ساتھ کیا گیا ہے، قول مرجوح پر مبنی ہے، پس رمضان کی جملہ نوافل کی جماعت، خواہ بالتداعی ہو۔ یا بلا تداعی، سب ماذون فیہ بلکہ مستحب ہونگی، اور "من قام رمضان" کے تحت داخل ہوگی، اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا، بلکہ جملہ طاعات، طواف نفل یا عمرہ نافلہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے۔ کما ذکر العینی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ہم نے حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل بھی مکہ معظمہ میں اسی پر پایا ہے۔ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا۔ اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنت عشریہ وغیرہ کا جو کہ بالخصوص شوافع، اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول بہ تھا، اور اہل مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبوع طواف کا اسی کا موید ہے۔ واللہ اعلم

ننگ اسلاف
حسین احمد غفرلہ
۱۹/ ذی الحجہ ۷۲ ۱۳ھ دار العلوم دیوبند

خط کا جواب از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مکرم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہ معاملہ نفس مسئلہ کی حیثیت سے تو کچھ اہم نہ تھا، لیکن حضرت مولانا مدنی کے فتوی پر تنقید کی حیثیت سے اس کو اتنا مہم بنا دیا کہ اس میں کافی بحث وتحقیق کے بغیر قلم اٹھانا مشکل تھا، رمضان میں مجھ سے بالکل یہ کام نہیں ہوتا، اس لئے اپنے چھوٹے لڑکے محمد تقی سلمہ کو جو اس سال دورۂ حدیث میں شریک ہونے والا ہے، یہ مسئلہ حوالے کیا، خیال یہ تھا کہ اس کو مشق ہوگی، اور کتابوں کے حوالے یہ نکال کر پیش کر دے گا تو پھر میں کچھ لکھوں گا، مگر ماشاء اللہ یہ لڑکا ذہین ہے، اس لئے تمام کتابوں کے حوالے بھی بغیر میری کسی امداد کے نکالے۔ پھر ان کے اقتباسات لے کر خود ہی ایک تحریر لکھ دی، اب جو تحریر دیکھی تو میری نظر میں بالکل کافی وافی تھی، اس لئے اسی پر تصدیق لکھ دی، وہ بھیج رہا ہوں۔

والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۴/ شوال ۱۳۷۸ھ

جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

الجواب وھوالموفق للصواب

تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو تو بہر صورت مکروہ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں، یا غیر رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء و محدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتوی اور تعامل رہا ہے۔

(۱) بدائع الصنائع میں ہے:

"اذا صلوا التراویح ثم ارادوا ان یصلوها ثانیا یصلون فرادی لا بجماعة، لان الثانیة تطوع مطلق والتطوع المطلق بجماعة مکروه۔ (بدائع ج ۱ ص ۲۹۰)

علامہ ابن نجیم" فرماتے ہیں:

"ولو صلوا التراویح، ثم ارادوا ان یصلوها ثانیا یصلون فرادی" اه

(البحرالرائق ج ۲ ص ۷۴)

فتاوی عالمگیریہ میں ہے:

ولو صلوا التراویح ثم ارادوا ان یصلوها ثانیا یصلون فرادی "کذافی التتارخانیة" (عالمگیریہ ج ۱ ص ۱۲۳)

فتاوی بزازیہ میں ہے:

صلوا بجماعة، ثم ارادوا اعادتها بالجماعة یکره، لان النفل بجماعة علی التداعی یکره الا

بالنص " اه۔

(بزازیہ علی حاشیۃ الہندیہ، ج ۴ ص ۳۱)

مذکورۃ الصدر نصوص سے معلوم ہوا کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ جائز نہیں، اور بدائع وفتاوی بزازیہ میں اس کی علت کی تصریح بھی فرمادی گئی کہ دوسری مرتبہ پڑھی جانے والی تراویح نفل مطلق (یعنی وہ نفل جس کے اندر جماعت کی نص نہیں ملتی) ہو جائے گی، اور نفل مطلق جماعت کے ساتھ مکروہ (تحریمی) ہے، تو معلوم ہوا کہ حضرات فقہاءؒ کے نزدیک نفل کی جماعت (علی التداعی) بہر صورت مکروہ ہے۔ خواہ رمضان میں ہو۔ یا غیر رمضان میں۔ کیونکہ اگر رمضان کی نفلیں علی الاطلاق اس حکم سے مستثنیٰ ہوتیں تو تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز نہ ہوتا، کما ھو ظاہر۔

(۲) علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاریؒ خلاصۃ الفتاوی میں تحریر فرماتے ہیں:

"ولوزاد علی العشرین بالجماعۃ یکرہ عندنا بناء علی ان صلوۃ التطوع بالجماعۃ مکروہ"

(خلاصۃ الفتاوی، ج ۱ ص ۶۳)

اگر رمضان کی نفلیں جماعت کے ساتھ علی الاطلاق جائز ہوتیں تو بیس سے زیادہ رکعتیں بالجماعۃ مکروہ نہ ہوتیں۔

(۳) در مختار میں ہے:۔

ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعۃ خارج رمضان ای یکرہ ذلک لو علی سبیل التداعی بان یقتدی اربعۃ بواحد، کما فی الدرر"

(شامی ج ۱ ص ۶۶۳)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

والنفل بالجماعۃ غیر مستحب، لانہ لم تفعلہ

الصحابۃ فی غیر رمضان (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۶۴)

علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

الجماعة فی التطوع ليست بسنة الا فی قيام رمضان وفی الفرض واجبة اوسنة موكدة"
(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۹۸)

محقق ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

وقد صرح الحاكم ايضا فی باب صلوة الكسوف من الكافی بقوله "ويكره صلوة التطوع جماعة ماخلا قيام رمضان و صلاة الكسوف" (فتح القدیر ج ۱ ص ۴۳۸)

نصوص مذکورہ بالا میں صلوٰۃ النفل بالجماعۃ کی کراہت کے حکم سے قیام رمضان کو مستثنیٰ کیا گیا، اور تراویح کے بجائے قیام رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے عموم سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم صرف غیر رمضان کے لئے مخصوص ہے، لیکن دراصل یہ قیام رمضان کا لفظ (عرف فقہاء کے اعتبار سے بالخصوص مسئلہ جماعت میں) عام نہیں، بلکہ تراویح کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ ہم عنقریب بالتفصیل بیان کریں گے، واللہ الموفق۔

(۴) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ شرح موطا میں فرماتے ہیں کہ:۔

قال الزرقانی رحمه الله ظاهره (ای حديث افضل الصلوة صلوتكم فی بيوتكم الا المكتوبة) يشمل كل نفل، لكنه محمول على مالا يشرع له التجميع كالتراويح والعيدين، اه
(اوجز المسالک ج ۲ ص ۷)

حضرت الشیخ مولانا خلیل احمد سہانپوری" شرح ابو داؤد میں لکھتے ہیں :

فان خیر صلاة المرء وھذا عام لجمیع النوافل و السنة الا النوافل التی من شعائر الاسلام کالعیدین و الکسوف والاستسقاء، قلت: وھذا یدل علی ان صلوة التراویح ی البیت افضل، و الجواب عن الذین قالوا با فضلیتھما ی المسجد جماعة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ذلک لخوف الافتراض، فاذا زال الخوف بوفاته علیه السلام ارتفع المانع، وصار فعله ی المسجد افضل، فاشبه صلاة العید"

(بذل المجہود ج ۲ ص ۳۳۶)

ان نصوص میں لفظ تراویح استعمال کیا گیا ہے۔ قیام رمضان نہیں کہ اس کے عموم سے عموم حکم کا شبہ ہو۔

(۵) عنایہ شرح ھدایہ میں ہے :۔

(فصل ی قیام شھر رمضان) ذکر التراویح ی فصل علی حدة لاختصاصھا بمالیس لمطلق النوافل"

(عنایۃ علی ہامش الفتح ج ۱ ص ۳۳۳)

البحرالرائق میں ہے :۔

(تحت قول الکنز "وسن ی رمضان عشرون رکعة" الخ) بیان لصلوة التراویح، وانمالم یذکرھامع السنن الموکدة قبل النوافل المطلقة لکثرة شعبھا ولا ختصا صھا بحکم من بین سائر السنن و النوافل وھوالاداء بجماعة"

(البحرالرائق ص ۷۱ ج ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا جماعت سے ادا کیا جانا تمام سنن ونوافل کے مقابلے میں اس کی خصوصیت ہے۔

(۶) فتاوی قاضیخان میں ہے:

ویستحب اداء ها (ای التراویح) بالجماعة، وقال مالک رحمه الله والشافعی رحمه الله فی القدیم: الانفراد افضل کسائر السنن، انتهی- وفیه بعد ذلک- والصحیح ان اداء ها بالجماعة فی المسجد افضل، لان فیه تکثیرا للجماعة، وکذلک فی المکتوبات"

(خانیہ علی حاشیہ الہندیہ ج۱ ص ۲۱۳)

پہلی نص میں اشارہ فرمادیا گیا کہ تراویح اور چند اور منصوص سنن کے علاوہ تمام سنن میں ہم بھی شوافع وغیرھم کے قدیم قول سے متفق ہیں کہ اس میں انفراد افضل ہے۔ دوسری نص میں فرمایا گیا کہ تراویح اس حکم میں مکتوبات کی شریک ہے، اگر رمضان کی بقیہ نفلوں میں بھی جماعت جائز ہوتی تو تصریح کر دی جاتی۔

(۷) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

" جماعت نوافل کی سوائے ان مواقع کے کہ حدیث سے ثابت ہیں، مکروہ تحریمی ہے، فقہ میں لکھا ہے کہ اگر تداعی ہو، اور مراد تداعی سے چار آدمی کا ہونا ہے، پس جماعت صلوۃ کسوف، استسقاء، تراویح کی درست اور باقی سب مکروہ ہیں، کذا فی کتب الفقہ"

(فتاوی رشیدیہ ص ۲۸۹)

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ شبینہ کے مفاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مثلاً اگر تراویح کے بعد یہ عمل ہو تو نفل کی
جماعت مجمع کثیر کے ساتھ ہونا، جو کہ مکروہ ہے"

(امداد الفتاوی ص ۳۰۰ ج ۱)

ان حضرات نے بالکل تصریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا کہ نفل کی جماعت (تراویح کے سوا) رمضان میں بھی اسی طرح ناجائز ہے جس طرح غیر رمضان میں۔

(۸) ان روایات کے علاوہ درایت بھی اس کی مقتضی ہے کہ نفل با جماعت رمضان میں بھی جائز نہ ہو، اس لئے کہ تراویح کی جماعت خلاف قیاس ہے کیونکہ تراویح تطوعات میں سے ہے۔ اور تطوعات میں اخفاء مطلوب ہے۔ برخلاف فرائض کے اسی لئے تطوعات کو نہ صرف بلا جماعت، بلکہ گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

صلوة المرء ى بيته افضل من صلوته ى
مسجدى هذا الا المكتوبة"

تو ثابت ہوا کہ تراویح کی جماعت خلاف قیاس ہے۔ اور یہ اصول کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ "امر خلاف قیاس اپنے مورد پر منحصر رہتا ہے" اس پر قیاس کر کے کسی دوسرے مسئلے کو اسی کے حکم میں کر دینا جائز نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوافل میں جماعت کا مورد کیا کیا ہیں؟ نوافل میں جماعت کا مورد صلوٰۃ الکسوف، صلاۃ الاستسقاء اور صلوٰۃ العیدین (علی قول من عدھما من النوافل) اور صلوۃ التراویح ہیں، رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں کہیں کسی سے جماعت منقول نہیں۔ البتہ ایک دو روایتیں اس قسم کی ملتی ہیں۔ لیکن وہاں پر جماعت لا علی سبیل التداعی ہے۔ جو بالاتفاق بہم صورت جائز ہے، مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وہ مشہور واقعہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں مشغول تھے، تو میں آپ کے بائیں پہلو میں

جا کر کھڑا ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (ایک روایت کے مطابق ہاتھ سے) پکڑ کر دائیں جانب گھما دیا، اس میں مقتدی صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز کی تقریر ترمذی میں ہے کہ:

"وبين التراويح و التهجد فى عهده عليه السلام لم يكن فرق فى الركعات، بل فى الوقت و الصفة اى التراويح تكون بالجماعة فى المسجد، بخلاف التهجد"

(العرف الشذی ص ۲۳۰ ج ۱)

اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں

"اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرداً پڑھتے تھے، کبھی بہ تداعی جماعت نہیں فرمائی، اگر کوئی شخص آ کھڑا ہوا تو مضائقہ نہیں، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما خود ایک دفعہ آپ کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تھے، بخلاف تراویح کے کہ اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کر کے ادا کیا"

(فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۰۷)

جب یہ معلوم ہو گیا کہ نفل کی جماعت صرف تراویح، کسوف، استسقاء اور عیدین میں مشروع ہے تو بحکم مقدمہ ثانیہ دوسری نوافل مثلاً تہجد وغیرہ میں اس حکم کو متعدی نہ کیا جائے گا، کیونکہ اس میں جماعت منقول و ماثور نہیں۔ لہٰذا منصوصہ نوافل کے علاوہ تمام نوافل میں خواہ وہ رمضان میں ہوں، یا غیر رمضان میں، جماعت بالتداعی مکروہ تحریمی ہوگی۔

قیام رمضان کی تحقیق

حضرت شیخ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال میں وہ نصوص پیش فرمائی ہیں، جو نمبر ۳ میں اوپر گزریں، اور اس کے علاوہ موطا امام مالک کی ایک عبارت پیش فرمائی ہے۔ ان سب میں مستثنیات میں "قیام رمضان" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ عینیؒ اور علامہ عسقلانیؒ کی عبارتیں پیش کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیام رمضان سے مراد صرف تراویح نہیں، بلکہ "ما یحصل بہ القیام" مطلقاً مراد ہے، اور پھر نتیجہ دونوں کو ملا کر یہ نکالا ہے کہ فقہاء نے قیام رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور عینی و عسقلانی کی عبارتوں سے اس کا عموم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا رمضان کی ہر نفل میں جماعت جائز ہے۔

لیکن قیام رمضان کا لفظ لغوی اعتبار سے تو بیشک عام ہے، مگر عرف عام فقہاء اور عام محدثین کا یہ ہے کہ اس کو صرف تراویح میں خاص کرتے ہیں۔ اور تراویح کے بجائے قیام رمضان کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ ھدایہ کی شرح میں علامہ بابرتیؒ نے یوں نقل کی ہے:

"وترجم بقیام رمضان اتباعا للفظ الحدیث قال صلی اللہ علیہ وسلم :ان اللہ تعالی فرض علیکم صیامہ و سننت لکم قیامہ"

(عنایۃ علی حاشیۃ الفتح ص ۳۳۳ ج ۱)

(۱) فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا مطلب (کہ قیام رمضان کے علاوہ دوسرے نوافل کی جماعت مکروہ ہے) عمدۃ القاری اور فتح الباری سے اخذ کرنے کے بجائے بہتر اور انسب یہ ہے کہ خود فقہاء کی عبارتوں سے اخذ کیا جائے، جو مسئلہ زیر بحث میں نص کا درجہ رکھتی ہیں۔ بخلاف عمدۃ القاری اور فتح الباری کے، کہ ان کے پیش نظر اس مقام میں جماعت کی بحث نہیں، بلکہ حدیث "من قام رمضان ایمانا" کی تشریح ہے، اس لئے ہم یہاں فقہاء کی چند وہ عبارتیں

پیش کرتے ہیں، جو مسئلہ جماعت میں نص ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسئلہ جماعت میں قیام رمضان سے مراد تراویح ہی ہے :

(الف) علامہ مرغینانیؒ نے ھدایہ میں "فصل فی التراویح" کی جگہ "فصل فی قیام رمضان" کا عنوان لگا کر تراویح کے مسائل ذکر فرمائے ہیں، اور شارحین ھدایہ مثلاً محقق ابن ہمامؒ نے اس عنوان کے تحت قیام رمضان کی تشریح کرنے کے بجائے تراویح کی تفسیر شروع کر دی :

(فصل فی قیام رمضان) التراویح جمع ترویحة" (فتح القدیر ص ۳۳۳ ج ۱)

اور علامہ بابرتیؒ نے یہی عنوان لگا کر تراویح کو سنن ونوافل سے علحدہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کرنی شروع کر دی۔ (جیسا کہ اوپر نمبر ۵ میں گزرا)

(عنایہ بحوالہ مذکور)

(ب) ملک العلماء علامہ کاسانیؒ نے بدائع میں جہاں قیام رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، وہیں آگے چل کر دلالۃ اس کی تشریح فرما دی ہے۔ کہ مراد تراویح ہے، آپ نے فرائض ونوافل کے درمیان مابہ الفرق امتیازات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

و منها ان الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان، وفی الفرض واجبة اوسنة موکدة"

پھر دو ہی سطروں کے بعد اس فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا :-

"و انما عرفنا الجماعة سنة فی التراویح بفعل رسول الله صلی الله علیه وسلم و اجماع الصحابة" (بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۹۸)

اس کے علاوہ وہ مسئلہ کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز ہے۔ اس سے بھی ثابت یہ ہوتا ہے کہ صاحب بدائع نے قیام رمضان سے مراد تراویح لی ہے، اور جماعت نفل کو رمضان و غیر رمضان دونوں میں ناجائز قرار دیتے ہیں، وھو ظاھر۔

(ج) علامہ شمس الائمہ سرخسی" فرماتے ہیں :۔

الفصل الخامس ى كيفية النية و اختلفوا فيها، و الصحيح ان ينوى التراويح اوقيام الليل"

(مبسوط للسرخسی ص ۱۴۵ ج ۲)

(د) فتاوی قاضیخان میں ہے :

"ان نوى التراويح اوسنة الوقت او قيام الليل ى رمضان جاز"

(خانیہ علی حاشی عالگیریہ ص ۲۱۶ ج ۱)

گویا قیام اللیل فی رمضان اور تراویح دونوں ہم معنی لفظ ہیں، تراویح کی نیت کرتے وقت تراویح کا لفظ استعمال کر لو، یا قیام رمضان کا، برابر ہے۔

(جواب نمبر ۲) احادیث و آثار میں بھی جہاں قیام رمضان کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں پر اس سے تراویح ہی مراد لیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ نہیں مثلاً :

(الف) عن سلمان الفارسى رضى الله عنه قال خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ى اخر يوم من شعبان، فقال : يا ايها الناس، قد اظلكم شهر عظيم شهر مبارك، شهر فيه ليلة خير من الف شهر، جعل الله صيامه فريضة و قيامه تطوعا"

اور سنن نسائی کی روایت میں ہے کہ :۔ "افترض الله علیکم صیامه و سننت لکم قیامه" یہاں پر "قیام" سے مراد تراویح کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قیام سے اگر تہجد مراد لیا جائے گا، تو "قیامه تطوعا" کا یہ جملہ بیکار ہو جائے گا، اس لئے کہ تہجد کے تطوع ہونے میں رمضان کی کیا تخصیص ہے؟ وہ تو غیر رمضان میں بھی تطوع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں "قیام" سے مراد تراویح ہی ہے، اور اس "قیام" سے تراویح ہی مراد لینے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کے اثبات میں نقل فرماتے ہیں۔ (کما فی الفتح ص ۳۳۳ ج ۱، و البزازیہ ص ۳۱، و مراقی الفلاح علی ہامش الطحطاوی علی المراقی، ص ۲۲۴)

(ب) "عن السائب بن یزید الصحابی قال: کانوا یقومون علی عهد عمر رضی الله عنه بعشرین رکعة و علی عهد عثمان و علی رضی الله عنهما مثله" (عمدة القاری بحوالہ بیہقی ص ۲٦۷ ج ۵)

اس حدیث کا سیاق و سباق واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں قیام سے مراد تراویح ہے، اور حنفیہ رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کی بیس رکعت ہونے پر استدلال میں پیش کرتے ہیں۔ (کمافی العمدة)

(۳) عام طور پر شراح حدیث بھی قیام رمضان سے مراد تراویح ہی لیتے ہیں چنانچہ:

(الف) صحیح مسلم میں اس طرح عنوان قائم فرمایا گیا ہے: (اگرچہ وہ تراجم امام مسلم کے قائم کردہ نہیں ہیں، تاہم یہ تراجم مستند محدثین نے لگائے ہیں)

"باب الترغیب فی قیام رمضان وهوالتراویح" (صحیح مسلم ص ۲۵۹ ج ۱)

(ب) حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز تقریر ترمذی میں لکھتے

ہیں:-

"باب ماجاء ی قیام شهر رمضان ای التراویح" (العرف الشذی ص ۳۲۹ ج ۱)

(ج) حضرت شیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تقریر ترمذی میں نص فرماتے ہیں:

باب ی قیام شهر رمضان، هذا القیام کان عاما ثم اختص بالتراویح، فمطلقه یراد به التراویح"

(الکوکب الدری ص ۳۶۷ ج ۱)

(د) موطاامام محمدؒ کی وہ عبارت جو مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کے سیاق وسباق سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں پر جو امام محمدؒ نے قیام شہر رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد تراویح ہی ہے۔ عبارت یہ ہے:

"قال محمد :و بهذا کله ناخذ، لاباس بالصلوٰة ی شهر رمضان ان یصلی الناس تطوعا بامام، لان المسلمین قد و اجمعوا علی ذلک"

اس مسئلہ کی جو دلیل پیش کی گئی ہے (یعنی مسلمانوں کا اجماع) وہ صرف تراویح ہی

پر صادق آتی ہے۔ غیر تراویح پر نہیں، کیونکہ غیر تراویح میں جماعت پر اجماع تو درکنار، اس کا نفس ثبوت ہی منقول نہیں، اس لئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوار مبارکہ میں کہیں غیر تراویح میں بالتداعی جماعت نفل کا ثبوت نہیں ملتا۔

بہر کیف! ان تمام نصوص سے۔ جو ہم نے اس سلسلے میں اب تک پیش کیں، کم از کم اتنی بات تو بہر صورت ثابت ہو جاتی ہے کہ جہاں فقہاء وغیرہ نے قیام رمضان کو کراھت جماعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، وہاں پر تراویح ہی مراد لیا ہے۔ اگرچہ فی نفسہ "قیام رمضان" کا لفظ جو حدیث "من قام رمضان الخ" میں مذکور ہے۔ وہ ہر نماز اور فعل طاعت کو عام اور شامل ہے۔

مسئلہ زیر بحث اور علامہ عینیؒ

مندرجہ بالا عبارتیں وغیرہ تو اس بارے میں تھیں کہ "قیام اللیل فی رمضان" جس میں جماعت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس سے مراد تراویح ہی ہے، لیکن چند شراح حدیث نے قیام رمضان کو عام قرار دیا، جیسا کہ شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ جن کی عبارت کا حوالہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ قیام اللیل فی رمضان عام ہے۔ تراویح وغیر تراویح سب کو، "مایحصل به القیام مطلقا" کے تحت قیام رمضان میں داخل مانا جائے گا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آجائے گی کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول حدیث "من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله" کی تشریح کے تحت آیا ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہے کہ قیام رمضان پر جو ثواب اس حدیث میں موجود ہے، وہ صرف تراویح ہی پر نہیں۔ بلکہ مطلق ہر نماز پر جو رمضان کی رات میں ادا کی جائے، ثواب حاصل ہو گا، اس جگہ اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ جماعت سے ادا کی جائے، یا بلا جماعت ــــ یہی وجہ ہے کہ یہاں علامہ عینی رحمتہ اللہ علیہ نے مسئلہ جماعت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اس مسئلہ کا ذکر علامہ عینی رحمتہ اللہ علیہ نے "باب صلوٰۃ اللیل" میں کیا ہے، اس میں ان کی عبارت یہ ہے۔

(حدیث : "صلوا ایها الناس فی بیوتکم، فان افضل الصلوۃ صلوۃ المرء فی بیته" کے تحت فرماتے ہیں) :

و استثنی من عموم الحدیث عدة من النوافل ففعلها فی غیر البیت اکمل، وھی ماتشرع فیها الجماعة، کالعیدین، والاستسقاء، والکسوف،

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں :

"قال الامام حمید الدین الضریر : نفس التراویح سنة، اما اداء ها بالجماعة فمستحب"

پھر ایک سطر کے بعد ہے :

وفی جوامع الفقه :التراویح سنة موکدة، والجماعة فیها واجبة، وفی الروضة لا صحابنا ان الجماعة فضیلة، وفی الذخیرة لا صحابنا عن اکثر المشایخ ان اقامتها بالجماعة سنة علی الکفایة"

(عمدۃ القاری، ص ۲۶۷ ج ۵)

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں قیام رمضان کے عموم کو ذکر کیا ہے۔ وہاں مسئلہ جماعت ذکر نہیں کیا۔ اور جہاں مسئلہ جماعت بیان فرمایا ہے۔ وہاں مستثنیات میں قیام رمضان کو ذکر نہیں کیا، بلکہ بلفظ تراویح ذکر فرمایا ہے۔ لہٰذا ان کے قول سے کہ قیام شہر رمضان کا لفظ عام ہے، تراویح کے سوا دوسری نوافل رمضان کی جماعت جائز ہونے پر استدلال غیر صحیح ہے،

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس بحث میں در حقیقت فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے، البتہ کلام اس میں ہے کہ حدیث "من قام رمضان ایماناً میں جو فضیلت موجود ہے۔ وہ صرف تراویح کے لئے مخصوص ہے، یا مطلق صلوٰۃ پر وہ فضیلت حاصل ہوگی؟ اس میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عموم کا قول اختیار فرمایا ہے۔ اور علامہ نووی اور علامہ کرمانی رحمہما اللہ نے دوسرا (علی ماذکرہ العینی") اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ جو جماعت دیوبند میں ابو حنیفہ عصر کا لقب رکھتے تھے، ان کا فتویٰ جمہور علماء و فقہاء کی تحقیق کے عین مطابق ہے، اس کو قول مرجوح پر عمل قرار دینا فہم عاجز سے بالا تر ہے۔ رہا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی" اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل، تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تو معلوم نہیں، البتہ حضرت شیخ الہند" کے متعلق اتنی بات یقین کے درجہ میں معلوم ہے کہ آپ نے شروع میں تہجد کی جماعت لا علی سبیل التداعی ایک دو افراد کے ساتھ کی ہے۔ لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے تو اسی کراہت کی وجہ سے آپ نے ساری رات تراویح کا معمول بنا لیا تھا، عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے، اور تراویح ہی سحری کے وقت ختم کی جاتی تھی، جس کے شاہد دیوبند میں آج بھی سیکڑوں حضرات ہوں گے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

ایک ضروری گزارش

آخر میں یہ گزارش ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی عظمت شان، جلالت قدر اور علمی تبحر کے پیش نظر تو اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کی جرات کسی بڑے عالم کو بھی نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا طفل

مکتب اس پر کچھ لکھے۔ لیکن الحمد للہ جماعت دیو بند کی خصوصیت اور انہیں بزرگوں کی تعلیم و تلقین نے ہمیں یہ صراط مستقیم دکھائی کہ مسائل شرعیہ میں آزادانہ اظہار رائے ترک ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہار خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے۔ اس لئے بنام خدا تعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھے واضح ہوا وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنی ترک ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں، آمین۔

اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه، وارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه، و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

احقر العباد
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
متعلم دارالعلوم کراچی نمبرا
۳۔/ شوال ۱۳۷۸ھ ۱۲/اپریل ۱۹۵۹ء

لله در المجيب حيث اصاب فيما اجاب و اجاد فيما افاد، مع ملاخطة ادب الاكابر، وفقه الله تعالى لما يحب و يرضى

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
صدر دارالعلوم کراچی نمبرا

بنکوں اور مالیاتی اداروں سے

زکوٰۃ کا مسئلہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِن شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ

فہرست مضامین

صفحہ | مضامین

الله

عرض ناشر

جس زمانے میں حکومت نے زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کے نفاذ کا اعلان کیا تھا، اور اس آرڈیننس اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس پر غور کرنے کے لئے مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے تین اجلاس ہوئے جن میں:

- حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ۔ مفتی ومہتمم دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی،
- حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ۔ مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی،
- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب۔ مفتی دارالعلوم کراچی،
- حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب۔ استاذ و ناظمِ تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔
- حضرت مولانا مفتی سبحان محمود صاحب۔ مفتی وشیخ الحدیث دارالعلوم کراچی ۱۴
- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب۔ معین مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴،

مجلس کی طرف سے جو متفقہ تحریر تیار کی گئی تھی وہ پیش خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"ان الذین یکسبون الاثم سیجزون ما کانو ایقترفون" (سورۃ الانعام: ۱۲۰)

یعنی جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، قیامت کے روز
ان کے ان اعمال کی سزا دی جائے گی جو وہ لوگ یہاں پر کیا کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت کا
بینکوں اور مالیاتی اداروں سے
زکوٰۃ وصول کرنے کا شرعی حکم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اما بعد!

حکومتِ پاکستان نے سرکاری سطح پر زکوٰۃ اور عشر کی وصولی اور تقسیم کے لئے ایک آرڈیننس نافذ کیا ہے، جس کے ذریعے مسلمانوں پر واجب الأداء زکوٰۃ کا ایک حصّہ حکومت وصول کرکے اس کی تقسیم کا انتظام کرے گی۔

زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمّہ داری ہے۔ اور اگر حکومت یہ انتظام ٹھیک ٹھیک شرعی احکام کے مطابق قائم کرنے

میں کامیاب ہوجائے تو یہ نفاذِ شریعت کی طرف ایک نہایت مُثبت قدم ہوگا اور انشاء اللہ اس ملک کے مسلمان اس کی دنیوی اور اُخروی برکات سے بہرہ ور ہوسکیں گے، لیکن اس نظام کو سرکاری سطح پر جاری کرتے وقت حکومت کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ اسلامی معیشت کے قیام کے لئے جتنا ضروری اور اہم ہے اُتنا ہی نازک اور توجّہ طلب بھی ہے۔ زکوٰۃ دوسرے محاصل یا ٹیکسوں کی طرح کوئی ٹیکس نہیں ہے، بلکہ یہ وہ عظیم الشّان عبادت ہے جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رُکن قرار دی گئی ہے۔ لہٰذا اس میں عبادت اور اطاعتِ خداوندی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اپنے ذمّے لے کر ایک ایسی گراں بار اور نازک ذمّہ داری اپنے سر لے رہی ہے جو اس کے دینی جذبے، اس کے اخلاص اور اس کے حُسنِ انتظام کے لئے ایک زبردست آزمائش اور امتحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حکومت کو ایک طرف تو اس بات کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کسی مسلمان کے ساتھ زکوٰۃ کی وصولی میں کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے، اور جتنی رقم اس کے ذمّے شرعاً واجبُ الاداء ہے اس سے ایک پائی بھی زائد وصول نہ ہو، کیونکہ حدیث پاک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

﴿ اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَۃِ کَمَانِعِھَا ﴾

"یعنی زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا ایسا ہی گنہگار ہے جیسے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا"۔

اور دوسری طرف اس بات پر کڑی نظر رکھنی ہوگی کہ زکوٰۃ سے حاصل ہو نے والی یہ مقدّس رقوم ٹھیک شریعت کے مطابق اس کے صحیح مستحقّین تک

پہنچیں' اور اس میں کوئی خیانت' خرد بُرد' بدعنوانی یا شرعی احکام سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ زکوٰۃ کے تقدّس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے مَصَارِف کا تعیّن انبیاء علیہم السلام پر بھی نہیں چھوڑا' بلکہ اُسے بذاتِ خود قرآن کریم میں متعیّن فرمادیا ہے' چنانچہ جب تک زکوٰۃ کو ان مَصَارِف پر صحیح طور سے خرچ کرنے کا اطمینان بخش انتظام نہ ہوجائے' زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اگر حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم دونوں کا نظام صحیح طور سے مقرر کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ اس کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا' جس کی برکات انشاء اللہ کھلی آنکھوں محسوس ہوں گی!

لیکن اگر خدا نخواستہ زکوٰۃ کی ان مقدّس رقوم کو مستحقّین تک پہنچانے کا انتظام صحیح نہ ہوسکا تو کروڑوں مسلمانوں کی عبادت خراب ہونے کا وبال بھی حکومت پر دنیا و آخرت میں بڑا سنگین ہوسکتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو اس کڑی آزمائش میں پورا اترنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے اور اس نازک مرحلے کو اس کے لئے آسان فرمائے' آمین۔

لیکن اس مقصد کے حصول کیلئے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ زکوٰۃ و عشر کا جو قانون نافذ کیا گیا ہے' وہ شرعی اعتبار سے درست ہو اور اس میں شرعی لحاظ سے کوئی سُقم باقی نہ رہے۔ اور دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس قانون کے مطابق عمل بھی درست ہو۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے اجلاس میں حالیہ زکوٰۃ و عشر آرڈیننس پر غور کیا گیا اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینے کے بعد مندرجۂ ذیل تبصرہ اتفاقِ رائے کے ساتھ منظور کیا گیا۔

نصابِ زکوٰۃ:

اس آرڈیننس کی سب سے زیادہ سنگین غلطی یہ ہے کہ اس میں ہر اس

شخص پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم کردی گئی ہے، جس کے بینک اکاؤنٹ میں زکوٰۃ منہا کرنے کے دن ایک ہزار روپے سے زائد رقم جمع ہو۔ اور بینکوں کے علاوہ دوسرے مالیاتی اداروں میں یہ ایک ہزار روپے کی قید بھی نہیں ہے، بلکہ ان اثاثوں کے حامل افراد کو ان کے اثاثوں کی مالیت کا لحاظ کئے بغیر لازمی طور پر زکوٰۃ کا مستوجب قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ شرعی لحاظ سے انتہائی سنگین غلطی ہے۔ اور عملاً اس قانون سے بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوسکتی ہے کہ ان پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے باوجود اُن سے زکوٰۃ وصول کرلی جائے۔

شریعت کی رُو سے زکوٰۃ صرف اس شخص پر فرض ہے جو نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی ہی مالیت کی نقدی یا سونے یا مالِ تجارت کا مالک ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر اس کی ملکیت میں ہو، البتہ اگر کسی شخص کے پاس سونے کے سوا کوئی چیز موجود نہ ہو تو اس کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے۔ پھر اگرچہ شرعاً زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر رقم پر علیٰحدہ سال پورا ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ سال کی ابتداء میں اور آخر میں کم از کم بقدرِ نصاب مالیت کا مالک رہا ہو، آرڈیننس میں زکوٰۃ کی ان بنیادی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

لہٰذا اگر نظامِ زکوٰۃ کو واقعۃً شرعی اصولوں کے مطابق قائم کرنا ہے تو آرڈیننس میں ایسی ترمیم ناگزیر ہے، جس کی رُو سے زکوٰۃ صرف انھی افراد سے وصول کی جاسکے جن کے ذمّے شرعاً زکوٰۃ فرض ہے۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ دفعہ ۲ ذیل ۲۳ میں "صاحبِ نصاب" کی جو تعریف لکھی گئی ہے یعنی :

> "صاحبِ نصاب سے مُراد وہ شخص ہے جس کے ذمّے اس آرڈیننس کی رُو سے زکوٰۃ واجبُ الاداء ہو"۔

اسے تبدیل کرکے "صاحبِ نصاب" کی تعریف اس طرح کی جائے :

"صاحبِ نصاب سے مُراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامانِ تجارت ہو' یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو"۔

پھر ہر سال تاریخِ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس کی قیمت کو وصولیٔ زکوٰۃ کا معیار مقرر کیا جائے' یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اُتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

سال گزرنے کا مسئلہ

زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مقدارِ نصاب پر پورا سال گزر چکا ہو۔ پورا سال گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ صاحبِ نصاب ہوجائے اور سال کے اختتام پر صاحبِ نصاب رہے (درمیان سال اگرچہ نصاب سے کم رہ جائے' البتہ بالکل ختم نہ ہو) تو سال کے اختتام پر جتنی بھی رقم اس کی ملکیت میں ہوگی اس ساری رقم پر شرعاً زکوٰۃ واجبُ الاداء ہوتی ہے' خواہ اس رقم کا کچھ حصّہ ایک دن پہلے ہی اس کی ملکیت میں آیا ہو۔ لہٰذا ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہے۔

موجودہ آرڈیننس کے تحت ایسی صورتیں عملاً ممکن ہیں کہ جس تاریخ میں کسی شخص کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع کی جائے' اس سے صرف چند روز پہلے ہی وہ صاحبِ نصاب بنا ہو' ایسی صورت میں اس سال ایسے شخص سے جبراً زکوٰۃ

وضع کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

لہٰذا آرڈیننس میں ایسی گنجائش موجود ہونی چاہیئے کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کردے کہ اُسے مقدارِ نصاب کا مالک بنے ہوئے سال پورا نہیں ہوا تو اس کی زکوٰۃ وضع نہ کی جائے!

قرضوں کا مسئلہ

آرڈیننس میں قرضہ جات کو قابلِ زکوٰۃ مالیت سے منہا کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس سلسلے میں فقہائے امّت کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر طرح کے قرضے زکوٰۃ سے منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ کا قدیم قول بھی یہی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک قرضے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ سے مانع ہیں، اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ سے نہیں۔ اور امام شافعیؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ کسی بھی طرح کا قرض زکوٰۃ سے منہا نہیں ہوگا۔ (ملاحظہ ہو المجموع شرح المہذب صفحہ ۳۱۳ و ۳۱۴ جلد ۵)

موجودہ حالات ایسے ہیں کہ جس کسی شخص نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کوئی قرض لیا ہو، اس کو زکوٰۃ سے منہا نہ کرنا اس شخص پر زیادتی ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ ہمیشہ اہلِ علم کے نزدیک زیرِ غور رہا ہے کہ آج کل بڑے بڑے سرمایہ دار اپنی پیداواری اغراض کے لئے جو قرضے لیتے ہیں، اگر اُن سب کو منہا کیا جائے تو اُن پر بعض صورتوں میں شاید کبھی بھی زکوٰۃ واجب نہ ہو، جو مقاصدِ شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے ایسے قرضوں کے بارے میں اگر امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ زکوٰۃ سے منہا نہیں کئے جائیں گے تو یہ مناسب ہے۔

۱۲ر ربیع الأول ۱۳۹۹ ہجری کو زکوٰۃ آرڈیننس کے جس مسوّدے کو رائے

عامّہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا تھا' اس میں بھی قرضوں کی منہائی کی گنجائش موجود تھی' اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ" نے اُس وقت بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ بینات جمادیٰ الثانیہ ۱۳۹۹ھ' صفحہ ۸)

لہٰذا مجلس کی رائے میں نصاب' **حولانِ حول** اور قرضوں کے بارے میں تجاویز کو مدِّنظر رکھتے ہوئے' آرڈیننس کی دفعہ ۳ مجوّزہ ترمیم کے بعد اس طرح ہونی چاہئے :

> "آرڈیننس کے دوسرے احکام کے تابع ہر مسلمان صاحبِ نصاب شخص سے شیڈول نمبر۱ میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہر سالِ زکوٰۃ کے اختتام پر لازماً زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ تاریخِ زکوٰۃ کے دن اس کی قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گزرا تو اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔ مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا تو اس کے قرضے کی رقم کو قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا"۔

اموالِ ظاہرہ وباطنہ

بینک اکاؤنٹ اور دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ منہا کرنے پر ایک علمی اشکال یہ ہے کہ فقہاء کرامؒ کی تصریح کے مطابق حکومت کو اموالِ ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہوتا ہے' اموالِ باطنہ سے نہیں۔ عام طور پر فقہاءؒ نے مُفت چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں' کھیتوں اور باغات کی پیداوار اور

اس مال تجارت کو جو شہر سے باہر لے جایا جا رہا ہو' اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا ہے اور نقدی' زیورات وغیرہ باقی تمام قابلِ زکوٰۃ اموال کو اموالِ باطنہ قرار دیا ہے۔ بینک اکاؤنٹس چونکہ بصورت نقد ہوتے ہیں' اس لئے علمی طور پر یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد مجلس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ :

"موجودہ دور میں بینک اکاؤنٹس کو اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے"۔

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد مبارک میں اموالِ ظاہرہ وباطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی' بلکہ دونوں قسم کے اموال سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی' لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں جب قابلِ زکوٰۃ اموال کی کثرت ہوگئی اور آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ اگر عاملینِ زکوٰۃ لوگوں کے گھروں اور دکانوں میں پہنچ کر اُن کی املاک کی چھان بین کریں گے تو اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی' اور اس سے اُن کے مکانات' دکانوں' گوداموں اور محفوظ شخصی مقامات کی نجی حیثیت مجروح ہوگی تو آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صرف ان اموال کی زکوٰۃ حکومت کی سطح پر وصول کی جائے' جن کی زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مُضرّت لاحق نہ ہو' اور جن کا حساب کرنے کے لئے گھروں اور دکانوں کی تلاشی نہ لینی پڑے۔ ایسے اموال اس زمانے میں صرف دو قسم کے تھے' یعنی مویشی اور زرعی پیداوار۔ چنانچہ صرف ان کی زکوٰۃ آپ نے سرکاری سطح پر وصول کرنے کا اعلان فرمایا اور باقی اموال کو اموالِ باطنہ قرار دے کر اُن کی زکوٰۃ کی ادائیگی خود مالکان کی ذمّہ داری قرار دے دی۔

بعد میں جب حضرت عمربن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا دور آیا تو انہوں نے شہروں کے باہر ایسی چوکیاں مقرر فرمادیں کہ جب کوئی شخص مالِ تجارت لے کر وہاں سے گزرے تو اس سے وہیں زکوٰۃ وصول کرلی جائے۔ اس موقع پر شہر سے باہر جانے والے مالِ تجارت کو بھی اموالِ ظاہرہ میں شمار کرلیا گیا۔ کیونکہ حکومت کو اس کی زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کا حساب کرنے کے لئے مالکان کے گھروں، دُکانوں اور نجی مقامات کی تلاشی کی ضرورت نہیں تھی۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کی وضاحت کے لئے حضراتِ فقہاء کرامؒ کی تصریحات درج ذیل ہیں :

(۱) علّامہ ابن ہمّام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ ظاهر قوله تعالىٰ خُذْ مِنْ اَمْوالِهِمْ صَدَقَةً (الاٰية) توجب اخذ الزكاة مطلقاً للا مام، وعلىٰ هذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده، فلما ولىّ عثمان رضى الله تعالىٰ عنه وظهر تغيّر الناس كره ان يفتّش السعاة على الناس مستور اموالهم، ففوّض الدفع الى الملاّك نيابة عنه، ولم يختلف الصحابةؓ فى ذلك عليه، وهذا لا يسقط طلب الامام اصلاً، ولهٰذا لو علم أنّ اهل بلدة لا يؤدّون زكاتهم طالبهم بها ﴾ (فتح القدير صفحه ٤٨٧ جلد ١)

(۲) امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وقوله تعالىٰ خذ من اموالهم صدقة يدل على أنّ اخذ الصدقات إلى الامام وانه متىٰ ادّاها من وجبت عليه الى

المساكين لم يجزه، لان حق الامام قائم فى اخذها فلا سبيل الى اسقاطه، وقد كان النبى صلى الله عليه وسلم يوجّه العمّال على صدقات المواشى ويأمرهم بأن ياخذوا على المياه فى مواضعها ﴾

آگے تحریر فرماتے ہیں :

﴿ امّا زكاة الاموال فقد كانت تحمل الىٰ رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم وابى بكرؓ و عمرؓ و عثمانؓ، ثم خطب عثمانؓ فقال "هٰذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين فليؤدّه، ثم ليزك بقية ماله"،فجعل لهم اداء ها الى المساكين، وسقط من اجل ذلك حق الامام فى اخذها ، لانه عقد عقده امام من أئمة العدل، فهو نافذ على الامّة لقوله عليه السلام: ويعقد عليهم اولهم، ولم يبلغنا انه بعث سعاة علىٰ زكاة الامول كما بعثهم علىٰ صدقات المواشى والثّمار فى ذلك، لان سائر الأموال غير ظاهرة للامام، وانما تكون مختبوة فى الدور والحوانيت والمواضع الحريزة ولم يكن جائزاً للسعاة دخول احرازهم ولم يجز ان يكلفوهم احضارها.

. . . . . ولما ظهرت هذه الاموال عند التصرف بها فى البلدان اشبهت المواشى فنصب عليها عمّال يأخذون منها ما وجب من الزكاة ، ولذالك كتب عمر بن عبد العزيزؒ الى عمّاله أن يأخذوا مما يمرّبه المسلم من التجارات من كل

عشرین دینارًا نصف دینارٍ ﴾

(احکام القرآن صفحہ ۱۵۵ جلد ۳، مطبوعہ استنبول ۱۳۳۵ھ)

(۳) فقہِ حنفی کی معروف کتاب الاختیار میں ہے :

﴿ لأن الأخذ کان للإمام، وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوّضه الی الملاّك وذٰلك لایسقط حق طلب الامام، حتّی لو علم انّ اهل بلدة لا یؤدّون زکاتهم طالبهم بها ولو مرّبها علی الساعی کان له اخذها ﴾ (الاختیار صفحہ ۱۰۰ جلد ۱)

(۴) اور صاحبِ ہدایہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ ومن مرّ علی عاشر بمائة درهم واخبره ان له فی منزله مائة اخریٰ وقد حال علیها الحول لم یزكّ التی مرّبها لقلّتها، وما فی بیته لم یدخل تحت الحمایة ﴾

(فتح القدیر صفحہ ۵۳۶ جلد ۲)

فقہاء کرامؒ کی مندرجۂ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ نقد روپیہ اور سامانِ تجارت اس وقت تک اموالِ باطنہ رہتے ہیں جب تک وہ پوشیدہ نجی مقامات پر مالکان کے زیرِ حفاظت ہوں' ایسے اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے میں چونکہ ان نجی مقامات میں دخل اندازی کرنی پڑتی ہے' اس لئے انہیں حکومت کی وصولیابی سے مستثنٰی رکھا گیا ہے' لیکن جب یہی اموال مالکان خود نجی مقامات سے نکال کر باہر لے آئیں' اور وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں تو وہ اموالِ ظاہرہ کے حکم میں آجاتے ہیں' اور حکومت کو ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار ہوجاتا ہے۔ گویا کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار ہونے کے لئے دو بنیادی اُمور ضروری ہیں :

ایک یہ کہ وہ ایسے نجی مقامات پر رکھے ہوئے نہ ہوں جہاں سے ان کا حساب کرنے کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کرنی پڑے' کما فی العبارۃ الأولیٰ والثانیۃ اور دوسرے یہ کہ وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں۔ کما فی العبارۃ الرابعۃ۔

اگر اس معیار پر موجودہ بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیا جائے تو ان میں یہ دونوں باتیں پوری طرح موجود ہیں' ایک طرف تو یہ وہ اموال ہیں جنہیں ان کے مالکان نے اپنی حرز (حفاظت) سے نکال کر خود حکومت پر ظاہر کردیا ہے' اور ان کے حساب میں نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے' دوسرے یہ کہ یہ اموال حکومت کے زیرِ حمایت ہی نہیں بلکہ زیرِ ضمانت آچکے ہیں' بالخصوص جب بینک سرکاری ملکیت میں ہیں اور ان کو جو سرکاری تحفّظ حاصل ہے وہ عاشر پر گزرنے والے اموال کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے مجلس کی رائے یہ ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھے ہوئے اموال' اموالِ ظاہرہ کے حکم میں ہیں اور حکومت اُن سے زکوٰۃ وصول کرسکتی ہے۔

اور اگر بالفرض انہیں یا ان میں سے بعض کو اموالِ باطنہ ہی قرار دیا جائے' تب بھی فقہائے کرامؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ جس علاقے کے لوگ ازخود زکوٰۃ ادا نہ کریں تو وہاں حکومت اموال باطنہ کی زکوٰۃ کا بھی مطالبہ کرسکتی ہے' جیسا کہ فتح القدیر اور الاختیار کی عبارتوں میں اس کی تصریح گزرچکی ہے' اور یہی مسئلہ بدائع الصنائع صفحہ ۷ جلد ۲ میں بھی موجود ہے۔

زکوٰۃ کی نیّت کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنے کے بارے میں ایک دُوسرا علمی اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور دوسری عبادتوں کی طرح اس کی ادائیگی میں بھی نیّت ضروری ہے' لیکن جب

مذکورہ اداروں میں جبراً زکوٰۃ وضع کی جائے گی تو اس میں مالکان کی طرف سے شاید نیّت نہ ہوسکے؟

فقہائے کرامؒ کی تصریحات میں اس اشکال کا بھی حل موجود ہے' اور وہ یہ کہ حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے' ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیّت کے قائم مقام ہو جاتا ہے' چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وفی مختصر الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ اذا اخذھا الامام کرھا فوضعھا موضعھا اجزأ لان لہ ولایۃ اخذ الصدقات فقام اخذہ مقام دفع المالک- وفی القنیۃ فیہ اشکال، لان النیۃ فیہ شرط ولم توجد منہ اھ قلت: قول الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ، فقام اخذہ الخ یصلح للجواب، تامل ﴾

(ردالمحتار صفحہ ۳۳ جلد ۲)

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی حیثیت

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر تیسرا شبہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بینکوں میں جو رُقوم جمع کرائی جاتی ہیں' وہ فقہی اعتبار سے قرض کے حکم میں ہیں اور مقروض کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ قرض خواہ کی رقم سے زکوٰۃ وصول کرلے۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض بن جانے کے بعد تو یہ اموال مضمون ہونے کی بناء پر اور زیادہ سرکاری تحفّظ میں آگئے ہیں' اس لئے قرض ہونے سے حکومت کے وصولیٔ زکوٰۃ کے حق پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بلاشبہ

دَینِ قوی ہے، جس پر باتفاق زکوٰۃ فرض ہے۔ اور بینکوں کے سرکاری ملکیت ہونے کی وجہ سے یہ رقوم حکومت کے صرف علم ہی میں نہیں، بلکہ اس کے قبضے اور ضمانت میں آجاتی ہیں۔ اس لئے اگر حکومت ولایتِ عامّہ کی بناء پر ان سے زکوٰۃ وضع کرلے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

محتاط طریقہ

لیکن "مجلس" یہ سمجھتی ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا محتاط طریقہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص ان اداروں میں اپنی رقم رکھوانے کے لئے آئے تو وہ ایک فارم پُر کرے جس میں اس کی طرف سے متعلّقہ ادارے کو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ وہ تاریخِ زکوٰۃ آنے پر اس کی رقم سے زکوٰۃ منہا کرکے زکوٰۃ فنڈ میں دے دے۔ اس طرح یہ ادارے مالکان کی طرف سے باقاعدہ وکیل باداء الزکوٰۃ بن جائیں گے، پھر اس میں نہ اموالِ باطنہ کی بنیاد پر کوئی اشکال باقی رہے گا، نہ نیّت کی بنیاد پر اور نہ اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی بنیاد پر۔

سُودی اکاؤنٹس اور زکوٰۃ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر ایک اور خلجان بعض ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ یہ سُودی اکاؤنٹس ہیں، اور سُود اور زکوٰۃ دونوں کیسے جمع ہوسکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں سُودی کاروبار کا وجود اس کے ماتھے پر کلنک کا شرمناک ٹیکہ ہے اور بالخصوص زکوٰۃ کا نظام جاری کرنے کے بعد اس حرام وناپاک ذریعۂ آمدنی کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لہٰذا یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بعُجلتِ ممکنہ مسلمانوں کو سُودی نظام کی اس لعنت سے نجات دلائے۔

لیکن جہاں تک زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلّق ہے فقہی اعتبار سے اگر کسی شخص کی آمدنی حلال و حرام سے مخلوط ہو اور وہ مجموع پر سے زکوٰۃ نکال دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حلال آمدنی کا ڈھائی فی صد شرعاً زکوٰۃ ہوگا اور حرام آمدنی کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ نہیں ہوگا' بلکہ وہ صدقہ سمجھا جائے گا جو حرام آمدنی سے جان چھڑانے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ سُود لینا حرام ہے' لیکن اگر کوئی شخص سُود وصول کرلے تو وہ سارے کا سارا واجب التصدّق ہے۔ اب اگر حکومت نے اس میں سے ڈھائی فی صد زکوٰۃ فنڈ میں دے دیا ہے' (جب کہ زکوٰۃ فنڈ میں صدقاتِ نافلہ اور عطیات بھی شامل ہیں) تو مالکان پر شرعاً واجب ہے کہ باقی ماندہ سُود بھی صدقہ کردیں نہ یہ کہ اس کی بناء پر اصل مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہ کریں۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے ایک ہزار روپے بینک میں جمع ہیں اور اس پر سو روپے سُود کا اضافہ ہوگیا تو حکومت پورے گیارہ سو روپے پر ڈھائی فی صد کے حساب سے ساڑھے ستائیس روپے وصول کرے گی' ان ساڑھے ستائیس روپوں میں سے پچیس روپے تو اس شخص کے اصل ایک ہزار روپے کی زکوٰۃ ہے اور ڈھائی روپے زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ سُود کی جو رقم پوری کی پوری صدقہ ہونی چاہئے تھی اس کا کچھ حصّہ ہے' اگر یہ بھی زکوٰۃ فنڈ میں چلا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اس کا مصرف بھی فقراء ہی ہیں۔

نابالغ کی زکوٰۃ

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لئے صاحبِ نصاب کا عاقل وبالغ ہونا شرط ہے۔ جب کہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نابالغ اور فاتر العقل کے مال پر بھی زکوٰۃ لازم ہے۔ آرڈیننس میں چونکہ بالغ یا نابالغ کے اکاؤنٹس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا اس لئے اس میں غالباً شافعی مسلک اختیار کیا

گیا ہے' اور لوگوں کے موجود حالات کے پیش نظر اگر ضرورت داعی ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

ترکے کا مال

البتہ بینک اکاؤنٹس میں بعض اموال ایسے ہوسکتے ہیں جو کسی مرحوم شخص کا ترکہ ہوں' چونکہ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ہی ان اموال پر وُرثاء کا حق ثابت ہوجاتا ہے اور وُرثاء میں سے ہر ایک کا صاحبِ نصاب ہونا ضروری نہیں' اس لئے اس مال سے بھی زکوٰۃ وصول کرنا درست نہیں ہوگا۔ لہٰذا آرڈیننس میں یہ استثناء بھی ہونا چاہئے کہ :

"جو شخص زکوٰۃ وضع کرنے کے دن انتقال کرچکا ہو' اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی"۔

کمپنیاں اور شیئرز

آرڈیننس میں "کمپنیوں" کو بھی صاحبِ نصاب قرار دیا گیا ہے اور کمپنیوں کے حِصَص کو بھی شیڈول نمبر(۱) میں درج کرکے ان سے زکوٰۃ وضع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کمپنی کے بینک اکاؤنٹ سے بحیثیت فرد قانونی الگ زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اس کمپنی کے حصّہ داروں سے ان کے حِصَص پر الگ زکوٰۃ وصول ہوگی۔ اگر واقعہ یہی ہے تو یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے' کیونکہ اس میں ایک ہی مال سے سال میں دو مرتبہ زکوٰۃ وصول ہونے کا احتمال ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔ لہٰذا اگر کمپنیوں سے زکوٰۃ وصول کی جارہی ہے تو حصّہ داروں سے الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے' اور اگر حصّہ داروں سے وصول کی جارہی ہے' تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے۔ ان دونوں صورتوں میں سے مجلس کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ حِصَص پر وصول کی جائے۔

عُشر بصورتِ نقد

آرڈیننس میں عُشر کا بھی ایک حصّہ لازماً وصول کرنے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے' مثلاً بارانی زمینوں کی پیداوار کا پانچ فی صد اور اس کے علاوہ ہر قسم کی زمینوں میں کاشت کار کا حصّہ مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ تصریح کردی ہے کہ ان پر شرعاً عُشر واجب ہے جسے مالکان اپنے طور پر ادا کریں گے۔ اس حکم میں شرعاً کوئی خرابی نہیں' البتہ آرڈیننس کی دفعہ ۵ ذیل ۵ میں صراحت کی گئی ہے کہ عُشر بصورتِ نقد وصول کیا جائے گا' صرف گندم اور دھان کے بارے میں یہ استثناء رکھا گیا ہے کہ اگر صوبائی زکوٰۃ کونسل چاہے تو اُسے بصورتِ جنس وصول کرلے۔

مجلس کی رائے میں یہ حصّہ بھی لائقِ ترمیم ہے کیونکہ شرعاً عُشر کو بصورتِ نقد ادا کرنا لازم نہیں بلکہ شریعت نے اس میں مالکِ پیداوار کی سہولت کو ملحوظ رکھا ہے۔ لہٰذا یہ پابندی ختم کرکے اس معاملے کو مالکِ پیداوار کی صوابدید پر چھوڑنا چاہئے۔

چوتھائی پیداوار کا عُشر سے استثناء

آرڈیننس میں زرعی پیداوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں عُشر سے مستثنیٰ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگرچہ بعض ائمہ کے اقوال اس قسم کے منقول ہیں کہ زرعی پیداوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباریٰ' باب خرص التمر صفحہ ۲۷۴ جلد ۳) لیکن فقہاء حنفیہ اور اکثر فقہاء کے مسلک میں یہ چھوٹ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر حکومت یہ چوتھائی حصّہ لازمی وصولی سے مستثنیٰ کرنا چاہتی ہے تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرنا

چاہئے کہ اس حصّے کا عُشر مالکان خود ادا کریں۔

تاریخِ زکوٰۃ

موجودہ آرڈیننس کے مطابق ہر زکوٰۃ کا سال یکم رمضان المبارک سے شروع ہو کر شعبان کے آخری دن پر ختم ہو گا۔ اور یہ بات اطمینان بخش ہے کہ شریعت کے مطابق زکوٰۃ کی تقسیم کے لئے ہجری سال کو اختیار کیا گیا ہے' لیکن مختلف اثاثوں کی قیمت لگانے کے لئے شیڈول نمبر(۱) میں مختلف تاریخیں مقرر کی گئی ہیں' یہ صورتِ حال شرعاً درست نہیں ہے۔ شرعی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص صاحبِ نصاب بن جائے تو اس کی ہر رقم کے لئے الگ سال شمار نہیں کیا جاتا' بلکہ اس کے تمام اثاثوں کے لئے زکوٰۃ کے وجوب کی ایک ہی تاریخ ہوتی ہے' لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام اثاثوں میں قیمت لگانے کی تاریخ ایک ہی رکھی جائے۔

البتہ اس قیمت کی بنیاد پر زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔

قیمتی پتّھروں اور مچھلیوں کی زکوٰۃ

آرڈیننس کے شیڈول نمبر(۲) میں ان اشیاء کی فہرست دی گئی ہے جن پر حکومت لازماً زکوٰۃ وصول نہیں کرے گی' بلکہ مالکان پر بطورِ خود ان کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ اس فہرست میں قیمتی پتّھروں اور مچھلیوں پر بھی زکوٰۃ عائد کی گئی ہے حالانکہ ان دونوں اشیاء پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک تجارت کی نیّت سے انہیں خریدا نہ گیا ہو۔ لہٰذا ان دونوں اشیاء کو اس شیڈول سے خارج کرنا چاہئے' کیونکہ بہ نیّتِ تجارت خریداری کی صورت میں یہ

"اموالِ تجارت" میں شامل ہو جائیں گے، جن کا ذکر شیڈول نمبر(۲) میں موجود ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ

مصارفِ زکوٰۃ کے بیان میں آرڈیننس میں براہِ راست فقراء کو زکوٰۃ پہنچانے کے ساتھ مختلف اداروں کے توسّط سے فقراء کی امداد کا بھی ذکر ہے، اس میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ :

"ہر صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی مستحقِ زکوٰۃ کو باقاعدہ مالک بنا کر کی جائے گی"۔

یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آرڈیننس کے اردو ترجمے سے یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ ادارے اُسے تعمیر اور عملے کی تنخواہوں پر صرف کر سکیں گے، جو شرعاً جائز نہیں۔ انگریزی متن اگرچہ نسبتاً بہتر ہے، لیکن اس میں بھی یہ وضاحت ضروری ہے۔

خُلاصہٴ تجاویز برائے حکومت

(۱) صاحبِ نصاب کی موجودہ تعریف کی جگہ حسبِ ذیل تعریف لکھی جائے :

"صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو"۔

پھر ہر سال تاریخِ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس قیمت کو وصولی زکوٰۃ کا معیار مقرر کیا جائے۔ یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

(۲) آرڈیننس کی دفعہ نمبر(۳) میں ترمیم کرکے اس کو اس طرح بنایا جائے :

"آرڈیننس کے دوسرے احکام کے تابع ہر مسلمان صاحبِ نصاب شخص سے شیڈول نمبر(۱) میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہر سالِ زکوٰۃ کے اختتام پر لازماً وصول کی جائے گی۔

شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ تاریخِ زکوٰۃ کے دن اس کی قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گزرا تو اس کے مذکورہ اثاثوں

سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا ہے تو اس کے قرضے کی رقم کو قابل زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا۔

مزید شرط یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں باضابطہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ذریعہ یہ ثابت ہوجائے کہ وہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخ میں انتقال کرچکا تھا تو بھی اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی"۔

(۳) بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں رقم رکھوانے والوں سے ایک وکالت نامہ تحریر کرایا جائے جس میں وہ متعلقہ مالی اداروں کو یہ اختیار دے دیں کہ تاریخِ زکوٰۃ آنے پر وہ ادارہ ان کی طرف سے زکوٰۃ وضع کرکے زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرادے۔

(۴) کمپنیوں اور ان کے حِصَص پر الگ الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے' بلکہ اگر کمپنیوں سے وصول کی جارہی ہے تو حِصَص پر وصول نہ کی جائے اور اگر حِصَص پر وصول کی جارہی ہے تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے۔ ان دونوں صورتوں میں سے بہتر یہ ہے کہ حِصَص پر وصول کی جائے۔

(۵) عُشر کے بصُورتِ نقد وصول کرنے کی پابندی ختم کی جائے' بلکہ یہ امر مالکِ پیداوار پر چھوڑا جائے کہ وہ چاہے تو بصُورتِ جنس ادا کرے اور چاہے تو بصُورتِ نقد۔

(۶) ہر زرعی پیداوار میں سے چوتھائی حصّہ جو حکومت بطور منہائی اخراجات چھوڑ رہی ہے' اس کے بارے میں یہ اعلان کیا جائے کہ اس حصّے کا عُشر مالکان خود ادا کریں۔

(۷) شیڈول نمبر(۱) کے تمام اثاثوں کے لئے قیمت مقرر کرنے کی تاریخ (ویلویشن ڈیٹ) ایک ہی مقرر کی جائے اور مختلف اثاثوں کے لئے مختلف تاریخیں نہ رکھی جائیں' البتہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔

(۸) قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کو شیڈول نمبر(۲) سے خارج کیا جائے۔

(۹) شیڈول نمبر(۲) میں مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرح بیان کرتے ہوئے پانچ سے پچیس اونٹ تک کی شرح بہت مجمل ہے' جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پانچ سے پچیس اونٹوں تک ایک اونٹ واجب ہے۔ اس کی اصلاح کرکے واضح طور پر لکھنا چاہئے کہ پانچ سے پچیس اونٹوں تک ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری واجب ہوگی۔

(۱۰) مصارفِ زکوٰۃ میں یہ وضاحت کی جائے کہ ہر صورت میں مستحقِ زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا مالک وقابض بنایا جائے گا اور ادارے یہ رقمیں تعمیرات اور اساتذہ کی تنخواہوں میں صَرف نہیں کرسکیں گے۔

یہ چند تجاویز ہیں' جو آرڈیننس کے فوری مطالعے سے سامنے آئیں'

﴿ ولَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین

تصدیقات

- حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب۔
مفتی و مہتمم دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی
- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب۔
مفتی و مہتمم دارالعلوم کراچی
- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب۔
خادم دارالافتاء دارالعلوم کراچی
- حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب۔
مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
- حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب۔
استاذ و ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
- حضرت مولانا مفتی سبحان محمود صاحب۔
دارالعلوم کراچی ۱۴۔
- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب۔
نائب مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴۔

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بینکوں اور مالیاتی اداروں

سے

زکوٰۃ کا مسئلہ

(دُوسرا حِصّہ)

الحمد للہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

امّا بعد

"مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ" نے اپنے ۱۲ر شعبان ۱۳۹۹ھ کے اجلاس میں زکوٰۃ وعشر آرڈی ننس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو تحریر مرتب کی تھی، اُسے اظہارِ رائے کے لئے ملک بھر کے معروف اہلِ فتویٰ علماء کی خدمت میں بھیج دیا گیا تھا، الحمد للہ! ان میں سے اکثر کے جوابات موصول ہوگئے۔ مندرجہ ذیل حضرات نے اس تحریر پر اصل مسئلے میں کسی ترمیم کے بغیر مجلس کی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے تصدیقی دستخط ثبت فرمادیئے :

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب، مہتمم دارالعلوم حقّانیہ، اکوڑہ خٹک۔

(۲) حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب، مفتی و مہتمم مدرسہ قاسم العلوم، ملتان

(۳) حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب، مفتی مدرسہ اشرفیہ، سکّھر

(۴) حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدّظلہم، مہتمم جامعہ فاروقیہ ڈرگ کالونی، کراچی (آپ نے نیت کے مسئلے میں قدرے تردّد فرمایا، اور باقی اُمور سے اتفاق فرمایا)۔

(۵) حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب، مہتمم جامعہ رشیدیہ، ساہیوال۔

(۶) حضرت مولانا مفتی محمد سعید صاحب، مفتی مدرسہ مطلع العلوم، بروری روڈ، کوئٹہ۔

(۷) حضرت مولانا فضل محمد صاحب، مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، منگورہ، سوات۔

(۸) حضرت مولانا مفتی محمد وجیہ صاحب، مفتی دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈوالہ یار، سندھ۔

(۹) حضرت مولانا مفتی محمد خلیل صاحب، مدرسہ اشرف العلوم، باغبان پورہ، گوجرانوالہ۔

(۱۰) حضرت مولانا حبیب الحق صاحب، مدرس مدرسہ اشرف العلوم، باغبان پورہ گوجرانوالہ۔

(۱۱) حضرت مولانا قاضی سعداللہ صاحب، رُکن مجلسِ شوریٰ قلّات ڈویژن، مستونگ بلوچستان (وحال رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)۔

(۱۲) حضرت مولانا قاضی بشیراحمد صاحب، دارالإفتاء راولاکوٹ، آزاد کشمیر۔

(۱۳) حضرت مولانا مقبول الرحمٰن صاحب قاسمی، دارالإفتاء راولاکوٹ، پونچھ، آزاد کشمیر۔

(۱۴) حضرت مولانا عبداللہ صاحب، ناظم دارالعلوم تعلیم القرآن، باغ، پونچھ، آزاد کشمیر۔

(۱۵) حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب خطیب جامع مسجد باغ، پونچھ، آزاد کشمیر۔

ان حضرات کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات نے مجلس کی تحریر پر مفصّل یا مختصر تبصرہ تحریر فرمایا، اور اس کے بعض نکات سے اختلاف بھی فرمایا :

(۱) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، مفتی جامعہ اشرفیہ، لاہور۔

(۲) حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب، مفتی خیر المدارس، ملتان۔

(۳) حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی، دارالعلوم حقانیہ، ساہیوال ضلع سرگودھا۔

(۴) حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ان حضرات میں سے بعض نے کچھ تو مجلس کی تحریر کی چند فروگزاشتوں پر مجلس کو متنبّہ فرمایا، جس پر مجلس ان حضرات کی تہِ دل سے ممنون ہے۔ وہ فروگزاشتیں درج ذیل ہیں :

(۱) مجلس کی تحریر میں "حولانِ حول" کی شرط کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا گیا تھا کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے یہ ضروری ہے کہ مالِ نامی "بقدرِ نصاب" سارے سال کسی شخص کی ملکیت میں موجود رہا ہو، حالانکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر سال کے اوّل و آخر میں نصاب کامل ہو اور اثناءِ حول میں ناقص ہو جائے تب بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ مجلس کی تحریرِ سابق میں یہاں نقص[1] رہ گیا تھا، اب اس

---

[1] جس کی وجہ یہ ہوئی کہ عباراتِ فقہاء میں مطلقاً مال نامی کو نصاب سے تعبیر کرکے قدرِ معہود کو "نصابِ کامل" اور اس سے کم کو نصابِ ناقص کہتے ہیں، بوقت تحریر لفظ نصاب پر نظر رہی اور "بقدر" کا لفظ سہواً تحریر میں آگیا۔ مقصد یہ ہے کہ مال نامی سارے سال موجود رہا ہو، مگر سال کے طرفین نصاب کا کامل ہونا شرط ہے، اگرچہ درمیان میں ناقص رہ گیا ہو۔

عبارت کو مجلس کی طرف سے کالعدم سمجھا جائے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے کامل نصاب کا سارے سال ملکیت میں رہنا ضروری ہے۔

(۲) صاحبِ نصاب کی تعریف سابقہ تحریر میں اس طرح کی گئی تھی :

"صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی ہو یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو"۔

اس تعریف میں اُس صورت کا حکم بیان سے رہ گیا تھا جس میں کسی شخص کے پاس صرف سونا ہی سونا ہو' چاندی یا نقدی بالکل[1] نہ ہو۔ ایسی صورت میں سونے کا نصاب یعنی ساڑھے سات تولہ سونا شرعاً معتبر ہوتا ہے' چنانچہ اس فروگزاشت پر متنبّہ ہونے کے بعد مجلس نے صاحبِ نصاب کی مجوزہ تعریف میں تبدیلی کرکے اُسے اس طرح کردیا ہے :

"زرعی پیداوار اور مویشیوں کے علاوہ دیگر قابلِ زکوٰۃ اموال میں صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ (۶۱۲ء۳۵ گرام) چاندی یا ساڑھے سات تولہ (۸۷ء۴۸ گرام) سونا یا ان دونوں میں سے کسی کی قیمت کے برابر روپیہ یا سامانِ تجارت ہو یا مذکورہ بالا اشیاء میں سے بعض کا یا سب کا مجموعہ مل کر سونے یا چاندی کے وزنِ مذکور کی قیمت کے برابر ہو جائے"۔

مجلس نے اس ترمیم شدہ تعریف سے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی مطلّع

[1] اس صورت کا حکم اگرچہ تعریف میں درج ہونے سے رہ گیا تھا' مگر تعریف سے پہلے کی عبارت میں اس کی صراحت کردی گئی تھی۔

کردیا تھا' چنانچہ اب حکومت نے جو نیا ترمیم شدہ زکوٰۃ آرڈی ننس ۱۹۸۰ء نافذ کیا ہے' اس میں بفضلہ تعالیٰ اس کی روشنی میں ترمیم کردی گئی ہے۔[۲] (ملاحظہ ہو زکوٰۃ وعشر ترمیمی آرڈی ننس ۱۹۸۰ء دفعہ ۳ ذیل الف)

(۳) مجلس کی تحریر میں لکھا گیا تھا کہ شہر سے باہر جانے والے اموالِ تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے چوکیاں مقرر فرمائی تھیں' اس سے تأثر یہ ہوتا تھا کہ ان چوکیوں کا یہ سلسلہ سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے شروع فرمایا تھا' حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے ہی میں ان چوکیوں پر زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مبسوط وکتاب الآثار وغیرہ)

یہ تو چند جزوی فروگزاشتیں تھیں۔ لیکن مذکورہ چاروں حضرات نے بنیادی طور پر جس مسئلے سے اختلاف فرمایا ہے یا جس پر اپنے تردّد کا اظہار کیا ہے وہ بینک اکاؤنٹس یا دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں ان حضرات کے دلائل یا شبہات پر مجلس نے دوبارہ غور کیا' لیکن غور و تحقیق کے بعد اس مسئلے میں مجلس کی رائے تبدیل نہیں ہوئی۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے پر جن شبہات کا اظہار کیا گیا ہے' بنیادی طور پر وہ تین شبہات ہیں :

(۱) حکومت کو صرف اموال ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے' اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت کو نہیں' بلکہ مالکان پر ان کی زکوٰۃ کی

[۲] نئے آرڈی ننس میں مجلس کی دوسری بیشتر تجاویز بھی شامل کرلی گئی ہیں' مثلاً حولانِ حول کی شرط' میت کے ترکے کو مستثنیٰ کرنے کی شرط' تمام اثاثوں کے لئے ایک ویلویشن ڈیٹ کی تجویز وغیرہ۔

ادائیگی اپنے طور پر فرض ہے اور نقود چونکہ اموالِ باطنہ میں سے ہیں' اس لئے بینک اکاؤنٹس بھی اموالِ باطنہ میں سے ہوئے' ان سے حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

(۲) بینک اکاؤنٹس درحقیقت بینک کے ذمے اکاؤنٹ ہولڈروں کا قرض ہے' جب یہ رقم مالک نے بینک کو دے دی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل گئی' اور بینک کی ملکیت میں داخل ہوگئی' اب اصل مالک پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ بینک سے اُس کو واپس وصول کرے گا' اُس سے پہلے جو زکوٰۃ بینک اکاؤنٹس سے وضع کی جارہی ہے وہ وجوبِ ادا سے پہلے ایک ایسے مال سے وصول کی جارہی ہے جس پر زکوٰۃ واجب الاداء نہیں' اور جو اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہے' لہٰذا اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۳) زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے ادا کنندہ کا نیّت کرنا ضروری ہے اور بینک اکاؤنٹس میں سے زکوٰۃ وضع کرتے وقت مالک کی نیّت بسا اوقات نہیں ہوتی۔

ان تینوں مسائل پر قدرے تفصیل کے ساتھ ذیل میں بحث کی جاتی ہے۔

﴿ واللہ سُبحانہ الموفق ﴾

اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ

جیسا کہ "مجلس" کی تحریرِ سابق میں امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء کرامؒ کی تصریحات کے حوالے سے عرض کیا گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی'

بلکہ ہر قسم کے قابلِ زکوٰۃ اموال سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب اموال اور آبادی کی کثرت ہوگئی اور اندیشہ ہوا کہ لوگوں کے نجی مکانات وغیرہ میں زکوٰۃ کے کارندوں کی مداخلت سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور اس سے فتنے پیدا ہوں گے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی تحصیل سرکاری سطح پر باقی رکھی اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں مالکان کو حکومت کا نائب بنادیا۔

حضراتِ فقہاء کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ کسی مال کے "اموالِ ظاہرہ" میں سے ہونے کے لئے دو اُمور ضروری ہیں :

ایک یہ کہ ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مالکان کے نجی مقامات کی تفتیش کرنی نہ پڑے۔

دوسرے یہ کہ وہ اموال حکومت کے زیرِ حمایت ہوں۔ پھر عرض کیا گیا تھا کہ بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھوائی ہوئی رقموں میں یہ دونوں اُمور موجود ہیں، لہٰذا ان کو "اموالِ ظاہرہ" میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اِس پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ کسی مال کے ظاہر ہونے کی اصل علّت "خروج من المصر" ہے، چونکہ اس دور میں شہر کے ناکوں پر حکومت کی طرف سے عاشر اس لئے بٹھائے جاتے تھے کہ وہ گزرنے والوں کی جان ومال کی حفاظت کریں، اس لئے شہر سے نکل کر تمام اموال حکومت کے زیرِحمایت آجاتے تھے، اور اس بناء پر حکومت ان کی زکوٰۃ وصول کرتی تھی، نجی مقامات کی تلاشی و تفتیش کی ضرورت نہ ہونا اس حکم کی حکمت ہے علّت نہیں، لہٰذا حکم کا مدار "خروج من المصر" پر ہوگا اور چونکہ یہ علّت بینکوں اور مالیاتی اداروں میں نہیں پائی جاتی، اس لئے ان کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کرکے ان سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنا درست نہیں۔

مجلس نے اس نقطۂ نظر پر مکرّر غور کیا' اور اس مسئلے میں فقہ اور حدیث کے متعلقہ مواد کو سامنے رکھا' لیکن غور و تحقیق کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ سرکاری سطح پر زکوٰۃ کی وصولی کے لئے "خروج من المصر" کو علّت قرار دینا اور اس پر حکم کا مدار رکھنا درست نہیں' بلکہ اصل علت وہی ہے کہ وہ اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں :

حدیث اور فقہ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضراتِ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے خلفاء و امراء سالانہ تنخواہوں اور وظائف کی تقسیم کے وقت انہی تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ کاٹ لیا کرتے تھے' اور اس پر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعینؒ اور دوسرے فقہاءؒ نے نہ صرف یہ کہ کوئی نکیر نہیں فرمائی' بلکہ اس طریقے کی تصدیق و تائید فرمائی ہے' چنانچہ مؤطأ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں روایت ہے :

﴿قال القاسم بن محمد : وكان ابوبكر الصديق رضى الله تعالى عنه اذا اعطى الناس اعطياتهم سأل الرجل : هل عندك من مال وجبت عليك فيه الزكاة ؟ فان قال نعم اخذ من عطائه زكاة ذلك المال، وان قال: لا، سلم اليه عطاءه ولم ياخذ منه شيئاً﴾

(مؤطاامام مالكؒ صفحه ۱۰۳ و ۱۰۴ الزكاة فى العين من الذهب والورق- ومصنف ابن ابى شيبة صفحه ۱۸٤ جلد ۳ ماقالوافى العطاء اذا اخذ- ومصنف عبدالرزاق صفحه ۷٦ جلد ٤- وكتاب الاموال لابى عبيد صفحه ٤١١)

"حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت

صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب لوگوں کو (بیت المال سے ملنے والی) تنخواہ یا وظائف دیتے تو ہر شخص سے پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں ہے' تو اس کی تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ لے لیتے' اور اگر وہ کہتا کہ "نہیں" تو اُس کی تنخواہ پوری دے دیتے' اور اس میں سے کچھ نہ لیتے"۔

اور امام ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں :

﴿فان اخبره انّ عنده مالاقدحلّت فيه الزكاة قاصه مما يريد ان يعطيه، وان اخبره ان ليس عنده مال قدحلّت فيه الزكاة سلّم اليه عطاءه﴾

(کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ٤١١ فقرہ ١١٢٥ باب فروض زکاۃ الذھب والورق)

"اگر وہ شخص یہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہو چکی ہے تو جو تنخواہ آپ اُسے دینا چاہتے اس میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے تھے' اور اگر وہ بتاتا کہ اُس کے پاس ایسا مال نہیں ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہو گئی ہو تو اُس کی تنخواہ اُسے پوری دے دیتے تھے"۔

نیز امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ معمول نقل فرمایا ہے :

﴿عن عبدالرحمن بن عبدالقاری ، وكان على بيت المال في زمن عمر مع عبيد الله بن الا رقم : فاذا خرج العطاء

جمع عمر رضی اللہ عنه اموال التجارة، فحسب عاجلها وآجلها، ثم یاخذ الزکاة من الشاهد والغائب ﴾

(مصنف ابن ابی شیبة صفحہ ۱۸٤ جلد ۳)

"عبدالرحمٰن بن عبدالقاری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں عبیداللہ بن ارقم کے ساتھ بیت المال پر مقرر تھے، فرماتے ہیں کہ جب (سالانہ) تنخواہوں کی تقسیم کا وقت آتا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام اموال تجارت کو جمع فرماکر ان کے نقد اور اُدھار کا حساب فرماتے، پھر حاضر اور غائب ہر طرح کے مال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے"۔

اور امام ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمائی ہے :

﴿ فکان اذا خرج العطاء جمع اموال التجار، ثم حسبها شاهدها وغائبها، ثم اخذ الزکاة من شاهد المال علی الشاهد والغائب ﴾

(کتاب الاموال صفحہ ٤٢٥ فقرہ ۱۱۷۸ باب الصدقة فی التجارات والدیون)

"جب تنخواہوں کی تقسیم ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام تاجروں کے اموال جمع فرماکر اس میں سے حاضر و غائب سب کا حساب فرماتے، پھر موجود مال سے حاضر و غائب ہر طرح کے مال کی زکوٰۃ وصول فرماتے"۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ :

﴿ وسندہ حسن ﴾

(اعلاء السنن صفحہ ۴۳۰ جلد ۱۲ کتاب السیر باب العطاء یموت صاحبه بعد مایستوهبه)

یعنی اس روایت کی سند حسن ہے۔

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دور میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہ تھی' اس لئے وہ ہر قسم کے اموال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے' لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ 'جنھوں نے یہ تفریق قائم فرمائی تھی' اُن کے دور میں بھی تنخواہوں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ مؤطأ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں مروی ہے :

﴿ عن عائشة بنت قدامة عن ابيها انه قال : كنت اذا جئت عثمان بن عفّان رضى الله تعالىٰ عنه اقبض عطائى، سألنى هل عندك من مال وجبت فيه الزكاة؟ قال : فان قلت : نعم اخذ من عطائى زكاة ذلك المال ، وان قلت : لا ، دفع الىّ عطائى ﴾

(مؤطأ امام مالکؒ صفحہ ۱۰۴ - ومصنف عبدالرزاق صفحہ ۷۷ جلد ۴ حدیث ۷۰۲۹، وکتاب الامّ للشافعیؒ صفحہ ۱۴ جلد ۲ طبع بولاق - وکتاب الاموال لابی عبیدؒ صفحہ ۴۱۲ فقرہ ۱۱۲۷)

"عائشہ بنت قدامہ اپنے والد کا قول نقل فرماتی ہیں کہ جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اپنی تنخواہ وصول کرنے جاتا تو وہ مجھ سے پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کوئی مال ایسا ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ چنانچہ اگر میں یہ کہتا کہ

"ہاں" تو میری تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ وصول فرمالیتے' اور
میں کہتا کہ "نہیں" تو میری تنخواہ مجھے دے دیتے"۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی تنخواہ سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا' البتہ ان کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے' جن کی تنخواہیں یا وظائف بیت المال سے جاری ہوں' دوسرے لوگوں کی نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی عمل تھا۔ (مؤطا امام مالک صفحہ ۲۷۳) اور حضرت ابن عباسؓ وابن عامرؓ بھی اسی کے قائل تھے۔
(حاشیہ مؤطا امام مالک صفحہ ۲۷۳)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہیں تقسیم کرتے وقت خود تنخواہ کی زکوٰۃ بھی اُسی تنخواہ میں سے وصول فرمالیتے تھے' چنانچہ مصنّف ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ میں ہے :

﴿عن هبيرة قال : كان ابن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه
يزكى عطياتهم من كلّ الف خمسة وعشرين﴾
(مصنف ابن ابی شیبۃ صفحہ ۱۸٤ جلد ۳)

"حضرت ہبیرۃ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کی تنخواہوں کی زکوٰۃ (اس حساب سے) وصول فرمایا کرتے تھے کہ ہر ہزار پر پچیس وصول کرلیتے تھے"۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق فرمانے کے بعد فرمایا ہے کہ :

﴿ فَالاِسْنَادُ حَسَنٌ ﴾ (اعلاء السنن صفحہ۴۲۹ و۴۳۰ جلد ۱۲)

"یعنی یہ سند حسن ہے"۔

البتہ چونکہ یہاں زکوٰۃ اُن تنخواہوں کی وصول کی جاتی تھی' جو صاحبِ تنخواہ کی ملکیت میں قبضہ کرنے کے بعد آتی ہے' اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ پہلے تنخواہ دے دیتے پھر اُس سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے' چنانچہ مصنّف عبدالرزاق میں ہے :

﴿ عن هبيرة بن يريم عن عبدالله بن مسعود رضی الله تعالىٰ عنه قال: كان يعطي ثم ياخذ زكاته ﴾

(مصنف عبدالرزاق صفحہ۷۸ جلد ٤ حدیث ۷۰۳٦ باب لاصدقة فی مال حتی یحول علیه الحول)

"ہُبیرۃ بن یریم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ تنخواہ دے دیتے پھر اس کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے"۔

اور معجم طبرانی رحمۃ اللہ علیہ میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں :

﴿ كان يعطي العطاء ثم ياخذ زكاته ﴾

اور علامہ نورالدین ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع الزوائد میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے :

﴿ رجاله رجال الصحيح ، خلاهبيرة ، وهوثقة ﴾

نیز امام ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے نقل فرمایا ہے :

﴿ عن هبيرة بن يريم قال : كان عبدالله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه يعطينا العطاء فى زبلٍ صغار ، ثم ياخذ منه الزكاة ﴾

(كتاب الاموال صفحه ٤١٢ فقره ١١٢٨ باب فروض زكاة الذهب والفضة)

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیں چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں تنخواہ دیتے پھر اس سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے"۔

تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد بھی جاری رہا' چنانچہ مصنّف ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ میں روایت ہے :

﴿ عن ابن عون عن محمد قال : رايتُ الامراء اذا اعملوا العطاءَ زكّوهُ ﴾ (مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ١٨٥ جلد ٣)

"ابن عون حضرت محمد رحمۃ اللہ علیہ (غالبًا ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ) کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے اُمراء کو دیکھا کہ جب وہ تنخواہ دیتے تو اس کی زکوٰۃ وصول کرلیتے"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں اگرچہ اموالِ ظاہرہ وباطنہ کی تفریق قائم ہوچکی تھی' لیکن ان کے بارے میں بھی مروی ہے :

﴿عن عمر بن عبدالعزیز انه کان یزکی العطاء والجائزة﴾

(مصنف ابن ابی شیبة صفحه ١٨٥ جلد ٣)

"حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہوں اور انعامات سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے"۔

اور مصنف عبدالرزاق میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں :

﴿عن جعفر بن برقان ان عمر بن عبدالعزیز کان اذا اعطی الرجل عطاءہ اوعمالته اخذ منه الزکاة﴾

(مصنف عبدالرزاق صفحه ٧٨ جلد ٤، فقرہ ٧٠٣٧)

"جعفر بن برقان" کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جب کسی شخص کو اس کا وظیفہ یا اس کی اجرت دیتے تو اس سے زکوٰۃ وصول فرمالیتے تھے"۔

یہ معاملہ صرف تنخواہوں اور وظائف کی حد تک محدود نہیں تھا' بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال پر جس کسی مسلمان کا کوئی مالی حق ہوتا تو اس کی ادائیگی کے وقت اس کی زکوٰۃ وصول کرنے کا معمول قرونِ اولیٰ میں جاری تھا۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ اور سُنن بیہقی رحمۃ اللہ علیہ میں مروی ہے :

﴿عن عمرو بن میمون قال : اخذ الوالی فی زمن عبدالملك مال رجل من اهل الرقة یقال له ابوعائشة عشرین الفاً، فادخلت فی بیت المال ، فلما ولی عمر بن عبدالعزیز اتاه ولده، فرفعوا مظلمتهم الیه فکتب الی میمون : ادفعوا الیهم

اموالھم وخذوا زکاۃ عامہ ھذا ، فلولا انہ کان مالا ضمارا
اخذ نامنہ زکاۃ مامضیٰ ﴾

(مصنف ابن ابی شیبہؒ صفحہ ۲۰۲ جلد ۳ ماقالوا فی الرجل یذھب لہ المال السنین واخرجہ ایضاً البیہقی فی السنن الکبریٰ صفحہ ۱۵۰ جلد ٤)

"عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ عبدالملک[1] کے زمانے میں اہلِ رقّہ کے ایک شخص ابو عائشہ سے ایک گورنر نے زبردستی بیس ہزار وصول کرکے بیت المال میں داخل کردیئے تھے' جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ہوئے تو اس شخص کے لڑکوں نے آکر داد رسی چاہی' اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے میمون کو لکھا کہ :

"ان کو ان کے اموال دے دو اور اس سے اس سال کی زکوٰۃ وصول کرلو' اس لئے کہ اگر یہ مالِ ضمار نہ ہوتا تو ہم اس سے پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی وصول کرتے"۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی سند کی تحقیق فرماکر ثابت فرمایا ہے کہ اس کے رجالِ ثقات ہیں اور سند متصل ہے۔
(اعلاء السنن صفحہ ۹ جلد ۹ باب لا زکاۃ فی المال الضمار)

نیز یہی واقعہ اجمالی طور پر دوسری سند سے مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں بھی مروی ہے' اور اس میں بھی ایک سال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہؒ کے مطبوعہ نسخے میں عبدالملک لکھا ہے' لیکن دوسرے نسخے میں اور دوسری کتابوں میں ولید بن عبدالملک کا ذکر ہے اور وہی صحیح ہے۔

﴿ان عمربن عبدالعزيز كتب فى مال قبضه بعض الولاة ظلما يأ مربردّه الى اهله، وتؤخذ زكاته لما مضى من السنين، ثم عقب بعد ذلك بكتاب : لا تؤخذ منه الزكاة الاّ[1] زكاة واحدة، فانه كان ضمارا﴾

(مؤطأ امام مالکؒ صفحہ ۱۰۷ الزکاۃ فی الدین)

"حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے مال کے بارے میں جس پر بعض نے ظلماً قبضہ کرلیا تھا' تحریر فرمایا کہ وہ مال اس کے مالکوں کو واپس کردیا جائے' اور اس کی پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی وصول کی جائے' لیکن اس کے بعد ایک اور خط بھیجا کہ اس سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ وصول کی جائے' پچھلے سالوں کی نہیں' کیونکہ وہ مالِ ضمار تھا"۔

ان تمام واقعات میں نقد روپے کی زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی گئی؛ اور وہ بھی عاشر پر گزرنے کی صورت میں نہیں' اور نہ مال کے شہر سے باہر ہونے کی حالت میں' بلکہ حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ تنخواہیں جاری کرتے وقت ان اموال کی زکوٰۃ ان تنخواہوں سے وصول فرماتے تھے جو تنخواہ دار کے گھروں' دکانوں یا دوسرے مقامات پر ان کی ملکیت میں ہوتے تھے۔ یہ حضرات واجب الاداء زکوٰۃ تنخواہ سے کاٹ کر باقی تنخواہ لوگوں کے حوالے کیا کرتے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ انھی تنخواہوں کی زکوٰۃ وصول فرماتے تھے' کیونکہ اگر مالک پہلے سے

---

[1] بعض ہندوستانی نسخوں میں لفظ اِلّا کتابت کی غلطی سے حذف ہوگیا ہے' صحیح عبارت وہی ہے جو اوپر لکھی گئی (اوجز المسالک صفحہ ۱۷۲ جلد ۳)۔

صاحبِ نصاب ہوتو تنخواہ کی اس رقم پر مالِ مُستفاد ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوتی تھی' البتہ یہ حضرات تنخواہوں سے زکوٰۃ کاٹنے کے بجائے پہلے تنخواہ حوالہ فرمادیتے' پھر مالک سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے۔ بہرصورت! اس نقد رقم سے سرکاری طور پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی' اور یہ سلسلہ اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی تفریق قائم ہونے کے بعد بھی جاری رہا' بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان رقوم سے بھی زکوٰۃ وصول فرمائی جو بیت المال میں ظلماً داخل کردی گئی تھیں۔

اس طریقِ کار سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار ہونے اور اس سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اس کا شہر سے باہر لے جانا ضروری نہیں' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے نجی مقامات کی تلاشی یا تفتیش کی ضرورت پیش نہ آئے' اور وہ فی الجملہ حکومت کے زیرِ حفاظت آگئے ہوں۔

تنخواہوں وغیرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا یہ طریقہ اُس دور میں بھی بِلا نکیر جاری رہا ہے' اور خود فقہاء حنفیہؒ نے بھی ان واقعات کو نقل کرکے اس کے تصدیق وتائید فرمائی ہے' چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنا خود امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل فرمایا ہے اور لکھا ہے :

قال القاسم : وكان ابوبكرؓ اذا اعطى الناس اعطياتهم يسئل الرجل هل عندك من مال قد وجبت فيه الزكاة؟ فان قال : نعم، اخذ من عطائه زكاة ذلك المال ، وان قال لا، سلّم اليه عطاءه قال محمد : وبهذا نأخذ ، وهو قول ابي

حنیفۃ رحمہ اللہ ﴾

(مؤطا امام محمدؒ صفحہ ۱۷۰ باب الرجل یکون علیہ الدین، ھل علیہ فیہ الزکاۃ؟)

اور اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں عائشہ بنت قدامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ روایت نقل کی ہے جو پیچھے مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے گزر چکی ہے۔

نیز علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اور شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ بالا واقعہ جس میں غصب شدہ مال کو واپس کرتے ہوئے اُس سے زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر ہے، ذکر فرما کر اُس سے مالِ ضمار پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے مسئلے میں استدلال فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مال سے ایک سال کی جو زکوٰۃ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے وصول فرمائی، وہ حنفیہؒ کے نزدیک بھی معمول بہ ہے، ورنہ وہ اس کی تردید یا توجیہ فرماتے۔

بلکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے بارے میں بھی حنفیہؒ کے نزدیک امام کو مکمل اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان کی زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے مُصدِّق بھیج کر سرکاری سطح پر ان کی زکوٰۃ وصول کرے، اور چاہے تو مالکوں کے حوالے کردے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کردیں، چنانچہ انہوں نے شرح معانی الآثار میں ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے: باب الزکاۃ یأخذ ھا الامام ام لا؟ اور اس میں اپنی عادت کے مطابق دونوں نقطۂ نظر بیان فرمانے کے بعد آخر میں لکھا ہے:

﴿ واماوجھہ من طریق النظر فانّا قد رأینا ھم انھم لایختلفون انّ للإمام أن یبعث الی ارباب المواشی السائمۃ

حتّٰی یأخذ منهم صدقة مواشیهم اذا وجبت فیها الصدقة وکذلك یفعل فی ثمارهم ثم یضع ذلك فی مواضع الزکوات علی ما أمرهٗ به عزّوجلّ، لایابیٰ ذلك احد من المسلمین، فالنظر علی ذلك ان یکون بقیة الاموال من الذّهب والفضّة واموال التجارات کذلك . . . . . وهذا کلّه قول ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ ومحمدؒ ﴾

(شرح معانی الآثار للطحاویؒ صفحہ ٢٦٣ و ٢٦٤ جلد ١)

"قیاس و نظر کے لحاظ سے بھی اس مسئلے میں صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مُفت چراگاہوں میں چَرنے والے مویشیوں کے مالکان کے پاس بھیج کر اُن کے مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کرے جب کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو' اسی طرح ان کے پھلوں میں بھی اس کو یہ حق حاصل ہے۔ پھر وہ حاصل شدہ زکوٰۃ کو مصارفِ زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب صَرف کرے' اس بات سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا' لہٰذا نظر وقیاس کا تقاضا یہ ہے کہ باقی اموال' سونا چاندی اور مالِ تجارت کا بھی یہی حکم ہو .... اور یہ سب کچھ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے"۔

یہاں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی قید و شرط کے بغیر امام کا یہ حق بیان فرمایا ہے کہ وہ سونا' چاندی اور مالِ تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے

مُصدِّق بھیج سکتا ہے' یہاں انہوں نے مصر یا غیر مصر کی بھی کوئی شرط نہیں لگائی' اور نہ عاشر کے پاس گزرنے کا کوئی ذکر فرمایا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا یہ اطلاق فقہاء حنفیہؒ کی دوسری تصریحات سے بظاہر معارض معلوم ہوتا ہے' اور مذکورہ بالا عبارت کے سیاق وسباق میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ان کی یہ ساری گفتگو مامرّعلی العاشر سے متعلق ہو' لیکن جہاں تک مذکورہ عبارت کا تعلق ہے' اس میں کوئی قید یا شرط نہیں ہے' اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ ان اموالِ باطنہ سے بھی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حنفیہؒ کے نزدیک اصلاً امام کو ہے' البتہ اُس مصلحت کے پیشِ نظر جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیش نظر تھی کہ جہاں لوگوں کے نجی مقامات کی تلاشی یا پڑتال کی ضرورت پڑتی ہو' وہاں مالکوں کو خود زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے اور جہاں یہ مصلحت داعی نہ ہو' وہاں وہ اپنے اصل حق کے مطابق زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے' چونکہ عاشر پر گزرنے والے اموال میں اس قسم کا کوئی مفسدہ نہیں ہے' اس لئے وہ اپنے اصل حق کے مطابق اُن سے زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے اور اگر کچھ مزید اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مفسدہ نہ ہو' وہاں بھی امام کا اصل حق عود کر آئے گا' اور وہ ان اموال سے زکوٰۃ وصول کرسکے گا' جس کی نظیریں تنخواہوں' وظائف اور مالِ مغصوب کے سلسلے میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ بلکہ اگر کسی جگہ یہ معلوم ہو کہ لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں' وہاں اس مفسدے کے باوجود امام اپنے اصل حق کے مطابق ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرسکے گا' کیونکہ ترکِ زکوٰۃ کا مفسدہ اس مفسدے سے شدید تر ہے۔ یہی بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہؒ نے تحریر فرمائی ہے' مثلاً علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ظاهر قوله تعالی : خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَۃً الآیۃ توجب اخذ الزکاۃ مطلقا للامام، وعلی ھذا کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والخلیفتان بعدہ، فلمّا ولی عثمان وظھر تغیّر الناس کرہ ان یفتّش السعاۃ علی الناس مستور اموالھم، ففوّض الدفع الی الملاّک نیابۃً عنہ، ولم یختلف الصحابۃ فی ذلک علیہ، و ھذا لا یسقط طلب الا مام اصلا، ولھٰذا لوعلم اھل بلدۃ لا یؤدّون زکاتھم طالبھم بھا﴾ (فتح القدیر صفحہ٤٨٧ جلد ١)

"آیت قرآنی خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَۃً الخ کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام کو مطلقاً (ہر قسم کے اموال کی) زکوٰۃ وصول کرنا واجب ہے' اور اسی طرزِ عمل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دو خلیفہ قائم رہے' لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے اور لوگوں کے حالات بدل گئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بات پسند نہ فرمائی کہ محصّلینِ زکوٰۃ لوگوں کے پوشیدہ اموال کی تفتیش کریں' چنانچہ انہوں نے مالکوں کو ادائے زکوٰۃ کا حق سونپ کر اس معاملے میں انھیں اپنا نائب بنادیا' اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس معاملے میں ان سے اختلاف نہیں فرمایا' لیکن یہ طرزِ عمل امام کے حقِّ مطالبہ کو بالکلیہ ساقط نہیں کرتا' چنانچہ اگر کسی شہر کے لوگوں کے بارے میں امام کو یہ معلوم ہو کہ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو

وہ اُن سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے گا"۔

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ اصلاً تمام اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق امام ہی کو ہے' اور اموالِ باطنہ کے سلسلے میں یہ حق ایک مصلحت سے چھوڑا گیا ہے' اور بالکلیہ اب بھی ساقط نہیں ہوا' بلکہ ان اموال کی زکوٰۃ جو مالکان ادا کرتے ہیں وہ بھی امام کے نائب کی حیثیت میں ادا کرتے ہیں' اصلاً ان کو یہ اختیار بھی نہیں تھا' اور اسی لئے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے دَین کو فقہاء نے له مطالب من جهة العباد قرار دیا ہے۔

یہاں بعض حضرات کو یہ شبہ پیش آیا ہے کہ امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل کا ذکر فرما کر لکھا ہے :

﴿ فجعل لهم اداء ها الى المساكين وسقط من اجل ذلك حقّ الامام فى اخذها لأنه عقد عقده امام من ائمة العدل، فهو نافذٌ على الأُمّة ﴾ (احکام القرآن للجصاص صفحہ ۱۹۰ جلد ۳)

"حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کے مالکوں کو یہ حق دے دیا کہ وہ مساکین کو اپنے طور پر زکوٰۃ دے دیا کریں' اور اس لئے اب ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے سلسلے میں امام کا حق ساقط ہوگیا' اس لئے کہ ائمۂ عدل میں سے ایک امام کا کیا ہوا فیصلہ ہے' جو پوری امّت پر نافذ ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلے کے بعد اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حقّ کسی کو نہیں رہا' لیکن امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ کی پوری عبارت بغور پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ حقِ امام

سے ان کی مراد ایسا حق ہے جس کے بعد مالکانِ اموال کو ازخود زکوٰۃ ادا کرنے کا اختیار باقی نہ رہے' اور ان کی ادائیگی کو شرعاً تسلیم نہ کیا جائے۔ چنانچہ ان کی مذکورہ عبارت سے پہلے اُن کے الفاظ یہ ہیں :

﴿ وقوله تعالیٰ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً یدل علی أنّ اخذ الصدقات الی الإمام، وانّه متی اداها من وجبت علیه الی المساکین لم یجزه، لانّ حق الامام قائم فی اخذها، فلا سبیل له الی اسقاطه ﴾

"اور باری تعالیٰ کا ارشاد خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کا کام امام کے سُپرد ہے اور یہ کہ اگر وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے' زکوٰۃ اپنے طور پر مساکین کو ادا کردے تو یہ اس کے لئے جائز نہیں اس لئے کہ امام کا وصولیابی کا حق قائم ہے' اور اُسے ساقط کرنے کا کوئی راستہ نہیں"۔

مذکورہ جملے سے صاف واضح ہے کہ وہ امام کے ایسے حق کا تذکرہ فرما رہے ہیں جس کی موجودگی میں مالک کو ازخود زکوٰۃ ادا کرنا ناجائز ہی نہ ہو' بلکہ اس سے زکوٰۃ ادا بھی نہ ہو' پھر اسی حق کے بارے میں آگے لکھا ہے کہ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ائمہ عدل میں سے تھے اور انہوں نے اموالِ باطنہ کی حد تک یہ حق ساقط کردیا' اس لئے یہ حق اب ساقط ہوگیا[1]۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت

---

[1] چنانچہ مویشیوں کے بارے میں اب امام کا حق اسی نوعیت کا ہے کہ اس کی موجودگی میں مالک کو ازخود زکوٰۃ دینا جائز نہیں' بلکہ بعض فقہاءؒ کے نزدیک تو اس طرح زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوتی' مبسوط میں ہے :

﴿فان قال دفعتها الی المساکین لم یصدق وتؤخذ منه الزکاة عندنا . . . . . ولنا ان هذا حق مالی یستوفیه الامام بولایة شرعیة، فلایملك من علیه اسقاط حقه فی الإستیفاء . . . . . ولا یبرأ بالاداء الی الفقیر فیما بینه وبین ربه وهو بعض مشائخنا ﴾ (مبسوط صفحه ۱۶۱ و ۱۶۲ جلد ۲)

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ از خود مساکین کو دینا جائز نہیں تھا اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تھی' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اختیار انہیں دے دیا' اب یہ بات طے ہو گئی کہ ایسے اموال کے مالکان اگر از خود زکوٰۃ ادا کردیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام کا حقِ اخذ بالکلیہ ساقط ہو گیا' اور اب وہ زکوٰۃ وصول کرنا چاہے تو وصول نہیں کرسکتا' چنانچہ فتح القدیر کی مذکورہ بالا عبارت اس پر صریح ہے کہ

وھذا لایسقط طلب الامام اصلاً

امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ کی اس پوری بحث کو اور دوسرے فقہاء و محدثین کی عبارتوں اور روایات کو دیکھنے کے بعد اس سلسلے میں جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ :

○ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک اور حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانوں میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ دونوں سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی' البتہ اتنا فرق ضرور تھا کہ مویشیوں اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مُصدّق بھیجے جاتے تھے' اور نقود اور اموالِ تجارت کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مُصدِّق بھیجنے کے بجائے مالکوں کو حکم تھا کہ وہ خود زکوٰۃ لے کر آئیں' لیکن دونوں قسم کے اموال میں ادائے زکوٰۃ کا راستہ یہی تھا کہ وہ حکومت کو دی جائے۔

○ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہر سے باہر جانے والے اموال کے بارے میں یہ تبدیلی فرمائی کہ اس کی وصولیابی کے لئے مُصدِّق مقرر فرمائے' اور باقی اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ حسبِ سابق مالکان خود لا کر دیتے رہے۔

○ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اموالِ باطنہ کی کثرت ہو گئی' آبادی پھیل گئی اور انہوں نے محسوس فرمایا کہ اب اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی سرکاری سطح پر وصولیابی کا یہ سلسلہ کہ اس کے بغیر ادائے زکوٰۃ جائز ہی نہ ہو' اگر

باقی رکھا گیا تو اس کے لئے اموالِ ظاہرہ کی طرح مُصدِّق مقرر کرنے پڑیں گے، اور لوگوں کے نجی مقامات میں ان کی دخل اندازی سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، لہٰذا آپ نے مالکان کو اجازت دے دی کہ وہ ان اموال کی زکوٰۃ خود ادا کرلیا کریں۔

○ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عمل کے بعد لوگوں کو اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن زکوٰۃ کی وصولیابی کا اصلی حق اب بھی امام ہی کو ہے، چنانچہ دو صورتوں میں اب بھی وہ زکوٰۃ کی وصولیابی کا اہتمام کرسکتا ہے، ایک یہ کہ کسی جگہ کے لوگوں کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور دوسرے یہ کہ کچھ اموالِ باطنہ اس طرح اموالِ ظاہرہ میں شامل ہوجائیں کہ ان سے زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے نجی مقامات کے تفتیش کی ضرورت نہ پڑے۔

○ چونکہ قدیم زمانے میں نجی مقامات کی تفتیش کے بغیر اموال کے ظاہر ہوجانے کی جو صورت کثرت سے پیش آتی تھی وہ یہ تھی کہ اموال کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے وقت وہ عاشر پر گزرتے تھے، اس لئے فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس صورت کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے اور اس طرح تعبیر فرمایا کہ "یہ اموال شہر سے باہر نکل کر اموالِ ظاہرہ میں شامل ہوگئے ہیں اور جو اموال شہر کے اندر ہیں وہ اموالِ باطنہ ہیں" اس لئے یہ "شہر سے باہر نکلنا" اصل مدارِ حکم یا بطورِ علّت نہیں، بلکہ اپنے عہد کے لحاظ سے ایک واقعے کا بیان ہے، ورنہ اصل مدارِ حکم وہی ہے جس کی بنا پر اموالِ باطنہ کو زکوٰۃ کی سرکاری وصولیابی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، یعنی تفتیش کے بغیر ان کا ظاہر ہوجانا، چنانچہ قرونِ اولیٰ میں ان اموال میں سے بھی زکوٰۃ وصول کی گئی جو شہر سے باہر نہیں ہوتے تھے، لیکن تفتیش کے بغیر ظاہر ہوتے تھے مثلاً تنخواہیں، وظائف اور حکومت کے اموال مغصوبہ، جس کی روایات پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہاں بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ بعض اموال حکومت پر تفتیش کے بغیر ظاہر ہو جاتے تھے لیکن اس کے باوجود حکومت اُن سے زکوٰۃ وصول نہیں کرتی تھی' مثلاً عاشر پر گزرنے والا اگر اپنے نجی مقامات پر رکھے ہوئے اموال کے بارے میں اقرار کرلیتا تو ان کی زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی' جس کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے۔

اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ اقرار کے ذریعے تو اموالِ باطنہ میں سے ہر مال ظاہر بن سکتا ہے' لیکن چونکہ جُزوی واقعات کو کُلّی احکام کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا' اور عاشر کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ جس مال کو چاہے ظاہر قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کرلے' اس لئے اس کو یہ لگا بندھا اُصول بتادیا گیا کہ جو کوئی شخص تمہارے پاس مال لے کر گزرے تو صرف اس مال سے زکوٰۃ وصول کرسکتے ہو جو اس وقت تمہارے سامنے آجائے' اور لوگوں کے گھروں یا دکانوں پر جو مال ہے اُس سے تعرّض نہ کرو۔ اس اصول کے تحت "عاشر" کو گھروں میں رکھے ہوئے مال سے تعرّض کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اور جب یہ اُصول مقرر ہوگیا تو اگر کسی جزوی واقعے میں کوئی شخص اپنے مالِ باطن کو عاشر پر اقرار کے ذریعے ظاہر بھی کردے تو یہ ایک استثنائی واقعہ ہوگا' جس سے اُصول تبدیل نہیں ہوسکتا' اس لئے اس صورت میں بھی بطورِ اُصول اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

ہاں اگر کچھ ایسے اموال پائے جائیں جن کی نوعیت ہی ایسی ہو کہ وہ سب کے سب بذاتِ خود حکومت پر بغیر تفتیش کے ظاہر ہوجاتے ہوں' اور حکومت اُن تمام اموال کے بارے میں یہ طے کردے کہ ان تمام اموال سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی تو اس میں شرعی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے' بلکہ تنخواہوں' وظائف اور اموالِ مغصوبہ سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی وہ اس کے جواز کی واضح نظیر ہے۔

دوسرے الفاظ میں "خروج من المصر" عاشر کے لئے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجازت کی تو علّت ہے لیکن امام کے لئے وصولئ زکوٰۃ کے اختیار کی علّت نہیں' بلکہ اس کے لئے علّت اموال کا تفتیش کے بغیر ظاہر ہوجانا ہے' چنانچہ جن اموال کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ بغیر تفتیش کے ظاہر ہوجاتے ہوں' ان سے مَامَرَّعَلی العَاشِرِ کی طرح وہ زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم جاری کرسکتا ہے' جیسا کہ تنخواہوں وغیرہ کے معاملے میں کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم "خروج من المصر" کا تذکرہ "باب فیمن یمرّعلی العاشر" میں تو فرماتے ہیں' جس کا موضوع یہ ہے کہ عاشر کون سے اموالِ زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے' لیکن جس جگہ امام کے وصولئ زکوٰۃ کے اختیار کا بیان ہے' وہاں عموماً "خروج من المصر" کو بطورِ علّت ذکر نہیں کیا جاتا' بلکہ وہاں علّت یہی بیان کی جاتی ہے کہ اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے میں لوگوں کے نجی مقامات میں دخل اندازی اور ان کی تفتیش لازم آجاتی ہے جس سے عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے' جیسا کہ فتح القدیر کی عبارت پیچھے گزرچکی ہے' اور امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت مجلس کی تحریرِ سابق میں نقل کی جاچکی ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص بینک میں رقم رکھواتا ہے تو شرعاً وہ رقم بینک کے ذمّے قرض ہوتی ہے، امانت نہیں، اسی لئے وہ بینک پر مضمون بھی ہوتی ہے اور اس پر زیادتی وصول کرنا سُود ہوتا ہے۔ اور جب کسی شخص نے کوئی رقم کسی دوسرے فرد یا ادارے کو بطور قرض دے دی تو وہ اس شخص کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں داخل ہوگئی۔ اب اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ رقم اُسے وصول ہو جائے گی، اس سے پہلے زکوٰۃ واجب الاداء نہیں۔ لہٰذا بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وضع کرنے پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب الاداء ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کرلی گئی ہے۔ اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دائن سے وصول کرنے کے بجائے مدیون کے مال سے وصول کی گئی ہے، حالانکہ اس کی کوئی نظیر معہود فی الشّرع نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

ذیل میں ان دونوں اعتراضات کی تحقیق مقصود ہے:

ان دونوں مسائل کی تحقیق کے لئے پہلے بینک اکاؤنٹس کی صحیح حیثیت متعین کرنا ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فقہی اعتبار سے بینک اکاؤنٹ قرض[1] ہے۔ لیکن دائن کے تصرف کے لحاظ سے یہ ایک بالکل نئی قسم کا قرض ہے جو فقہاء کرام رحمۃ

اللہ علیہم کے عہد میں موجود نہیں تھا اور جس کی نظیریں بھی اس دور میں کم ملتی ہیں، لہٰذا زکوٰۃ کے حق میں بینک اکاؤنٹس کو بالکلیہ دوسرے دیون اور قرضوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہوگا، وجوبِ زکوٰۃ کے حق میں دَین کے اندر اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دائِن کے لئے کس حد تک مرجوّالوصول ہے، اور دائِن کا تصرّف اس پر کس حد تک برقرار ہے، اسی بناء پر فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے وجوب زکوٰۃ کے معاملے میں دَین قوی، دَین متوسّط اور دَین ضعیف کی تقسیم فرمائی ہے، اور اسی بناء پر دَین مجحود کو مالِ ضمار میں شامل کرکے اسے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، جب ہم اس نقطۂ نظر سے بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ دَین ہونے کے باوجود اس معاملے میں دوسرے عام دیون سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

(۱) عام قرضوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ مُقرض کے قبضے سے نکلنے کے بعد ان پر مُقرِض کا کوئی تصرّف باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ مقروض کے رحم وکرم پر ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اُسے ادا کرے۔ اس کے برعکس بینک اکاؤنٹس میں مقرض کے طلب

لہ البتہ جن اکاؤنٹس پر سُود کا لین دین طے ہوتا ہے، مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈپازٹ، ان میں ایک اور بھی احتمال قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ وہ شرکت فاسدہ یا مضاربت فاسدہ کا مال ہو، کیونکہ فقہائے کرامؒ یہ لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے شرکت یا مضاربت کرتے وقت نفع کے شائع حصے کے بجائے معین رقم طے کرلی جائے تو شرکت اور مضاربت فاسد ہوجاتی ہے۔ (شامی) اور شرکت فاسدہ اور مضاربت فاسدہ دونوں میں جب تک شریکین مال واپس نہ لیں ان کے درمیان شرکت فی الملک قائم ہوجاتی ہے، اور دونوں اپنے اپنے حصے کے مالک رہتے ہیں۔ وہ رقم دَین نہیں بلکہ مالِ تجارت کے حکم میں رہتی ہے۔ اور غیر سُودی اکاؤنٹس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ اصلاً ودیعت تھی، لیکن خلط بالإذن کی بنا پر وہ مال شرکتِ ملک بن گیا۔ چنانچہ درمختارِ کتاب الایداع میں تصریح ہے کہ ودیعت خلط بالإذن سے شرکتِ ملک بن جاتی ہے۔ (شامی صفحہ ۸و۴ جلد ۴) اور حضرت تھانوی قدس سرّہ نے سیونگ اکاؤنٹ کو اسی بناء پر شرکتِ ملک کا مال قرار دیا ہے۔ (امداد الفتاویٰ صفحہ ۳۰۹ جلد ۳)

اگر ان اکاؤنٹس کی یہ توجیہ درست ہو تو ان اکاؤنٹس کے دَین ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس توجیہ میں تأمّل یہ ہے کہ اس کے مطابق ان اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پھر مضمون نہ ہوگی، حالانکہ فریقین کی طرف سے مضمون ہونا شرط ہوتا ہے۔ فلیتامل

کرنے پر فوری ادائیگی نہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا' اور یہ بینک کی طرف سے صرف زبانی اقرار نہیں ہوتا' بلکہ بینکوں کا مسلسل بلا تخلّف طرزِ عمل یہی ہے' جس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے' لہٰذا یہ قرض کی وہ قسم ہے جس میں مُقْرِض اپنی رقم جب چاہے فوراً بلا تخلّف واپس لے سکتا ہے اور عملاً وہ ایسی ہی قابلِ اعتماد ہے جیسے اپنی تجوری میں رکھی ہوئی رقم' بلکہ اس سے بھی زیادہ' کہ تجوری کی رقم میں ہلاک ہونے کا خطرہ ہے' لیکن بینک اکاؤنٹ میں ایسا خطرہ بھی نہیں ہے۔

(۲) بینک اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پر ہر اکاؤنٹ ہولڈر ٹھیک اسی طرح تصرّف کرتا ہے جس طرح اپنی الماری میں رکھی ہوئی رقم پر تصرّف کرتا ہے۔ اس وقت تجارت کا سارا کاروبار بینک اکاؤنٹس ہی پر چل رہا ہے اور بیشتر ادائیگیاں بینک ہی کے ذریعے ہوتی ہیں۔

(۳) عُرف عام میں بھی بینک میں رقم رکھوانے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے یہ رقم کسی کو قرض دے دی ہے' بلکہ وہ اُسے اپنی ہی رقم سمجھتا ہے' اور اس کے ساتھ اپنی رقم ہی کا سا معاملہ کرتا ہے' جب کوئی شخص اپنے حاضر وغائب مال کی فہرست بناتا ہے تو بینک اکاؤنٹس کو مال حاضر میں شمار کیا جاتا ہے' مالِ غائب میں نہیں۔

(۴) عام قرضوں کا حال یہ ہے کہ معاہدۂ قرض کا محرّک مُستقرض ہوتا ہے' لیکن یہاں محرّک مُقْرِض ہوتا ہے' اور اس کا اصل منشاء قرض دینے کے بجائے اپنے مال کی حفاظت ہوتا ہے۔

عام قرضوں کے مقابلے میں بینک اکاؤنٹس کی ان وجوہ فرق کو ذہن میں رکھ کر قرضوں پر زکوٰۃ کے مسئلے پر غور فرمایئے۔

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر پہلا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ قرضے پر اگرچہ زکوٰۃ فرض تو ہوتی ہے' لیکن اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی

ہے' جب وہ دائن کے قبضے میں واپس آجائے' اور زیرِ بحث صورت میں دائن کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ قرضوں پر زکوٰۃ کا نفس وجوب تو متّفق علیہ ہے' البتّہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مُقْرِض کو یہ سہولت دی ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس پر واجب اس وقت ہوگی جب قرضے کی رقم اُسے واپس ملے گی' چنانچہ جب بھی چالیس درہم کی مقدار اس کے پاس واپس آئے گی' ایک درہم بطور زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہوگا' اس سہولت کا پس منظر اور اس کی اصل وجہ مندرجۂ ذیل روایات سے واضح ہوتی ہے :

(۱) امام بیہقیؒ روایت فرماتے ہیں :

﴿عن حميد بن عبدالرحمن بن عبدالقاري، وكان على بيت مال عمر رضى الله عنه قال : كان الناس ياخذون من الدين الزكاة، وذلك انّ الناس اذا خرجت الاعطية حبس لهم العرفاء ديونهم، ومابقى فى ايديهم اخرجت زكاتهم قبل ان يقبضوا، ثم داين الناس بعد ذلك ديونا هالكة فلم يكونوا يقبضون من الدين الصدقة الا مانضّ منه ولكنهم كانوا اذا قبضوا الدين اخرجوا عنها لما مضى﴾

(السنن الكبرىٰ للبيهقىؒ صفحه ۱۵۰ جلد ٤ باب زكاة الدين اذا كان على مصر اوجاحد)

"حمید بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بیت المال پر مقرّر تھے' فرماتے ہیں کہ لوگ دین سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے' جس کا طریقہ یہ تھا کہ جب لوگوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا وقت آتا تو عرفاء ان کے دیون کا

حساب کرتے' اور جو باقی بچتا اس کی زکوٰۃ ان کے قبضہ کرنے سے پہلے ہی نکال لی جاتی' لیکن اس کے بعد لوگوں نے ایسے دیون کا معاملہ شروع کردیا جو بعض اوقات ضائع ہو جاتے تھے' اس لئے حکّام صرف اُس دَین سے زکوٰۃ وصول کرتے جو نقد شکل میں آجاتا' لیکن لوگ جب اپنے قرضوں پر قبضہ کرتے تو زمانۂ گزشتہ کی زکوٰۃ بھی نکالتے تھے"۔

اس روایت سے واضح ہے کہ اصلاً دیون کا حکم بھی یہی تھا کہ سال بسال اُن کی زکوٰۃ ادا کی جائے' خواہ وہ قبضے میں نہ آئے ہوں' لیکن چونکہ بعض مرتبہ لوگ زکوٰۃ نکال دیتے ہیں' اور بعد میں دیون وصول نہیں ہوتے' اس لئے یہ سہولت دی گئی کہ دیون کی زکوٰۃ دیون وصول ہونے کے بعد دی جائے' لیکن جب ادا کی جائے تو سالہائے گزشتہ کی بھی ادا کی جائے۔ اس کے باوجود صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم کی ایک بڑی جماعت کا مسلک یہی رہا ہے کہ مدیون اگر قابلِ اعتماد ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وصولیابی کا انتظار نہ کیا جائے' بلکہ سال کے سال زکوٰۃ ادا کی جاتی رہے' چنانچہ حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت ابن عمرؓ' حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم' حضرت جابر بن زید' حضرت مجاہد' حضرت ابراہیم نخعی' حضرت میمون بن مہران' حضرت قتادہ' اور حضرت سعید بن المسیّب رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کا مسلک یہی تھا۔

(کتاب الاموال لابی عبیدؒ صفحہ ۴۳۴ باب الصدقۃ فی التجارات والدیون فقرہ نمبر ۱۲۳۶ و مصنف عبدالرزاق صفحہ ۱۰۴ جلد ۴ باب لا زکاۃ الا فی الناض)

اسی کو امام ابو عبیدؒ نے ترجیح دی ہے' اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔ (نہایۃ المحتاج صفحہ ۱۳۰ جلد ۳)

لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ دَین خواہ کتنے قابلِ

اعتماد شخص کے پاس ہو، اس میں چونکہ عدم ادائیگی کا احتمال بھی رہتا ہے، لہٰذا جب تک وہ مالک کے قبضے اور تصرف میں نہ آجائے اس وقت تک وجوبِ ادا نہیں ہوگا، اس کے لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے جسے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

﴿عن علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال : اذا کان ذلك دَین علی الناس فقبضه فزکّاہ لما مضی قال محمدؒ: وبه نأخذ وهو قول ابی حنیفةؒ﴾ (کتاب الآثار صفحہ۱۰۸)

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کسی کا دَین لوگوں پر ہو اور وہ اس پر قبضہ کرلے تو زمانۂ ماضی کی زکوٰۃ ادا کرے گا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد پر رکھی ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے :

﴿عن علی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه فی الدَین الظَّنون قال : ان کان صادقا فلیزکه اذا قبضه لما مضی﴾

"جس دَین کی وصولیابی مشکوک ہو اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "اگر دائن سچا ہے تو دَین پر قبضہ کرنے کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے"۔

امام ابوعبیدؒ نے "دَینِ ظنون" کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ

﴿ هوالذی لا یدری صاحبه ایقضیه الذی علیه الدّین ام لا؟ ﴾

(بیہقیؒ صفحہ ۱۵۰ جلد ٤ وکتاب الاموال صفحہ ٤٣١ فقرہ ١٢٢٠ ومصنف ابن ابی شیبہؒ صفحہ ١٦٣ جلد ٣)

یعنی "یہ وہ دَین ہے جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ مدیون اُسے ادا کرے گا یا نہیں کرے گا؟ "

اور اس ارشاد کی تفصیل امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں روایت فرمائی ہے :

﴿ عن الحسن قال : سئل علّی عن الرجل یکون له الدّین علی الرجل ، قال : یزکیه صاحب المال فان توی ماعلیه وخشی ان لا یقضی، قال : یمهل فاذاخرج ادّی زکاة ماله ﴾ (مصنف ابن ابی شیبہؒ صفحہ ١٦٢ جلد ٣)

"حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ سوال کیا گیا کہ کسی شخص کا دَین دوسرے پر واجب ہو (تو وہ کیا کرے؟) آپؓ نے فرمایا کہ مالک اس کی زکوٰۃ نکالے' لیکن اگر اُسے یہ اندیشہ ہو کہ مدیون ادا نہیں کرے گا تو وہ ٹھہر جائے' اور جب دَین وصول ہو جائے تو اس وقت ادا کر دے"۔

اس معلوم ہوا کہ اس باب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ کا ہے۔ یعنی :

﴿أنّ عبداللہ بن عباس وعبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنهما قالا : من اسلف مالا فعلیہ زکاتہ فی کل عام اذا کان فی ثقة ﴾ (السنن الکبری للبیهقی صفحہ۱۴۹ جلد)

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کوئی مال قرض دے تو اُس پر ہر سال اُس کی زکوٰۃ واجب ہے' اگر وہ قابلِ اعتماد جگہ پر ہو"۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکمّل الفاظ یہ ہیں

﴿ زکّوا ما کان فی ایدیکم، وما کان فی دَین فی ثقة فهو بمنزلة مافی ایدیکم، وما کان فی دَین ظنون فلا زکاة فیه حتی یقبضه ﴾

(بیهقیؒ صفحہ ۱۵۰ جلد ۴ ومصنّف ابن ابی شیبہؒ صفحہ ۱۶۲ جلد ۳)

"جو مال تمہارے ہاتھوں میں ہو اس کی زکوٰۃ نکالو' اور جو دَین قابلِ اعتماد جگہ پر ہو' وہ ایسا ہی ہے جیسے تمہارے قبضے کا مال' اور جو دَین ظنون ہو تو اُس پر اُس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں جب تک وہ قبضے میں نہ آجائے"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا ایک حصّہ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل فرمایا ہے اور اس سے دَین کے مسئلے میں مالکیہ کے خلاف استدلال فرمایا ہے :

﴿ عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ تعالی عنه انه قال فی

الدَّین یُرجیٰ، قال : زَکِّہِ کل عام﴾

(کتاب الحجۃ علیٰ اھل المدینۃ صفحہ ٤٧٢ جلد ١)

"حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس دَین کے بارے میں فرمایا جس کی وصولیابی کی اُمید ہو کہ اس کی زکوٰۃ ہر سال نکالو"۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہاء حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم نے اس باب میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال پر رکھی ہے' اور ان کے نزدیک اگرچہ قبضے کے بعد زکوٰۃ کا وجوب صِرف اس صُورت میں ہے جب کہ دَین کی وصولیابی مظنون ہو' جہاں وصولیابی کا وثوق نہ ہو' وہاں ان کے نزدیک وجوبِ ادا بھی قبضے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے' لیکن فقہائے حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم نے اس پہلو پر نظر فرمائی کہ معروف دیون میں سے ہر دَین میں' خواہ وہ کتنے ہی قابلِ اعتماد شخص کے پاس ہو' عدمِ ادائیگی کا کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہوتا ہے' لہٰذا انھوں نے ہر دَین قوی کو "دَینِ مظنون" قرار دے کر یہ عام حکم لگادیا کہ اس پر نفسِ وجوب تو ہو جاتا ہے' لیکن وجوبِ ادا قبضے کے بعد ہوگا۔

اِس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب ہم بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں' اور عام دیون کے مقابلے میں اُن کی جو وُجوہِ فرق شروع میں بیان کی گئیں' اُن کو دیکھتے ہیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ یہ دَینِ قوی کی وہ قسم ہے جو فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کے عہد میں موجود نہیں تھی' یا اس کی نظیریں شاذونادر تھیں' اور اس قسم کو "دَینِ مظنون" کسی طرح قرار نہیں دیا جاسکتا' بلکہ یہ وصولیابی کے یقین' دائن کے آزادانہ تصرّفات اور عرف عام کی رُو سے بالکل اس طرح دائن کی ملکیت اور تقدیری قبضے میں رہتا ہے جیسے اپنے گھر میں رکھا ہوا مال' لہٰذا حضرت عبداللہ بن

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے الفاظ میں بمنزلۃِ مافی ایدیکم کا اطلاق اس سے زیادہ کسی دَین پر نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ اگر بینک اکاؤنٹس پر زکوٰۃ کے وجوبِ اداء کے لئے دوسرے دیون کی طرح ان کے نقد ہونے کی شرط لگائی جائے تو اس سے اتنی عملی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی بہت مشکل ہوجائے گی، امام ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے تو عام دیون کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے کہ :

﴿ وانما اختاروا ـ اومن اختار منهم ـ تزكية الدّين مع عين المال لانّ من ترك ذلك حتى يصير الى القبض لم يكد يقف من زكاة دينه على حدّ، ولم يقم بادائها، وذلك انّ الدين ربّما اقتضاه ربه متقطعا، كالدّراهم الخمسة والعشرة واكثر من ذلك واقلّ، فهو يحتاج فى كلّ درهم يقتضيه فمافوق ذلك الى معرفة ماغاب عنه من السنين والشهور والايّام، ثمّ يخرج من زكاته بحساب مايصيبه وفى اقلّ من هذا ماتكون الملالة والتّفريط، فلهذا اخذواله بالاحتياط، فقالوا : يزكيه مع جملة ماله فى رأس الحول، وهوعندى وجه الأمر ﴾

(كتاب الاموال صفحه٤٣٤ فقره١٢٣٦)

"جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ دَین کی زکوٰۃ عین مال کے ساتھ ہی ادا کی جائے، انہوں نے اس مسلک کو اس لئے اختیار فرمایا کہ جو شخص دَین کی زکوٰۃ کو قبضہ ملنے تک مؤخر کرے گا وہ اپنے دیون کی زکوٰۃ کو حد کے مطابق معلوم کرکے

اس کی صحیح ادائیگی نہ کر سکے گا' اس لئے کہ دَین بعض اوقات
قسطوں میں وصول ہوتا ہے' مثلاً کبھی پانچ مِل گئے' کبھی دس
کبھی زیادہ' کبھی کم' اب اسے جو درہم بھی حاصل ہوگا اس
کے بارے میں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کتنے سال' کتنے مہینے'
کتنے دن اس کے قبضے سے خارج رہا ہے' پھر وہ اسی کے حساب
سے زکوٰۃ نکالے گا' اور اس عمل میں مشقت اور کوتاہی کا بڑا
امکان ہے' اس لئے ایسے شخص کے لئے ان علماء نے احتیاط پر
عمل فرمایا' اور یہ حکم دے دیا کہ وہ ہر سال اپنے دوسرے مال
کے ساتھ دَین کی زکوٰۃ بھی نکال دیا کرے' اور یہی میرے
نزدیک صحیح طریقہ ہے"۔

لیکن عام دیون کے بارے میں یہ دُشواری قابلِ لحاظ ہو یا نہ ہو' لیکن بینک اکاؤنٹس کے بارے میں تو اس قسم کا حساب وکتاب عملی اعتبار سے تقریباً ناممکن ہے' کیونکہ عام طور پر ان اکاؤنٹس سے بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ رقمیں نکالی اور نئی داخل کی جاتی ہیں' اور قبضے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہر اکاؤنٹ ہولڈر اپنے اکاؤنٹ کے ہر ہر روپے کے بارے میں یہ ریکارڈ پوری طرح محفوظ رکھے کہ وہ کتنے عرصے بینک میں رہا ہے' تاکہ اس پر واجب ہونے والی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کر سکے' اور جب کوئی رقم بینک سے نکالے تو پہلے یہ حساب کرے کہ یہ رقم کتنے سال بینک میں رہی ہے' اور اس پر کتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے' پھر زکوٰۃ ادا کرے' اور اس میں جو عملی تعذّر ہے وہ مخفی نہیں۔ اور خود فقہائے حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم نے مال مُستفاد کا الگ سال شمار نہ کرنے پر ایک دلیل یہی عملی تعذّر کی پیش کی ہے۔ چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے تو مال مُستفاد پر الگ سال شمار کرنے والوں پر طنز فرماتے ہوئے یہاں تک لکھا ہے کہ :

﴿ینبغی لصاحب هذا المال ان یقعد حسّاباً یحسبون زکاة ماله متی تجب؟ ارایتم الرجل اذا کان یفید الیوم الفاً وغداً الفین وبعد غدٍ ثلاثة آلاف، وبعد ذلك خمسة آلاف وبعد ذلك بعشرین یوما عشرة آلاف، أینبغی له ان یزکی کل مال من هذه الاموال علیٰ حدة؟ وهذا قول ضیّق لا یوافق ماعلیه الناس، ینبغی له ان یجمع ماله کلّه ثم یزکیه اذا وجبت الزکاة علی ماله الاوّل﴾

(کتاب الحجة علی اهل المدینة صفحه ۴۹۱ و ۴۹۲ جلد ۱)

" (ان حضرات کے قول کے مطابق) تو ہر صاحبِ مال کو چاہئے کہ وہ باقاعدہ مُحاسب اس کام کے لئے بٹھائے کہ وہ اس کی زکوٰۃ کا حساب کیا کریں کہ وہ کب واجب ہوگی؟ ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک شخص کے پاس آج ایک ہزار آتے ہیں' کل دوہزار' پرسوں تین ہزار' اس کے بعد پانچ ہزار' پھر بیس دن کے بعد دس ہزار' تو کیا وہ ان تمام رقموں کی الگ الگ زکوٰۃ نکالے گا؟ یہ تو بڑا تنگ قول ہے جو لوگوں کے طرزِ عمل کے موافق نہیں' اس کے بجائے اسے چاہئے کہ وہ اپنا سارا مال جمع کرے پھر سارے مال کی زکوٰۃ ایک ساتھ اسی وقت نکالے جب اس کے پہلے مال پر زکوٰۃ واجب ہوئی تھی"۔

اور حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ "جو فقہِ حنفی کا بہت بڑا مأخذ ہیں" اُن کا ایک ارشاد امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے کہ :

﴿ ومن كان له من دين ثقة فليزكه ، وما كان لا يستقر يعطيه اليوم ويأخذ الى يومين فليزكه ﴾

(مصنف ابن ابی شیبہؒ صفحہ ۱۶۲ جلد ۳)

"جس شخص کا کوئی دَین کسی قابلِ اعتماد شخص پر ہو' اُس کو چاہئے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے' اور جو دَین ایک حالت پر نہ رہتا ہو' آج وہ کسی کو دیتا ہو اور دو دن تک واپس لے لیتا ہو' اس کی بھی زکوٰۃ نکالے"۔

اس کا منشاء بھی غالباً یہی ہے کہ دیون کی جو رقمیں آتی جاتی رہتی ہوں اُن کا الگ الگ حساب رکھنا چونکہ مُتعذّر ہے' اس لئے ان سب کی زکوٰۃ ایک ساتھ ہی نکالنی چاہئے' اور اِس قسم کے دیون کی جتنی مکمل مثال بینک اکاؤنٹس ہیں اتنی مکمل مثال شاید کوئی اور ممکن نہ ہو۔ لہٰذا ان تمام دلائل کی روشنی میں بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر یہ اعتراض درست نہیں رہتا کہ ان کی زکوٰۃ وجوب ادا سے پہلے وصول کرلی گئی ہے' بلکہ مذکورہ بالا دلائل کی رو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان اکاؤنٹس کا وجوبِ ادا بھی اُسی وقت ہوجاتا ہے' جب دوسری رقموں کا سال پورا ہو۔

بینک اکاؤنٹس کے دَین ہونے کی بنیاد پر اُن سے زکوٰۃ وضع کرنے پر دوسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص نے کوئی رقم بینک کو قرض دے دی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں آگئی' لہٰذا جس رقم سے حکومت زکوٰۃ وصول کررہی ہے وہ بینک کی ملکیت ہے' اور اس کی کوئی نظیر شریعت میں نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

اس اعتراض کے جواب میں عرض یہ ہے کہ جس دَین کی وصولیابی اتنی متیقّن ہو جتنی بینک اکاؤنٹس میں متیقّن ہوتی ہے' اس سے زکوٰۃ کی وصولیابی کی

متعدّد نظیریں موجود ہیں کہ اس کو تقدیراً دائن کے قبضے میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کی گئی ہے' چند نظائر درج ذیل ہیں :

(۱) پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت صدیق اکبر' حضرت عمر' حضرت عثمان' رضی اللہ تعالیٰ عنہم زکوٰۃ کی رقم دی جانے والی تنخواہوں سے کاٹ لیتے تھے' امام ابو عبیدؒ کی روایت کے یہ الفاظ پیچھے گزرے ہیں کہ :

﴿ فان اخبره انّ عنده مالا قد حلّت فيه الزكاة قاصه ممّا يريد ان يعطيه ﴾ (كتاب الاموال صفحه ٤١١)

"اگر تنخواہ لینے والا یہ بتاتا ہے کہ اس کے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہے تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو تنخواہ اُسے دینا چاہتے تھے اس میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے تھے"۔

ظاہر ہے کہ تنخواہ کی وصولیابی سے پہلے وہ بیت المال پر دَین ہی تھا' اور چونکہ صاحبِ تنخواہ کا اس پر قبضہ نہیں ہوا تھا' اس لئے ابھی وہ حقیقۃً اس کی ملکیت اور قبضے میں نہیں آیا تھا' لیکن قبضے میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وضع کرنا اس لئے تھا کہ وہ دَین متیقّن ہونے کی بنا پر تقدیراً صاحبِ تنخواہ کے قبضے میں آچکا تھا۔ چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ مؤطا میں نقل کرکے اس پر ترجمۃ الباب یہ قائم فرمایا ہے کہ :

﴿ باب الرّجل يكون له الدين هل عليه فيه الزكاة؟ ﴾

اور پھر یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ :

﴿ كان ابوبكر اذا اعطى الناس اعطيا تهم يسئل الرجل هل عندك من مال قد وجبت فيه الزكاة ، فان قال نعم اخذ من

عطائه زکاة ذلك المال، وان قال لا، سلّم الیه عطاءه ﴾

اور پھر فرمایا ہے :

﴿ قال محمّد : وبهذا نأخذ، وهوقول ابی حنیفة رحمه الله ﴾ (مؤطا امام محمد صفحہ ۱۷۰)

اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت صدیقِ اکبرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ کے اس عمل کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

﴿ وفیه دلالة علی انّهم کانوایأخذون زکاة العطاء لکونه دینا مستحقّا علی بیت المال والاّ لم یکن لأخذ الزّکاة منه معنی ﴾

(اعلاء السنن صفحہ ٤٣٠ جلد ١٢ کتاب السیر، باب العطاء یموت صاحبه بعد مایستوجبه)

"ان روایات سے معلوم ہوا کہ وہ تنخواہوں سے زکوٰۃ اس لئے وصول کرتے تھے کہ وہ بیت المال پر دَین ہوتی تھیں۔ (حالانکہ دَینِ اُجرت دَین قرض سے ضعیف ہے)۔ ورنہ ان تنخواہوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے"۔

ان تمام روایات وعبارات میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ دَین متیقّن کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی اُس سے زکوٰۃ وصول کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ متیقّن ہونے کی بنا پر تقدیراً مالک کے قبضے میں ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں امام ابوعُبیدؒ فرماتے ہیں کہ :

﴿عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه انه کان یکون عنده الیتامیٰ فیستسلف اموالهم لیحرزها من الهلاك ، ثم یخرج صدقتها من اموالهم وهی دَین علیه﴾

(کتاب الاموال صفحه۴۵۱ فقره۱۳۰۹ مزید ملاحظه فی السّنن الکبریٰ للبیهقیؒ صفحه۱۴۹ جلد۴ ومصنف عبدالرزاق صفحه۷۰ و۹۸و۹۹ جلد۴)

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرپرستی میں یتامیٰ ہوتے تھے' تو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے اموال کو اپنے ذمّے قرض بنالیتے تھے' تاکہ ان کو ضائع ہونے سے بچائیں' پھران کے اموال سے ان کی زکوٰۃ نکالتے تھے' درآنحالیکہ وہ مال ان کے ذمّے دَین ہوتا تھا"۔

یہاں یہ مسئلہ تو علیحدہ ہے کہ نابالغ کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ واقعے میں "یتامیٰ" سے مراد نابالغ یتامیٰ ہیں یا بالغ یتامیٰ؟ لیکن یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان یتامیٰ پر زکوٰۃ فرض سمجھتے تھے' اور اُن کے اموال کو خود قرض لے لیتے تھے پھران سے قرض ہونے کی حالت ہی میں زکوٰۃ نکالتے تھے۔ یہ صُورت موجودہ بینک اکاؤنٹس کی صُورت سے بہت قریب ہے کہ دونوں جگہ رقم کو ودیعت کے بجائے قرض بنانے کا مقصد ان اموال کو مضمون بنانا ہے اور باوجودیکہ وہ رقمیں قرض لینے کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملکیت میں آگئیں' لیکن انہوں نے انھی رقموں سے اصل مالکوں کی زکوٰۃ ادا فرمائی۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دَین متیقّن کو تقدیراً دائن کے قبضے میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

زکوٰۃ کی نیّت کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ کی وصولیابی پر تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ بینکوں سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کی صورت میں اصحاب اموال کی طرف سے نیّت متحقق نہیں ہوگی، حالانکہ نیّت ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط ہے۔

اس سلسلے میں مجلس کی سابقہ تحریر میں عرض کیا گیا تھا کہ جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار حکومت کو ہے، ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیّت کے قائم مقام ہوجاتا ہے، اور دلیل میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت بھی پیش کی گئی تھی کہ :

﴿ وفی مختصر الکرخیؒ اذا اخذ ھا الامام کرھا فوضعھا موضعھا اجزا، لانّ لہ ولایۃ اخذ الصدقات فقام اخذہ مقام دفع المالك، وفی القنیۃ: وفیہ اشکال لان النیۃ فیہ شرط ولم توجد منہ اہ قلت : قول الکرخیؒ فقام اخذہ الخ یصلح للجواب۔ تامّل ﴾ (شامی صفحہ ۳۵ جلد ۲)

اس پر بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ عبارت کے متصل بعد تحریر فرمایا ہے :

﴿ ثم قال فی البحر : والمفتی بہ التفصیل :ان کان فی

الاموال الظاهرة یسقط الفرض لانّ للسلطان اونائبه ولایة اخذھا وان لم یضعھا موضعھا لایبطل اخذه ، وان کان فی الباطنة فلا ﴾

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اگر جبراً وصول کرلی جائے تو وہ ادا نہیں ہوگی۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ مجلس نے اپنی تحریرِ سابق میں جو الفاظ لکھے تھے کہ "حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیّت کے قائم مقام ہوجاتا ہے"۔ وہ اسی عبارت کے پیشِ نظر لکھے تھے' کیونکہ مذکورہ عبارت میں مدار اس پر ہے کہ سلطان کو "ولایتِ اخذ" حاصل تھی یا نہیں؟ اور بینک اکاؤنٹس سے "ولایتِ اخذ" کے دلائل پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاچکے ہیں' لہٰذا زیرِ بحث مسئلے میں مذکورہ عبارت سے حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت کو ہے اُن میں حکومت کی وصولی کا نیّت کے قائم مقام ہوجانا ائمۂ اربعہ کے نزدیک مسلّم ہے' اگرچہ ائمہ ثلاثہ نیّت کے معاملے میں اتنے سخت ہیں کہ بعض صورتوں میں دلالۃً نیت کو بھی معتبر نہیں مانتے' مثلاً اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بغیر نیّتِ زکوٰۃ کے صدقہ کردے تو حنفیہؒ کے نزدیک اس کی زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے۔ (عالمگیریہ صفحہ ۱۷۱ جلد ۱)
لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نیّت کے فُقدان کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی۔

(المغنی لابن قدامہؒ صفحہ ۶۳۹ جلد ۲۔ والحطاب صفحہ ۳۵۷ جلد ۲)

لیکن حکومت کی وصولیابی کے سلسلے میں ائمۂ ثلاثہ بھی اس پر متّفق ہیں کہ وہ نیّت کے قائم مقام ہوجاتی ہے' چنانچہ فقہِ مالکی کی معروف کتاب "مواہب الجلیل" میں ہے:

﴿ اذا اخرج رجل الزّکاۃ بغیرعلم من ھی علیه وغیراذنه فی ذلک، فان کان مخرج الزّکاۃ الامام فالزکاۃ مجزئة ﴾

(مواھب الجلیل للحطاب صفحه۳۵٦ جلد ۲)

اور فقہِ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی معروف کتاب "نہایۃ المحتاج" میں ہے :

﴿ الأصح عند الشافعیة ان نیّة السلطان تکفی اذا اخذ زکاۃ الممتنع ﴾

(نهایة المحتاج صفحه۱۳۸ جلد ۳)

اور علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

﴿ ولایجوز اخراج الزّکاۃ الاّ بنیّة الاّ ان یاخذھا الامام منه قھراً ﴾

(المغنی لابن قدامه صفحه۲۳۸ جلد ۲)

پھر یہ ساری تفصیل تو زکوٰۃ کی وصولیابی کے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی میں ہے اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہی ہو تو اس کے لئے یہ راستہ موجود ہے کہ وہ زکوٰۃ وضع ہونے کے فوراً بعد نیّت کرلے' کیونکہ اگر کوئی فضولی کسی کے مال سے زکوٰۃ ادا کردے تو جب تک مال فقیر (یا اس کے وکیل) کے قبضے میں ہو' اس وقت تک اصل مالک زکوٰۃ کی نیّت کرکے اس کی اجازت دے سکتا ہے' اس کی تصریح فقہاء حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم کے کلام میں موجود ہے' چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے :

﴿ رجل ادّی زکاۃ غیره عن مال ذلک الغیر، فاجازه المالک ، فان کان المال قائمافی یدا الفقیر جاز وإلاّ فلا، کذا فی السراجیة ﴾

(عالمگیریة صفحه۱۷۱ جلد ۱)

واللہ سُبحانه وتعالیٰ أعلم بالصَّواب !

تصدیقات

(۱) حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب
دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیۃ۔ کراچی

(۲) حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
دارالافتاء والارشاد۔ ناظم آباد۔ کراچی

(۳) حضرت مولانا مفتی سُبحان محمود صاحب
دارالعلوم کراچی

(۴) حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب
مدرسہ اشرفیہ۔ سکھر

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
مہتمم دارالعلوم کراچی

(۶) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
دارالعلوم کراچی

(۷) حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکّھروی صاحب
دارالعلوم کراچی

(۸) حضرت مولانا مفتی وجیہ اللہ صاحب
دارالعلوم بھاگ۔ ضلع کچھی۔ بلوچستان

اسلام میں خلع کی حقیقت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ''خلع'' شوہر اور بیوی کا ایک باہمی معاملہ ہے جو فریقین کی رضامندی پر موقوف ہے۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے بعض جج صاحبان نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر عدالت تحقیق کے ذریعہ اس نتیجے پر پہنچے کہ زوجین حدود اللہ قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عدالت شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع کرا سکتی ہے۔ چنانچہ اس فیصلے کے خلاف حضرت مولانا محمد مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے یہ مقالہ تحریر فرمایا۔ اور اس فیصلے کا تفصیل جواب دیا جو پیش خدمت ہے۔

میمن اسلامک پبلشرز

فہرست مضامین

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

"النکاح من سنتی"

(ابن ماجہ)

نکاح میری سنت ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں خُلع کی حقیقت

تعارف

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کو کسی وجہ سے اتنا ناپسند کرتی ہو کہ اس کے ساتھ کسی قیمت پر نبھاؤ ممکن نہ رہا ہو تو اس کا بہترین طریقہ تو یہ ہی ہے کہ وہ شوہر کو سمجھا بجھا کر طلاق دینے پر آمادہ کرے' ایسی صورت میں شوہر کو بھی یہی چاہئے کہ جب وہ نکاح کے رشتے کو خوشگواری کے ساتھ نبھتا نہ دیکھے اور یہ محسوس کرے کہ اب یہ رشتہ دونوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہا تو وہ شرافت کے ساتھ اپنی بیوی کو ایک[1] طلاق دے کر چھوڑ دے' تاکہ عدّت گزرنے کے بعد وہ

---

[1] طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ جس زمانے میں عورت پاک ہو' اسے صرف ایک طلاق دی جائے' طلاق کا لفظ صرف ایک مرتبہ استعمال کیا جائے اور اس کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کرلی جائے' اس طرح عدّت گذرنے کے بعد وہ خود آزاد ہوجائے گی۔ ہمارے معاشرے میں یہ رواج انتہائی تباہ کن صورت اختیار کرتا جارہا ہے کہ جب بھی طلاق کی نوبت آتی ہے شوہر تین سے کم طلاق نہیں دیتا' خوب یاد رکھنا چاہئے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنا گناہ ہے' اور اس گناہ کی دنیوی سزا یہ ہے کہ اسکے بعد اگر میاں بیوی دوبارہ نکاح بھی کرنا چاہیں تو حلالہ کے بغیر نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔ آجکل لوگ بہ کثرت اس میں مبتلا ہیں اور تین طلاقیں دینے کے بعد عموماً شرمسار اور پریشان ہوتے ہیں۔

جہاں چاہے نکاح کر سکے۔

لیکن اگر شوہر اس بات پر راضی نہ ہو تو عورت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو کچھ مالی معاوضہ پیش کر کے اسے آزاد کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے، عموماً اس غرض کے لئے عورت مہر معاف کر دیتی ہے، اور شوہر اُسے قبول کر کے عورت کو آزاد کر دیتا ہے۔ اس کام کے لئے اسلامی شریعت میں جو خاص طریقِ کار مقرّر ہے، اسے فقہ کی اصلاح میں "خُلع" کہا جاتا ہے۔

"خُلع" عربی زبان کا لفظ ہے، اور "خَلع" سے نکلا ہے جس کے معنی "اُتارنے" کے آتے ہیں، عرب کہتے ہیں کہ خلعت اللباس (میں نے لباس اتار دیا)، اس لفظ کو زوجین کی جدائی کے لئے اس لئے مستعار لیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں شوہر اور بیوی کو ایک لباس قرار دیا گیا ہے، اور خُلع کے ذریعہ دونوں اپنا یہ معنوی لباس اتار دیتے ہیں۔ (المطرزیؒ : المغرب صفحہ ۱۶۵ جلد ۱ دکن سنہ ۱۳۲۸ء و فتح القدیر صفحہ ۱۹۹ جلد ۳ المطبعۃ الامیریۃ ۱۳۱۶ھ)

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے "خُلع" کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی ہے:

﴿ ازالۃ ملک النکاح ببدل بلفظ الخلع ﴾

"خلع کے لفظ کے ذریعہ معاوضہ لے کر ملکِ نکاح کو زائل کرنا"۔

(ابن الہمامؒ : فتح القدیر صفحہ ۱۹۹ جلد ۳)

نکاح اور دوسرے شرعی معاملات کی طرح خُلع بھی ایجاب و قبول کے ذریعہ انجام پاتا ہے[۱]۔ لیکن اگر زیادتی مرد کی طرف سے ہو تو تقریباً تمام فقہاء کرامؒ کا اس

---

[۱] الکاسانیؒ : بدائع الصنائع صفحہ ۱۴۵ جلد ۳ مطبعۃ الجمالیۃ مصر ۱۳۲۸ھ و ابن رشدؒ : بدایۃ المجتہد صفحہ ۶۸ جلد ۲ مصطفیٰ البابی ۱۳۷۹ھ و ابن عابدینؒ : ردالمحتار صفحہ ۶۰۶ جلد ۲ مصطفیٰ البابی

پر اتفاق ہے کہ شوہر کے لئے معاوضہ لینا جائز نہیں' اسے چاہئے کہ معاوضہ کے بغیر عورت کو طلاق دے دے[1]' ایسی صورت میں اگر مرد معاوضہ لے گا تو مرتکبِ حرام اور سخت گناہ گار ہو گا[2]۔ اس لئے کہ اس بارے میں قرآن کریم کا واضح ارشاد یہ ہے کہ :

﴿ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾ (النساء)

"اور اگر تمہارا ارادہ ہو کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بدلو' اور ان میں سے ایک کو تم نے کچھ مال دیا ہو تو اس مال میں سے کچھ (واپس) نہ لو' کیا اس کو بہتان اور کھلے گناہ کے طور پر واپس لوگے؟"۔

ہاں اگر زیادتی عورت ہی کی جانب سے ہو اور وہی رشتۂ نکاح کو فسخ کرنا چاہتی ہو تو اس صورت میں مرد کے لئے معاوضہ لینا جائز ہے' لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ معاوضہ مہر کی مقدار سے زائد نہ ہو' تاہم اگر مہر سے زیادہ مقدار باہمی رضامندی سے مقرر کرلی گئی تو بھی خُلع صحیح ہو گا اور عورت کو پورا مقررہ معاوضہ دینا ہو گا۔
(بدائع الصنائع صفحہ ۱۵۰ جلد ۳ والبحر الرائق صفحہ ۸۳ جلد ۴)

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کا یہی مطلب ہے :

﴿ وَلَا تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ﴾ (البقرة)

---

[1] عالمگیریہ صفحہ ۵۱۵ جلد ۱ مصطفیٰ البابی وبدائع الصنائع صفحہ ۱۵۰ جلد ۳۔

[2] ابن نجیمؒ: البحر الرائق صفحہ ۸۳ جلد ۴ المطبعۃ العلمیۃ وابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ : فتح القدیر صفحہ ۲۰۳ جلد ۳۔

"اور جو مال تم نے اپنی بیویوں کو (مہر وغیرہ کے طور پر) دیا ہے' اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ اِلّا یہ کہ زوجین کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھیں گے' پس اگر (اے حکام) تم کو خوف ہو کہ زوجین اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس مال میں کوئی گناہ نہیں ہے جسے عورت بطور فدیہ دے (اور اپنی جان چھڑا لے) "۔

"خُلع" کا معاملہ زوجین ازخود کرسکتے ہیں' بعض فقہاء نے اس کے لئے عدالت سے رجوع کرنا ضروری قرار دیا ہے' لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک یہ معاملہ باہمی رضامندی سے ہوسکتا ہے' عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں[۱]۔

پھر اس میں فقہاء مجتہدین کا اختلاف ہے کہ "خُلع" کی حیثیت طلاق کی ہے یا فسخ کی؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت سعید بن مسیّبؒ' حسن بصریؒ' عطاءؒ' قاضی شریحؒ' شعبیؒ' ابراہیم نخعیؒ' جابر بن زید رضی تعالیٰ عنہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' سفیان ثوریؒ' امام اوزاعیؒ' اور صحیح قول کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ خُلع طلاق ہے' لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ' طاوسؒ' عکرمہؒ' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق بن راہویہؒ' ابوثورؒ' اور داؤد ظاہریؒ کا کہنا یہ ہے کہ خلع فسخِ نکاح ہے اور اس پر طلاق کے احکام جاری نہیں ہوں گے' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' کا قدیم مذہب بھی یہی تھا لیکن پھر انھوں نے پہلے مذہب کو

---

[۱] السرخسیؒ : المبسوط صفحہ ۱۷۳ جلد ۶ مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۴ھ وابن قدامۃ : المغنی صفحہ ۵۲ جلد ۷ دارالمنار ۱۳۶۷ھ۔ القرطبی : الجامع لاحکام القرآن صفحہ ۱۳۸ جلد ۳ دارالکتب المصریہ ۱۹۳۶ء والشافعیؒ : کتاب الام صفحہ ۲۰۰ جلد ۵ مکتبۃ الکلیات الازہریہ ۱۳۸۱ھ

اختیار کرلیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۲۷۵ جلد اول المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ سنہ ۱۳۵۶ھ وبدایۃ المجتہد صفحہ ۶۹ جلد ۲)

اس اختلاف کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اسلام نے مرد کو تین طلاقوں کا اختیار دیا ہے' اگر وہ ان تینوں طلاقوں کو بیک وقت دینے کا گناہ کرے تو پھر بیوی سے نہ رجوع کرسکتا ہے اور نہ حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو صرف ایک طلاق دے' اسے دوبارہ رشتۂ نکاح قائم کرنے کا اختیار رہتا ہے' اب اگر وہ اس اختیار کو استعمال کرکے بیوی کو دوبارہ نکاح میں لے آئے تو چونکہ وہ ایک طلاق پہلے استعمال کرچکا ہے' اس لئے اسے اب صرف دو طلاقوں کا اختیار رہے گا' یعنی اگر وہ دو طلاقیں بھی دے دے گا تو پھر بیوی سے نہ رجوع کرسکے گا' نہ حلالہ کے بغیر دوسرا نکاح۔

اب جو حضرات "خُلع" کو طلاق قرار دیتے ہیں' ان کے نزدیک جو شخص اپنی بیوی سے ایک مرتبہ خُلع کرلے تو یہ طلاق شمار ہوگی' لہٰذا اگر وہ اس کی رضامندی سے اسے دوبارہ نکاح میں لے آے تو اسے اب صرف دو طلاقوں کا اختیار ہوگا' یعنی اب وہ اگر دو طلاقیں بھی دے دیگا تو طلاقِ مغلّظ واقع ہوجائے گی' جس کے بعد دوبارہ نکاح بھی حلالہ کے بغیر نہیں ہوسکے گا۔ لیکن جو حضرات خلع کو فسخ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اگر خُلع کے بعد میاں بیوی باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرلیں تو شوہر کو بدستور تین طلاقوں کا اختیار رہتا ہے' اور صرف دو طلاقوں سے بیوی مُغلّظ نہیں ہوتی کیونکہ خلع کو طلاق شمار نہیں کیا گیا۔

(السرخسیؒ : المبسوط صفحہ ۱۷۳ جلد ۶)

لیکن اس پر اتفاق ہے کہ خلع سے عورت بائنہ ہوجاتی ہے' یعنی اس کے بعد شوہر یکطرفہ طور پر رجوع نہیں کرسکتا' ہاں دونوں کی باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے' صرف سعید بن مسیّبؒ اور ابن شہابؒ سے ایک روایت یہ منقول ہے کہ اگر مرد عدّت کے دوران بدلِ خلع واپس کردے تو یکطرفہ طور پر رجوع کرسکتا

ہے، لیکن جمہور فقہاءؒ نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔

(ابن رشدؒ : بدایۃ المجتہد صفحہ ۷۰ جلد ۲)

معاوضہ دیکر طلاق حاصل کرنے کے لئے "خلع" کے علاوہ "مبارات" "صلح" "فدیہ" اور طلاق علیٰ مال کے الفاظ بھی مستعمل ہیں، ان کے درمیان فرق لفظی نوعیت کا ہے، اسی لئے یہ تمام الفاظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں، البتہ بعض مالکی فقہاءؒ نے ان الفاظ میں اصطلاحی فرق بیان کیا ہے کہ :

> "اگر عورت پورے مہر کے بدلے میں طلاق حاصل کرے تو اسے خلع کہیں گے، اور اگر مہر کا کچھ حصّہ معاوضہ قرار پائے تو وہ فدیہ کہلائے گا، اور اگر مہر سے زائد مقدار کو عوض مقرر کیا جائے تو وہ صلح ہوگی، اور اگر طلاق کے بدلے میں عورت اپنا کوئی اور حق ساقط کرے تو اسے مبارات کہا جائے گا"۔
>
> (ابن رشدؒ : بدایۃ المجتہد صفحہ ٦٦ جلد ۲ و فتح الباری ۳۳۲ جلد ۹ و تفسیر القرطبی صفحہ ۱۴۶ و ۱۴۷ جلد ۳)

مسئلہ زیرِ بحث

"خلع" اور اس کے احکام کا یہ نہایت مختصر تعارف اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ آئندہ مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو، اس مقالے میں خلع کے تمام احکام کو بالاستیعاب پیش کرنا مقصود نہیں، بلکہ خلع سے متعلق ایک خاص مسئلے پر گفتگو کرنا ہے جو چند سالوں سے ہمارے ملک میں خاصی اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے۔

اب تک تمام فقہاء اور مجتہدین کا اس پر اتفاق چلا آتا ہے کہ "خلع" شوہر اور بیوی کا ایک باہمی معاملہ (TRANSACTION) ہے جو فریقین کی رضامندی پر موقوف ہے' لہٰذا کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔ نہ شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ بیوی کو خلع پر قانوناً مجبور کرے' اور نہ بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ شوہر سے بزورِ قانون خلع حاصل کرے۔

غیر منقسم ہندوستان اور پاکستان کی عدالتیں بھی مسلمانوں کے مقدّمات میں اسی اصول کے مطابق فیصلے کرتی آئی تھیں۔ اس سلسلے میں عمر بی بی بنام محمد دین اور سعیدہ خانم بنام محمد مسیح کے دو مقدّمات کافی مشہور ہیں' عمر بی بی بنام محمد دین کے مقدّمے میں جسٹس عبدالرحمٰن اور جسٹس ہارنس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا تھا کہ عورت شوہر کی مرضی کے بغیر خلع نہیں کراسکتی۔

(عمر بی بی بنام محمد دین۔ اے۔ آئی۔ آر۔ سنہ ۱۹۴۵ء لاہور ۵۱)

اسی طرح سعیدہ خانم بنام محمد مسیح کے مقدّمے میں جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس' جسٹس محمد جان اور جسٹس خورشید زمان صاحبان نے بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع نہیں ہوسکتا۔ اور محض اختلافِ مزاج' ناپسندیدگی اور نفرت کی بناء پر عدالت نکاح کو فسخ نہیں کرسکتی۔

(سعیدہ خانم بنام محمد مسیح۔ پی ایل ڈی سنہ ۱۹۵۲ء۔ لاہور ۱۱۳)

لیکن سنہ ۱۹۵۹ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس شبیر احمد' جسٹس بی۔ زیڈ۔ کیکاؤس اور جسٹس مسعود احمد صاحبان نے بلقیس فاطمہ بنام نجم الاکرام کے مقدّمے میں یہ فیصلہ دے دیا کہ اگر عدالت تحقیق کے ذریعہ اس نتیجے تک پہنچ جائے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عدالت شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع کراسکتی ہے۔

(بلقیس فاطمہ بنام نجم الاکرام۔ پی ایل ڈی سنہ ۱۹۵۹ء لاہور ۵۶۶)

پھر سنہ۱۹۶۷ء میں سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان جسٹس ایس۔اے۔رحمان، جسٹس فضل اکبر، جسٹس حمود الرحمٰن، جسٹس محمد یعقوب علی اور جسٹس ایس اے محمود صاحبان نے بھی خورشید بیگم بنام محمد امین کے مقدّمے میں اسی نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے۔

(خورشید بیگم بنام محمد امین۔ پی ایل ڈی سنہ۱۹۶۷ء سپریم کورٹ ۹۷)

اس مقالے میں ہم خُلع سے متعلق خاص اسی مسئلے پر گفتگو کریں گے کہ آیا خلع زوجین کی باہمی رضامندی کا معاملہ ہے یا ان میں سے کوئی دوسرے کو اس کی رضامندی کے بغیر خلع پر مجبور بھی کرسکتا ہے؟

ہماری تحقیق کی حد تک امّتِ اسلامیہ کے تقریباً تمام فقہاء مجتہدین اس بات پر متفق ہیں، اور قرآن وسنت کے دلائل بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ خلع فریقین کی باہمی رضامندی کا معاملہ ہے اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اس مقالے میں ہم اسی بات کے مفصّل دلائل پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جناب جسٹس ایس۔ اے رحمان صاحب کی ہمارے دل میں بڑی قدرومنزلت ہے، وہ ایک قابلِ احترام دانشور ہیں، اور انہوں نے اپنی تحریروں سے ملک وملت کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن چونکہ زیرِ بحث مسئلے میں ہمارے نزدیک ان کا موقف جمہور امّت کے خلاف اور شرعی اعتبار سے نادرست ہے، اس لئے ہم یہاں ان کے دلائل پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

مساوات

جناب جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے :

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾

"اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو مثل انہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ کے موافق"۔

جسٹس صاحب نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح مرد کو عورت کی رضامندی کے بغیر طلاق کا قانونی حق دیا گیا ہے' اسی طرح عورت کو بھی مرد کی رضامندی کے بغیر خلع کا حق ملنا چاہئے۔

(پی ایل ڈی سنہ ۱۹۶۷ء سپریم کورٹ صفحہ ۱۱۴)

لیکن یہ استدلال بوجوہِ ذیل درست نہیں ہے :

(۱) جسٹس صاحب نے اس آیت کے آگلے جملے پر غور نہیں فرمایا' قرآن کریم میں پوری آیت اس طرح ہے :

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ وَّاللهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴾

"اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو مثل انہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ کے موافق اور مردوں کا ان کے مقابلے میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکیم ہیں"۔

(ترجمہ ماخوذ از حضرت تھانویؒ)

اس آیت میں وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ کے الفاظ واضح طور پر دلالت کررہے ہیں کہ بعض معاملات میں جو اختیارات مرد کو حاصل ہیں وہ عورت کو حاصل نہیں ہیں۔

(۲) اگر اس آیت کا مطلب یہ لیا جائے کہ زوجین تمام حقوق و فرائض میں بالکل برابر ہیں تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد کو بغیر معاوضہ دیئے طلاق دینے کا اختیار

حاصل ہے اور عورت معاوضہ ادا کئے بغیر طلاق حاصل نہیں کرسکتی۔ حالانکہ زوجین کی مساوات کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ رشتۂ نکاح کو قطع کرنے میں بھی دونوں برابر ہیں تو عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا اختیار ملنا چاہئے۔ حالانکہ یہ وہ بات ہے جسے جسٹس صاحب بھی تسلیم نہیں فرماتے۔

(۳) تمام فقہاء اور مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں زوجین کی جس مساوات کا ذکر کیا گیا ہے وہ معاشرتی مساوات ہے' ورنہ جہاں تک طلاق اور رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کا سوال ہے' معمولی حالات میں اس کا مکمل اختیار صرف مرد کو ہے' اور اسی کی طرف قرآن کریم میں ان الفاظ کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے :

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾

"اور مردوں کا ان (عورتوں) کے مقابلے میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے"۔

اس معاملے میں فقہاء و مفسّرین کے چند اقوال درج ہیں :

(الف) حضرت ابو مالکؒ فرماتے ہیں کہ :

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ قَالَ يُطَلِّقُهَا وَلَيْسَ لَهَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْئٌ ﴾

آیت قرآنی وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے' لیکن عورت کو اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں"۔

(اخرجہ عبد بن حمید وابن ابی حاتم عن ابی مالکؒ۔ الدر المنثور للسیوطیؒ صفحہ ۲۷۷ جلد ۱)

(ب) امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (شافعی) اس آیت کی تشریح کرتے

ہوئے پہلے لکھتے ہیں :

﴿ان المقصود من الزّوجية لا يتم الاّ اذا كان كل واحد منهما مراعيًا حق الآخر وتلك الحقوق المشتركة كثيرة نشيرالى بعضها﴾

(الرازیؒ: تفسیر کبیر صفحہ ۲۴۶ جلد ۲ المطبعة الحسينية- مصر)

"زوجیت کے مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہوسکتے جب تک کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے حق کی رعایت نہ کرے' اور یہ مشترک حقوق بہت سے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد انہوں نے تمام معاشرتی حقوق میں مساوات کا ذکر کیا ہے' اس کے بعد وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

﴿انّ الزّوج قادر على تطليقها واذا طلقها فهو قادر على مراجعتها شاءت المرأة أم لم تشاء، أما المرأة فلا تقدر على تطليق الزوج وبعد الطلاق لاتقدر على مراجعة الزوج ولا تقدر ايضاً على أن تمنع الزوج من المراجعة﴾

(تفسیر کبیر- صفحہ ۲۴۷ جلد ۲)

"شوہر عورت کو طلاق دینے پر قادر ہے اور طلاق دینے کے بعد رجوع بھی کرسکتا ہے' عورت چاہے یا نہ چاہے' لیکن عورت نہ شوہر کو طلاق دے سکتی ہے' نہ طلاق کے بعد شوہر سے رجوع کرسکتی ہے' اور نہ شوہر کو رجوع سے روک سکتی ہے"۔

(ج) امام ابو عبد اللہ القرطبی رحمۃ اللہ علیہ (مالکی) اپنی تفسیر میں اس جملے کی شرح

کرتے ہوئے علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں :

﴿ له رفعُ العقد دونها ﴾

(القرطبی الجامع لأحکام القرآن صفحه۱۲۵جلد ۳ دارالکتب المصریة ۱۹۳۶ء)

"عقدِ نکاح کو ختم کرنے کا اختیار صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں"۔

ظاہر ہے کہ ان دلائل کی موجودگی میں وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ سے قطع نظر کرکے صرف وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کے الفاظ سے اس بات پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ محض ناپسندیدگی کی بناء پر عورت شوہر کو بزورِ عدالت خلع پر مجبور کرسکتی ہے۔

آیتِ خُلع

اس کے بعد جناب جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے اس آیت کے بعض الفاظ سے استدلال فرمایا ہے جو خلع کے بارے میں نازل ہوئی ہے' پوری آیت یہ ہے :

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (البقرة- ۲۲۹)

"طلاق دو مرتبہ (جائز) ہے' پھر خواہ رکھ لینا قاعدہ کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ' اور تمہارے لئے یہ

بات حلال نہیں کہ کچھ بھی لو اُس میں سے جو تم نے اُن کو دیا تھا مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے، سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی قائم نہ کرسکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اُس چیز میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑالے، یہ خدائی ضابطے ہیں، سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے باہر نکل جائے ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔

(ترجمہ ماخوذ از حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے اس بات پر متعدّد فقہاء اور مفسّرین کے اقوال پیش کئے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ (سو اگر تم کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ کرسکیں گے) میں خِطاب حکّام اور اُولوالأمر کو ہے، اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر حکّامِ عدالت یہ سمجھتے ہوں کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو وہ شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع کے ذریعہ نکاح فسخ کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں لعان، ایلاء، عِنّین (نامرد) اور مفقودالخبر کے فسخِ نکاح کو بطور نظیر پیش کرکے آخر میں وہ علّامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کی فتح القدیر، علّامہ ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ کی احکام القرآن اور صحیح بخاری کے حوالوں سے یہ فرماتے ہیں کہ:

"اگر عورت مرد سے ناقابلِ اصلاح نفرت (INCURABLE AVERSION) کرتی ہو تو یہ خلع کے لئے کافی وجہ جواز ہے"۔ (پی ایل ڈی (سپریم کورٹ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۱۶ جلد ۱۹)

لیکن اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ اس آیت میں فَإِنْ خِفْتُمْ الخ

کا خِطاب حکّام کو ہے' جیسا کہ بہت سے علماء نے کہا ہے' تب بھی اس آیت سے استدلال کسی طرح صحیح نہیں۔ آیت میں تو صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اگر حکّام کو اس بات کا احتمال ہو کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو زوجین کے لئے خلع کر لینے میں کوئی گناہ نہیں۔ اس سے یہ بات کہاں نکلتی ہے کہ زوجین میں سے کسی کو خلع کرنے پر مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر آیت کا منشاء یہ ہوتا کہ حکّام ایسی صُورت میں زوجین یا زوجین میں سے کسی ایک کو خلع پر مجبور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں جیسا کہ جسٹس صاحب کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے' تو صاف یہ کہا جاتا کہ "اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ وہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو تمہیں اختیار ہے کہ ان کے درمیان نکاح کو فسخ کردو" لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ "ایسی صورت میں زوجین پر خلع کرنے میں کوئی گناہ نہیں" اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکّام کے پاس زوجین کی ناچاقی کا کوئی معاملہ آئے اور وہ محسوس کریں کہ اب یہ لوگ حدود اللہ کی حفاظت نہیں کر سکیں گے تو وہ زوجین کو خلع کا مشورہ تو دے سکتے ہیں' لیکن خلع کا معاملہ زوجین اپنی رضامندی ہی سے کریں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ جب "خلع" فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے تو پھر فَإِنْ خِفْتُمْ الخ میں خطاب "اُولُوالامر" (حکام) کو کیوں کیا گیا؟ سو اس کا جواب اس معاشرتی پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر بہ آسانی دیا جا سکتا ہے جس میں یہ آیت نازل ہو رہی ہے۔ اس زمانے میں "اولوالامر" کی حیثیت صرف ایک جج اور حاکم ہی کی نہیں تھی' بلکہ ایک مصلح' مُفتی اور مشیر کی بھی تھی' لوگ صرف ڈگری حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ بہت سے معاملات میں محض شریعت کا حکم معلوم کرنے یا مشورہ طلب کرنے کے لئے بھی ان سے رجوع کرتے تھے۔ لہٰذا اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم سے اس جیسے معاملے میں رجوع کیا جائے تو تم انھیں خلع کا مشورہ دے سکتے ہو' نیز اپنی نگرانی میں خلع کا معاملہ کرا سکتے ہو۔

اولوالامر کو محض مخاطب کرلینے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ انھیں خلع کے معاملے میں وہ مکمل اختیارات حاصل ہوگئے ہیں جو زوجین کو حاصل ہیں، اس کی وضاحت کے لئے دو مثالوں پر غور فرمایئے :

(۱) فرض کیجئے کہ حکّام کے پاس ایک ایسا مقدّمہ آتا ہے جس میں زوجین میں سے کوئی خلع پر راضی نہیں (مرد اس لئے کہ وہ عورت کو جدا نہیں کرنا چاہتا، اور عورت اس لئے کہ وہ بلامعاوضہ طلاق چاہتی ہے) اور کوئی ایسی صورت بھی نہیں پائی جاتی (مثلاً شوہر کا جنون وغیرہ) جس کی موجودگی میں عدالت کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، البتہ حکّام یہ خوف رکھتے ہیں کہ نکاح کے قائم رہنے کی صورت میں یہ دونوں "حدود اللہ" کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ عورت سے خلع کرنے کو پوچھا جاتا ہے لیکن وہ خلع پر راضی نہیں ہوتی تو کیا اس صورت میں محض اس وجہ سے کہ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ الخ میں حکّام کو مخاطب کیا گیا ہے، حکّام ان دونوں کے درمیان زبردستی خلع کے ذریعہ نکاح فسخ کرسکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں!

(۲) فرض کیجئے کہ ایک مقدّمے میں زیادتی چونکہ عورت کی طرف سے ہے، اس لئے شوہر مہر معاف کرائے بغیر طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف عورت خلع پر راضی نہیں، وہ یا تو طلاق ہی نہیں چاہتی، یا طلاق کے معاوضے میں مہر معاف کرنے پر راضی نہیں تو کیا ایسی صورت میں حکّام عورت کو خلع پر مجبور کرکے نکاح فسخ کرسکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں! اور کوئی بھی شخص محض فَإِنْ خِفْتُمْ کے خطاب سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ اس کے ذریعہ ان صورتوں میں حکّام کو زبردستی خلع کے ذریعہ نکاح فسخ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

آیت کا سیاق

یہ بات کہ اس آیت میں حکّام کو خلع کرانے کا اختیار صرف اس صورت

میں دیا گیا ہے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں اس پر راضی ہوں' آیت کے سیاق (CONTEXT) پر غور کرنے سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ خلع کے سلسلے میں آیت کے الفاظ یہ ہیں :

﴿ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ﴾

"اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ اُس مال میں سے کچھ لو جو تم نے اُن (عورتوں) کو دیا ہے' مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے' پھر پس اگر (اے حکام) تم کو یہ احتمال ہو کہ وہ اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہ ہو گا جس کو بطور فدیہ دے کر عورت اپنی جان چھڑالے"۔

اس میں پہلا جملہ واضح طور پر اس بات کی نشان دہی کررہا ہے کہ قرآن کریم کا یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جبکہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے' اور اس وجہ سے دونوں خلع کرنا چاہتے ہوں' یا کم از کم اس پر راضی ہوں۔ پھر آگے فَإِنْ خِفْتُمْ کے جملے کے شروع میں فاء تعقیب (جس کا اردو ترجمہ "پس" ہے) صاف دلالت کررہی ہے کہ حکّام کو یہ خطاب بھی اسی صورت سے متعلق ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے یعنی إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ (مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے۔

پھراس آیت میں آگے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (توان دونوں میاں بیوی پر کوئی گناہ نہیں) کے الفاظ بھی خاص طور سے قابلِ غور ہیں، معمولی غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ الفاظ اپنے ضمن میں شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی کا واضح مفہوم رکھتے ہیں، اس کی تشریح کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں :

آپ اگر زید سے یہ کہیں کہ "تمہارے لئے طلاق دینے میں کوئی گناہ نہیں" تو اس جملے سے ہر شخص یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ زید اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا، یا کم از کم اس پر راضی تھا لیکن اسے یہ شک تھا کہ میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں، آپ نے یہ کہہ کر اُس کے شک کو دور کیا ہے کہ "تمہارے لئے طلاق دینے میں کوئی گناہ نہیں"۔

اس کے برعکس آپ کے ان الفاظ سے کوئی بھی شخص جسے بات سمجھنے کا سلیقہ ہو، یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ زید طلاق دینے پر راضی نہیں تھا، اور آپ اس جملے کے ذریعہ اسے طلاق پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ اگر زید طلاق دینے پر سرے سے راضی ہی نہ ہو، بلکہ اس سے انکار کررہا ہو تو آپ اسے مجبور کرنے کے لئے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ "تمہیں طلاق دینی پڑے گی" یا "تمہیں بزورِ قانون علیحدگی پر مجبور کیا جائے گا" لیکن اس صُورت میں یہ کہنا بالکل مہمل اور بے معنی بات ہوگی کہ "تمہارے لئے طلاق دینے میں کوئی گناہ نہیں" یہاں بھی قرآن کریم نے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (ان دونوں میاں بیوی پر کوئی گناہ نہیں) کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جس کا واضح مطلب ہی یہ ہے کہ قرآن کریم صرف اس صورت کو بیان کررہا ہے جس میں شوہر اور بیوی دونوں خلع پر راضی ہیں۔ ورنہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا کے الفاظ بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ زوجین کے خلع پر راضی ہو جانے کے بعد ان میں سے ہر

ایک کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ میرے لئے یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں' عورت کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ پیسے دیکر طلاق حاصل کرنا شاید جائز نہ ہو' اور مرد کو یہ شک گذر سکتا تھا کہ طلاق پر پیسے وصول کرنا گناہ نہ ہو' اللہ تعالیٰ نے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (دونوں پر کوئی گناہ نہیں) کے الفاظ سے دونوں کا شبہ دور فرمادیا۔

بلکہ ان الفاظ میں شوہر کی رضا مندی کا مفہوم اور زیادہ واضح ہے' اس لئے کہ معاملۂ خلع کے گناہ ہونے کا زیادہ شبہ مرد ہی کو ہو سکتا ہے' کیونکہ وہ پیسے وصول کرنے والا ہے' بخلاف عورت کے کہ وہ پیسے ادا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ اسی آیت میں آگے فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ اس میں بدلِ خلع کو "فدیہ" اور عورت کی ادائیگی کو "افتداء" کہا گیا ہے' اور بقول علّامہ ابنِ قیّم رحمۃ اللہ علیہ یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ "خلع" ایک عقدِ معاوضہ ہے جس میں فریقین کی باہمی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے کہ "فدیہ" عربی زبان میں اس مال کو کہا جاتا ہے جو جنگی قیدیوں کو چھڑانے کے لئے پیش کیا جاتا ہے' اس مال کو پیش کرنا "افتداء" اور قبول کرنا "فداء" کہلاتا ہے۔ (امام راغب اصفہانی : المفردات فی غریب القرآن صفحہ اصح المطابع کراچی۔ وابن اثیرالجزری" النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر صفحہ ۲۰۴ المطبعۃ الخیریۃ۔ ابوالفتح مطرزی" : المغرب صفحہ ۸۸ جلد ۲ دکن ۱۳۲۸ھ)

یہ معاملہ بہ اتفاق عقدِ معاوضہ ہوتا ہے جس میں فریقین کی رضامندی لازمی شرط ہے' اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ علامہ ابنِ قیّم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

﴿وفی تسمیتہ صلی اللہ علیہ وسلم الخلع فدیۃ دلیل علی أن فیہ معنی المعاوضۃ ولھٰذا اعتبر فیہ رضا الزّوجین﴾

(ابن القیمؒ زادالمعاد صفحہ ۲۳۸ جلد ۲ المطبعۃ المیمنیۃ مصر ۱۳۲۴ھ)

"اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خلع کا نام فدیہ رکھا' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں معاوضہ کے معنی پائے جاتے ہیں' اور اسی لئے اس میں زوجین کی رضامندی کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے"۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیتِ خُلع میں تین جملے ایسے ہیں جو واضح طور پر شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی کا مفہوم رکھتے ہیں :

(۱) اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ

(مگر یہ کہ ان دونوں میاں بیوی کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھیں گے)۔

(۲) فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ

(اس مال میں جو عورت بطور فدیہ دے)۔

(۳) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

(تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں)

ان تینوں جملوں کے بیچ میں فَاِنْ خِفْتُمْ (اگر تم کو خوف ہو) کے الفاظ آئے ہیں' اس سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ فَاِنْ خِفْتُمْ (اگر تم کو خوف ہو) کا خطاب حکّام ہی کو ہے تب بھی یہ اس صورت میں ہے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں خلع پر راضی ہوں

لہٰذا جس طرح اس سے اس بات پر استدلال درست نہیں ہے کہ میاں بیوی دونوں یا صرف بیوی کی رضامندی کے بغیر حاکم بذریعہ خُلع نکاح فسخ کر سکتا ہے' اسی طرح اس بات پر بھی استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں کہ حاکم کو شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع کے ذریعہ نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

یہ ساری گفتگو یہ بات تسلیم کرنے کے بعد کی گئی ہے کہ فَإِنْ خِفْتُمْ میں خِطاب حکّام کو ہے، اور اس میں شک نہیں کہ علماء کی ایک بڑی جماعت کا قول یہی ہے، لیکن اگر اُن حضراتِ مفسّرین کا قول اختیار کیا جائے جو اس کا مخاطب شوہر اور بیوی کو قرار دیتے ہیں تو بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے۔ اس تفسیر کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس آیت کا پہلا جملہ یعنی وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ الخ میں باتفاق خطاب شوہروں کو ہے۔ اس لئے اس کی مناسبت کا تقاضا یہ ہے کہ فَإِنْ خِفْتُمْ کا خطاب بھی انہی کو ہو، چنانچہ حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے :

> "اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیبیوں کو چھوڑتے وقت ان سے) کچھ بھی لو (گو وہ لیا ہوا) اس (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم (ہی) نے اُن کو (مہر میں) دیا تھا مگر (ایک صورت میں البتّہ حلال ہے وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بی بی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو (جو دربارۂ ادائے حقوقِ زوجیت ہیں) قائم نہ کر سکیں گے، سو اگر تم لوگوں کو (یعنی میاں بی بی کو) یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہو گا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دیکر عورت اپنی جان چھڑا لے"۔

(حضرت تھانویؒ : بیان القرآن صفحہ ۷۵ جلد ۱ تاج کمپنی کراچی)

یہ تفسیر بالکل بے غبار بھی ہے، اور اگر اس تفسیر کو اختیار کیا جائے تو پھر اس آیت میں حکّام کا کوئی ذکر ہی نہیں رہتا۔

اس مسئلے میں جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے عِنّین اور مفقود الخبر کی

جو نظیریں پیش کی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ بالکل غیر متعلق (IRRELEVONT) ہیں، کیونکہ زیرِ بحث مسئلہ صرف اس صورت میں ہے جبکہ فسخِ نکاح کی معروف صورتوں میں سے کوئی صورت نہ پائی جارہی ہو، بلکہ عورت محض ناپسندیدگی اور نفرت کی بناء پر علیحدگی چاہتی ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کو عِنّین (نامرد) مجنوں، مُتعنِّت (نان ونفقہ نہ دینے والا) اور مفقود الخبر (لاپتہ شخص) کی بیوی پر قیاس کیا جائے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کا نکاح بلا معاوضہ فسخ کردیا جائے۔ حالانکہ جسٹس صاحب بھی خود اس کو درست نہیں سمجھتے۔

رہ گئے فتح القدیر، احکام القرآن، صحیح بخاری اور المسوّیٰ کے وہ حوالے جو جسٹس صاحب نے پیش کئے ہیں، سو وہ بھی بالکل غیر متعلق ہیں، اس لئے کہ ان سب حوالوں میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ حدود اللہ کو قائم نہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جن میں زوجین کے لئے خُلع کرنا جائز ہو جاتا ہے؟ رہا یہ معاملہ کہ ان حالات میں حکّام زوجین کو یا ان میں سے کسی ایک کو خلع پر مجبور کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں انہی حضرات فقہاء کی واضح تصریحات یہ ہیں کہ جب تک شوہر اور بیوی دونوں راضی نہ ہوں، خلع کا معاملہ صحیح نہیں ہوتا۔ فقہاء کی یہ تصریحات ہم آگے پیش کریں گے۔

خُلع فسخ ہے یا طلاق؟

آگے جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے یہ بحث چھیڑدی ہے کہ "خُلع" فسخِ نکاح (DISSOLUTION OF MARRIAGE) ہے یا طلاق (DIVORCE)؟ اس معاملے میں فقہاء کا اختلاف نقل کرنے کے بعد وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں جس کی رُو سے خُلع طلاق نہیں، بلکہ فسخ ہے، اور اس کی بعد تحریر فرماتے ہیں :

"اگر اس رائے کو قبول کرلیا جائے (کہ خُلع فسخ ہے طلاق نہیں ہے) تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ خلع تنہا شوہر کی مرضی پر موقوف نہیں ہے"۔ (پی ایل ڈی (سپریم کورٹ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۱۶)

لیکن جسٹس صاحب کے اس ارشاد سے بھی اتفاق ممکن نہیں۔ بحث کے تعارف میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ خلع کے طلاق یا فسخ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور عملی طور پر فقہاء کے اس اختلاف کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ تفسیر' حدیث اور فقہ کی جس کتاب میں بھی یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے' وہاں اس کا مطلب یہی بیان کیا گیا ہے کہ اگر خلع کو فسخ قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خلع کو طلاق شمار نہیں کیا جائے گا' اور اگر میاں بیوی باہمی رضا مندی سے دوبارہ نکاح کرلیں تو شوہر کو بدستور تین طلاق کا اختیار ملے گا؟ لیکن اس سے یہ نتیجہ کسی نے نہیں نکالا کہ چونکہ یہ فسخ ہے اس لئے اس میں شوہر کی رضا مندی ضروری نہیں ہے۔

ہم یہاں اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں کہ فقہاء کے اس اختلاف میں قابلِ ترجیح مسلک کون سا ہے؟ ہم تھوڑی دیر کے لئے یہی فرض کرلیتے ہیں کہ اس معاملے میں جسٹس صاحب کے ارشاد کے مطابق امام احمدؒ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہی قابل ترجیح ہے جس کی رُو سے خلع طلاق نہیں' فسخ ہے' لیکن اس سے یہ بات کیسے ثابت ہوگئی کہ یہ فسخ نکاح شوہر کی مرضی کے خلاف بھی عمل میں آسکتا ہے؟ خود جسٹس صاحب نے نقل فرمایا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ خلع کو فسخ نکاح قرار دیتے ہیں' لیکن ان کے مذہب کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے' وہ بھی جمہور امّت کی طرح خُلع کو فسخِ نکاح قرار دینے کے باوجود فریقین کی مرضی کو اس کے لئے لازمی شرط سمجھتے ہیں' چنانچہ علامہ ابنِ قدامہ رحمۃ اللہ علیہ جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مستند ترین راوی ہیں' تحریر فرماتے ہیں :

﴿ ولا یفتقر الخلع إلی حاکم نصّ علیہ أحمد فقال یجوز الخلع

دون السلطان وروی البخاری ذلك عن عمروعثمان رضی الله عنهما وبه قال شریحؒ والزهریؒ ومالكؒ والشافعیؒ واسحاقؒ وأهل الرأی وعن الحسنؒ وابن سیرینؒ لا یجوزألاّ عندالسلطان، ولنا قول عمرؓوعثمانؓ ولأ نه معاوضة فلم یفتقرالی السلطان كالبیع والنكاح ولأنه عقد بالتراضی أشبه الإقالة ﴾

(ابن قدامہؒ: المغنی صفحه۵۲ جلد ۷ دار المنار ۱۳٦۷ھ)

"خلع کے لئے حاکم کی ضرورت نہیں' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے' چنانچہ کہا ہے کہ خلع بغیر سلطان کے جائز ہے' اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی مذہب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نقل کیا ہے' اور امام شریح رحمۃ اللہ علیہ' امام زہری رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور اہل رائے کا بھی یہی قول ہے۔ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ' اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ ہے کہ خلع صرف حاکم کے پاس ہو سکتا ہے۔ اور ہماری دلیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے' نیز یہ کہ خلع ایک عقدِ معاوضہ ہے لہٰذا اس میں سلطان کی ضرورت نہیں' جیسے بیع اور نکاح۔ علاوہ ازیں خلع باہمی رضامندی سے عقدِ نکاح کو ختم کرنے کا نام ہے' لہٰذا وہ اقالہ کے مشابہ ہے"۔

علامہ ابن قدامہؒ نے مذکورہ بالا عبارت میں امام احمدؒ کا صاف مذہب

یہ نقل کیا ہے کہ خلع باہمی رضامندی سے ہوتا ہے اور اقالہ کی مثال دیکر یہ بھی واضح کردیا ہے کہ جس طرح اقالہ (فسخ بیع) (Cancellation of the sale transaction) فریقین کے حق میں فسخِ معاملہ ہوتا ہے لیکن اس میں باہمی رضامندی ضروری ہے اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اسی طرح خلع بھی فسخِ نکاح ہے لیکن اس میں بھی باہمی رضامندی ضروری ہے اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔

جسٹس صاحب کی نقل کے مطابق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی خلع کو فسخِ نکاح مانتے ہیں، طلاق نہیں کہتے، لیکن یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم قول ہے اور آخری قول یہی ہے کہ خُلع طلاق ہے۔

(ابن رشدؒ : بدایۃ المجتہد، صفحہ ۶۹ جلد ۲ و تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۲۷۵ جلد ۱ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۳۵۶ھ و کتاب الام صفحہ ۱۹۸ جلد ۵)

اور جہاں تک فریقین کی رضامندی کا سوال ہے اس کو وہ بھی دوسرے تمام فقہاء کی طرح خلع کے لئے لازمی شرط قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ کتاب الام کے باب الخلع والنشوز میں پوری صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں :

﴿ وإن قال لا افارقها ولا أعدل لها أجبر على القسم لها ولا يجبر على فراقها ﴾

(الامام الشافعیؒ: کتاب الام صفحہ ۱۸۹ جلد ۵، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ ۱۳۸۱ھ، باب الخلع والنشوز)

"اور اگر شوہر کہے کہ نہ میں بیوی کو علیحدہ کروں گا اور نہ اس کے ساتھ انصاف کروں گا تو اُسے انصاف پر مجبور کیا جائے گا، لیکن علیحدگی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا"۔

اور ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وليس له أن يأمرهما يفرقان إن رأيا إلا بأمر الزوج ولا يعطيا من مال المرأة الا باذنها ﴾ (ایضاً کتاب الام صفحہ۱۹٤ جلد ۵)

"اور حاکم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ حکمین کو شوہر کے حکم کے بغیر تفریق کرنے کا حکم دے اور یہ بھی اختیار نہیں کہ عورت کا مال اس کی اجازت کے بغیر شوہر کو دے"۔

اور آگے ایک مقام پر لکھتے ہیں :

﴿ وانّما جعلنا ها تطليقة لأن الله تعالى يقول الطلاق مرّتان فعقلنا مِن الله تعالى أن ذلك إنّما يقع بإيقاع الزوج وعلمنا أن الخلع لم يقع إلاّ بايقاع الزوج ﴾ (کتاب الام :صفحہ۱۹۸ جلد ۵)

"اور ہم نے معاملۂ خلع کو طلاق اس لئے قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الطلاق مرتان تو ہم نے اللہ کے کلام سے یہ بات سمجھی ہے کہ طلاق صرف شوہر کے واقع کرنے سے واقع ہوتی ہے' اور یہ بھی معلوم ہے کہ خُلع شوہر کے واقع کئے بغیر واقع نہیں ہوتا"۔

اور اس کے دو صفحوں کے بعد تو اس مسئلے کو بالکل ہی کھول کر بیان کردیا ہے' فرماتے ہیں :

﴿ وكذلك سيد العبد إن خالع عن عبده بغير إذنه لان الخلع طلاق فلايكون لأحد أن يطلق عن أحد ،لاأب ولا سيد ولا ولى ولا سلطان إنما يطلق المرء عن نفسه أويطلق عليه السلطان بمالزمه من نفسه أذا امتنع هوأن يطلّق وكان ممن له طلاق وليس الخلع من هذا المعنى بسبيل ﴾ (ایضاً صفحہ۲۰۰ جلد ۵)

"اسی طرح غلام کا آقا اگر اپنے غلام کی طرف سے بغیر غلام کی اجازت کے خلع کرلے (تو صحیح نہ ہوگا) اس لئے کہ خلع طلاق ہے۔ لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے طلاق دے' نہ باپ کو یہ حق ہے' نہ آقا کو' نہ ولی کو' اور نہ سلطان (حاکم) کو۔ طلاق تو انسان اپنی طرف سے خود دیتا ہے' یا جب وہ طلاق سے باوجود اہل طلاق ہونے کے باز رہے اور اسی کی طرف سے سلطان کو طلاق دینا لازم ہوجائے تو سلطان طلاق دے دیتا ہے' لیکن خُلع میں یہ صورت بالکل نہیں پائی جاسکتی"۔

اس میں آخری جملوں نے تو یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ خلع کے معاملہ میں شوہر کی رضامندی طلاق سے بھی زیادہ ضروری ہے' کیونکہ طلاق تو کبھی خاص حالات میں حاکم بھی شوہر کی طرف سے دے سکتا ہے' لیکن خلع میں یہ بات کبھی نہیں پائی جاسکتی۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جن حضراتِ فقہاءؒ نے خلع کو طلاق کے بجائے فسخِ نکاح کہا ہے' وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ فسخِ نکاح اقالہ کی طرح فریقین کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

آگے جسٹس صاحب فرماتے ہیں :

"اور اگر خلع کو طلاق ہی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض قدماء حنفیہ (ORTHODOX HANAFI JURSTS) کا خیال معلوم ہوتا ہے' تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کو خاص حالات میں یہ حق نہیں ہے کہ وہ شوہر سے اس کی مخالفت کے باوجود طلاقِ خُلع حاصل کرے؟ اس مسئلے کی

کوئی تصریح ان حنفی فقہاء کے یہاں نہیں ملتی"۔

(پی ایل ڈی (سپریم کورٹ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۱۶)۔

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ خلع کو طلاق قرار دینا صرف "بعض قدماء حنفیہ" ہی کا خیال نہیں، بلکہ یہ تمام حنفیہ کا متفقہ مسئلہ ہے، اور صرف حنفیہ ہی نہیں، فقہاء کی اکثریت خلع کو طلاق قرار دیتی ہے، علامہ ابنِ رُشد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

﴿ وأمّا نوع الخلع فالجمهور على أنه طلاق ﴾

"جہاں تک خلع کی نوعیت کا تعلق ہے جمہور (اکثر فقہاء) کے نزدیک وہ طلاق ہی ہے" (ابن رشدؒ: بدایۃ المجتہد صفحہ ۶۹ جلد ۲ مصطفیٰ البابی ۱۳۷۹ھ، مزید دیکھئے تفسیر ابن کثیرؒ صفحہ ۲۷۵، جلد ۱)۔

دوسری بات یہ ہے کہ جسٹس صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ حنفی فقہاء کے یہاں ایسی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ عورت شوہر کے راضی نہ ہونے کی صورت میں "طلاقِ خُلع" حاصل نہیں کر سکتی، لیکن ہم یہاں حنفی فقہاء کی چند تصریحات پیش کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خلع شوہر کی رضامندی پر موقوف ہے، علامہ ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ قدماء حنفیہ کے مستند ترین فقہاء میں سے ہیں، اور جسٹس صاحب نے بھی ان کی کتاب "احکام القرآن" سے مختلف معاملات میں حوالے نقل کئے ہیں۔ یہاں ہم پہلے انہی کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ وہ حضرت جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، (یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا)

﴿ لو كان الخلع إلى السلطان شاء الزوجان أو أبيا إذا علم أنهما لايقيمان حدود الله لم يسئلهما النبي صلى الله عليه وسلم عن ذلك ولاخاطب الزوج بقوله اخلعها بل كان يخلعها منه ويرد عليه حديقته وإن أبيا أو واحد منهما ﴾

(الجصاص:احکام القرآن صفحہ٤٦٨ جلد ۱ المطبعة البهية ۱۳٤٧ھ)

"اگر خلع کا یہ اختیار حاکم کو ہوتا کہ وہ جب دیکھے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں کریں گے (تو خود نکاح فسخ کردے) خواہ زوجین چاہیں یا نہ چاہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے شوہر سے اس معاملے میں کچھ نہ پوچھتے اور نہ شوہر سے یہ کہتے کہ تم ان سے خلع کرلو' بلکہ خود خلع کرکے شوہر کا باغ ان کو لوٹا دیتے' چاہے وہ دونوں انکار کرتے یا ان میں سے کوئی ایک انکار کرتا"۔

اس عبارت میں علامہ ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ نے صاف تصریح فرمادی ہے کہ اگر حاکم یہ دیکھے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں کرسکیں گے تب بھی وہ شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی کے بغیر خلع نہیں کرسکتا' اگر ان دونوں میں سے ایک بھی خلع سے انکار کردے تو حاکم کو خلع کا اختیار نہیں۔ فقہاء کا اصول یہ ہوتا ہے کہ جو بات اُن کے یہاں مختلف فیہ اور معروف و مشہور ہو' اسے تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے کسی ایک جگہ اصولی طور پر بیان کردیتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص فقہاء کی عبارتوں میں یہ مسئلہ تلاش کرنا چاہے کہ "طلاق کا اختیار صرف مرد کو ہے' عورت کو نہیں" تو ان الفاظ کے ساتھ اسے فقہاء کی تصریحات بہت کم ملیں گی' اس لئے کہ یہ بات اتنی طے شدہ ہے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بالکل یہی معاملہ خلع کے ساتھ بھی ہے۔ یہ مسئلہ کہ "خلع کے لئے زوجین میں سے ہر ایک کی رضامندی ضروری ہے" فقہاء کے یہاں اتنا معروف و مشہور' اور متفق علیہ اور مسلّم ہے کہ وہ اسے مستقل طور پر بہت کم ذکر کرتے ہیں' البتہ خلع کی تعریف' تعارف اور اس کے ارکان و شرائط بیان کرتے ہوئے اسے اصولی طور پر ذکر کرتے ہیں یا کسی اور مسئلے کی دلیل میں بطور ایک مسلّمہ

حقیقت کے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں جو حنفی فقہ کی مسلّم الثبوت کتاب ہے' صراحت کے ساتھ لکھا ہے :

﴿ وشرطه شرط الطلاق ﴾ (عالمگیریۃ: صفحہ ۵۱۵ جلد ۱)

"خلع کی تمام شرائط وہی ہیں جو طلاق کی ہیں"۔

اور علاّمہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وشرطه كالطلاق ﴾ (ابن عابدین: صفحہ ۶۰۶ جلد ۲)

"خلع کی شرائط طلاق جیسی ہیں"۔

اور شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ والخلع جائز عند السلطان وغيره لأ نه عقد يعتمد التراضي كسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولاية ايقاع الطلاق ولها ولاية التزام العوض ﴾

(السرخسیؒ: المبسوط صفحہ ۱۷۳ جلد ۶ مطبعة السعادة مصر ۱۳۲۴ھ)

"اور خلع حاکم کے پاس بھی جائز ہے اور حاکم کے بغیر بھی' اس لئے کہ یہ ایک ایسا معاملہ (TRANSACTION) ہے جس کی ساری بنیاد باہمی رضامندی پر ہے' اور یہ معاوضہ لے کر طلاق دینے کے حکم میں ہے' شوہر کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے اور عورت کو معاوضہ اپنے اوپر لازم قرار دینے کا"۔

اس کے علاوہ فقہاء دوسرے معاملات کی طرح خلع کا رُکن بھی ایجاب (OFFER) اور قبول (ACCEPT BNCE) کو قرار دیتے ہیں' مثلاً ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

﴿ وأما ركنه فهو الايجاب والقبول لأنه عقد على الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا يستحق العوض بدون القبول ﴾

(الکاسانیؒ: بدائع الصنائع صفحہ ١٤٥ جلد ٣ مطبعة الجمالیة مصر ١٣٢٨ء)

"رہا خلع کا رُکن تو وہ ایجاب اور قبول ہے' اس لئے کہ یہ معاوضہ کے ساتھ طلاق کا معاملہ ہے' لہٰذا بغیر قبول کے علیحدگی واقع نہیں ہوگی"۔

واضح رہے کہ فقہاء کی اصطلاح میں کسی عمل کا رُکن وہ چیز ہوتی ہے جس کے بغیر اس عمل کا شرعی وجود (LEGAL ENTITY) ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً سجدہ نماز کا رکن ہے' اس لئے سجدہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی' اسی طرح ایجاب وقبول خلع میں بھی رکن ہیں جس کے بغیر خلع نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جو فقہاء اسے طلاق قرار دیتے ہیں وہ بھی اور جو حضرات اسے فسخ کہتے ہیں وہ بھی' دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ خلع باہمی رضامندی کا معاملہ ہے' جس میں شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی ضروری ہے' اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔ لہٰذا خلع کے طلاق یا فسخ ہونے سے مسئلہ زیرِ بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

آگے جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ خلع میں شوہر کی رضامندی کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

(پی ایل ڈی (سپریم کورٹ) ١٩٦٧ء صفحہ ١١٧ سطر ١)

بعض لوگ شوہر کی رضامندی کو ضروری سمجھتے ہیں اور بعض حضرات اسے ضروری قرار نہیں دیتے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جسٹس صاحب اپنے اس دعوے کی تائید میں فقہاء کے جو اقوال پیش کرتے ہیں وہ بالکل دوسرے مسئلے سے متعلق ہیں' اور ان کا شوہر کی رضامندی سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سلسلے میں جسٹس صاحب نے علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی جو عبارت پیش کی ہے وہ یہ ہے :

﴿ اتفق الائمة على ان المراة اذا كرهت زوجها لقبح منظر أو سوء عشرة جاز لها أن تخالعه على عوض وإن لم يكن من ذلك شيئ وتراضيا على الخلع من غير سبب جاز ولم يكره خلافا للزهرى وعطاء وداؤد فى قولهم ان الخلع لا يصح فى هذه الحالة لأنه عبث والعبث غير مشروع ﴾

(الشعرانیؒ: المیزان الکبریٰ صفحہ ۱۱۹ جلد ۲ دار احیاء الکتب المصریۃ)

"تمام أئمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر عورت اپنے شوہر کو بد صورتی یا سوءِ معاشرت کی بناء پر ناپسند کرتی ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ شوہر سے معاوضہ پر خُلع کا معاملہ کرلے اور اگر ناپسندیدگی کی کوئی وجہ نہ ہو اور میاں بیوی خُلع پر بلاوجہ راضی ہو جائیں تب بھی جائز ہے اور مکروہ نہیں' البتہ اس میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ' امام عطاء رحمۃ اللہ علیہ' اور امام داؤد رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے' وہ کہتے ہیں کہ اس حالت میں خلع صحیح نہیں' اس لئے کہ وہ عبث ہے اور عبث غیر مشروع ہے"۔

اس عبارت ہی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اختلاف شوہر کی رضامندی کے مسئلے میں نہیں' بلکہ اس مسئلے میں ہے کہ فریقین کی رضامندی کے بعد بھی خلع ہر حال میں جائز ہے یا صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ بیوی اپنے شوہر کو ناپسند کرنے کی معقول وجہ رکھتی ہو۔ اکثر فقہاء نے پہلی رائے کو اختیار کیا ہے' اور امام زہری رحمۃ اللہ علیہ' امام عطاء رحمۃ اللہ علیہ' اور امام داؤد ظاہری

رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری رائے کو، لیکن جہاں تک خلع میں فریقین کی رضامندی کا تعلق ہے، اس کو دونوں فریق ضروری قرار دیتے ہیں جیسے کہ جاز لھا أن تخالعه علی عوض اور وتراضیا علی الخلع کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ خدا جانے اس عبارت کے کون سے لفظ سے جسٹس صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی فریق کے نزدیک شوہر کی رضامندی کے بغیر بھی خلع ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد جسٹس صاحب نے عمدۃ القاری کے حوالہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک زوجین کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے جو حَکَم بھیجے جاتے ہیں ان کو تفریق کا بھی اختیار ہوتا ہے، اور اگر وہ مناسب سمجھیں تو شوہر کی اجازت کے بغیر بھی تفریق کرا سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے "حَکَمین" کو یہ اختیار دیا ہے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے تمام فقہاء رحمہم اللہ کا مسلک یہی ہے کہ جب تک شوہر حَکَمین کو اپنا وکیلِ مختار نہ بنائے، اس وقت تک ان کو شوہر کی مرضی کے بغیر تفریق کا اختیار حاصل نہیں ہے، ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کریم میں حَکَم بھیجنے کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں کیا گیا ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَماً مِنْ اَهْلِهٖ وَحَكَماً مِنْ اَهْلِهَا اِنْ يُرِيْدَا اِصْلَاحاً يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾

"اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑجانے کا اندیشہ ہو تو تم ایک حَکَم مرد کی طرف سے اور ایک حَکَم عورت کی طرف سے بھیجو، اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ زوجین کے اندر موافقت پیدا فرمادے گا"۔

اس آیت کا آخری جملہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ حَکَم زوجین کے درمیان تفریق اور علیحدگی کے لئے نہیں' بلکہ دونوں میں موافقت پیدا کرنے اور پھوٹ سے بچانے کے لئے بھیجے جارہے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الام میں اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے' وہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وليس له أن يأ مرهما يفرقان إن رأيا إلاّ بأمرالزوج ولا يعطيامن مَال المرأة إلابإذنها (قال) فإن اصطلح الزوجان وإلاّ كان على الحاكم أن يحكم لكل واحد منهما على صاحبه بمايلزمه من حق فى نفس ومال وأدب (قال) وذلك أن الله إنما ذكرأنهما "إن يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما" ولم يذكرتفريقا (قال) وأختار للامام أن يسأل الزوجين أن يترا ضيا بالحكمين ويوكلاهما معاً فيوكلهما الزوج إن رأياأن يفرقا بينهما فرقا على ماراَيامن أخذ شيئى أوغيرا خذه ﴾ (كتاب الام صفحہ١٩٤ جلد ٥)

"جب میاں بیوی کے درمیان پھوٹ کا اندیشہ ہو اور وہ حاکم کے پاس اپنا معاملہ لے جائیں تو اس پر واجب ہے کہ ایک حَکَم شوہر کی طرف سے اور ایک حَکَم بیوی کی طرف سے بھیجے' یہ حَکَم اہلِ قناعت اور اہلِ عقل میں سے ہوں' تاکہ ان کے معاملے کی تحقیق کریں اور حتی المقدور مصالحت کرائیں لیکن حاکم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ حکمین کو اپنی رائے سے شوہر کے حَکَم کے بغیر تفریق کا حُکم دے' اور نہ وہ عورت کا کوئی مال اس کی

اجازت کے بغیر شوہر کو دے سکتے ہیں۔ پس اگر زوجین میں مصالحت ہو جائے تو بہتر' ورنہ حاکم پر یہ واجب ہے کہ وہ فریقین میں سے ہر ایک پر دوسرے کے جانی' مالی اور ادبی (معاشرتی) حقوقِ واجبہ کی ادائیگی کا فیصلہ کرے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ ذکر فرمایا ہے کہ "اِنْ یُرِیْدَا اِصْلاَحاً یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا" (اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں موافقت پیدا فرمادے گا) اور تفریق کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔ ہاں البتہ حاکم کے لئے میں یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ زوجین سے کہے کہ وہ حَکَمین کے ہر فیصلے پر راضی ہو جائیں اور دونوں انہیں اپنا وکیل بنا دیں' شوہر حَکَمین کو اس بات کا وکیل بنائے کہ وہ اگر مناسب سمجھیں تو اپنی رائے کے مطابق کچھ لے کر یا بغیر کچھ لئے تفریق کردیں"۔

آگے لکھتے ہیں ﴿ ولا یجبرا لزوجان علی توکیلھما إن لم یوکلا ﴾

(ایضاً صفحہ ۱۹۵ جلد ۵)

"اور اگر زوجین حَکَمین کو وکیل نہ بنائیں تو انہیں مجبور نہ کیا جائے گا"۔

امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی دلائل کی روشنی میں تحریر فرماتے ہیں :

﴿ ولیس للحکمین فی الشقاق أن یفرّقا إلاّ أن یجعل ذلک إلیھما الزوج ﴾

(مختصر الطحاوی: صفحہ ۱۹۱ دار الکتاب العربی دکن ۱۳۷۰ھ)

"اور حَکَمین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ شقاق کی صورت میں تفریق کردیں الّا یہ کہ شوہر انہیں یہ اختیار دے دے"۔

جناب جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے اس مسئلہ پر علامہ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ انہوں نے اس پر مبسوط بحث کی ہے لیکن جسٹس صاحب نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ اس بحث کے بعد انہوں نے نتیجہ کیا نکالا ہے؟ علامہ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر بحث کرنے کے بعد صاف لکھا ہے کہ :

﴿ليس في الآية ولا في شيئ من السُنن أن للحكمين أن يفرقا ولا أن ذلك للحاكم﴾

(ابن حزم: المحلى، صفحه٨٧و٨٨ جلد ١٠، ادارة الطباعة المنيرية ١٣٥٢ھ)

"کسی بھی آیت یا حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حَکَمین کو تفریق کا اختیار ہے، اور نہ یہ اختیار حاکم کے لئے ثابت ہوتا ہے"۔

حضرت جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ

جسٹس صاحب نے صحیح بخاری کی مندرجہ ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا ہے :

﴿عن ابن عباسؓ أنّ امرأة ثابت بن قيس أتت النبى صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله ثابت بن قيس ما أعتب عليه فى خلقٍ ولا دين ولكنى أكره الكفر فى الاسلام، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتردّين عليه حديقته

قالت نعم قال رسول صلی اللہ علیه وسلم اقبل الحديقة وطلّقها تطليقةً ﴾

(صحیح بخاری: صفحہ۷۹۴ جلد ۱۲صح المطابع کراچی)

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی (جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اخلاق اور دینداری سے ناراض نہیں ہوں، لیکن میں اسلام لانے کے بعد کفر کی باتوں سے ڈرتی ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم ان پر ان کا باغ (جو انہوں نے بطور مہر دیا تھا) لوٹا دوگی؟ انہوں نے کہا ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے فرمایا کہ تم باغ قبول کرلو اور انہیں ایک طلاق دے دو“۔

لیکن اس حدیث سے استدلال اس لئے درست نہیں کہ مذکورہ واقعہ شوہر کی رضامندی سے ہوا تھا، اور انہوں نے خُلع کے اس معاملے کو قبول کرلیا تھا، چنانچہ سننِ نسائی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ فأرسل إلى ثابت فقال له خذالذی لها عليك وخلِّ سبيلها قال نعم ﴾

(الدر المنثور للسیوطیؒ: صفحہ ۲۸۲ جلد ۱ بحوالہ نسائی)

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پیغام بھیجا کہ جو مال ان کا تم پر واجب تھا وہ

لے لو اور ان کو چھوڑ دو' حضرت ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا' ہاں! "۔

اور ظاہر ہے کہ اگر شوہر خلع کو قبول کرلے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ گفتگو تو اس صورت میں ہو رہی ہے جبکہ شوہر خلع پر راضی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خلع کا حکم دیا تھا تو یہ حکم باتفاق علماء بطور مشورہ تھا' قاضی کی حیثیت میں جبراً نہیں تھا' حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں :

﴿ ھو أمر إرشاد وإصلاح لا إیجاب ﴾

(الحافظ ابن حجرؒ: فتح الباری: صفحہ ۳۲۹ جلد ۹ المطبعۃ البہیۃ ۱۳۴۸ھ)

"یہ ہدایت اور اصلاح کا حکم تھا' ایجابی حکم نہ تھا"۔

علّامہ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے یہی لکھا ہے۔

اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شوہر کو طلاق کا حکم دینا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قاضی یا حاکم ازخود تفریق نہیں کرسکتا' بلکہ یہ کام صرف شوہر کرسکتا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر جصّاص رازی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

﴿ لو کان الخلع الی السلطان شاء الزوجان أو أبیا اذا علم أنھما لایقیمان حدود اللہ لم یسألھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک ولا خاطب الزوج بقولہ اخلعھا بل کان یخلعھا منہ ویرد علیہ حدیقتہ وإن أبیا أو واحد منھما لما کانت فرقۃ المتلاعنین إلی الحاکم لم یقل للملاعن خلّ سبیلھا

بل فرق بینهما ﴾

(الجصاصؒ: احکام القرآن صفحہ۴٦۸جلد ۱ المطبعۃ البھیۃ ۱۳۴۷ھ)

"اگر یہ اختیار سلطان کو ہوتا کہ وہ جب دیکھے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں کریں گے تو خلع کردے' خواہ یہ زوجین کی خواہش ہویا نہ ہو' تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے اس کا سوال نہ فرماتے' اور نہ شوہر سے یہ کہتے کہ تم ان سے خلع کرلو' بلکہ خود خلع کرکے عورت کو چھڑا دیتے' اور شوہر پر اس کا باغ لوٹا دیتے' خواہ وہ دونوں انکار کرتے یا ان میں سے کوئی ایک انکار کرتا۔ جیسے کہ لعان میں زوجین کی تفریق کا اختیار حاکم کو ہوتا ہے تو وہ ملاعن (شوہر) سے یہ نہیں کہتا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دو' بلکہ خود تفریق کردیتا ہے"۔

امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دلیل نہایت وزنی ہے' یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی فقیہ نے اس حدیث سے استدلال کرکے یہ نہیں کہا کہ حاکم شوہر کو خلع پر مجبور کرسکتا ہے۔

سعیدہ خانم بنام محمد سمیع کے مقدّمے میں فاضل جج صاحبان نے بھی حضرت جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعے کا یہی جواب دیا تھا کہ وہاں خلع شوہر کی مرضی سے ہوا تھا۔

(سعیدہ خانم بنام محمد سمیع۔ پی ایل ڈی ۱۹۵۲ء لاہور)

جسٹس ایس اے رحمان صاحب سعیدہ خانم کے مقدّمے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سعیدہ خانم کے مقدّمے میں اس آیت پر غور نہیں کیا گیا جو حق خلع کے بارے میں ہے' اگرچہ حضرت جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہا کی حدیث پر گفتگو کی گئی ہے"۔

سعیدہ خانم کے مقدّمے میں جو حضرت جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعے کو شوہر کی مرضی کا واقعہ قرار دیا گیا ہے' اس کا جواب دیتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں :

"میری ناقص رائے میں یہ بات قرآن کے الفاظ اور روح کے ساتھ جو بیوی اور شوہر کو ایک دوسرے کے حقوق کے معاملے میں ایک ہی مقام دیتی ہے' زیادہ ہم آہنگ ہوگی کہ ان واقعات کی تشریح اس طرح کی جائے کہ اولوالامر بشمول قاضی خُلع کے ذریعہ خود بھی تفریق کا حکم دے سکے' اگرچہ شوہر اس سے متفق نہ ہو"۔

(پی ایل ڈی (سپریم کورٹ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۱)

ظاہر ہے کہ جسٹس صاحب کے یہ الفاظ محض اپنے دعوے کے اعادہ کی حیثیت رکھتے ہیں' اور ان سے کسی طرح بھی اس بات کا جواب نہیں ہوتا کہ حضرت جمیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ باہمی رضامندی کا واقعہ تھا۔ رہی یہ بات کہ قرآن کریم کے "الفاظ" اور "روح" سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قاضی شوہر کی مرضی کے خلاف خلع کے ذریعہ تفریق کر سکتا ہے' سو آیتِ خلع پر بحث کرتے ہوئے ہم مفصّل بحث کر چکے ہیں' جس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ پوری امّت اور اس کے ائمہ تفسیر نے قرآن کریم کے ان الفاظ کا مفہوم یہی قرار دیا ہے کہ خلع صرف فریقین کی باہمی رضامندی سے ہو سکتا ہے' اس کے سوا اُس کا کوئی راستہ نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد

جناب جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے اپنے فیصلے میں حضرت عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک ارشاد سے بھی استدلال فرمایا ہے' سُنَنِ بیہقی میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا :

﴿ اذا أرادت النساء الخلع فلا تكفروهنّ ﴾

(الدار المنثور للسیوطیؒ: صفحہ ۲۸۳ جلد ۱)

"اگر عورتیں خلع کرنا چاہیں تو ان سے انکار نہ کرو"۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد خود اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم فریقین یا ان میں سے کسی ایک کی مرضی کے خلاف خُلع نہیں کرسکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس ارشاد میں شوہروں کو خطاب فرمایا ہے' اس لئے کہ حاکم اور قاضی تو وہ خود تھے' اگر حاکم اور قاضی کو ازخود خلع کرنے کا اختیار ہوتا تو ان کو شوہروں سے یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ جب عورتیں خلع کرنا چاہیں تو تم انکار نہ کرو۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد سے اس بات پر کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ حاکم فریقین یا ان میں سے کسی ایک کی مرضی کے خلاف خود خلع کرسکتا ہے۔ ہاں! یہ ارشاد شوہروں کے لئے ایک ہدایت نامہ ضرور ہے کہ جب عورتیں خلع کرنا چاہیں تو انہیں خواہ مخواہ باندھے رکھنے کے بجائے خُلع کو قبول کرلینا چاہئے۔

یہاں تک ہم نے ان دلائل پر تبصرہ کیا ہے جو جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب نے اپنے فیصلے میں پیش کئے ہیں۔ اس فیصلے پر جسٹس ایس اے محمود صاحب نے بھی ایک نوٹ لکھا ہے' اس نوٹ میں بیشتر دلائل تو بنیادی طور پر وہی ہیں جو جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب نے پیش کئے ہیں' اور ان کا جواب پیچھے تفصیل کے ساتھ آچکا ہے البتہ اس میں دو باتیں نئی ہیں جن کا جواب پیچھے نہیں آیا :

(۱) علامہ ابنِ رُشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں خلع کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

﴿ والفقه أن الفداء إنما جعل للمرأة فی مقابلة ما بید الرجل من الطلاق فإنه لما جعل الطلاق بید الرجل إذا فرك المرأة جعل الخلع بید المرأة اذا فرکت الرجل ﴾

"اور خلع میں راز یہ ہے کہ فدیہ (خلع) عورت کو مرد کے حقِ طلاق کے مقابلے میں دیا گیا ہے' اس لئے کہ جب مرد عورت کو ناپسند کرے تو اسے طلاق کا اختیار دیدیا گیا ہے' اور جب عورت مرد کو ناپسند کرے تو اس کو خلع کا اختیار دیدیا گیا ہے"۔

اس سے جسٹس صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس طرح طلاق میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں' اسی طرح خُلع میں مرد کی رضامندی ضروری نہیں' لیکن علاّمہ ابنِ رُشد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی یہ تشریح بوجوہِ ذیل صحیح نہیں:

(الف) اسی عبارت سے چند سطر پہلے علاّمہ ابنِ رُشد رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:

﴿ وأما مایرجع الی الحال التی یجوز فیها الخلع من التی لایجوز فإن الجمهور علی أن الخلع جائز مع التراضی إذا لم یکن سبب رضاهما بما تعطیه إضراره بها ﴾

(ابنِ رشدؒ: بدایۃ المجتہد صفحہ ۶۸ جلد ۲ مصطفی البابی ۱۳۷۹ھ)

"رہی یہ بات کہ خلع کون سی حالت میں جائز ہوتا ہے اور کونسی حالت میں ناجائز' سو جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ خلع باہمی رضامندی کی حالت میں جائز ہے' بشرطیکہ عورت کے مال کی ادائیگی پر راضی ہونے کا سبب مرد کی طرف سے اسے تنگ کرنا نہ ہو"۔

اس عبارت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ خُلع جائز ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں اس پر رضامند ہوں' البتّہ چونکہ اس طرح عورت کو فی الجملہ علیحدگی کا ایک راستہ مل جاتا ہے' اس لئے علاّمہ ابنِ رُشد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک نُکتے کے طور پر اس طرح بیان کردیا ہے کہ عورت کا یہ اختیار مرد کے حقِّ طلاق کے مقابلے میں ہے۔

(ب) ورنہ اگر علامہ ابنِ رُشد رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہوتا کہ خلع کا حق ٹھیک مرد کے حقِ طلاق کی طرح ہے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ان کے نزدیک اس کے لئے عورت کو مال ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ جس طرح مرد کچھ پیسے دیئے بغیر طلاق دینے کا حق رکھتا ہے' اسی طرح عورت بھی پیسے ادا کئے بغیر علیحدگی حاصل کرنے کی مجاز ہوتی' حالانکہ یہ وہ بات ہے جسے خود جسٹس صاحبان بھی تسلیم نہیں فرماتے۔

(ج) اسی طرح اگر اس عبارت کا وہی مطلب ہوتا جو ان حضرات نے سمجھا ہے تو عورت کو خلع کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے۔ بلکہ جس طرح شوہر عدالت میں جائے بغیر بیوی کو طلاق دے سکتا ہے' اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ملنا چاہئے تھا' حالانکہ معزز جسٹس صاحبان اس بات کو بھی تسلیم نہیں فرماتے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ علامہ ابن رُشد رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد طلاق اور خلع کو ہر اعتبار سے ایک ہی سطح پر لا کھڑا کرنا نہیں ہے' بلکہ وہ ایک نکتے کے طور پر یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ عورت کو بھی خلع کے ذریعہ علیحدگی کا ایک راستہ دے دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو مہر یا کچھ اور مال کی ترغیب دلا کر علیحدگی حاصل کر سکتی ہے' اس کے لئے ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں جیسا کہ خود الفاظِ قرآن لَاجُنَاحَ میں اس کی واضح شہادت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خلع میں شوہر کی

رضامندی کی بالکل ضرورت ہی نہیں ہے۔

(د) یہاں ایک اصولی بات کی طرف مختصر اشارہ کردینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ تمام فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا طریقہ عموماً یہ ہے کہ وہ صرف احکام اور ان کی علتیں بیان کرتے ہیں، حِکمتوں اور مصلحتوں کا ذکر نہیں کرتے، اور اگر کہیں اتفاقاً ان کا ذکر آئے تو الفقه فيه یا السّرّ فيه کے الفاظ سے اس کو ممتاز کردیتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمہ اصول یہ ہے کہ فقہاء کا قانونی منشاء معلوم کرنے کے لئے ان کے بیان کردہ اسباب و عِلل کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اور جو بات وہ حِکمت و مصلحت کے طور پر بیان کرتے ہیں اُسے کسی قانونی حکم کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اس لئے کہ احکامِ فقہیہ کا مدار علّتوں پر ہوتا ہے، حِکمتوں پر نہیں۔ اور اس مقام پر ابنِ رُشدؒ نے یہ نکتہ الفقه فيه کے عنوان سے ہی بیان فرمایا ہے۔

(۲) ہمیں سب سے زیادہ حیرت جناب جسٹس ایس اے محمود صاحب کے اس ارشاد پر ہے کہ:

> *"Ibne Hazam in "Al-Mohalla" supports the Qazi's right to effict separation by Khula after efforts at reconciliation have faild"*
> *(PLD (SC) 1967 p.137)*

> "ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ نے المُحلّٰی میں قاضی کے اس حق کی حمایت کی ہے کہ جب میاں بیوی کے درمیان اتفاق پیدا کرنے کی کوششیں ناکام ہوجائیں تو وہ خلع کے ذریعہ تفریق کرسکتا ہے"۔

حالانکہ علامہ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ نے جس سختی کے ساتھ قاضی اور حَکَمین کے اس حق کی تردید کی ہے، اسے ہر شخص المُحلّٰی میں دیکھ سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

﴿ وليس لهما أن يفرقا بين الزوجين لا بخلع ولا بغيره ﴾

"حکمین کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ میاں بیوی کے درمیان
خلع کے ذریعہ یا بغیر خلع کے تفریق (علیحدگی) کردیں"۔

اور اس مسئلہ پر مفصّل بحث کرکے آخر میں لکھتے ہیں :

﴿ لیس فی الآیة ولا فی شیئی من السُنن أن للحکمین أن
یفرقا ولا أن ذلك للحاکم ﴾

(ابن حزمؒ: المحلیٰ، صفحہ۸۷و۸۸ جلد ۱۰، ادارة الطباعة المنیریة ۱۳۵۲ھ)

یعنی "کسی آیت یا کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ
حکمین کو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرنے کا اختیار ہے
اور نہ یہ اختیار حاکم (قاضی) کے لئے ثابت ہوتا ہے"۔

مُثبِت دلائل

اب تک ہم نے ان دلائل کا فقہی جائزہ لیا ہے جو سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے میں پیش کئے گئے ہیں۔ اب ہم مختصراً وہ دلائل مثبت طور پر پیں کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خُلع باہمی رضامندی کا معاملہ ہے' اور حاکم کسی فریق کے علی الرّغم اسے نافذ نہیں کرسکتا۔

① خلع کی آیت پر ہم پیچھے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرچکے ہیں' اس بحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس آیت کے تین جملے خلع کے لئے فریقین کی رضامندی کو ضروری قرار دیتے ہیں :

(الف) إِلَّآ أَنْ يَّخَافَآ أَنْ لَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ

(ب) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

(ج) فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ

(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے :

﴿ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ إِلَّآ أَنْ يَعْفُونَ أَوْيَعْفُوَ الَّذِىْ بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾

"اور اگر تم ان بیویوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ، اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کرچکے تھے تو جتنا مہر مقرر کیا ہو اس کا نصف ہے، مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں یا یہ کہ وہ شخص رعایت کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق ہے"۔

(ترجمہ ماخوذ از حکیم الامّت مولانا تھانویؒ : بیان القرآن، صفحہ ۱۴۱ جلد ۱، شیخ غلام علی)

اس آیت میں الَّذِى بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق ہے) سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق شوہر ہے، جس کے بارے میں آیت نے یہ واضح کردیا ہے کہ نکاح کا رشتہ تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا اس رشتے کو اس کے سوا کوئی ختم نہیں کرسکتا۔

جناب جسٹس ایس اے رحمٰن اور جناب جسٹس ایس اے محمود صاحب نے اس دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ بعض مفسّرین نے یہاں الَّذِى بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے مراد شوہر کے بجائے عورت کے ولی کو قرار دیا ہے۔

لیکن یہ جواب مندرجہ ذیل وجوہ سے درست نہیں :

(۱) یہ تفسیر کا ایک مسلّمہ اُصول ہے کہ کسی آیت کا جو مفہوم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا ہو وہی مفہوم سب سے زیادہ مستند، قوی اور واجب

القبول ہوتا ہے' اور اس معاملے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد موجود ہے جسے مختلف محدّثین نے روایت کیا ہے' اور سند کے لحاظ سے اس کا مرتبہ "حسن" سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ ارشاد یہ ہے :

﴿عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ولیّ عقدة النكاح الزوج﴾

(الدارقطنیؒ : بحواله تفسير القرطبیؒ :صفحہ۲۰٦ جلد۳ دارالکتب المصریة ۱۹۳٦ء)

"حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولیّ عقدة النكاح (سے مراد) شوہر ہے"۔

اور اسی معنیٰ کی ایک حدیث مرفوع ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ' ابنِ ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ' طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بھی بیان کی ہے۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کی تفسیر "شوہر" سے فرمائی ہے۔ (الآلوسی : روح المعانی' صفحہ ۱۵۴' جلد ۲ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ)

اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ کی اکثریت سے اس آیت کی یہی تفسیر منقول ہے جن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی داخل ہیں۔

(۲) امام المفسّرین حافظ ابنِ جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس موضوع پر نہایت مفصّل بحث کی ہے اور ناقابلِ انکار دلائل سے اسی تفسیر کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان دلائل کو تفصیل کے ساتھ وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں بغرضِ

اختصار حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(دیکھئے تفسیر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۳۱۸ جلد ۱۲ المطبعۃ المیمنیۃ مصر)

(۳) جسٹس صاحبان نے اس آیت کے جس مفہوم کو ترجیح دی ہے' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورت کا ولی عورت کی اجازت کے بغیر اس کا حق مہر معاف کر سکتا ہے۔ قاضی ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ مشہور مفسّر قرآن ہیں' انہوں نے قرآن کریم کے اگلے جملے سے استدلال کر کے اس مفہوم کے خلاف بڑی مضبوط بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسی آیت کے فوراً بعد ارشاد ہے :

﴿ وَأَنْ تَعْفُوا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾

"اور اگر تم رعایت کردو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے"۔

حالانکہ ولی کا عورت کے حقِ مہر کو معاف کر دینا کسی بھی اعتبار سے تقویٰ نہیں کہلا سکتا' یہ بات اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جبکہ اس کا مخاطب شوہر کو قرار دے کر یہ کہا جائے کہ وہ رعایت کر کے پورا مہر ادا کر دے تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے :

﴿ ان الأول (ای کون المراد هوالزوج) أنسب لقوله تعالىٰ وأن تعفوا اقرب للتقوىٰ فان اسقاط حق الصغيرة ليس فى شيئى من التقوىٰ ﴾

(القاضی ابوالسعودؒ: تفسیر ارشاد العقل السلیم صفحہ ۱۷۹ جلد ۱ المطبعۃ المصریۃ ۱۳۴۷ھ)

فقہاء کی عبارتیں

آخر میں ہم فقہاء مجتہدین کی وہ عبارتیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی اور ظاہری مسلک میں سے ہر ایک اس بات پر

یقینی ہے کہ خُلع صرف میاں بیوی کی باہمی رضامندی سے ہو سکتا ہے' اور ان میں سے کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔

حنفی مسلک :

حنفی مسلک کی بہت سی کتابوں کے حوالے ہم پیچھے پیش کرچکے ہیں' یہاں صرف شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جو تمام فقہاء حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کے مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے :

﴿والخلع جائز عندالسلطان وغيره لانه عقد يعتمد التراضى﴾

(السرخسیؒ: المبسوط صفحه۱۷۳ جلد٦ مطبعة السعادة مصر١٣٢٤ه)

"اور خُلع سلطان (حاکم) کے پاس بھی جائز ہے' اور اس کے علاوہ بھی۔ اس لئے کہ یہ ایسا عقد ہے جس کی ساری بنیاد باہمی رضامندی پر ہے"۔

اس کے علاوہ امام ابوبکر حصّاص رحمۃ اللہ علیہ کی صریح عبارت اس مفہوم پر پیچھے دوبار پیش کی جاچکی ہے نیز فتاویٰ عالمگیریہ اور ابنِ عابدین شامیؒ کی عبارتیں بھی گذر چکی ہیں۔

شافعی مسلک :

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿لأن الخلع طلاق فلايكون لأحدأن يطلق عن احدأب ولاسيّد ولاولیّ ولاسُلطان﴾

(الامام الشافعیؒ: كتاب الام صفحه۲۰۰ جلد٥ مكتبة الكليات الازهريه١٣٨١ه)

"اس لئے کہ خلع طلاق کے حکم میں ہے' لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے طلاق دے' نہ باپ کو یہ حق ہے' نہ آقا کو' نہ سرپرست کو اور نہ حاکم کو"۔

اور علامہ ابو اسحٰق شیرازی شافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

﴿لان رفع عقد بالتراضی جعل لِدفع الضرر فجاز من غیر ضرر کالاقالۃ فی البیع﴾

(الشیرازیؒ: المهذب صفحہ ۷۱ جلد ۲ عیسی البابی ۱۳۷٦ھ)

"اس لئے کہ یہ (خلع) باہمی رضامندی سے عقدِ نکاح کو ختم کرنے کا نام ہے جو ضرر دور کرنے کے لئے مشروع ہوا ہے' لہٰذا جہاں کسی فریق کو ضرر نہ ہو وہاں (بدرجہ اولیٰ) جائز ہے' جیسے کہ بیع میں اقالہ (واپسی) "۔

مالکی مسلک :

(۱) علامہ ابو الولید باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ موطاء امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شرح میں لکھتے ہیں :

﴿وتجبر علی الرجوع إلیہ إن لم یرد فراقها بخلع أو غیرہ﴾

(ابو الولید الباجیؒ: المنتقیٰ صفحہ ٦۱ جلد ۷ مطبعة السعادة)

"عورت کو شوہر کے پاس جانے پر مجبور کیا جائے گا اگر شوہر خلع وغیرہ کے ذریعہ علیحدگی نہ چاہتا ہو"۔

(۲) اور علامہ ابنِ رُشد مالکی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿وأما مایرجع الی الحال التی یجوز فیها الخلع من التی لایجوز فإن الجمهور علی أن الخلع جائز مع التراضی إذا لم

یکن سبب رضا هما بما تعطیه إضرار ه بها ﴾

(ابنِ رُشدؒ: بدایۃ المجتھد صفحہ ٦٨ جلد ٢ مصطفی البابی ١٣٧٩ھ)

"رہی یہ بات کہ خلع کون سی حالت میں جائز ہوتا ہے اور کونسی حالت میں ناجائز، تو جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ خُلع باہمی رضامندی کے ساتھ جائز ہے، بشرطیکہ عورت کے مال کی ادائیگی پر راضی ہونے کا سبب مرد کی طرف سے اسے تنگ کرنا نہ ہو"۔

حنبلی مسلک :

فقہ حنبلی کے مستند ترین شارح علامہ موفق الدین بن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ ولأنه معاوضة فلم يفتقر إلى السلطان كالبيع والنكاح ولأ نه قطع عقد بالتراضي أشبه الإقالة ﴾

(ابنِ قدامہؒ: المغنی صفحہ ٥٢ جلد ٧ دار المنار ١٣٦٧ھ)

"اور اس لئے کہ یہ عقدِ معاوضہ ہے، لہٰذا اس کے لئے حاکم کی ضرورت نہیں، جیسا کہ بیع اور نکاح۔ نیز اس لئے کہ خلع باہمی رضامندی سے عقد کو ختم کرنے کا نام ہے، لہٰذا یہ اقالہ (فسخِ بیع) کے مشابہ ہے"۔

اور علامہ ابن قیم جوزیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وفی تسمیة صلى الله عليه وسلم الخلع فدیةً دلیل علی أن فیه معنی المعاوضة ولهذا اعتبر فیه رضا الزوجین ﴾

(ابن القیمؒ: زاد المعاد صفحہ ٢٣٨ جلد ٢ میمنیۃ مصر ١٣٢٤ھ)

"اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خُلع کا نام فدیہ رکھا،

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں عقدِ معاوضہ کے معنی پائے جاتے ہیں، اسی لئے اس میں زوجین کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے"۔

ظاہری مسلک :

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

﴿ الخلع وهوا لافتداء إذاكرهت المراة زوجها فخافت ان لاتوفيه حقّه أوخافت أن يبغضها فلا يوفيها حقّها فلها أن تفتدى منه و يطلقها إن رضى هوو إلاّ لم يجبر هوو لا أجبرت هى، انما يجوزبتراضيهما ولا يحل الا فتداء إلاّ باحدالوجهين المذكورين اواجتماعهما فان وقع بغير هما فهو باطل ويرد عليها ماأخذمنها وهي إمرأته كما كانت ويبطل طلاقه ويمنع من ظلمهافقط ﴾

(ابن حزمؒ: المحلّی صفحہ ۲۳۵ جلد ۱۰ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ ۱۳۵۲ھ)

"خُلع اور وہ فدیہ دے کر جان چھڑانے کا نام ہے، جب عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرے اور اُسے ڈر ہو کہ وہ شوہر کا حق پورا ادا نہیں کرسکے گی، یا اُسے خوف ہو کہ شوہر اس سے نفرت کرے گا اور اس کے پورے حقوق ادا نہیں کرے گا تو اسے یہ اختیار ہے کہ وہ شوہر کو کچھ فدیہ دے اور اگر شوہر راضی ہو تو وہ اسے طلاق دے دے، اور اگر شوہر راضی نہ ہو تو نہ شوہر کو مجبور کیا جاسکتا ہے نہ عورت کو، خلع تو صرف باہمی رضامندی سے جائز ہوتا ہے۔ اور جب تک مذکورہ دو صورتوں،

میں سے کوئی ایک یا دونوں نہ پائی جائیں خلع حلال نہیں ہوتا۔
لہٰذا اگر ان کے سوا کسی طرح خلع کرلیا گیا تو وہ باطل ہے اور
شوہر نے جو کچھ مال لیا ہے وہ لوٹائے گا' اور عورت بدستور
اس کی بیوی رہے گی اور اس کی طلاق باطل ہوگی اور شوہر کو
صرف عورت پر ظلم کرنے سے منع کیا جائے گا"۔

اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

﴿ لیس فی الآیة ولافی شیئی من السنن أن للحکمین أن یفرقاولا ان ذلک للحاکم ﴾ (ایضاً صفحہ۸۸ جلد ۱۰)

"کسی بھی آیت یا کسی بھی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حَکَمین (ARBITRATORS) کو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرنے کا اختیار ہے' اور نہ یہ اختیار حاکم کے لئے ثابت ہوتا ہے"۔

خُلع کا فقہی مفہوم

حقیقت یہ ہے کہ خلع کے فقہی مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی سے انجام پائے' اس کے سوا اس کی کوئی اور شکل نہیں۔ علامہ ابوالفتح مطرزی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "المغرب" جو فقہی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرنے کے لئے لکھی ہے' اس میں تحریر فرماتے ہیں :

﴿ وخالعت المرأة زوجها واختلعت منه اذا افتدت منه بمالها فإذا أجابها إلیٰ ذلک فطلقها قیل خلعها ﴾

(المطرزیؒ: المغرب فی ترتیب المغرب صفحہ۱۶۵ جلد ۱ دکن۱۳۲۸ھ)

خالعت المرأة اور اختلعت المرأة کے الفاظ

اس وقت استعمال کئے جاتے ہیں جب عورت اپنی آزادی کے لئے کوئی فدیہ پیش کرے۔ پس اگر شوہر اس کی پیشکش کو قبول کرلے اور طلاق دے دے تو کہا جاتا ہے کہ خلعھا (یعنی مرد نے عورت کو خلع کردیا) "۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جناب جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب نے اپنی بحث کے شروع میں تقلید کے مسئلے پر جو گفتگو فرمائی ہے، وہ بھی زیرِ بحث مسئلہ میں بالکل غیر متعلق (IRRELEVENT) ہے، اس لئے کہ یہاں مسئلہ تقلید کا نہیں، تمام فقہاء کے اتفاق کا ہے۔ تقلید کا ذکر اس مقام پر تو موزوں ہوتا ہے جہاں کوئی مسئلہ کسی ایک مجتہد کے قول پر مبنی ہو، لیکن آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ یہ مسئلہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، یہاں تک کہ ظاہری فقہاء تک کے یہاں مسلّم اور متفق علیہ ہے، محض کسی ایک مجتہد کی ذاتی رائے نہیں ہے، لہٰذا جناب جسٹس صاحب نے تقلید کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اس پر تبصرہ کرنا ہم یہاں ضروری نہیں سمجھتے۔

آخر میں ایک اور مغالطے کا جواب دے دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جناب جسٹس ایس اے محمود صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ فقہاء کی جتنی عبارتوں میں باہمی رضامندی کے ساتھ خلع کا ذکر کیا گیا ہے، وہ خلع کی صرف ایک قسم ہے، جس میں معاملہ حاکم تک نہیں پہنچایا جاتا، لیکن خلع کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس میں حاکم ہی خلع کرتا ہے، اور حاکم ہی کے حکم سے (نہ کہ شوہر کے تلفظِ طلاق سے) علیحدگی عمل میں آتی ہے اور اس میں شوہر کی رضامندی ضروری نہیں۔
(پی ایل ڈی (سپریم کورٹ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۴۰)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی فقہاء کے نزدیک خُلع کی یہ دو قسمیں ہیں تو فقہاء نے ان دونوں قسموں کو الگ الگ کرکے کیوں بیان نہیں کیا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ خلع کی تعریف ایسی کرتے ہیں جو صرف پہلی قسم کو شامل ہو؟ پھر

اپنی کتابوں میں تمام احکام، شرائط، ارکان اور تفصیلات بھی "پہلی قسم" ہی کی بیان کرتے ہیں، اور خلع کے ابواب میں کسی ایک لفظ کے ذریعہ بھی دوسری قسم کا کوئی اشارہ تک نہیں دیتے؟ جس خلع کے لئے انہوں نے باہمی رضامندی کو ضروری قرار دیا ہے، اگر وہ خلع کی صرف ایک قسم ہے تو آخر وہ دوسری قسم کہاں ہے؟ اس کے احکام کا بیان کس جگہ کیا گیا ہے؟ پہلی قسم کے لئے تو پورا باب موجود ہے، مگر کیا دوسری قسم ایک فقرے کی وضاحت کی بھی مستحق نہیں تھی؟

اگر اس طرز استدلال کو درست مان لیا جائے تو کیا کل یہ نہیں کہا جاسکتا کہ طلاق کے جتنے احکام فقہاء نے بیان کئے ہیں، وہ صرف طلاق کی ایک قسم کے احکام ہیں جس کا اختیار مرد کو ہوتا ہے، اور طلاق کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا اختیار عورت کو دیا گیا ہے۔ اور جس جگہ فقہاء نے یہ کہا ہے کہ طلاق کا اختیار صرف مرد کو ہے، اس سے مراد صرف پہلی قسم ہے، اور دوسری قسم میں یہ اختیار عورت کو حاصل ہے۔

اگر یہ بات درست نہیں، اور کون ہے جو اسے درست کہہ سکے۔ تو پھر یہی بات خلع کے بارے میں کیونکر درست ہوسکتی ہے؟

قاضی کی تفریق بین الزوجین

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک بعض مخصوص حالات میں قاضی شرعی کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بلا مرضیٔ شوہر بھی زوجین میں تفریق کردے جو بحکمِ طلاق ہے۔ اور یہ طلاق شوہر کی اجازت کے بغیر حاکم کی طرف سے ہوتی ہے جیسے مفقود الخبر شوہر، مجنوں، نامرد وغیرہ شوہر کے معاملات تمام کتبِ فقہ میں مفصّل موجود ہیں۔ اس لئے تفریقِ قاضی کے مسئلہ کی وضاحت کردینا مناسب ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ عورت کے جو حقوق مرد پر واجب ہیں، وہ دو قسم کے ہیں، ایک وہ حقوق جو قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور جو نکاح کے قانونی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، مثلاً نان ونفقہ اور وظائفِ زوجیت وغیرہ۔ یہ وہ حقوق ہیں جنھیں بزورِ عدالت شوہر سے وصول کیا جاسکتا ہے اور اگر شوہر ان کی ادائیگی سے عاجز ہو تو اس پر قانوناً واجب ہو جاتا ہے کہ عورت کو طلاق دے، ایسی صورت میں اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے یا طلاق دینے کے قابل نہ ہو تو مجبوراً قاضی کو اس کا قائم مقام قرار دے کر تفریق کا اختیار دیا جاتا ہے۔ مجنوں، متعنت (نان ونفقہ نہ دینے والا)، عِنّین (نامرد)، مفقود الخبر، اور غائب غیر مفقود میں یہی صورت ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف نکاح کے بعض حقوق ایسے ہیں جن کی ادائیگی شوہر پر دیانۃً ضروری ہے لیکن وہ قانونی حیثیت نہیں رکھتے، اور نہ انھیں بزور عدالت وصول کیا جاسکتا ہے، مثلاً بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک اور خوش اخلاقی کا معاملہ، ظاہر ہے کہ یہ حقوق بزورِ قانون نافذ نہیں کئے جاسکتے، جب تک شوہر کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر نہ ہو دنیا کی کوئی عدالت ان کا انتظام نہیں کرسکتی، اور جب اس قسم کے حقوق کا تعلق عدالت سے نہیں ہے تو اسے یہ اختیار بھی حاصل نہیں ہے کہ حق تلفی کی صورت میں وہ نکاح فسخ کردے۔

چنانچہ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ صرف پانچ عیوب کی بناء پر قاضی کو تفریق کا اختیار ملتا ہے:

- ایک اس وقت جب کہ شوہر پاگل ہو گیا ہو،
- دوسرے جب وہ نان ونفقہ ادا نہ کرتا ہو،
- تیسرے جب وہ نامرد ہو،
- چوتھے جب وہ بالکل لاپتہ ہو گیا ہو

○ پانچویں جب غائب غیر مفقود کی صورت ہو'

ان صورتوں کے سوا قاضی کو کہیں بھی تفریق کا اختیار نہیں ہے' اور محض عورت کی طرف سے ناپسندیدگی کسی بھی فقہ میں فسخِ نکاح کی وجہ جواز نہیں بنتی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

مستقبل کی تاریخ پر خرید و فروخت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی نے ”عقود المستقبلیات فی السلع“ کے موضوع پر اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے لئے ایک تفصیلی مقالہ عربی میں تحریر فرمایا تھا۔ برادر مکرم مولانا عبداللہ میمن صاحب نے اس کا اردو ترجمہ فرمایا دیا۔ جو پیش خدمت ہے۔

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مستقبل کی تاریخ پر خرید و فروخت احکامِ شرعیہ کی روشنی میں

الحمد لله رب العٰلمین، والصلوة والسلام علیٰ رسوله الكريم، وعلیٰ اٰله واصحابه اجمعين، وعلیٰ كل من تبعهم باحسان الی یوم الدین۔

امابعد!

آجکل بازار میں تجارت کی ایک خاص قسم رائج ہے، جس کو عربی میں "المستقبلیات" (FUTURES) کہا جاتا ہے۔ جس میں کچھ مخصوص اشیاء کو مستقبل کی کسی معین تاریخ پر فروخت کردیا جاتا ہے۔ آجکل عالمی منڈیوں میں اور خاص کر مغربی ممالک میں تجارت کی جتنی صورتیں رائج ہیں، ان میں اس صورت کا رواج بہت زیادہ ہو چکا ہے اور اس تجارت کے لئے اب تو مستقبل مارکیٹیں قائم ہو چکی ہیں، جن میں صرف ایک دن کے اندر کئی ملین کی تجارت ہو جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ۱۸۴۸ء میں تجارت کی اس خاص صورت کو منظم کرنے کے

لئے شیکاگو میں ایک تجارت گاہ اور منڈی قائم کی گئی' جس کا نام (CHICAGO BOARD OF TRADE) ہے۔ البتہ جاپان والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے تجارت کی اس خاص صورت کو ۱۸۴۸ء سے بھی ایک صدی پہلے رائج کر دیا تھا۔

(دیکھئے : GERALD GOLD: MODERN COMMODITY FUTURES TRADING, SEVENTH ED. 1975 P.15)

جہاں تک اس معاملے کی حقیقت کا تعلق ہے تو "انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :

> "Commercial contracts calling for the purchase or sale of speciefide quantities of commodities at speci- fied future dates."
>
> "یعنی یہ وہ عقدِ تجارت ہے' جس کا مقصد کسی چیز کی معیّن مقدار کو مستقبل کی کسی معیّن تاریخ میں بیچنا یا خریدنا ہوتا ہے"

اس تعریف کا حاصل یہ ہے کہ اس معاملے میں جس چیز کی بیع ہوتی ہے' اس کی سپردگی اور قبضہ مستقبل کی کسی معیّن تاریخ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس تعریف پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ "غائب سودے" (FORWARD SALES) کی تعریف بھی انہیں الفاظ سے کی جاتی ہے' اس لئے کہ اس میں بھی مبیع کو مستقبل کی معیّنہ تاریخ میں مشتری کے سپرد کیا جاتا ہے؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ "المستقبلیات" (FUTURES) اور "غائب سودے" میں فرق ہے۔ وہ یہ کہ "غائب سودے" میں مستقبل کی کسی تاریخ میں مبیع کی سپردگی مقصود ہوتی ہے اور بائع اس معیّن تاریخ میں مبیع سپرد کرنا چاہتا ہے اور مشتری اس معیّن تاریخ میں اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور معیّن تاریخ

کے آنے پر واقعۃً ادائیگی اور قبضہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک "المستقبلیات" (FUTURES) کا تعلق ہے' اس میں مبیع اور سامان کو صرف اس معاملے کی بنیاد تو بنایا جاتا ہے' لیکن اکثر حالات میں عام طور پر اس عقد میں مبیع کی سپردگی اور اس پر قبضہ کرنا مقصود نہیں ہوتا' بلکہ اس بیع کا اصل مقصد یا تو نفع کی امید پر اپنا روپیہ داؤ پر لگانا ہوتا ہے یا اس کے ذریعہ کسی غائب سودے کے نفع کی ضمانت مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا "مستقبلیات" (FUTURES) میں مبیع کی ادائیگی اور اس پر قبضہ شاذونادر ہی پایا جاتا ہے جیسا کہ ہم انشاء اللہ اس کی وضاحت کردیں گے۔

"مستقبلیات" (FUTURES) اور غائب سودے (FORWARD SALES) کے درمیان جو فرق ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے' انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں "مستقبلیات" (FUTURES) کی تعریف کرنے کے بعد اس فرق کو بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ :

> *"and the term commodity is used to define the underlying asset, even thought the contract is frequently divorced from the product. It therefore differs from a simple forward purchase in the cash market, which involves actual delivery of the commodity at the agreed time in the future."*

"عقود مستقبلیات" (FUTURES) میں "السِّلَع" (COMMODITY) کی اصطلاح اور اس کا استعمال صرف اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اس معاملے میں اس کو بنیاد بنایا جاسکے (ورنہ وہ اشیاء بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتیں) بلکہ عام طور پر یہ معاملہ اشیاء (PRODUCTS) سے خالی ہوتا ہے۔ لہٰذا "عقود مستقبلیات" (FUTURES) ان "غائب

سودوں" (FORWARD SALES) سے جو آجکل بازاروں میں رائج ہیں، بالکل مختلف ہیں۔ جن میں واقعۃً مستقبل کی کسی متفق علیہ تاریخ پر سامان کی سپردگی اور قبضہ عمل میں آجاتا ہے" (دیکھئے حوالہ بالا)

جہاں تک "عقود مستقبلیات" (FUTURES) کے عملی طریقہ کار کا تعلق ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ معاملات عام طور پر صرف ان بازاروں میں ہوتے ہیں، جو اسی غرض کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ ایسے بازاروں کو "سوق تبادل السِّلَع" (COMMODITY EXCHANGE) کہا جاتا ہے، ان بازاروں کی بنیاد ممبرشپ پر ہوتی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس بازار میں جاکر فیوچر معاملہ کرنا چاہے تو اس کے لئے اس بازار کا ممبر ہونا ضروری ہے۔ اور یہ ممبرشپ یا تو ایسے شخص کے لئے جاری کی جاتی ہے جو یا تو کوئی مصنوعات بنانے والا ہو یا ان کی تجارت کرتا ہو یا ایجنٹوں کے اداروں سے تعلق رکھتا ہو۔ اور اگر کوئی شخص ممبر تو نہیں ہے، لیکن وہ اسی بازار میں کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے تو ممبر ایجنٹ کے واسطے سے کر سکتا ہے (براہ راست نہیں کر سکتا) اور جس شخص کو ممبرشپ حاصل ہے اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ "مستقبلیات" (FUTURES) کا کوئی معاملہ کرنے سے پہلے اس بازار کے منتظمین کے پاس اپنا اکاؤنٹ کھلوائے۔ جس میں معیّن مقدار کی رقم ہر وقت موجود رہے اور بازار کے قواعد و ضوابط کے مطابق وہ رقم معاملات کے تصفیہ کے لئے بطور ضمانت ادارے کے پاس رہے گی۔ اور عام طور پر یہ رقم معاہدے پر دستخط کے وقت اس چیز کی جو قیمت طے ہوتی ہے اس کے دس فیصد اور آئندہ مستقبل میں اس چیز کی جو قیمت ہونے والی ہے اس کے سات فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اس رقم کے جمع کرنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ بعد میں فریقین کے درمیان اختلاف واقع ہونے کی صورت میں اگر ایک فریق اپنے ذمّہ لازم ہونے والی رقم کی

ادائیگی سے انکار کردے تو اس صورت میں اس کے اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقم سے دوسرے فریق کے نقصانات کی تلافی کردی جائے۔

اکاؤنٹ کھولنے کے بعد مستقبل کی کسی تاریخ پر خاص معیّن مقدار کی چیز کی خرید و فروخت کی اجازت ہوتی ہے اور جس چیز کا عقد کیا جاتا ہے اس کی مقدار کو کئی تجارتی یونٹوں (TRADING UNITS) میں تقسیم کردیا جاتا ہے اور اس کی ہر یونٹ اس خاص چیز (شی معقود علیہ) کی معروف مقدار کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً گندم میں جو یونٹ معتبر اور رائج ہے وہ پانچ ہزار بوریاں ہیں' لہٰذا اب اس مقدار سے کم میں معاملہ نہیں ہوگا۔ اور معاملہ کرنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ ایک یونٹ گیہوں کا معاملہ کرے یا دو کا کرے یا اس سے زیادہ کا کرے۔ اسی طرح اس چیز کے عمدہ اور گھٹیا ہونے کے اعتبار سے بھی اس چیز کی مختلف قسموں کی درجہ بندی کردی جاتی ہے اور پھر ان قسموں کو خاص نمبروں کے ذریعہ متعارف کرایا جاتا ہے۔ مثلاً گندم درجۂ اول "گندم درجہ دوم" "گندم درجہ سوم" وغیرہ اور ہر درجے کی گندم کے اوصاف معاملہ کرنے والوں کے علم میں ہوتے ہیں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص جنوری میں اول درجے کی ایک یونٹ گندم اکتوبر کی کسی تاریخ پر بیچنا چاہتا ہے تو وہ اس بازار میں اول درجہ کی ایک یونٹ گندم اکتوبر میں سپردگی کی بنیاد پر اتنے داموں میں بیچنے کی اوفر کرے گا جس میں اس کو نفع کی توقع ہو' لہٰذا جو شخص ایک یونٹ گندم ان شرائط پر خریدنے کے لئے تیار ہوگا وہ اس کی اس پیش کش کو قبول کرے گا اور پھر دونوں (بائع اور مشتری) کو آپس میں ملاقات کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی بلکہ وہ ادارہ فریقین کی شرائط پورا کرنے کا ذمّہ دار ہوگا' لہٰذا بائع (SALER) اس ادارے کے واسطے ہی سے اپنی پیش کش بازار میں متعارف کرائے گا۔ اور مشتری (BUYER) ادارہ کے توسط سے ہی بائع کی اس پیش کش کو قبول کرے گا۔ اور سپردگی کی تاریخ آنے پر وہ ادارہ اس بات کا ذمّہ دار ہوگا کہ بائع

کی طرف سے سامان کی سپردگی کرائے اور مشتری کی طرف سے ثمن کی ادائیگی کرائے۔

اور حقیقت میں یہ معاملہ اتنی سادگی سے انجام نہیں پاتا جس طرح ہم نے اس کی تفصیل بیان کی' یہ نہیں ہوتا کہ مشتری اس سپردگی کی تاریخ کا انتظار کرے اور پھر اس تاریخ کے آنے کے بعد اس سامان (مبیع) پر قبضہ کرے۔ بلکہ یہی ایک عقد جو بائع اور مشتری کے درمیان ہوا ہے' جنوری سے اکتوبر تک روزانہ محلِّ بیع و شراء بنتا رہتا ہے اور بعض اوقات صرف اس ایک عقد پر اس کی سپردگی کی تاریخ آنے سے پہلے یومیہ دس دس بیع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً زید نے عمرو کو ایک یونٹ گندم اکتوبر میں سپردگی پر بیچ دی اب عمرو وہ گندم خالد کے ہاتھ بیچ دے گا اور پھر خالد آگے حامد کے ہاتھ فروخت کرے گا اور ہر شخص اپنا منافع رکھ کر زیادہ دام میں آگے فروخت کرتا رہے گا۔ قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے درمیان جو فرق ہو گا وہ اس خطرہ (RISK) کا منافع ہو گا جو پارٹیوں نے اس مدّت کے دوران برداشت کیا۔ لہٰذا اگر ایک شخص نے وہ گندم کم قیمت پر خرید کر زیادہ دام میں فروخت کردی تو وہ شخص دونوں قیمتوں کے درمیان کے فرق کو اپنا منافع ہونے کی بنیاد پر مطالبہ کر سکتا ہے' اور مشتری ہونے کی حیثیت سے نہ تو بائع کو ثمن ادا کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی بائع ہونے کی حیثیت سے مبیع کی سپردگی کی ضرورت ہو گی' لہٰذا مثال مذکور میں اگر عمرو نے زید سے ایک یونٹ گندم اکتوبر میں سپردگی کی بنیاد پر دس ہزار ڈالر کی خریدی اور آگے خالد کو گیارہ ہزار ر لر میں وہ گندم فروخت کردی تو اب عمرو نہ تو زید کو قیمت ادا کرے گا' اور نہ خالد کو مبیع سپرد کرے گا' البتہ ان دو عقدوں کی بنیاد پر ایک ہزار ڈالر نفع کے وصول کرلے گا۔

اب ان معاملات کو نمٹانے کے لئے وہ ادارہ بازار میں ایک کمرہ مخصوص کردیتا ہے جس کو "کلیرنگ ہاؤس" (CLEARING HOUSE) کہا جاتا ہے

اور بازار میں جتنے معاملات ہوتے ہیں وہ سب اس کلیرنگ ہاؤس میں رجسٹرڈ ہوتے ہیں اور وہ "کلیرنگ ہاؤس" اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ وہ پورے دن میں ہونے والے تمام معاملات کا شام کو تصفیہ کرے گا۔ چنانچہ مثالِ مذکورہ میں اسی روز شام کو اپنے منافع کے ایک ہزار ڈالر "کلیرنگ ہاؤس" سے وصول کر کے اس معاملہ سے الگ ہو جائے گا۔

بہر حال اس ایک عقد پر سپردگی کے مہینے کے آنے تک مسلسل معاملات ہوتے رہتے ہیں اور جب اکتوبر کا مہینہ آئے گا' اس وقت ادارہ کی طرف سے سب سے آخری مشتری کو یہ اطلاع دی جائے گی کہ اب سپردگی کی تاریخ آرہی ہے' اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا تم اس تاریخ پر اس گندم پر قبضہ کرنا چاہو گے یا اس معاملہ کو آگے فروخت کرنا چاہتے ہو؟ اب اگر وہ مشتری اس گندم پر قبضہ کرنے کا خواہش مند ہے تو اس صورت میں بائع وہ گندم معیّن گودام میں پہنچا کر اس کا تصدیق نامہ حاصل کرلے گا اور وہ تصدیق نامہ مال چھڑانے والے (یا مشتری) کے حوالے کر کے اس کی بنیاد پر اس گندم کی قیمت وصول کرلے گا۔

اور اگر آخری مشتری گندم پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس عقد کی بیع کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں یہ آخری مشتری پھر سب سے پہلے بائع کے ہاتھ دوبارہ عقدِ بیع کرے گا اور اب معاملہ کا تصفیہ قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے درمیان جو فرق ہو گا' اس فرق کی ادائیگی کی بنیاد پر ہو جائے گا۔ جیسا کہ تاریخِ سپردگی سے پہلے کے معاملات میں ہوا تھا اور اس طرح آخری معاملے تک ادائیگی اور سپردگی نہیں پائی جاتی۔

ان بازاروں کے اکثر معاملات میں یہی دوسری صورت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا شاذونادر ہی مبیع کی سپردگی کی صورت پیش آتی ہوگی' جو شاید ایک فیصد ہوگی۔

عام طور پر جو لوگ اس قسم کے معاملات میں حصّہ لیتے ہیں۔ وہ دو قسم کے

ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کی اغراض بھی مختلف ہوتی ہیں۔

بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو نفع کی امید پر اپنا روپیہ داؤ پر لگاتے ہیں۔ جن کو اصطلاح میں "مخاطر" (SPECULATOR) کہا جاتا ہے' ان لوگوں کا مقصد اس معاملے کے ذریعہ نہ بیچنا ہوتا ہے' نہ خریدنا' نہ مبیع مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی ثمن۔ بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے درمیان جو فرق ہے اس کو بطور نفع کے وصول کریں جیسا کہ ہم نے اوپر تفصیل سے ذکر کیا' چنانچہ یہ لوگ عام طور پر قیمتوں کے اتار' چڑھاؤ کے ماہرین کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے مستقبل کا معاملہ اس امید پر کرلیتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد جب دام بڑھیں گے اس وقت اس کو زیادہ قیمت پر فروخت کردیں گے۔ اور اس عقد کے نتیجہ میں ان کو مبیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی کی تکلیف میں پڑے بغیر ہی خالص نفع حاصل ہو جائے گا۔ اب بعض اوقات ان کی یہ امیدیں کامیاب ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات ناکام ہو جاتی ہیں۔

اور بعض لوگوں کا اس عقد کے ذریعے یہ مقصد ہوتا ہے کہ وہ جو عقد فی الحال کررہے ہیں' آئندہ زمانۂ مستقبل میں اس کے نفع کی حفاظت کرلی جائے۔ تاکہ آئندہ نقصان سے بچ جائیں۔ جس کو اصطلاح میں "تامین الرّبح" (HEDGING) کہا جاتا ہے۔

اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھ لینا زیادہ آسان ہوگا۔ مثلاً زید نے عام بازار سے گندم کی دس ہزار بوریاں' فی بوری پانچ ڈالر کے حساب سے خرید لیں۔ اب یہ ایک عام بیع ہو گئی۔ جس میں قبضہ بھی پایا گیا' لیکن بازار کے حالات دیکھتے ہوئے اس کا خیال یہ ہے کہ وہ تین ماہ بعد یہ گندم بیچ دے گا۔ لیکن زید کو یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تین ماہ بعد گندم کے دام گر جائیں جس کی وجہ سے اس کو نقصان ہو جائے۔ مثلاً اگر ایک بوری پر آدھا ڈالر بھی قیمت گر گئی تو اس کو پانچ ہزار ڈالر کا

نقصان ہو جائے گا۔

چنانچہ اس نقصان سے بچنے کے لئے وہ فیوچر مارکیٹ (FUTURE MARKET) جاتا ہے اور یہ گندم عام بازار کے بھاؤ پر تین ماہ بعد کی سپردگی کی بنیاد پر فروخت کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ دو عقد کرتا ہے کہ گندم خریدنے کا معاملہ عام بازار میں کرتا ہے اور پھر گندم بیچنے کا معاملہ "فیوچر مارکیٹ" میں کرتا ہے۔ اس طرح ایک معاملہ کے نفع سے دوسرے معاملے کے نقصان کی تلافی کر لیتا ہے۔ لہٰذا اب اگر تین ماہ بعد اس گندم کے دام فی بوری نصف ڈالر کم ہو جائیں تو زید کو پہلے عقد میں پانچ ہزار ڈالر کا نقصان ہو جائے گا، لیکن اسی وقت زید کو دوسرے عقد کے ذریعہ جو اس نے "فیوچر مارکیٹ" میں کیا ہے تقریباً اسی مقدار میں نفع حاصل ہو جائے گا، اس لئے کہ اس صورت میں "فیوچر مارکیٹ" میں بھی اس گندم کے دام نصف ڈالر کے قریب قریب گر جائیں گے۔ چنانچہ اب یہ ہو گا کہ زید نے تین ماہ پہلے "فیوچر مارکیٹ" میں زیادہ دام میں جو گندم بیچی تھی اب وہ اسی گندم کو کم دام پر خرید لے گا اور اس طرح قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے درمیان کا جو فرق ہے وہ بحیثیت نفع کے حاصل ہو جائے گا جو تقریباً پانچ ہزار ڈالر ہو گا۔ اس طرح عام بازار میں جو اس نے گندم کا سودا کیا تھا اور اس میں گندم کی قیمت کم ہو جانے کی وجہ سے اس کا نقصان ہوا، اس کی تلافی اس عقد کے نفع سے ہو جائے گی جو اس نے "فیوچر مارکیٹ" میں کیا، مندرجہ ذیل نقشے سے واضح نتیجہ سامنے آجائے گا :

عام بازار	فیوچر بازار
ستمبر : دس ہزار گندم کی بوریاں	دس ہزار گندم کی بوریاں
فی بوری =/۵ ڈالر میں خریدیں	فی بوری =/۵ ڈالر میں فروخت کیں
دسمبر : دس ہزار گندم کی بوریاں	دس ہزار گندم کی بوریاں

فی بوری ۴/۵۰ ڈالر میں فروخت کیں	فی بوری ۴/۵۰ میں خریدیں
نقصان فی بوری ۰۰/۵۰ ڈالر	نفع فی بوری ۰۰/۵۰ ڈالر

اور اگر دسمبر میں گندم کی قیمت فی بوری نصف ڈالر زیادہ ہو جائے تو پھر معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو جائے گا، یعنی "فیوچر مارکیٹ" میں تو اس کو نقصان ہو گا اور عام بازار میں نفع ہو جائے گا، دونوں صورتوں میں ایک عقد کے خسارے کو دوسرے عقد کے نفع کے ذریعہ پورا کیا جائے گا۔ "تامین الربح" (HEDGING) کا یہی مطلب ہے۔

بہر حال : یہ فیوچر ٹریڈنگ کا مختصر خلاصہ ہے، اور آجکل تو اس کے معاملات انتہائی پیچیدہ ہو چکے ہیں اور اب ان معاملات کا دائرہ اشیاء سے تجاوز کر کے "کرنسی" اور "اختیارات" تک پھیل چکا ہے، لیکن جو خلاصہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ اس معاملے کی حقیقت سمجھنے اور اس کے بارے میں حکمِ شرعی کے بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔

جہاں تک اس کے شرعی حکم کا تعلق ہے تو جو شخص بھی شریعت کے قواعد اور مصالح سے واقفیت رکھتا ہو اس کو اس معاملہ کی مندرجہ بالا تفصیل پر نظر کرنے کے بعد ذرہ برابر تردّد نہیں ہو گا کہ یہ معاملہ شرعاً حرام اور ناجائز ہے اور شریعت کے بہت سے احکام سے متصادم ہے۔

اوّلاً اس لئے کہ اس معاملے میں ایک ایسی چیز کی بیع ہوتی ہے جو ابھی انسان کی ملکیت میں نہیں ہے اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ "بیع مالا یملکہ الانسان" جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ :

> ایک مرتبہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
> کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر کوئی شخص میرے پاس

ایسی چیز خریدنے کے لئے آئے جو ابھی میرے پاس نہیں ہے تو کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں پہلے اس چیز کا سودا اس سے کر لوں اور پھر بازار سے خرید کر اس کو دیدوں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "ایسی چیز مت بیچو جو تمہارے پاس نہیں ہے"۔

(جامع الاصول جلد اوّل، صفحہ ۴۵۷، بحوالہ نسائی، ترمذی، ابوداؤد)

اور اس معاملہ میں جو عقدِ بیع مبیع کی سپردگی کی مدّت کے دوران ہوتے ہیں وہ بھی مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی مکمل ہو جاتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"من اشتریٰ طعامًا فلا یبعه حتیٰ یستوفیه"

(اخرجه البخاری ومسلم)

"جو شخص کوئی غلّہ خریدے وہ اس کو اس وقت تک آگے فروخت نہ کرے جب تک اس پر قبضہ نہ کر لے"۔

بعض لوگوں نے بیع سلم کی بنیاد پر اس معاملے کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے، لیکن مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر اس کو بیع سلم کی بنیاد پر جائز قرار دینا درست نہیں۔

(۱) بیع سلم میں پورا ثمن اسی وقت ادا کر دینا واجب ہے، جس کو "رأس مالِ السّلم" کہا جاتا ہے، چنانچہ علّامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ بیع سلم کے صحیح ہونے کی شرائط ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

ویقبض الثمن کاملًا وقت السّلم قبل التفرق، هذا الشرط السادس، وهو ان یقبض رأس مال السّلم فی مجلس العقد

فان تفرقا قبل ذلك بطل العقد، وبهذا قال ابو حنيفة والشافعي وقال مالك! يجوزان يتأخر قبضه يومين وثلاثة واكثر مالم يكن ذلك شرطا، لانه معاوضة لا تخرج بتأخير قبضه من ان يكون سلما فاشبه مالم تأخر إلى آخر المجلس، ولنا انه عقد معاوضة لا يجوز فيه شرط تاخير العوض المطلق • فلا يجوز التفرق فيه قبل القبض كالصرف"

(المغنی لابن قدامہ صفحہ ۳۳۴ جلد ٤)

"یعنی بیع سلم کے وقت ہی پورے ثمن پر جدا ہونے سے پہلے قبضہ کرلیا جائے۔ یہ بیع سلم کی درستگی کی چھٹی شرط ہے' وہ یہ کہ مجلسِ عقد ہی میں بیع سلم کے رأس المال" پر قبضہ کرلیا جائے' لہٰذا اگر "رأس المال" پر قبضہ کرنے سے پہلے بیع سلم کے عاقدین جدا ہو جائیں تو وہ بیع باطل ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "رأس المال" پر قبضہ کو دو' تین یا زیادہ دنوں تک مؤخر کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ یہ تاخیر عقد کے اندر مشروط نہ ہو' اس لئے کہ یہ "رأس المال" ایک معاوضہ ہے جس پر قبضہ میں تاخیر کرنا اس عقد کو "عقدِ سلم" ہونے سے خارج نہیں کرتا۔ اور یہ تاخیر بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص مجلسِ عقد کے اختتام تک قبضہ کو مؤخر کردے' اور ہمارے نزدیک (امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک) یہ ایک عقدِ معاوضہ ہے جس میں عوض مطلق کی تاخیر کی شرط جائز نہیں' لہٰذا "عقدِ سلم" میں "بیع صرف" کی طرح قبضہ سے پہلے

جدائی جائز نہیں"۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوا کہ جمہور فقہاء کے نزدیک بیع سلم کے "رأس المال" پر مجلسِ عقد میں قبضہ کرنا "بیع سلم" کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے، البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو، تین روز یا زیادہ کی تاخیر بھی جائز ہے بشرطیکہ صُلبِ عقد میں تاخیر کو بطور شرط نہ قرار دیا گیا ہو۔ لہٰذا اگر صُلبِ عقد میں "رأس المال" کی تاخیر مشروط ہو تو یہ عقد کسی کے نزدیک بھی درست نہ ہوگا۔

لیکن جہاں تک فیوچر والے معاملے کا تعلق ہے اس میں ثمن پر قبضہ کی تاخیر صلب عقد میں مشروط ہوتی ہے۔ لہٰذا ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی یہ معاملہ درست نہیں۔ البتہ اس معاملے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں ثمن کا کچھ حصّہ عقد کے وقت بھی بائع کے قبضہ میں دے دیا جاتا ہے۔ لیکن صرف اتنی بات اس معاملے کے درست ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اوّلاً تو اس لئے کہ ثمن کا کچھ حصّہ عقد کے وقت بائع کو دے دینا "بیع سلم" کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ عقد کے وقت پورا ثمن ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ فیوچر مارکیٹ کی انتظامیہ کے پاس جو رقم رکھوائی جاتی ہے وہ نہ ثمن کا حصّہ ہوتی ہے اور نہ ہی وہ بائع کو دی جاتی ہے بلکہ وہ رقم بطور ودیعت کے فریق ثالث کے پاس اس غرض سے رکھوائی جاتی ہے کہ وہ رقم مشتری کی طرف سے خریداری کے عمل کے پورے کرنے کی ضامن ہو جائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ فیوچر والے معاملے میں عقد کے وقت ثمن بائع کو نہیں دیا جاتا ہے بلکہ وہ ثمن مشتری کے ذمّہ دین ہوتا ہے۔ جس طرح مبیع بائع کے ذمّہ واجب ہوتی ہے تو اس صورت میں یہ "بیع الکالئ بالکالئ" ہو جائے گی جو حدیث شریف کی رو سے ممنوع اور ناجائز ہے جیسا کہ حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ :

"نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الکالئ بالکالئ"

(السراج المنیر للعزیزی صفحہ ۳۷۲ جلد ٤)

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع الکالی بالکالی سے منع فرمایا ہے"۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مارکیٹ کی انتظامیہ اداء ثمن کی جو گارنٹی دیتی ہے اس گارنٹی کی وجہ سے یہ سمجھا جائے گا کہ گویا ثمن بائع کو دیا جاچکا ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ "بیع سلم" کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ ثمن کی بالفعل ادائیگی مجلسِ عقد میں ہو چکی ہو۔ کسی ثالث کی طرف سے اس ثمن کی ادائیگی کی صرف تصدیق اور ضمانت کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ کسی تیسرے شخص کی گارنٹی اس ثمن کو دَین ہونے سے نہیں نکال سکتی۔ لہٰذا یہ دَین کی بیع دَین سے ہو جائے گی جو ناجائز ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ بیع سلم کے صحیح ہونے کی جن شرائط پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ بیع کے وقت "مسلم فیہ" کی تمام صفات مکمل طور پر بیان کر دی جائیں۔ لہٰذا اگر "مسلم فیہ" کے اوصاف ایسے مجہول ہوں اور متردّد ہوں جو آپس میں نزاع کا باعث بن سکتے ہوں تو اس صورت میں کسی کے نزدیک بھی وہ بیع درست نہ ہوگی۔

فیوچر معاملات میں اگرچہ مبیع کے "درجات" بیان کر کے اس کے تمام اوصاف مکمل طور پر واضح کرنا ضروری ہوتے ہیں لیکن عملاً ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات بائع ایک ہی عقد میں مبیع کے ایک سے زیادہ "درجات" بیان کرتا ہے اور پھر بائع کو یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ ان "درجات" میں سے جس درجہ کی مبیع چاہے وہ مشتری کے سپرد کرے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں ہے :

"FUTURES Market, on the other hand, generally permits trading in a number of grades of the commodity to protect hedger sellers from being "cornered" by speculators buyers who might otherwise insist on delivery of a particul'ar grade whose stocks are small. Since a number of alternative grades can be tendered, the futures market is not suitable fof the acquisition of the physical commodity. For this reason physical delivery of the commodities in fulfillment of the futures contract generally dose not take place, and the contract is usually settled between buyers and sellers by paying the difference between the buying and selling price."

"دوسری طرف مستقبلیات کا بازار اس بات کی گنجائش رکھتا ہے کہ کسی مخصوص جنس کے مختلف گریڈس کی تجارت کی جائے۔ اور اس طرح جو تاجر متوقع نقصان سے بچنا چاہتے ہیں' ان کو اس خطرہ سے تحفّظ فراہم ہو جاتا ہے کہ سٹہ باز خریداران سے کسی ایسے مخصوص گریڈ کی ادائیگی پر اصرار کریں جس کے ذخائر تھوڑی تعداد میں ہوں' چونکہ مستقبلیات کے بازار میں بہت سے متبادل گریڈس کی پیش کش ممکن ہوتی ہے' اس لئے مستقبلیات کا بازار کسی جنس کو حقیقی طور پر حاصل کرنے کے لئے موزوں نہیں' اس وجہ سے مستقبلیات کے معاہدات کو پورا کرنے کے لئے عموماً اجناس کی حقیقی ادائیگی نہیں کی جاتی' اور خریداروں اور بیچنے والوں کے درمیان معاہدے کا تصفیہ عموماً اس طرح ہوتا ہے کہ وہ آپس میں قیمتِ خرید اور قیمتِ

فروخت کے فرق کا لین دین کر لیتے ہیں"۔

انسائیکلو پیڈیا کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عقد میں بائع کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ عقد کے وقت اس مبیع کے جو مختلف اوصاف علی سبیل البدلیت بیان کئے تھے ان میں سے کسی ایک وصف کی مبیع مشتری کے سپرد کردے' مشتری وصف کی اس جہالت سے اس وقت تک دوچار رہتا ہے جب تک وہ مبیع پر قبضہ نہ کرلے۔ مبیع میں اس جیسی جہالت ہر عقدِ بیع کو باطل کر دیتی ہے۔ تو بیعِ سلم یقیناً ایسی جہالت کی وجہ سے باطل ہو جائے گی۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ "عقود مستقبلیات" میں یہ بات طے شدہ ہے کہ عام طور پر مشتری کا سامان پر قبضہ نہیں پایا جاتا' بلکہ آخری مشتری کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو بائع سے سامان اس کے سپرد کردینے کا مطالبہ کرے' یا چاہے تو دوبارہ وہ سامان اسی بائع کو فروخت کردے۔ اس دوسری صورت میں تصفیہ اس طرح ہوتا ہے کہ خریدنے اور بیچنے کے داموں میں جو فرق ہوتا ہے صرف اس فرق کو وصول کرکے ڈیفرنس برابر کرلیا جاتا ہے۔ یہ تفصیل ابتداء ہی سے عقد کے اندر مشروط ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شرط عقدِ سلم کو فاسد کر دیتی ہے اور اگر عقدِ سلم میں یہ بات مشروط نہ بھی ہو تب بھی بیعِ سلم میں یہ مسئلہ ہے کہ "مسلم فیہ" کو بائع کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں۔ المغنی لابن قدامہ میں ہے :

"وبیع المسلم فیہ عن بائعہ او من غیرہ قبل قبضہ فاسد"

(المغنی لابن قدامۃ، صفحہ ۳۴۱ جلد ٤)

"مسلم فیہ کو قبضے سے پہلے بائع کے ہاتھ فروخت کرنا' یا کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا فاسد ہے۔ یعنی بیع سلم کو فاسد کر دیتا ہے"۔

(۵) اگر ہم یہ فرض کریں کہ بائع اوّل اور مشتری اوّل کے درمیان جو سب سے پہلے عقد ہوا تھا وہ اپنی تمام شرائط کے ساتھ عقدِ سلم تھا تو اس صورت میں "رَب السّلم" یعنی مشتری اوّل کے لئے جائز نہیں تھا کہ وہ "مسلم فیہ" پر قبضہ کرنے سے پہلے آگے فروخت کردے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

"واما بیع المسلم فیه قبل قبضه ، فلا نعلم فی تحریمه خلافاً، وقد نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن بیع الطعام قبل قبضه وعن ربح مالم یضمن، ولا نه مبیع لم ید خل فی ضمانه، فلم یجز بیعه کالطعام قبل قبضه"

(المغنی لابن قدامة جلد ٤ صفحه ٣٤١)

"مسلم فیہ کو قبضہ کرنے سے پہلے آگے فروخت کرنے کی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام پر قبضہ کرنے سے پہلے آگے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے' اور جو چیز انسان کے ضمان میں نہ ہو اس کا نفع لینے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہاں "مسلم فیہ" قبضہ سے پہلے اس کے ضمان میں نہیں آئی اس لئے طعام کی طرح اس کی بیع بھی قبضہ سے پہلے جائز نہیں"۔

پیچھے "عقود مستقبلیات" کے طریق کار کے بارے میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس میں مبیع کی سپردگی اور حوالگی سے پہلے ایک ہی عقد کے اندر بے شمار سودے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا "عقود مستقبلیات" کے جواز کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا پانچ وجوہات کی بناء پر اس عقد کو "عقدِ سلم" کہکر جائز نہیں کہا جا سکتا۔

جب اس کو عقدِ سلم کہنا ممکن نہیں تو پھر یہ ایک ایسا عقد ہے جو مستقبل کی کسی تاریخ پر منعقد ہوتا ہے۔ اور تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ عقدِ بیع نہ تو تعلیق کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف اضافت کو قبول کرتا ہے' لہٰذا "عقود مستقبلیات" میں بیع اوّل جو بائع اول اور مشتری اول کے درمیان ہوئی تھی وہ درست نہیں ہوئی۔ تو پھر اس بیع کی بنیاد پر ہونے والی دوسری بیوع کیسے درست ہونگی؟

فقہی اعتبار سے اس عقد کی ایک اور شکل ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اس عقد کو "بیع" نہ کہا جائے بلکہ اس کو "وعدۂ بیع" کہا جائے کہ بائع اس بات کا وعدہ کر رہا ہے کہ وہ فلاں مخصوص سامان کو فلاں تاریخ میں اتنی قیمت پر فروخت کر دے گا اور موعودلہ یعنی مشتری کو یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ وعدے کے مطابق معیّن تاریخ پر اس سامان کو معیّن قیمت پر خرید لے' اب یہ مشتری اپنا یہ حق کسی تیسرے آدمی کو فروخت کر دے اور تیسرا آدمی چوتھے کو فروخت کر دے۔ یہاں تک کہ سپردگی کی معیّن تاریخ آجائے۔

لیکن میرے خیال میں اس عقد کی یہ شکل شرعاً اس عقد کے لئے وجہ جواز بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔

○ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس عقد کی صورتِ واقعہ اس شکل کے موافق نہیں ہے۔ اس لئے کہ عاقدین فیوچر مارکیٹ میں صرف وعدہ بیع کے لئے نہیں جاتے بلکہ ان عاقدین کا مقصد عقدِ بیع کو یقینی طور پر طے کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس عقد کو وعدۂ بیع کہنا درست نہیں۔

○ دوسری وجہ یہ ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک "وعدہ" محض قضاءً لازم نہیں ہوتا۔ اور جن فقہاء نے وعدہ محض قضاءً لازم کیا ہے انہوں نے کسی شدید ضرورت کے تحت لازم کہا ہے۔ اور یہاں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

○ تیسرے یہ کہ "موعودلہ" یعنی مشتری کو مستقبل کی تاریخ میں خریدنے کا جو حق حاصل ہے وہ ایسا حق نہیں ہے جس کو آگے فروخت کرنا یا اس کا عوض لینا جائز ہو۔ اس لئے کہ یہ ایسا حق نہیں ہے جو قضاءً واجب ہو بلکہ یہ "حقِ مجرّد" ہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک "حقِ مجرّد" کی بیع چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ اور وہ شرائط اس عقد میں موجود نہیں۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اگر "عقد مستقبلیات" شرعاً جائز نہیں ہے تو پھر اس کے متبادل کوئی صورت بتائیں جو احکامِ شرعیہ کے مطابق ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی معاملے کی متبادل صورت تو اس وقت تلاش کی جاتی ہے جب اس معاملے کا مطلوبہ مقصد درست ہو۔ پھر اس مطلوبہ مقصد کے حصول کے لئے شرعی متبادل صورت کو تلاش کیا جاتا ہے۔

جہاں تک "عقود مستقبلیات" کا تعلق ہے تو اس عقد کا کوئی جائز مقصد نہیں ہے جس کو پورا کرنے کے لئے شرعی طریقہ تلاش کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیوچر مارکیٹ میں جو معاملات ہوتے ہیں ان سے تجارت مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ نفع کی امید پر اپنا روپیہ داؤ پر لگانا مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد اس عقد کو بیع کے بجائے قِمار (جُوا) سے زیادہ مشابہ کر دیتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ فیوچر مارکیٹ میں معاملہ کرنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں :

ایک قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کو "مخاطر" (SPECULATOR) (نفع حاصل کرنے کی امید میں رقم کو داؤ پر لگانے والا) کہا جاتا ہے۔ جن کا مقصد نہ تو بیع و شراء ہوتا ہے اور نہ ہی سپردگی اور قبضہ مقصود ہوتا ہے' بلکہ صرف قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے درمیان جو فرق ہے اس کو بطور نفع کے حاصل کر لینا ان کا مقصود

ہوتا ہے۔ (دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ آپس کے ڈیفرنس کو برابر کرلینا ان کا مقصود ہوتا ہے)۔ اب ظاہر ہے کہ یہ غرض اور مقصد ہی غیر شرعی اور ناجائز ہے۔ اس لئے کہ یہ تو تجارت کئے بغیر اور مبیع کو اپنے ضمان میں لئے بغیر نفع کمانا ہو جائے گا۔ جو نصِ صریح کی رو سے حرام ہے۔

فیوچر مارکیٹ میں دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا مقصد "اپنے نفع کی ضمانت اور حفاظت" ہوتی ہے۔ جس کو عربی میں "تامین الربح" (HEDGING) کہا جاتا ہے یعنی یہ لوگ عام بازار میں ایک چیز خریدتے ہیں لیکن بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کے نتیجے میں جو خسارہ محتمل ہوتا ہے اس سے بچنے کے لئے وہ لوگ فیوچر مارکیٹ میں جاکر اسی چیز کا سودا کرلیتے ہیں' جیسا کہ ہم نے اوپر تفصیل سے ذکر کیا۔ لیکن اس قسم کی ضمانت اور حفاظت کی ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو لمبی مدّت کے لئے اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی چیز کو خریدنے کے چند روز بعد ہی اس کو بیچنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں نفع کی ضمانت اور حفاظت (تامین الربح) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب یہ لوگ کسی چیز کو خریدنے کے بعد زیادہ نفع حاصل کرنے کی خاطر طویل مدّت کے لئے ذخیرہ کرلیتے ہیں' اس وقت ان کو فیوچر مارکیٹ میں جانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے کہ ان لوگوں کو اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس چیز کو خرید کر ہم نے ذخیرہ کیا ہوا ہے کچھ عرصے کے بعد اس کی قیمت کم ہو جائے اور ہمیں بجائے نفع کے نقصان اٹھانا پڑے' چنانچہ یہ اُس خسارے اور نقصان سے بچنے کے لئے فیوچر مارکیٹ میں اس کا سودا کر لیتے ہیں۔ جیرالڈ گولڈ لکھتا ہے کہ :

> "اگر ایک تاجر نے کسی کسان سے دس ہزار بوریاں گندم کی خریدیں پھر فوراً کسی معیّن دام پر اس کو فروخت کرنا چاہے' مثلاً ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کو نکالنا چاہے تو ایسے تاجر کو اس

بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ فیوچر مارکیٹ میں جا کر نفع کی ضمانت (تامین الربح) کا انتظام کرے' اس لئے کہ اس گندم کی قیمت کم ہو جانے کا جو خطرہ تھا وہ خطرہ اس کی بیع کے فوراً بعد مشتری کی طرف منتقل ہو گیا"۔

لیکن بعض اوقات تاجر اس گندم کو خرید کر فوراً آگے فروخت نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ اس کو ایک معتدبہ مدّت کے لئے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے' لیکن اس کو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فروخت کرتے وقت اس کے دام کم ہو جائیں اور اس کی وجہ سے اسے نقصان ہو چنانچہ اس خطرہ سے بچنے کے لئے وہ تاجر فیوچر مارکیٹ میں داخل ہوتا ہے تاکہ اس نے جس منافع کو حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ محفوظ رہے"۔

اس عبارت سے ظاہر ہوا کہ "فیوچر مارکیٹ" میں داخل ہو کر عقد کرنے کی ضرورت ان تاجروں کو پیش آتی ہے جو مصنوعات اور اشیاء کو ایک معتدبہ مدّت کے لئے اپنے پاس روک کر رکھنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ عام طور پر ذخیرہ اندوزی کی نیت سے اشیاء کو روکتے ہیں جو کہ شریعت کے خلاف ہے' لہٰذا جب فیوچر مارکیٹ میں داخل ہونے کا مقصد ہی غیر شرعی ہے تو پھر ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہئے کہ "فیوچر مارکیٹ" کا شرعی متبادل طریقہ کیا ہو گا؟۔ ہاں! البتہ اگر کوئی واقعی طور پر یہ چاہتا ہے کہ میں ایسی بیع کروں جس کے اندر مجھے مبیع فوراً حوالے کرنے کی ضرورت نہ پڑے تو اس کے لئے شرعی طریقہ "بیع سلم" کا موجود ہے' کتب فقہ میں اس کی جو شرائط ہیں اس کے مطابق وہ "بیع سلم" کر لے۔ اس طرح اس کو فیوچر مارکیٹ میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله

ہاؤس فنانسنگ کے جائز طریقے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

''الطرق المشروعة للتمويل العقاری'' کے موضوع پر حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ''اسلامی فقہ اکیڈمی کے لئے عربی میں ایک تفصیلی مقالہ تحریر فرمایا تھا۔ جو ''بحوث فی قضایا فقهیة معاصره'' میں شائع ہو چکا ہے برادر مکرم مولانا عبداللہ میمن صاحب نے اس کا ترجمہ فرمادیا۔ جو پیش خدمت ہے۔

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہاؤس فائنانسنگ کے جائز طریقے

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد النبی الامین وعلی الہ واصحابہ الطاہرین و علی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین اما بعد

"مکان انسان کی بنیادی ضرورت میں داخل ہے اس کے بغیر انسان کے لئے زندگی گزارنا مشکل بلکہ ناممکن ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والله جعل لكم من بيوتكم سكنا

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے گھر رہنے کی جگہ بنائی۔ (سورۃ النحل : ۸۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ثلاث من السعادة: المراة الصالحة، والمسكن الواسع، والمركب الهنيئی"

تین چیزیں انسان کی نیک بختی کی علامت ہیں۔ نیک بیوی، کشادہ مکان، خوشگوار سواری،"

(کشف الاستار عن زوائد البزار للہیثمی ج ۲ ص ۱۵۶ نمبر ۱۴۱۲)

آج کے دور میں ایک مناسب اور کشادہ مکان کے حصول کے لئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور خاص طور پر گنجان آبادی والے شہروں میں اور

زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ آج کی زندگی بہت پیچیدہ ہو چکی ہے، آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور مہنگائی روز بروز بڑھ رہی ہے اور جو لوگ اپنے نئے مکان خریدنے یا بنوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی سی ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے موجودہ دور میں بہت سے بڑے بڑے شہروں میں "ہاؤس فنانسنگ" کے ادارے قائم ہو چکے ہیں جو لوگوں کے لئے مکان خریدنے یا بنوانے کی خدمات انجام دیتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر ادارے سودی نظام ہی کے تحت کام کرتے ہیں چنانچہ یہ ادارے ان مقاصد کے لئے اپنے گاہکوں کو قرضے فراہم کرتے ہیں اور پھر ان قرضوں پر ایک متعین شرح سے سود حاصل کرتے ہیں جس شرح پر فریقین معاہدہ کرتے وقت اتفاق کر لیتے ہیں۔

چونکہ یہ معاملہ سود کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور سود کا معاملہ شریعت اسلامیہ میں ان بڑے محرمات میں داخل ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم میں منع فرمایا ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کوئی ایسا معاملہ کرے جو سودی لین دین پر مشتمل ہو اس لئے علماء پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کی سہولت کے لئے ہاؤس فنانسنگ کا کوئی ایسا طریقہ تجویز کریں جو شریعت مطہرہ کے مطابق ہو اور وہ طریقہ سودی نظام پر مشتمل طریقے کا متبادل بھی بن سکے۔

اس مقصد کے لئے ہم اس مقالے میں ہاؤس فنانسنگ کے چند شرعی طریقے بیان کریں گے اور اس میں اس کے جواز کے دلائل اور اس پر عمل کرنے کی صورت میں پیدا ہونے کے نتائج بھی پیش کریں گے واللہ سبحانہ ھوالموفق للصواب۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہے کہ وہ عوام سے کسی نفع کا مطالبہ کئے بغیر ان کی بنیادی ضروریات پوری کرے اور وہ ضروریات ان کو فراہم کرے چونکہ مکان بھی ہر انسان کی بنیادی ضرورتوں میں

داخل ہے اس لئے ہر انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مالی وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے اس بنیادی ضرورت کو حاصل کرے اور جس شخص کے مالی وسائل تنگ ہیں جس کی وجہ سے نہ تو وہ مکان خرید سکتا ہے اور نہ وہ اپنی جیب سے مکان تعمیر کر سکتا ہے تو اس صورت میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل تین طریقوں سے میں سے کسی ایک طریقے سے اس کی یہ ضرورت پوری کرے نمبر ایک اگر وہ شخص مستحق زکوۃ ہے تو پھر زکوۃ فنڈ سے اس کرتے مدد کتے ہوئے اس کی ضرورت پوری کرے دوسرے یہ کہ صرف واقعی اخراجات کی بنیاد پر اس کو مکان فراہم کرے اور اس پر کسی نفع کا مطالبہ نہ کرے تیسرے یہ کہ حکومت اس شخص کو قرض حسنہ فراہم کرے جس پر اس سے کسی نفع یا سود کا مطالبہ نہ کرے۔

ہاؤس فنانسنگ میں یہی تین طریقے اصل الاصول ہیں جو اسلامی روح اور اس اسلامی معاشرے کے مزاج کے بالکل موافق ہیں جو معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور اچھے اور نیک کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی بنیاد پر قائم ہے اور جس میں دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور دوسروں کی راحت کو اپنی راحت تصور کیا جاتا ہے اور جس معاشرے میں کمزور کے ساتھ تعاون اور اسکی مدد کی جاتی ہے تاکہ وہ بھی ایک متوسط درجے کی خوشحال زندگی گزار سکے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا تین طریقوں یا کسی ایک طریقے پر عمل صرف اس حکومت کے لئے ممکن ہے جس کے پاس ذرائع آمدنی اور وسائل بہت بڑی تعداد میں موجود ہوں اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک صورت بہت بھاری رقم چاہتی ہے اور خاص طور پر ہمارے اس دور میں جس میں آبادی بہت زیادہ ہو چکی ہے اور مہنگائی بھی بہت ہو چکی ہے لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ حکومت اپنے غیر پیداواری اسکیموں اور منصوبوں میں کمی واقع کر کے اس کے لئے بچت کر سکتی ہے اور پھر اس بچت کو ہاؤس فنانسنگ میں استعمال کر سکتی ہے اسی طرح ان بھاری

اخراجات میں کمی کر کے بھی ان وسائل کو بڑھایا جا سکتا ہے جن کا مقصد صرف دکھاوا اور خوش عیشی کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن ان اخراجات میں کمی کرنے کے باوجود بھی آج مسلم ممالک کی بڑی تعداد اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ تمام لوگوں کے لئے اس طریقے سے رہائش فراہم کرے۔

لہٰذا ان حالات میں ایسے طریقے اختیار کرنا ضروری ہے جس میں حکومت کو رہائش فراہم کرنے پر نہ تو تبرع محض اختیار کرنا پڑے اور نہ بھاری اخراجات برداشت کرنے پڑیں اور وہ طریقے سود اور دوسرے ممنوعات شرعیہ سے بھی پاک ہوں وہ طریقے مندرجہ ذیل ہیں :

بیع موجل

پہلا طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ کار (کمپنی) مکان خرید کر اس کی مالک بن جائے پھر گاہک کو نفع کے ساتھ ادھار فروخت کر دے اور پھر کمپنی گاہک سے عقد میں طے شدہ قسطوں کے مطابق قیمت وصول کرے اور اس میں نفع کا تناسب بیان کئے بغیر بھی ادھار فروختگی کا معاملہ کیا جا سکتا ہے اس صورت میں نفع کے تناسب کی طعیین کا اختیار سرمایہ کار (کمپنی) کو ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس ادھار بیع کا معاملہ مرابحہ کے طریقے پر کیا جائے اور عقد کے اندر اس کی صراحت کر دی جائے کہ کمپنی اس مکان پر آنے والے واقعی اخراجات سے اس قدر زائد نفع گاہک سے وصول کرے گی۔

پھر مندرجہ بالا طریقے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں اولاً یہ کہ اگر عقد کے وقت وہ مکان تیار موجود ہے پھر تو مندرجہ بالا طریقے پر کمپنی وہ مکان خود خرید کر گاہک کو ادھار فروخت کر دے دوسرے یہ کہ عقد کے وقت وہ مکان تیار موجود نہیں ہے بلکہ کمپنی مکان تیار کرنا چاہتی ہے تو اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی اسی گاہک کو مکان بنانے کے لئے اپنا وکیل مقرر کر دے اس صورت میں تعمیر کمپنی

ہی کی ملکیت میں ہوگی اور گاہک صرف کمپنی کے وکیل کے طور پر اس تعمیر کی نگرانی کرے گا اور تعمیر مکمل ہونے کے بعد کمپنی وہ مکان گاہک کو ادھار فروخت کر دے گی۔

یہ تو وہ صورت ہے جس میں گاہک کمپنی کے ساتھ مکان خریدنے یا تعمیر کرنے میں کسی بھی قسم کے مالی اشتراک کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

البتہ اگر گاہک میں مکان کی خریداری یا تعمیری اخراجات میں نقد رقم لگا کر اشتراک کی صلاحیت تو موجود ہے لیکن اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ اس رقم کے ذریعہ مکان خریدنے یا تعمیر کرنے پر آنے والے تمام اخراجات پورے کر سکے اس لئے گاہک یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی رقم لگانے کے بعد جتنی رقم کی مزید ضرورت ہو صرف اتنی رقم وہ کمپنی سے طلب کرے جیسا کہ آج کل اکثر ہاؤس فنانسنگ کمپنیوں میں یہی طریقہ رائج ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ کمپنی اور گاہک دونوں مل کر مشترک طور پر مکان خریدیں مثلاً اس مکان کی نصف قیمت گاہک ادا کرے اور نصف قیمت کمپنی ادا کرے اور اب یہ مکان دونوں کے درمیان نصف نصف کے اعتبار سے مشترک ہو جائے گا اور پھر کمپنی اپنا نصف حصہ قیمت خرید سے کچھ زیادہ قیمت پر گاہک کو ادھار فروخت کر دے اور قسطوں میں اس سے قیمت وصول کرے۔

اور اگر گاہک پہلے خالی زمین خرید کر پھر اس میں تعمیر کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس کچھ رقم موجود ہے تو اس صورت میں زمین کی خریداری کی حد تک تو وہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جو ہم نے اوپر مکان خریدنے کے سلسلے میں بیان کیا وہ یہ کہ گاہک اور کمپنی دونوں مشترک طور پر زمین خرید لیں اور پھر کمپنی اپنا حصہ گاہک کو زیادہ قیمت پر ادھار فرو[illegible] کر دے۔

اور اگر زمین پہلے سے گاہک کی ملکیت میں موجود ہے یا مندرجہ بالا طریقہ پر زمین اس کی ملکیت میں آچکی ہے اور اب گاہک اس زمین پر ہاؤس فنانسنگ کے

واسطے سے مکان تعمیر کرنا چاہتا ہے (اور گاہک کے پاس کچھ رقم موجود ہے) تو اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ کمپنی اور گاہک دونوں مشترک طور پر اس کی تعمیر کریں مثلاً تعمیر پر آنے والے نصف اخراجات گاہک برداشت کرے اور نصف اخراجات کمپنی برداشت کرے اس صورت میں وہ تعمیر گاہک اور کمپنی کے درمیان مشترک ہو جائے گی لہٰذا جب تعمیر مکمل ہو جائے تو اس کے بعد کمپنی اپنا حصہ گاہک کو اپنا نفع لگا کر ادھار فروخت کر دے اور شرعاً مشترک چیز کے ایک شریک کے لئے اپنا حصہ دوسرے شریک کو فروخت کرنا جائز ہے البتہ کسی اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنے کے بارے اختلاف ہے علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ دارلمحتار میں فرماتے ہیں۔

"ولو باع احد الشریکین ى البناء حصته لاجنبى لا یجوز ولشریکه جاز"

"کسی عمارت میں دو شریکوں میں سے کسی ایک شریک کے لئے اپنا حصہ اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں البتہ اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے"

اور مندرجہ بالا صورت میں قیمت کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر کمپنی کیلئے جائز ہے کہ وہ گاہک سے رھن کا مطالبہ کرے، اور کمپنی کیلئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ مکان کے کاغذات اپنے پاس بطور رھن کے رکھ لے۔

مندرجہ بالا طریقہ شرعاً بالکل بے غبار ہے البتہ کمپنی اس قسم کے معاملات اس وقت تک نہیں کرتی جب تک کمپنی کو اس بات پر مکمل اعتماد نہ ہو جائے کہ جو مکان کمپنی خرید رہی ہے یا کمپنی جس مکان کی تعمیر کر رہی ہے گاہک اس مکان کو ضرور خریدے گا اس لئے کہ اگر کمپنی نے اپنی کثیر رقم خرچ کر کے اس مکان کو خرید لیا اور بعد میں گاہک نے اس کو خریدنے سے انکار کر دیا تو اس صورت میں صرف یہ نہیں کہ کمپنی کا نقصان ہو جائے گا بلکہ پورا نظام ہی سرے سے ناکام ہو جائے گا

اور چونکہ مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف نسبت کرکے فروختگی کا معاملہ (FUTURE SALE) کرنا جائز نہیں اس لئے مندرجہ بالا طریقے کو کامیاب بنانے کی یہی صورت ہے کہ گاہک اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ وہ اس مکان یا زمین کی خریداری یا تعمیر کے بعد کمپنی کے حصے کو ضرور خرید لے گا۔

گاہک کی طرف سے کمپنی کے حصے کو خریدنے کی یقین دہانی ایک وعدہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اکثر فقہاء کے نزدیک "وعدہ" قضاء لازم نہیں ہوتا لیکن فقہاء کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو "وعدہ" کو دیانۃ اور قضاء دونوں طریقے سے لازم سمجھتی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے چنانچہ وہ وعدہ کو لازم قرار دیتے ہیں خاص طور پر اس وقت جب اس وعدہ کی وجہ سے موعودلہ (جس سے وعدہ کیا گیا ہے) کسی مشقت میں پڑ جائے چنانچہ شیخ محمد علیش مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

فالوفاء بالعدة مطلوب بلاخلاف، اختلف فی وجوب القضاء بها علی اربعة اقوال حكاها ابن رشد فی كتاب جامع البيوع، وفی كتاب العارية، وفی كتاب العدة، ونقلها عنه غير واحد فقيل: يقضى بها مطلقا وقيل: لا يقضى بها مطلقا: وقيل: يقضى بها ان كانت علی سبب، وان لم يدخل الموعودله بسبب العدة فی شيی كقولك اريد ان اتزوج ...... فاسلفنی كذا ...... والرابع: يقضى بها ان كانت

علی سبب، ودخل للموعود له بسبب العدة في شيئ، وهذا هو المشهور من الاقوال"

(فتح العلی المالک، للشیخ محمد علیش، مسائل الالتزام، ج ۱ص ۲۵۲)

وعدہ پورا کرنا بلا اختلاف مطلوب ہے البتہ قضاء وعدہ پورا کرنے کے واجب ہونے میں اختلاف ہے اور اس کے بارے میں چار اقوال ہیں علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب جامع البیوع اور کتاب العاریہ اور کتاب العدۃ میں ان اقوال کو ذکر فرمایا ہے اور بہت سے فقہاء نے ان سے نقل کیا ہے پہلا قول ہے کہ اس وعدہ کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس وعدہ کے مطابق بالکل فیصلہ نہیں کیا جائے گا تیسرا قول یہ ہے کہ اگر اس وعدہ کا کوئی سبب موجود ہو تو قضاء وہ وعدہ لازم ہو جائے گا اگرچہ موعود لہ اس وعدہ کی وجہ سے کسی عمل میں داخل نہ ہو (کوئی کام نہ کیا ہو) مثلاً آپ کسی شخص سے کہیں کہ میرا شادی کرنے کا ارادہ ہے، یا فلاں چیز خریدنے کا ارادہ ہے تم مجھے اتنی رقم قرض دے دو، ...... (اس نے کہا کہ ٹھیک ہے اس کے بعد کسی وجہ سے اس نے شادی کا ارادہ ختم کر دیا یا اس چیز کی خریداری کا ارادہ ختم ہو گیا تب بھی ادھار دینے کے وعدہ کو پورا کرنا لازم ہو گا) چوتھا قول یہ ہے کہ اگر اس وعدہ کا کوئی سبب موجود ہو اور موعود لہ اس وعدہ کی وجہ سے کوئی کام کر بیٹھے تو قضاء اس وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہے تمام اقوال میں سے یہ آخری قول زیادہ مشہور ہے۔

امام قرافی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال سحنون : الذی یلزم من الوعد، هدم دارک وانا اسلفک ماتبنی به اوا خرج الی الحج وانا اسلفک او اشتر سلعة او تزوج امراة وانا اسلفک لانک ادخلته بوعدک ی ذلک اما مجرد الوعده فلا یلزم الوفاء به بل الوفاء به من مکارم الا خلاق"

(الفروق للقرافی، الفرق الرابع عشر بعد المائتین، ج ۴ ص ۲۵)

امام سحنون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو وعدہ لازم ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کیا کہ تم اپنا مکان گرا دو، میں مکان بنانے کے لئے تمہیں قرض فراہم کروں گا، یا یہ کہا کہ تم حج کے لئے چلے جاؤ، میں قرض دوں گا، یا آپ نے کہا کہ تم فلاں چیز خرید لو، یا کسی عورت سے شادی کرلو، میں قرض فراہم کروں گا، ان تمام صورتوں میں وعدہ پورا کرنا لازم ہے اسلئے کہ تم نے اس سے وعدہ کرکے اس کو اس کام میں داخل کیا ورنہ جہاں تک مجرد وعدہ کا تعلق ہے تو اس کو پورا کرنا لازم نہیں ہے البتہ ایسے وعدے کو بھی پورا کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے۔

علامہ ابن الشاط رحمۃ اللہ علیہ "الفروق" کے حاشئے میں تحریر فرماتے ہیں:

الصحیح عندی القول بلزوم الوفاء بالوعد مطلقا، فیتعین تاویل ماینا قض ذلک" الخ (حاشیۃ الفروق لابن الشاط، ج ۴ ص ۲۴، ۲۵)

میرے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ مطلقا ہر وعدے کو پورا کرنا لازم ہے لہٰذا اس اصول کے خلاف جو بات ہوگی اس کی تاویل کی جائے گی۔

اسی طرح متاخرین حنفیہ نے بھی چند مسائل میں "وعدہ" کو قضاء لازم قرار دیا ہے جیسا کہ "بیع بالوفاء" کے مسئلے میں۔ چنانچہ قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ "بیع بالوفاء" کے مسئلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"وان ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع، ویلزمه الوفاء بالوعد، لان المواعدة قد تکون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس"

(الفتاوی الخانیة، فصل فی الشروط المفسدة فی البیع ج ۲ ص ۱۳۸)

اگر بیع بغیر شرط کے کی جائے اور اس کے بعد "شرط" کو بطور "وعدہ" کے بیان کر دیا جائے تو بیع جائز ہو جائے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا اس لئے کہ باہمی وعدہ کبھی لازم بھی ہوتا ہے لہٰذا اس وعدہ کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم قرار دیا جائے گا۔"

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وفی جامع الفصولین ایضاء:
لوذکرا البیع بلاشرط، ثم ذکرا الشرط علی وجه العدة جاز البیع، ولزم ألوفاء، بالوعد، اذالمواعید قد تکون لازمة، فیجعل لازما لحاجة الناس" (ردالمحتار، باب البیع الفاسد، مطلب فی الشروط الفاسد اذا ذکر بعد العقد، ص ۱۳۵ ج ۴)

"جامع الفصولین" میں بھی یہ عبارت موجود ہے کہ اگر
بائع اور مشتری بلا کسی شرط کے بیع کریں اور پھر شرط کو بطور
وعدہ کے ذکر کریں تو بیع جائز ہوگی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم
ہوگا اس لئے کہ آپس کے باہمی وعدے بعض اوقات لازم ہو
جاتے ہیں لہٰذا یہاں بھی لوگوں کی ضرورت کی بنا، پر لازم قرار
دیا جائے گا"

بہرحال مندرجہ بالا عبارات فقہیہ کی بنیاد پر اس قسم کے وعدوں کو قضاء لازم قرار دینا جائز ہے ـــــ لہٰذا زیر بحث مسئلے میں جس اگریمنٹ پر دونوں فریق کے دستخط ہیں اس اگریمنٹ کے مطابق گاہک نے جو یہ "وعدہ" کیا ہے کہ زمین یا عمارت میں کمپنی کا جتنا حصہ ہے وہ اس حصے کو خرید لے گا یہ "وعدہ" قضاء اور دیانۃً پورا کرنا لازم ہوگا۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ کمپنی کے حصے کی بیع اس وقت ہو جب وہ کمپنی اپنے حصے کی مالک بن جائے اس لئے کہ "بیع" کو زمانہ مستقبل کی طرف منسوب کرنا (FUTURE SALE) جائز نہیں، لہٰذا جب کمپنی اپنے حصے (زمین یا عمارت) کی مالک بن جائے اس وقت کمپنی مستقل "ایجاب و قبول" کے ذریعہ گاہک کے ساتھ بیع کا معاملہ کرے۔

۲۔ شرکت متناقصہ

ہاؤس فنانسنگ کا دوسرا طریقہ "شرکت متناقصہ" پر مبنی ہے جو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہوگا:

ا۔ سب سے پہلے گاہک اور کمپنی "شرکت ملک" کی بنیاد پر مکان خریدیں گے، جس کے بعد وہ مکان مشترک ہو جائے گا اور جس فریق نے اس کی خرایدر میں جس تناسب سے رقم لگائی ہوگی اس تناسب سے وہ اس مکان کا مالک ہوگا، لہٰذا اگر دونوں فریقوں نے منصف نصف لگائی ہوگی تو وہ مکان دونوں کے درمیان آدھا آدھا

ہو گا، اور اگر ایک فریق نے ایک تہائی رقم لگائی اور دوسرے فریق نے دو تہائی رقم لگائی تو وہ مکان اسی تناسب سے دونوں کے درمیان مشترک ہو جائے گا۔

۲۔ پھر کمپنی ماہانہ یا سالانہ کرایہ طے کر کے اپنا حصہ اس گاہک کو کرایہ پر دے دی گی۔

۳۔ پھر اس مکان میں کمپنی کا جتنا حصہ ہے اس کو چند متعین حصوں میں مثلاً دس برابر حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۴۔ اس کے بعد فریقین آپس میں ایک متعین عرصہ (پیریڈ) طے کر لیں (مثلاً چھ ماہ یا سال کا عرصہ) پھر گاہک ہر پیریڈ میں کمپنی کی کل ملکیت کے ایک حصے کو اس کی قیمت ادا کر کے خرید لے گا، مثلاً اس مکان میں کمپنی کا جو حصہ ہے اس کی قیمت دو لاکھ روپے ہے، پھر جب اس کو دس حصوں میں تقسیم کر دیا تو ہر ایک حصے کی قیمت بیس ہزار روپے ہوگی۔ لہٰذا گاہک ہر چھ ماہ بعد کمپنی کو بیس ہزار روپے ادا کر کے اس کے ایک ایک حصے کا مالک بنتا رہے گا۔

۵۔ گاہک جس قدر حصے خریدتا رہے گا، اسی حساب سے اس کی ملکیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور کمپنی کی ملکیت اس مکان میں کم ہوتی چلی جائے گی۔

۶۔ چونکہ گاہک نے کمپنی کا حصہ کرایہ پر لیا ہوا تھا اس لئے جس قدر وہ کمپنی کے حصے خریدتا رہے گا اسی حساب سے کرایہ بھی کم ہوتا چلا جائے گا مثلاً اگر کمپنی کے حصہ کا کایہ ایک ہزار روپے طے ہوا تھا تو گاہک جس قدر حصے خریدے گا ہر حصے کی خرایدری کے بعد ایک سو روپے کرایہ کم ہو جائے گا لہٰذا ایک حصے کی خریداری کے بعد کرایہ نو سو روپے ہو جائے گا اور دو حصوں کی خریداری کے بعد کرایہ آٹھ سو روپے ہو جائے گا۔

۷۔ حتی کہ جب گاہک کمپنی کے دس کے دس حصے خرید لے گا تو وہ پورا مکان گاہک کی ملکیت ہو جائے گا اور س طرح یہ شرکت اور کرایہ داری کے دونوں معاملے بیکوقت اپنے انتہاء کو پہنچ جائیں گے۔

بہر حال، ہاؤس فنانسنگ کا مندرجہ بالا طریقہ تین معاملات پر مشتمل ہے نمبر ایک فریقین کے درمیان شرکت ملک کا قیام، نمبر دو کمپنی کے حصے کو گاہک کا کرایہ پر لینا نمبر تین کمپنی کے حصے کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے گاہک کے ہاتھ ایک ایک کر کے فروخت کر دینا...... ان تین معاملات کو پہلے علیحد علیحدہ بیان کرنے کے بعد پھر مجموعی لحاظ سے ہاؤس فنانسنگ کے اس طریقے کا شرعی جائزہ لیں گے۔

جہاں تک پہلے معاملے کا تعلق ہے یعنی کمپنی اور گاہک کا مشترکہ طور پر مکان خریدنا تو شرعی لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں اس لئے کہ اس خریداری کے نتیجے میں دونوں فریقوں کے درمیان "شرکت ملک" قائم ہو جائے گی اور اس "شرکت ملک" کے فقہاء نے مندرجہ ذیل تعریف کی ہے۔

"شیرکة املک ہئی ان یملک متعدد عینا او دینا بارث الوبیع اورغیرھما"

"شرکت ملک" یہ ہے کہ متعدد افراد وارثت یا بیع وغیرہ کے ذریعہ کسی چیز یا دین کے (مشترک طور پر) مالک بن جائیں"

(تنویر الابصار مع ردالمحتار، ج ۳ ص ۳۶۴)

بہر حال، زیر بحث مسئلے میں وہ مکان دونوں کے ماشترک مال سے خریدنے کے نتیجے میں اس کے اندر "شرکت ملک" وجود میں آگئی۔

جہاں تک دوسرے معاملے کا تعلق ہے یعنی اس مکان امیں کمپنی کے حصے کو گاہک کا کرایہ پر لینا تو کرایہ داری کا یہ معاملہ بھی شرعاً جائز ہے، اس لئے مشترکہ چیز کو شریک کے علاوہ دوسرے کو کرایہ پر دینے کے جواز اور عدم جواز میں تو فقہاء کا اختلاف ہے لیکن مشترک چیز کو شریک کو کرایہ پر دینے کے جواز پر فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں چنانچہ عالامہ ابن قدامة رحمة اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

ولا تجوز اجارة المشاع لغير الشریک، الا ان یوجر الشریکان معا، وھذا قول ابی حنیفة وزفر، لانہ لا یقدر علی تسلیمہ فلم تصح الجارتہ ......

...... واختار ابو حفص العکبری جواز ذلک وقد اومأ الیہ احمد وھو قول مالک والشافعی وابی یوسف و محمد لانہ معلوم یجوز بیعہ، فجازت اجارتہ کالمفروز، ولانہ عقد فی ملکہ یجوز مع شریکہ، فجاز مع غیرہ"

(المغنی لابن قدامۃ ج ۶ ص ۱۳۷)

مشترک چیز کو شریک کے علاوہ دوسرے کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، البتہ اس وقت جائز ہے جب دونوں شریک ایک ساتھ (ایک آدمی کو) کرایہ پر دیں، یہ امام ابو حنیفہ اور امام زفر رحمہما اللہ کا قول ہے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس چیز کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک شریک اپنا حصہ کرایہ دار کے سپرد کرنے پر قادر نہیں ہے، اس لئے یہ اجارہ درست نہیں

البتہ ابو حفص العکبری رحمہ اللہ نے اس اجارہ کے جواز کا قول اختیار کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے

بھی اس کے جواز کی طرف اشارہ کیا ہے اور امام مالک امام شافعی امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے اس کی وجہ جواز یہ ہے کہ وہ مشترک حصہ معلوم اور متعین ہے اور جب اس متعین حصے کو بیع جائز ہے تو اس کا اجارہ بھی جائز ہونا چاہئے، جیسا کہ علیحدہ کئے ہوئے حصے کی بیع او اجارہ جائز ہوتا ہے، دوسرے کہ وہ شریک اپنی ہی ملک کے اندر

معاملہ کر رہا ہے لہٰذا جس طرح شریک کے ساتھ جائز ہے غیر شریک کے ساتھ بھی جائز ہے۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ "در مختار" میں فرماتے ہیں:

"وتفسد (ای _ الاجارة) ایضا بالشیوع ...... الا اذا اجر کل نصیبه اوبعضه من شریکه، فیجوز، وجوازه بکل حال"

(الدر المختار مع ج ٦ ص ٤٧ و ٤٨)

شرکت کی وجہ سے "اجارہ" فاسد ہو جاتا ہے البتہ اگر مشترکہ چیز کا ایک شریک اپنا کل حصہ یا بعض حصہ دوسرے شریک کو اجارہ پر دے تو یہ جائز ہے، اور اس کی ہر صورت جائز ہے۔

اور چونکہ زیر بحث صورت میں مشترک مکان کا ایک شریک دوسرے شریک کو اپنا حصہ کرایہ پر دیتا ہے اس لئے با جماع فقہاء یہ صورت جائز ہے۔

جہاں تک تیسرے معاملے کا تعلق ہے کہ یعنی کمپنی کا اپنے مشترک حصے کو گاہک کے ہاتھ ایک ایک حصہ کر کے فروخت کرنا، تو یہ معاملہ بھی شرعاً جائز ہے اس لئے اگر اس مکان کی زمین اور عمارت دونوں مبیع میں داخل ہیں تب تو بیع کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ اگر اس مکان کی صرف عمارت مبیع میں داخل ہے، زمین داخل نہیں، تب اس عمارت کو شریک کے ہاتھ فروخت کرنا بالا جماع جائز ہے لیکن کسی اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنے کے جواز میں اختلاف ہے چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ علیہ رد المحتار میں فرماتے ہیں:۔

"ولو باع احد الشریکین فی البناء حصته لاجنبی، لا یجوز ولشریکه جاز"

(ردالمحتار، کتاب الشرکۃ، ج ۳ ص ۳٦٥)

"اگر کسی عمارت کے دو شریکوں میں سے ایک شریک اپنا حصہ کسی اجنبی کے ہاتھ فروخت کر دے تو یہ بیع جائز نہیں، البتہ شریک کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

اور چونکہ زیر بحث مسئلے میں وہ عمارت شریک ہی کے ہاتھ فروخت کی جاتی ہے، اس لئے اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

بہرحال، مندرجہ بالا تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ تینوں معاملات یعنی شرکت ملک اجارہ اور بیع ان میں سے ہر ایک فی نفسہ جائز ہے اگر ان معاملات کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور ایک معاملے کے اندر دوسرے معاملے کو مشروط نہ کیا جائے تو ان کے جواز میں کوئی غبار نہیں۔

البتہ اگر یہ معاملات فریقین کے درمیان کسی سابقہ معاہدہ اور ایگریمنٹ کے مطابق انجام پائیں تو اس میں "صفقہ فی صفقة" کے اصول کی بنیاد پر یا ایک معاملے کے اندر دوسرے معاملے کے مشروط ہونے کی وجہ سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ "صفقة فی صفقه" ہونے کی وجہ سے یہ تینوں معاملات بھی ناجائز ہو جائیں گے "صفقة فی صفقة" فقہاء کے نزدیک ناجائز ہے، حتی کہ ان فقہائے کے نزدیک بھی یہ ناجائز ہے کہ جو بیع کے اندر بعض مشروط کے جواز کے قائل ہیں جیسے فقہاء حنابلہ چنانچہ علامہ ابن قدامة رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"الثانی (ای النوع الثانی من الشرط) فاسد، وهو ثلاثة انواع، احدها ان يشتوط على صاحبه عقدا اخرم، کسیف اوقرض، اوبیع، او اجارة، اوصرف الثمن اوغيره فهذا يبطل ابيع، ويحتمل ان يبطل اليرسط وحده الشهور ى المذهب ان هذا الشرط فاسد، يبطل به البيع، لان النبی صلی

الله علیه وسلم قال : لا یحل بیع وسلف، ولا شرطان فی بیع " قال الترمذی : ھذا حدیث صحیح ، ولان النبی صلی الله علیه وسلم نھی عن بیعتین فی بیعة، حدیث صحیح و ھذا منه، وکذلک کل ما فی معنی ذلک، مثل ان یقول، علی ان تزوجنی بانبتک، او علی ان زوجک ابنتی، فھذا کله لا یصح ، قال ابن مسعود : صفقتان فی صفقة ربا : وھذا قول ابی حنیفة والشافعی وجمہور العلماء، وجوزه مالک، وجعل العوض المذکور فی الشرط فاسدا "

(الشرح الکبیر علی المقنع لشمس الدین ابن قدامة، ج ۴ ص ۵۳)

(ذکر الموفق لابن قدامة فی المغنی ج ۴ ص ۲۹۰)

شرط کی دوسری قسم فاسد ہے، اس کی تین صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ فریقین میں سے ایک دوسرے فریقین پر اس معاملے کے ساتھ دوسرے معاملے کو مشروط کر دے، مثلاً مسلم، یا بیع، یا اجارہ کو بیع کے ساتھ مشروط کر دے، یا حاصل ہونے والے ثمن کے ساتھ بیع صرف وغیرہ کو مشروط کر دے تو یہ شرط اس بیع کو باطل کر دے گی اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ صرف شرط باطل ہو جائے (اور بیع درست ہو جائے) لیکن مشہور مذہب یہی ہے کہ یہ شرط فاسد ہے، جو بیع کو باطل کر دے گی، اس لئے کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیع اور قرض کو جمع کرنا حلال نہیں، اور نہ بیع میں شرط لگانا حلال ہے...... امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اس

لئے کہ ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ نھی عن بیعتین فی بیعۃ" یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع کے اندر دوسری بیع کرنے سے منع فرمایا ہے" یہ حدیث بلاشبہ صحیح ہے اور اوپر بیان کردہ حدیث بھی اس معنی میں ہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ شرط جو اس معنی میں ہو وہ بھی اس بیع کو باطل کر دے گی مثلاً فریقین میں سے ایک یہ کہے کہ اس شرط پر یہ معاملہ کرتا ہوں کہ تو اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دے، یا اس شرط پر کہ میں اپنی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کروں گا اور یہ تمام کا تمام صحیح نہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک معاملے کے اندر دوسرا معاملہ داخل کرنا سود ہے، امام حنیفہؒ امام شافعی اور جمہور علماء کا بھی یہی قول ہے، البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور شرط کے اندر جس عوض اور بدل کا ذکر ہے اس کو فاسد قرار دیا ہے۔"

لیکن "صفقۃ فی صفقۃ" کی خرابی اس وقت لازم آئے گی جب ایک عقد کے اندر دوسرا عقد مشروط ہو، جب کہ زیر بحث مسئلے میں فریقین آپس میں یہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ دونوں فلاں تاریخ کو عقد اجارہ کریں گے اور فلاں تاریخ کو عقد بیع کریں گے اور پھر یہ دونوں معاملات اپنے اپنے وقت پر کسی شرط کے بغیر منعقد ہو جائیں تو اس صورت میں "صفقۃ فی صفقۃ" کی خرابی باہر لازم نہیں آئے گی، اس لئے کہ فقہاء کرام نے کئی مسائل میں اور خاص طور پر "بیع بالوفاء" کے مسئلے میں اس کی صراحت کی ہے چنانچہ فتاویٰ خانیہ کی یہ عبارت پیچھے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ:

"وان ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة، جاز البيع، و يلزم الوفاء بالوعد، لان المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس

(الفتاویٰ الخانیہ، ص ۱۳۸ ج ۲)

اگر بیع بغیر کسی شرط کی جائے، اور پھر شرط کو بطور وعدہ کے ذکر کیا جائے، تو بیع جائز ہو جائے گی، اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہو گا، اور اس لئے کہ آپس کے وعدے بعض اوقات لازم بھی ہوتے ہیں لہٰذا اس وعدے کو بھی لوگوں کی ضرورت کے لئے لازم قرار دیا جائے گا"

علماء مالکیہ نے بھی "بیع بالوفاء" کے مسئلے میں جس کو وہ "بیع الثنایا" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس بات کی تصریح کی ہے کہ "بیع بالوفاء" ان کے نزدیک جائز نہیں ہے چنانچہ علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"لا یجوز بیع الثنایا، وهو ان یقول ابیعک هذا الملک اوهذه السلعة على ان اتیک بالثمن الى مدة كذا اومتى اتیک به فالبیع مصروف عنی"

(تحریر الاکلام فی مسائل الالتزام، للحطاب ص ۲۳۳)

"بیع الثنایا" جائز نہیں ہے "بیع الثنایا" یہ ہے کہ بائع یہ کہے کہ اپنی یہ ملک یا یہ سامان میں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ اگر اتنی مدت کے اندر اندر میں تیرے پاس اس کی قیمت لے آؤں، یا جب بھی میں تیرے پاس اس کی قیمت لے آؤں تو اس وقت یہ بیع مجھ پر واپس لوٹ جائے گی"

البتہ اگر بیع شرط کے بغیر ہو جائے، اس کے بعد مشتری بائع سے یہ وعدہ کرلے کہ جب وہ قیمت لائے گا اس وقت وہ اس کو واپس فروخت کر دے گا اس صورت میں یہ وعدہ درست ہو جائے گا اور مشتری کو یہ وعدہ پورا کرنا لازم ہو گا علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قال فی معین الحکام : ویجوز للمشتری ان یتطوع للبائع بعد العقد بانه ان جاء الثمن الی اجل کذا، والمبیع له، ویلزم المشتری متی جاءه بالثمن فی خلال الاجل او عند انقضاءه او بعده علی القرب منه ولا یکون للمشتری تفویت فی خلال الاجل، فان فعل ببیع او هبة اوشبه ذلک نقض ان اراده البائع وردالیه"

(تحریر الکلام للحطاب ص۲۳۹)

معین الحکام میں فرمایا کہ مشتری کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ عقد ہونے کے بعد بائع کو بطور احسان یہ کہے کہ اگر وہ اتنی مدت تک ثمن لے آئے گا تو یہ مبیع اس کی ہو جائے گی لہٰذا اگر مدت کے اندر اندر یا مدت پوری ہونے پر یا مدت پوری ہونے کے فوراً بعد بائع ثمن لے آئے تو مشتری کو اپنا وعدہ پورا کرنا لازم ہو گا اور مشتری کے لئے جائز نہیں کہ وہ مدت کے اندر اس مبیع کو بیع یا ھبہ وغیرہ کے ذریعہ آگے چلتا کر دے اگر مشتری ایسا کرے گا تو اس کا یہ معاملہ ٹوٹ جائے گا بشرطیکہ بائع کا اس کو واپس لینے کا ارادہ ہو اور قیمت واپس کر دے۔

یہ اس وقت ہے جب بیع کسی شرط کے بغیر وجود میں آجائے اور آپس کا وعدہ بیع مکمل ہونے کے بعد کیا جائے ...... بعض فقہاء نے اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اگر بیع منعقد ہونے سے پہلے بائع اور مشتری آپس میں کوئی وعدہ کر لیں اس کے بعد بیع کسی شرط کے بغیر منعقد کر لیں تو یہ بھی جائز ہے چنانچہ قاضی ابن سماوۃ حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

شرطا شرطا فاسدا
قبل العقد، ثم عقدا، لم يبطل العقد
و يبطل لو تقارنا"

(جامع الفصولین، ۲: ۲۳۷)

عاقدین نے عقد بیع سے پہلے آپس میں کوئی شرط فاسد کر لی، اس کے بعد آپس میں عقد بیع کی (اس عقد کے اندر کوئی شرط نہیں لگائی) تو اس صورت میں وہ شرط اس عقد کو باطل نہیں کرے گی البتہ اگر وہ شرط عقد بیع کے اندر ہوتی تو اس صورت میں یہ شرط اس عقد کو باطل کر دیتی"

"بیع بالوفاء" کے مسئلے میں قاضی ابن سماوہ" فرماتے ہیں:

وكذا لوتواضعا الوفاء قبل البيع، ثم عقدا بلاشرط الوفاء فالعقد جائز، ولا عبرة بالمواضعة السابقة،" (جامع الفصولین: ۲: ۲۳۷)

اگر عاقدین عقد بیع سے پہلے کوئی وعدہ کر لیں پھر وفاء کی شرط کے بغیر عقد بیع کر لیں تو یہ عقد جائز ہے، اور سابقہ وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا"

البتہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمحتار میں جامع الفصولین کی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد اس پر اعتراض کیا ہے، وہ فرماتے

ہیں:

فی جامع الفصولین ایضا : لوشرطا شرطا فاسدا" قبل العقد، ثم عقدا، لم یبطل العقد، قلت وینبغی الفساد لو اتفقا علی بناء العقد علیه، کماصرحوا به فی بیع الهزل، کماسیاتی اخر البیوع" (ردالمحتار ۴ : ۱۳۵)

جامع الفصولین میں ہے کہ اگر عاقدین نے عقد بیع کرنے سے پہلے آپس میں کوئی شرط فاسد ٹھیرالی، پھر عقد کیا تو اس صورت میں یہ عقد باطل نہ ہوگا ...... میں کہتا ہوں کہ اگر عاقدین نے اس عقد کو سابقہ شرط کی بنیاد پر کیا ہے تو اس صورت یہ عقد فاسد ہونا چاہئے جیساکہ کتاب البیوع کے آخر میں "بیع الهزل" میں اس کی صراحت کی ہے"

لیکن علامہ محمد خالد الاتاسی رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ کے اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

اقول هذا بحث مصادم للمنقول (ای ماهو منقول فی جامع الفصولین) کما علمت و قیاسه علی بیع الهزل قیاس مع الفارق، فان الهزل کمافی المنار هوان یراد باشئی مالم یوضع له، ولامایصلح له اللفظ استعارة ونظیره بیع التلجئة وهو کما فی الدر المختار، ان یظهرا عقدا و هما لا یریدانه وهو لیس ببیع فی الحقیقة، فاذا اتفقاه علی بناء العقد علیه فقد اعترفا بانهما لم

بریدا انشاء بیع اصلا واین هذا من
مسئلتنا؟ .... وعلی کل حال فاتباع
المنقول اولی (شرح المجلۃ للاتاسی ۲: ۶۱)

میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بحث جامع الفصولین کی عبارت سے متصادم ہے جیسا کہ تجھ کو معلوم ہے اور علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کا اس مسئلہ کو "بیع الھزل" پر قیاس کرنا یہ قیاس مع الفارق ہے اس لئے کہ صاحب منار کے مطابق "ھزل" کا مطلب یہ ہے کہ لفظ بول کر ایسی چیز مراد لی جائے جس کے لئے وہ لفظ وضع نہیں ہوا، اور نہ ہی بطور استعارہ کے اس لفظ کا اس معنٰی پر اطلاق ہوتا ہو، اور اس کی نظیر "بیع التلجئۃ" ہے، در مختار میں "بیع التلجئۃ" کی تعریف یہ کی ہے کہ عاقدین آپس میں کسی عقد کا اظہار کریں جبکہ دونوں کا عقد کرنے کا ارادہ نہ ہو اور یہ حقیقت میں بیع ہی نہیں ہے لہٰذا اگر یہ دونوں عاقدین اس عقد کی بنیاد پر کوئی دوسرا عقد کر لیں تو ایسا کرنا عاقدین کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہوگا کہ انہوں نے اصلاً بیع کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا اب ظاہر ہے کہ اس مسئلے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے۔ بہرحال جامع الفصولین میں ذکر کردہ مسئلے کی اتباع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

چنانچہ متاخرین حنفیہ کی ایک جماعت نے یہ فتوٰی دیا ہے کہ اگر کوئی وعدہ عقد بیع سے بالکل جدا ہو، چاہے وہ عقد بیع سے پہلے کیا جائے، یا بعد میں کیا جائے دونوں صورتوں میں وہ وعدہ اصل عقد بیع کے ساتھ ملحق نہیں ہوگا، اور اس وعدہ کی وجہ سے یہ لازم نہیں آئیگا کہ یہ بیع شرط کے ساتھ ہوئی ہے، اور نہ یہ لازم آئیگا کہ

یہ "صفقۃ فی صفقۃ" ہے لہٰذا اب اس معاملے کے جائز ہونے میں کوئی مانع باقی نہ رہا۔

البتہ ایک اشکال یہ رہ جاتا ہے کہ جس صورت میں بیع سے پہلے آپس میں کوئی وعدہ کر لیا گیا ہو، اس صورت میں اگرچہ ایجاب و قبول کے وقت اس وعدہ کا زبان سے اظہار نہیں کیا جاتا لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ وعدہ فریقین کے نزدیک عقد کے وقت ضرور ملحوظ ہوگا اور اسی سابقہ وعدہ کی بنیاد پر عاقدین یہ موجودہ عقد کریں گے، لہٰذا پھر تو زیر بحث معاملہ جس میں عقد بیع سے پہلے آپس کوئی وعدہ ہو گیا ہو اور اس معاملے میں کوئی فرق نہیں رہیگا جس میں صراحتا دوسرا عقد مشروط ہو، اور حکم معاملے کی حقیقت پر ہونا چاہئے اس کی ظاہری صورت پر نہ ہونا چاہئے لہٰذا سابقہ کیا ہوا وعدہ بھی شرط کے درجے میں ہو کر اس بیع کو ناجائز کر دیگا۔

میرے علم کی حد تک اس اشکار کا جواب یہ ہے۔ واللہ اعلم — کہ ان دونوں مسئلوں میں صرف ظاہری اور لفظی فرق نہیں ہے، بلکہ حقیقی طور پر ان دونوں میں باریک فرق ہے وہ یہ کہ اگر ایک عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط ہو جس کو اصطلاح میں "صفقۃ فی صفقۃ" کہتے ہیں اس میں پہلا عقد مستقل اور قطعی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ پہلا عقد دوسرے عقد پر اس طرح موقوف ہوتا ہے کہ یہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتا جس طرح ایک معلق عقد ہوتا ہے۔

لہٰذا جب بائع نے مشتری سے کہا کہ میں یہ مکان تمہیں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم اپنا فلاں مکان مجھے اتنے کرایہ پر دوگے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیع آئندہ ہونے والے اجارہ پر موقوف رہیگی اور جب عقد کسی آئندہ کے معاملے پر موقوف ہو تو اس صورت میں اس عقد کو مستقل عقد نہیں کہا جائیگا۔ بلکہ عقد معلق کہا جائیگا۔ اور عقود معارضہ میں تعلیق جائز نہیں۔

اور اگر اس بیع کو نافذ کر دیں، اس کے بعد مشتری عقد اجارہ کرنے سے انکار کر دے، تو اس صورت میں عقد بیع خود بخود کالعدم ہو جائیگا اس لئے کہ عقد

بیع تو عقد اجارہ کے ساتھ مشروط تھا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جب شرط فوت ہو جائے تو مشروط خود بخود فوت ہو جائیگا۔

لہٰذا جب ایک عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقد اول عقد ثانی کے ساتھ معلق ہو جائیگا، گویا بائع نے مشتری سے یہ کہا کہ اگر تم اپنا فلاں مکان مجھے اتنے کرایہ پر دو گے تو میں اپنا یہ مکان تمہیں اتنے پر فروخت کر دونگا ظاہر یہ کہ یہ عقد کسی امام کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع تعلیق کو قبول نہیں کرتی ہے۔

بر خلاف اس کے کہ بائع اور مشتری ابتداء ہی عقد اجارہ کو بطور ایک وعدہ کے طے کر لیں۔ پھر مطلق غیر مشروط طور پر عقد بیع کریں تو اس صورت میں یہ عقد بیع مستقل اور غیر مشروط ہوگی اور عقد اجارہ پر موقوف نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر عقد بیع مکمل ہو جانے کے بعد مشتری عقد اجارہ کرنے سے انکار کر دے تو اس صورت میں عقد بیع پر کوئی اثر نہیں پڑیگا، عقد بیع اپنی جگہ پر مکمل اور درست ہو جائیگی۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائیگا کہ چونکہ وعدہ پورا کرنا بھی لازم ہوتا ہے، اس لئے مشتری کو اس بات پر مجبور کیا جائیگا کہ وہ اپنے وعدے کو پورا کرے، اس لئے کہ اس نے اس وعدے کے ذریعے بائع کو اس بیع پر آمادہ کیا ہے چنانچہ مالکیہ کے نزدیک قضا بھی اس وعدے کو پورا کرنا مشتری کے ذمے ضروری ہے البتہ اس وعدے کا اس بیع پر کوئی اثر نہیں پڑیگا جو بیع غیر مشروط طور پر ہوئی ہے لہٰذا اگر مشتری اپنا وعدہ پورا نہ بھی کرے تب بھی بیع اپنی جگہ پر تام سمجھی جائیگی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر بیع کے اندر کوئی دوسرا عقد مشروط ہو تو اس صورت میں وہ عقد مکمل ہونے اور فسخ ہونے کے درمیان متردد رہتا ہے، اور اس تردد کی وجہ سے اس عقد کے اندر فساد آجائیگا۔ بخلاف اس کے کہ بیع تو مطلق اور غیر مشروط ہو۔ البتہ اس بیع سے پہلے عاقدین آپس میں کوئی وعدہ

کرلیں، تواس صورت میں اس بیع کے مکمل ہونے میں کوئی تردد باقی نہیں رہیگا، وہ ہر حال میں مکمل ہو جائیگی زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ جن حضرات فقہاء کے نزدیک وعدے کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے، ان کے نزدیک اس سابقہ وعدے کو پورا کرنا مشتری کے ذمے لازم ہو گا۔

بہر حال: شرکۃ متناقصہ "کا جائز اور بے غبار طریقہ یہ ہے کہ تینوں معاملات اپنے اپنے اوقات میں دوسرے معاملے سے بالکل علیحدہ علیحدہ کئے جائیں اور ایک عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط نہ ہو، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عاقدین کے درمیان وعدہ اور ایگریمنٹ ہو جائے جس کے تحت آئندہ کے معاملات طے پائیں۔

چنانچہ عاقدین (گاہک اور کمپنی) اس بات پر اتفاق کرلیں کہ فلاں مکان دونوں مل کر مشترکہ طور پر خریدیں گے، اور پھر کمپنی اپنا حصہ گاہک کو کرایہ پر دیدیگی پھر گاہک کمپنی کے حصے کو مختلف قسطوں میں خرید لے گا حتی کہ گاہک اس پورے مکان کا مالک ہو جائیگا۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ گاہک اور کمپنی کے درمیان یہ معاہدہ صرف وعدہ کی شکل میں ہو، اور ہر عقد اپنے اپنے وقت پر مستقل ایجاب وقبول کے ساتھ کیا جائے۔ اس صورت میں یہ عقد غیر مشروط ہو گا لہٰذا کرایہ داری میں بیع کا معاملہ مشروط نہ ہو گا اور نہ بیع کے اندر کرایہ داری کا معاملہ مشروط ہو گا۔

واللہ اعلم بالصواب .

غیر سودی کاؤنٹر

یعنی پی ایل ایس اکاؤنٹ کی حقیقت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

۱۹۸۱ء میں جب حکومت نے بلاسود بینکاری کا آغاز کرتے ہوئے تمام بنکوں میں ''پی۔ایل۔ایس'' یعنی پروفٹ اینڈ لوس شیرنگ (نفع نقصان کی شرکت کا کھاتہ) جاری کر دیا گیا۔ اور اس کے لئے ''غیر سودی کاونٹرز'' کھول دیئے گئے۔ چونکہ اس کا طریقہ کار تمام تر سودی بنیادوں پر تھا۔ اس لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے اس کھاتے کی حقیقت لوگوں کے سامنے واضح کرنے کے لئے یہ مضمون تحریر فرمایا۔ جس میں یہ بتا دیا کہ یہ اکاؤنٹ اور کھاتہ بھی سودی کھاتہ ہے اس میں رقم رکھوا کر نفع لینا جائز نہیں۔

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غیر سُودی کاؤنٹرز

یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے حکومت نے بلا سُود بینکاری کے آغاز کا اعلان کیا ہے، اور ہر بینک میں "غیر سُودی کاؤنٹر" کھول دیئے گئے ہیں، حکومت کا کہنا ہے کہ یہ "بلا سُود بینکاری" کی طرف پہلا قدم ہے اور آئندہ بینکنگ کے پورے نظام کو رفتہ رفتہ غیر سُودی نظام میں تبدیل کردیا جائیگا۔

سُود جیسی لعنت سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ایک اسلامی حکومت کا اہم ترین فریضہ ہے، اور جس دن ہماری معیشت اس شیطانی چکّر سے نجات پا گئی، وہ نہ صرف پاکستان، بلکہ پوری انسانیت کے لئے روزِ سعید ہوگا۔ موجودہ حکومت نے بار بار اپنے اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ وہ ملکی معیشت کو غیر سُودی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتی ہے، اور ایک ایسے ماحول میں جہاں بینکوں کے سُود کو حلال طیب قرار دینے کی شرمناک کوششیں جاری رہی ہیں، حکومت کی طرف سے اس عزم کے

اظہار کو بھی مسلمانوں نے غنیمت سمجھا' اور اس نیک کام کی طرف جو قدم بھی آگے بڑھایا جائے اُسے ماضی کے مقابلے میں مستحسن ہی قرار دیا جائے گا' اس لئے ان نئے "غیر سُودی کاؤنٹروں" کے افتتاح کے بعد مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد نے اُسے خوش آمدید کہا اور اپنے اکاؤنٹ ان کاؤنٹروں میں کھلوانے شروع کردیئے۔

ذاتی طور پر اگرچہ ہمیں اس طریق کار سے شدید اختلاف تھا کہ سُودی اور غیر سُودی کاؤنٹر متوازی طور پر ساتھ ساتھ چلائے جائیں' مگر جب ان کاؤنٹروں کا افتتاح ہوا تو اس اقدام کو ماضی کے مقابلے میں بہرحال غنیمت سمجھتے ہوئے ہمارا فوری اور پہلا تأثر یہ تھا کہ ان کاؤنٹروں کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہئے' کیونکہ عرصۂ دراز کی تمنّاؤں اور جدوجہد کے بعد اس کام کا آغاز ہورہا ہے جس کے انتظار میں ایک تہائی صدی بیت گئی ہے' خیال یہ تھا کہ حکمتِ عملی خواہ کیسی ہو' لیکن غیر سُودی بنکاری کا قیام بہرصورت ایک ایسا نیک کام ہے جس میں تعاون خیر ہی خیر ہے' چنانچہ اس کارِ خیر میں تعاون اور حصّہ داری کے جذبے کے ساتھ ہم نے اس کی اسکیم کا مطالعہ کیا۔ لیکن افسوس اور شدید افسوس' حسرت اور شدید حسرت اس بات کی ہے کہ ان کاؤنٹروں کے تفصیلی طریقِ کار کو دیکھنے کے بعد یہ جذبہ بڑی حد تک سرد پڑگیا۔

یکم جنوری ۱۹۸۱ء کے بعد اطراف واکناف سے تحریری اور زبانی طور پر ہم سے یہ سوال کیا جارہا ہے کہ کیا ان کاؤنٹروں سے واقعۃً سُود ختم ہوگیا ہے؟ اور کیا ایک مسلمان سُود کے کسی خطرے کے بغیر ان کاؤنٹروں میں رقم رکھوا سکتا ہے؟

ان سوالات کا علیٰ وجہ البصیرت جواب دینے کے لئے جب ہم نے اس اسکیم کا مطالعہ کیا جو یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے نافذ کی گئی ہے' اور اس کے طریقِ کار کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ سُود کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی ذہنیت اتنی آسانی سے اس نجاست کا خاتمہ کرنے کے لئے تیار نہیں' بلکہ وہ اس پر تھوڑا سا عطر چھڑک کر

اور کچھ خوش نما پالش کر کے کچھ مزید عرصے تک کام چلانا چاہتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ابھی نہ صرف اور انتظار کرنا ہوگا' بلکہ سُود کی گرتی ہوئی دیوار کو۔ جو انشاء اللہ بالآخر گر کر رہے گی۔ صحیح طرح ڈھانے کے لئے ابھی اور جدوجہد کرنی ہوگی۔

چونکہ عام طور پر مسلمانوں بلکہ بیشتر علماء کو بھی اس نئی اسکیم کی تفصیلات پہنچ نہیں سکیں' اس لئے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنے علم و بصیرت کی حد تک اس اسکیم پر تبصرہ پیش کریں' تاکہ حکومت' عوام اور علماء اس کی روشنی میں راہ عمل طے کر سکیں:

بینکوں کو غیر سُودی نظام پر کس طرح چلایا جائے؟ اور معیشت کے لئے سُود کی متبادل اساس کیا ہو؟ اس مسئلے پر مدّتِ دراز سے عالمِ اسلام کے مختلف حصّوں میں سوچا جارہا ہے اور اس پر بہت سا علمی اور تحقیقی کام ہوچکا ہے' فکر و تحقیق کی ان تمام کاوشوں کو سامنے رکھنے کے بعد ایک بات تقریباً تمام تجاویز میں مشترک نظر آتی ہے' اور وہ یہ کہ سُود کے اصل متبادل طریقے صرف دو ہیں : ایک نفع و نقصان کی تقسیم یعنی شرکت یا مضاربت اور دوسرے قرض حسن۔

لہٰذا سُود کو ختم کرنے کے بعد بنکاری کا سارا نظام بنیادی طور سے انہیں دو طریقوں پر مبنی ہونا چاہئے۔ البتہ بینک کو بعض ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کی انجام دہی کے لئے نہ وہ شرکت و مضاربت کا طریقہ اپنا سکتا ہے' اور نہ قرضِ حسن کا۔ ایسے مقامات پر جُزوی طور سے کچھ دوسرے طریقے بھی مختلف حضرات نے تجویز کئے ہیں' یہ طریقے پورے نظامِ بنکاری کی بنیاد نہیں بن سکتے' بلکہ انھیں استثنائی یا عُبوری طور پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔

بلاسُود بنکاری پر اب تک جو علمی اور تحقیقی کام سامنے آیا ہے' ان میں

احقر کی معلومات کی حد تک سب سے زیادہ جامع، مفصّل اور حقیقی رپورٹ وہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے علماء کرام اور ماہرینِ معاشیات وبنکاری کی مدد سے مرتب کی ہے اور اب منظرِعام پر آچکی ہے۔ اس رپورٹ کا حاصل بھی یہی ہے کہ بلاسود بنکاری کی اصل بنیاد نفع ونقصان کی تقسیم پر قائم ہوگی، اور بینک کا بیشتر کاروبار شرکت یا مضاربت پر مبنی ہوگا، البتہ جن کاموں میں شرکت یا مضاربت کار آمد نہیں ہوسکتی، وہاں کے لئے اس رپورٹ میں کچھ اور متبادل راستے بھی تجویز کیے گئے ہیں جنھیں بوقتِ ضرورت عُبوری دور میں اختیار کیا جاسکتا ہے، انھی متبادل راستوں میں ایک متبادل راستہ وہ ہے جِسے اس رپورٹ میں "بیعِ مؤجّل" کا نام دیا گیا ہے۔

اس طریقِ کار کا خلاصہ اس طرح سمجھئے کہ مثلاً ایک کاشتکار ٹریکٹر خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس رقم نہیں ہے، بحالاتِ موجودہ ایسے شخص کو بینک سُود پر قرض دیتا ہے، یہاں سُود کے بجائے شرکت یا مضاربت اس لئے نہیں چل سکتی کہ کاشتکار ٹریکٹر تجارت کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے کھیت میں استعمال کے لئے خریدنا چاہتا ہے۔ اس صورتِ حال کا مثالی حل تو یہ ہے کہ بینک ایسے اشخاص کو قرضِ حَسن فراہم کرے، لیکن جب تک بینکوں کی مالی پوزیشن اتنی مستحکم ہو کہ وہ اپنا روپیہ قرضِ حَسن کے طور پر دے سکیں، اس وقت تک کے لئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بینک کاشتکار کو روپیہ دینے کے بجائے ٹریکٹر خرید کر اُدھار قیمت پر دے دے، اور اپنا کچھ منافع رکھ کر اس کی قیمت متعین کرے اور کاشتکار کو اس بات کی مہلت دے کہ وہ بینک کو ٹریکٹر کی مقررہ قیمت کچھ عرصے کے بعد ادا کردے۔ اس طریقے کو اسلامی کونسل کی رپورٹ میں "بیعِ مؤجّل" کا نام دیا گیا ہے، اور اس میں بینک نے ٹریکٹر کی بازاری قیمت پر جو منافع رکھا ہے اسے معاشی اصطلاح میں "مارک اپ" کہا جاتا ہے۔

یہ سُود سے بچاؤ کا کوئی مثالی طریقہ تو نہیں ہے، لیکن چونکہ مذکورہ صورت میں بینک ٹریکٹر کو اپنی ملکیت، اپنے قبضے اور ضمان (RISK) میں لانے کے بعد

فروخت کرتا ہے' اس لئے فقہی اعتبار سے یہ نفع سود نہیں ہوتا' اور فقہائے کرامؒ نے خاص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے' چنانچہ جن مقامات پر بینک کے سامنے فی الحال کوئی متبادل راستہ نہیں ہے' وہاں کونسل کی رپورٹ میں یہ طریقِ کار اختیار کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے' جس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ ضرورت کے مواقع پر صریح سُود سے بچنے کے لئے' یہ طریقِ کار اختیار کرلیا جائے' لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس طریقِ کار کو سُود کی روح باقی رکھنے کا ایک قانونی حیلہ بنا کر بنکاری نظام کی پوری عمارت "مارک اپ" کی بنیاد پر کھڑی کردی جائے۔ چنانچہ کونسل کی مذکورہ رپورٹ میں جہاں سُود کے متبادل طریقوں میں ایک طریقہ "بیعِ مؤجّل" مقرر کیا گیا ہے' وہاں پوری صراحت کے ساتھ یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ اس طریقِ کار کو کن حدود میں استعمال کرنا چاہئے۔ رپورٹ کے تمہیدی نکات میں لکھا ہے کہ :

> "کونسل اس امر کو ابتدا ہی میں واضح کردینا ضروری سمجھتی ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں سُود کا مثالی متبادل حل "نفع ونقصان میں شرکت" یا قرضِ حسن کی صورت میں سرمائے کی فراہمی ہے۔ اگرچہ اس رپورٹ میں پیش کردہ سفارشات بڑی حد تک نفع ونقصان میں شرکت کے اصول پر مبنی ہیں لیکن بعض سفارشات میں کچھ دوسرے متبادل طریقے مثلاً پٹہ داری' ملکیتی کرایہ داری' بیع مؤجّل' سرمایہ کاری بذریعہ نیلام بھی اپنائے گئے ہیں .... اگرچہ یہ متبادل طریقے جس صورت میں زیرِ نظر رپورٹ میں پیش کئے گئے ہیں' سُود کے عنصر سے پاک ہیں' تاہم اسلام کے مثالی اقتصادی نظام کے نقطۂ نظر سے یہ صرف "دوسرا متبادل حل" ہیں۔ اس کے

علاوہ یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ طریقے بالآخر سُودی لین دین اور اس سے متعلقہ برائیوں کے از سرِنو رواج کے لئے چور دروازے کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔ لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ ان طریقوں کا استعمال کم سے کم حد تک صرف ان صورتوں اور خاص حالات میں کیا جائے جہاں اس کے سوا چارہ نہ ہو، اور اس بات کی ہرگز اجازت نہ دی جائے کہ یہ طریقے سرمایہ کاری کے عام معمول کی حیثیت اختیار کرلیں"۔

(خاتمۂ سُود پر اسلامی نظریاتی کونسل کی اردو رپورٹ صفحہ ۱۳)

نیز "بیعِ مؤجّل" کے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے آگے پھر لکھا ہے کہ

"اگرچہ اسلامی شریعت کے مطابق سرمایہ کاری کے اس طریقے کا جواز موجود ہے، تاہم بلاامتیاز اسے ہرجگہ کام میں لانا دانش مندی سے بعید ہوگا، کیونکہ اس کے بے جا استعمال سے خطرہ ہے کہ سودی لین دین کے از سرِنو رواج کے لئے چور دروازہ کُھل جائے گا۔ لہٰذا ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ یہ طریقہ صرف ان صورتوں میں استعمال ہو جہاں اس کے سوا چارہ نہ ہو"۔

(ایضاً صفحہ ۲۶ فقرہ ۱/۷)

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم یکم جنوری سے نافذ ہونے والی اسکیم کا جائزہ لیتے ہیں تو نقشہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اس اسکیم میں نہ صرف یہ کہ "مارک اپ" ہی کو غیر سُودی کاؤنٹرز کے کاروبار کی اصل بنیاد قرار دے دیا گیا، بلکہ "مارک اپ" کے طریقِ کار میں ان شرائط کا بھی لحاظ نظر نہیں آتا

جو اس "مارک اپ" کو محدود فقہی جواز عطا کر سکتی تھیں' چنانچہ اس میں مندرجہ ذیل سنگین خرابیاں نظر آتی ہیں :

(۱) "بیعِ مؤجّل" کے جواز کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ بائع جو چیز فروخت کر رہا ہے وہ اس کے قبضے میں آچکی ہو۔ اسلامی شریعت کا یہ معروف اصول ہے کہ جو چیز کسی انسان کے قبضے میں نہ آئی ہو اور جس کا کوئی خطرہ (RISK) انسان نے قبول نہ کیا ہو اُسے آگے فروخت کر کے اس پر نفع حاصل کرنا جائز نہیں' اور زیرِ نظر اسکیم میں "فروخت شدہ" چیز کے بینک کے قبضے میں آنے کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ یہ صراحت کی گئی ہے کہ بینک "مارک اپ اسکیم" کے تحت کوئی چیز مثلاً چاول اپنے گاھک کو فراہم نہیں کرے گا' بلکہ اس کو چاول کی بازاری قیمت دے گا' جس کے ذریعے وہ بازار سے چاول خرید لے گا' اور اسکیم کے الفاظ یہ ہیں :

> "جن اشیاء کے حصول کے لئے بینک کی طرف سے رقم فراہم کی گئی ہے' ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بینک نے اپنی فراہم کردہ رقم کے معاوضے میں بازار سے خرید لی ہیں' اور پھر انہیں نوّے دن کے بعد واجب الاداء زائد قیمت پر ان اداروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے (جو اس سے رقم لینے آئے ہیں) "۔

(اسٹیٹ بینک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۹)

اس میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ وہ اشیاء بینک کی ملکیت اور اس کے قبضے میں کب اور کس طرح آئیں گی؟ اور محض کسی شخص کو کوئی رقم دے دینے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ جو چیز وہ خریدنا چاہ رہا ہے وہ پہلے بینک نے خریدی اور پھر اس کے ہاتھ بیچ دی ہے؟ صرف کاغذ پر کوئی بات فرض کر لینے سے وہ حقیقت کیسے بن سکتی ہے' جب تک اس کا صحیح طریقِ کار اختیار نہ کیا جائے۔ زیادہ سے

زیادہ جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ کہ بینک پہلے اس ادارے کو اپنا وکیل (AGENT) بنائے کہ وہ مطلوبہ چیز بینک کی طرف سے خرید لے' اور جب وہ خرید کر بینک کے وکیل کی حیثیت سے اس پر قبضہ کرلے تو پھر بینک اسے فروخت کردے۔ لیکن اول تو اس طریقِ کار کی صراحت ہونی چاہئے' دوسرے یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ جب تک وہ ادارہ مطلوبہ چیز خرید کر اس پر بینک کی طرف سے قبضہ نہیں کرلے گا' بینک کی فراہم کی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض نہیں ہوگی بلکہ اس کے پاس بینک کی امانت ہوگی۔ یہاں نہ صرف یہ کہ اس قسم کے کسی طریق کار کا کوئی ذکر نہیں' بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ چاول وغیرہ کی خریداری کے لئے بینک نے جو رقمیں رائس کارپوریشن کو پہلے سے دی ہوئی تھیں' ۲۸ر مارچ کو یہ سمجھا جائے گا کہ کارپوریشن نے وہ رقمیں سُود کے ساتھ بینک کو واپس کردی ہیں' اور پھر بینک نے اسی روز وہ رقمیں دوبارہ کارپوریشن کو "مارک اپ" کی بنیاد پر دے دی ہیں' اور جس جنس کی خریداری کے لئے وہ قرضے دیئے گئے تھے' یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بینک نے خرید لی ہے' اور پھر کارپوریشن کو "مارک اپ" کی بنیاد پر بیچ دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جن رقموں سے کارپوریشن پہلے چاول وغیرہ خرید چکی ہے اور شاید خرید کر آگے فروخت بھی کرچکی ہے اس کے بارے میں کون سی منطق کی رُو سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ بینک نے خرید کر دوبارہ کارپوریشن کو بیچی ہے؟

اس سے یہ بات واضح طور پر مترشّح ہوتی ہے کہ "بیعِ مؤجّل" کا طریقہ حقیقی طور پر اپنانا پیشِ نظر نہیں بلکہ فرضی طور پر اس کا صرف نام لینا پیشِ نظر ہے' اور انتہا یہ ہے کہ اس جگہ یہ نام بھی برقرار نہیں رہ سکا' بلکہ بینک کی دی ہوئی رقم کو قرض (ADVANCE) اور اس عمل کو قرض دینے (LEND) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(اسٹیٹ بینک نیوز کیم جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۷)

(۲) اس اسکیم کی ایک سنگین ترین غلطی اور ہے۔ "بیعِ مؤجّل" کے لئے ایک

لازمی شرط یہ ہے کہ معاہدے کے وقت فروخت شدہ شے کی قیمت بھی واضح طور پر متعیّن ہو جائے' اور یہ بات بھی کہ یہ قیمت کتنی مدّت میں ادا کی جائے گی؟ پھر اگر خریدنے والا وہ قیمت معیّنہ مدّت پر ادا نہ کرے تو اس سے وصول کرنے کے لئے تمام قانونی طریقے استعمال کئے جاسکتے ہیں' لیکن ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر معیّنہ قیمت میں اضافہ کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے' کیونکہ تاخیر کی بنیاد پر قیمت میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو اسی کا دوسرا نام سُود ہے' لیکن زیرِ نظر اسکیم میں اس اہم اور بنیادی شرط کی بھی پابندی نہیں کی گئی' بلکہ بعض معاملات میں وضاحت کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے' چنانچہ اس میں کہا گیا ہے کہ امپورٹ بِلوں کی ادائیگی میں بینک جو رقم خرچ کرے گا' اس پر ابتداءً بیس دن کی مدّت کے لئے اعشاریہ ۸۷ فیصد "مارک اپ" وصول کرے گا' اور اگر یہ رقم بیس دن میں ادا نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید چودہ دن کے لئے اعشاریہ ۵۸ فیصد "مارک اپ" کا مزید اضافہ ہوگا اور اگر ۳۴ دن گزر جانے پر بھی قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید اعشاریہ ۶۲ فیصد "مارک اپ" کا اضافہ ہوگا' اور اگر ۴۸ دن گزر جانے پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو آئندہ ہر پندرہ دن کی تاخیر پر مزید اعشاریہ ۹۷ فی صد کے "مارک اپ" کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اندازہ فرمائیے کہ یہ طریقِ کار واضح طور پر سُود کے سوا اور کیا ہے؟ اگر "انٹرسٹ" کے بجائے نام "مارک اپ" رکھ دیا جائے اور باقی تمام خصوصیات وہی رہیں تو اس سے "غیر سُودی نظام" کیسے قائم ہو جائے گا؟

یہ غنیمت ہے کہ مدّتوں کے اضافے سے "مارک اپ" کی شرحوں میں اضافہ زیرِ نظر اسکیم میں صرف امپورٹ بِلوں کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے' دوسرے معاملات میں اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ لیکن اگر یہ صورت مجوّزینِ اسکیم کی نظر میں "غیر سُودی" ہے تو شاید وہ دوسرے معاملات میں بھی اس کے

اطلاق میں کوئی قباحت نہ سمجھیں۔

(۳) ملکی ہنڈیوں اور بلز آف ایکسچینج کو بھنانے کے لئے جو طریقہ اسکیم میں تجویز کیا گیا ہے، وہ بعینہٖ وہی ہے جو آج کل بینکوں میں رائج ہے، اس میں سرِمُو کوئی فرق نہیں کیا گیا، صرف اس کٹوتی کو جو پہلے کٹوتی (DISCOUNT) کہلاتی تھی، "مارک ڈاؤن" کا نام دے دیا گیا ہے، حالانکہ ہنڈیاں بھنانے کے لئے بھی ایک شرعی طریقِ کار اسلامی کونسل کی رپورٹ میں تجویز کیا گیا ہے۔

(۴) پھر اگر بالفرض اسکیم سے یہ شرعی قباحتیں دور کردی جائیں تب بھی اصولی مسئلہ یہ ہے کہ اس اسکیم میں شرکت اور مضاربت کو غیر سُودی بینکاری کی اصلی اساس قرار دینے کے بجائے "مارک اپ" کو اسکیم کی اصل بنیاد قرار دیا گیا ہے، اور غیر سُودی کاؤنٹرز کا بیشتر کاروبار اسی قانونی حیلے کے گِرد گھما دیا گیا ہے۔ اس وقت اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے جاری ہونے والا پندرہ روزہ اخبار "اسٹیٹ بینک نیوز" ہمارے سامنے ہے، اس کے یکم جنوری ۱۹۸۱ء کے شمارے میں ان مدّات اور اس طریق کار کی تفصیل دی گئی ہے جو غیر سُودی کاؤنٹرز میں اختیار کیا گیا ہے، اس تفصیل کے مطابق غیر سُودی کاؤنٹرز میں جمع ہونے والی رقوم سات مختلف مدّات میں استعمال کی جائیں گی، ان سات مدّات میں سے صرف ایک مَد میں شرکت یا مضاربت کے طریقے کو استعمال کیا گیا ہے، اور باقی تمام مدّات میں "مارک اپ" یا "مارک ڈاؤن" کا طریقہ تجویز کیا گیا ہے اور شرکت یا مضاربت والی مد کو استعمال کرنے کے لئے بھی کوئی نیا طریقِ کار وضع کرنے کے بجائے یہ صراحت کردی گئی ہے کہ یہ رقم مختلف کمپنیوں کے حصص این آئی ٹی یونٹس اور پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ خریدنے اور انویسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان اور بینکرز ایکویٹی کے ان معاملات میں استعمال کی جائے گی جو نفع و نقصان کی شرکت پر مبنی ہیں۔

اس طریقِ کار کا حاصل یہ ہے کہ ملک میں شرکت و مضاربت کے دائرے کو توسیع دینے کا کوئی پروگرام پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ جو ادارے اس وقت شرکت

یا مضاربت کے طریقے پر کام کررہے ہیں، غیر سودی کاؤنٹروں کی جتنی رقم ان اداروں میں لگ سکے گی وہ ان میں لگادی جائے گی اور باقی سارا کاروبار "مارک اپ" کی بنیاد پر ہوگا۔ اور معاملہ یہ نہیں ہوگا کہ بینک کا اصل کاروبار شرکت یا مضاربت کی بنیادی پر ہو، اور جزوی طور پر ضرورت کے وقت "مارک اپ" کا طریقہ اختیار کیا جائے بلکہ "مارک اپ" کاروبار کی اصل بنیاد ہوگا اور جزوی طور پر شرکت یا مضاربت کے طریقے کو بھی اختیار کرلیا جائے گا، جس کا حاصل یہ ہے کہ بینکاری کے نظام کو بدل کر اسے مثالی اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے کے بجائے چند حیلوں کے سہارے موجودہ نظام جوں کا توں باقی رہے گا۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر "بیع مؤجّل" کا مذکورہ بالا طریقہ شرعاً جائز ہے اور اُسے بعض مقامات پر اختیار کیا جاسکتا ہے تو پھر پورے نظامِ بینکاری کو اس کی بنیاد پر چلانے میں کیا قباحت ہے؟ اور اس کے جائز ہونے کے باوجود شرکت یا مضاربت ہی پر کیوں زور دیا جارہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "بیع مؤجّل" کا مذکورہ طریقہ جس میں کسی چیز کو ادھار بیچنے کی صورت میں اس کی قیمت بڑھادی جاتی ہے، اگرچہ ٹھیٹھ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے سُود میں داخل نہیں ہوتا، لیکن اس کے رواجِ عام سے سُود خور ذہنیت کی حوصلہ افزائی ہوسکتی ہے، اس لئے یہ کوئی پسندیدہ طریقِ کار نہیں ہے، اور اس کو پورے نظامِ بینکاری کی بنیاد بنالینا مندرجہ ذیل وجوہ سے درست نہیں :

(۱) ادھار بیچنے کی صورت میں قیمت بڑھا دینا خود فقہاء کرام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، اگرچہ اکثر فقہاء اسے جائز کہتے ہیں، لیکن چونکہ اس میں مدّت بڑھنے کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کی جاتی ہے، اور اس طرح اگرچہ یہ ٹھیٹھ معنی میں سُود نہ ہو، لیکن اس میں سُود کی مشابہت یا سُود کی خود غرضانہ ذہنیت ضرور موجود ہے، اس لئے بعض فقہاء نے اسے ناجائز بھی قرار دیا ہے، چنانچہ قاضی خان جیسے محقق حنفی

عالِم اسے سُود کے حکم میں شامل کرکے اسے حرام کہتے ہیں۔

اور ایسا معاملہ جس کے جواز میں فقہاء کرامؒ کا اختلاف ہو' اور جس میں سُود کی کم از کم مشابہت تو پائی ہی جاتی ہو' اسے شدید ضرورت کے مواقع پر بدرجۂ مجبوری اختیار کر لینے کی تو گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اس پر اربوں روپے کی سرمایہ کاری کی بنیاد کھڑی کر دینا اور اسے سرمایہ کاری کا ایک عام معمول بنا لینا کسی طرح درست نہیں۔

(۲) بینک بنیادی طور پر کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہوتا' بلکہ اس کا مقصد تجارت' صنعت اور زراعت میں سرمائے کی فراہمی ہوتا ہے' اگر ایک تجارتی ادارہ جو تجارت ہی کی غرض سے وجود میں آیا ہو اور جس کے پاس سامان تجارت موجود رہتا ہو وہ "بیع مؤجّل" کا مذکورہ طریقہ اختیار کرے تو اس کی نوعیت مختلف ہے' لیکن بینک جو نہ تجارتی ادارہ ہے اور نہ سامانِ تجارت اس کے پاس موجود رہتا ہے' وہ "بیعِ مؤجّل" کا یہ طریقہ اختیار کرے تو ایک کاغذی کاروائی کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی' جس کا مقصد سُود سے بچنے کے ایک حیلے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس قسم کے حیلوں کی شدید ضرورت کے مواقع پر تو گنجائش ہو سکتی ہے' لیکن سارا کاروبار ہی حیلہ سازی پر مبنی کر دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

(۳) جب ہم "غیر سُود بنکاری" کا نام لیتے ہیں اور بینکنگ کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کی بات کرتے ہیں تو اس کا منشاء یہ نہیں ہوتا کہ چند حیلوں کے ذریعے ہم موجودہ طریقِ کار کو ذرا سا تبدیل کرکے سارا نظام جُوں کا تُوں برقرار رکھیں' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ کاری کے پورے نظام کو تبدیل کرکے اسے اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالیں' جس کے اثرات تقسیمِ دولت کے نظام پر بھی مرتب ہوں۔ اور سرمایہ کاری کا اسلامی تصوّر یہ ہے کہ جو شخص کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کر رہا ہے وہ یا تو نفع کا مطالبہ نہ کرے' یا اگر نفع کا مطالبہ کرتا ہے تو نقصان

کے خطرے میں بھی شریک ہو' لہٰذا "غیر سُودی بینکاری" میں بنیادی طور پر اس تصوّر کا تحفظ ضروری ہے' اب اگر بینک کا سارا نظام "مارک اپ" کی بنیاد پر استوار کرلیا جائے تو سرمایہ کاری کا یہ بنیادی اسلامی تصوّر آخر کہاں اطلاق پذیر ہو گا؟ کیا ہم دنیا کو یہی باور کرائیں گے کہ مروجہ بینکنگ سسٹم کی خرابیوں پر پورے عالمِ اسلام میں جو شور مچ رہا تھا وہ صرف اس لئے تھا کہ "انٹرسٹ" کے بجائے "مارک اپ" کا حیلہ کیوں استعمال نہیں کیا جارہا؟ کیا اس حیلے کے ذریعے نظامِ تقسیمِ دولت کی مروّجہ خرابیوں کا کوئی ہزاروں حصّہ بھی کم ہوسکے گا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں' تو خدارا سوچئے کہ "مارک اپ" کا حیلہ استعمال کرکے ہم اسلامی نظامِ سرمایہ کاری کا کیا تصوّر دنیا کے سامنے پیش کررہے ہیں؟

اسی لئے ہمارے فقہاء کرامؒ نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ اِکّا دُکّا مواقع پر کسی قانونی تنگی کو دور کرنے کے لئے کوئی شرعی حیلہ اختیار کرلینے کی تو گنجائش ہے' لیکن ایسی حیلہ سازی جس سے مقاصدِ شریعت فوت ہوتے ہوں' اس کی قطعاً اجازت نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کو جس قسم کا نظامِ سرمایہ کاری مطلوب ہے وہ "مارک اپ" کے "میک اپ" سے حاصل نہیں ہو گا' اس کے لئے محض قانونی لیپ پوت کی نہیں' انقلابی فکر کی ضرورت ہے' اس غرض کے لئے کاروباری اداروں کو مجبور کرنا ہو گا کہ وہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر کام کریں' حسابات رکھنے کے طریقے بدلنے ہوں گے' ٹیکسوں اور بالخصوص انکم ٹیکس کے موجودہ قوانین کی ایسی اصلاح کرنی ہوگی جس سے یہ قوانین بددیانتی اور رشوت ستانی کی دعوت دینے کے بجائے لوگوں میں امانت ودیانت اور ملک وملّت کی خدمت کا جذبہ پیدا کریں' اور سب سے بڑھ کر اس ذہنیت کا خاتمہ کرنا ہو گا جو نقصان کا ادنیٰ خطرہ مول لئے بغیر اپنے ایک ایک روپے پر یقینی نفع کی طلبگار رہتی ہے۔

لہٰذا ہم اربابِ حکومت سے نہایت دردمندی کے ساتھ یہ اپیل کرتے ہیں کہ جب آپ نے معیشت کو سُود سے پاک کرنے کا مبارک ارادہ کیا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس ارادے کی نیک نیتی پر شبہ کیا جائے اور جب آپ اس سمت میں عملی اقدام بھی کرنے کے لئے تیار ہیں تو خدا کے لئے یہ کام نیم دلی سے نہ کیجئے' کیونکہ اس قسم کے انقلابی کاموں میں نیم دلی بعض اوقات انتہائی خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے بجائے آپ پوری جرأت وہمت اور پوری یکسوئی کے ساتھ وہ اقدامات کیجئے جو اس عظیم اور مقدّس کام کے لئے ضروری ہیں۔ ابھی غیر سُودی کاؤنٹروں کی محض ابتدا ہے اور اس مرحلے پر خرابیوں کی اصلاح نسبتاً آسان ہے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی جائیں گی' چنانچہ ہماری نظر میں فوری طور سے کرنے کے کام یہ ہیں :

(۱) غیر سُودی کاروبار کی اصل بنیاد "مارک اپ" کے بجائے نفع ونقصان کی تقسیم کو بنایا جائے۔

(۲) جن مقامات پر "مارک اپ" کا طریقہ باقی رکھنا ناگزیر ہو وہاں اس کی شرعی شرائط پوری کی جائیں' یعنی اول تو قیمت کی ادائیگی میں تاخیر پر "مارک اپ" کی شرحوں میں اضافے کی شرط کو فی الفور ختم کیا جائے' کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے اس بات کی وضاحت کی جائے کہ "مارک اپ" کی بنیاد پر فروخت کیا جانے والا سامان بینک کے قبضے میں لاکر فروخت کیا جائے گا۔

(۳) بل آف ایکسچینج بھنانے کے لئے "مارک ڈاؤن" کا طریقہ ختم کرکے وہ طریقِ کار اختیار کیا جائے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا ہے۔

(۴) ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اب تک "غیر سُودی کاؤنٹر" میں رقم رکھوانے والوں کو یہ نہیں بتایا گیا کہ منافع کی صورت میں ان کو ملنے والی شرح منافع کیا

ہوگی؟ یعنی یہ واضح نہیں ہے کہ بینک نفع کا کتنا حصّہ خود رکھے گا اور کتنا اکاؤنٹ ہولڈرز میں تقسیم کرے گا؟ اس کے بجائے غیر سُودی کاؤنٹرز کے پراسپکٹس میں یہ کہا گیا ہے کہ شرح کے تعیّن کلّی طور پر بینک کی صواب دید پر ہوگا۔ یہ صورت حال بھی شرعاً درست نہیں۔ جب اکاؤنٹ ہولڈرز کے ساتھ شرکت کا معاملہ کیا جارہا ہے تو یہ بات معاہدے کے وقت طے ہونی چاہئے کہ نفع کی صورت میں نفع کا کتنا متناسب حصّہ بینک کا ہوگا' اور کتنا اکاؤنٹ ہولڈر کا؟ ورنہ شرح منافع مجہول ہونے کی بناء پر اس معاملے کی شرعی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ جن حضرات نے اس نئے نظام کے تحت "غیر سُودی کاؤنٹروں" میں اپنے اکاؤنٹ کھلوائے ہیں' ان کو ملنے والے نفع کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ نیز جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے سُود سے بچنے کی توفیق بخشی ہے' وہ آئندہ ان کاؤنٹروں میں رقم رکھوائیں یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ "غیر سُودی کاؤنٹروں" کے کاروبار کی جو تفصیل ہم نے دیکھی ہے اس کی رو سے اس کاروبار کے تین حصّے ہیں :

(۱) پہلا حصّہ واضح طور پر جائز ہے۔ یعنی جو رقمیں عام کمپنیوں کے غیر ترجیحی حِصَص یا این آئی ٹی یونٹ خریدنے میں لگائی جائیں گی یا کسی اور ایسے کاروبار میں لگائی جائیں گی جو شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر رقمیں وصول کرتا ہو' ان پر حاصل ہونے والا منافع شرعاً حلال ہوگا۔

(۲) دوسرا حصّہ واضح طور پر ناجائز ہے۔ یعنی درآمدی بِلوں پر "مارک اپ" کا جو طریقہ اسکیم میں بتایا گیا ہے کہ وقتِ مقررہ پر ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں "مارک اپ" کی شرح بڑھتی چلی جائے گی۔ یہ واضح طور پر شرعاً ناجائز ہے' اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والا منافع شرعاً حلال نہیں ہوگا' اسی طرح ملکی بِلوں پر

"مارک ڈاؤن" کے نام سے کٹوتی کرکے جو نفع حاصل ہوگا' وہ بھی شرعاً درست نہیں ہوگا۔

(۳) تیسرا حصّہ مبہم اور غیر واضح ہے۔ یعنی در آمدی بِلوں کے علاوہ دوسری مدّات میں جہاں "مارک اپ" کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے' وہاں صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں' وہاں بھی نفع کے ناجائز ہونے کے دو احتمال ہیں' ایک یہ کہ یہاں بھی ادائیگی میں تاخیر ہونے پر "مارک اپ" کی شرح بڑھائی جاتی رہے' جس کی اسکیم میں نہ کوئی صراحت ہے نہ تردید۔ اور دوسرے یہ کہ بینک جو سامان "مارک اپ" کی بنیاد پر فروخت کررہا ہے' اس پر بینک کا قبضہ ہونے سے پہلے اُسے فروخت کردیا جائے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی صورت نہ ہوئی تو فقہی طور پر اس سے حاصل ہونے والے نفع کی گنجائش ہوگی۔

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہوئی کہ فی الحال ان "غیر سُودی کاؤنٹروں" کا کاروبار جائز اور ناجائز معاملات سے مخلوط ہے' اور اس کا کچھ حصّہ مشتبہ ہے۔ لہٰذا جب تک ان خامیوں کی اصلاح نہ ہو' اس سے حاصل ہونے والے منافع کو کلّی طور پر حلال نہیں کہا جاسکتا' اور مسلمانوں کو ایسے کاروبار میں حصّہ لینا درست نہیں۔

واللہ اعلم

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

فارن ایکس چینج

بیرر سرٹیفکیٹس کا شرعی حکم

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

''فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ'' جو حکومت جاری کرتی ہے، اس کے بارے میں ایک صاحب نے شرعی مسئلہ معلوم کرنے کے لئے دارالافتاء دارالعلوم کراچی میں ایک استفتاء بھیجا، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے اس استفتاء کا تفصیل جواب تحریر فرمایا۔ جو پیش خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اور حضرت مولانا مد ظلہم کی عمر میں اور صحت میں برکت عطاء فرمائے، آمین۔

میمن اسلامک پبلشرز

فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ
کا
شرعی حکم

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں کہ جو لوگ بیرونِ ملک رہتے ہیں اور اپنا زرِ مبادلہ باہر سے لے کر آتے ہیں۔ ان کے لئے حکومت نے "فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ" کے نام سے ایک اسکیم جاری کی ہے جس کے ذریعہ ان کو باہر سے لائے ہوئے زرِ مبادلہ کے عوض یہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں۔ اور اس کا حاملِ اس کو اسٹاک ایکسچینج میں بھی نفع پر فروخت کرسکتا ہے۔ اور خود ایک پاکستانی بینک بھی ایک سال کے بعد سو روپے پر ۱۴/۵۰ روپے مزید نفع کے ساتھ اور دو سال کے بعد ۳۱ روپے اور تین سال کے بعد ۵۲ روپے سود یا نفع کے ساتھ فروخت کرسکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو اسی کے ذریعہ بوقتِ ضرورت زرِ مبادلہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔

ان سرٹیفکیٹ کا خریدنا اور ان پر نفع حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

◆◆◆◆◆◆◆◆

الجواب

حامداً و مصلّیا

فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ کے بارے میں تحقیق سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ جو لوگ پاکستان سے باہر ملازمت کرتے ہیں وہ اگر زرِمبادلہ پاکستان لے کر آئیں تو حکومت کا قانون یہ ہے کہ وہ بیرونی زرِمبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرائیں اور اس کے بدلے حکومت کے طے کردہ نرخ کے مطابق پاکستانی روپیہ وصول کریں۔ پاکستان میں رہتے ہوئے زرِمبادلہ اپنے پاس رکھنا قانوناً جائز نہیں۔ اور جب ایک مرتبہ یہ زرِمبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرادیا جائے تو اس کے بعد کسی وقت اس کو واپس لینا بھی قانوناً ممکن نہیں۔ اب حکومت نے یہ فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹ اس مقصد سے جاری کئے ہیں کہ جو شخص باہر سے زرِمبادلہ لاکر ان کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لے تو اس کو تین فوائد حاصل ہوتے ہیں :-

پہلا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو دکھا کر اس کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کر سکتا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سال بھر یہ سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھے تو وہ ساڑھے بارہ فیصد نفع کے ساتھ پاکستانی روپیہ میں بُھنا سکتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ سال گزرنے سے پہلے یا کسی بھی وقت وہ اس کو بازارِ حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں جس قیمت پر چاہے فروخت کرسکتا ہے۔

چونکہ اس سرٹیفکیٹ کی وجہ سے اس کے حامِل کو زرِمبادلہ حاصل کرنے کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے اس لئے عام طور پر اسٹاک ایکسچنج میں لوگ اسے زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ مثلاً سو روپیہ کا سرٹیفکیٹ ایک سو دس روپیہ میں بِک سکتا ہے۔

سرٹیفکیٹ کو دیکھنے اور اس کے متعلق مطبوعہ معلومات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ سرٹیفکیٹ غیر ملکی زرِمبادلہ کی رسید نہیں' بلکہ اس پاکستانی روپیہ کی رسید ہے جو کسی باہر سے آنے والے کو زرِمبادلہ حکومت کے حوالہ کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام پاکستانی روپے یا اس کی نمائندگی کرنے والے تمسّکات کی بنیاد پر زرِمبادلہ حاصل کرنے کا کوئی استحقاق نہیں ہوتا' لیکن اس سرٹیفکیٹ کے حامِل کو زرِمبادلہ کے حصول کا استحقاق حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا فقہی اعتبار سے اس کی صورت یہ بنی کہ :-

حکومت نے باہر سے آنے والا زرِمبادلہ پاکستانی روپیہ کے عوض میں خرید لیا' لیکن یہ پاکستانی روپیہ فوراً ادا کرنے کے بجائے اسے اپنے ذمّے میں دَین بنا لیا اور اس دَین کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ اور اس کے حامِل کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہے تو یہ دَین اپنے اصل پاکستانی روپے کی شکل میں وصول کرے یا اگر چاہے تو ادائیگی کے دن کی قیمت کے لحاظ سے زرِمبادلہ کی شکل میں وصول کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ' حامل کے اس پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے کہ جو حکومت کے ذمّہ دَین ہے۔ اب اگر حکومت ایک سال کے بعد یہ سو روپے کا وثیقہ ایک سو ساڑھے بارہ روپیہ میں لیتی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ دَین پر ساڑھے بارہ فیصد زیادتی ادا کر رہی ہے جو شرعاً واضح طور پر سُود ہے ______ اسی طرح اگر اس سرٹیفکیٹ کا حامِل یہ وثیقہ بازارِ حصص میں اس کی اصل قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے تو اس کے معنیٰ بھی یہ ہوئے کہ وہ اپنا دَین زیادہ قیمت پر دوسرے کو

فروخت کر رہا ہے اور یہ معاملہ بھی سُود ہونے کی بنا پر ناجائز ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ سرٹیفکیٹ غیر ملکی زرِمبادلہ کی رسید ہے اور اس وجہ سے اس کو پاکستانی روپیہ میں کسی بھی طے شدہ نرخ پر فروخت کرنا جائز ہونا چاہئے ــــــــ اس لئے کہ یہ سرٹیفکیٹ غیر ملکی زرِمبادلہ کی رسید نہیں ہے جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ پر غیر ملکی زرِمبادلہ کے بجائے صراحۃً پاکستانی روپے کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعہ جب کبھی زرِمبادلہ حاصل کیا جائے تو اتنا زرِمبادلہ نہیں ملے گا جس کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل ہوا تھا۔ بلکہ تبادلہ کے دن، غیر ملکی زرِمبادلہ کے نرخ کے مطابق زرِمبادلہ دیا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے پچیس (۲۵) سعودی ریال دے کر سو روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور چھ ماہ کے بعد وہ اس سرٹیفکیٹ کے بدلے دوبارہ سعودی ریال حاصل کرنا چاہتا ہے جبکہ چھ ماہ کے بعد سعودی ریال مہنگا ہو چکا ہے، تو اسے اتنے سعودی ریال دیئے جائیں گے جتنے اس روز پاکستانی سو روپے میں حاصل ہوتے ہوں۔ مثلاً اس دن کی شرح تبادلہ اگر ۲۳ ریال ہو تو اسے اس سرٹیفکیٹ کے ذریعہ ۲۳ ریال ہی حاصل ہوں گے۔ پس یہ واضح دلیل ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ، سعودی ریال کا وثیقہ نہیں بلکہ پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے۔

لہٰذا اس سرٹیفکیٹ کو اس بنا پر خریدنا کہ اسے زیادہ قیمت پر اسٹاک ایکسچینج میں بیچ دیا جائے گا یا سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد نفع حاصل کیا جائے گا، سُودی معاملہ ہونے کی بناء پر قطعاً ناجائز و حرام ہے، البتہ اگر کوئی شخص اس غرض سے سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقتِ ضرورت اس کے ذریعہ زرِمبادلہ حاصل ہو سکے اور اسے اسٹاک ایکس چینج میں فروخت کرنے یا حکومت سے اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش

ہے، لیکن خریدنے کے بعد اسے زیادہ قیمت پر بیچنا یا اس پر حکومت سے منافع حاصل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

واللہ اعلم

احقر
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
دارالافتاء دارالعلوم کراچی۔۱۴
۲۲-۸-۱۴۰۸ھ

++++++++

کچھ شبہات
اور
ان کا جواب

"فارن ایکس چینج بیرر سرٹیفکیٹ" کے بارے میں "البلاغ" میں جب یہ مندرجہ بالا سوال اور جواب شائع ہوئے تو اس پر ایک صاحب کا تفصیلی خط موصول ہوا۔ جس کا تفصیلی جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا' وہ خط اور اس کا جواب ذیل میں پیشِ خدمت ہے۔

معظّم و محترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب۔ السلام علیکم!

گزشتہ ایک سال سے نجیب الحق صدیقی صاحب کی کرم فرمائی کی وجہ سے "البلاغ" زیرِ مطالعہ ہے' آپ کے مضامین بہت اشتیاق سے پڑھتا ہوں اور روز بروز آپ کی تبحّر علمی' زورِ قلم اور اندازِ تحریر کا مدّاح ہوتا جارہا ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔

شوال المکرم سنہ ۱۴۰۸ ہجری یعنی جون سنہ ۱۹۸۸ء کے "البلاغ میں فارن کرنسی سرٹیفکیٹ" کے بارے میں جنابِ والا کی تحقیق اور رائے نظر سے گزری۔ اس سلسلے میں کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں :-

○ یہ مفروضہ کہ ہر پاکستانی کو وطن واپسی پر سارا فارن کرنسی حکومت کے پاس جمع کرانا ہوتا ہے درست نہیں۔ عرصہ دراز سے حکومتِ پاکستان نے یہ اجازت دی ہوئی تھی کہ واپس آنے والے پاکستانی چھ ماہ تک غیر ملکی زرِ مبادلہ اپنے پاس فارن کرنسی اکاؤنٹ میں رکھ سکتے ہیں۔ پھر سنہ ۱۹۸۵ء کے اواخر میں یہ مدّت بڑھا کر تین سال کردی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گزشتہ سال جب فارن کرنسی سرٹیفکیٹ جاری کئے گئے اس وقت خریدنے والے سارے حضرات یا بیشتر حضرات قانوناً اس بات کے مجاز تھے کہ حکومت کو زرِ مبادلہ نہ دیں اور اپنے پاس ہی رکھیں اور جن لوگوں نے یہ سرٹیفکیٹ خریدے ان کے پیش نظر یا تو اور جگہوں سے زیادہ ملنے والی منافع کی شرح تھی یا وہ اپنے سرٹیفکیٹ کو اسٹاک ایکس چینج میں فروخت کرکے حکومت کی مقرر کردہ شرح تبادلہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

○ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ "سرٹیفکیٹ کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کرسکتا ہے"۔ یہ کچھ حد تک صحیح ہے کیونکہ حامل کو یہ کرنسی پاکستان سے باہر ہی ملے گی، لیکن اگر وہ اس سے پاکستان میں فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولنا چاہے گا تو اسے اس بات کی اجازت نہ ہوگی۔ البتہ وہ حامل جس کا پہلے سے فارن کرنسی

اکاؤنٹ موجود ہے وہ سرٹیفکیٹ اس اکاؤنٹ میں جمع کرا سکتا ہے۔

○ گوکہ یہ درست ہے کہ یہ حکومت باہر سے آنے والا زرمبادلہ پاکستانی روپیہ کے عوض خرید کر فوراً ادا کرنے کے بجائے اسے اپنے ذمے دَین بناتی ہے لیکن فروخت کرنے والا صرف اس لئے حال کے بجائے مستقبل کے روپے میں (جو کہ افراط زر کی وجہ سے روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے) اور حقیقی شرح تبادلہ سے کم لینے کو تیار ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں زرِمبادلہ لینے کا استحقاق برقرار رکھتا ہے۔ ماہرین معاشیات کے مطابق صرف اور صرف (FLOATING RAK) ہی کسی کرنسی کی حقیقی قیمت تبادلہ ہوتا ہے۔ حکومتوں کے مقرر کردہ ریٹ کرنسی کی صحیح (WORTH) یعنی (INTRINSIC VALUE) کو (REFLECT) نہیں کرتے۔ اب اگر حکومت مصنوعی طور پر فارن کرنسی کے بدلے کم قیمت دے گی تو بازار میں اس پر (PREMIUM) زیادہ ہو گا۔ مثال کے طور پر آج حکومت زبردستی پر اُتر آئے اور ڈالر کی قیمت دس روپیہ طے کردے تو مارکیٹ میں ڈالر دس فیصد (موجودہ) (PREMIUM) کے بجائے نوّے یا سو فیصد پریمیم پر بِکے گا جو اس کی صحیح قیمت ہے۔ میں اس ضمن میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر جب حکومت نے ڈالر کی شرح تبادلہ 14.75 روپیہ مقرر کی ہوئی تھی' ڈالر بازار میں چودہ روپے کا ملتا تھا اور حکومت خود چودہ روپے کی قیمت کو بلاواسطہ بونس واؤچر اسکیم کے ذریعے (SUPPORT) کر رہی تھی۔ مختلف

کرنسیوں میں ایک دوسرے کے مقابلے میں اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے جو کہ ان ممالک میں افراطِ زر اور شرحِ سُود کا ایک (FUNCTION) ہے لیکن جن ملکوں میں کرنسی کی نقل وحرکت پر کوئی پابندی نہیں یا جہاں حکومت مصنوعی طور پر شرحِ تبادلہ طے نہیں کرتی وہاں مارکیٹ کی شرح اور حکومت کی شرحِ تبادلہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ دونوں شرحیں مقامی کرنسی کی (INTRINSIC VALUE) کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی حکومت کو (جوکہ اسلامی حکومت بھی نہیں) اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ عوام کو ان کی غیر ممالک میں کمائی کی کم قیمت دے (جبکہ کسٹم، پولیس، عدالتیں، انکم ٹیکس غرض ہر ادارہ انہیں لوٹنے پر تیار بیٹھا رہتا ہے) اور اگر وہ کم قیمت دیتی ہے تو عوام اس بات کے کس حد تک مجاز ہیں کہ وہ اپنے زرِمبادلہ کی صحیح قیمت (INTRINSIC VALUE) بازار سے حاصل کریں، خصوصاً جبکہ اسی حکومت نے زرمبادلہ کی بازار میں فروخت قانونی قرار دی ہوئی ہے؟

○ دورانِ تحقیق جنابِ والا کے علم میں یہ بات ضرور آئی ہو گی کہ حکومت پاکستان کو ہنڈی کے کاروبار سے ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا تھا کیونکہ لوگ حکومت کی مصنوعی شرح کو چھوڑ کر پرائیویٹ اداروں کے ذریعے رقومات کی ترسیل کر رہے تھے۔ بیرر فارن ایکس چینج سرٹیفکیٹ جاری کر کے اور ان کی اسٹاک ایکس چینج میں فروخت کو قانونی بنا کر دراصل

حکومت نے ہنڈی کے کاروبار پر ضرب لگائی ہے اور اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ لوگ زرِ مبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کر سکیں (مجھے ابلاغ صرف ایک سال سے ہی مل رہا ہے اس لئے میرے علم میں نہیں کہ ہنڈی کے کاروبار کے سلسلے میں فقہی نقطۂ نظر کیا ہے۔ براہ کرم اس سے بھی آگاہ فرمائیے)۔

ان باتوں کے پیشِ نظر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ جائز ہے فارن کرنسی کی حقیقی قیمت ہونے کی وجہ سے؟ بالکل اسی طرح جس طرح کمپنیوں کے حصص وغیرہ بازار میں (PAR VALUE) سے زیادہ یا کم اپنی (INTRINSIC VALUE) کی بناء پر فروخت ہوتے ہیں۔ البتہ اس بات سے مکمل اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت کی طرف سے جو ساڑھے بارہ فیصد منافع حاصل کیا جائے گا وہ سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز و حرام ہوگا۔

○ آخری پیراگراف میں جنابِ والا نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس غرض سے یہ سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقت ضرورت اس کے ذریعے زرِ مبادلہ حاصل ہو سکے تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے۔ یہ اجازت بھی عام آدمی کے لئے مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص پاکستان واپسی پر صرف اور صرف اسی غرض سے یہ سرٹیفکیٹ لیتا ہے کہ بوقتِ ضرورت اس سے زرِ مبادلہ حاصل ہو سکے گا لیکن تین سال بعد جب اس کے بدلے زرِ مبادلہ لینا چاہتا ہے تو ایک لاکھ روپیہ کے سرٹیفکیٹ کی (SURRENDER VALUE) ایک لاکھ باون ہزار روپیہ ہو جانے کی وجہ سے اسے زیادہ زرِ مبادلہ ملتا

ہے۔ یہ باون ہزار یقیناً سُود ہے اور اس شخص کے پاس اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ حکومت یہ رقم اُسے زبردستی دیگی' ایسی صورت میں کیا وہ سُود وصول کرنے کا گناہگار نہ ہوگا؟ بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپیہ خیرات کردے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی' اتنی لے کرباقی خیرات میں دیدے' لیکن ایسی صورت میں روپیہ کی قیمت میں کمی (EXCHANGE LOSS) سُود سے پوری ہوگی۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

جواب کا منتظر

مخلص
منتسم مسعود

✦✦✦✦✦✦✦✦

الجواب

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدّ ظلہم

محترمی و مکرمی جناب منتسم مسعود صاحب۔ حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گرامی نامہ ملا۔ جواب کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی، وہ پچھلے دنوں مفقود رہی، اس لئے جواب میں قدرے تاخیر ہو گئی۔ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے جس تفصیل کے ساتھ فارن ایکس چینج بیرر سرٹیفکیٹ کا پورا پس منظر بیان فرمایا ہے، اس پر میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں، باہر سے زرِمبادلہ پاکستان منتقل کرنے والوں پر جو پابندیاں قانوناً عائد ہیں، اور جن کی وجہ سے وہ

مشکلات کا شکار ہیں، ان کا کچھ اندازہ پہلے بھی تھا، آپ کی مفصّل تشریح سے اور زیادہ ہوگیا۔ لیکن ان تمام باتوں سے فارن ایکس چینج بیرر سرٹیفکیٹ کی موجودہ شرعی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان مشکلات کا اصل حل تو یہ ہے کہ حکومت زرِمبادلہ بازاری نرخ پر حاصل کرے۔ یا پھر شرعاً اس بات کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی کہ حکومت ان سرٹیفکیٹس کو پاکستانی روپے کا نہیں، بلکہ اُس زرِمبادلہ کا نمائندہ قرار دے جو حکومت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اگر یہ سرٹیفکیٹ زرِمبادلہ کا نمائندہ ہوتو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت کے ذمّے زرِمبادلہ دَین ہے۔ اب اس کے بعد حکومت کسی بھی آئندہ مرحلے پر اسے باہمی رضامندی سے طے شدہ قیمت پر خرید سکتی ہے، اور یہ قیمت بازاری قیمت سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ نیز متبادل طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ سرٹیفکیٹ کا حامل بازار میں اُسے بطورِ حوالہ دے کر اس کے ذریعے زیادہ پاکستانی روپے حاصل کرلے۔

لیکن شرعاً دُشواری یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو زرِمبادلہ کے بجائے پاکستانی روپے کا وثیقہ قرار دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے اسی وقت زرِمبادلہ کو سرکاری نرخ پر پاکستانی روپے سے خریدلیا ہے، اور اس پاکستانی روپے کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ جاری کردیا ہے۔ اب یہ زرِمبادلہ اس شخص کی ملکیت میں نہیں رہا جس کی بنیاد پر مذکورہ دو طریقوں سے اس کی بیع ممکن ہوتی۔

رہا یہ کہنا کہ موجودہ صورت میں اسٹاک ایکس چینج کے اندر جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ زرِمبادلہ کی حقیقی قیمت ہونے کی بنا پر جائز ہونا چاہئے، سو یہ توجیہ دو وجہ سے ممکن نہیں ہے۔

اول تو اس لئے کہ وہ زرِمبادلہ کی نہیں، بلکہ پاکستانی روپے کی قیمت ہے، کیونکہ سرٹیفکیٹ پاکستانی روپے ہی کا وثیقہ ہے، اور روپوں کے ہم جنس تبادلے میں کمی بیشی جائز نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ پر بازار میں جو دس یا بارہ فیصد منافع ملتا ہے، نہ وہ کلیۃً زرِ مبادلہ کے سرکاری اور بازاری نرخوں کے فرق پر مبنی ہوتا ہے اور نہ اس فرق کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر یہ منافع دس یا بارہ فیصد ہے تو سرکاری اور بازاری نرخوں کا فرق عموماً اس سے کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے حامل کو ہنڈی کے ذریعے زرِ مبادلہ بھیجنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے

____ اس لحاظ سے جناب کا یہ فرمانا احقر کے نزدیک درست نہیں ہے کہ حکومت کی طرف سے کھلے بازار میں اس سرٹیفکیٹ کی فروخت کی اجازت بازار سے زرِ مبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کرنے کی اجازت کے مترادف ہے۔

اس کے برخلاف صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت نے بازار میں زرِ مبادلہ کو اس کی بازاری قیمت پر بیچنا تو ممنوع قرار دے رکھا ہے، لیکن اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ زرِ مبادلہ سرکار کو کم قیمت پر فروخت کر کے اس قیمت کی بنیاد پر سُودی معاملہ کر کے اپنے اس نقصان کی تلافی کر سکتے ہو۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ غیر ملکی کرنسی کا سرکاری نرخ اُس کے بازاری نرخ سے بہت کم مقرر کرنا، جب کہ کھلے بازار میں زرِ مبادلہ کی خرید و فروخت بھی قانوناً ممنوع ہو، ایک طرح کا ظلم ہے جس کی عام حالات میں ہمیں شرعاً اجازت نہیں ہے۔ لیکن اگر حکومت ایک غلط کام کر رہی ہو تو اس سے سُودی معاملے کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ وہ بدستور ناجائز ہی رہے گا۔

البتہ چونکہ حکومت نے سرٹیفکیٹ کے حامل سے زرِ مبادلہ جبراً کم قیمت پر خریدا ہے اس لئے اگر حکومت اسے سال بھر کے بعد سرٹیفکیٹ پر بارہ فیصد منافع دیتی ہے تو اگرچہ یہ منافع سُود ہے، لیکن اس میں سے اتنی رقم رکھ لینے کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن زرِ مبادلہ کے سرکاری نرخ اور بازاری نرخ کے فرق کے برابر ہو۔ مثلاً کسی نے ایک سو ڈالر دیکر =/۱۷۰۰ پاکستانی روپے کا

سرٹیفکیٹ حاصل کیا' جب کہ اس کی بازاری قیمت =/۱۷۵۰ روپے تھی۔ اس میں اس کو پچاس روپے کا نقصان سرکاری جبر کی وجہ سے ہوا جس پر وہ دل سے راضی نہیں تھا' اب اگر سال بھر کے بعد حکومت اسے سرٹیفکیٹ کے بدلے =/۲۴۰۰ دیتی ہے' تو ان روپوں میں سے =/۵۰ روپے اگر وہ ذاتی نقصان کی تلافی کے طور پر وصول کرلے تو شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے' لیکن باقی روپے اس کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت پھر بھی نہیں ہوگی۔

لیکن اگر اسٹاک ایکس چینج میں سرٹیفکیٹ بیچ کر بارہ فیصد منافع حاصل ہو تو اس میں سے یہ پچاس روپے وصول کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں یہ پچاس روپے کا نقصان اُسی فریق سے وصول کیا جارہا ہے جس نے یہ نقصان پہنچایا تھا' اور دوسری صورت میں منافع دینے والا فریق وہ نہیں ہے جس نے نقصان پہنچایا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر

الف کسی ناجائز طریقے سے

ب کے =/۵۰ روپے غصب کرلے پھر وہی

الف سُود کے نام سے اس کو اپنی طرف سے =/۵۰ روپے ادا کرے تو

ب کے لئے یہ =/۵۰ روپے بحیثیتِ سُود نہیں' بلکہ بحیثیتِ تلافیٔ نقصان لینے کی گنجائش ہے' لیکن اگر

ج اس کو اس کے کسی قرض پر =/۵۰ روپے سُود دے تو اس کا استعمال اس کے لئے اس بناء پر جائز نہیں ہوگا کہ

الف نے اسے =/۵۰ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔

اس تفصیل سے آپ کے آخری سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے' اور وہ یہ اگر کوئی شخص صرف زرِ مبادلہ وصول کرنے کے حق کا تحفّظ کرنے کے لئے فارن

ایکس چینج بیرر سرٹیفکیٹ خریدتا ہے اور سال بھر کے بعد اس پر حکومت سُود دیتی ہے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ سرٹیفکیٹ کی اصل قیمت (FACE VALUE) اپنے استعمال میں لاسکتا ہے' اور اس سے زائد اتنی رقم لینے کی بھی گنجائش ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن (نہ کہ منافع وصول ہونے کے دن) اس کے ادا کردہ زرِ مبادلہ کی بازاری قیمت اور سرکاری نرخ کے فرق کے برابر ہو' لیکن اس سے زیادہ جتنی رقم حکومت کی طرف سے ملے' وہ یقیناً سُود ہے' اور اسے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں' بلکہ اس سے اپنی جان چھڑانے کی نیت سے اسے صدقہ کردینا واجب ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آپ نے جو لکھا ہے کہ :

"بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپیہ خیرات کردے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی' اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے"۔

تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی' اتنی لینا درست نہیں' بلکہ اس فارن کرنسی کے دیتے وقت اس کی بازاری قیمت سرٹیفکیٹ کی اصلی قیمت (FACE VALUE) سے جتنی زائد تھی' صرف اتنی وصول کرنے کی گنجائش ہے' اس سے زائد نہیں' اور احتیاط تو بلاشبہ اسی میں ہے کہ اصلی قیمت (FACE VALUE) پاس رکھ کر باقی سب صدقہ کردی جائے۔

یہ واضح کرنا بھی مناسب ہے کہ اس رقم کو خیرات کرنے کا مطلب رفاہی کاموں میں لگانا نہیں' بلکہ مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنا کر صدقہ کرنا ہے۔ البتہ یہ رقم اپنے باپ' بیٹے' شوہر اور بیوی کو بھی دی جاسکتی ہے' بشرطیکہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں۔

ایک اور بات آخر میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ آپ نے ایک جگہ افراطِ زر کی بنیاد پر روپے کی قیمت میں کمی کا بھی ذکر فرمایا ہے' جس سے ایسا لگتا ہے کہ ادائیگیوں

میں روپے کی قیمت میں کمی کا بھی لحاظ ہونا چاہئے۔ شرعی نقطۂ نظر سے قرض اور دیگر واجبات اور دُیون کے لین دین میں افراطِ زر کی شرح میں تبدیلی کا اعتبار نہیں ہوتا، اس لئے ادائیگی کے وقت اس پہلو کو مدّنظر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق احقر نے اپنے ایک مفصّل مقالے میں کی ہے جو انشاء اللہ عنقریب "البلاغ" میں شائع ہو جائے گا۔

دُعاء میں یاد رکھنے کی درخواست ہے

والسلام

احقر

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۳-۱۲-۱۴۰۸ھ

✦✦✦✦✦✦✦✦

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

ووٹ کی اسلامی حیثیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

فہرست مضامین

مضامین | صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتخابات میں
ووٹ کی اسلامی حیثیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اما بعد!

موجودہ دور کی گندی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کردیا ہے کہ ان ساتھ مکروفریب' جھوٹ' رشوت اور دغابازی کا تصوّر لازِم ذات ہوکر رہ گیا ہے' اسی لئے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب ہی نہیں سمجھتے۔ اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین ومذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے معاشرے کے اندر چند در چند غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں' یہاں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

اپنے ووٹ کو استعمال کرنا شرعاً ضروری ہے

پہلی غلط فہمی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے' اس کا منشاء اتنا بُرا نہیں' لیکن نتائج بہت برے ہیں' وہ غلط فہمی یہ ہے کہ

آج کی سیاست مکر وفریب کا دوسرا نام بن چکی ہے' اس لئے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصّہ لینا چاہیے' نہ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہئے اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرخشے میں پڑنا چاہئے۔

یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو' لیکن بہرحال غلط اور ملک وملّت کے لئے سخت مضر ہے۔ ماضی میں ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے' لیکن جب تک کچھ صاف' ستھرے لوگ اسے پاک کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھیں گے اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائیگا۔ اور پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی۔ لہٰذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سیاست کی اس گندگی کو دور دور سے بُرا کہا جاتا رہے بلکہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو مسلسل اسے گندا کر رہے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

﴿ الناس إذا راؤ الظالم فلم يا خذوا على يديه أوشك أن يعمهم الله بعقاب ﴾

(جمع الفوائد صفحہ ۵۱ جلد ۲ : بحوالہ ابوداؤد وترمذی)

"اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں"۔

اگر آپ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے' اور انتخابات میں سرگرم حصّہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے یہ آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ

کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

بہت سے دین دار لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا نقصان ہو گا؟ لیکن سنیے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ من أُذِلّ عندهٗ مؤمن فلم ینصره وهو یقدر علی أن ینصرهٗ أذله الله علی رؤوس الخلائق ﴾ (ایضاً صفحه ۵۱، جلد ۲)

"جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جارہا ہو اور وہ اس کی مدد کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے میدان میں) برسرِعام رسوا کرے گا۔

ووٹ نہ دینا حرام ہے

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے۔ اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ آثِمٌ قَلْبُه ﴾

"اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی کو چھپائے، اس کا دل گناہ گار ہے"۔

اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ مَنْ كَتَمَ شَهَادَةً اِذَا دُعِيَ اِلَيْهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّوْرِ ﴾

(جمع الفوائد بحواله طبرانی صفحه ٦٢ جلد ١)

"جس کسی کو شہادت کے لئے بلایا جائے' پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا"۔

بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا یہ فریضہ ادا کردے' اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ کرے' حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

﴿ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِخَیْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِیْ یَاْتِیْ بِشَهَادَتِهٖ قَبْلَ اَنْ یُّسْاَلَهَا ﴾ (ایضاً صفحه ٢٦١ جلد ١ بحواله مالك و مسلم وغیره)

"کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص ہے جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کردے"۔

ووٹ بھی بلاشبہ ایک شہادت ہے' قرآن و سنّت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں' لہٰذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں' اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف' دیندار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسو ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ یہ پورا میدان' شریروں' فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں' ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے' اگر دین دار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہو کر رہ جائیں تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا' کیوں

کہ اس کے ذمّہ دار وہ خود ہوں گے اور ان کے حکّام کا سارا عذاب وثواب ان ہی کی گردن پر ہوگا اور خود ان کی آنے والی نسلیں اس شرّوفساد سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

انتخابات خالص دنیاوی معاملہ نہیں

انتخابات کے سلسلے میں ایک دوسری غلط فہمی پہلی سے زیادہ سنگین ہے' چونکہ دین کو لوگوں نے صرف نماز' روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے' اس لئے سیاست و معیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصوّر کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں نماز' روزے اور وظائف واوراد تک کے پابند ہوتے ہیں' لیکن نہ انہیں خرید وفروخت کے معاملات میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے' نہ وہ نکاح وطلاق اور برادریوں کے تعلّقات میں دین کے احکام کی کوئی پروا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی معاملہ سمجھ کر اس میں مختلف قسم کی بدعنوانیوں کو گوارا کر لیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے' چنانچہ بہت سے لوگ اپنا ووٹ اپنی دیانتدارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلّقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں' حالانکہ وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جارہا ہے وہ اس کا اہل نہیں' یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس کا زیادہ حق دار ہے' لیکن صرف دوستی کے تعلق' برادری کے رشتے' یا ظاہری لحاظ ومرّوت سے متأثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کو غلط جگہ استعمال کر لیتے ہیں' اور کبھی خیال میں بھی نہیں آتا کہ شرعی ودینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ ووٹ ایک شہادت ہے اور شہادت کے بارے میں قرآنِ کریم کا ارشاد یہ ہے۔

﴿ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ﴾

''اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو، خواہ وہ شخص (جس کے خلاف بات کہی جارہی ہے) تمہارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو''۔

لہٰذا جب کسی شخص کے بارے میں ضمیر اور دیانت کا فیصلہ یہ ہو کہ جس شخص کو ووٹ دے رہے ہو وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے۔ یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے، تو اس وقت محض ذاتی تعلّقات کی بناء پر اسے ووٹ دے دینا ''جھوٹی گواہی'' کے ذیل میں آتا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں جھوٹی گواہی کی مذمّت اتنی شدّت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بُت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے :

﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ﴾

''پس تم پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے''۔

اور حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدّد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبرالکبائر میں شمار کر کے اس پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں اکبرالکبائر (بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤں؟ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی، جھوٹی بات! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ

گئے' اور "جھوٹی گواہی" کا لفظ بار بار ارشاد فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔

(بخاری ومسلم' جمع الفوائد صفحہ ۱۶۲ جلد ۲)

یہ وعیدیں تو صرف ووٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہیں جو محض ذاتی تعلّقات کی بناء پر دیا گیا ہو' اور روپے پیسے لے کر کسی نااہل کو ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے۔

لہٰذا ووٹ ڈالنے کے مسئلہ کو ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خالِص دنیوی مسئلہ ہے' اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے' اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی اس "شہادت" کا استعمال کس حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا ہے۔

نااہل کو ووٹ دینا شدید تر گناہ ہے

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نااہل کو ووٹ دینا گناہ ہے تو ہم کون سے پاکباز ہیں؟ ہم صبح سے لے کر شام تک بے شمار گناہوں میں ملوّث رہتے ہیں۔ اگر اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نفس وشیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے' اوّل تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی سوچا کرے تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا' اگر کوئی شخص تھوڑی سی گندگی میں ملوّث ہو جائے تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہئے نہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے۔

دوسری بات یہ ہے کہ گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بھی بڑا فرق ہے' جن گناہوں کے نتائج بد پوری قوم کو بھگتنے پڑیں' ان کا معاملہ پرائیویٹ گناہوں کے مقابلے میں

بہت سخت ہے۔ انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناونے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرات دو چار افراد سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس لئے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ و استغفار کرلینا بھی آسان ہے، اور ان کے معاف ہوجانے کی امید بھی ہروقت کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے برخلاف جس گناہ کا بُرا نتیجہ پورے ملک اور پوری قوم نے بھگتنا ہو، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، یہ تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آسکتا، اس لئے اگر کسی وقت انسان اس بد عملی سے آئندہ کے لئے توبہ کرلے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ بَرا ہونا بہت مشکل ہے، اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم ہے۔

اس حیثیت سے یہ گناہ چوری، ڈاکہ، زناکاری اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر ہے۔ اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام بیسیوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، مگر یہ سب گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق بخشے تو معاف بھی ہوسکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں بھی پھنسالیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھوں ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے ووٹ کی کیا حیثیت ہے؟ اگر وہ غلط استعمال بھی ہو جائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر کیا اثرانداز ہوسکتا ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اوّل تو اگر ہر شخص ووٹ ڈالتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی میں کوئی ایک ووٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہوسکے گا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ووٹوں کی گنتی کا جو نظام ہمارے یہاں رائج ہے اس میں صرف ایک ان پڑھ، جاہل شخص کا ووٹ بھی ملک وملّت کے لئے فیصلہ کن ہوسکتا ہے، اگر

ایک بے دین' بدعقیدہ اور بدکردار امیدوار کے بیلٹ بکس میں صرف ایک ووٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہوکر پوری قوم پر مسلّط ہو جائے گا۔ اس طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اور اَن پڑھ انسان کی معمولی سی غفلت' بھول چوک یا بددیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کرسکتی ہے۔ اس لئے مرّوجہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے اور یہ ہرفرد کا شرعی' اخلاقی' قومی اور ملّی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجّہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

انتخابی مہم کے دس مُنکرات

انتخابات کا ہنگامہ ہمارے معاشرے میں بے شمار گناہوں اور بد عنوانیوں کا ایسا طوفان لے کر آتا ہے جس کی ظلمت پورے ماحول پر چھا جاتی ہے' اور اس میں شریعت' اخلاق' شرافت اور مرّوت کی بنیادوں پر اتنی متواتر ضربیں لگتی ہیں کہ پورا ملک لرز کر رہ جاتا ہے ____ ان گناہوں اور بد عنوانیوں کا انتہائی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دلوں سے ان گناہوں کے گناہ ہونے کا احساس بھی مٹتا جا رہا ہے اور اقتدار طلبی کی اس اندھی دوڑ میں سب کچھ شیرِ مادر بن کر رہ گیا ہے' اور چونکہ معاشرے میں ان برائیوں کا چلن کسی روک ٹوک کے بغیر اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب کوئی ان بُرائیوں کے خلاف بولتا بھی نہیں' اس لئے ایسے حضرات کو بھی ان کے بُرا یا گناہ ہونے کا خیال ہی نہیں آتا' جن کی نیت جان بوجھ کر بُرائی کرنے کی نہیں ہوتی۔ لہٰذا آج کی محفل میں ایسی چند بُرائیوں کا ذکر اس جذبے سے کیا جا رہا ہے کہ جو اللہ کا بندہ ان سے بچ سکے وہ بچ جائے اور دوسرے حضرات کے دل میں کم از کم ان کے گناہ اور بُرائی ہونے کا احساس پیدا ہو جائے۔

(۱) انتخابات کے تعلق سے جو گناہ اور منکرات ہمارے ماحول میں پھیلے ہوئے ہیں' ان سب کی بنیادی جڑ تو اقتدار کی ہوس اور کسی منصب تک پہنچنے کی حرص ہے۔ جس کا جواز تلاش کرنے کے لئے بعض اوقات ملک وملّت کی خیرخواہی کی معصوم تاویل کرلی جاتی ہے۔ حالانکہ حکومت واقتدار کے بارے میں قرآن وسنّت کی ہدایات یہ ہیں کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے جس کی طرف لپکنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی جائے' بلکہ یہ دنیا وآخرت کی ذمّہ داری کا وہ جُوا ہے جسے

گردن پر رکھنے سے پہلے انسان کو لرزنا ضرور چاہئے' اور شدید مجبوری کے بغیر اپنے آپ کو اس آزمائش میں ڈالنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے نامزد کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے ایک جواب یہ بھی دیا کہ :

"ذمّہ داری کا طوق خطّاب کے خاندان میں بس ایک ہی شخص (یعنی خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے' میں اپنے بیٹے کے گلے کو اس سے گرانبار کرنا نہیں چاہتا۔

اگر کسی شخص کے دل میں واقعۃً اس گرانبار ذمّہ داری کا کماحقہ احساس ہو تو بے شک اس کا جائز ذرائع سے اقتدار تک پہنچنا ملک وملّت کی خیر خواہی کے جذبے سے ہوتا ہے جو اس کی ادا ادا سے جھلکتا ہے' اور اس کے نتیجے میں کبھی وہ خرابیاں' بدعنوانیاں اور گناہ وجود میں نہیں آتے جن کے زہریلے اثرات سے آج کی سیاسی فضا مسموم ہے۔

لیکن جب اقتدار کو ایک منفعت' ایک لذّت اور ایک مادّی مفاد سمجھ لیا جائے اور اسے حاصل کرنے کے لئے تن من دھن کی ساری طاقتیں لٹائی جانے لگیں تو یہ اقتدار کی وہ حرص ہے' جس کے بطن سے خیر وفلاح برآمد نہیں ہوسکتی' اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں' برائیوں' خود غرضیوں اور بدعنوانیوں کو جنم دے کر معاشرے میں شر اور فساد کو پھیلاتا ہے۔

(۲) اسی شر وفساد کا ایک حصّہ یہ ہے کہ ہماری انتخابی مہمّات میں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کو شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ اپنے مقابل کو چت کرکے اپنی فتح کا ہاتھ بلند کرنے کے لئے اُس پر بلا تحقیق ہر قسم کا الزام عائد کرنا حلال طیّب قرار پا چکا ہے' بلکہ یہ اس سیاسی جنگ کا لازمی حصّہ ہے جس کے بغیر سیاسی فتح کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بُرا ہو' لیکن اس پر کوئی ایسا الزام عائد کرنا ہرگز جائز نہیں ہے جس کی سچّائی کی مکمل تحقیق نہ ہو چکی ہو۔ لیکن انتخابی جلسوں کی شاید ہی کوئی تقریر اس قسم کے بلا تحقیق الزامات سے خالی ہوتی ہو جو بہتان کے گناہ کبیرہ میں داخل ہیں۔ پھر بعض اوقات اس بہتان طرازی کے لئے اتنی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کی جاتی ہے کہ وہ دشنام طرازی کا گناہ بھی سمیٹ لیتی ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کی جان' مال اور آبرو کو کعبۃُ اللہ سے زیادہ مقدّس قرار دیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی جان' مال یا آبرو پر ناروا حملہ کرنا (معاذاللہ) کعبے کو ڈھانے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے' لیکن انتخابی مہم کے جوش میں مدّمقابل کا کعبۂ آبرو گلی گلی میں ڈھایا جاتا ہے' اور اخباروں کے صفحات سے لے کر انتخابی جلسوں اور کارنر میٹنگز تک کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جو بہتان تراشی اور دشنام طرازی کی عفونت سے بدبودار نہ ہو۔

(۳) پھر چونکہ انتخابات کا موقع ایسا ہوتا ہے کہ کبھی امیدوار کے بارے میں حقائق منظرِ عام پر لانے کی واقعی ضرورت بھی ہوتی ہے' تاکہ عوام کو دھوکے اور نقصان سے بچایا جاسکے' اس لئے کسی امیدوار کے حقیقی اوصاف بیان کرنے کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے اوّل تو یہ ضروری ہے کہ کوئی بات ضروری تحقیق کے بغیر نہ کہی جائے' اور دیانت داری اور انصاف سے ہر حال میں کام لیا جائے' دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ ناگوار فریضہ صرف بقدرِ ضرورت ہی انجام دیا جائے' اسے محض مزے لینے اور مجلس آرائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے ورنہ اگر وہ بہتان نہ ہو' تب بھی غیبت کے اس گناہِ عظیم میں داخل ہے جسے قرآن کریم نے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کسی شخص نے حجّاج بن یوسف کی بُرائیاں بیان کرنی شروع کردیں۔ حجّاج کا ظلم وستم لوگوں میں مشہور تھا' لیکن

چونکہ اس مقام پر بُرائی کرنے کا کوئی صحیح مقصد یا فائدہ نہیں تھا' اس لئے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ :

"یہ غیبت ہے' اور اگر حجّاج نے بہت سے لوگوں پر ظلم کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہر شخص کے لئے اس کی غیبت حلال ہو گئی ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اگر حجاج سے بے گناہوں کے خون کا حساب لے گا تو اس کی ناروا غیبت کا بھی حساب لے گا"۔

(۴) دوسرں کی بُرائی اور ان پر الزام تراشی کے علاوہ انتخابات میں کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ منہ بھر بھر کر خود اپنی تعریف اور اپنی خدمات کا مبالغہ آمیز تذکرہ کیا جائے۔ یاد رکھئے : خودسنائی' نام و نمود اور دکھاوے کو مذہب واخلاق کے ہر نظام میں گناہ یا کم از کم بُرا ضرور سمجھا گیا ہے' لیکن ہماری انتخابی سیاست کے مذہب میں یہ عمل کسی قید و شرط کا پابند نہیں رہا۔

(۵) عوام کو ووٹ دینے پر مائل کرنے کے لئے یہ بھی لازمی سمجھ لیا گیا ہے کہ اُن سے سوچے سمجھے بغیر خوشنما وعدے کئے جائیں۔ وعدہ کرتے وقت اس بات سے بحث نہیں ہوتی کہ اُن کو پورا کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ کس طرح روبعمل لائے جاسکیں گے؟ مسئلہ صرف یہ ہے کہ وعدوں کے نیلام میں کس طرح دوسروں سے بڑھ چڑھ کر بولی لگائی جائے؟ _____ ہم برسرِ اقتدار آکر غریبوں کی قسمت بدل دیں گے' ہم پسماندہ علاقوں کو پیرس کا نمونہ بنا دیں گے' ہم ہر ضلع میں ایک ہائی کورٹ قائم کردیں گے' ہم غُربت اور جہالت کا خاتمہ کردیں گے؟ _____ اس قسم کے بلند وبانگ دعوے اخباری بیانات سے لیکر تقریروں تک ہر جگہ سنائی دیتے ہیں' اور ان جھوٹے وعدوں اور دعووں کے ذریعے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۶) جلسے جلوس اور اشتہار بھی انتخابی سرگرمیوں کا ایک لازمی حصّہ ہیں، اگر یہ جلسے جلوس اخلاق و شرافت کی حدود میں ہوں تو ناجائز بھی نہیں، لیکن جلسوں جلوسوں میں غنڈہ گردی روزمرّہ کا معمول بن چکی ہے جس کے نزدیک سیاسی حریفوں کی جان، مال اور آبرو کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ چنانچہ جس کا داؤ چل جائے وہ دوسروں کو زک پہنچانے میں کسر نہیں چھوڑتا۔

(۷) پھر بعض اوقات انتخابی جلسے جلوس ایسے عام اور مصروف راستوں پر منعقد کئے جاتے ہیں جن کی وجہ سے شہر کی آبادی کے لئے نقل و حرکت محال ہو جاتی ہے، اور ٹریفک کا ایسا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے جو بے گناہ شہریوں کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے، نہ جانے کتنے ضعیف اور بیمار لوگ اس قسم کی بدنظمی کی وجہ سے اپنے علاج سے محروم رہ جاتے ہیں، کتنے ضرورت مند اپنے روزگار تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس طرح عام گزر گاہوں کو بلاک کر کے نہ جانے کتنے انسانوں کو ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچانے کا گناہِ عظیم اس قسم کے جلسوں جلوسوں کے حصّے میں آتا ہے۔

(۸) دیواروں کو انتخابی نعروں سے سیاہ کرنا اور شخصی اور سرکاری عمارتوں پر اشتہارات چسپاں کرنا بھی انتخابی مہم کا جزء لاینفک ہے جس کے نتیجے میں شہر کی بیشتر عمارتیں متضاد نعروں اور اشتہارات سے داغدار نظر آتی ہیں، اور کسی اللہ کے بندے کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی دوسرے کی عمارت کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کر کے اس کا حُلیہ بگاڑنا درحقیقت چوری اور غصب کے مُترادف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> "کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں"۔

عمارتیں اور دیواریں کسی نہ کسی کی ملکیت ہوتی ہیں، اور ان کو اپنے اشتہار کے لئے استعمال کرنا مالک کی اجازت کے بغیر حرام ہے، چہ جائیکہ ان کو

خراب اور بدنما بنانا۔ لیکن غربت اور جہالت کے خاتمے کے دعویدار بے تکان اس چوری اور غصب کا ارتکاب کرتے ہیں' اور اگر کوئی شریف انسان اس عمل سے روکنے کی کوشش کرے تو اسے پتھروں اور فائرنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(۹) ووٹوں کی خرید و فروخت اور اس غرض کے لئے لوگوں کو رشوت دینا' اور جن لوگوں کے قبضے میں بہت سے ووٹ ہوں' ان کے ناجائز کام کرا دینا یا اس کا وعدہ کرلینا ایک مستقل جُرم ہے' جو خدا اور آخرت سے بے فکر امیدواروں میں بہ کثرت رائج ہے اور اس نے معاشرے کو اخلاقی تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

(۱۰) ظاہر ہے کہ ساری انتخابی مہم چلانے کے لئے ہر جماعت کو کروڑوں روپیہ درکار ہوتا ہے۔ اس کروڑوں روپے کے سرمائے کے حصول کے لئے جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں' ان میں غیر ملکی طاقتوں سے گٹھ جوڑ اور ان کی دی ہوئی لائن پر کام کرنا ایک ایسی بیماری ہے جو ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے' اور جو لوگ باہر سے سرمایہ حاصل نہیں کرتے' یا نہیں کرپاتے' وہ اپنے ہی ملک کے بڑے بڑے دولت مند افراد سے اپنی جماعتوں کے لئے چندے وصول کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ چندہ درحقیقت اس بات کی رشوت ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد چندہ دینے والوں کو خصوصی مُراعات دیجائینگی۔ اور اگر وہ دینے سے انکار کریں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ جو جماعت جتنی زیادہ طاقتور ہوتی ہے' اور اس کے اقتدار میں آنے کے جتنے زیادہ امکانات ہوتے ہیں' اس کی چندے کی اپیل اتنی ہی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

یہ دس موٹے موٹے گناہ محض مثال کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں' لیکن اگر آپ باریک بینی سے غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ ان میں سے ہر گناہ بذاتِ خود بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے' اور انتخابی مہم کے دوران اسی قسم کے نہ جانے کتنے گناہوں

کا ارتکاب دھڑلے سے ہوتا ہے۔ اب غور فرمائیے کہ جن حکومتوں کی بنیاد میں جھوٹ' الزام تراشی' بہتان' غیبت' خود ستائی' جھوٹے وعدوں' دوسروں کے ساتھ غنڈہ گردی' مخلوقِ خدا کی ایذا رسانی' دوسروں کی املاک پر ناجائز تصرف جیسے عظیم گناہ داخل ہوں' ان سے ملک وملّت کو سُکھ چین کس طرح نصیب ہو؟ اور جس ماحول میں ان گناہوں کی ظلمت چھائی ہوئی ہو' وہاں سے خیروفلاح کی روشنی نمودار ہونے کی کیا توقع رکھی جائے؟

لیکن ان گذارشات کا مقصد محض تنقید برائے تنقید نہیں' نہ اس کا منشاء یہ ہے کہ لوگوں میں مایوسی پھیلائی جائے۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ کم از کم ہم اپنی بیماریوں سے آگاہ تو ہوں' اور ان میں سے جس کسی بیماری کا سدِّباب اپنی قدرت میں ہو اس سے دریغ نہ کریں' اور کم از کم عام مسلمان اُن گناہوں سے محفوظ رہنے کا اہتمام کریں جن میں وہ بعض اوقات نادانستہ طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ اس ہنگامہ خیز طوفان میں ایک تنہا شخص خود کسی بُرائی سے رُک جائے تو اس سے معاشرے پر مجموعی طور سے کیا اثر پڑے گا؟ یاد رکھئے کہ معاشرے سے گندگی جس چھوٹی سے چھوٹی مقدار میں بھی کم ہو' غنیمت ہے' کیونکہ معاشرہ درحقیقت افراد ہی کے مجموعے سے عبارت ہے' یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے لہٰذا بعض اوقات کسی ایک شخص کا عزم وہمّت بھی معاشرے کی تبدیلی میں فیصلہ کُن کردار ادا کر سکتا ہے۔ ع

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

قانون میعاد سماعت کی شرعی حیثیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

۱۹۷۷ء میں ایک صاحب نے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم سے ایک خط کے ذریعہ یہ سوال کیا کہ کیا پاکستان میں جو قانون ''قانونِ میعادِ سماعت'' کے نام سے جاری ہے وہ آیا شرعی قانون ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا مدظلہم نے ایک تفصیلی خط تحریر فرمایا۔ جو پیشِ خدمت ہے۔

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قانونِ میعادِ سماعت کی شرعی حیثیت

جناب محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ازراہِ کرم راہنمائی فرمائیں کہ دنیا کے بعض جدید ترقی یافتہ ممالک میں (LIMITATION ACT) کے نام سے جو اصول رائج ونافذ ہیں ان کی تاریخ کیا ہے اور کیا وہ سرابسر غیراسلامی اصول ہیں؟ اگر یہ اصول و قوانین غیراسلامی ہیں تو دیوانی وفوجداری مسائل وامور میں چارہ جوئی کی میعاد کا عدم تعین جو عملی خرابیاں پیدا کرتا ہے اس کا تدارک کیونکر کیا جاسکتا ہے، خصوصاً اگر اس عدم تعیّن کو کانٹ کے (CATEGOMCAL IMPERATIVE) کی حیثیت دی جائے تو جائداد غیر منقولہ کے برسوں پرانے معاملات متأثر ہوتے ہیں۔ اور اگر اصول وقوانین غیراسلامی نہیں تو ان کے اسلامی ہونے کا کیا جواز ہے؟ جب کہا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں شفعہ کو چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے؟ اگر عنقریب قومی اتحاد برسراقتدار آجائے، تو پورا کا پورا اسلام کیونکر نافذ

ہوگا اور (LIMITATION ACT) کو کس طرح مشرّف بہ اسلام کیا جائے گا۔ یا پھر اسے کس بنا پر ایک کلمہ گو قانون کی حیثیت حاصل ہوگی؟ مفصّل جواب سے بلا تاخیر سرفراز فرمائیں۔

والسّلام

جعفر قاسمی
محلّہ ریختی چنیوٹ
۲۲ر۸ر۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدّ ظلہم

کا جواب

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں۔ آمین

گرامی نامہ باعثِ مسرّت و افتخار ہوا۔ آپ کے سوال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ "قانونِ میعادِ سماعت (LIMITATION ACT) سراسر غیر اسلامی قانون نہیں ہے اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اسلام کی تاریخ میں شفعہ کو چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے" واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عدالتیں بھی میعادِ سماعت کا لحاظ کرتی رہی ہیں خاص طور سے ترکی خلافت کے دور میں عالمِ اسلام کے تمام قاضی خلیفۂ وقت کی مقرر کردہ میعادِ سماعت پر عمل کرتے رہے۔ اور فقہاء اسلام نے ان کے اس عمل کی نہ صرف توثیق و تائید کی ہے بلکہ خلیفۂ وقت کے منشور جاری ہونے کے بعد اس کو واجب العمل قرار دیا ہے "الاشباہ والنظائر" کے مشہور شارح علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے سلاطین نے تمام قاضیوں کو یہ حکم دیا ہوا ہے کہ وہ وقف اور وراثت کے سوا کوئی دعویٰ بناء دعویٰ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قابل سماعت نہ سمجھیں۔ اور فتاویٰ حامدیہ میں (جس کی تنقیح علامہ ابن عابدین

شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے) اس مسئلے پر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے فقہاء کے فتاویٰ نقل کئے ہیں جو اس بات پر یک زبان ہیں کہ سلطان کی طرف سے اس ممانعت کی اجراء کے بعد پندرہ سال بعد کوئی مقدمہ دائر نہ کیا جائے۔ البتہ علامہ خیرالدین رملی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ خیریہ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس بارے میں ہر خلیفہ کی طرف سے از سرِنو حکم جاری ہونا میعادِ سماعت کی پابندی کے لئے ضروری ہے۔

البتہ مختلف زمانوں میں مختلف میعادیں مقرر کی گئی ہیں۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں بعض مقدّمات کے لئے پندرہ سال، بعض کے لئے تینتیس سال اور بعض کے لئے چھتیس سال کی مدّتیں مقرر کی گئی ہیں مثلاً درمختار میں ہے :

"القضاء مُظهر لا مُثبت ولا يتخصّص بزمان ومكان وخصومة، حتى لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ينفذ، قلت : فلا تسمع الآن بعدها إلا بأمر"

اس کے تحت علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر کافی مفصّل بحث کی ہے اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ :

قال المتأخرون من اهل الفتویٰ : لاتسمع الدعوی بعد ست وثلاثين سنة إلا ان يكون المدعى غائبا اوصبيا الخ"

بلکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی مبسوط سے نقل کیا ہے کہ :

اذا ترك الدعوىٰ ثلاثة وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوىٰ

ثم ادعیٰ لا تسمع دعوۂ

(درمختار کتاب القضاء مطلب فی عدم سماع الدعویٰ بعد خمس عشرة سنة- صفحہ ۲٤٤ جلد ٤ مطبوعہ دیوبند)

شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ خلافتِ عباسیہ کے دور کے ہیں' جس سے واضح ہوا کہ میعادِ سماعت کا یہ تصور خلافتِ عباسیہ میں بھی موجود تھا۔ افسوس ہے کہ میں اس وقت پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے صاحبِ فراش اور چلنے سے معذور ہوں' اس لئے دوسری کتابوں کی مراجعت اس وقت ممکن نہیں' ورنہ اس پر شاید اور بھی قدیم حوالے دستیاب ہوجاتے۔ تاہم علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ تصریحات سے بھی اتنا واضح ہوجاتا ہے کہ میعادِ سماعت کا تصور نہ صرف غیر اسلامی نہیں' بلکہ اسلامی عدالتیں ہر دور میں اس پر کسی نہ کسی شکل میں عمل پیرا رہی ہیں۔

البتہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے اور شاید آپ کو بھی یہی شبہ ہوا ہو کہ محض تاخیر کی بناء پر ایک صاحبِ حق کو حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے؟ موجودہ قوانین میں اس سوال کا جواب نصفت (EQUITY) کے ان مقولوں کے ذریعہ دیا گیا ہے کہ :

"THE LOW AIDS THE DILIGENT AND NOT THE INIDO LENT"

"قانون چوکس لوگوں کی مدد کرتا ہے' غافلوں کی نہیں"

"THERE SHOULD BEAN END TO LITIGATION"

"عدالتی مخاصمتوں کی کوئی انتہاء ہونی چاہئے"۔

لیکن یہ مقولے موجودہ قوانین کے حق میں اس لئے پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہوئے کہ وہاں دیانت اور قضاء کی کوئی تفریق کم از کم عملاً نہیں ہے بلکہ جو حق عدالت سے مسترد ہوگیا عملاً[1] وہ حق ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے اسلامی فقہ میں دیانت اور قضاء کے احکام ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لہٰذا اگر عدالت نے کسی حق کا تصفیہ کرنے سے انکار کردیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حق نہیں رہا' بلکہ وہ حق موجود ہے' اور جس کے ذمّے حق ہے اس پر دیانۃً فرض ہے کہ وہ اُسے صاحبِ حق تک پہنچائے' خواہ کتنا زمانہ بیت چکا ہو' اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو عدالت خواہ اُسے کچھ نہ کہے' لیکن وہ گنہگار ہوگا۔ اسی لئے فقہاء کا یہ مقولہ "الاشباہ والنظائر" وغیرہ میں درج ہے کہ "الحق لا یسقط بتقادم الزمان" یعنی حق زمانہ گذر جانے کی بناء پر ساقط نہیں ہوتا۔ اس سے مراد یہی ہے کہ میعادِ سماعت گذر جانے کے باوجود وہ حق موجود ہے۔ جس کا ایک اثر تو اُخروی ہے کہ اس حق کو تلف کرنے والا گنہگار ہوگا۔ دوسرا اثر دنیوی ہے کہ جس شخص کو بھی اس حق تلفی کا یقینی علم ہوگا وہ اس پر فاسق کے احکام جاری کرے گا جس سے اس کے ساتھ اس کے سارے معاملات متأثر ہوں گے۔ تیسرا اثر یہ ہے کہ اگرچہ عدالت اس مسئلے کو سننے سے انکار کرچکی' لیکن اگر خلیفہ کے پاس اپیل پہنچے اور وہ محسوس کرے کہ مقدّمہ جاندار ہے اور اس میں چالبازی بظاہر نہیں ہے۔ تو فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ اُسے کسی قاضی کے پاس بھیج سکتا ہے' اس صورت میں قاضی اس کی سماعت کرے گا۔

(شامی صفحہ ۳۴۳ جلد ۴)

نیز ایسی صورت میں صاحبِ حق قاضی کو ثالث بنا کر بھی فیصلہ کرا سکتا ہے"۔

---

[1] عملاً اس لئے کہا کہ اصولی طور پر موجودہ قوانین میں بھی یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ "میعادِ سماعت" سے چارہ جوئی (REMEDY) ختم ہو جاتی ہے حق (RIGHT) ختم نہیں ہوتا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ صرف زبانی طور پر نہیں' بلکہ عملاً بھی میعادِ سماعت سے حق ساقط نہیں ہوتا۔ البتہ میعادِ سماعت مقرر کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مدّت دراز گذرنے کے بعد بھی اگر حق سماعت باقی رکھا جائے تو اس سے ایک طرف تو مقدّمات میں مکروفریب اور جھوٹی گواہیوں کا امکان بڑھ جائے گا کیونکہ مدّت دراز گذرنے کے بعد واقعے کے عینی گواہ ملنے مشکل ہوتے ہیں' اور مل بھی جائیں تو واقعے کی پوری تفصیلات ذہن میں نہیں رہتیں۔ اس لئے اس قسم کے مقدّمات عدالتوں میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مقدمات میں غیر ضروری تعویق ہو اور لاینحل مسائل کھڑے ہوجائیں۔ میعادِ سماعت کی یہی حکمت ہمارے فقہاء نے بھی بیان فرمائی ہے"۔

خلاصہ یہ کہ قانونِ میعادِ سماعت کو سراسر غیراسلامی قرار دینا درست نہیں۔ بلکہ اسلامی فقہ میں اسکی بنیاد موجود ہے اور جب کبھی شریعت کی بنیاد پر موجودہ قوانین کی تدوین نو کی جائے گی تو اس قانون کو بالکلیہ مسترد یا منسوخ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس پر مذکورہ فقہی بنیادوں پر نظرثانی کی جائے گی' اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قانون میں اتنی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی جتنی دوسرے بہت سے قوانین میں ضرورت پیش آئے گی۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۱۲ر رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

الله نور السموات والارض

کوّے کی حلت پر تحقیق

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

عرض ناشر

آج سے تقریباً ۴۲ سال پہلے ۱۹۶۰ء میں شکار پور سندھ کے بعض علماء نے کوّے کی حرمت پر ایک فتویٰ دیا۔ جو جمہور علماء کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس لئے ایک صاحب نے اس کے بارے میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم العالی کو ایک استفتاء بھیجا، اور اس کے ساتھ ان علماء کا جواب بھی ارسال کیا۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے وہ سوال و جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد کیا۔ حضرت مولانا مدظلہم نے اس کا تحقیقی جواب تحریر فرمایا جو پیش خدمت ہے۔ شکار پور سندھ کے علماء کا جواب فارسی میں ہے۔

میمن اسلامک پبلشرز

کوے کی حلت پر تحقیق

س:
شکار پور سندھ کے علماء نے کوے کی حرمت پر ایک تحریر لکھی ہے جو ارسال خدمت ہے، یہ تحریر چونکہ جمہور علماء کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے اس سے متعلق بعجلت ممکنہ تحقیق فرما کر ممنون فرمائیں۔ اس تحریر کے سوال وجواب حسب ذیل ہیں۔

(س) غراب ملکی حلال است یا حرام، بینوا توجروا۔

ج :غراب ملکی حرام است از جملہ فواسق و موذیات است در حدیث شریف فی الموطا امام مالک" عن نافع عن عبدالله ابن عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم قال خمس من الدواب لیس علی المحرم ی قتلهن جناح الغراب و الحداة و العقرب و الفارة و الکلب العقور ودر حاشیہ مصفی علی الموطا قال البغوی اتفق اهل العلم علی انه یجوز للمحرم قتل هذه الاعیان ولا شئی علیه ی قتلها ی الاحرام و الحرم لان الحدیث یشتمل علي اعیان بعضها سباع و بعضها هوام و بعضها لایدخل ی معنی السباع ولا هی من جمله الهوام واىما هو حیوان مستخبث اللحم و تحریم الاکل یجمع الکل و قالت الحنفیة لا جزاء بقتل ماورد ی الحدیث وقاسوا علیه الذئب و قالوای غیرها من الفهد و النمر و الخنزیر و جمیع مالا یوکل لحمه علیه الجزا بقتلها الا ان یبتدیه شئی فیدفعه عن نفسه فیقتله فلاشی علیه وی البحر معنی الفسق فیهن خبثهن دکثرة الغررفیهن درہدایہ می آرد

والمراد الغراب الذی یاکل الجیف و یخلط لانہ یبتدی بالاذی وی
بعض النسخ او یخلط کما نقل عبارتہا ی البحر اد یخلط الحب
بالنجس معناہ یا کل الحب تارۃ و النجس تارۃ کذای الحاشیتہ
للسید الشامی علی البحر نقلاعن النہرعن البدائع۔ قال ابویوسف
الغراب المذکور ی الحدیث الذی یا کل الجیف او یخلط لان
ہذالنوع ہوالذی یبتدی بالاذی در مسکین شرح کنز تحت قولہ
ولاشی بقتل الغراب می آرد والمرادبہ الا بقع الذی یا کل
الجیف و یخلط النجس مع الطاہر ی التناول ودر حاشیہ
علامہ ابی السعودی نویسد الواو بمعنی او اذلا حاجۃ بضم
الخلط الی اکلہا (ای اکل ما خالطہ) کما ذکرہ الحموی انتہی—

وفقہاء کرام دو نوع غراب را از غراب کہ در حدیث شریف
مذکور است استثنی ساختہ اند، یکے غراب الزرع و دیگر عقعق
کمافی عامتہ الکتب بقتل ایں ہردو نوع برمحرم جزا واجب است —
در ردالمحتار در تعریف غراب الزرع می نویسد وہوالذی
یلتقط الحب ولا یا کل الجیف ولا یاتی ی القری والا مصار —
در تعریف عقعق می آرد ہو طائر نحوالحمامۃ
طویل الذنب فیہ بیاض وسواد وہو نوع من الغربان یتشام بہ و
یعقعق بصوت یشبہ العین و القاف پس ایں ہر دونوع
حلال اند وازیں جا است کہ فقہاء کرام در کتاب مایحل اکلہ وما لا
یحل ہمیں دو نوع غراب راحلال نوشتہ اندو در تنویر الابصار نو
یسد وحل غراب الزرع الذی یا کل الحب والارنب و
العقعق وہو غراب یجمع بین اکل جیف وحب ولا شک ان غراب

دیارنا غیر العقعق وغیر غراب الزراع فیکون داخلافی الغراب المذکورفی الحدیث فیکون فاسقاد حراما کسائر نظائرہ و آنچہ بعض فضلاء ایں غراب ملکی را حلال دانستہ و تمسک گرفتہ بآنچہ بعبارات فقہاء واقع شدہ نوع یا کل الحب مرۃ والاخری جیفۃ غیر مکروہ عندالامام الاعظم فانہ یتوھم منہ فی بادی الرای ان الغراب المعروف فی دیارنا غیر مکروہ عند الامام لانہ یخلط بین الحب والنجاسۃ فقول ان الفقہاء الکرام حصر واھذالنوع فی العقعق قال فی العنایۃ شرح الہدایۃ اما الغراب الا بقع والاسود انواع ثلثۃ نوع یلتقط الحب ولا یاکل الجیف ولیس بمکروہ ونوع لا یاکل الاالجیف وانہ مکروہ ونوع یخلط باکل الحب مرۃ و الجیف اخری وھو غیر مکروہ عند الامام ومکروہ عندابی یوسف وفی الحاشیۃ السعدیۃ للحلبی اقول قال الزیلعی ونوع یختلط بینہا وھو یوکل عندابی حنیفۃ رح وھو العُقعق کما فی المُنح وسیاتی وفی حاشیۃ شرح الوقایہ نوع یجمع بین الحب و الجیف وھو حلال عندابی حنیفۃ و ھو العقعق الذی یقال لہ بالفارسیۃ عکہ وفی تکملۃ البحر العلامۃ الطرطوسی فی شرح قولہ" الا بقع والغراب ثلثہ انواع" الی قولہ" ونوع یخلط بینہما وہو ایضا یوکل عندالامام وہو العقعق" پس ظاہر شدکہ ایں نوع کہ جامع است درمیان حب وجیفۃ و آں نزد امام حلال است منحصراست در عقعق واوموذی نیست و آنچہ در ہدایہ و شرح مسکین آوردہ و یخلط مراد ازاں آں است کہ اوموذی باشدو آں حرام است پس غراب کہ جامع باشد درمیان حب وجیفۃ دو صنف است یکے صنف کہ او موذی نیست و آں حلال است منحصر است در عقعق و صنف دیگراو موزیست حرام است۔

در تیسیر القاری شرح صحیح البخاری می آرد فاسق بودن غراب ازانست که پشت مجروح دواب راو چشم شتررا می کند انتهی بزبان سندهی مشهور است که کا نوکری گذه کنبی یعنی وقتیکه غراب آواز دہد حیوانے که ریش دارد می لرزد در مصداق آں درد یارما ہمیں غراب معروف است چنانچه در اوصاف ذمیمه او ظاہر است و در رد المحتار می آرد تحت قوله ولاشئی بقتل غراب الا العقعق لان الغراب دائما تقع علی دبر الدابة کما فی غایة البیان ازایں عبارات واضح گردید که ایں غراب که در دیار ما است موذی است ریش دابه رامی کند و در بر دابه می افتد و چشم شتررا می کند حرام است و عقعق غیر آنست — عقعق رادر سندهی متاه گویند۔ واللہ اعلم بالصواب۔

المحرر فقیر عبدالحکیم

صدر مدرس مدرسه اشرفیه شکارپور۔

اسماء گرامی مصدقین بالا لفاظ المذکورۃ فی الاصل۔ محمد فضل اللہ مہتمم مدرسہ اشرفیہ شکار پور۔ عبدالقادر ثانی مدرس۔ الفقیر عبدالفتاح۔ مولوی عبدالحق۔ مولوی غلام مصطفےٰ۔ مولوی عبدالمالک۔ مولوی تاج محمد۔ مولوی مظفر دین سومرو۔ مولوی عزیز اللہ۔ الفقیر محمد عظیم۔ عبدالحی جتوئی۔ عبدالکریم چشتی ــ محمد عارف چشموی۔ امید علی جیکب آباد۔ محمد اسمعیل عودوی ثم الشکار فوری۔ انا عبدالعزیز الباندوی ــ العبد عبدالغنی۔ حامد اللہ بلوچستانی اجمیری۔ عطاء اللہ انقلابی۔ مولوی مظہر الدین مدرسہ ہاشمیہ عبدالعزیز جتوئی۔

العبارات والروایات المزیدۃ

(عالمگیری اردو صفحہ ۴۴۰) جو پرندے نجس و مردار خوار ہیں جیسے دیسی کوا، اس کو طبیعت پاکیزہ پلید و خبیث جانتی ہے۔ انتہی۔ عن ہشام عن عروۃ عن ابیہ انہ سئل عن اکل الغراب فقال ومن یا کلہ بعد ما سماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسقاً یریدبہ الحدیث المعروف خمس فواسق یقتلن فی الحل والحرم۔

وفی الموعد الابقع ہوالذی فی صدرہ بیاض۔ قال فی المحکم غراب ابقع یخالط فیہ سواد و بیاض وھوا خبثھا ردالمحتار از عنایہ نقل کردہ نوع لایا کل الا الجیف وھوالذی سماہ المصنف الابقع وانہ مکروہ الخ حقیقت ہمیں است کہ یک نوع غراب ابقع سوائے جیف نمی خورد مراد عنایہ ہمیں نوع است مگر در حدیث از غراب ابقع ہماں مراد است کہ ہردو خلط می کند کمافی تبیین الحقائق والمراد بالابقع ما یاکل الجیف و یخلط کذافی الھدایہ۔

جواب از حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم

الجواب :- اقول وبا للہ استعین۔ فاضل مجیب نے ملکی کوے کے حرام ہونے پر جو استدلال کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء نے کوے کی جو ایک یہ قسم بیان فرمائی ہے کہ وہ نجاست وغیرہ میں خلط کرتا ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عقعق، جو موذی نہیں (۲) وہ کوا جو خلط کرتا ہے اور موذی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم تو حلال ہے لیکن دوسری قسم حرام ہے اور چونکہ ملکی کوا دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے وہ حرام ہوگا۔ موذی ہونے یا نہ ہونے کی تفصیل پر انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جس جگہ فقہاء کرام یہ تحریر فرماتے ہیں کہ حالت احرام میں کوے کا قتل کرنا جائز ہے اور اس پر کوئی جزا نہیں، اس کے تحت اس کوے کو ابقع اور اس قسم کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں جو نجاست اور زرع میں خلط کرنے کا عادی ہو اور اس کے بعد عقعق کو اس سے مستثنیٰ کر لیتے ہیں۔ ان کے اس فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلط کرنے والے کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو موذی ہے، اس کو قتل کرنے سے جزا واجب نہیں۔ دوسری قسم: عقعق کہ وہ بھی خلط کرتا ہے۔ مگر چونکہ موذی نہیں اس لئے اس کے قتل پر جزا واجب ہے۔

موذی کوے کے حرام ہونے پر فاضل مجیب نے دلیل یہ پیش کی ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مسویٰ میں لکھا ہے کہ جن پانچ چیزوں کو حدیث میں عام حکم سے مستثنیٰ کر کے یہ کہا گیا ہے کہ ان کے قتل سے کوئی حرج نہیں، وہ سب کی سب حرام ہیں، ان کا کھانا ناجائز ہے۔ اور جب فقہاء کی عبارتوں سے یہ معلوم ہو چکا کہ ان چیزوں میں وہ موذی کوا بھی داخل ہے جو خلط کرتا ہو تو مسویٰ کی اس عبارت سے اس کوے کا حرام ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

خلاصہ کے طور پر استدلال ان مقدمات پر موقوف ہے۔

(۱) خلط کرنے والے کی دو قسمیں ہیں۔ موذی اور عقعق جو موذی نہیں۔

(۲) موذی کوے کو قتل کرنے سے محرم پر جزا واجب نہیں اور غیر موذی کے قتل پر جزا آتی ہے۔
(۳) مسوی کی عبارت میں ہے کہ تمام "فواسق خمس" جن کے قتل سے محرم پر جزا نہیں آتی وہ حرام ہیں۔
اس استدلال کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار چونکہ ان مقدمات پر ہے اس لئے ہم ان میں سے ہر ایک مقدمہ پر بحث کریں گے۔

پہلا مقدمہ

ان میں سے پہلا مقدمہ علی الاطلاق صحیح نہیں کیونکہ عقعق بھی کبھی ایذا پہنچاتا ہے۔
صاحب ہدایہ کے قول "المراد بالغراب الذی یا کل الجیف او یخلط لانہ یبتدی بالاذیٰ اما العقعق غیر مستثنٰی لا نہ لا یسمٰی غرابا ولا یبتدی بالاذیٰ الخ" کے تحت علامہ اکمل الدین بابرتی "لکھتے ہیں قیل فعلی ھذا یکون ی قولہ ی العقعق ولا یبتدی بالاذی لانہ یقع علی دبرالدابۃ انظر (عنایۃ علی ہامش الفتح جلد ۲ ص ۲۶۷)۔
اور مولانا عبدالحی صاحب" نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ انہ دائما یقع علی دبرالدابۃ (حاشیہ ہدایہ ج ا ص ۲۶۱)۔
اسی طرح علامہ زین الدین بن نجیم نے بھی ہدایہ کی اس عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے فیہ نظر لانہ دائما یقع علی دبرالدابۃ، کما ی غایۃ البیان و الجرالرائق (ص ۳۶ ج ۳)
اگرچہ علامہ شامی نے بحر کے حاشیہ پر اور ردالمحتار میں صاحب بحر کے

اس اعتراض کو رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اشار فی المعراج الی دفع مافی غایۃ البیان بانہ لا یفعل ذلک غالبا" لیکن اس سے بھی عقعق کے اصلا موذی نہ ہونے کا ثبوت نہیں ملتا کیونکہ صاحب معراج نے غالبًا کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کبھی کبھی ایذاء پہنچاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خود علامہ شامی" نے آگے چل کر لکھا ہے۔" ثم رایتہ فی الظھیریۃ قال وفی العقعق روایتان و الظاھر انہ من الصیود —— وبہ ظھران مافی الھدایۃ ھو ظاھر الروایۃ (منحۃ علی البحر ص ۳٦ ج ۳)۔ علامہ عثمانی" نے بھی فتح الملہم میں ظہیریہ کا قول نقل کیا ہے (ص ۱۳۱ ج ۳) جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرجوح روایت عقعق کے بارہ میں بھی یہ ہے کہ اس کے قتل سے محرم پر جزا نہیں، ظاہر ہے کہ اس روایت کی بنا یہی ہے کہ عقعق موذی ہوتا ہے، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک خمس فواسق کے قتل پر جزانہ ہونے کی علت مشترکہ ایذا ہے، جیسا کہ علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد ص ۲۷۰ ج ۱ میں نقل فرمایا ہے۔

(وسیاتی نصہ) پس ثابت ہوا کہ عقعق بھی کسی درجہ میں موذی ہے۔ اگر آپ کے قول کی بنا پر موذی "کوا" حرام ہے تو عقعق بھی حرام ہونا چاہئے۔ (وذالک خلف)

بہرحال، مقدمہ اولیٰ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں بعض حضرات کی رائے مختلف ہے اور جو حضرات اسے موذی نہیں کہتے وہ بھی کبھی کبھی اس کی ایذا رسانی کے قائل ہیں۔

مقدمہ ثانیہ

یہ مقدمہ راجح قول کی بنا پر صحیح ہے، اگرچہ علامہ ابن نجیم" اس

سلسلہ میں تمام لوگوں میں متفرد ہیں اور انہوں نے لکھا ہے کہ دا طلق ی الغراب فشمل الغراب بانواعه الثلاثة مگر اس کو صاحب نہر، علامہ حصکفی، "علامہ شامی" اور مولانا عثمانی" نے رد کیا ہے (شامی ص ۳۰ ج ۲، فتح الملہم ص ۲۳۱ ج ۳)۔

تیسرا مقدمہ

یہ مقدمہ ہرگز صحیح نہیں اور اس کی عدم صحت مسوی کی اصل عبارت دیکھتے ہی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ امر بہت افسوس ناک اور حیرت انگیز ہے کہ فاضل مجیب نے مسوی کی عبارت نقل کرنے میں مجرمانہ قطع وبرید سے کام لیا ہے، جو علماء کی شان سے از بس بعید اور بہت گھناؤنا اقدام ہے۔ ہمارے ذہن نے اس فعل کی تاویل تلاش کرنے میں بہت قلابازیاں کھائیں مگر کوئی راہ دکھائی نہ دی، ذرا مسوی کی اصل عبارت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

قال البغوی اتفق اهل العلم علی انه یجوز للمحرم قتل هذه الاعیان المذکورة ی الخبر دلاشئی علیه ی قتلها وقاس الشافعی رح علیها کل حیوان لا یوکل لحمه فقال لافدیة علی من قتلها فی الاحرام والحرم لان الحدیث یشتمل علی اعیان بعضها سباع و بعضها هوام و بعضها لا ید خل ی معنی السباع ولاهی من جملة الهوام و انما هو حیوان مستخبث اللحم و تحریم الاکل یجمع الکل فاعتبروه و قالت الحنفیة حح لاجزاء بقتل ماورد ی الحدیث وقاسوا علیه الذئب وقالوا ی غیر هامن الفهد و النمرو الخنزیر و جمیع مالا یوکل لحمه علیه الجزاء بقتلها الا ان یبتدیه شئی فید فعه

عن نفسہ الخ - (مسوی مع مصفی ص ۲۹۳ ج ۱) -

خط کشیدہ جملے فاضل مجیب نے نقل نہیں فرمائے جس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ "تحریم الاکل یجمع الکل" کا حکم حنفیہ" نے دیا ہے۔ حالانکہ اصل عبارت دیکھنے سے ہر کس و ناکس سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ امام شافعیؒ کے قیاس کے مطابق بیان ہو رہا ہے۔

ہم ذاتیات پر حملہ کرنے کے عادی نہیں مگر اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یوں تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ہر وقت اپنی عاقبت کو سامنے رکھے۔ لیکن فتویٰ جیسے نازک مقام پر یہ فرض زیادہ موکد ہو جاتا ہے۔

ایسی بزدلی کا مظاہرہ فتویٰ میں ایک اور جگہ بھی ہوا ہے کہ فاضل مجیب نے

بحر کی عبارت کا ایک ٹکڑا (ومعنی الفسق فیھن خبثھن و کثرۃ الغرر فیھن) نقل فرمایا اور اس سے کچھ آگے سے صاحب ہدایہ کا مذکورہ بالا قول بھی، تاکہ صاحب بحر بظاہر ہمنوا معلوم ہوں۔ حالانکہ یہ اتنی مضحکہ خیز اور افسوسناک حرکت ہے کہ ناگفتہ بہ، کیونکہ خود صاحب بحر کے پورے کلام سے فاضل مجیب کے ایک مزعومہ کی تردید ہو رہی ہے۔ صاحب بحرؒ نے لکھا ہے واطلق فی الغراب فشمل الغراب بانواعه الثلاثة اور اس کے بعد صاحب ہدایہ پر بھی اعتراض کر دیا ہے کہ انه دائما یقع علی دبر الدابة (کما مر آنفا) جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صاحب بحر کے نزدیک تمام اقسام غراب کا حکم ایک ہی ہے اور یہ بھی کہ ان کے نزدیک عقعق بھی موذی ہے۔ لہٰذا اگر ایذا ہی علت حرمت ہوتی تو عقعق بھی ان کے نزدیک حرام ہو جاتا۔ حالانکہ عقعق کی حلت پر تمام فقہاء حنفیہ" کا اجماع ہے (الا ابا یوسف") اس کے باوجود فاضل مجیب نے ان کو بھی اپنا ہم خیال ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ "سبحان الله ھو بھتان عظیم۔" نہ جانے

واذاقلتم فاعدلوا ولو کان ذاقربی کا ارشاد کون سے لوگوں کے لئے ہے۔

بہرکیف. مسویٰ کی جس عبارت سے فاضل مجیب نے استدلال فرمایا تھا وہ تو للم شافعیؒ کا مسلک ثابت ہوا، اب ذرا اس بلہ میں حنفیہؒ کا مسلک دیکھ لیجئے۔ حنفیہؒ کے نزدیک ان پانچ فواسق کو قتل کرنے کی علت ابتداء بالاذیٰ ہے، اکل نجاست یا خلط نہیں ہے اور نہ حلت و حرمت سے اس کا کوئی تعلق ہے جیساکہ خود مسویٰ کی مذکورہ عبارت کے آخری جملوں سے مستفاد ہوتا ہے۔ وقالوای غیر هامن الفهد والنمر والخنزیر وجمیع مالا یوکل لحمه علیه الجزاء بقتلها الا ان یبتدیه شئی فیدفعه عن نفسه فیقتله فلا شئی علیه" یعنی اگر کوئی جانور ابتداء بالاذیٰ کرے اور دفاع میں اسے قتل کر دے تو کوئی جزا واجب نہیں۔ معلوم ہوا کہ ابتداء بالاذیٰ علت ہے۔ اور علامہ ابن رشدؒ نے بھی حنفیہ اور مالکیہ کا مسلک یہی نقل فرمایا ہے۔

وقال (ی المسئلة الثالثة) وهی اختلافهم ی الحیوان المامور بقتله ی الحرام وهی الخمس المنصوص علیها، الغراب و الحداة و الفارة و العقرب و الکلب العقور فان قوما فهموا من الامر لها مع النهی عن قتل البهائم المباحة الاکل ان العلة ی ذلک هو کونها محرمة وهو مذهب الشافعیؒ وقوما فهموا من ذلک معنی التعدی لا معنی التحریم وهو مذهب مالک وابی حنیفة وجمهور اصحابهما

(بدایۃ المجتہد ص ۲۷۰ ج ۱)۔

اس عبارت میں وضاحت کے ساتھ حنفیہ کا یہ مذہب تحریر کیا گیا ہے کہ حدیث میں مباح القتل فرمانے کی علت ابتداء بالاذیٰ ہے اور اس حدیث سے کسی خاص شے کی حرمت پر دلیل قائم نہیں کی جاسکتی، اس کے علاوہ تمام فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی خاص جانور کو

قتل کرنے سے جزا واجب ہونے یا نہ ہونے کے بارہ میں ابتداء بالاذی کو مدار ٹھیراتے ہیں، کما فی الہدایۃ والبحر والعنایۃ وغیرھا۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کوے کے حلال یا حرام ہونے کا مسئلہ ہمیں کتاب الحج میں نہیں ڈھونڈنا چاہئے بلکہ اس کا صحیح مقام کتاب الذبائح کی وہ جگہ ہے جہاں فقہاء غراب کی انواع واقسام پر بحث کرتے ہیں۔ یہی بنیادی غلطی ہے کہ ایک مسئلہ کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا کر دوسری غیر متعلق جگہ پر تلاش کیا جارہا ہے۔ حالانکہ کتاب الذبائح میں فقہاء کی عبارات واضح ہیں اور ان سے ملکی کوے کی حلت ثابت ہوتی ہے۔

(۱) ملک العلماء کاسانی" تحریر فرماتے ہیں

"والغراب الذی یا کل الحب والزرع والعقعق ونحوھا حلال بالاجماع (بدائع ص ۳۹ ج ۵)

(۲) شمس الائمہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں۔

خمس فواسق تقتلن فی الحرم والمراد به ما یا کل الجیف واما الغراب الزرعی الذی یلتقط الحب فهو طیب مباح لا نه غیر مستخبث طبعا وقد یا لف الادمی کا لحمام فهو والعقعق سواء ولا باس باکل العقعق وان کان الغراب بحیث یخلط فیا کل الجیف تارة والحب تارة فقد روی عن ابی یوسف رح انه یکره وعن ابی حنیفة انه لا باس با کله وهوالصحیح علی قیاس الدجاجة، وانه لا باس با کلها وقدا کلها رسول الله صلی الله علیه وسلم وهی قد تخلط ایضا وهذا لان ما یا کل الجیف فلحمه ینبت من الحرام فیکون

خبیثا عادۃ وھذالا یوجد فیما یخلط

(مبسوط سرخسی ص۲۲۶ ج ۱۱)۔

(۳) عالمگیریہ میں فتاوی قاضی خاں سے نقل کیا ہے

"وعن ابی یوسف رح قال سئلت ابا حنیفۃ رح عن العقعق فقال لاباس بہ فقلت انہ یا کل النجاسات فقال انہ یخلط النجاسۃ بشئی اخر ثم یا کل فکان الاصل عندہ ان ما یخلط کا لدجاج لا باس

(عالمگیریہ کتاب الذبائح ص۳۲۱ ج ۵)۔

خط کشیدہ جملوں پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ فقہاء رحمہم اللہ نے خلط کرنے والے کوے کے بارہ میں جو حکم دیا ہے کہ وہ حلال ہے۔ اس کو پھر عقعق کے ساتھ محصور کر دیا ہے۔ سو اس کی بناء صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ فقہاء خلط کرنے والے کوے کی نوع بتا کر آگے فرما دیتے ہیں "وھوالعقعق" اور یہ دلیل چند وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) وھوالعقعق کے الفاظ حصر کے ہرگز نہیں، اگر محصور کرنا مقصود ہوتا تو بصراحت کہا جاتا کہ ھذاالنوع محصور فی العقعق۔ کیونکہ حلت و حرمت کا اہم مسئلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام فقہاء نے ایسا نہیں کیا کہ آخر میں عقعق کی تصریح کر دی ہو، جیسے کہ عنایہ، مبسوط اور بدائع وغیرہ میں ہے، معلوم ہوا کہ یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں۔

(۲) اس کے برخلاف مبسوط، بدائع اور عالمگیریہ کی عبارات عقعق اور غیر عقعق میں تفصیل نہ ہونے پر واضح ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے خواہ عقعق ہو یا نہ ہو۔

(۳) دراصل عقعق کے کوا ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ اسے غراب میں داخل مانتے ہیں اور بعض نہیں، جیسا کہ لوبس معلوف یسوعی نے اپنی لغت کی مشہور کتاب میں لکھا ہے۔

العقعق طائر على شكل الغراب اوهوالغراب (منجد ص ۵۴۴)۔ چنانچہ صاحب ہدایہ کے نزدیک عقعق غراب نہیں، جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے اما العقعق غير مستثنى لا نه لا يسمى غرابا (ہدایہ مجتبائی ص ۲۶۲ ج ۱)۔

اور دوسرے بعض فقہاء کی عبارات سے اس کا غراب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تو اب جن لوگوں نے عقعق کو غراب میں داخل نہیں مانا، وہ حضرات غراب کی انواع بیان کر کے گزر جاتے ہیں، اور وھوالعقعق نہیں کہتے بلکہ یا تو سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کرتے یا وکذاالعقعق وغیرہ کہتے ہیں، اور جنہوں نے عقعق کو غراب میں شامل کیا ان حضرات نے خلط کرنے والے کوے کا نام ہی عقعق رکھ دیا، اس لئے اس سلسلہ میں فقہاء کی عبارتوں میں کچھ تفاوت نظر آتا ہے۔

بہرکیف! معلوم ہو گیا کہ وھوالعقعق کہنے سے خلط کرنے والی نوع کا حصر عقعق میں نہیں کیا گیا۔

العبارات المزیدہ کا جواب

فتوی کے آخر میں جو ”عبارات مزیدہ“ پیش کی گئی ہیں ان میں سے کتاب المختص للاندلسی سے جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ مندرجہ بالا بحث کے بعد قابل اعتنا نہیں رہتی کمالا یخفی، البتہ چند روایات نقل کرنے کے بعد فاضل مجیب نے جو تحقیق فرمائی ہے وہ بڑی عجیب ہے کہ ابقع کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک

خلط کرنے والا اور ایک صرف نجاست کھانے والا۔ کیونکہ تبیین الحقائق میں ہے والمراد بالا بقع الذی یا کل الجیف و یخلط کذا فی الھدایۃ۔ اور پھر وہی دلیل پیش کی کہ ابقع حرام ہے کیونکہ حدیث میں غراب سے مراد ابقع ہے اور عروہؒ فرماتے ہیں ومن یا کلہ بعد ماسماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسقا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "ابقع" لغۃ اس کوے کو کہا جاتا ہے کہ جس میں سیاہی اور سفیدی دونوں موجود ہوں، لہٰذا اس کا اطلاق کووں کی تینوں قسموں پر ہوجاتا ہے۔ صرف دانہ کھانے والے کوے کو بھی ابقع کہہ سکتے ہیں، خلط کرنے والے کو بھی، اور صرف نجاست کھانے والے کو بھی۔ چنانچہ علامہ شامیؒ غراب الزرع کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں قال القھستانیؒ وارید بہ غراب لم یا کل الا الحب سواء کان ابقع اواسود اوزاغا وتمامہ فی الذخیرۃ (شامی ص ۲۶۸ ج ۵)۔ دوسرے یہ کہ اگر واقعۃً ایسا ہوتا تو تمام فقہاء اس کو بصراحت تامہ تحریر فرماتے کیونکہ معاملہ اہم ہے۔ خصوصیت سے کتاب الذبائح میں تو پوری تفصیل سے مذکور ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ فقہاء" ابقع کو عام طور سے صرف نجاست کھانے والے میں خاص کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عالمگیریہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو، ھوالغراب الابقع وھرما یا کل الجیف۔

(عالمگیریہ ص ۲۶۸ ج ۱)۔

رہا حضرت عروہؒ کا قول، تو اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ شمس الائمہ سرخسی نے جو کچھ کوے کے بارہ میں لکھا ہے وہ یہ [illegible] یث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے، ان کی پوری عبارت اس طرح ہے، (وعن) ھشام بن عروۃ عن ابیہ انہ سئل عن اکل الغراب فقال ومن یا کلہ بعد سماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسقا یرید بہ الحدیث المعروف خمس

يقتلن فی الحرام، والمراد به ما يا كل الجيف اما الغراب الزرعی الذی يلتقط الحب الخ (مبسوط سرخسی ص ۲۲۶ ج ۱۱)۔

اس لئے اب اس میں کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی، البتہ عالمگیری اردو کی جو عبارت پیش کی گئی ہے۔ وہ زیر بحث مسئلہ میں صریح ہو سکتی تھی۔ مگر افسوس کہ عالمگیری اردو ہمارے پاس نہیں اور عربی کی اصل عالمگیری میں تتبع کے باوجود اس مطلب کی کوئی عبارت نہیں ملی، بلکہ اس کے خلاف ایک صراحت ملی ہے جسے ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ جب تک اصل عبارت ہمیں نہ ملے، اس وقت تک ہم کوئی فیصلہ قطعی اس عبارت کے بارہ میں نہیں کر سکتے۔ لا سیما اذا جر بناما جربنا۔

اور اگر یہ عبارت بالفرض صحیح بھی ہو تو جتنی صراحتیں ہم نے پیش کی ہیں۔ اس کے بعد اس کی کوئی معتد بہ حیثیت نہیں رہتی جب کہ اس کے خلاف خود عالمگیری ہی میں اس قدر صریح نص موجود ہے۔

خلاصہ کلام

یہ ہے کہ فاضل مستدل نے تمام استدلال کی بنیاد کتاب الحج کی عبارات کو بنایا ہے۔ حالانکہ یہ بنیادی غلطی ہے۔ کیونکہ حرم یا حالت احرام میں قتل کی اباحت کی علت ایذا ہے۔ (کما صرح به ابن رشد ويستفاد من سائر كتب الفقه) حرمت یا اکل نجاست و خلط نہیں ہے، بخلاف کوے کی حرمت و حلت کہ وہاں علت صرف نجاست کھانا یا خلط کرنا ہے (کما صرح به فی الهندية والمبسوط) اس لئے ایک کا جوڑ دوسرے سے ملا کر کوئی حکم لگا دینا کسی طرح سے صحیح نہیں ہو سکتا۔

بلکہ کوے کی حلت و حرمت کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے کتاب الذبائح میں وہ جگہ دیکھنی چاہئے جہاں فقہاءؒ نے اس مسئلہ کا ذکر کر کے مختلف انواع غراب

اور ان کے احکام ذکر فرمائے ہیں۔ اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے خواہ وہ موذی ہو یا نہ ہو۔ اور یہی فیصلہ ہمارے اکابر مثلاً حضرت مولانا گنگوہیؒ وغیرہ سے منقول ہے۔

هٰذا ما بدالی بعد تحقیق۔ وفوق کل ذی علم علیم

احقر
محمد تقی عثمانی غفر اللہ لہٗ
۴ ربیع الاوّل ۱۳۸۰ھ
دار العلوم کراچی

تحریر و تصدیق

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم العالی

حامداً و مصلیا، اما بعد، قال فی العنایۃ و اما الغراب الاسود والابقع فھو انواع ثلاثۃ نوع یلتقط الحب ولا یاکل الجیف ولیس بمکروہ و نوع منہ لا یاکل الا الجیف وھو الذی سماہ المصنف الابقع الذی یاکل الجیف وانہ مکروہ ونوع یخلط یاکل الحب مرۃ و الجیف اخریٰ ولم یذکرہ فی الکتاب وھو غیر مکروہ عند ابی حنیفتہ رح مکروہ عند ابی یوسف"

(العنایۃ علی ہامش الفتح ص ۶۲ ج ۸)۔

نوع منہ لایاکل الا الجیف اور اس کی تفسیر "وھو الذی سماہ الخ" سے ثابت ہوا کہ صرف وہ ابقع حرام ہے جو محض نجاست کھاتا ہو۔ نیز ونوع یخلط (الی قولہ) ولم یذکرہ فی الکتاب سے معلوم ہوا کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے، اس میں عقعق کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ عبارت نہ صرف یہ کہ عقعق کی تخصیص سے ساکت ہے بلکہ عدم تخصیص پر ناطق ہے، اس لئے کہ عقعق کا ذکر تو ہدایہ میں اسی موقع پر موجود ہے پس ولم یذکرہ فی الکتاب نص صریح ہے کہ نوع یخلط سے مراد عقعق نہیں، مبسوط اور بدائع کی عبارت سے بھی یہ ثابت کیا جاچکا ہے۔ مخدوم عبدالواحد سیوستانی رح نے بھی غراب اہلی کی حلت کی تصریح فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

س:- ماحکم خرء الغراب الذی یطیر فی الامصار و

القری و یخلط بین التقاط الحب و العذرات وما حکم سوره؟-

الجواب:- الظاہران الغراب الابقع الذی فیہ سواد و بیاض وہو مکروہ عند الصاحبین وغیر مکروہ عند الامام کما فی السراجیۃ والا بقع الاسود ان کان یخلط فیا کل الجیف و یا کل الحب قال ابو حنیفہ لا یکرہ وقال صاحباہ یکرہ انتہی، فیکون ما کول اللحم (الی ان قال) وان لم یکن لخرئہ رائحۃ کریہۃ یکون طاہرا لکون خرئہ خرء ما کول اللحم من الطیور التی ترزق فی الہواء الخ

(فتاویٰ واحدیہ ص ۹۴)-

عبارات بالا کے علاوہ مندرجہ ذیل نصوص میں بھی اس کی تصریح ہے کہ حلت و حرمت کا مدار خوراک پر ہے۔

(۱) واصل ذالک ان یاکل الجیف فلحمہ نبت من الحرام فیکون خبیثا عادۃ وما یاکل الحب لم یوجد ذالک فیہ وما خلط کالدجاج والعقعق فلا باس باکلہ عند ابی حنیفۃ رح وھو الاصح لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکل الدجاجۃ وہی مما یخلط

(العنایۃ مع الفتح ص ۶۲ ج ۸)-

(۲) فکان الاصل عندہ ان ما یخلط کالدجاج لا باس (عالمگیریہ ص ۳۲۱ ج ۵)-

آخر میں ابو حنیفہؒ عصر، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا فیصلہ بھی تذکرۃ الرشید سے نقل کیا جاتا ہے: جب یہ فیصلہ خود کتب فقہ میں مذکور ہے کہ مدار اس کی خوراک پر ہے۔ پس یہ کوا جو ان بستیوں میں پایا جاتا ہے اگر یہ عقعق نہ ہو تو بھی اس کی حلت میں شبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب وہ بھی خلط کرتا ہے اور نجاست و غلہ و دانہ سب کچھ کھاتا ہے تو اس کی حلت بھی مثل

عقعق کے معلوم ہوگئی خواہ اس کو عقعق کہا جاوے یا نہ کہا جاوے۔ فقط واللہ اعلم، رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔

عبارت مذکورہ کے حاشیہ پر ہے۔ جب مخالفین کا اس مسئلہ پر غوغا زیادہ ہوا تو ستر سے زائد علماء کا مواہیر سے ایک رسالہ بنام فصل الخطاب شائع کیا۔ نیز ایک حاجی نے علماء حرمین سے اس کی حلت کا فتویٰ لیا، وہو ہذہ ـــ الحمد لله وحده، رب زدنی علماء الغراب المذكورحلال من غير كراهة عندابی حنيفة رح وهوالاصح وہوالمسٰی بالعقعق بتصريح فقهائنا رحمهم الله واصاب من افتى بحله وجوازا كله وكيف يلام الحنفى على اكل ماهوحلال عند امامه من غير كراہة والاصل فی حل الغراب وحرمته الغذاء وكونه ذا مخلب لا بصورة ولونه كما يدل عليه تصريحات فقهائنا فی غالب معتبرات المذهب كمافی البحر الرائق والدرالمختار والعناية وغيرها وفيما نصه جامع الرموز اشعاربانه لوا كل كل من الثلاثة الجيف و الحب جميعا حل ولم يكره وقالا يكره والا دل اصح فثبت مما صرح به علمائنا ان الغراب بانواعه سواء كان عقعقا اوغيره اذا كان يجمع بين جيف وحب يجوزا كله عندامامنا الاعظم والله اعلم، (قاله بفمه و امر برقمه عبدالله بن عباس بن صديق مفتى مكة المشرفة۔)
اسی مضمون کا علماء مدینہ منورہ کا بھی فتویٰ موجود ہے (تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۱۷۸)۔ اس تحریر کے بعد مسئلہ ایسا واضح ہوگیا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

فبای حدیث بعدہ یومنون۔

للہ در المجیب الاوّل وارشاد الرشید الثانی حیث اوضحوا الحق والصواب بحیث لا یبقی منہ ریب مرتاب۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دار العلوم کراچی ۳۰
۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ

فقط واللہ الھادی الی سبیل الرشاد۔

رشید احمد عفی عنہ
دار العلوم کراچی ۳۰
۱۵ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ

خطباتِ عثمانی

(۳ر جلدیں)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

کے خطبات کا دوسرا مجموعہ:

خاص ایڈیشن : =/1200 روپے

عام ایڈیشن : =/800 روپے

میمن اسلامک پبلشرز